

ماہنامہ سریتا

سماجی تعمیر نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر

وشوناتھ

زرِ سالانہ

——— ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ال ——— ۱۲ روپے

(——— ۲۲ روپے

——— ۱۵۰ روپے

ـ کیلئے: ایک سال ۱۶ روپے دو سال ۳۰ روپے

ا ہر پرچہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ڈاک
رد کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرچہ کم ہو جانے
درت میں ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد
ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے پر اگر پرچہ اسٹاک
جود ہوا تو دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔

ہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریداری
مارہ ہیں فوراً دیجیئے تاکہ سریتا آپ کو وقت پر
سکے۔

، دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ
لی کے لئے دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ
پرائیویٹ لمیٹڈ اور دلی پریس نئی دلی سے وشوناتھ
ع اور شائع کرایا۔
ادارت اور اشاعت: دلی پریس جھنڈے والا
شہ رانی جھانسی روڈ، نئی دلی!

۹۳ واں شمارا مارچ ۱۹۶۷

کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچرس

ماہنامہ سریتا

سماجی تعمیرِ نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر

وشوناتھ

زرِ سالانہ

___ ایک روپیہ ۲۵ پیسے

سال ___ ۱۲ روپے

ل ___ ۲۲ روپے

___ ۱۵۰ روپے

ک کیلئے: ایک سال ۱۶ روپے دو سال ۳۰ روپے

یا کا ہر پرچہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ڈاک
سپرد کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرچہ کم ہو جائے
صورت میں ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد
ں ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے پر اگر پرچہ اسٹاک
موجود ہوا تو دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔

رہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریداری
ساتھ ہمیں فوراً دیجئے تاکہ سریتا آپ کو وقت پر
سکے۔

ان دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ
دلی کے لئے دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ
ی پرائیویٹ لیمٹڈ اور دلی پریس نئی دلی سے وشوناتھ
طبع اور شائع کرایا۔

م ادارت، انتظام اشاعت: دلی پریس جھنڈے والا
بست، رانی جھانسی روڈ، نئی دلی ۱

کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچرس

سنگ مرمر کا بنا ہوا
دنیا بھر میں مشہور تاج کے
نام پر
ہندوستان کی سب سے زیادہ آرام دہ
اور تیز رفتار ریل گاڑی

تاج ایکسپریس

دلی کو مرکز بنا کر
آپ ایک ہی دن میں آگرہ کے
تاریخی شہر اور آس پاس
کے یادگار مقامات دیکھ سکتے ہیں
صبح نئی دلی سے چلئے
اور دس بجے رات کو لوٹ آئیے۔ آگرہ
اسٹیشن سے قابلِ دید مقامات تک عام قسم کی اور
ایرکنڈیشنڈ بسوں اور گائڈ کی خدمات کا انتظام ہے۔

A Day's Visit to Agra...

NORTHERN RAILWAY





ہمارے کتنے بچے ہونے چاہئیں ؟



م خوشی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں : کوئی فکر، کوئی مسئلہ، کوئی مشکل نہ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے،
بلہ خوش حال کنبے میں کتنے بچے ہونے چاہئیں ؟ — آج شادی شدہ جوڑوں میں سے ۷۰ فیصد ایسے ہیں، جو تین سے
اوہ بچے نہیں چاہتے۔ اب وہ دن گئے جب ماں باپ زیادہ بچوں کو خوشی کا سبب سمجھتے تھے*۔ ہاں کنبے کو محدود
کھنے کے متعدد طریقے ہیں۔

*میسور، اتر پردیش، بہار اور بنگال میں آبادی کا سروے

معلومات اور مفت مشورے کے لئے
فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر میں جائیں ▼

DA44/107


ہمدرد
کے
برسوں کے
تجربات کے
نتائج
قلزم
"قلزم" ہمیشہ پاس رکھیے
ہمدرد بام
ہمیشہ ساتھ رکھیے
ہمدرد مرہم
اسے ہمیشہ گھر میں رکھیے
صدوری
ہمدرد منجن
ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

اداریہ

موجِ سرِ تیا

۱۹۶۲ کے چینی حملے کے دوران "شہرت یافتہ" کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل بی ایم کول کی ایک کتاب "ان ٹولڈ سٹوری" (ان کہی کہانی) شائع ہوئی ہے۔ اِس کے مطابق جنرل کول نے نیفا میں ہوئی ہار کے لئے اُس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی جواہر لال نہرو، وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن اور وزیر خزانہ مسٹر مرارجی دیسائی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

جنرل کول نے لکھا ہے کہ وزیر خزانہ مسٹر مرارجی دیسائی نے دفاع پر ہونے والے خرچ کے معاملے میں کنجوسی دکھائی اور وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن نے مناسب اور فوری کارروائی کرنے میں غفلت برتی۔ اور چونکہ ان دونوں وزیروں نے پنڈت نہرو کے دور میں نااہلیت کا یہ ثبوت دیا اس لیے وہ بھی اس ہار کے لئے ذمہ دار تھے۔

پنڈت نہرو تو چونکہ اِس دُنیا میں ہیں نہیں اس لئے موجودہ حالات میں اُن کے بارے میں کچھ اظہار رائے کرنا بیکار ہی ہے۔ لیکن باقی دونوں سابق وزراء آج بھی موجود ہیں اس لئے عوام کو اُن سے یہ پُوچھنے کا حق ہے کہ جنرل کول نے اُن کے بارے میں جو انکشافات کئے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہیں۔

مگر اس معاملے میں مسٹر دیسائی کا تعارف پہلی بار منظرِ عام پر آیا ہے۔

مسٹر مرارجی دیسائی کو خاص طور پر مندرجہ ذیل الزام کا تسلی بخش جواب دینا چاہئے۔

"آزادی کے بعد سے ہمارے زیادہ تر نیتا یہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اہنسا کے ذریعے آزادی حاصل کی ہے۔ اس لئے اگر ہم برطانیہ جیسے طاقتور ملک کو ہتھیاروں کا استعمال کئے بغیر بہ آسانی ملک سے باہر نکال سکے تب ہتھیار بند فوجوں پر روپیہ خرچ کرنا بیکار ہے۔ نفسیاتی طور پر یہی بات نیتاؤں کے دِل میں گھر کئے ہوئے تھی۔ اِس لئے فوجوں کی اہمیت کم ہوتی گئی اور اُن کی زیادہ تر ضرورتوں اور مطالبوں کو "عیاشی" کہہ کر ردّ کر دیا گیا۔"

کانگریس دورِ حکومت میں مُلک کی عزت کس طرح مٹی میں مل رہی ہے اس کا ایک تازہ نمونہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے وہ دو متضاد بیانات ہیں جو انھوں نے انہی دنوں امریکہ سے اناج کی مدد لینے کے سلسلے میں دیئے ہیں۔

پہلے بیان میں وزیر اعظم نے کہا کہ اُن کی سرکار کو امریکی امداد کی یہ دونوں شرائط قبول ہیں کہ بھارت نہ تو شمالی ویت نام کے ساتھ کسی طرح کی تجارت کرے گا اور نہ کیوبا کو لڑائی میں کام آنے والا کوئی سامان

بھیجے گا۔ آپ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں شرائط سے بھارت کی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ بھارت پہلے ہی سے ان کے مطابق کام کرتا آرہا ہے۔ شمالی ریت نام کے ساتھ بھارت کی تجارت ۱۹۶۱ کے چینی حملے کے بعد سے بند ہے اور کیوبا کو بھی ہم پٹ سن کے بوروں کے سوائے اور کچھ نہیں بھیج رہے ہیں۔ اس لئے امریکہ کی یہ دونوں شرطیں بھارت کی خلافِ شان نہیں کہی جاسکتیں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اگلے ہی دن مسز اندرا گاندھی نے ایک اور بیان دیا کہ امریکہ کی شرطیں بھارت کی آزادی اور شان کے خلاف ہیں اس لئے بھارت سرکار انھیں قبول نہیں کرسکتی وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ بھک منگے کی کیا شان اور کیا آزادی؟ یاتو آپ امریکہ یا کسی بھی غیر ملک سے قرضہ یا رعائت پر اناج نہ مانگیں اور نہ بنا شرط کچھ مدد ملنے کی اُمید ہی رکھیں یا پھر اگر ایسی مدد کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکتے تو جن شرطوں پر بھی ممکن ہو، مدد لے لیں۔ اس میں اپنی نام نہاد عزّت کا سوال کیوں اُٹھاتے ہیں؟

لیکن ایک ہاتھ سے لگاتار مانگتے جانا اور دوسرے سے دینے والے کے منہ پر طمانچہ لگانا تو روزمرہ کے معمولات میں بھی ممکن نہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں اُسے کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے؟

بہرحال یہ اچھا ہی ہوا کہ امریکہ نے اپنے اناج کے ساتھ کچھ شرائط جوڑدیں۔ اُن کے تحت ہم اگر امریکہ سے اناج لیں تو بھی اور نہ لیں تو بھی ہمارے نیتاؤں اور لوگوں کو یہ محسوس تو ہوگا کہ اب تک ہم جو امریکی اناج کھاتے آرہے تھے، وہ ایک طرح کی بھیک تھی اور بھکاری کی کوئی عزّت نہیں ہوتی۔

شاید اس تجربے سے ہی ہمارے اندر کچھ خودداری کا جذبہ پیدا ہو اور ہماری سرکار اور کسان ملک کو اناج کے معاملے میں خودکفیل بنانے کی کچھ کوشش کریں۔

پچھلے دِنوں بمبئی میں بھارت کی ایک سگریٹ کمپنی اور کچھ دیگر ملکی و غیر ملکی تجارتی فرموں کی طرف سے اُن کے مال کی اشتہار بازی کے لئے "ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں"، کے نام سے 'بہترین میاں بیوی' مقابلہ کرایا گیا تھا۔ اُس میں بمبئی کے ہی ایک جوان جوڑے کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا دونوں کو ۷ دن کے لئے روم کی مفت سیاحت کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔

حسیناؤں اور صحت مند جوانوں کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ بہترین جوڑوں کے ایسے مقابلے اپنی جگہ پر چاہے کتنی ہی صحت مندانہ روایات کیوں نہ ہوں، لیکن جس بنیاد پر بمبئی کا موجودہ مقابلہ کرایا گیا وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے سماجی وذاتی صحت کے لئے یقینی طور پر بہت زیادہ خطرناک ہے۔

اس مقابلے کا مقصد متعلقہ سگریٹ کمپنی کی سگریٹ برانڈوں کا مشتہر کرنا تھا یعنی اِس میں انعام پانے والے جوڑے کے ذریعے جگہ جگہ یہ پبلسٹی کرانا کہ وہ اتنے خوبصورت اور تندرست صرف اس وجہ سے ہیں کہ وہ اس کمپنی کے سگریٹ پیتے ہیں! ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ غلط بات اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ سگریٹ پینے سے تندرستی اور خوبصورتی تو دور رہی، اُلٹا بنی بنائی صحت اور خوبصورتی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ سگریٹ سے کینسر تک ہو سکتا ہے، یہ بات بھی اب اکثر سبھی ملکوں کے ڈاکٹر تسلیم کرنے لگے ہیں۔

ایسی حالت میں سگریٹ وغیرہ قسم کی چیزوں
کی اشتہار بازی کی سرے سے اجازت نہیں دی جانی
چاہیئے۔ نہ کہ ان چیزوں کو تندرستی و خوبصورتی کی
بنیاد بتانے کی تلقین کی جائے۔ کئی ترقی یافتہ
ملکوں میں نشیلی و زہریلی چیزوں کی اشتہار بازی
قانونی طور پر ممنوع ہے۔ بھارت میں بھی
شراب و دیگر منشیات کی اشتہار بازی نہیں کی
جاسکتی۔ لیکن اب اِن مقابلوں کے پیشِ نظر یہ
کہنا پڑتا ہے کہ بھارت میں سگریٹ وغیرہ
کی اشتہاری بازی پر بھی پابندی لگ جانی
چاہیئے۔ بہتر ہو اگر اگلی لوک سبھا اس مسئلے
پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے۔

کمیونسٹ کہا کرتے ہیں کہ چیزوں کی پیداوار
صرف استعمال کے لئے ہونی چاہیئے،
نہ کہ اس خیال سے کہ اُن کی تیاری میں کیا
لاگت آئی اور کیا منافع وغیرہ ہوا۔ دوسرے لفظوں
میں کمیونسٹ اقتصادی سرگرمیوں میں بچت یا
منافع کے اُصول کو نہیں مانتے، اسے وہ خالص
سرمایہ دارانہ اُصول کہتے ہیں۔ لیکن گزشتہ چند
سالوں سے خود اُن کے پیر وطن روس میں یہ
سرمایہ دارانہ اصول کس طرح روز افزوں اہمیت
حاصل کر رہا ہے۔ اس کی ایک اور دل
چسپ مثال ابھی حال میں سامنے آئی ہے۔
روس کے وزیر زراعت نے اعلان کیا
کہ اس بار وہاں گیہوں کی پیداوار کا ایک نیا
ریکارڈ قائم ہو گیا ہے۔ کُل پیداوار ۱۷۱,۰۰۰,۰۰۰
ٹن کی ہے، جب کہ وہاں کی پوری آبادی کو
پیٹ بھر کھانے کے لئے صرف ۱۳۲,۰۰۰,۰۰۰
ٹن کی ضرورت ہے۔ (موازنے کے لئے دیکھئے
کہ بھارت کی آبادی روس کے مقابلے میں
دوگنی سے زیادہ ہے، لیکن یہاں کی اناج کی
ضرورت کا تخمینہ صرف ۱۰,۰۰۰,۰۰۰ ٹن
لگایا جاتا ہے اور وہ بھی حاصل نہیں ہو
اس سال یہاں کی پیداوار صرف ۱۰۵,۰۰۰,۰۰۰
ہے۔)
لیکن روسی وزیر کے اعلان میں خاص
یہ تھی کہ ضرورت کے مقابلے میں تین کر
ٹن یا اس سے بھی زیادہ فالتو اناج ہونے پر
روس غیر ممالک سے اناج منگائے گا، شکر
(بھارت جیسے) بھوکے ملک کو مفت
کچھ زیادہ دینے کا تو خیر سوال ہی نہیں۔
یہ عجیب بات کیوں ہے؟ خود
وزیر موصوف کے مطابق فالتو پیداوار ہو
کے باوجود باہر سے اناج خریدنے کی وج
ہے کہ روس کے دور دراز مشرقی عـ
(مشرقی سائبیریا) میں یورپی علاقوں سے
کے ذریعے اناج بھیجنے کی نسبت کناڈا
سے خرید کر سمندری راستے سے اناج
زیادہ سستا پڑتا ہے۔ اور روس خود
فالتو اناج مشرقی یورپ اور وسطِ یور
ممالک کو بیچے گا۔ جہاں سے وہ خریدا
سستا پڑے گا۔
مطلب یہ کہ آج روس میں تمام کار
نفع نقصان کے سرمایہ دارانہ اصول کو مدِنظ
کیا جا رہا ہے۔ چیزیں صرف استعمال کے
کے کمیونسٹ اصول پر نہیں۔ وجہ صاف
روس نے برسوں کے تجربے کے بعد یہ سمجھ
صحیح معاشی ترقی صرف نفع نقصان کے
سامنے رکھ کر ہی کی جا سکتی ہے، کھوکھلے آ
کی بنیاد پر نہیں۔
لیکن بھارت میں ہمارے موجودہ
تک اُن طریقوں سے چپٹے ہوتے ہیں جو
برسوں پہلے آزما کر چھوڑ چکا ہے۔ ہمارے
آج بھی نفع نقصان کا خیال رکھے بغیر ارا
بڑے بڑے منصوبوں پر لگائے جا رہے ہیں
ملک کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔

گلزار

نیا پاکستان

ہندوستانی تہذیب کے آغوش میں

رس پہلے، جب پاکستان بنا تھا، مسلم لیگی اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ تہذیب پر کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہوتا ہے، سیاست کی کوئی تنظیم مذہب کے نام پر تہذیبی دوں کو ختم نہیں کرسکتی۔

پاکستانی حکمرانوں نے مملکتِ خداداد لستان، کو جذباتی بنیادوں پر ایک ایسا نیا ملک بنانا چاہا (جس کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہونے کے سبب) جو دنیا کے نقشے میں ایک نئی اسلامی ریاست کا اضافہ کرے، جس کے رشتے عربی اور عجمی تہذیبوں سے جوڑے جائیں، اور سیاسی اعتبار سے اقتدار اور غیر ملکی امداد حاصل کرنے کے لئے اس نئے خطۂ زمین کے باسیوں کو ہندوستان سے مسلسل نفرت کرنے کا درس دیا جائے۔ ان کے قدیم تہذیبی رشتے اور اس برِ صغیر کی زمین سے ان کی قدیم وابستگی کے تصور کو مجروح کیا جائے۔ اسی لئے انہوں نے تاریخ کو نئے سرے سے مرتب کرکے پاکستان کی زمین اور تہذیب کو غیر منقسم ہندوستان کے ایک حصے کی حیثیت سے قائم رکھنے کی جگہ، عجمی اور عربی رشتے ڈھونڈ نکالے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں میں غیر ہندو عناصر تلاش کرکے پاکستان کو ہیجنک تہذیب کا حامل بنا

لیکن تہذیبیں اور کلچر غلط تصورات یا نظریات میں نہیں پنپتیں، ان کے لئے زمین اور زمین سے گہرے رشتے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستانی حکمرانوں کی تعلیمات کے باوجود اپنے ابتدائی دس برسوں میں پاکستان تہذیبی اعتبار سے خود کو ہوا میں معلق محسوس کرنے لگا۔

ادھر پانچ برسوں میں جو پاکستانی نئی نسل سامنے آئی ہے، اس نے اپنی تہذیبی بے جا[ئی] کو بڑی شدت سے محسوس کیا، اور اس برِ صغیر میں اپنی تہذیبی جڑیں تلاش کرنی شروع کردی[ں]۔ پھر قدامت پرست پاکستانی دانش وروں کو نئ[ی] نسل کا یہ رویہ پسند نہ آیا۔ انہوں نے دل کھول کر اس نئی جدوجہد کی مخالفت کی۔

لیکن تہذیبی بنیادوں کے بغیر کوئی قوم ا[پنا] کردار، اپنے ضمیر، اپنی روایت اور اخلاقی قدروں کو پا نہیں سکتی۔ پاکستان کی نئی نسل، اپنے تہذ[یبی] ماضی کے بغیر خود کو بے روح محسوس کر رہی تھ[ی]۔ اس کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ یا تو و[ہ] پاکستانی حکمرانوں اور مسلم لیگی دانش وروں [کے] پیش کئے ہوئے اس تصور کو اپنا لیں، جس [کے] مطابق ان کا رشتہ ایران، ترکی، مصر اور عرب سے وابستہ ہوجاتا تھا، یا اس مفروضے [کے] خلاف جدوجہد کریں، اور اپنی رگوں میں دوڑ[تے] خون کی صحیح حیثیت اور ماہیت کا پتہ لگائیں، [تاکہ] ان کا احساسِ اجنبیت ختم ہو، اور وہ کسی تہذ[یبی] قدر سے وابستہ ہوسکیں۔

[illegible] اپنے حکمرانوں کے دیے ہوئے فریب سے نکل گیا ہے
[illegible] بن گیا ہے جتنا ڈسکوری آف انڈیا ، مصنف ...

اس نئی نسل نے دوسرا راستہ اختیار کیا، وہ کچھ عرصہ کی کوشش کے بعد آج پاکستانی ہندیب کا نظریہ اپنے صحیح مرکز پر پہنچ گیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ہند اور پاکستان کے درمیان جو دُوری، نفرت اور غم و غصہ ہے، اس کے برخلاف پاکستان کی ذہنی زندگی ہندوستان کے آغوش میں ہی سانس لے رہی ہے، وہ ہندوستان جو تقسیم سے پہلے کا تھا، اور ہندو مسلمان دونوں کا مذہبی مرکز تھا۔

آپ کو حیرت تو ہوگی، لیکن پاکستان کے ایک اہم ترین ادبی اور تہذیبی رسالے، 'اوراق' کے تازہ شمارے سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

> "اس برِصغیر کے بیشتر مسلمان اُن لوگوں کی اولاد ہیں جن کی تاریخ کا آغاز آج سے پانچ ہزار برس پہلے ہوا تھا۔ یہ ہمارا ماضی ہے۔ اشوک اور چندر گپت کے عہد میں عوام پر جو بیتی وہ دراصل ہمارے ساتھ بیتی تھی۔ یہ ماضی ہماری روایات، ہماری رسُوم، ہمارے لوک گیتوں اور ہمارے اندازِ فکر میں اسی قدر موجود ہے، جتنا وہ کلچر جو عربوں، ترکوں اور عجمیوں کے ساتھ ہمارے دیس میں آیا۔"

(اوراق جولائی ۱۹۶۶)

یہ اقتباس 'اوراق'، کے ایڈیٹر ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ادارئیے میں ایک قدامت پرست مسلم لیگی دانش ور کی تہذیبی مسئلے سے متعلق ایک بحث کے سلسلہ میں درج کیا ہے۔ اور نئے مورّخ فیاض محمود کی تصنیف 'دی سٹوری آف انڈو پاکستان' سے لیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ فیاض محمود اور ڈاکٹر وزیر آغا ان لوگوں میں سے نہیں ہیں، جن کا اصل وطن ہندوستان تھا۔ لیکن پاکستان ہجرت کر گئے ہیں۔ یہ دونوں اشخاص مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں اور پاکستان کے اصل اور بنیادی شہری ہیں۔

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال کی لڑائی اور اُس کے بعد جاری رہنے والے پروپیگنڈے کے باوجود جون، جولائی ۱۹۶۶ کے شمارے میں اس بحث کو پوری شدت اور جرأت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تہذیبی اعتبار سے نیا پاکستان، ہندوستان اور اس برِصغیر کی قدیم روایت اور ماضی کے آغوش میں پرورش پا رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبی اعتبار سے پاکستان اور پاکستانی عوام ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے بہت قریب آ جائیں گے اور شاید ایک دن ایسا بھی آ ہی جائے گا جب دو ملکوں کی اس غیر فطری تقسیم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بنگال سے پشاور تک ایک ہی ملک ہوگا، اور ایک ہی تہذیب!

یہ بات محض کوئی خوب صورت خواب نہیں ہے۔ ذرا حقائق کا اندازہ کیجئے، اور پھر سوچئے کہ کیا ایسا ہونا ممکن نہیں ہے؟

ملک تقسیم ہونے کے بعد پاکستانی حکمرانوں اور روایت پرست دانش وروں نے علمی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے وہ تمام ذرائع استعمال

کرنا شروع کر دیئے تھے، جن سے پاکستان کا مجموعی کردار ہندوستان سے الگ تھلگ نظر آئے اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ فارسی اور عربی الفاظ سے بھرا جا رہا تھا۔ فارسی آمیز اصطلاحات اور لغات مرتب کی جا رہی تھیں۔ ایرانی طرز کے لباس، ایرانی طرز کی مصوری اور مصریوں کی موسیقی کو روشناس کرایا جا رہا تھا۔ نئی تعمیرات میں قدیم اسلامی طرز کی نقل، کلچر میں ایک خاص قسم کا اسلامی رنگ، اور سندھ کی تہذیب کو ہندوستان میں پہلی اسلامی تہذیب قرار دینے کی کوششیں۔

یہ سب محض اس لئے تھا کہ پاکستانی عوام اپنی ضروریات اور حقائق سے مجبور ہو کر کہیں اس غیر فطری تقسیم کے خلاف آواز نہ اٹھائیں، اس برِصغیر کی زمین سے اپنا تہذیبی رشتہ جوڑنے کی بجائے اپنا رشتہ ایک ایسے نئے ملک سے جوڑ لیں، جس کو باقی رکھ کر حکومت کرنا اور شہنشاہیت کے خواب دیکھنا آسان تھا۔

بعض کتابوں میں تو یہاں تک تحقیق پیش کی گئی یا کرائی گئی کہ پاکستان کا تصور دراصل نیا نہیں، بلکہ سیکڑوں سال پرانا ہے، اور پاکستانی علاقہ زمانۂ قدیم سے مسلمانوں کا مرکز اور ان کی تہذیب کا گڑھ رہا ہے۔ برِ اعظم ایشیا میں یہ خطہ جس پر آج پاکستان بنا ہے، ہمیشہ سے باقی ہندوستان سے الگ رہا ہے۔ اور سمرقند، بخارا، ایران اور کابل کی اسلامی سلطنتوں کا ایک حصہ رہا ہے۔

زبان کے سلسلے میں بھی اسی قسم کا رویّہ اپنایا گیا، اردو کو مسلمانوں کی یعنی پاکستان کی زبان قرار دیا گیا، اور اردو ادب کے اسلوب، روائت اور کہانیوں کا رشتہ ایران سے جوڑ کر غیر ہندوانہ اردو کی تشکیل شروع کر دی۔

انسان اپنی روح اور اپنے ضمیر کا تابع ہے۔ جذبات اور پبلسٹی اس پر اثر انداز تو ہوتی ہیں، لیکن عام تشہیری نظریات اور جذباتی مدّوجزر سے گزر کر وہ ہمیشہ سچائی کی منزل کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ پاکستان کی نئی نسل نے بھی اپنے ضمیر، اپنے ماضی اور روح کو پا لیا ہے۔ اور پاکستانی حکمرانوں کی تمام ہشیارانہ چالوں اور کوششوں کے باوجود نئے پاکستانی دانشور اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کے اعتبار سے آج اس دنیا میں سانس لے رہے ہیں جو پانچ ہزار برس کی قدیم تہذیب نے انہیں ورثہ میں دی ہے۔

پاکستان کی نئی زبان وہ اردو ہے جس میں ہندوستانی تہذیب کے تمام رنگ جھلملاتے ہیں۔ انہوں نے ویدک ہندوستان سے اپنا رشتہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اپنی جڑیں اس برِصغیر کی زمین میں تلاش کر لی ہیں، اور آج وہ ویدوں سے، مہابھارت اور رامائن سے، بدھ اور ہندوستان کی دیومالا سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان تبدیلیوں کا جائزہ لینا ہو تو پاکستان کے وہ تمام اہم ادبی رسائل دیکھ ڈالئے جن میں ان مسائل پر باقاعدہ بحثیں چلی ہیں، اور اب وہاں کے دانشور اپنی منزل کو پا چکے ہیں۔

سب سے پہلے پاکستان کے جدید شعرا پر نظر ڈالئے وہ اردو شاعری جس کی تلمیحات، استعارے، ہیرو اور علامتیں سب ایران و عرب کی سرزمین سے آتی تھیں، آج پاکستان کی زمین، مٹی، تہذیب اور ضمیات سب میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ رچا بسا نظر آتا ہے۔

اندھیارے کی کالی مَیا من کو پھاڑے کھائیں،
شمشانوں کے ہاگھو ڈکاریں، اندھے کنویں بلائیں
پگڈنڈی کے شیش ناگ جی پگ پگ ڈستے جائیں
پیڑ ملکش، بادل راون، گھر بھتنے بن جائیں
دھیان کے اندر پتہ بے بیتی گھڑیاں اڑتی آئیں
میں سیتا بن باس کو نکلی برہ کی اگن جلائے
آگے آگے رام جی نا ہیں، پیچھے لچھمن نا آئے

ـــ "رات اور سیتا" از اسد محمد خاں
(ادبِ لطیف جولائی ۱۹۶۳)
یہ پاکستان کے ایک جدید شاعر کی
نظم ہے، جو ۱۹۶۴ کے ایک ہندوستانی مشاعرے
میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر گیا ہے۔
اس نظم میں شیش ناگ، راکھشس،
راون، سیتا، بن باس، رام جی اور لچھمن جی
قابلِ غور ہیں۔ بلکہ یہ بات خصوصاً قابلِ
ذکر ہے کہ شاعر نے اپنے اضطراب، اپنے کرب
اور اپنے ماحول کی عبرت ناک اور خوف ناک
فضا کو پیش کرنے کے لئے، اپنا وہ لہجہ قائم
رکھا ہے، جس کی روح اس قدیم تہذیب
اور اس کی دیومالا میں موجود ہے۔

جدید شاعری میں دیومالا کو خاص
اہمیت حاصل ہے۔ آج کا نیا شاعر قدیم
دیومالائی علامتوں کو نئے معنی میں استعمال
کرتا ہے اور اپنے مفہوم کو وسیع کر دیتا ہے۔
بدقسمتی سے اردو زبان کو اسلامی نظریے میں
کسی دیومالا سے سابقہ ہی نہیں پڑا کیونکہ
اسلام ضمیات (دیومالا) کے خلاف ہے۔ اس
لئے پاکستانی جدید شعرا نے اپنے لئے اس
دیومالا کا انتخاب کیا ہے جو ہزاروں برس
سے اُن کی روح کا حصہ رہی ہے۔

جدید پاکستانی دانش وروں نے ویدوں
کا مطالعہ بھی بڑی دل چسپی سے شروع کیا ہے۔
ان کے نزدیک ان کی تہذیبی تاریخ کی ابتدا
دراصل ویدوں کے زمانے سے ہی ہوتی ہے۔
چنانچہ پاکستان کے جدید ادب میں ویدک علامات
اور ویدک نظریات کی پرچھائیاں بھی نمایاں
ہو رہی ہیں۔ مثال کے لئے یہ چند مصرعے
ملاحظہ کیجئے۔

یہ آگ، پانی، ہوا، یہ مٹی
انہی سے میرا خمیر اُٹھا
انہی میں تحلیل ہو نہ جاؤں

یہ آگ جو نور کا لہو ہے
جو میری رگ رگ میں موجزن ہے
ـــ "سفر" از اعجاز فاروقی
(ادبی دنیا لاہور)

یہاں آگ، پانی، ہوا اور مٹی رِگ وید
کی علامتیں ہیں یعنی اگنی، جل، وایو، اور دھرتی۔
رِگ وید میں ایک لائن ہے۔
"اگنی کی شعاعیں، جو اوشا کے قلب سے نکلی ہیں
ہمیشہ تابناک رہتی ہیں اور کبھی ماند نہیں پڑتیں۔"
(رِگ وید-۱/۱۴۳/ ۳)

اسی نظریہ کو اعجاز فاروقی نے اپنی نظم کے
مندرجہ بالا آخری دو مصرعوں میں پیش کیا ہے۔
ایک دوسرے شاعر احمد تمیم کی نظم "حلقۂ زنجیر"
(ادبی دنیا لاہور) کی یہ سطریں بھی ہندوستانی
تصورات میں رچی بسی ہیں۔

بند دروازے کے باہر
چڑھتے سورج کے اگن رتھ پر
ہماری خواہشوں کی لاش ہے۔

یہاں "سورج کا اگن رتھ" بھی ہندوستانی
تہذیب اور رِگ وید کی علامت ہے۔ اور
یہ سورج مصر و یونان اور ایران و عرب کی
زمین پر چمکنے والا سورج نہیں بلکہ قدیم بھارت
میں اپنا دیومالائی روپ رکھنے والا سورج
دیوتا ہے۔

قدیم بھارتی تہذیب کی یہ روایت
جدید پاکستانی دانش وروں اور پاکستانی ادب
کی روح بن گئی ہے، اور اس روح کے
میسر آ جانے کے باعث پاکستان کی جدید
اردو شاعری، دنیا بھر کے ادب میں ایک
انفرادیت اور خصوصیت کی حامل ہو چکی ہے
اس جدید ادب کی جڑیں ہماری زمین میں
بہت دور تک چلی گئی ہیں، اور پاکستانی ادب
کو ایک عظیم روایت کا ورثہ میسر آ گیا۔
ایک نظم کے کچھ مصرعے اور ملاحظہ کیجئے۔

اُس کے من کی کامنا تھی، کاشن میں
لکھتا کبھی

زندگی پر ایک البیلی سی نظم
زندگی ہوتی کوئی چنچل پری
بادلوں کے پنکھ، روپک دامنی
اس کے من کی کامنا کو روپ دینے
کے لئے

سوچ کے رتھ پر سوار
لوک اور پرلوک میں اُڑتا پھرا اس
اپسرا کی کھوج میں

اگر پاکستان کا جدید ذہن اس تہذیبی انقلاب سے روشناس نہ ہوتا تو 'سوچ کے رتھ' اور 'لوک پرلوک' کی پرواز کے یہ نئے اور وسیع مفہوم رکھنے والے استعارے جدید پاکستانی شاعری کو میسر نہیں آ سکتے تھے۔

یہاں یہ نکتہ بھی خصوصاً قابل ذکر ہے کہ اردو غزل کو پاکستان کے قدامت پرست ناقد، آج بھی فارسی غزل سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن نئے ذہن نے اردو غزل کو بھی غیر ملکی اور اجنبی دیاروں سے نکال کر اپنی تہذیب، یعنی ہندوستانی تہذیب میں، اور ہندی آمیز ایک نئی رسیلی زبان میں تبدیل کر دیا ہے۔ ناصر شہزاد کی غزل کے کچھ اشعار اس کے ثبوت میں پیش ہیں۔

چال کی شوخی، روپ کی سج دھج، جسم کا
ہار سنگھار گیا
میرے پریم کا جادو اس سندر لڑکی کو
مار گیا
سُن ری سہریا، رس کی گگریا، کل گاؤں
کے میلے میں
دور دیس کا اک پردیسی تجھ پر تن من
وار گیا
مان بھی جا اب پیاری سکھی! بیت نہ
جائے یہ نیاری رینی
دیکھ وہ چاند کا پھیرتا بجرا نیل گگن کے
پار گیا
گوری! کچھ تو بتا وہ کون ہے جو مندر
کے آنگن میں
تجھ سے پریت کا بندھن باندھ کے
اپنے بھاگ سنوار گیا
('نصرت' لاہور۔ فروری ۱۹۶۲)

یہاں پر پیش کئے گئے خیالات ورجحانات کی ان تبدیلیوں سے شاید آپ یہ نتیجہ نکالیں کہ پاکستان کے نئے ادیبوں نے یکسانیت کے احساس کو ختم کرنے کے لئے نیا تہذیبی پس منظر، ہندی دیومالا کی علامتیں اور ہندی آمیز اردو کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ لیکن آپ کا یہ شبہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا۔ پاکستان کی نئی نسل واقعی اُس تہذیب کو اپنی رگوں میں اتار چکی ہے، جو ایشیا کی ایک عظیم اور قدیم تہذیب ہے۔ یہ عمل صرف خارجی اشیا اور اسلوب میں ہی نہیں، سوچنے کے انداز اور زندگی کے متعلق کسی فلسفے کی تلاش میں بھی نمایاں ہوا ہے۔

پاکستانی جدید نسل کے ادیبوں میں اختر احسن کا نام بہت اہم ہے۔ انہوں نے نئی شاعری کا منشور بھی تحریر کیا ہے، اور فنی قدروں کے لئے ہندوستان کے روحانی فلسفہ سے مدد لی ہے۔ اردو غزل میں انہوں نے ایک نئی طرز کی 'زین غزل' کے نام سے ابتدا کی ہے۔ اس طرز کی غزلوں میں زین بودھ مت کے فلسفہ کو پیش کرتے ہوئے، انہوں نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ 'نصرت' لاہور نومبر ۱۹۶۲ء) میں لکھا ہے

"میری ان زین غزلوں کا میری اس دھرتی سے ایک بہت ہی پرانا رشتہ بنتا ہے۔ بودھ مت اگرچہ گیا میں پیدا ہوا، لیکن اس کے اعضا کی اصل طاقت میری ہی

دھرتی کے اس کونے نے دی۔
اس نئے مت کا پہلا اصول یہ تھا: پرستش کے لائق انسان ہے نہ کہ خدا۔ اس لئے کہ جو بھی ہے وہ انسان کے ہاتھ کے پر ہے۔ اور خدا انسان کے بہت سے دکھوں میں سے صرف ایک دکھ کا نام ہے۔ چنانچہ تمام الفاظ میں صرف ایک ' میں ' کا لفظ ہی تنہا سب سے بڑا دکھ یا سکھ ہے ۔

بدھ جی کا کام بندگی ہے
بدھ جی کا نام ہے خدا کا"

پاکستان میں بدھسٹ فلسفہ اور تعلیمات کے احیاء کی اور بھی اہم مثالیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں لاہور کا ایک واقعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

لاہور کے میوزیم میں بودھ کا ایک قدیم اور اہم مجسمہ تھا۔ ۱۹۶۲ میں میوزیم کے کارکنوں کی غفلت سے اس مجسمہ کو نقصان پہنچا، اور ٹوٹے ہوئے مجسمے کو میوزیم سے ہٹا دیا گیا۔ یہ واقعہ یوں تو کسی خاص اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا۔ لیکن برصغیر کی تہذیب سے اپنا رشتہ استوار کرلینے والے دانشوروں کی نظر میں اس واقعے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، اور نئے نقاد انتظار حسین نے "ادب لطیف" لاہور جنوری ۱۹۶۳ میں اپنے اداریے میں یہ الفاظ تحریر کئے۔

" ہمارے پچھلے سو سال کی ذہنی تاریخ یہ رہی ہے کہ تہذیبی روایات اور ادبی رجحانات مغرب کے حوالہ سے مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔ بودھ مت کی اس صورت کا جسے زین بدھ ازم کہتے ہیں، اس وقت امریکہ میں بڑا غلغلہ ہے۔ اور اس سے سنجیدہ حلقوں میں یہ شک پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستان کے نوجوان دانشوروں کے یہاں اس روایت سے دلچسپی کہیں اس حوالے سے تو پیدا نہیں ہوئی۔ اور کہیں مہاتما بدھ کی مقدس شخصیت کو زمواد ملارمے اور ایلیٹ کی طرح کھلونا تو نہیں سمجھا جا رہا۔ کیوں کہ اگر اس مقدس شخصیت نے واقعی نوجوان دانشوروں کو متاثر کیا ہے تو ان کے انداز نظر اور طرز زندگی میں کوئی فرق تو پڑنا چاہیئے۔"

انتظار حسین کے ان شبہات کا جواب اسی رسالے کے اسی شمارے میں شائع شدہ ایک مضمون میں موجود ہے۔ یہ مضمون میوزیم میں بودھ کے مجسمے کی ناقدری کے خلاف ہے۔ اور پاکستان کے بہت بڑے ایڈووکیٹ اور ادیب اعجاز حسین بٹالوی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون کو موصوف نے حلقۂ ارباب ذوق کی میٹنگ میں بھی پڑھ کر سنایا تھا۔

" شاید آپ کو یاد ہوگا، چند برس ہوئے حلقۂ ارباب ذوق راولپنڈی میں (کہ راولپنڈی ٹیکسلا کے ہمسائے میں ہے) ایک مضمون پڑھتے ہوئے میں نے اس مجسمے کا تذکرہ کیا تھا۔ اس وقت زیر بحث مسئلہ پاکستان کا ثقافتی ماضی تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ابھی ہمارے مصوروں اور فنکاروں کو گوتم بدھ کے اس نادر مجسمے سے اپنا رشتہ دریافت کرنا ہے، جو لاہور کے عجائب گھر کے ایک

تاریک کرنے میں رکھا ہے۔ مدعا یہ تھا کہ ہر ادیب، فن کار اور مصور کو اپنے ملک کے روحانی لینڈ سکیپ سے اسی طرح متاثر ہونا چاہئے جیسے وہ اپنے یہاں کے درختوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ فاقہ کش گوتم کا یہ مجسمہ اس سرزمین پر جسے ہم نے پاکستان کا نام دیا ہے، پھلنے پھولنے والی ایک خاص تہذیب کی سربرآوردہ علامت ہے۔ اسے فراموش کرنے یا مسترد کرنے کا مطلب اسی طرح ہے جیسے کوئی اپنے شجرۂ نسب کی ایک کڑی سے انکار کر دے یا اپنی تہذیبی وراثت سے محض اپنی لاعلمی کی وجہ سے عاق ہو جائے۔"

تہذیبی اقدار اور برصغیر کی زمین میں اپنی روٹیں تلاش کرنے کا یہ نظریہ صرف بودھ تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ فلسفۂ ویدانت سے بھی خصوصی مدد لی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں جون، جولائی ۱۹۶۰ کے 'اوراق' لاہور میں شائع شدہ و۔ع۔غ کا خط 'رادھے شیام کے نام' خصوصاً قابل ذکر ہے۔ و۔ع۔غ ویدانت کے فلسفے کے ایک بہت بڑے سکالر ہیں۔ پاکستانی دانش ور اور ہندوستان کے لوگ فلسفہ ویدانت کے سلسلے میں ان سے معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس ان کے شائع شدہ خط سے ہے، جو ایک ہندوستانی (رادھے شیام) کے سوالات کا جواب ہے۔

"بعض لوگ کہتے ہیں اپنشد بھی سچ، مہاواکیہ بھی سچا۔ شری بھگوتی بھی سچی۔ مگر ہم سچے دل سے کہہ نہیں سکتے۔ میرا جواب یہ ہے کہ جب آپ بچے کو پہلی دفعہ پہاڑے سکھاتے ہیں تو کیا وہ سچے دل سے کہتا ہے 'دو دونی چار'؟ ہرگز نہیں۔ وہ تو صرف استاد پر اعتبار کر کے طوطے کی طرح جھوٹا موٹا اس کی نقل اتارتا ہے اسی طرح آپ بھی شری بھگوتی کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ مطالعہ اور ست سنگ کو جاری رکھیں۔ تھوڑے عرصے میں سچائی آپ کے ہردے میں اتر جائے گی اور آپ ایسا ہی محسوس کریں گے۔"

(مہاواکیہ برہم کے خزانے کی کنجی ہے)

ویدانت کے نظریات سے اس قدر قریب ہونے پر، آپ پاکستان کے نئے ذہن پر تعجب نہ کیجئے۔ اس لئے کہ ابھی ایسے بے شمار حوالے اور بھی موجود ہیں۔ پاکستان کا نیا دانش ور اب اپنے حکمرانوں کے دئے ہوئے فریب سے نکل چکا ہے، اور ذہنی طور پر وہ اتنا ہی ہندوستانی بن چکا ہے، جتنا کہ ڈسکوری آف انڈیا کا مصنف۔

اب ذرا موسیقی کے متعلق جدید پاکستانی تعلیمات کے نظریات پر بھی نگاہ ڈال لیجئے۔ یہ اقتباس افضل پرویز کے مضمون 'برہما اور سنگیت سنگھاسن' سے ماخوذ کیا جا رہا ہے، جو 'فنون' لاہور میں شائع ہوا ہے۔

"بھیرویں جو سدا سہاگن راگنی کہلاتی ہے، سنگیت کا چڑھتا ٹھاٹھ ہے۔ اس کے نیچے سے اوپر جانے والے سُروں یعنی 'آروہی' اور اوپر سے نیچے آنے والے سُروں یعنی 'امروہی' میں رکھب، گندھار، دھیوت اور نکھاد اترے یعنی مدھم سُر ہیں۔ باقی سب شُدھ سُر ہیں۔

سنگیت سنگھاسن کے اس مقام پر براجمان بھیرویں راگنی دراصل اسی برہما کی دین ہے، جو زمانۂ قبل از تاریخ کا وحشی انسان ہے۔ ہم برِ صغیر کے تمام علاقوں کے لوک گیتوں میں بھیرویں کی دُھن اس فیاضی سے رچی ہوئی دیکھتے ہیں کہ اس دیوی کو بے ساختہ پرنام کرنا پڑتا ہے۔"

تہذیبی تعلق اور قدیم ہندوستان سے وابستگی کے سلسلے میں سب سے اہم کام ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا ہے۔ موصوف کی حال ہی میں ایک طویل کتاب 'اردو شاعری کا مزاج' شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں آریوں کی آمد سے پہلے کے ہندوستان سے لے کر ۱۹۴۷ اور اس کے بعد تک کی تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو شاعری اور ادب کا رشتہ آریائی تہذیب سے جوڑا ہے۔ غزل کے متعلق ان کی ریسرچ یہ ہے کہ یہ صنف خالص فارسی سے اردو میں نہیں آئی بلکہ ہندی گیتوں سے اس کا تعلق ہے۔ غزل کے جذبات کا رشتہ زمین سے ہے۔ غزل کا مزاج دراصل دھرتی پُوجا کا مزاج ہے۔ اس کتاب پر پاکستان کے رجعت پسندانہ اور قدامت پسندانہ لوگوں نے تو بہت ناک بھوں چڑھائی، لیکن جدید دانش وروں نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم غیر فطری بنیادوں پر ہوئی ہے۔ جو پنجاب تقسیم ہوا، وہ سرسکندر حیات کا پنجاب نہیں، بلکہ ہیروارث شاہ کا پنجاب ہے۔ جو بنگال ٹکڑے ٹکڑے ہوا، وہ بی سی رائے کا بنگال نہیں، ٹیگور، سرت چندر چٹرجی اور قاضی نذرالاسلام کا بنگال ہے۔ زمین کے کسی خطے پر سرحد کے نشان لگا کر زمین کو تقسیم کرنا آسان ہے، لیکن انسانیت اور انسانیت کی روح یعنی تہذیب کو تقسیم کرنا آسان نہیں ہے۔

اگر پاکستان کے جدید دانش وروں نے تہذیبی تعلق کی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں، تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے بہت سے مسائل خود بخود فطری طور پر حل ہو جائیں گے۔ اس وقت نہ معاہدہ تاشقند کی ضرورت ہوگی، اور نہ غیر ملکی مصالحت کرانے والوں کی۔ ایک تہذیب کے پروردہ، ایک نسل، ایک روایت، ایک زمین اور ایک ہی ماضی کے آغوش میں پلنے والے انسان شیر و شکر ہوجائیں گے۔

یہاں ایک افسوس ناک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے اپنے ادب اور کتب و رسائل کی آمد و رفت پر ایسی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، جس سے نہ صرف پاکستانی عوام کو، بلکہ خود ہمیں بھی ایک طرح نقصان پہنچ رہا ہے، اور ہم پاکستان کی جدید نسل کے دانش وروں کے خیالات سے بے خبر، ریڈیو اور دیگر پبلسٹی کے ذرائع پر اپنا سرمایہ غلط طریقے سے ضائع کر رہے ہیں ●

علمیت

جارج برنارڈ شا ایک دعوت میں گئے۔ وہاں اپنے کو بہت قابل سمجھنے والے ایک آدمی نے اُن کا کافی وقت برباد کردیا۔ برنارڈ شا بولے "معلوم ہوتا ہے پوری کائنات کا علم ہم دونوں کے پاس ہی سمٹ آیا ہے"۔ خوش ہوتے ہوئے وہ آدمی بولا "یہ کیسے؟"
برنارڈ شا نے برجستہ کہا "آپ کو یہ گمان ہے کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں جب کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کیا ہیں۔"

گاؤں کی شہزادیاں

دوش پر گاگر لئے آتی ہیں جب پنہاریاں
پھر سپہرے کتنا حسیں ہوتا ہے پنگھٹ کا سماں

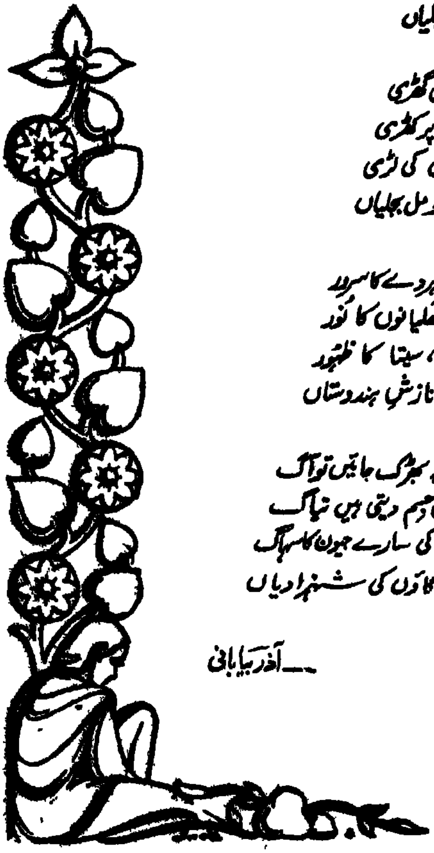
مسکراتی جھیل سی آنکھوں میں مستی کی چبھن
ترشے ترشے سے لبوں پر صبح کی پہلی کرن
صندلی بانہوں کو چھولے جھک کے یہ نیلا گگن
عنبریں زلفوں سے کرتی ہے ہوا اٹھکھیلیاں

گونجتے ہیں کنواری اہلاؤں کے نغمے جس گھڑی
ٹکتی ہے سنگیت کی دیوی منڈیروں پر کھڑی
نرم ماتھے پر دمکتی ہے ستاروں کی لڑی
دھیان کی لہروں میں گھل جاتی ہیں کومل بجلیاں

گاؤں کی شہزادیاں، کھیتوں کے ہرے کا سرور
آنگنوں کی جوت، گھر کی آن، کھلیانوں کا نور
جیسے رادھا کا منوہر روپ، سیتا کا ظہور
گاؤں کیا ہے ان کی ہستی نازشِ ہندوستاں

یہ اگر چپ ہیں تو شبنم، یہ بھڑک جائیں تو آگ
وقت پر یہ اپنے کومل جسم دیتی ہیں تیاگ
مانگ کی بندیا ہے ان کی سارے جیون کا سہاگ
کتنی اونچی ہیں ہمارے گاؤں کی شہزادیاں

—— آذر بیابانی



کسی مصیبت میں مبتلا تھی۔ ابھی کل شام کو تو وہ اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ابھی دو گھنٹوں میں اُس کی یہ حالت کیسے ہو گئی تھی!

"شری..." ہکا بکا سا مدھو صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ اُس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ہاں" شری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔



دو کناروں کے بیچ

حیران تھا کہ اتنی رات گئے کون کواڑ کھٹکھٹا رہا ہے۔ "کون ہے؟" اُس نے جھنجھلا کر کہا۔

باہر سے کوئی جواب نہیں آیا، بس دوبارہ کواڑ کی کنڈی بج اٹھی۔ مدھو بڑبڑاتا ہوا اٹھا بتی جلائی اور کواڑ کھول دیئے۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سامنے شری دیوی کھڑی تھی، اس نے آنکھیں ملیں اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا، سامنے شری دیوی ہی تھی۔

وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑی رہی جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ پھر اس میں کچھ حرکت ہوئی اور ایک گہری سانس فضا میں پھیل گئی۔ مدھو نے غور سے دیکھا، اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، آنکھیں لال تھیں، اور بال پریشان تھے۔

مدھو کو محسوس ہوا کہ وہ متفکر تھی اور

"کیا بات ہے؟ آؤ اندر آؤ!" اتنی دیر تک اُسے خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اس وقت اگر کوئی دونوں کو یہاں دیکھ لے تو کیا ہو؟

شری دیوی جھجکتی ہوئی کمرے کے اندر آ گئی۔ اس کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ اُس کی پریشانی کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے مدھو کے دماغ میں کئی باتیں ایک ساتھ گھوم گئیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس لڑکی سے اسے شادی کرنی پڑے گی جو رات کو اس کے کمرے میں اچانک آ گئی تھی۔

اس نے کواڑ بند کر لئے اور اس سے پاؤں کے نیچے دری پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"شری اب کہو کیا بات ہے!"

شری نے ساری کے پلو سے آنسو پونچھیں۔ وہ اب بھی چپ چاپ تھی

گھور رہے تھے جیسے جل رہی تھی۔

مدھو نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے "لو پانی پیو۔ معلوم ہوتا ہے بہت تھک گئی ہو؟"

شری نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا اور مدھو کی طرف زخمی ہرنی کی طرح یوں دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ کیا اس مصیبت میں تم میری مدد نہیں کرو گے؟

"شری، مجھے اپنا دکھ نہیں بتاؤگی؟"

شری کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی "مدھو ... میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ ..." اور جملہ پورا کئے بغیر وہ اس کی طرف



ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔

"جھجک کیوں رہی ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے کہ میں تمہارا دکھ بانٹ سکوں گا؟"

"جانتی ہوں مدھو۔ مگر یہ بتاؤ کیا تم مجھ سے حقیقی محبت کرتے ہو؟"

"ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" مدھو نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

"پہلے تو تم نے کبھی ایسی خواہش ظاہر نہیں کی۔"

"میں نے آج ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔"

خوشی سے جھوم اٹھا "میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ برسوں پرانی میری آرزو آج پوری ہوئی ہے۔ کہیں تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

کہانی • وینکٹ راؤ

"کیا میں نے کبھی تم سے اس طرح مذاق بھی کیا ہے؟ لیکن ..."

"ہاں ہاں کہتی جاؤ۔"

"کیا تم سچ مچ مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟"

"پھر تو لکھ کر دے دوں؟"

"نہیں مدھو، ایسا تم دل رکھنے کے لئے کہہ رہے ہو۔ تم اس وقت زیادہ جذباتی ہو رہے ہو۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"مجھے پورا بھروسہ ہے تم پر مدھو! لیکن آدمی بھی چلے ہوتے ہیں اس لئے میں کچھ کہنے سے گھبرا رہی ہوں۔"

"اچھا بتاؤ تمہیں مجھ پر اعتبار کیوں نہیں ہے؟"

"کیا تم مجھے معاف کر دو گے؟"

شری کے لہجے کی بے بسی مدھو سمجھ نہ سکا۔ "کس بات کے لئے معافی دے دوں؟ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ جب سے آئی ہو بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔"

"کیا تم مجھے معاف کر دو گے؟"

"میں اس قابل نہیں ہوں۔"

"تم مجھے معاف کر سکتے ہو مدھو۔ میں تمہیں حق دیتی ہوں۔ جب ہم شادی کر رہے ہیں تو یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ مستقبل میں ہم لوگوں میں کشیدگی پیدا نہ ہو۔ کیا اب بھی معاف نہیں کرو گے؟"

مدھو مسکرا دیا "تمہارے اصرار کو کیسے ٹال سکتا ہوں؟"

"کیا اس حالت میں بھی تم مجھے معاف کر دو گے اگر میرا قصور بہت بڑا ہو؟"

"ہاں"

"تو اپنا دُکھڑا سناؤں؟"

"ہاں ہاں کہے جاؤ۔"

"اور اگر میرے باپ کی کہانی سُننے کے بعد تمہارا سن بدل گیا؟"

"کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے؟"

شری کے چہرے پر درد اُبھر آیا جیسے زخم ابھرتے وقت درد پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس نے گہری نظروں سے مدھو کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ہر طرح کی بات سننے کو تیار ہے۔ شری نے زمین پر نظریں گاڑ دیں اور اس کے ہونٹ پھڑپھڑا اُٹھے۔

"مدھو ہری بھی میرے اتنا ہی قریب ہے جتنے کہ تم۔ جب کبھی بھی تم دونوں ایک ساتھ ہمارے گھر میں آتے تو وقت گزر جانے کا پتہ بھی نہ چلتا۔ پچھلے چار ماہ سے ہری مجھے اکیلے ہی ملتا رہا ہے۔ مجھے کبھی بھی نہ تو اس پر شک ہی ہوا اور نہ ہی اس طرح اس کے آنے میں مجھے کوئی برائی نظر آئی۔

"ایک دن وہ رات کے نو بجے میرے پاس آیا اور بولا 'آؤ سنیما دیکھنے چلیں!' اُس نے یہ بھی بتایا کہ تم دردِ سر کی وجہ سے نہ آسکے۔ مجھے اُس کی بات پر یقین آ گیا اور ہم دونوں سنیما دیکھنے چلے گئے۔ تانگہ جب سڑک چھوڑ کر سمندر کی طرف چلا تو میں نے پوچھا "کیا ہم سنیما دیکھنے نہیں جا رہے؟"

"ہری مسکرایا 'پکچر شروع ہونے میں ابھی کافی دیر ہے۔ آؤ کچھ دیر یہاں گھومیں پھریں۔'

میں کچھ نہ بولی۔

"ہم لوگ سمندر کے کنارے ریت پر بیٹھ گئے۔ پام کے پیڑوں میں اُلجھا چاند جھلملا رہا تھا۔ چاندنی میں سمندر کے سینے پر اٹھلاتی سفید لہریں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا بدن میں گدگدیاں کرتی چلی جاتی ہم دونوں قدرت کے ان مناظر میں کھوئے ہوئے تھے۔

"اچانک ہری نے چہرہ اُوپر اُٹھایا اور سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں پھر مسکرا دیا۔ اس کی وہ مسکراہٹ معمولی نہ ہو کر بہت معنی خیز تھی۔ اس میں وہ باتیں پوشیدہ تھیں جنہیں الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ ہلے' چاندنی نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔

"مجھے ہنسی آ گئی لیکن میں چپ رہی۔

"اس نے کہا "اس طرح جدائی برداشت کرنے سے کیا حاصل؟" اُس نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔

"میرا دل زور زور سے دھڑک اُٹھا اس کی آنکھوں میں بھوک تھی، نشہ تھا دعوت تھی۔ چاروں طرف کے پُرسکون ماحول میں چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جسم میں ایک نشہ سا جاگنے لگا۔ ایک گرم لہر میری رگوں میں دوڑنے لگا۔ اور مجھ پر بےخودی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"ہری نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ سر سے پاؤں تک لرز اٹھی۔ سارے بدن میں جیسے سا گھل گیا۔ اس نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا وہ میرے جذبات سے واقف ہے۔

"میں نے ہمت کر کے کہا: 'میں نے ...

[illegible] ہے [illegible] تم نے پانی تو نہیں رکھی ہے؟"

لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔ میں نے اُس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن میرے بدن میں پیدا ہونے والے اشتعال نے مجھے اندھا بنا دیا اور میں اپنی خواہش کے خلاف اس طوفان میں بہتی چلی گئی۔ رات بھر ہم وہیں پڑے رہے۔ صبح اس نے مجھے تانگے پر بٹھا کر گھر پہنچا دیا۔"

شری رُک گئی۔ اس کا گلا بھر آیا تھا۔ اور وہ رو رہی تھی۔

مدھو مسکرا دیا "تمھاری کہانی ختم ہو گئی یا باقی ہے؟"

شری کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اُس تمام کہانی کا مدھو پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولی "کہانی ابھی باقی ہے مدھو! اُس دن کے بعد ہری اس طرح بدل گیا جیسے ہم دونوں اجنبی ہیں۔ شاید مجھ سے تعلقات بڑھانے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوں کہ میں کیسے اُس لمحے اپنی کمزوری کا شکار ہو گئی۔

"اس بات کو تین مہینے ہو چکے ہیں۔ تب سے یہ پاپ کی گٹھڑی" اس کا گلا رُندھ گیا اور وہ سسک اٹھی۔

اُس کو دلاسہ دیتا ہوا مدھو بولا "روتی کیوں ہو شری؟"

"مدھو! کاش، مجھے اُس کی نیت کے بارے میں پہلے ہی پتہ چل جاتا۔ میں نے اس کی بہت خوشامد کی۔ میں اُس کے آگے روتی گڑگڑائی کہ مجھ سے شادی کر لے لیکن وہ صاف انکار کر گیا۔ میں نے اُس کی نشانی کے بارے میں بتایا تو بولا ــــ 'میں کوئی دوا دے دوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔' وہی آدمی جو میری [illegible] کا باعث بنا، اب مجھے پہچان نہیں رہا تھا



مدھو کے چہرے پر اطمینان کی جھلک تھی اور وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا

غصے اور نفرت سے مدھو کی آنکھیں سکڑ گئیں "جب ہی تو یہ مجھ سے معاف کرنے کا بار بار وعدہ لے رہی تھی" اس نے سوچا، "آخر وہ ایک ایسی عورت کو کیسے معاف کر سکتا ہے جس کی عصمت لُٹ چکی ہو۔ لیکن شری نے تو اُس پر بھروسہ کر کے اسے اپنی تمام کہانی سنائی تھی۔ تو کیا وہ اُسے دھتکار دے، جسے اب کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہو گا؟"

"میں ان باتوں کی پردہ پوشی کر کے تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ آخر تمہاری شریکِ حیات بننے کے بعد میں ہری کے بچے کو کیسے پیار کر سکتی ہوں۔ اس لئے میں نے سب باتیں تم پر آشکار کر دیں۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گے!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مدھو کے لئے آزمائش کی یہ سخت گھڑی تھی۔ وہ لمحے جب اُس نے شری کو چاہا تھا، وہ وعدے

جو اُس نے شری سے کہے تھے، وہ قسمیں جو اُس نے شری کے آگے کھائی تھیں، لیکن اُس کا واسطہ دے کے گڑگڑائی تھیں۔ اُس کے دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

اچانک وہ تن کر بیٹھ گیا۔ کشمکش ختم ہو چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر سکون و اطمینان جھلک آیا تھا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

"شری، پاگل تو نہیں ہو گئی ہو" وہ مسکرایا۔ "اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے؟ کیا میں اپنا فیصلہ تمہیں سناؤں؟"

شری نے اپنا پیلا چہرہ اُوپر اٹھایا اور سراسیمہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے بکرا قصائی کی طرف دیکھتا ہے۔

"میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔"

شری آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے گھورنے لگی۔ اُسے مدھو کے الفاظ اور اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی۔

"ہاں شری، میں تم سے شادی کروں گا کیوں کہ اس دنیا میں کوئی بھی پارسا نہیں ہے۔ ہر آدمی گناہ گار ہے۔ کچھ اپنا دُکھ دل میں چھپا لیتے ہیں۔ وہ دوسروں سے اپنا دُکھ نہیں کہتے، اور خوش رہنے کا سوانگ رچتے ہیں۔ لیکن تم نے اپنے گناہوں کو سنا کر ازالہ کر لیا۔ تم نے مجھ پر یقین کیا اور اسی بھروسے پر یہاں تک آ گئیں۔ تم سے زیادہ محبوب مجھے اور کون ہو سکتا ہے جو مجھ پر اتنا بھروسہ رکھتا ہو۔"

"کیا یہ سچ ہے مدھو؟"

"ہاں، میں اپنا فیصلہ تمہیں سنا چکا ہوں۔ دنیا جن باتوں کو گناہ سمجھتی ہے میری نظر میں وہ گناہ نہیں ہیں۔ معافی کی اہمیت بھی اُسی وقت ہے جب ہم کسی کے عیبوں سے واقف ہو جائیں۔ آج سے تم میری بیوی ہو اور میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا ہوں کیوں کہ تم نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے۔"

"لیکن اُس بچے کا کیا ہو گا جو میرے پیٹ میں ہے؟"

"وہ میرا بیٹا ہو گا۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں تو تمہارے بدن کا ہر عضو مجھے پیارا ہے۔ میں زندگی بھر کبھی یہ محسوس ہی نہ کروں گا کہ کبھی یہ باتیں تمہارے ساتھ واقع ہوئی تھیں۔"

شری پھر رونے لگی۔

مدھو نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "اب کیوں رو رہی ہو تم؟"

"مدھو یہ غم کے نہیں خوشی کے آنسو ہیں۔ اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کون میرا شوہر بن سکتا ہے۔" شری بولی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں اب تک فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ دونوں میں سے کس سے شادی کروں؟ لیکن آج فیصلہ ہو گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

شری نے کہنا شروع کیا "میں نے ہری کو بھی تمہاری طرح اپنی دکھ بھری کہانی سنائی تھی اس میں فرق صرف اتنا تھا کہ کہانی میں ہیرو تم تھے۔ لیکن اس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ لوگوں میں سماج سدھار کی تقریریں ہی کر سکتا ہے مگر پورا فریبی ہے۔ اس کے برعکس ایک تم ہو جو اس آزمائش میں کامیاب ہو گئے۔"

"شری، مجھے افسوس ہے کہ میرے لئے تمہیں اتنا بڑا سوانگ رچنا پڑا" مدھو نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا نہ کرتی تو تمہیں کیسے حاصل کرتی، اب میں مطمئن ہوں اور تمہارے ساتھ زندگی گزار سکتی ہوں۔" شری نے اپنا سر مدھو کے سینے پر ٹکا دیا۔



جے کسان

ستیش ودبے

مجھے بہت خوشی ہوئی جب ایک زراعتی ملک کے مہذب لوگوں نے ستر برس کے بعد مجھے یاد کیا اور 'جے کسان' کے نعروں سے میری عزت افزائی کی۔ گویا جسے صدیوں سے غیر مہذب کہہ کر مذاق اڑایا جاتا رہا، اسی کی عزت افزائی کی جانے لگی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک کسان کی نفسیات کو پہچاننے والا آدمی اگر وزیر اعظم نہ ہوتا تو یہ دقتی بگل شاید ہی بجتا۔

خیر، پھر بھی مجھے فخر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں تو مجھے اپنا سمجھا جا رہا ہے۔ لیکن اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ نعرے کھوکھلے، جھوٹے اور مجھے بہلانے کے لئے لگائے جاتے ہیں آج کلکٹر سے لے کر شہر کا ایک ادنٰی شہری بھی مجھے غیر مہذب، گنوار اور اجڈ سمجھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے کام کاج کے مقابلے میں ہم کمتر ہوں — کمتر اس لئے کہ ہمارے کپڑے گندے ہوتے ہیں، ہماری باتوں میں خوشامد کی چاشنی نہیں رہتی۔ اور نہ ہی ہم خود ساختہ مہذب لوگوں کی طرح زندگی گزار پاتے ہیں۔ آپ کا بچہ کانوینٹ، یا کنڈر گارٹن میں پڑھنے جاتا ہے لیکن میرا بچہ کچی مٹی کے بنے گاؤں کے ایک چھوٹے سکول میں جاتا ہے۔ سکول کے وقت کے علاوہ وہ کھیتوں کھلیانوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ گیہوں دوسروں کے لئے بچا کر خود جوار یا مکا کی روٹیاں کھاتا ہے۔ پاپا ممی کے ساتھ وہ سیر سپاٹے، پکچر یا پکنک کے لئے نہیں جاتا، وہ تو گرمی، سردی اور برسات میں قدرت کی ستم ظریفیوں سے ٹکر لیتا ہے۔

ہم لوگوں کی یہی خواہش رہتی ہے کہ فصل اچھی ہو، ملک کے لوگ بھوکوں نہ مرنے پائیں۔ میرے بچے کی تیز عقلی دیکھ کر اس

نعرے باز ملک کا کہیں یہ بھی تو ایک نعرہ نہیں!

کے ماسٹر صاحب نے مجھ سے کہا تھا
کہ میں اسے اچھی طرح پڑھاؤں تو وہ کلکٹر بن
سکتا ہے۔ میں نے سوچا اکیلا لڑکا اگر خاندانی کام
چھوڑ کر شہر چلا گیا تو مرتے وقت دادا کی طرح
میں کس سے وعدہ لوں گا کہ بیٹا، قسم کھاؤ
کہ تم زمین نہ ساجھے پر دو گے نہ بیچو گے،
بلکہ خود کھیتی کر کے ملک کے تئیں اپنا فرض
انجام دو گے۔ میں نے اسے زیادہ پڑھانے
کا خیال ترک کر دیا ہے، لیکن میں اکثر سوچتا
ہوں کہ وہ بھی اب شہر والوں کی نظر میں
صرف پگڑی والا اجڈ کسان رہ جائے گا۔
افسوس مجھے اسی بات کا ہے کہ میرے
اور میرے دوسرے بھائیوں کی نفسیات
کو سمجھنے والا اور ان کا احترام کرنے والا
ملک میں کوئی نہیں ہے۔ غلط راستے بتانے
والے بہت سے ہیں لیکن ٹھیک راستے
پر لانے والا کوئی نہیں۔ آج ہر آدمی ہمیں
خوب بے وقوف بنا کر اپنا مطلب سیدھا
کرتا ہے۔ پنچائت کے الیکشن میں سیاسی
پارٹیوں کی مداخلت اور غلط رہ نمائی کی وجہ
سے ہمارے گاؤں کا ماحول زہریلا بن گیا ہے۔ گٹ
بندی کی جڑیں مضبوط ہو جانے کی وجہ
سے لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن
بنے بیٹھے ہیں۔ یک جہتی کا جذبہ ختم ہو گیا
ہے۔ گاؤں کی پنچائت کے سبھی پنچ مجھ جیسے
ہی انگوٹھا ٹیک ہیں، جنھیں پنچائت کے قانون
کالی بھینس کی طرح لگتے ہیں۔ وہ فیصلے بھی آپسی
تعلقات کو مد نظر رکھ کر دیتے ہیں۔

سیوکوں، انسپکٹروں، ڈاکٹروں وغیرہ
گرام نہ جانے کن کن لوگوں کی خدمات
سے ہماری مشکلات حل کرنے کا ڈرامہ
بہت دفعہ کھیلا گیا، لیکن یہ سب لوگ
ہمارے لئے کارگر ثابت نہیں ہوئے۔ ہم

اگر انجن، بیج یا کھیتی سے متعلق دوسرا سامان
خریدنے کے لئے حکومت سے قرض دلانے
کے واسطے ان سے گذارش کرتے ہیں، تو
یہ حضرت آدھی رقم خود ہضم کر جاتے ہیں۔
ان کا کہنا ہے — آج کل کسی کو لئے دیئے
بغیر کام نہیں چلتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا
کریں۔ شکایت کرنے جاتے ہیں تو انصاف
کرانے کے نام پر بقایا دولت دوسرے
لوگ ہتھیا لیتے ہیں۔

شہروں کی عدالتیں تو ہمارے لئے بوچڑ خانے
ہیں۔ ایک بار میں نے زمین خریدی
تھی، اس کی رجسٹری کرانے کے بعد نقل لینے
میں مجھے نہ جانے کتنے دن لگ گئے۔ روزانہ
بابو صاحب ڈانٹ پلا کر بھگا دیتے۔ میں ان
سے کہتا بھی تو کیا! ان کی چمک دار پتلون
قمیص اور کالا چشمہ دیکھ کر ہی مجھے ڈر لگتا
تھا۔ آٹھویں دن ایک چپراسی مل گیا۔ مجھ سے کہنے
لگا "چل، دس روپے دو، تمہارا کام کرا دیتا
ہوں" یہ آدمی بھلا لگا۔ دس کا نوٹ اس
کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ مجھے ایک کمرے
میں لے گیا اور ایک بابو جی کی طرف اشارہ
کر کے بولا — ان سے جا کر لے لو۔ بابو صاحب
نے آدھ گھنٹہ بعد میری طرف دیکھا اور بہت
بری طرح ڈانٹ کر باہر نکال دیا۔ باہر آ کر
دیکھا تو چپراسی بھی غائب۔ چپ چاپ اپنی
قسمت کو کوستا ہوا وہیں سر پر ہاتھ رکھ کر
بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ بابو جی باہر نکلے،
بڑے خلوص سے باتیں کیں۔ چا-

پینے چلنے کو کہا۔ اُنھوں نے ناشتہ کیا، چائے پی۔ پیسے میں نے چکائے اس درمیان ہوٹل میں آئے بابو صاحب کے دوست انھیں کہتے رہے "کیوں، آج بڑا مُرغا پھنسا ہے!" اس پاس کوئی نہ تھا۔ میں ہی اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ سمجھ گیا کہ شہر میں دوسروں کو کھلانے پلانے والے کو مُرغا کہتے ہوں گے۔

ہوٹل سے باہر نکلا تو بابو صاحب بولے "نقل کے پندرہ روپے دینے پڑیں گے۔ میرے پاس تو ہے نہیں۔ دوسرے بابو کے پاس ہے اور وہ بغیر کچھ لئے دئے نقل نہیں دیتا۔ نہیں تو پھر آٹھ دن بعد آنا"

میں نے سوچا، کھیتی کا کام چھوڑ کر کہاں بار بار آتا پھروں گا، انھیں پندرہ روپے دئے۔ وہ مجھے آفس میں لے گئے اور اس کی میز پر ہی نقل دے کر کہا "جلدی سے باہر چلے جاؤ" میں نے اُن کی طرف دیکھا اور چُپ چاپ چلا آیا۔

لوگوں کے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے ہم بہت کچھ کیا جاتا رہا ہے۔ مگر میری نظر میں یہ سب دِکھاوا ہے۔ میرے ہی گاؤں کے سکول کا ایک ماسٹر دو سال تک گھر بیٹھے تنخواہ لیتا رہا۔ وہ ایک دن بھی سکول نہیں گیا۔ مگر بچوں کی حاضری برابر لگاتی۔ اس وقت ہمارے سکول میں تیسرے درجے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ پانچویں تک کا سکول کر دینے کا لالچ کئی صاحبان نے دیا لیکن اُن کی کوشش چندے کی رقم ڈکار دینے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔

سرکار ہم کسانوں سے وصولی بھی کتنی سختی سے کرتی ہے۔ گالی گلوچ تو اکثر سُننے کو مِل جاتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں جو بھی ملازم آتا ہے ہمارا محافظ بن کر آتا ہے۔ تحصیل دار صاحب کا چپراسی تک ہم سے ٹھیک برتاؤ نہیں کرتا۔ ابھی ابھی ہم لوگوں سے "لیوی" کی شکل میں اناج لیا گیا۔ قدرت نے ساتھ نہیں دیا، یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن کلکٹر صاحب اور اُن کے کارندوں نے جو ظلم اور زبردستی کی، وہ ہمارا ہی دِل جانتا ہے۔ گاؤں کے مہاجن سے قرض لے کر اُونچے دام میں اناج خرید، نیچے دام میں سرکار کو بیچا۔ ہم لوگوں میں اِتنی بحث کی طاقت کہاں کہ ہم اُن لوگوں سے آنکھ مِلا کر بات کریں۔

اس تاناشاہی سے تو ہم بہت پریشان ہو گئے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ جاگیرداروں کے راج میں ہی زیادہ سُکھی تھے۔ آج کل کے افسر تو ہم سے ہی کھاتے ہیں۔ اور ہمیں ہی مارتے ہیں۔ ایک بار ایک انسپکٹر کو خوش کرنے کے لئے اُن کے گھر دس کلو دال اس کی عدم موجودگی میں رکھ آیا تھا۔ کچھ دن بعد جب اُس کے درشن ہوئے تو مجھے دیکھتے ہی وہ اُبل پڑا "کیا سمجھتے ہو مجھے، کیا میں رشوت خور ہوں؟ دال کیا سمجھ کر میرے گھر رکھ گئے تھے؟"

نہ جانے کیا سوجھی، میں نے کہا "حضور، دال آپ کے لئے نہیں میرے

گھر کے لئے تھی۔ اسی شہر کے بازار سے خریدی تھی۔ اچانک اپنے خسر صاحب کی بیماری کی خبر سن کر یہیں سے گاؤں چلا گیا تھا۔ اب لوٹا ہوں۔ دال کا بورا لینے ہی آپ کے یہاں آیا ہوں۔"

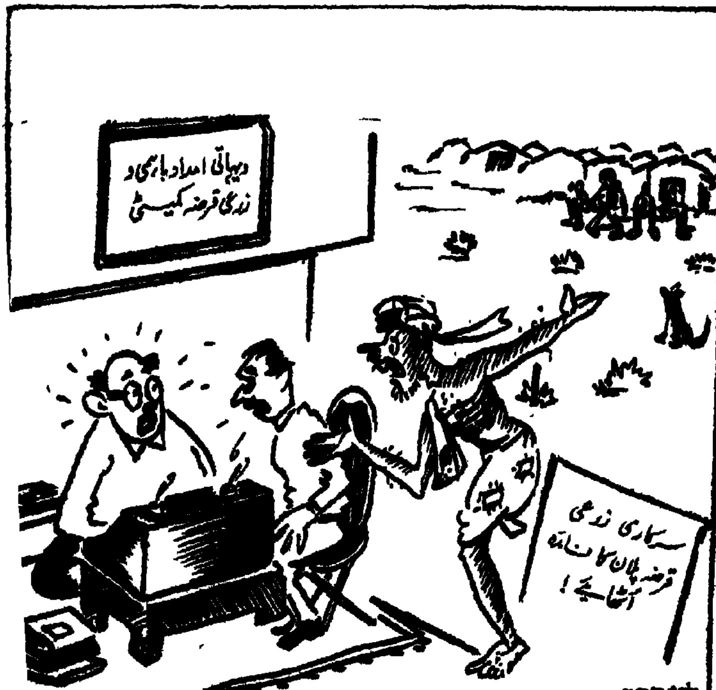
میری بات سن کر ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ منہ لٹکا کر بولے "ارے بھئی، وہ دال تو ہم نے استعمال کر لی۔"

"تو پیسے دے دیجئے۔"

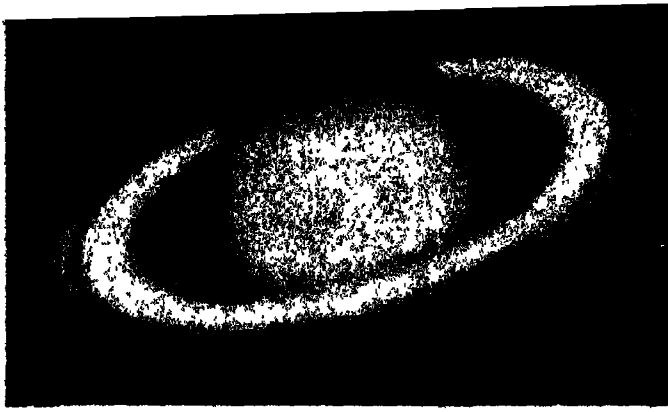
"ابھی تو پیسے بھی نہیں ہیں، مگر کیا پٹیل صاحب، آپ دس کلو دال بھی بچوں کے لئے نہیں دے سکتے؟"

"دس کیا میں کلو دے سکتا ہوں مگر آپ ہمارا مال بھی کھاتے ہیں اور ہمیں دھوبی کا کتا بھی بناتے ہیں۔ یہ کہاں کی انسانیت ہے؟

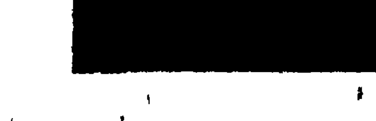
"جے کسان" کے نعرے لگانے والو میری درج بالا تصویریں کیا آپ نے دھیان سے کبھی دیکھی ہیں؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے گویا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ملک کی حفاظت کے لئے قدرت کی گود میں پالے پوسے اپنے جوانوں کو ملک کے لئے قربان کر رہا ہوں۔ نعرے لگانے کے علاوہ آپ میرے لئے کیا کر رہے ہیں؟ ●



بابو جی۔۔ مجھے جلدی سے کچھ قرضہ دیجئے۔ ساہوکار لوگ اس طرف میں (کر اب ہم سے اپنی ساری رقم فوراً واپس مانگ رہے ہیں)!



دوسرے سیّاروں پر زندگی



نظامِ شمسی میں زمین کے علاوہ صرف دو ہمارے اور ایسے سیارے ہیں، جن پر زندگی کے کچھ آثار ہو سکتے ہیں یہ دو سیارے ہیں، مریخ اور زہرہ مریخ زمین کے ایک طرف سورج سے زیادہ فاصلے پر واقع ہے اور زہرہ زمین اور سورج کے بیچ میں واقع ہے۔

سورج سے ان تینوں سیاروں کے فاصلے اس علاقے میں پڑتے ہیں جسے سورج کا سنہری علاقہ کہا جاتا ہے، یعنی اس خطے میں گھومنے والے سیاروں پر سورج کی روشنی اور گرمی اس مطلوبہ تعداد میں رہتی ہیں جو زندگی کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ دور کے یا زیادہ قریب کے سیاروں پر بتدریج گرمی یا سردی اتنی زیادہ ہوگی کہ زندگی کو جس روپ میں ہم جانتے ہیں، اس کی وہاں نشوونما ہونا بالکل ناممکن ہے۔

زہرہ اور سورج کے بیچ ایک سیارہ عطارد ہے یہ سورج کے سب سے قریب تقریباً .... میل پر واقع ہے۔ اس کا ایک ہی رُخ ہمیشہ سورج کی طرف رہتا ہے اور یہ حصہ سورج کے بہت زیادہ نزدیک رہنے کی وجہ سے اتنا زیادہ گرم ہو جاتا ہے کہ اُسے ایک دہکتا ہوا انگارہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اس کے دوسرے حصے پر بے حد سردی رہتی ہے۔ اس سیارے کا کوئی کرۂ ہوائی بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس سیارے پر ہمارے جدید سائنسی نظریے کے مطابق زندگی کے کچھ بھی آثار نہیں ہو سکتے.

زُہرہ ہماری زمین کے برابر ہی بڑا ہے. لیکن اس پر ہمیشہ سفید بادلوں کی ایک گہری تہہ چڑھی رہتی ہے۔ زُہرہ کے اس دبیز کرۂ ہوائی میں زندگی کے لئے مطلوبہ آکسیجن گیس اکثر نہ ہونے کے برابر ہے اور پانی ہونے کے آثار بھی بہت معمولی ہیں۔ اس لئے زُہرہ

شاید ریت اور مٹی سے بھرا ایک عظیم ریگستان ہے اور وہاں پر نباتات ہونے کی امید بھی بہت کم ہے۔

لیکن نئے تجربات و مشاہدات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ زہرہ کے بارے میں یہ تمام معلومات صرف اس کی اوپری تہہ تک ہی محدود ہیں یعنی یہ ممکن ہے کہ اس گہری تہہ کے نیچے ہوا، پانی اور حرارت وغیرہ سب کچھ ہو، جو اوپری تہہ پر ۶۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ پایا گیا ہے اور زندگی کے لئے موافق ہے۔ اس لئے اس بارے میں اس وقت تک یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ کوئی راکٹ زہرہ کی اوپری تہہ کو پار کرکے اس کی ٹھوس سطح پر پہنچ کر وہاں کے حالات کی اطلاع نہ دے۔

مریخ پر ضرور کچھ آکسیجن اور تھوڑا پانی ہونے کے آثار ہیں۔ زمین کی طرح مریخ کے دونوں قطب بھی برف سے ڈھکے رہتے ہیں، اگرچہ مریخ کے قطبوں پر یہ برف زمین کی نسبت کم ہے اور ان کا پھیلاؤ بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہ چیز تبدیلیٔ موسم کا واضح اشارہ ہے، اس لئے مریخ پر ہماری زمین کی طرح موسم بدلتے ہیں۔ علاوہ بریں اس کی سطح پر مختلف رنگوں کے دھبوں میں جو کمی بیشی ہوتی ہے، اس سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ یہ موسموں کی تبدیلی کے ساتھ نباتات کے پھیلنے و سکڑنے کی وجہ سے ہے۔ اس طرح سبھی باتیں مریخ سیارے پر کم از کم کسی طرح کی نباتات کے ہونے کی دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ زندگی کے اور کیا روپ مریخ پر پائے جا سکتے ہیں اس ضمن میں یقینی طور پر کچھ بھی کہنا ممکن نہیں ہے۔ سائنسی کہانیوں میں، مریخ کے باشندوں کے متعلق بہت طومار باندھے گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سیارے پر کسی بھی قسم کے سب جان داروں کا وجود اگر ناممکن نہیں تو انسان جیسے ذی ہوش جان داروں کی گنجائش ہی کیا!

مریخ سے آگے کے سیاروں میں عظیم مشتری، زحل اور نیپچون، یورینس، پلوٹو وغیرہ شامل ہیں یہ سبھی زندگی کے لئے مہلک نظر آتے ہیں۔ ان میں سے مشتری و زحل جیسے بڑے سیاروں کے چاروں طرف، جو بھاری گیس اور گندی ہوائی ہے وہ اتنا زہریلا ہے کہ اس میں زندگی کا کوئی ایسا روپ جسے ہم جانتے ہیں، لمحہ بھر کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان سیاروں کے اندر کوئی سخت زمین بھی نہ ہو تو تعجب نہیں۔ شاید یہ تمام سیارے گیس کے ہی بنے ہوئے ہیں۔ اس گیس کو عام طور پر میتھین کے نام سے پکارا جاتا ہے جو بہت زیادہ زہریلی ہے۔ یہ تمام سیارے بہت زیادہ سرد ہیں اور ان میں زیادہ روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی اس لئے ان باہر والے سیاروں میں روشنی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔

لیکن جیسا کہ قارئین نے نوٹ کیا ہوگا، اس مقالے میں ہمیں 'زندگی' کا ذکر کرتے ہوئے بار بار یہ کہنا پڑا ہے کہ 'زندگی' سے ہماری مراد ہے زندگی کے وہ روپ جنہیں ہم جانتے ہیں یعنی نباتات، کیڑے مکوڑے، مچھلیاں وغیرہ، حیوانات اور انسان۔ یہ سب روپ کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن و کیلشیم وغیرہ معدنیات پر مبنی ہیں اور ان کے وجود اور نشوونما کے لئے ایک خاص درجہ حرارت، روشنی وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ہم یہ [illegible] کہ زندگی صرف ان ہی حالات میں [illegible] جیسے کہ کم و بیش ہماری زمین پر [illegible] لیکن یہ [illegible] قیاس [illegible] ہمارا خیال صرف ایک [illegible]

سے ہمارے یہ علی مختلف حالات میں مختلف طرح کی زندگی کی نشوونما ہو رہی ہے۔

ہمارے نظام شمسی پر ضرور ہی یہ بات ...ق ہوگی — ایسا سوچنا بالکل بے معنی ہے ...ں کسی دوسرے نظام شمسی میں بھی کسی طرح ... زندگی نہیں ہو سکتی، ہم اسے نہیں مان ...تے۔

اب ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کم از کم ہمارے نظام شمسی میں زمین کے علاوہ اور کہیں بھی زندگی کا کوئی اونچا روپ (حیوان اور انسان وغیرہ) نہیں ہے۔ اگر صرف اتنی ہی معلومات سے مفروضہ انسان کو اپنی عظمت کا شبہ ہونے لگے تو اُسے یہ جان لینا چاہیے کہ یہ بات صرف نظام شمسی پر ہی صادق ہوتی ہے، اس کے باہر نہیں۔ ●

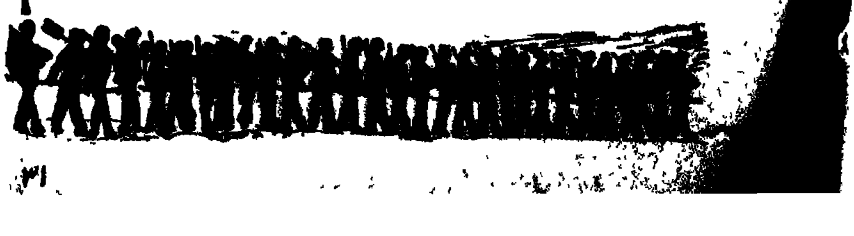


دُلہن

رات سرحد کی ہے جواں دیکھو
جل اٹھے اب ہیں آرزو کے چراغ
دل کی خوابیدہ دھڑکنوں کو یوں
کس نے اکسایا
کیوں جگایا ہے ؟
ہے جواں رُت کو پی پلا لو اب
پھر ملیں گے نہ میکدے میں ایاغ
جل رہے ہیں بہت سے پروانے
شمع کی لَو ہے تیز بڑھی ؟
سُرخ رنگوں میں نکھر گئی دُلہن
چار سُو آتشیں ہے چیخ و پکار
خود سری میں ہیں جو بھی ناچ اٹھے
یہ تشدد و جبر کے حامی

کیا کیا —
یہ سہاگ اجڑے گا
ایسا ہرگز کبھی نہیں ہوگا۔
رنگ و الفت کی اب ہے بن آئی
جذبۂ سرفروشی ابھرے گا۔
خون چہرے پہ جو بکھر آیا۔
حُسنِ دوشیزگی نکھر آئی۔
جھنڈے امن و اماں کے گاڑیں گے
جیسے سُورج کی ہر طرف لالی
رات سرحد کی ہے جواں دیکھو
جل اٹھے اب ہیں آرزو کے چراغ

— صبین عقیل



دھوپ چھاؤں

بیکر سے ۱۸ میل دور فول گڑھ میں ایک ہی دن میں ایک محلے میں ۹۰ شادیاں ہوئیں۔ دولہا حضرات الگ الگ مقامات سے آئے تھے مگر سب براتیوں کے کھانے پینے کا انتظام ایک ہی جگہ پر کیا گیا تھا۔ مزے دار بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر دولہا دلہنوں کی عمر ایک اور پانچ برس کے درمیان تھی۔

—— ہندوستان، نئی دلی

(بھیجنے والے: دنیش کمار سنگھ، درگ)

●

مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ سے ۹۰ میل شمال مشرق سلہٹ ضلع کے موضع پنجا راۓ میں ایک نوجوان عورت نے بیک وقت ۹ بچوں کو جنم دیا۔ یہ سب بچے تندرست ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان بچوں کے والدین کی شادی کو ابھی ایک ہی سال ہوا ہے۔

—— نو بھارت ٹائمز، دلی

(بھیجنے والے: پرکاش ماتھر آزاد۔ ماروار جنکشن)

●

ضلع درگ میں واقع تحصیل راجنا ند گاؤں میں مسلمان تیلیوں کی عورتوں کے لئے سنیما بینی ممنوع ہے۔ اگر کسی عورت نے چوری چھپے سنیما دیکھ لیا اور اس کی اطلاع تیلی سماج کے سربراہوں کو ہو گئی، تو وہ اُس عورت کو اپنے سماج سے خارج کر دیتے ہیں۔ ایک عورت کو تو برادری سے بھی نکال دیا گیا۔

—— نو بھارت، رائے پور

(بھیجنے والے، کے بی لال، رائے پور)

●

گورکھپور کے نشرول مانک لال دلال آرٹس و کامرس یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو جس کا رول نمبر ۱۴۳۵ ہے، جیاگرافی پریکٹیکل میں ۴۲ نمبر ملے ہیں، جبکہ اس مضمون میں کل نمبر ۲۵ ہی تھے۔

—— نو بھارت ٹائمز، بمبئی

(بھیجنے والے: ریندر گپت، سوکھ بھیکا)

●

اُردے پور شہر میں ایک ۱۴ سالہ لڑکے کی شادی ۵ مہینے کی ایک بچی سے کر دی گئی۔ لڑکے والوں کی طرف سے بارات سجا کر لائی گئی تھی اور لڑکی کے ساتھ مروجہ رسم و رواج کے مطابق شادی انجام پا گئی۔

—— وشومتر، کلکتہ

(بھیجنے والے: پرکاش چند آنند)

●

ناگپور میں ملکی کے ایک صاحب ۱۰ سالہ 'مٹھو رام' کے لئے راشن لیا کرتے جبکہ دوسرے صاحب 'موتی لال' کے لئے کارڈ پر اناج خریدا کرتے تھے۔

دراصل مٹھو رام ایک طوطے کا نام ہے اور موتی لال پالتو کتے کا۔ دونوں کے راشن کارڈ کاٹ دیے گئے ہیں۔

—— نو بھارت ٹائمز، دلی

(بھیجنے والے: دوارکا پرشاد گپتا)

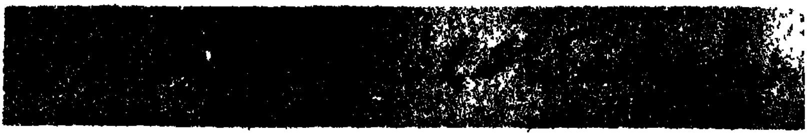
اس نمبر کے لئے اخبارات کے دلچسپ کٹنگ بھیجئے۔ سب سے بہتر کٹنگ پر ۔۔ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

——

کہانی

تھیو - ڈبلو - لاتوشے

شیطان کی موت



گاؤں والے اُسے شیطان کہتے تھے۔ اِس لئے نہیں کہ وہ شکاریوں کو جھانسا دینے میں اُستاد تھا، بلکہ اس اندھے عقیدے کے سبب کہ اُسے گولی لگ ہی نہیں سکتی۔

گاؤں کا شکاری اکبر قسم کھا کر کہا کرتا تھا کہ اُس نے خود ریڈی صاحب کو اسّی گز کے فاصلے سے شیطان کے ماتھے پر گولی چلاتے دیکھا ہے اور رائفل بھی کوئی معمولی نہیں تھی — ہاتھیوں کو مارنے والی ۵۰۰ ایکسپریس تھی۔ لیکن شیطان پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ غرّایا اور جھاڑیوں میں گُم ہوگیا۔ اگر کوئی اکبر کی بات کا مذاق اُڑاتے تو وہ سنجیدگی سے کہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل سچ ہے۔ اُس نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ریڈی صاحب خود حیران تھے کہ چیتے کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا اور وہ پھر بھی اچھا بھلا تھا۔

جیسا کہ مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے ان دنوں جلال پور (آندھرا پردیش) کے آس پاس کے دیہاتوں میں اس چیتے نے زبردست دہشت پیدا کر رکھی تھی اور مرنے سے پہلے وہ کم سے کم ایک درجن انسانوں کو اپنا شکار بنا چکا تھا۔

مرنے پر جب شیطان کو ناپا گیا تو وہ چھ فٹ چار انچ کا جوان چیتا نکلا۔ اُس کے جسم پر کسی پرانے زخم کا نشان نہیں تھا۔ یہ تعجب کی بات تھی، کیونکہ چیتے لولے لنگڑے یا بوڑھے ہو جانے پر ہی آدم خور ہو جاتے ہیں۔ ویسے آدم خوری اُن کی عادت نہیں ہے۔

شیطان کو لوگ کھاری جھیل کا آدم خور بھی کہتے تھے کیونکہ وہ اپنے زیادہ تر شکار کھاری جھیل کے آس پاس ہی پکڑتا تھا۔ گرمیوں میں یہ چھوٹی سی جھیل خشک ہو جاتی تھی اور گاؤں والے وہاں نمک جمع کرنے جایا کرتے تھے۔ اسی لئے شیطان نے اسے اپنی شکارگاہ بنا رکھا تھا۔

شیطان کے زیادہ تر شکار نمک جمع کرنے والے لوگ ہی تھے۔ وہ جھیل کے پاس ہی کسی جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور آناً فاناً اپنے شکار کو دبوچ کر پاس کے جنگل میں غائب ہو جاتا۔

ایک زمانے سے حیدرآباد اپنے نڈر اور بہادر شکاریوں کے لئے مشہور رہا ہے، اس لئے اُمید تھی کہ شیطان کی خبر سُنتے ہی کئی شکاری وہاں آ پہنچیں گے۔ ایسا ہوا بھی۔ لیکن شیطان سب کو چکمہ دے گیا۔ شیطان کی یہ شہرت سیف الدّین خاں کے ہاتھوں مرنے تک برقرار رہی۔

پہلی بار جب سیف الدّین خاں جلال پور گئے تو انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ تین دن تک جھیل کے پاس خیمہ لگا کر بیٹھے رہے لیکن شیطان کا کوئی

سراغ نہیں ملا۔ آخر تنگ آکر وہ حیدرآباد لوٹ آئے اور شیطان کا شکار کرنے کا ارادہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔

خان صاحب کماری جھیل اور شیطان کو بالکل بھول چکے تھے کہ ایک دن اچانک انھیں جلال پور کا شکاری اکبر اپنے دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ضرور کچھ اَن ہونی بات ہوئی ہے ورنہ جلال پور سے سو میل کا راستہ طے کرکے اکبر حیدرآباد نہ آتا۔

جیسے ہی اکبر نے خان صاحب کو دیکھا وہ دوڑ کر اُن کے پیروں سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ خان صاحب کے دریافت کرنے پر اُس نے رُندھے گلے سے بتایا کہ اُس کی بیوی حبیبہ کو شیطان اُٹھا کر لے گیا ہے۔

اکبر کی بیوی حبیبہ خوبصورت اور جوان تھی۔ مشکل سے ۲۲ سال کی ہوگی۔ اکبر سے اُس کی شادی قریب تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اُن کی صرف ایک اولاد تھی —— نوری۔ خان صاحب کو یہ سب معلوم تھا، اس لئے اکبر کی بات سُن کر اُنھیں بھی بہت افسوس ہوا۔ وہ اکبر کو گھر لے گئے اور بڑے پیار سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اکبر نے خان صاحب سے استدعا کی کہ وہ اُس کے ساتھ چل کر حبیبہ کے قاتل سے بدلہ لیں۔ خان صاحب انکار کرکے اکبر کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے کہا "برسات میں تو چیتے کو تلاش کرنا بڑا مشکل ہے، سردی آنے دو، میں اُسے ضرور ماروں گا۔"

لیکن اکبر کی اس سے تسلی نہیں ہوئی اُس نے ضد کی کہ خان صاحب ابھی اُس کے ساتھ چلیں۔ نہیں تو اُسے دفنانے کے لئے بیوی کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ حبیبہ کو چیتا قریب ۵۴

گھنٹے پہلے لے گیا تھا۔ خان صاحب جانتے تھے کہ اب تک حبیبہ کی ہڈیاں ہی بچی ہو[ں] لیکن پھر بھی اکبر کی دل جمعی کے لئے وہ اُ[س] کے ساتھ ہو لئے۔ دونوں جیپ سے تین گ[ھنٹے] میں جلال پور پہنچ گئے۔

سیف الدّین خان چیتے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے تھ[وڑی] دیر گاؤں میں رُکے۔ حبیبہ کے ساتھ جانے [والی] بڑھیا نے بتایا کہ وہ دونوں بکری کے لئے پتے لینے جنگل گئی تھیں۔ دونوں پتے توڑنے [میں] اتنی مصروف تھیں کہ انھیں کسی بات کا ہو[ش] نہ رہا۔ اچانک حبیبہ زور سے چیخی تو اپنے [سامنے] بھیانک اور خطرناک چیتے کو دیکھ کر بڑھیا [کے] رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ شیطان نے حبیبہ کو اپنے جبڑوں میں دبوچ رکھا تھا اور [بیچاری] لڑکی بُری طرح چیخ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد [وہ] مڑا اور گھنے جنگل میں غائب ہوگیا۔ اِس [وقت] نہ بڑھیا کچھ بول سکی اور نہ ہل جل سکی۔ ڈ[ر کے] مارے وہ پتھر کی طرح کھڑی رہی۔

اکبر جانتا تھا کہ چیتا اس کی بیوی کو [کہاں] سے اٹھا لے گیا تھا۔ اس لئے اُس نے [جیپ] سیدھے وہیں لے جا کر روکی۔ یہاں سے گھ[نا] جنگل شروع ہوتا تھا، اس لئے دونوں شکا[ری] اُترے اور بڑی ہوشیاری سے ٹوہ لیتے [ہوئے] آگے بڑھنے لگے۔ خون کے دھبّے اور کپڑوں [کے] چیتھڑے دیکھتے دیکھتے وہ لوگ خون سے [لت] پت ایک چٹان تک پہنچے۔ سیف الدّین سمجھ [گئے] کہ چیتے نے تھوڑی دیر اپنے شکار کو اس [جگہ] رکھا ہوگا۔

آگے بڑھنے پر گھنی اور اُونچی گھاس [میں] سے انھیں چیتے کے پیر کے نشان اور خ[ون کے] دھبّے ڈھونڈھنے میں دقّت پیش آرہی [تھی] لئے شکاری اب ایک ہی نشان ...



اچانک ایک جھاڑی کی اوٹ سے شیطان نکلتا ہوا دکھائی دیا

چیتے کا پیچھا کر رہے تھے۔ یہ نیستان تھے کانٹے دار جھاڑیوں میں اُلجھے ہوئے چھوٹے چھوٹے قطرے۔ کام بڑا مشکل تھا لیکن یہ لوگ بھی چیتے کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ کچھ دُور اور آگے بڑھنے پر ایک جھاڑی میں ایک بڑا سا لال چیتھڑا اُلجھا ہوا دکھائی دیا۔ یہ جیبہ کی ساری کا ٹکڑا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شکاری ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ یہاں گھٹنے گھٹنے اُونچی گھاس تھی۔ خان صاحب نے دیکھا کہ گھاس ایک جگہ کچھ دبی ہوئی ہے جب دونوں وہاں پہنچے تو انھیں ایک اِنسان کی چچوڑی ہوئی ٹانگ ملی جو سوکھے ہوئے خون کے گڑھے میں پڑی تھی۔ انھیں اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ چیتے نے یہیں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھرا ہوگا۔ وہ ضرور بہت بھوکا رہا ہوگا۔ ورنہ چیتے شکار کرنے کی جگہ کے اتنا قریب بیٹھ کر کبھی شکار نہیں کھاتے۔

خان صاحب دوربین سے چاروں طرف کی جھاڑیوں کا جائزہ لینے لگے۔ اچانک انھیں ایک جھاڑی کی اوٹ میں آدھی چھپی ہوئی جیبہ کی لاش دکھائی دی۔ جب انھوں نے اکبر کو اس کی بیوی کی لاش دکھائی تو وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

سیف الدین نے ایک بار پھر دُوربین سے ان جھاڑیوں کو اچھی طرح دیکھا، لیکن شیطان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اچانک انھیں ایک عجب آواز سُنائی دی۔ آواز کی سمت میں دیکھنے پر انھیں پتہ چلا کہ ایک پیڑ پر بیٹھے بہت سے گِدھ شور مچا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شیطان کہیں پاس کی جھاڑی میں چھُپا ہوا اپنے شکار کی حفاظت کر رہا تھا، جس کی وجہ سے یہ پرند اس پر جھپٹ نہیں پا رہے تھے۔

خان صاحب اپنے تجربے سے جانتے تھے کہ جیبہ کی لاش کے پاس جانا بہت خطرناک ہوگا اس لئے وہ جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ لوگ کچھ ہی قدم چلے ہوں گے کہ ایک جھاڑی کی اوٹ سے شیطان نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بڑی شان سے گردن اُٹھائے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ خان صاحب جھٹ ایک پیڑ کے تنے کے پیچھے چھُپ گئے اور اوٹ سے چیتے کی حرکتوں کا جائزہ لینے لگے۔

اب تک چیتا میدان کے بیچ پہنچ چکا تھا۔ خان صاحب نے پہلے اپنے کیمرے سے اس کی تصویر کھینچی اور پھر اس کے کندھے کا نشانہ لیتے ہوئے گولی داغ دی۔ گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی اور جانور دہاڑتا ہوا وہیں چت ہوگیا۔ اکبر کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی

مقالہ

فریدہ خاتون



محبوب کا تصوّر کلاسیکل شاعری میں

ہماری کلاسیکل شاعری میں اور کچھ ہوا ہو یا نہ
لیکن عشق ضرور ہوا ہے اور وہ بھی
نہایت شدّ و مد اور دُھوم دھام کے ساتھ
ہر شاعر کے لئے اچھا شاعر بننے کے لئے اچھا
'عاشق' ہونا شرط رہا ہے۔ چناں چہ اگر آپ
اُردو اور فارسی شعرا کے دیوان اٹھا کر دیکھنے
کی جسارت کریں تو ان میں ایک حشر برپا نظر
آئے گا۔ 'عاشق' دم توڑتے نظر آئیں گے اور
'محبوب' تیر و ترکش، خنجر، بھالے اور برچھیوں سے
آراستہ ایک جمِ غفیر کو قتل کرنے پر کمربستہ
یہاں عاشق کا رویّہ بھی کچھ کم دل چسپی
سے خالی نہیں ملے گا۔ عاشق صاحب کی مضحکہ
خیزی ملاحظہ ہو کہ محبوب جتنا قتل و غارت
گری پر آمادہ ہوگا، عاشقِ صادق اتنا ہی
اُس کے در پہ جبیں سائی اور قدم بوسی پر
آمادہ نظر آئے گا۔ اس پر طرّہ یہ بھی ہے کہ
محبوب عاشقِ صادق کا تو دشمنِ صادق ثابت
ہوگا اور اغیار کا رفیق و ہمدم۔ لیکن عاشق
صاحب ایسے صادق قسم کے بے حیا اور ڈھیٹ
ہونے کا ثبوت پیش کریں گے کہ زندگی سے تو
باز آنے کی بارہا کوششیں فرمائیں گے۔

زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

لیکن عشق سے باز آنے کے لئے
قیمت پر بھی آمادگی ظاہر نہیں کی جائے
زبانِ حال سے یہ اس طرح گویا ہوں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس شعر میں
حقیقی کا پرتو نظر آئے لیکن اردو
اس سلسلے میں بڑی وسعتوں اور گنجائ
حامل ہے۔ اس میں مجازی اور حقیقو
کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا گیا
یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ کس شعر میں
محبوب حقیقی سے ہے اور کہاں مجاز
لہٰذا ہر شعر اپنی جگہ کئی کئی معنی رکھتا
تو انسان کے اپنے خیالات اور ض
منحصر ہے کہ وہ جس طرح چاہے شو
کر یا کھینچ تان کر اپنے مقصد و مطا
مطابق بنا لے اور جس موقع پر جس
اس سے خاطر خواہ لطف حاصل کر
اُردو اور فارسی شاعری میں
کی حالت کچھ اس قدر دگرگوں
ہوتی ہے کہ بجائے رقت طاری
حاصل کرنے کے امکانات شدّ

نے لگتے ہیں۔ جیسے ۔

انتہائے لاغری میں جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ بولے کہ اب بستر کو جھاڑا چاہیے

اب پتہ نہیں وہ بے چارے معدوم و موہوم قسم کے عاشق بستر جھاڑنے کے بعد کبھی برآمد ہوئے یا تحلیل ہو کر بستر ہی میں جذب ہو گئے۔ اور زبانِ حال سے محبوب کی جفا شعاریوں کے راگ الاپتے رہے۔ اب ذرا ان کے ضعف کا عالم اسی ملاحظہ ہو۔

خمیدہ ضعف سے ایسا میں دردمند ہوا
کہ سایہ پاؤں کا سر سے میرے بلند ہوا

اِدھر عاشق صادق صاحب کا یہ حال ہے، اُدھر محبوب کے مظالم بامِ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ بے چارے عاشق صاحب ایک نگاہِ التفات و لطف و کرم کی آرزو میں کبھی جیتے ہیں، کبھی مرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کامیابی قدم چومنے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ ناچار عاشق شکوے کے لئے زبان کھولتے ہیں اور نہایت سعادت مندی سے ہانک لگاتے نظر آتے ہیں۔

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اور پھر خود ہی یہ کہہ کر اطمینان حاصل کرنے کی کوشش بھی فرماتے ہیں۔

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

ہماری کلاسیکل شاعری میں عاشق کی شخصیت کچھ سوالیہ نشان سی بنی ہر جگہ نظر آجاتی ہے۔ کبھی کوئے جاناں کے اِرد گرد، کبھی کسی راہ گزر پر، کبھی 'مے خانہ' اور قمار خانے کی چہار دیواری میں۔ کبھی کوہ و دشت کی پیمائش کرتے ہوئے۔ لیکن محبوب کچھ ایسا پتھر دل، فولاد صفت اور احساسات سے معرا واقع ہوا ہے کہ اس کے آگے کچھ پیش نہیں جاتی۔

چاہے آپ سر پٹک کر مر جانے کی دھمکی دیں، چاہے کفن پوش ہو کر درِ محبوب پر پہنچیں۔ لیکن اس کی بے نیازی اور لاپرواہی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، اور وہ اپنی روایت یا اپنی ڈگر سے رتی بھر بھی ہلنے یا سرکنے کو تیار نہیں۔ اُدھر عاشق صادق صاحب اپنی وراثت یعنی ہٹ دھرمی ترک کرنے پر قطعی آمادہ نہیں۔ لہٰذا عاشق صادق کی ڈھٹائی ملاحظہ فرمائیے۔

قاتل سنبھل کے تیغ لگا جائے زخم ہے
تسمہ لگا جو گردنِ بسمل میں رہ گیا

یا وحشت تیرا ہی آسرا۔ اب اس انتہا

شاعر کا محبوب انسان تو انسان، دیو، پری، جن حور و غلمان وغیرہ کی ضمن میں بھی بہ مشکل کھینچ تان ہی کے آ پائے گا۔ اس کے محبوب کو عجیب الخلقت ہی کہا جا سکتا ہے۔

پسندی کا کیا کہنا کہ جس کی بارش ایشیائی شاعری کے روایتی عاشق پر ہوتی ہے۔

تہہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

یہاں تو کچھ یہ احساس ہوتا ہے کہ بجائے عناصر کے زخموں ہی سے اُن کے جسم کی تعمیر و تربیت ہوئی ہے، اور اُن کی زندگی ان ہی زخموں کی منہ بولتی تصویر رہی ہے۔ آگے ایک شعر اور سُننے کی ہمت پیدا کر لیجئے۔

آتش کو دست و تیغ سے ممکن ہوا نہ زخم
بے چارہ مر کے حسرتِ قاتل میں رہ گیا

اب اس روایتی قسم کے عاشق کو کہیں زخموں کی آرزو ہے، کہیں محبوب کی گالیاں ہضم کر جانے کی تمنا۔ بے چارے عاشق صادق نہ ہوئے دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو گئے یہ حال تو عشق میں شدید قسم کی ناکامی کے بعد ہے۔ محبوب کے جور و ستم کس فراخدلی کے ساتھ نظر انداز کرتے ہیں۔ بے چارے منحنی، خمیدہ ضعیف ترین عاشق گویا کہ عاشق صادق نہ ہوئے 'چکنا گھڑا' ہو گئے اور اگر اس عشق سے توبہ کا وہم بھی دل کے قرب و جوار سے گزر گیا تو کچھ اس قسم کے خوابوں کی شدید عادت ہو جائے گی۔

جب سے کی عشق سے توبہ، نظر آتے ہیں یہ خواب
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

پتہ نہیں اُن کو سچ مچ عشق ہی ہوتا تھا یا محض عشق کی نقل تھی یا پھر تخیل کی کار پردازی یا فکر کی زور آزمائی، غرض جو کچھ بھی رہا ہو دل چسپ اور مضحکہ خیز ضرور ہے اب ذرا عاشق صادق کے جنوں کا عالم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

خیر، یہاں تو چاکِ گریباں اور گوشۂ داماں ہی پر بیتی ہے۔ بے چارے عاشق کو کہیں کہیں تو سر بھی وبالِ دوش محسوس ہونے لگتے ہے۔

کوئے قاتل میں پہنچ کر سر ہوا مجھ کو وبال
بوجھ اُترنے کی جگہ دم چڑھ گیا مزدور کا

جہاں عاشقِ صادق کا حال اتنا عبرتناک ہے ور وہ عجیب و غریب اوصا کا مالک ہے وہاں طرّہ یہ بھی ہے کہ اُس کے آنسو ہمارے آپ کے آنسوؤں سے بہ مختلف ہیں۔ مشابہت یا مناسبت کا کوئی بھی پیدا ہوتا نظر نہیں آتا جب اس کا ہی آگ اور پتھر کی آمیزش سے بنا دل تو پھر آنسو بھی خون کے ہونا کوئی تعجب بات نہیں، اور پھر آنسوؤں کے ساتھ لخت جگر' کا ٹپکنا اور بھی قرین قیاس نظر آ لگتا ہے

خوں نابِ یوں کھو نہ بہری چشم سے بہا
اٹکا نہ جب تک اُن کے لختِ جگر کہیں

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو
کہ ہر زخمِ بدن سے خون کا دریا نکل آیا

جہاں عاشق اس قدر صبر و تحمل یاد الفاظ میں بے حیائی اور ڈھٹائی جیسے ا کا مالک ہے وہاں محبوب بھی اپنے جفا کاری، بے دردی اور بے پروائی ہے۔ محبوب نہایت ظالم اور جفا کار ہوا ہے، لہٰذا اِدھر اُس نے اپنی

والی آنکھوں سے تیر برسائے (پتہ نہیں کتنے تیروں کا ذخیرہ اس کی ان دو چشم فتنہ انگیز میں پوشیدہ ہے جو کسی طرح بھی ختم ہونے میں نہیں آتا) اور صفِ عاشقان میں کچھ بسمل اور کچھ نیم بسمل لہرا لہرا کے زمین پر گر کر لوٹنے لگے۔

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

لیجئے صاحب، ایک ڈھیر لگ گیا لاشوں کا۔ کیا ہولناک منظر کھینچا ہے کہ بس عش عش کیجئے اور اپنی قسمت پر ناز کیجئے اور نمازِ جنازہ اور کفن دفن کے انتظامات کی طرف رجوع فرمائیے۔

محبوب کا سراپا بھی شاعر نے کچھ اس قدر افسوسناک قسم کا پیش کیا ہے کہ محبوب عجیب و غریب اور 'عجیب الخلقت' بن کر سامنے آتا ہے۔ شاعر کا محبوب ایک عام اور فطری محبوب سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اگر شاعر کا تصور روز مرہ کی زندگی میں استعمال کرنے کی غلطی آپ سے سرزد ہو گئی تو واقعی محبوب بے رنگ سا ہو جائے گا کیوں کہ شاعر کا محبوب انسان کے زمرے سے تو باہر کی چیز ہے۔ محبوب کے سراپا کے سلسلے میں شاعر صاحب کا تصور کچھ اور ہی بہاریں دکھاتا نظر آتا ہے۔ شاعر کا محبوب انسان تو انسان، دیو، پری، جن حور و غلمان وغیرہ وغیرہ کی ضمن میں بھی بہ مشکل کھینچ تان ہی کے آئے گا۔ اس کے محبوب کو عجیب الخلقت ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ جو کچھ بیچ زمین کے اور بیچ آسمانوں کے ہے۔ اس میں تو کہیں چھپاں ہوتا نظر آتا نہیں۔ لیجئے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

علت آنست کہ وقتے سخنے می گوید
ورنہ معلوم نہ گشتے کہ دہانے دارد

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبوب بے چارے سے کبھی کبھی بول دینے کی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اس وجہ سے یہ گمان سا ہونے لگتا ہے کہ اس کے ایک دہن بھی ہے۔ ورنہ یہ معلوم کرنا تو امرِ محال تھا کہ محبوب صاحب کا دہن ہے بھی کہ نہیں۔ اب بھلا آپ خود غور فرمانے کی یہ زحمت گوارا کریں کہ بغیر دہن کے محبوب کس قدر حسین لگتے ہوں گے اور کہیں کہیں ان خوش کمراں کی کمر معدوم ہوتے ہوتے مُو سے باریک تر بھی ہو جاتی ہے۔

آگے شمشیر تمہاری کے بھلا یہ گردن
مُو سے باریک ترا اے خوش کمراں ہے کہ نہیں



اب ذرا سعدی کے محبوب کی کمر اور دیکھنے کی تاب پیدا کر لیجئے۔

بخت آنست کہ در وقت کمر می بندد
ورنہ مفہوم نہ گشتے کہ میانے دارد

لیجئے صاحب، مشکل آسان ہوئی کہ محبوب موقع کی مناسبت سے کبھی کبھی کمر کس لیتا ہے۔ اس سے کچھ اس قسم کا خیال گزرنے لگتا ہے کہ محبوب صاحب کی کمر ہے ورنہ سعدی کا محبوب اور کمر دو متضاد چیزیں تھیں اور کمر کی موجودگی ایک امرِ تحقیق طلب تھا۔ یہاں سعدی کی خوش قسمتی آڑے آ گئی کہ اس طوالت سے بچ گئے غرض کہ محبوب کی کمر کچھ اس خوب صورتی سے غائب کی گئی ہے کہ داد دینا کچھ ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔ شکر ہے خدا کا اگر اوپر اور نیچے کا دھڑ ہوا میں معلق ہوتا تو ہم اور آپ کیا کر سکتے تھے۔

اب آہو چشم محبوب کی فتنہ انگیزیاں بھی سرِدست دیکھتے چلتے ہیں۔ ان کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بھئی، محبوب کی چشم کہیں بادام ہیں، کہیں نرگس ہیں تو کہیں آم کی ترشی ہوئی قاشیں، کہیں کاغذی بادام کا مزہ دے رہی ہیں، تو کہیں خمار آگیں ہو گئی ہیں۔ آنکھیں کیا ہیں ساغر ہیں۔ گردش کرتے ہوئے پیمانے ہیں۔

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

ساغرِ چشم سے ہم بادہ پرست
مئے دیدار پیا کرتے ہیں

کہیں کہیں آنکھیں جھیلیں بھی بن گئی ہیں آپ شوق سے تیرنے یا جال لگا کر مچھلیاں پکڑئیے۔ اب آنکھوں کے بعد پلکوں اور ابرو کی حشر سامانیاں بھی دیکھئے۔

غضب آیا ہلیں گر اُس کی مژگاں
صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے

محبوب کی ابرو اور قد ملاحظہ

ابروش خم بکمانے دارد و قدراست چوتیر
کس ندیدم کہ چنیں تیر و کمانے دا

یعنی محبوب کی بھنویں کمان کی اور قد بالکل تیر کی طرح سیدھا ہے۔ سعدی صاحب کے محبوب کے قد ا کی فراوانی بھی اور دیکھ لیجئے۔



آں تماشائے درخت چمنش حاجت نیـ
کہ در خانۂ تو سرو روانے دا

یہاں محبوب کو سرو رواں کہا محبوب سرو کا پیڑ بن گیا۔ بے چارہ باغ میں ایک جگہ خاموش ملے گا۔ لیکن شاعر کا سرو محبوب بولتا چ بل کھاتا نظر آئے گا۔ چنانچہ وہ باغ رہینِ احسان کیوں ہو؟ اپنے ہی گھ سرو سے کیوں نہ لطف اندوز ہو۔ اب ذرا تصور تو کیجئے کہ شعرا کے مختلف الاعضا کا کتنا حسین مرقـ

ہوا سے کیمیاوی کھاد

نائٹروجن ہوا میں کافی مقدار میں موجود ہے مگر اس کی صفت یہ ہے کہ کسی بھی مرکب میں — بر اس پر کسی بھی طرح کا کیمیاوی اثر نہیں ہوتا۔ یہ بالکل غیر متحرک طور پر رہتی ہے۔ غیر متاثر رہتی مرکب کی شکل میں نائٹروجن حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ دباؤ اور درجۂ حرارت ضرورت ہوتی ہے۔

امریکی کیمیا داں ڈاکٹر جیمز پی کولمین ہوا میں سے نائٹروجن حاصل کرنے کا کوئی براہ راست تو ایجاد نہ کر سکے مگر انھوں نے نائٹروجن کو بالواسطہ طور پر اری ڈیم اور روڈیم مادّوں میں شا کر کے ایک مرکب تیار کر لیا۔

آج کل کیمیاوی کھاد بنانے کے لئے جو امونیا تیار کی جا رہی ہے اس پر صرفہ بہت آتا ہے کیوں کہ ڈگری فارن ہائٹ کے درجۂ حرارت اور ۶۰۰۰ پاؤنڈ فی مربع انچ کے اونچے دباؤ پر ہی یہ حاصل ہوتا

۔۔اس میں انھوں نے بہت مبالغہ آرائی کی
۔۔آنکھوں کی جگہ گردش کرتے ہوئے
نے یا کاغذی بادام یا پھر آم کی قاشیں
چاہیں آنکھوں کی جگہ چسپاں کر دیجئے۔ ابرو
جگہ تیر و کمان، زلفوں کی طرح لہراتے ہوئے
سیاہ، یا پھر گھٹائیں، کالی پلکوں کی جگہ
رآبدار، چاند و سورج کی طرح تابناک
ر دمکتا ہوا چہرہ، اس پہ "سبزۂ خط"۔ سبزۂ
ط پر آپ کو ہنسنے کی قطعی اجازت نہیں، یقین
آئے تو سودا سے تصدیق کر لیجئے۔

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی ایک عالم رہا

غالباً اب تو آپ کو یقین آ چلا ہوگا کہ
محبوب کے چاند کی طرح تابناک چہرے
کے لئے سبزۂ خط کی موجودگی بھی اشد ضروری
ہے۔ ورنہ حسن کے ادھورے رہ جانے کا قطعی
امکان ہے۔

لیجئے اب کلاسیکل شاعری کا محبوب مکمل طور پر
ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس "عجیب الخلقت"
قسم کے محبوب سے عشق کا تصور محبوب کے
سراپا سے بھی زیادہ بھیانک ثابت ہوتا ہے۔
پتہ نہیں کس طرح شاعر اس سے محبت کا
دم بھرتا نظر آتا ہے اور اس کے فراق میں
کلیجہ چاک، سینہ فگار، آہ و نالہ کا غلغلہ نہایت
سعادت مندی کے ساتھ بلند کرتا نظر آتا ہے۔
اور پھر عاشق صادق اس عجیب و غریب
محبوب کی تمام جفا شعاریوں کے بعد اس کے
تلوار، نیزہ، بھالے، برچھیوں کی پروا کئے بغیر
سینہ سپر کئے کھڑا نظر آتا ہے اور محبوب وار
پہ وار کرتا ہے۔ اور عاشق صادق اُف تک
کرنے کو آدابِ عاشقی کے خلاف گردانتا
ہے۔ محبوب کو اظہارِ عشق پر غصہ آتا ہے
اور عاشق صاحب ہیں کہ ان کے دل میں
عشق کا بیکراں سمندر ہر دم موجزن ہے۔
پتہ نہیں کس طرح لوگ شاعر کے تصوراتی
محبوب پر سر دُھنتے ہیں۔ سُن سُن کر اور پڑھ
پڑھ کر۔ اور شاعر اسی خوبیوں بھرے محبوب
کے تصور سے اپنے دل و دماغ میں عشق کی
آگ کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ میرے خیال سے
ان اوصاف پر مشتمل محبوب کے تصور سے ہی
عشق کا بھوت نو دو گیارہ ہو جانا چاہئے۔ لیکن
شاعر تو عشق سے توبہ کرنے کے بعد بھی کچھ اس
قسم کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے کہ کوئی
اس کا دامن کھینچتا ہے اور کوئی گریباں یہاں عشق
کے خیال سے ہی خوابوں کی نوعیت کچھ اس
قسم کی ہوگی۔

اگر ان اوصاف پر مشتمل معشوق صاحب کبھی
عاشق صادق صاحب سے خواب میں
بھی دوچار ہو جانے کی ہمت کریں تو شاعر
صاحب عشق کے میدان میں کچھ اس طرح
صاف ہوں کہ گدھے کے سر کی مثال دینا
ہوگی۔ غرض کلاسیکل شاعری کا محبوب بڑی
خوبیوں اور جمالتوں کا مالک ہے۔ لگتا ہے
عورت لگتا ہے مرد۔ کبھی شکار پر آمادہ، کبھی قتل و
غارت کا بازار گرم۔ کبھی چہرہ فروغِ مے سے
گلستاں کئے ہوئے محبوب کی آمد بہار
دکھا رہی ہے۔ کبھی دشنہ و خنجر سے آراستہ
و پیراستہ محبوب زور و شور سے چلے آ رہے
ہیں۔ گویا میدانِ شاعری نہ ہوا، میدانِ کارزار
ہوگیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیا انداز ہے؟
کم از کم کسی ایسے صنم کی تو پرستش کرتے
جو لائقِ پرستش ہوتا۔ اس کے تصور سے لرزہ
نہ طاری ہوتا، کپکپی تو نہ چڑھنے لگتی، دل
پتہ سا تو نہ کانپنے لگتا۔

شاباش

منمّاڈ سٹیشن پر ایکسپریس گاڑی میں یکبارگی کئی مُسلّح ڈاکو سوار ہوئے۔ یہ ڈاکو بندوق پستول اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ڈاکوؤں نے ڈبّے میں بیٹھی ایک عورت کا سارا سامان چھین لیا، اور پھر اسے بھی اغوا کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک نے اس کو گود میں اٹھالیا اور دوسرے نے زنجیر کھینچ لی۔ ڈاکو ٹرین سے اترنے لگے۔ سبھی مسافر اس حادثہ کو بہت بے بسی سے دیکھ رہے تھے کہ یکایک ایک فائر ہوا۔ اور ایک ڈاکو الٹ کر لائن سے نیچے جاگرا۔ پھر دوسرا فائر ہوا۔ اور ایک نوجوان مسافر بھی نیچے جاگرا۔ یہ واقعہ اتنے کم لمحہ میں ہوا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ چونکہ ٹرین کے پہرے دار سپاہی بھی فائر کی آواز سن کر آگئے تھے اس لئے بقیہ ڈاکو اس عورت کو وہیں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ حولدار نے ٹارچ جلاکر چاروں طرف دیکھا۔ اور یہ دیکھ کر حیراں رہ گیا کہ سامنے ڈاکوؤں کے نامور سردار کی لاش موجود ہے جسے ڈاکو لے کر بھاگ نہ سکے اور ساتھ ہی ایک مسافر کی لاش بھی ہے۔ دونوں کے سینے میں گولی لگی ہے اور خون اُبل اُبل کر گر رہا ہے۔ حولدار کی تفتیش پر بغل میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مُسافر نے بتایا کہ جب جب ڈاکو عورت کو لے کر نیچے اترنے لگے تو اس نوجوان مُسافر نے ڈاکو کے پستول والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کر پستول چھیننا چاہا۔ لیکن چونکہ ڈاکو پستول کے ٹرائیگر پر انگلی رکھے ہوئے تھا اس لئے ... سے فائر ہوگیا۔ اور گولی ڈاکو کے سردار کو ... گئی جو اتر کر سامنے کھڑا تھا سردار کے گرنے ... بعد فوراً ہی بندوق والے ڈاکو نے نوجوان مسا... گولی چلادی جس سے نوجوان زخمی ہوکر ... گر گیا۔ پولیس والوں نے جب اس کی جیب تلاشی لی تو اس میں سے ایک ڈائری نکلی۔ جس... پتہ چلا کہ نوجوان پاس ہی کے ایک کالج میں ... کا طالب علم تھا۔ —— روزنامہ ...

(بھیجنے والے: شکیل احمد خاں۔ دربھنگہ، ...)

بس میں سفر کرنے والے ایک مسا... بیسٹ کو اپنے قرضہ کی بقایا رقم ایک ان... طریقہ سے ادا کی۔

یہ مُسافر گذشتہ ۲۵ سال سے بمبئی کی ٹراموں اور بسوں میں سفر کرتا رہا۔ اور ... عرصہ میں اس نے کبھی ٹکٹ نہیں خریدا۔

ایک صبح سفر حج کے لئے روانہ ہو... کے موقعہ پر اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ... سنٹرل ڈپو میں داخل ہوا وہاں اپنے جُرم کا ... کیا اور ۷۵ روپے کے ٹکٹ خرید کر انھیں تلف کردیا۔ —— روزنامہ انقلاب

بھیجنے والی۔ نیلم نازلی جل...

اس سال سرووان کے حاجی اقرار ... (عمر ۵۵ سال) نے یونی ورسٹی انٹرینس ام... پاس کیا ہے۔ ان کی صاحبزادی نے بھی ان... ساتھ ہی امتحان پاس کیا ہے۔ مسٹر اقرار حسین ... مقامی پرائمری سکول میں ٹیچر ہیں۔ انھوں ... یونی ورسٹی کا میٹرکولیشن امتحان ۱۹۲۷ ... کیا تھا۔ —— آزاد ہند

(بھیجنے والے، عبدالرحمٰن ...)

اس پیج کے تحت اپنے دلچسپ تجربات ...
...۔ پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی ...

کہانی • وصی اقبال

تائی بشیرن

ستر سال بوڑھی عورت جو سامنے اینٹوں کا ڈھیر لگا رہی ہے۔ کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟

یہ دبلی پتلی، کمزور۔ لیکن اپنے ارادہ کی مضبوط عورت تائی بشیرن ہے تائی بشیرن یہاں بھٹہ پر روز صبح سے شام تک محنت مزدوری کرتی ہے تاکہ اس کا پوتا وحیدا خوب پڑھ لکھ جائے پھر وہ اُسے فوج میں بھرتی کرائے گی۔ جہاں وہ کپتان بن کر اپنے وطن کی حفاظت کرے گا دشمنوں سے لڑے گا۔

یہی وہ وعدہ ہے جو اس نے اپنے سنّو سے کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس وعدہ کو پورا کرنے کے لئے اُسے کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اس کا کہنا ہے "خدا اُس دن مجھے موت دے دے جس روز میں کسی دوسرے کے ہاتھوں پانی پینے کے لئے مجبور ہو جاؤں"

تائی بشیرن جسمانی طور پر ضرور کمزور ہو چکی ہے لیکن اُس کی ہمت و جرأت آج بھی جوان ہے جیسے وہ کبھی خود بھی جوان تھی۔

خیر، جوانی تو گاؤں کی اور بہت سی لڑکیوں پر بھی آئی تھی۔ لیکن تائی کا تو انداز ہی نرالا تھا۔ گو وہ ایک معمولی ناک نقشے والی سانولے رنگ کی ایک معمولی سی لڑکی تھی جیسے عموماً نچلے متوسط طبقہ کی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بستی کا ہر نوجوان سوتے جاگتے اس کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ تائی بشیرن کو حاصل کرنے کے لئے شمشیرہ اور حیدر کی بات تو خیر الگ رہی، لنگڑا شکورا تک اسی کا گرویدہ تھا اور اکثر رات کے پچھلے پہر دُعا مانگا کرتا تھا۔

شکورا اُسے دُعاؤں کے ذریعے مانگتا تھا فضلو اور اللہ دیا اُسے خوشامد سے رام کرنا چاہتے تھے، شبّیر اور امداد اُسے ہمیشہ اپنے پیسے سے مرعوب کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ شمشیر اور حیدر اس کو اپنے کسرتی جسموں سے متاثر کرنا چاہتے تھے۔

لیکن وہ جب اپنی بیوہ ماں کی شاخ سے ٹوٹ کر گری تو نہ حیدر اور شمشیر کی جھولی میں آئی، نہ شبیر اور امداد کی گود میں، نہ فضلو اور اللہ دیا کے دامن میں، اور نہ ہی لنگڑے شکورا کے کشکول میں۔ اُسے تو ایک ہی جیالا اُچک کر لے گیا۔ یہ تھا شیرا قصائی کا چھوٹا لڑکا سنّو۔

سنّو کے پاس نہ تو روپیہ پیسہ تھا، نہ وہ پہلوان تھا اور نہ اُس نے صورت شکل ہی ایسی پائی تھی کہ بشیرن اُس پر فدا ہوتی البتہ اُس میں اتنی خوبی ضرور تھی کہ وہ اپنی روزی آپ کمانے والا عزت

اچانک آکاش کی بلندیوں سے پاتال کے گھنے اندھیرے میں دھکیل دی گئی جہاں ہر طرف لامحدود وسعتوں اور آرزوؤں کے ہزاروں کھنڈر تھے لیکن . . .

مند اور ساری بستی کا ہمدرد تھا۔ اُس کی اِن خوبیوں سے متاثر ہوکر بشیرن نے اُس سے شادی کرلی تھی۔

سنّو کے پاس چار پانچ بیگھے زمین تھی۔ کچھ اِدھر اُدھر سے محنت مزدوری کرلیتا تھا۔ غرض زندگی کے دن بڑے آرام سے گزر رہے تھے۔

سوسائٹی کے پچاس روپے جو باپ کے مرنے کے بعد سنّو کے نام آگئے تھے، وہ بھی بشیرن نے اس فصل پر ادا کر دیئے تھے۔ "قسم ہے اپنی جان کی، میں اس وقت تک گیہوں کا ایک دانہ اپنے خرچ میں نہ لاؤں گی جب تک کہ سوسائٹی کا قرضہ ادا نہ ہو جائے" بشیرن نے عہد کیا تھا۔

ویسے سنّو کا ارادہ تھا کہ اس بار وہ بشیرن کے لئے کچھ ریشمی کپڑے بنا دے۔ اگلی فصل پر سوسائٹی کا قرضہ ادا کردے گا۔



تائی بشیرن کہہ رہی تھی "میرا لال ضرور اپنی ماں کا وعدہ پورا کرے گا۔"

لیکن بشیرن نے اُس سے صاف صاف کہہ دیا "مجھے ریشمیں جوڑا نہیں، تم اور تمہاری عزت چاہیے۔ کپڑے تو پھر کبھی بھی بن جائیں گے لیکن گئی ہوئی عزت واپس نہیں آئے گی"

دوسرے دِن جیسے ہی سوسائٹی کا امین گاؤں میں آیا۔ سنّو نے سارا قرضہ مع سود کے ادا کردیا۔ اب اُسے محسوس ہوا کہ بشیرن نے واقعی اُس کی عزت بچالی تھی۔

بہرحال اب وہ دونوں ہی خوش تھے اور آرام و اطمینان کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُنھوں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ اُداس اُداس سے رہنے لگے ہیں اور اس اُداسی میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔

آخر سنّو سے ضبط نہ ہوسکا۔ ایک رات اُس نے بشیرن سے حسرت بھرے لہجے میں کہا "کیا طاق کے یہ کھلونے ایسے ہی رکھے رہیں گے، بشیرن ؟" آگے اس کی زبان اس کا ساتھ نہ دے سکی

بشیرن نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن آنسوؤں کا سیلاب جسے وہ نہ جانے کب سے روکے ہوئے تھی، سنّو کے اتنا کہنے سے اُمنڈ پڑا۔ لیکن کوئی سسکی یا کوئی سرد آہ پھر بھی اُس نے اپنے ہونٹوں سے نہ نکلنے دی۔

اُن کی بڑھتی ہوئی اُداسی رفتہ رفتہ ایک خلش، ایک کسک کا رُوپ اختیار کرتی جارہی تھی اور پھر اُس میں بتدریج اضافہ ہی ہورہا تھا۔

سنّو نے ایک بار طے کیا کہ اُس طاق میں رکھے سارے کھلونے ہٹا دیئے جائیں۔ شاید اس طرح ان کے دُکھ میں کچھ کمی ہوسکے۔ لیکن ایک شام وہ جب اس ارادہ سے طاق کے پاس جانے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھا تو بشیرن اس پر برس پڑی "اگر تم نے اتنا کم ہمت ہونے کی کوشش کی تو پھر میرا اور تمہارا گزارہ نہ ہوسکے گا۔۔۔"

سنّو کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اچانک اُسے ایسا محسوس ہوا کہ بشیرن نے اُسے پاتال کے کربناک اندھیرے میں جاتے جاتے روک لیا ہے۔ وہ شرمندگی اور پیار کے ایک عجیب امتزاجی انداز سے بولا "بشیرن"!

قریب تھا کہ بشیرن بھی بے قابو ہو کر جذبات کی رَو میں بہہ جاتی، لیکن اُس نے اپنے آپ کو فوراً روک لیا "ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔"

اب یہ اللہ ہی کی رحیمی اور کریمی تھی کہ اتنے عرصہ بعد جبکہ سنّو کیا بشیرن بھی مایوس ہونے کے قریب تھی، اُسے محسوس ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور پھر بہت جلد وہ دن بھی آیا کہ جب وہ حقیقتاً ماں بن گئی۔

سنّو بشیرن سے زیادہ خوش تھا۔ بشیرن سنّو سے زیادہ، گویا اُن کا نوزائیدہ بچہ قدرت کا ایک ایسا انعام تھا۔ جس کے وہ اہل ہی نہ تھے۔

بشیرن نے شاید اُسی پُر مسرت احساس سے جھومتے ہوئے ایک رات نہایت سنجیدہ انداز سے کہا تھا "سُنتے ہو، میں اپنے بابو کو بستی کے دوسرے بچوں کی طرح یونہی آوارہ نہیں پھرنے دوں گی۔ میں اسے پڑھاؤں گی۔"

"ہاں، ہاں میں کب منع کرتا ہوں" سنّو خوشی کے بھرپور احساس سے مگن تھا "تو اسے خوب پڑھانا۔"

"ہاں، اور جب یہ خوب بہت سا پڑھ لکھ جائے تو پھر میں اس کو فوج میں بھرتی کراؤں گی۔"

"ہاں، میرا بہادر بیٹا فوج میں کپتان بنے گا۔"

"اور دُشمن سے لڑے گا بھی تو؟"

"تو اور کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ میرا بیٹا فوج میں بھرتی ہونے کے بعد اپنے وطن کی حفاظت نہیں کرے گا۔ یہ سنّو کا بیٹا ہے۔ اپنی جان دیدے گا لیکن اپنے وطن کی عزت پر دھبہ نہ آنے دے گا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ اُن کا ننھا [illegible] بڑا ہو کر سکول جاتے، کالج پہنچے پھر فوج میں بھرتی ہو۔ وہاں کپتان بنے اور کبھی وطن کی عزت پر حرف آتے تو اپنی جان کی بازی لگا دے۔ سنّو اُن سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا۔

بشیرن جیسے اچانک آکاش کی بلندیوں سے پاتال کے گھنے اندھیرے میں دھکیل دی گئی۔ جہاں ہر طرف لا محدود حسرتوں اور برباد آرزوؤں کے ہزاروں کھنڈر ہیں۔

لیکن کیا مجال کہ اس المناک موقع پر بھی کسی نے بشیرن کے مُنہ سے ایک سسکی بھی نکلتی سُنی ہو۔ وہ جب بھی اپنے آپ پر اس اذیت کو حاوی ہوتا ہوا محسوس کرتی تو آہستہ آہستہ دُعا مانگتی "میرے اللہ پاک، تونے ہی یہ غم دیا ہے۔ تو ہی میری آبرو رکھنا۔"

ویسے تو سنّو اچانک ہی ایک حادثے کا شکار ہوا تھا۔ مگر وہ اکثر بشیرن سے کہا کرتا تھا "اگر میں کبھی اِس دُنیا میں نہ رہوں تو تو اپنا وعدہ مت بھلا دینا۔"

اب سنّو تو اس دُنیا میں نہیں تھا لیکن اُس سے کیا ہوا وعدہ بشیرن کو ضرور یاد تھا۔

وہ محنت کرتی، مزدوری کرتی دن دِن بھر گھر

[illegible]

تو کیا اب مجھ سے کپتان بنانے کا وعدہ بھی نہیں لیتا

سے باہر کھیت کھلیان میں رہتی کبھی ایک وقت کھاکر گزارہ کرلیتی، کبھی دونوں وقت پانی پی پی کر گزار دیتی۔ کپڑے پھٹ گئے ہیں تو کوئی پرواہ نہیں۔ میلے ہیں تو ہوا کریں۔ مگر اُس نے اپنے بابو کی پڑھائی ہر حالت میں جاری رکھی۔

وہ سوچتی اگر بابو پڑھے گا نہیں تو فوج میں بھرتی ہوکر کپتان کیسے بنے گا اور جب وہ کپتان [illegible] بن پائے گا تو پھر اپنے وطن کی حفاظت کیسے کرے گا؟ دشمنوں سے لڑے گا کس طرح؟ اور پھر ستو سے کیا ہوا اس کا وعدہ کیسے پورا ہوگا؟ نہیں، نہیں۔ وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گی۔

"لیکن اماں" آخر ایک روز بابو سے ضبط نہ ہوسکا۔ اب وہ جوان تھا اور اپنی ماں کے ہر دکھ اور تکلیف سے پوری طرح واقف تھا وہ سوچتا۔ اماں نے اُس کے لئے اب تک کیسی کیسی مصیبتیں اور پریشانیاں برداشت کی ہیں۔۔۔۔ کن کن اذیتوں کو اپنے گلے لگایا ہے اور کیسے کیسے حوصلہ شکن مرحلوں سے اپنے آپ کو ہنستے کھیلتے گزارا ہے۔

ایک روز اُس نے اپنی ماں سے نہایت نرم اور پیار بھرے لہجہ میں کہا "اماں، تمہارا وعدہ تو یوں بھی پورا ہوجاتا ہے کہ میں اتنی پڑھائی پر ہی فوج میں بھرتی ہوجاؤں۔ اس طرح کپتان پہلے ہی نہ بن سکوں لیکن اپنے وطن کی حفاظت میں خوب کرسکتا ہوں"

"نہیں میرے لال، اگر بنا کپتان بنے تُو وطن کی حفاظت کرسکتا تو تیرا باپ مجھ سے کپتان بنانے کا وعدہ کبھی نہیں لیتا نہیں، نہیں۔ تُو مجھے دھوکا مت دے"

"نہیں اماں، میں تجھے دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں بنا کپتان بنے۔۔"

"مگر تجھے پریشانی کیا ہے؟"

"نہیں اماں، مجھ سے تیرے یہ دکھ اب نہیں دیکھے جاتے۔ میں کل ہی شہر جاکر اپنا نام فوج میں لکھا دوں گا"

بشیرن لاکھ منع کرتی رہی کہ تو میری پروا بالکل نہ کر، اپنی پڑھائی جاری رکھ۔ لیکن بابو آخر اُسی ماں کا بیٹا تھا، جس نے محنت و مشقت کی چکی میں خود دن رات پس کر جو کچھ بھی ہو سکا اپنے بابو کے لئے کیا مگر کسی دوسرے کے آگے ایک پیسے کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا وہ کیسے یہ سب برداشت کرتا رہتا۔ وہ بہت جلد فوج میں بھرتی ہوگیا۔

اِدھر بابو فوج میں بھرتی ہوا اُدھر کچھ عرصہ بعد ہی اس کی شادی ہوگئی اور پھر ایک دن تائی بشیرن دادی بھی بن گئی۔

اس روز بھی تائی بشیرن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ سارے گھر میں اس طرح گھومی گھومی پھرتی تھی۔ گویا آج پھر وہ ایک عرصہ کے بعد ماں بنی ہے ۔۔۔ وہی خوشی میں برتری کا دھیما دھیما سا احساس، وہی فخر کا ہلکا ہلکا سا سرور، جیسے نسیم سحری میں پھولوں کی کیفیت!

شاید اُس وقت بھی تائی بشیرن پر یہی کیفیت طاری تھی۔ جب اُس نے بابو سے کہا "سُنتا ہے میں اپنے وحید کو بہت پڑھاؤں گی"

"ہاں، ہاں۔ میں نے کب منع کیا ہے" بابو بھی بہت خوش تھا۔

"اور جب یہ بہت سا پڑھ جائے گا تو پھر میں اسے فوج میں بھرتی کراؤں گی"

"کپتان بنانے کے لئے؟" بابو ہنسنے لگا۔

"ہاں، ہاں، کپتان بنانے کے لئے" تائی بشیرن نے پوتے کو اپنی آغوش میں لے کر زور سے بھینچا "تُو میرا وعدہ پورا نہ کرا سکا۔ لیکن میرا یہ لال ضرور اپنی ماں کا منہ اُجالا کرے گا"

"اماں وقت تو آنے دے میں بھی تیرا

منہ کالا نہیں ہونے دوں گا۔"

ایک روز شام کے وقت تائی بشیرن اپنے چار سالہ پوتے وحیدا کی انگلی پکڑے کہیں سے آرہی تھی کہ راستہ میں اس کو برکت اللہ خاں کا بڑا لڑکا رحمت اللہ خاں اور ٹھاکر اجے سنگھ کا لڑکا امر سنگھ باتیں کرتے ہوئے مل گئے۔

امر سنگھ کہہ رہا تھا "حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ ہر وقت چوکس اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے، ہمارے بہادر جوانوں نے دشمن پر وہ کاری ضرب لگائی ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد کرا دیا ہے۔"

"اس میں تو شک نہیں کہ ہمارے جوان بڑی بہادری اور جوانمردی سے لڑ رہے ہیں۔ لیکن ہمیں پھر بھی ہوشیار رہنا چاہیئے۔"

اتنے میں تائی بشیرن ان کے قریب آچکی تھی۔ وہ دونوں احتراماً کھڑے ہو گئے۔ تائی انھیں دعا دے کر کہنے لگی "پرسوں بابو کا خط آیا تھا۔ لکھا ہے۔ ہماری سرحدوں پر دشمن نے گڑبڑ شروع کردی ہے۔ میں اس وقت گھر نہیں آسکوں گا۔"

"ہاں تائی، اس وقت ہماری سرحدوں پر دشمن نے بہت زیادہ گڑبڑ پھیلا رکھی ہے۔" امر سنگھ نے اس کی تائید کی "بلکہ اب تو باقاعدہ جنگ بھی شروع ہو گئی" رحمت اللہ خاں نے بتایا۔

"تو فکر کی کیا بات ہے۔ ہماری بہادر فوج دشمن کو ایسا مزا چکھائے گی کہ وہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھے۔"

"یہ تو ہونا ہی چاہیئے۔"

"اللہ رکھے میرے بابو کو، کیا وہ اپنے جیتے جی اپنے وطن کی عزت پر دھبہ آنے دے گا؟"

"تائی بشیرن کو کوئی کام تھا وہ ان دونوں کے درمیان زیادہ دیر تک نہ رک کر اپنے گھر کی طرف چلدی۔ دروازہ کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے سنتو سے کیا ہوا اپنا وعدہ پھر یاد آگیا مگر اس بار اسے کچھ زیادہ مایوس نہ ہونا پڑا۔ بابو کے الفاظ آج بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے "اماں کبھی موقع تو آنے دے میں بھی تیرا منہ کالا نہیں ہونے دوں گا۔"

اٹھلاتی پتھ پر آتی...



وہ آتی،
دو ٹوک کلیجے کے کرتی،
اٹھلاتی پتھ پر آتی۔
وسن گات مل کر ہیں ایک،
چل رہی اڑیاں ٹیک ٹیک،
سوندریہ دکھانے کو،
اوٹھوں میں مسکانوں کو،
لالی بیچ دنت بجلی چمکاتی۔
وہ آتی،
دو ٹوک کلیجے کے کرتی،
اٹھلاتی پتھ پر آتی۔

ساتھ دو ہیرو بھی ہیں
سدا بال بکھرائے،
دھواں اڑاتے، گانا گاتے
منہ میں پان دبائے۔
بابا کی پاکٹ سے
جب وہ نوٹ اڑاتے
پر یہ پیا سنگ تب پکچر جاتے۔
کبھی کبھی چپل بھی کھاتے
گھر والوں پر جب ٹنکا کی چھایا چھاتی۔
وہ آتی،
دو ٹوک کلیجے کے کرتی،
اٹھلاتی پتھ پر آتی۔

—— سشیل کمار منڈولیا

ا وسن۔ کپڑے گات۔ بدن۔ بجلی۔ لائٹ

ایک شام تائی بشیرن سکتہ کی سی کیفیت میں اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی تھی اور وحیدا اس کے پیروں سے لپٹا ہوا بے تحاشہ چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔

ابھی ابھی تار آیا تھا کہ بابو دشمن سے بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے کام آگیا۔ اس وقت بشیرن تائی کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بالکل نہیں سمجھ پارہی تھی کہ یہ سب کیا ہے ابھی چند دن پہلے ہی اس کی جوان بہو کا انتقال ہوا تھا آج اس کے بیٹے کی موت کی خبر آگئی۔ وحیدا کی فلک شگاف چیخیں اس کے دل و دماغ کی سب چولیں ہلائے دے رہی تھیں۔

قریب تھا کہ وحیدا کے ساتھ ایک بار اس کی بھی چیخ نکل جاتی کہ اس کا سر بُری طرح چکرانے لگا۔ اُس نے ذرا آگے بڑھ کر چھپر کی ٹکانی تھام لی۔ وحیدا ابھی تک اس کے پیروں سے لپٹا ہوا دھاڑیں مار رہا تھا "ابا میرے اچھے ابا، میرے بابو!"

آنکھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب یکبارگی اُمنڈ پڑا۔ اب وہ بار بار سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر ایک بار کسی حد تک اس نے اپنے آپ پر قابو پا ہی لیا "اے میرے اللہ پاک، تو نے ہی یہ غم دیا ہے، تو ہی میری آبرو رکھنا، نہیں تو مجھے موت دے دے نا لیکن میرا پردہ چاک مت کر دینا۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جوان بیٹے اور بہو کی ناگہاں موت نے اس کے ہوش و حواس کھو دئے ہیں اور اب وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے۔

لیکن تائی بشیرن کا کہنا ہے کہ جب بابو بہت پڑھ نہ سکا تو وہ فوج میں بھرتی ہوکر کپتان بھی نہ بن سکا اور نہ ہی وہ بہادری کے ساتھ اپنے وطن کی حفاظت کر سکا اور جب یہ سب کچھ نہیں ہوا تو پھر سنو سے کیا ہوا اس کا وعدہ کبھی کہاں پورا ہوا۔

وہ تو اپنا وعدہ پورا کرے گی۔ وحیدا کو خوب بہت سا پڑھائے گی۔ پھر وہ فوج میں بھرتی ہوکر کپتان بنے گا اور اپنے وطن کی حفاظت کرے گا۔

اُس کی بہکی بہکی باتوں میں کتنی عظیم حقیقت ہے!



"نہ... نا... میں تم سے دودھ نہیں لوں گی۔ تم مزے دار اصلی دودھ خود پی کر ہمیں دودھ میں پانی ملا کر دیتے ہوگے۔"

مقالہ • پریم چند گوسوامی



بے صبری

ایک منٹ رُکیے، کہیں آپ بھی اِس مرض کے شکار تو نہیں !

موٹر، سکوٹر یا مختلف سواریوں سے ہونے والے ۹۰ فیصد حادثوں کی وجہ ہوتی ہے بس، گاڑی چلانے والے یا راہ گیر کی بے صبری۔ کئی بار اس کی وجہ سے صرف نقصان ہی نہیں اُٹھانا پڑتا بلکہ زندگی سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں۔

مثلاً ایک آدمی کو کسی کام سے جلدی سے سڑک پار کرنی ہے اور ٹریفک اِتنا ہے کہ رُکتا ہی نہیں، مسلسل چل رہا ہے۔ راہ گیر سڑک پار کرنے کے لئے بے صبر ہے اِس لئے وہ ایک، دو یا پانچ منٹ کا انتظار نہیں کر سکتا کہ سڑک پر چلتی ہوئی سواریوں کی بھیڑ کو تھوڑا کم ہو جانے دے۔ آمد و رفت کے اُس گیپ کا انتظار کرے جو سڑک پر سواریوں کے گُذرتے وقت بعض اوقات آتا ہے۔ تب جن لوگوں کو پیدل سڑک پار کرنی ہوتی ہے وہ اکثر ایک ساتھ مل کر سڑک پار کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ موٹر گاڑیوں کی رفتار کی پروا کئے بغیر ہی بے صبری سے سڑک پار کرنے کے لئے بڑھ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت ہوشیاری برتنے کے بعد بھی اُنھیں حادثے کا شکار ہونا پڑ جاتا ہے

ایک دو یا پانچ منٹ کا انتظار کر لینے سے راہ گیر کا کچھ بگڑ نہیں جاتا، مگر بے صبری کا بھوت اُس کے ذہنی توازن کو بگاڑ دیتا ہے اور وہ بے قرار ہو اُٹھتا ہے۔

بے صبری کی وجہ سے ہی سواری چلانے والوں کے درمیان ٹکریں ہوتی ہیں۔ سڑکوں پر چلنے والوں کا شکار ہو کر مرنے والوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ کبھی غیر ضروری طور سے اپنی سواری آگے نکالنے کی کوشش میں، کبھی کم جگہ سے ہو کر گذر جانے کی بے صبری میں اور کبھی غلط ڈھنگ سے ڈرائیو کرنے میں نہ جانے کتنے لوگ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

آمد و رفت میں ہی نہیں، زندگی کے ہر صرف شعبے میں بے صبری اپنے کرتب دکھاتی ہے۔ کھانے پینے، کھیلنے کودنے یا دوسرے کاموں میں بھی بے صبری کے بُرے نتائج دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک بار ریل کے سفر میں ایک بے صبر آدمی کو دیکھا تھا۔ گاڑی کسی سٹیشن پر رُکی ہوتی تھی۔ اُن صاحب نے جلدی سے کپ ہاتھ میں

لیا اور گرم گرم چائے پینے لگے۔ اُسی وقت گاڑی نے سیٹی دی۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، چائے کو غٹا غٹ پی گئے اور جیسے ہی پیالے کے انتظار میں کھڑے چائے والے کو خالی پیالہ لوٹانے لگے، اُنھیں چکر آیا بے ہوش ہو گئے۔ گاڑی میں کچھ معالجہ ہو نہیں پایا۔ اگلے سٹیشن تک پہنچتے پہنچتے وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ اپنی بے صبری کی کتنی زبردست قیمت چکانی پڑی اُنھیں! اگر اُس لمحہ وہ چائے بغیر پئے ہی پیالہ لوٹا دیتے اور پیسے دے دیتے تو صرف کچھ پیسوں کا نقصان تھا، لیکن بے صبری میں ایک سانس میں گرم چائے پی جانے کے سبب اپنی جان ہی گنوانی پڑ گئی۔

بے صبری اکثر زیادہ مصروف ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ آپ اپنے اوپر یکے بعد دیگرے ذمہ داریاں لیتے جائیں تو آپ کو عموماً یہ فکر ہوگا کہ فلاں کام ہوا اور فلاں کام نہیں ہوا۔ سب ہی کام ٹھیک وقت پر اور ایک ساتھ ہو جائیں اس خیال کے آتے ہی بے صبری کا جنم ہوگا آپ اُس وقت یہ بھول جائیں گے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے اور بے صبری سے اپنے کام پورے کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگیں گے

اگر تھوڑی سی ہوشیاری اور تحمل سے کام لیا جائے تو آپ کے تمام کام اپنے وقت پر ہو جائیں گے۔ آپ اپنی جلد بازی یا بے صبری سے انھیں پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے۔ بے صبروں کے لئے راجستھان میں ایک کہاوت مقبول عام ہے۔

سب کام اطمینان سے ہوتے ہیں۔ مالی اگر گھڑے میں سیکڑوں گھڑے پانی بھر دے تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ پھل تو اُسی وقت لگیں گے جب اُن کا موسم آئے گا۔

اور اسی کے تحت سماجی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مثلاً کسی بے صبر آدمی کو ریل، بس، سنیما یا سرکس وغیرہ کا ٹکٹ خریدنا ہے، پوسٹ آفس کا مل جمع کرنا ہے، بنک سے روپے نکالنے ہیں، وہ سب لحاظ اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر اُس سے پہلے لائن میں کھڑے ہوئے لوگوں کو منتشر کر دے گا اور پہلے اپنا کام کرنے کی تگ و دو کرے گا

بے صبری میں آدمی کوئی بھی کام طریقے سے نہیں کر سکتا۔ کسی بھی کام کو کرنے کے لئے آدمی کا ذی ہوش ہونا ضروری ہے اور اُس کی توجہ اُسی پر مرکوز ہونی چاہئے۔ اگر آپ کو اپنے کام کی جلدی ہے، گویا بے صبری نے آپ کے ذہن کو مفلوج کر دیا ہے تو یقیناً ہی اُس کام کو پورا کرتے وقت آپ قلم کی بجائے کاغذ، کاغذ کی جگہ پن اور پن کی جگہ پیپر ویٹ اُٹھائیں گے اور جب آپ کی اِس حرکت کا پتہ چلے گا کہ بے صبری کی وجہ سے آپ ایسی بے وقوفیاں کر رہے ہیں تو پیپر ویٹ خود اپنے سر پر دے مارنے کو آپ کا جی چاہے گا۔

آناً فاناً کسی کام کو کر گزرنے کی خواہش بے صبری کے خیال کا ہی نتیجہ ہے۔ بہت سے لوگ یکا یک مالدار ہو جانے کے لئے بے قرار ہو کر کچھ نہ کچھ کر گذرنے کی بات دن رات سوچتے رہتے ہیں۔ جس کام کو پورا ہونے میں مہینوں یا برسوں کی تیاری درکار ہو، بے صبری کی وجہ سے اُسے دنوں اور گھنٹوں میں کر گزرنے کی بے چینی اُن پر سوار رہتی ہے اور کچھ اَنٹ شنٹ کرنے کو اُنھیں اُکساتی ہے۔ اس سے عقل اُلٹ جاتی ہے، توازن بگڑنے لگتا ہے اور دماغ میں بے صبری بڑھتی جاتی ہے۔

بے صبری کی وجہ سے جب انھیں ناکامی دیکھنا پڑتا ہے تو اُن کی آنکھیں کھ

بے صبری کے سبب آدمی ڈسپلن توڑتا ہے — بے صبری سے بچنے کے لئے اپنا شعور بیدار رکھنا

ریختی کہانی مقابلہ • اعزازی انعام • اندرجیت دت

زور آور سنگھ

جسے اپنی زندگی سے زیادہ اپنا فرض پیارا تھا...

ہواؤں کو چیرتے ہوئے اجنبی نوجوانوں
نے جب تقریباً تک پھیلے برف کے ریگستان
کے اُس پار نظریں دوڑائیں تو وہاں زندگی کے آثار
دیکھ کر اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ اُس
کی اُمید کا بجھتا ہوا چراغ ایک بار پھر ٹمٹما اُٹھا۔
وہ چار دن سے تند طوفان کا سامنا کرتا ہوا
راجدھانی کی طرف بڑھ رہا تھا۔
شام کے دُھندلکے میں پہرے دار نے
گھوڑے کی ٹاپ سُن کر اپنا بلّم تانتے ہوئے
زور دار آواز میں، آنے والے کو للکارا۔گھوڑے
دن سے سر لگائے وہ سوار کوئی جواب
بغیر آگے بڑھ آیا۔ پہرے دار کا نیزہ
سے فضا میں چمکا اور اُسی لمحے گھوڑے
جھک کر سوار کو اپنی پیٹھ سے نیچے گرا دیا
نیزہ اُس کی پسلیوں میں پیوست ہو کر
کے دل تک پہنچ جاتا۔
"اور رچھپال! جلدی سے مشعل باہر لا ٹیرو!"
قلعے کے بند دروازے میں ایک چھوٹی
کھڑکی کھلی اور ایک سپاہی ہاتھ میں مشعل لیے
باہر آیا۔ روشنی میں اجنبی کی پوشاک
دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں

سے دیکھنے لگے۔ انھیں بہت حیرت تھی۔
"یہ مسخرہ کہاں سے ٹپک پڑا؟" رچھپال
نے سپاہی سے سوال کیا "لباس سے تو بالکل
درباری مسخرہ معلوم ہوتا ہے لیکن شکل....."
اجنبی کی اُنگلی میں چمکتی ہوئی شاہی انگوٹھی
پر نظر پڑتے ہی پہرے دار کی زبان پر تالا
سا لگ گیا۔ اب قلعے کے بڑے پھاٹک پر
تعینات سپاہیوں اور ان کے سردار کی حالت
خراب تھی۔ جلدی سے اجنبی کو پالکی میں لٹا
کر راج محل پہنچایا گیا۔ مہاراج کے عتاب کے
ڈر سے رات بھر اُن میں سے کسی کو نیند نہ آئی۔

کو تیسرے دن جب ہوش آیا
تو اپنے اردگرد کے ماحول اور
پاس بیٹھی دو حسین لڑکیوں پر نظر پڑتے ہی
اُسے گمان ہوا کہ وہ اپنی منزل سے دُور کسی
دوسری دنیا میں ہے۔
"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"
ان الفاظ کو سُن کر زور آور کو کچھ یقین
ہونے لگا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اس خوبصورت
لڑکی نے دوسری لڑکی کو اشارہ کیا اور وہ

دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ ابھی کمرے
کی ہر ایک چیز کا سرسری جائزہ بھی نہ لے پایا
تھا کہ دروازہ آہستگی سے کھلا اور مہاراج اُس
کے پلنگ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ کنیز
تخلیہ کا اشارہ پاکر دروازہ بند کرتی ہوئی وہاں
سے غائب ہو گئی۔

"نوجوان! تمہاری ہمت اور محنت قابلِ
تعریف ہے۔ یہ تمہارے حوصلے کی پختگی کا پھل ہے
کہ تم نے موت پر فتح پائی ورنہ سب شاہی
طبیب نااُمید ہو چکے تھے۔"

وہ ٹکٹکی لگائے مہاراج کی طرف دیکھ
رہا تھا۔

"تمہاری جیب سے ملا ہوا خط ہم پڑھ چکے
ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کے علاوہ ایک
اور اہم پیغام بھی تم لائے ہو۔"

اُس نے اپنے نحیف ہاتھوں سے اپنی ٹوپی

ساتویں دن ایک شام کو وہ راج محل کے
ایک خاص کمرے میں تھا۔ ایک مرصّع کرسی پر
شاہانہ لباس میں ملبوس، مہاراجہ گلاب سنگھ،
والیٔ جموں و کشمیر رونق افروز تھے۔ اُن کی بغل
میں مہارانی کھڑی تھیں۔

"تو تم ہماری فوج میں بھرتی ہو کر خدمت
کرنے کے ارادے سے اتنی دُور دراز کی مسافتیں
طے کر کے یہاں آئے ہو؟"

"جی حضور" ہزار کوششیں کرنے پر
بھی اُس کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔

ان کے چہرے پر گہری سوچ اور اداسی
کے آثار دکھائی دے رہے تھے،
تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ پھر اُس سے
مخاطب ہوئے "ہماری دلی خواہش بھی یہی ہے۔
ہماری بہن کے خط سے ہمارے بہنوئی کی طرف

سر سے اُتارتے ہوئے کہا "مہاراج کا اندازہ
لفظ بہ لفظ صحیح ہے۔ اِس ٹوپی کی تہہ میں
آپ کی بہن، رانی چمبہ کا پیغام چھپا ہے۔"

"ہمیں تمہاری جان عزیز ہے اس لئے
جب تک تم پورے طور پر صحت یاب نہیں
ہو جاتے ہم تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتے
اس دوران ہر ممکن آسائش تمہیں بہم پہنچائی
جائے اس کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہوگا۔"

ایک بار پھر کھلا اور مہاراج اس
کی ٹوپی ہاتھ میں لئے کمرے سے
باہر نکل گئے۔

سے تم سے کی گئی ناانصافی کا علم بھی ہمیں ہو چکا
ہے لیکن حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ہم
ایک بار پھر تمہیں چمبہ جانے کے لئے کہتے ہیں
وہاں سے لوٹنے پر تمہارے احسانات کا بدلہ
تمہیں اپنی فوج میں موزوں جگہ دے کر ضرور
چکائیں گے۔"

زور آور سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا
چھا گیا، اُمیدوں کے وہ چراغ جو اُس نے تیز
و تُند طوفانی جھونکوں کی زد میں بجھنے نہ دیئے تھے
راج محل کی پُرسکون فضا میں اسے بجھتے ہوئے
دکھائی دیئے۔ پسینے کی بوندیں اس کی پیشانی
پر نمودار ہو کر شبنم کی طرح جم گئیں، اُس نے



ہوئے جسم میں ہلکی سی لرزش ہوئی اور اُس
شہاب ثاقب کے ٹوٹنے پر پیدا ہونے
ا روشنی بن کر مہاراج کے دل پر اثر کیا۔
ن نے آگے بڑھ کر اس کے لڑکھڑاتے
کر اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا۔
"نوجوان! کیا تمہیں ہمارے وعدے پر
ار نہیں؟"
اپنے اندر آئی ہوئی پستی کو جھنجوڑ کر دور
لے ہوئے وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔
"آپ کی سرپرستی میں دنیا کا مشکل ترین
م سرانجام دینے میں میری جان بھی کام آ سکے
یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ مہاراج حکم دیں!
ہے کب یہاں سے روانہ ہونا ہوگا؟"
"شاباش، ہمیں تم جیسے بے خوف انسان
ے اسی جواب کی توقع تھی۔ کل سورج نکلنے
ے پہلے ہی قلعے کا سالار تمہارے یہاں سے
کوچ کر جانے کا بندوبست کر دے گا! یہ لو
وہ خط جو تمہیں سب کی نظروں سے بچا کر بہاری
بھن تک پہنچانا ہے۔"

کی ایک تھیلی آگے بڑھاتے ہوئے
مہاراج نے اپنی بات جاری رکھی
"یہ تمہارا سفر آسان بنانے میں کافی مددگار
ثابت ہوں گی! اچھا خدا حافظ۔"
دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہی جب
وہ تیار ہو کر باہر آیا تو سالار دو سپاہیوں کے
ساتھ اُس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا
اور سواری کے لئے ایک گھوڑا تیار کھڑا تھا۔
زور آور سنگھ نے اُس پر سوار ہونے کی
کوشش کی اور دانستہ رکاب میں پاؤں
اُلجھا کر رہ گیا۔
"او زنخے کی اولاد! یہ شاہی اصطبل کا
بہترین گھوڑا ہے، کوئی بچے کا ٹٹو نہیں جو تم
اپنے آپ اس کی پیٹھ پر پہنچ جاؤ گے۔"
سالار نے دانت پیستے ہوئے دوسری
طرف آکر مدد کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔
زور آور نے ایک جست میں گھوڑے پر سوار
ہو کر ایک لات کس کر سالار کے پیٹ پر
لگائی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔
اُس نے پیچھے مڑ کر کہا "جاتے ہوئے کا

سلام، بھائی جان! امید ہے آپ بخیر ہوں گے
سالار ایک ہاتھ سے پیٹ سہلاتا ہوا، دوسرے ہاتھ میں ہنٹر سنبھال کر اُس کے پیچھے بھاگا لیکن زور آور سنگھ تب تک قلعے کے بڑے دروازے سے باہر نکل چکا تھا

کے معتمد، دستِ راست اور کئی مہموں کے فاتح، سالار حکمت سنگھ سے یہ اُس کی پہلی ملاقات تھی۔

واپسی پر وہ عجلت سے کام نہیں لے رہا تھا کیوں کہ جگہ جگہ پر کٹ کر جانے والے راستوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ سفر کے تیسرے دن ایک دوپہر کو جب وہ چڑھائی پار کر کے تین راستوں کے سنگم پر پہنچا تو پیچھے سے تیزی سے آتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی ہوئی برف پر تڑتڑ کرتی ہوئی گولیوں کی طرح پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونج اُٹھی۔

چار آدمیوں کی حفاظت میں گھوڑے کی پیٹھ پر لگی ہوئی خوب صورت پالکی پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ اُس کے قریب آکر رک گیا۔ آدمیوں کے چہروں پر تعاقب کے خوف و ہراس کے آثار نمایاں تھے، پالکی کا باریک پردہ ایک طرف سرکاتے ہوئے ایک حسین چہرہ نمودار ہوا اور گھبراہٹ میں لپٹے ہوئے شیریں الفاظ اُس کے کانوں سے ٹکرائے "جمّو جانے والا سیدھا اور آسان راستہ ان میں سے کون سا ہے؟"

زور آور سنگھ تصویرِ حیرت بنا اُس حسین پُر وقار چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف پھیلے ہوئے برف کے سمندر میں آسمان سے کوئی پری پالکی میں بیٹھ کر اُتر آئی ہو اور اُس سے مخاطب ہو۔

نازنین نے اپنا سوال دُہرایا۔ زور آور کے ہونٹ کپکپائے لیکن آواز کانٹا بن کر اُس کے حلق میں اُبھر گئی۔ کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس کا ہاتھ جمّو جانے والے سیدھے اور آسان راستے کی بجائے دُوسرے راستے کی طرف خود بخود اُٹھ گیا۔ قافلہ اُس راہ پر گامزن ہو کر پہاڑی کے موڑ پر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

طلسم ٹوٹا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ زور آور سوچ رہا تھا کہ اُس نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا! نہ جانے کب تک وہ اسی حالت میں وہیں کھڑا رہتا اگر پیچھے سے ایک بار پھر گھوڑوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آوازیں اسے چونکا نہ دیتیں۔ آوازیں دم بدم اس کے قریب آتی گئیں اور اُس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ پندرہ سواروں کے ساتھ سالار حکمت سنگھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر معاملے کی اہم اور خطرناک نوعیت کا احساس ہوا۔ حکمت سنگھ نے گھوڑا روکتے ہوئے کرخت آواز میں پوچھا

"کیوں بے آگ کی دم، کچھ دیر پہلے ایک پالکی اور چار آدمیوں پر مشتمل جو قافلہ یہاں سے گزرا ہے اُس نے کون سا راستہ اختیار کیا تھا؟"

"یہ راستہ بھائی جان" زور آور نے لبنان سے مسکراتے ہوئے چمبہ جانے والے بدسے راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک حریف کے منہ سے 'بھائی جان' کے ہتک میز الفاظ دُوسری بار سُن کر حکمت سنگھ کے ن بدن میں آگ سی لگ گئی اور وہ تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے، عقاب کی طرح اُس پر جھپٹا لیکن زور آور کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی شاہی انگوٹھی نے ڈھال بن کر سامنا کرتے ہوئے حکمت سنگھ کے قدم وہیں منجمد کر دیئے۔ اُس نے دانت پیستے ہوئے خون آشام نگاہوں سے اُسے دیکھا اور سپاہیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر آندھی کی طرح بڑھ گیا۔

تیسرا راستہ اُس کے گاؤں کا چکر کاٹ کر چمبہ پہنچتا تھا۔ جتنی بار زور آور نے اس راستے پر گھوڑا ڈالنے کی کوشش کی ہر بار ایک حسین چہرے نے اس کی نظروں کے سامنے گھوم کر اُس کے ہاتھ روک دیئے اور اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی، آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اُسی راستے پر ہولیا جدھر نازنین گئی تھی۔

پہاڑی کا چکر کاٹ کر ایک خطرناک موڑ پر پہنچا تو دو چمکتی ہوئی تلواریں اس کی منتظر تھیں، خطرے کا احساس ہو جانے پر اُس نے اپنا گھوڑا ایک دم روک کر تلوار میان سے کھینچ لی۔ حملہ آور ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے گھوڑوں سے نیچے گر گئے اور زور آور کی تلوار آنِ واحد میں اُن کا لہو چاٹ گئی۔

پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اور دو آدمیوں نے اُس پر ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ ایک کا وار تلوار پر روک کر اُس نے پینترہ بدلتے ہوئے اتنا بھرپور وار کیا کہ اس کا سر کدّو کی طرح گردن سے جُدا ہو کر دُور جا گرا۔ چوتھے آدمی کی تلوار دُور تک زور آور کے کندھے میں پیوست ہو گئی اور دستہ حملہ آور کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا۔ زور آور نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے چوتھے آدمی کو سرپٹ گھوڑا دوڑا کر بھاگتے ہوئے دیکھا اور بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔

"اَے دُکھیوں کے مددگار! اَے سرود شکتی مان! اپنی اِس نادان بچّی کی خطائیں معاف کر! میں اپنی جان کے بدلے اِس نیک سیرت انسان کی جان بخشی کی خواہاں ہوں! میرے پروردگار!!"

زور آور سنگھ نے آنکھیں کھولیں تو گرم گرم آنسو اُس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ چاندی چاندنی میں اُس نے دیکھا کہ نازنین اُس کا سر گھٹنوں پر رکھے اُس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہی ہے۔ پھر کندھے میں درد کی شدّت کا احساس ہونے پر اسے پتہ چلا کہ نازنین نے تلوار زخم سے کھینچ کر اُس پر اپنا ریشمی دوپٹہ کس کر باندھ دیا تھا۔
زور آور کو ہوش میں دیکھ کر اُس کا چہرہ

خوشی سے پھول کی طرح کھِل اُٹھا تھا۔ زورآور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اُس کے گھوڑے کے سوا کوئی اور گھوڑا اُسے دکھائی نہ دیا۔ اُس نے مری ہوئی آواز میں نازنین کو گھوڑا ایک چٹان کے پاس لے آنے کو کہا اور بمشکل اُس پر سوار ہوا۔ اُسی چٹان کے سہارے نازنین اُس کے پیچھے سوار ہو گئی اور اپنے نازک ہاتھوں میں لگام تھام کر گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کیا۔

نے اُسے بتایا کہ وہ چمبہ کے راجہ بلبیر سنگھ کی دُختر کی رشتہ دار ہے۔ اُس کا نام چندر رُکھمی ہے۔ راجدھانی میں وہ مہارانا کی مہمان تھی اور وہ کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر اُس کی شادی سکیت کے بوڑھے حکمران سے کرنے پر بضد تھے۔ موقع پاکر وہ بلبیر سنگھ کے پاس پناہ لینے کی غرض سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ حکمت سنگھ کے تعاقب کی خبر سُن کر راجدھانی سے لائے گئے سپاہیوں نے ایک پڑاؤ پر اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور مجبوراً اُسے نئے آدمیوں کا بندوبست کرنا پڑا۔

وہ بھلے آدمی نہ تھے، لُٹیرے تھے اور راجکماری کے جسم پر چمکتے ہوئے بیش قیمت زروجواہر کا لالچ اُنھیں یہاں تک کھینچ لایا تھا۔ اُسے تنہا پاکر سارے زیورات حوالے کر دینے کے لئے انھوں نے کہا۔ اپنے آپ کو بے یارومددگار پاکر وہ اُن کی بات مان لینا چاہتی تھی کہ موڑ پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے انھیں پہلے آنے والے خطرے سے نپٹنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا اُسے زورآور بخوبی جانتا تھا۔ راجکماری اُس کے اِس احسان پر شکریہ ادا کر کے اسے شرمندہ کر رہی تھی۔ زورآور نے محسوس کیا کہ وہ اُس کے لباس کو دیکھ کر قدرے شرم محسوس کر رہی تھی۔

اُس نے چندر رُکھمی کو بتایا کہ وہ مسخرہ نہیں ہے، بلکہ چمبہ کے پاس ایک چھوٹی سی ریاست کا راجکمار ہے۔ بلبیر سنگھ نے کسی بات پر اس کے باپ سے ناراض ہو کر اُسے قتل کر دیا اور ریاست پر قبضہ جما لیا۔ اُس کی ماں نے گمنامی میں رہ کر ایک گاؤں میں اُس کی پرورش کی۔

جوان ہونے پر جب اُسے حقیقت کا پتہ چلا تو وہ ایک دن تنِ تنہا چمبہ پہنچا اور بلبیر سنگھ کو مقابلے کے لئے للکارا۔ بلبیر سنگھ نے سپاہیوں کی مدد سے اُسے گرفتار کر لیا۔ دوسرے دن دربار میں بُلاکر، اُس کی اس حرکت کو مسخرہ پن کہہ کر مسخروں کی ایک پوشاک اُس کے سامنے رکھ دی اور کہا 'اِس حالت میں زندہ رہے، ورنہ انکار کی صورت میں موت کو گلے لگالے'۔ اُس کی خودداری اِس ہتک آمیز زندگی پر موت کو ترجیح دیتی لیکن اچانک یہ خیال آنے پر کہ اُس کے بعد اُس کی ماں کا کیا حشر ہوگا اور بلبیر سنگھ سے بدلہ کون لے گا؟ اُس نے مجبوراً مسخرے کی پوشاک کو اپنا لیا۔

کی دردبھری داستان سُن کر راجکماری کے دل میں اُس کے لئے ہمدردی اور بھی بڑھ گئی۔ اُس نے اُسے اس زندگی سے نجات دلانے میں ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا۔ چمبہ پہنچتے پہنچتے فضا میں صبح ہونے کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ زخم سے خون زیادہ نکل جانے کی وجہ سے زورآور پر غشی طاری ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر چندر رُکھمی کی نازک باہوں میں لڑھک گیا۔

زورآور سنگھ نے آنکھیں کھولیں تو ایک نازنین اُس کا سر گھٹنوں پر رکھے اُس کی

راجکماری کی جان بچانے کے احسان کے بدلے
بلبیر سنگھ نے زور آور کے بلا اجازت محل سے
ہ جانے کی خطا تو معاف کر دی لیکن اسے مسخرے
زندگی سے نجات دینے کی چندر رشمی کی التجا کو
ں نے کمال چالاکی سے ٹھکرا دیا۔ اُس نے زور آور
ہ کمرے میں صرف مستوروں کی پوشاکیں رہنے دی
یں اور اُسے وہی پوشاک زیب تن کرنی پڑی۔
یر سنگھ نے راجکماری سے کہا کہ اتنے دن سے
ہاں ہونے پر بھی اُس نے کوئی دوسری پوشاک
نتخب نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ
ہ اسی حالت میں رہ کر خوش ہے۔ اب زور آور
ہاراج کی ناراضگی کے ڈر سے راجدھانی بھی واپس
نہ جا سکتا تھا۔ وہ عجیب شکنجے میں گرفتار تھا۔

اُس نے اکیلے میں مہاراج کا پیغام رانی صاحبہ کو دیا۔ وہ خط پڑھ کر اُداس ہو گئیں لیکن خط کے مضمون کے بارے میں اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ کچھ دن بعد راجدھانی سے ایک قاصد آیا اور یہ خبر محل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ مہاراج نے بلبیر سنگھ کو رانی صاحبہ کے ہمراہ راجدھانی طلب کیا ہے۔ چوتھے دن بلبیر سنگھ، رانی کے ساتھ ایک سو سواروں کی حفاظت میں راجدھانی روانہ ہو گیا۔

مگر ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ وہ چند سپاہیوں کے ساتھ ایک شام قلعے میں داخل ہوا۔ اُس کی خستہ حالت بتا رہی تھی کہ اُس نے سارا سفر راستے میں کہیں رکے بغیر طے کیا ہے۔ پھر زور آور کے کانوں نے یہ بھی سنا کہ بلبیر سنگھ راجدھانی سے بھاگا آیا ہے اور حکمت سنگھ اُس کی سرکوبی کے لئے وہاں سے روانہ ہو چکا ہے۔ چمبہ اور ارد گرد کی ریاستوں میں بغاوت کی خبریں ملنے پر مہاراج خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ جلد ہی راجدھانی سے کوچ کرنے والے ہیں۔

ایک صبح قلعے کی دیواروں سے جھانکتے ہوئے لوگوں نے دیکھا کہ چار پانچ سو سوار قلعے کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جنگ کی تیاری کے بگل نے چاروں طرف بھاگ دوڑ مچا دی۔ بلبیر سنگھ، زور آور کو لے کر زرہ بکتر اور جنگی سامان کے مخصوص کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے زرہ بکتر پہناتے ہوئے زور آور سنگھ کو محسوس ہوا کہ خوف و ہراس کے آثار بلبیر سنگھ کے چہرے پر دم بہ دم بڑھتے جا رہے ہیں۔ اُس کے سر پر فولادی خول رکھ کر جب اُس نے آئینہ دکھایا تو اچانک بلبیر سنگھ اس کے قدموں پر جھک گیا۔

"میری جگہ تم حکمت سنگھ کا مقابلہ کرو گے تم خود



سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہی"



یہ لڑکیاں

اکثر میں آفس سائیکل سے ہی جایا کرتا ہوا، لیکن اُس دن سائیکل خراب ہو جانے کے سبب مجھے بس پکڑنے کے لئے وکل بس سٹینڈ تک آنا پڑا۔ بس سٹینڈ پر دو تین آدمی اور ایک اپٹوڈیٹ لڑکی بھی اِنتظار میں کھڑے تھے۔ کافی دیر تک کوئی بس نہیں آئی۔ میں نے سوچا کوئی رکشا آجائے تو اُسی سے چلوں۔ بس نہیں آئی مگر سواری رکشا والا آ پہنچا۔ اُس نے کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ چل رہی ہیں؟ بیس پیسے سواری؟"

لڑکی نے انکار کر دیا۔ بس نہ آنے سے مجھے لگ رہا تھا کہ آفس پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ تبھی ایک خالی رکشا آیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لڑکی بول اُٹھی "رکشا خالی ہے؟"

رکشا والے نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا "آئیے، بیس پیسے سواری یا پورے رکشا کے لئے چالیس پیسے۔"

لڑکی نے رکشا میں بیٹھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا آپ چلیں گے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا اور بس سٹینڈ پر کھڑے سب لوگ ہنس پڑے۔

——— سُریش کمار اگروال، لکھنؤ

> یہ لڑکے اور یہ لڑکیاں نمبروں کے لئے اپنے تجربے بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
>
> ——— ایڈیٹر

ہو کر آؤ گے تو میں تمہاری ریاست واگذار کر دوں گا۔"

"ایک درباری مسخرہ اور اتنے طاقت ور سالار کا مقابلہ کرے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"زور آور! یہ وقت مذاق کا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اُس کا مقابلہ کر سکتے ہو۔"

جواب کا انتظار کئے بغیر وہ زرہ بکتر اُتار کر زور آور کو پہنانے لگا۔ زور آور کے باہر نکلتے ہی تین سو سواروں نے ننگی تلواریں فضا میں بلند کرتے ہوئے 'راجہ بلبیر سنگھ کی جے' کا نعرہ لگا کر اُس کا استقبال کیا۔ قلعے کی خندق کا پُل سرنگوں ہوتے ہی وہ دُشمن پر ٹوٹ پڑے۔

ہر طرف لوہے سے لوہا ٹکرانے لگا۔ حکمت سنگھ نے اُس کے بالمقابل آ کر ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہوئے اپنی تلوار کا بھرپور وار اُس پر کیا۔ زور آور نے کمال پھُرتی سے اُس کا وار ڈھال پر روک کر جوابی وار کیا۔ حکمت سنگھ گھوڑا پیچھے ہٹا کر اُس کا وار نہ بچاتا تو اس کی موٹی گردن کبھی کی مُولی کی طرح کٹ کر تن سے جدا ہو چکی ہوتی۔ حکمت سنگھ کو اتنے سخت مقابلے کی خواب میں بھی توقع نہ تھی۔ وہ بلبیر سنگھ کی بزدلی سے بخوبی واقف تھا لیکن یہاں حالات خلافِ توقع پا کر وہ زور آور پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑا۔ جوش میں ہوش نہ رہنے پر اس کے سارے وار خالی گئے۔ زور آور سنگھ نے موقع پا کر ایک زبردست وار اُس کے سر پر کیا اور حکمت سنگھ کا لوٹ پوٹ کر رہ گیا۔

راجکماری اور دوسرے لوگ اپنے دل ہتھیلیوں پر لئے قلعہ کی دیواروں سے اس زبردست جنگ کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک بلبیر سنگھ کی تلوار کی نوک زور آور کے نقاب کی ایک ڈوری سے اُلجھی اور نقاب اُس کے چہرے سے دم بھر کے

بھنک گئی۔ بلبیر سنگھ کے بھیس میں ایک سنترے کو سامنے پاکر حکمت سنگھ انگشت بدنداں رہ گیا۔ آخر زور آور سنگھ کے حملوں کی تاب نہ لاکر وہ جان بچاکر بھاگا۔

گھوڑا دوڑا کر سیدھا محل کے دروازے پر پہنچا اور اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بلبیر سنگھ نے تیزی سے زرہ بکتر اس کے جسم سے الگ کی اور اُسے وہیں ٹھہرنے کے لئے حکم دے کر باہر نکل گیا۔ باہر آج کی اِس شاندار فتح پر لوگ خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ فضا میں بلبیر سنگھ کی جے جے کار کے فلک شگاف نعروں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اسے مبارک باد پیش کی وہ چندر مکھی تھی۔

بلبیر سنگھ کچھ دنوں کے بعد تمام قیمتی زرد جواہر خچروں پر لدوا کر ایک سو سپاہیوں کے ساتھ تبت کی سرحد پر قزاقوں کے راجہ سے مدد حاصل کرنے کا بہانہ کر کے چمبہ سے کوچ کر گیا۔ زور آور بخوبی جانتا تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ قلعے میں کئی دن تک طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہیں۔ آخر ایک دن مہاراجہ گلاب سنگھ کے چھوٹے بھائی راجہ دلبھ سنگھ نے دھوم دھام سے قلعے میں داخل ہو کر چمبہ کا گورنر مقرر کئے جانے کا اعلان کیا تو لوگوں نے چین کی سانس لی۔

چندر مکھی کی حالت قابلِ رحم تھی۔ بلبیر سنگھ نے زور آور سے رومانی نظمیں لکھوا کر اُسے اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور حکمت سنگھ کو شکست فاش دینے والے فریب میں آکر وہ ہزار جان سے اُس پر فدا ہو چکی تھی۔ بلبیر سنگھ کی یاد میں وہ بن کھلے پھول کی طرح کمہلانے لگی۔ اِدھر زور آور قسمت کی اس ستم ظریفی پر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ وہ

یہ  لڑکے

میرا ایک دوست ایک دن برآمدے میں کھڑی لڑکیوں کے پاس گیا اور ایک تیز طرار لڑکی سے بولا "ارے آپ یہاں بات کرنے میں لگی ہیں اور باہر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

وہ لڑکی پہلے تو کچھ سمجھ نہیں پائی کہ کون کس کا انتظار کر رہا ہے، مگر تھوڑی دیر میں جب اُسے میرے دوست کی حرکت کا پتہ چلا تو ناراضگی سے بولی "کیا مطلب ہے تمہارا؟ لڑکیوں کو چھیڑتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"ارے، آپ تو بُرا مان گئیں" وہ ہکلاتا ہوا بولا "میں نے آپ کو کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔"

دفعتاً سب لڑکیاں ایک آواز ہو کر اُس پر برس پڑیں "اب تو تمہیں بتانا ہی ہوگا کہ کون انتظار کر رہا ہے۔"

میرے دوست کو اس اجتماعی حملے سے بچنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور لڑکیاں جواب پانے کے لئے مُصر تھیں۔

اُس کی بدحواسی دیکھ کر میں لڑکیوں سے مخاطب ہوا "دراصل، اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ چھٹی کبھی کی ہو چکی ہے گیٹ پر بے چارے رکشے تانگے والے سواریوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

میرے اس جواب سے تمام لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور میرے دوست کی جان بچی

— پردیپ کمار شرما چلبلا



یہ جانتا تھا کہ حقیقت کا علم ہونے پر نتیجہ اُس کے حق میں اچھا نہ نکلے گا۔ اس لئے وہ راجکماری کو حقیقت سے روشناس کرانے سے قاصر تھا۔

دن زور آور کو اپنی ماں کی بیماری کی اطلاع ملی اور وہ ولبھ سنگھ سے اجازت لے کر اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ جاتے ہوئے چندر رُکھمی کو الوداع کہتے وقت اس نے شاہی انگوٹھی اُسے دیتے ہوئے کہا کہ جب بھی ضرورت محسوس ہو وہ انگوٹھی بھیج کر اسے طلب کر لے۔ زندہ ہوا تو سَر کے بل چل کر حاضرِ خدمت ہوگا۔ لیکن دراصل اُس نے ہمیشہ کے لئے چمبہ چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کیونکہ گمنام اور یک طرفہ محبت کے شعلوں میں جُھلستے ہوئے زندہ رہنے کی تاب اب اُس میں نہ تھی۔

گاؤں پہنچنے کے چند دن بعد اُس کی ماں بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پہ ناکامیوں کے تھپیڑے کھا کھا کر، ٹوٹا ہوا دل لئے، حسرت و یاس کے بڑھتے ہوئے سایوں میں اپنے گاؤں میں زندگی دن کاٹنے لگا۔

لیکن کون جانتا تھا کہ بدقسمتی سے ابھی اس کی آنکھ مچولی بالکل ختم نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی قریب ہی کسی موڑ پر اُس کی منتظر ہے۔ ایک دن ایک سوار نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ سامنا ہونے پر اس نے شاہی انگوٹھی زور آور کو دی اور اپنی راہ لی۔ دُوسرے دن صبح زور آور سنگھ چمبہ میں راجکماری کے سامنے کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر چندر رُکھمی کا چہرہ ایک لمحہ کے لئے کنول کی طرح کھِل اُٹھا۔

زور آور کو احساس ہوا جیسے اس کے لب ایک طویل عرصے کے بعد ہنسی سے آشنا ہوئے ہوں۔ راجکماری نے اُسے بتایا کہ مہاراج چند دنوں کے بعد چمبہ پہنچنے والے ہیں اور وہ والیٔ سکیت کی رانی بننے کے لئے ہمیشہ کے لئے چمبہ چھوڑنے والی ہے۔ جانے سے پہلے آخری بار اپنے محسن سے ملاقات کی آرزو نے اُسے انگوٹھی بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اُسی شام محل میں ایک شاندار جشن ہونے والا تھا۔ چندر رُکھمی کے اصرار پر جب وہ اپنی مخصوص پوشاک میں وہاں پہنچا تو ہر طرف سے چھیڑ چھاڑ کے جملوں نے اس کا استقبال کیا مسخرے کی طرف سے حاضر جوابی کا ایک لفظ بھی نہ سُن کر سب حاضرین حیران تھے۔

اچانک حکمت سنگھ کی نظر اس پر پڑی وہ اُن دنوں ایک سرحدی قلعے کا گورنر تھا اور اُسی دن راجہ ولبھ سنگھ کی دعوت پر چمبہ پہنچا تھا۔ اس لئے زور آور کو اُس کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا اُس کے قریب آ کر رُکا اور جام والا ہاتھ بلند کر کے بولا

" ایشور کی قسم! حکمت سنگھ سے تین بار سامنا ہونے اور زندہ بچ نکلنے والا انسان اگر کوئی اس دنیا میں ہے تو وہ یہ مسخرہ ہے۔"

حالت مری پلکوں پہ نہ ہوتے اگر آنسو

ہنگامے ہوا [illegible] نہ ہوتے — گر ہم ہوتے کے بدلے ہوتے انکار نہ ہوتے
آتا ہو [illegible] ہے نہ رہتا — [illegible] عمر سایہ دیوار نہ ہوتے
کچھ کارِ یار ہوتی [illegible] جگر کی — شاداب کبھی ہجر کے گل زار نہ ہوتے
قیمت مری [illegible] کے پلکوں کی ہے ورنہ — یہ چھینے [illegible] حاصلِ معیار نہ ہوتے
رقصاں مری پلکوں پہ نہ ہوتے اگر آنسو — [illegible] کو [illegible] کبھی نمودار نہ ہوتے
فن کو نہ بنا تے کبھی جو وعظِ انسان — [illegible] جو اس دور کے فنکار نہ ہوتے
ادراک کا سوز جو [illegible] ہم کو نہ ملتا
ہم [illegible] اپنے یہ اشعار نہ ہوتے

— عبدالمتین نیاز

کے یہ الفاظ سن کر سب سردار اُن دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ راجدھانی اور پہاڑی راستے پر ہوئی مڈبھیڑوں کا سرسری ذکر کرنے کے بعد جب بلبیر سنگھ کے بھیس میں اس سے ٹکر لینے کی روداد حکمت سنگھ نے سب کو سنائی تو لوگ حیرت سے زور آور کو دیکھتے رہ گئے۔ چاروں طرف سے واہ واہ کے نعرے بلند ہو اٹھے۔ حکمت سنگھ نے مدھم لیکن ہتک آمیز لہجے میں زور آور کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا

"لیکن یاد رکھو اگر چوتھی بار تم نے میری راہ کاٹی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں زندہ نہ رکھ سکے گی۔"

اتنا کہہ کر وہ پُر معنی نظروں سے چندر مکھی کی طرف دیکھتا ہوا بھیڑ میں گم ہو گیا۔ جب زور آور سنگھ چندر مکھی کے پاس پہنچا تو اس نے حقارت سے منہ پھیرتے ہوئے اس سے کہا "بلبیر سنگھ کو میری نظروں میں بہادر ثابت کر کے جو صدمہ تم نے میرے دل کو پہنچایا ہے اس کے لئے شاید میں تمہیں تمام عمر معاف نہ کر سکوں۔"

راجکماری کے یہ جملے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اُس کے کانوں میں پڑے اور وہ دل تھامے، بوجھل قدموں سے اپنے جسم کو گھسیٹتا ہوا کمرے تک پہنچا اور اوندھے منہ بستر پر گر کر زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا۔

دُوسرے دن جب یہ پُر اندوہ خبر اُس کے کانوں میں پڑی کہ رات کو راجکماری نے زہر کھا کر خود کشی کر لی تو فرطِ غم سے وہ پاگل ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا اُمڈ پڑا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں پڑا رہا۔ قلعے کے گھڑیال نے رات آدھی سے زیادہ ڈھل جانے کی منادی کی تو وہ وہاں سے جلد از جلد کہیں دُور چلے جانے کی نیت سے باہر آیا اور اپنے گھوڑے پر زین کس کر سر جھکائے قلعے کے بڑے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔

راجپوتوں کے دستور کے مطابق چندر مکھی کی لاش قلعے کے ایک کونے میں بنے ہال میں رکھی گئی تھی جسے دوسرے دن صبح نذرِ آتش کیا جانا تھا۔ اُس کے قدم بے اختیار اُس ہال کی

طرف اٹھنے لگے۔ ایک اندھیرے مقام پر گھوڑا
باندھ کر، اپنے پیچھے ہال کا دروازہ بند کرتے
ہوئے وہ تابوت کے پاس پہنچا، کافوری شمع
کی روشنی میں راجکماری کے چہرے پر ایک روحانی
مسرت تیر رہی تھی۔ زور آور سنگھ کی آنکھوں سے
آنسو ٹپک ٹپک کر اُس کا مرمریں چہرہ بھگونے
لگے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ ٹکٹکی لگائے
دم بخود اُسے دیکھتا رہا۔ اچانک یہ احساس
ہونے پر کہ چندر ریکھی کے جسم میں خفیف سی
حرکت ہوئی ہے اُس نے جلدی سے کفن میں
ہاتھ ڈالا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے۔
اُسی لمحہ ہال کے باہر بھاری قدموں کی
چاپ نے بڑھتے ہوئے خطرے کا پتہ دیا اور
وہ جلدی سے لاش کفن سے نکال کر کونے
میں رکھے کپڑوں کے ایک ڈھیر کی طرف
لپکا۔ کپڑے ہٹا کر، لاش نیچے رکھ کر وہ اوپر
لیٹ گیا اور کپڑے اپنے اوپر ڈال لئے۔ تبھی

ہال کا دروازہ کھلنے کے ساتھ کئی قدموں کے
اندر داخل ہونے کی آوازیں اسے سنائی دیں۔
"جلدی سے لاش نکال کر باہر لے آؤ"
یہ الفاظ حکمت سنگھ کے تھے۔
"حضور تابوت تو ایک دم خالی ہے" ایک
کانپتی ہوئی آواز ہال میں گونج اٹھی۔
"ہال کا کونہ کونہ چھان مارو۔"
پھر چاروں طرف دوڑتے ہوئے قدم
زور آور سنگھ کے دل کی دھڑکنوں کا ساتھ
دینے لگے۔ کچھ قدم کپڑوں کے ڈھیر کے
بالکل قریب سے نکل گئے۔ زور آور کا سارا
جسم خوف سے پسینے پسینے ہوگیا۔ وہ سوچ رہا
تھا کہ ابھی کئی ہاتھ کپڑوں کے ڈھیر کی طرف
لپکنے والے ہیں۔ لیکن ایسا نہ ہوکر سب قدم
ہال کے دروازے کی طرف جاکر غائب ہوگئے۔
"معلوم ہوتا ہے کہ راجکماری کو گہری
بے ہوشی کی دوا پلائے جانے کی سازش کا راز
دلیپ سنگھ پر افشا ہوچکا ہے۔ تم سب قلعے
کے چور دروازے سے نکل کر مقررہ مقام پر پہنچ
کر ہمارا انتظار کرو۔"

کے لہجے میں گھبراہٹ اور ناکامی کے
آثار نمایاں تھے۔ تھوڑی دیر بعد
ہال میں ایک بار پھر موت کی سی خاموشی طاری
ہوچکی تھی۔ زور آور سنگھ، راجکماری کے پاؤں
کے تلوے جلدی جلدی مسل کر اُسے ہوش میں
لانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ چندر ریکھی اپنے
آپ کو اس حالت میں دیکھ کر چیخنے والی تھی
کہ اس نے اُس کے منہ پر آہستہ سے ہاتھ
رکھ دیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اُسے
موقع کی نزاکت کا احساس دلایا۔ تھوڑی دیر
بعد کپڑوں کے ڈھیر سے ایک لبادہ اوڑھا
گھوڑے پر بٹھا کر وہ تیزی سے قلعے کے دروا
پر پہنچا۔ شاہی انگوٹھی نے ایک بار پھر اُسے

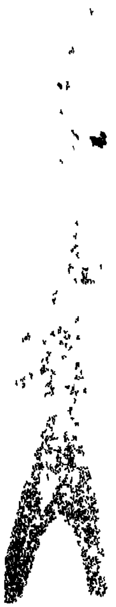
مدد کی اور پہرے دار سے ہاتھ میں کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

ہونے تک وہ دس میل دُور ایک گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ راجکماری اب بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ گاؤں کے باہر ایک خالی جھونپڑے میں اُسے لٹا زور آور سنگھ اُس کے لئے کپڑوں اور کھانے کا بندوبست کرنے کے لئے گاؤں چلا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد ہی پہنچتے ہی چند سواروں نے اُسے گھیر لیا۔ چاروں طرف سے اپنے آپ کو حکمت سنگھ کے آدمیوں کے نرغے میں گھرا پا کر وہ سٹپٹا اُٹھا۔

حکمت سنگھ نے چندر مکھی کی لاش کے بارے میں پوچھا تو زور آور نے لاش کے غائب ہونے اور اس گاؤں میں اپنی موجودگی کے لئے کئی بہانے بنائے لیکن حکمت سنگھ کو یقین نہ ہوا اور وہ اُسے حراست میں لے کر سرحدی قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔

شام ہونے پر وہ قلعے میں داخل ہوئے۔ حکمت سنگھ نے چندر مکھی کا پتہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زور آور نے اُس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ آخر اُس نے ہار کر ایک سردار اور چند سپاہیوں کو اُسی گاؤں کے گرد و نواح میں چندر مکھی کو تلاش کرنے کے لئے روانہ کیا۔

حکمت سنگھ نے زور آور سنگھ کو سامنے ایک ستون کے پاس فرش پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر اُس نے اپنی کرخت آواز میں ایک لڑکے کو جام میں شراب بھرنے کا حکم دیا۔ ڈر کے مارے لڑکے کا ہاتھ شراب جام میں انڈیلتے ہوئے کانپا اور تھوڑی سی شراب حکمت سنگھ کی پوشاک پر جا پڑی۔ اس نے غصے سے پاگل ہو کر لڑکے کو بالوں سے پکڑ کر ہوا میں اُچھالا اور تلوار نیچے رکھ دی۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ لڑکے کا جسم دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔



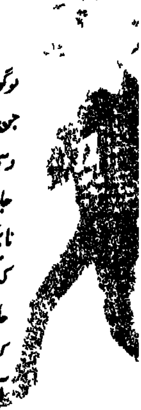
بیں کھڑے لڑکے کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ایک شعلہ نمودار ہوا اور آنسوؤں کی شکل اختیار کرتے ہوئے اُس کی سفید داڑھی پر بکھرنے لگا۔ حکمت سنگھ کی تالی کی آواز پر ایک قوی ہیکل انسان ہال میں داخل ہوا اور لڑکے کی لاش اُٹھا کر چپکے سے ایک کمرے میں غائب ہو گیا۔ بربریت کا یہ ہولناک منظر دیکھ کر زور آور کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ حکمت سنگھ نے پے در پے کئی جام چڑھائے اور لڑھک گیا۔

آدھی رات کے قریب کسی دوسرے قلعے کے ایک ایلچی نے حکمت سنگھ کے سامنے حاضر

ہوکر اُسس قلعے کے گورنر کا خط پیش کیا۔ حکمت سنگھ نے پیغام پر سَرسَری نظر دوڑاکر خط میز پر پھینک دیا اور بوڑھے چوب دار کو اُسے خاص کمرے میں ٹھہرانے کا حکم دیا۔

وقت حکمت سنگھ نے ایک معنی خیز ۔۔۔ اشارہ ایلچی کی ٹوپی کی طرف کیا۔ کچھ دیر بعد جب بوڑھے نے قاصد کی ٹوپی لاکر حکمت سنگھ کے سامنے رکھ دی تو زور آور کے کان کھڑے

تخفیف



اوکل ہاما کے چکاشا شہر میں گنجے لوگوں نے ایک کلب کی بنیاد رکھی ہے جن ممبران کی بھوؤں پر بھی بال نہیں ہوتے وہی اس کلب کے عزّت مآب ممبر شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کلب نے شہر کے تمام نائیوں کے روبرو ایک پیش کش رکھی ہے کہ اُن سے حجامت کے دام آدھے لئے جائیں۔ نائیوں کو اس بات سے اتفاق کرنا پڑا اور اب چکاشا شہر میں آباد ہر گنجا آدھے داموں میں حجامت بنواتا ہے۔

ہوگئے۔ حکمت سنگھ نے ٹوپی کی تہہ سے ایک خط نکال کر پڑھا اور ایک ہلکی سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر اُبھر آئی۔ پھر اُس نے خط میز پر رکھ کر ایک اور جام پیا اور دوبارہ صوفے پر دراز ہوکر اونگھنے لگا۔

زور آور کو جب یقین ہوگیا کہ حکمت سنگھ سو رہا ہے تو وہ دبے پاؤں میز کے قریب پہنچا۔ میز پر رکھے ہوئے خط کو پڑھ کر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔ خط آہستہ سے جیب

میں ڈال کر اُس نے دُوسرا خط موم بتی کی لَو پر رکھ دیا اور چپکے سے اپنی جگہ پر آکر لیٹ گیا۔ کاغذ کے جلنے کی بدبو سے حکمت سنگھ ہڑبڑاکر اُٹھا، خط کا باقی حصّہ اس نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیا اور زور آور سنگھ کو سوتا پاکر اطمینان سے پھیل کر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب حکمت سنگھ کے خراٹوں کی آواز پھر سنائی دینے لگی تو زور آور چپ چاپ بوڑھے کے کمرے میں گیا۔ بوڑھا اب بھی جاگ رہا تھا۔ زور آور نے اُسے خط کے مضمون سے آگاہ کرکے اپنے لڑکے کے بے رحمانہ قتل کا بدلہ لینے کے لئے وہ خط وہاں سے تیس میل دُور ایک قلعے میں مقیم مہاراجہ گلاب سنگھ کی خدمت میں راتوں رات لے جاکر پیش کرنے پر تیار کرلیا۔

بمشکل اپنی جگہ پر آکر لیٹا ہی تھا کہ وہاں کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور راجکماری سپاہیوں کی حراست میں اندر داخل ہوئی۔ زور آور کا دل بجھنے لگا۔ حکمت سنگھ، راجکماری کو سامنے پاکر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھ بیٹھا۔ چندر مکھی کی نظر ستون پر سر ٹکائے زور آور پر پڑی اور وہ چیخ اُٹھی۔

"او شیطان، تُو نے اس نیک سیرت انسان کو یہاں قید کر رکھا ہے اور میں تمام دِن جھروکے میں اس کا انتظار کرتی رہی؟"

اتنا سُنتے ہی حکمت سنگھ کی آنکھیں غصّے سے سُرخ ہوگئیں۔ اُس نے اُٹھ کر سپاہیوں کو اُنھیں اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اُس میں گھس گیا۔ زور آور کے دونوں ہاتھ دو مضبوط کھمبوں سے باندھ دیئے گئے۔ اُس کے ننگے جسم پر کوڑے برسائے اس وقت تک بند نہ کئے گئے جب تک سسکیوں بھرے الفاظ میں چندر مکھی نے حکمت سنگھ سے شادی ۔

لئے رضامندی کا اظہار نہ کرکے وقتی طور تسلی دے دی۔
دوسرے دن صبح، ہال میں سہنے منڈپ پر حکمت سنگھ دولہا بنا بیٹھا تھا اور راجکماری دلہن کے لباس میں اُس کے بغل میں بیٹھی تھی۔ ایک کونے میں کھڑے زور آور سنگھ کی مایوس نگاہیں بار بار دروازے سے ٹکرا کر چندر مکھی کے افسردہ چہرے پر آکر جم جاتیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وردھے کو مہاراج تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا اور اُن کے یہاں تک پہنچنے میں تھوڑی دیر اور لگ گئی تو اُس کا کیا حشر ہوگا؟ پنڈت ڈر سے کانپتے ہوئے جلدی جلدی منتر پڑھ کر اُس کی ناامیدی میں دم بدم اضافہ کر رہا تھا۔ تبھی باہر شور و غل کی آواز سنائی دی اور مہاراج کے سپاہی پلک جھپکتے ہی قلعے کے کونے کونے تک پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ حکمت سنگھ معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگا پاتا وہ سپاہیوں کے نرغے میں گھر چکا تھا۔

دیر بعد ایک تخت پر مہاراج رونق افروز ہوئے۔ حکمت سنگھ کی مشکیں کس کر اُسے اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُنھوں نے معیہ خط اس کے منہ پر مار کر اسے اپنی صفائی کا موقع دیا۔ اُسی لمحہ اُن کے اشارے پر رومال سے ڈھکا ہوا ایک تھال وہاں لایا گیا۔ تھال حکمت سنگھ کے سامنے لے جا کر اُس پر سے رومال اٹھایا گیا تو اُس میں رکھے دوسرے قلعے کے گورنر کا سر دیکھ کر اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اب اُس کے پاس صفائی کے لئے رہ ہی کیا گیا تھا۔

"لے جاؤ اس نابکار کو یہاں سے اور اس کا سر کاٹ کر قلعے کی دیوار پر لٹکا دو۔ اس کے جسم کو کتوں اور گدھوں کی خوراک بننے کے لئے میدان میں پھینک دو تاکہ آئندہ کسی کو نمک حرامی کی جرأت نہ ہو۔"

... سنگھ وہاں سے لے جانے کے بعد وہ چندر مکھی اور زور آور سنگھ کی طرف متوجہ ہوئے "نوجوان، تمہیں یاد ہوگا کچھ عرصے پہلے راجدھانی کے ایک محل میں ہم نے تم سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ تم سے ہوئی ایک چھوٹی سی غلطی کے مقابلے میں تمہارے احسانات کا بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ آج ہم تمہیں منہ مانگا انعام دینے میں دلی مسرت محسوس کریں گے۔

شاندار نتیجہ

ایک کمپنی کے جنرل منیجر نے اپنے عملے کی حوصلہ افزائی کے لئے دفتر میں جگہ جگہ بورڈ لگوا دئے — "جو کرنا ہے آج ہی کر گذرو"۔
کچھ دن بعد اُس کے ایک دوست نے پوچھا "کہو بھائی، تمہارے نئے تجربے کا کیا اثر ہوا؟"
"بہت کچھ ہوا" منیجر بولا "خزانچی بیس ہزار لے کر بھاگ گیا۔ اور دو کلرکوں نے تنخواہ بڑھانے کے لئے بھوک ہڑتال شروع کر دی"

پھر مہاراج نے راجکماری سے مخاطب ہو کر کہا "نادان لڑکی، تم نے اپنے ہاتھوں ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑے چلائے ہیں۔ واقعی سکھیت اب بھی تمہاری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ اگر تم چاہو تو اپنی بھول سدھار کر اپنی زندگی کا دامن سکھ کے پھولوں سے بھر سکتی ہو۔"
اُس وقت زور آور سنگھ نہایت مودبانہ

(آگے صفحہ ۱۴۸ پر

شراب اور شباب

مسلسل ناول — جان او ہند

شہنشاہ جہانگیر کا شاہی پڑاؤ اجمیر میں تھا۔ جہانگیر کی زیادہ شراب نوشی ملکہ نورجہاں کے لئے باعثِ فکر بنی ہوئی تھی۔ ایک رات شہنشاہ بے حد شراب پی کر بے ہوش ہو گئے۔

شہنشاہ کی بے پناہ مے نوشی کے علاج کے لئے نورجہاں نے اپنے ایک وفادار منصب دار رُستم کو ایک مشہور حکیم شہاب کو بلانے کے لئے قاصد بنا کر بھیجا۔ رُستم نے اپنے جانے کی خبر دو اور منصب داروں کو دیدی۔

شاہی حرم کی ایک ۶۰ سالہ خاتون خالدہ بیگم جسے کسی زمانے میں اعلیٰ رُتبہ حاصل تھا، لیکن وقت کے ساتھ اُس کی شان اور رتبہ اس سے چھن گیا تھا، وہ اب نورجہاں کی طاقت سے کڑھنے والوں میں پیش پیش تھی۔ نادرہ لونڈی بھی اُس کے پاس رہتی تھی۔

فریبہ بوڑھی خالدہ بیگم کے یہاں ایک جادوگر کو لے کر جاتا ہے وہ جادوگر سے یہ راز جاننا چاہتی ہے کہ شاہی حرم کی ایک خاتون نے شہنشاہ کو کس طرح اپنے بس میں کر رکھا ہے۔ بیگم اُس جادوگر کا سِتّے کی ترکیب بھی پوچھتی ہے۔ باندی نادرہ بھی جادوگر کی باتوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

جس قافلے کے ساتھ رُستم کا جانا طے ہوا تھا وہ اُس کے جانے سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔

جب رُستم دوبارہ چلنے لگا تو نادرہ اُس سے ملنے کے لئے اُس کے خیمے میں گئی اور جوشِ محبت میں اُس سے ہم آغوش ہو گئی۔ اُس نے رُستم کو ایسا سحر زدہ کیا کہ وہ اُس کی جیب میں سے نورجہاں کا رقعہ نکال لے گئی اور رُستم کو پتہ نہ چل سکا۔ چلتے وقت رُستم کو دفعتاً اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اُسی وقت نادرہ بھی اُس کے سامنے آگئی اور نورجہاں کا خط اُسے واپس کر دیا۔

راستے میں رُستم کو مختلف اطراف کو جانے والے کئی قافلے ملے۔ ایک قافلے کے ساتھ چلنے والی ایک پری چہرہ حسینہ کو دیکھ کر رُستم اُس پر فریفتہ ہو گیا۔

رُستم ایک راجپوت سردار کے قافلے کے ساتھ چلنے لگا۔ ایک پڑاؤ پر پہنچ کر رُستم نے شب گذاری کی۔ اچانک رات میں اُس نے اپنے گھوڑے کو زمین پر سُم رگڑتے ہوئے اِدھر اُدھر چکر لگاتے دیکھا، کیونکہ الاؤ سے تقریباً دو گز کے فاصلے پر ایک طاقتور سیاہ رنگ کا چیتا گھوڑے پر گھات لگائے ہوئے تھا۔ گھوڑا یکبارگی جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

الاؤ کی آگ تیز کرنے اور پہرے داروں کے شور و غل سے درندہ گھبرا کر جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

رُستم نے اپنے گھوڑے کی تلاش میں سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا اور اُسے چشمے کے کنارے کھڑا ہوا پایا۔ رُستم نے ایال سے اپنے گھوڑے کو پکڑ لیا اور نیچے چشمے کی طرف لے جانے لگا۔

اُسی وقت رُستم کو دور ایک چٹان پر کچھ ہلکی سی روشنی جھلملاتی دکھائی دی۔ دن کے وقت اُس نے اُس چٹان کو دیکھا تھا مگر تب وہاں اُسے کوئی انسانی شکل یا اُس کے کچھ آثار نظر نہیں آئے تھے۔



"کبھی کبھی چور ڈاکو قافلے میں مل جاتے ہیں اسی لئے ہمیں ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔"

اور پھر یک لخت رات کی خاموشی کو توڑتی ہوئی نقارے کی آواز گونج اٹھی۔ تھوڑی دیر خاموشی
ی۔ پھر نقارے پر تین چوٹیں پڑیں۔ رستم سمجھ گیا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ دائیں طرف اوپر چٹان
جہاں ابھی روشنی جھلملا رہی تھی وہیں دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ چٹان کی
ف دیکھا، اب پھر روشنی جھلملا رہی تھی۔ ضرور چٹان پر کچھ ہو رہا ہے۔ رستم نے سوچا۔ روشنی پھر غائب
گئی۔ نقارے کی آواز پھر سنائی نہیں دی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔
رستم بہت بے چینی سے آواز یا روشنی کا منتظر تھا۔ کئی لمحے بیت گئے۔ چاروں طرف گہرا
ٹا مسلط رہا۔ رستم گھوڑے سے ٹیک لگائے کھڑا چٹان کی طرف گھورتا رہا۔ دور پڑاؤ کی روشنی
رہی تھی۔ اوپر ستاروں سے چمکتا ہوا آسمان اور نیچے چشمے کی سُریلی موسیقی تھی۔
آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ نہ آواز آئی نہ روشنی ہی۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو خراماں خراماں
ے کو لئے پیدل چلنے لگا۔ اچانک پھر آواز گونج اٹھی — "توم۔ توم۔ توم" نقارہ بج رہا تھا۔
جواب میں دوسری طرف بھی نقارہ بجا اور تھوڑی دیر کے لئے پہلے نقارے والا حالات کا جائزہ
کے لئے رُک گیا۔
"توم۔ توم۔ توم" اب نقارے کی آواز پہلے سے جدا تھی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ رستم نے ارادہ
ا اُسے خود جاکر پہاڑی پر دیکھنا چاہئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شائد اُس کا یہ قدم اپنے قافلے

کے حق میں اچھا ثابت ہو۔ یہ نقارے کی چوٹ اور روشنی کا جلنا بجھنا خفیہ اشارے بھی ہو سکتے تھے۔ اس نے اس بارے میں جتنا بھی غور کیا، اتنا ہی وہاں جانے کا ارادہ مضبوط ہوتا گیا۔

گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر وہ چٹان کے نیچے ڈھلان کی طرف بڑھنے لگا۔ چٹان کے نیچے پہنچنے کے بعد وہ پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگا۔ کئی بار نیچے لڑھکنے کے ڈر سے اسے چڑھتے وقت ہاتھوں کی بھی مدد لینی پڑی۔ آخر وہ لڑھکتا پھسلتا چوٹی پر پہنچ ہی گیا۔

چوٹی پر چٹان چوکور تھی۔ سامنے گہرا اندھیرا تھا۔ اس نے چٹان کے نیچے دیکھنے کی کوشش کی اندھیرے میں جو کچھ نظر آ سکا وہ صرف پڑاؤ کی روشنیاں تھیں جو اس پڑاؤ پر چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

اب وہ کیا کرے؟ اس نے سوچا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بس چاروں طرف درخت اور خاردار جھاڑیاں ہیں۔ تبھی اچانک سامنے روشنی چمک اٹھی۔ جس روشنی کو اس نے نیچے سے دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں یہ کافی تیز تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے یہ روشنی مشکل سے دو سو گز کے فاصلے پر ہوگی، پہلے ہر بار روشنی کے ساتھ نقارہ بھی بجتا تھا اس لئے اس بار بھی اسے اس کا انتظار تھا تاکہ وہ اس آواز کے سہارے روشنی کی طرف چل دے لیکن اس کے برعکس سناٹا مسلط رہا۔

رستم روشنی کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ خاردار جھاڑیوں میں ہوشیاری سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ان جھاڑیوں میں کوئی بھی چیز چھپی ہو سکتی تھی۔ جانوروں سے زیادہ انسان کا ڈر تھا۔ کیونکہ وہ زیادہ خونخوار اور عیار ہوتے ہیں۔

اچانک جنگل ختم ہو گیا اور وہ کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ حالانکہ اندھیرا تھا، پھر بھی وہ سمجھ گیا کہ سامنے بالکل کھلی جگہ نہیں ہے۔ کچھ خیمے کی طرح کی چیز سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس نے زمین پر لیٹ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی یہ تقریباً آٹھ فٹ اونچے خیمے کے پردے کی طرح کوئی چیز تھی

رستم پیٹ کے بل آگے کھسکتا گیا روشنی کی جھلملاہٹ جو غائب ہو چکی تھی دوبارہ ایک لمحے کے لئے نظر آئی اور پھر پہلے کی طرح غائب ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں فوراً تمام بات آ گئی۔

اس کپڑے میں ایک دراڑ تھی۔ جب ہوا چلتی تو کپڑا پھڑپھڑانے سے روشنی دراڑ سے ایک لمحے کے لئے جھلملا اٹھتی۔



چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی کشمیر نہیں دیکھا ہے لہٰذا ہماری اگلی میٹنگ وہیں ہونی چاہئے۔

آخر عورت کی اوقات ہی کیا ہے! چاہے وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو آدمی سے ہمیشہ کم تر رہے گی۔ وہ آدمی کی غلام ہے۔ اُس کے جسم کی تشکیل ہی آدمی کے عیش کے لئے ہوئی ہے اور پھر مہاراج، آپ کوئی غیر تو نہیں ہیں۔

اِس پردے کے اور قریب سرک آیا۔ اب وہ ہاتھ بڑھا کر پردے کو چھو سکتا تھا۔ وہ دراصل ایک کنویں کی طرح تنا ہوا گول پردہ تھا۔ رُستم نے اندر جھانک کر دیکھا۔ بیچ میں الاؤ جل رہا تھا۔ الاؤ کے چاروں طرف زمین پر تقریباً ۲۵ آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ حقّہ پی رہے تھے۔ کچھ پان کھا رہے تھے اور کچھ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پردے کے دُوسرے سرے پر گھوڑے اُن کے تھوڑے دانہ کھا رہے تھے۔

اچانک پردے میں سے نقارہ کی آواز گونجی — توم — توم — توم توم نقارہ بجتا رہا۔ رُستم دراز سے نقارہ بجانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ چھوٹے نقارے کے اوپر کا حصہ بڑھا ہوا تھا۔ نچلا حصہ ڈھیلا تھا۔ آواز بند ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد سناٹے کو چیرتے ہوئے چیتے نے اس پار سے دوبارہ نقارہ بجا۔ توم توم، توم توم، توم توم۔

قافلہ چشمے کے کنارے محوِ خواب تھا۔ لوگ اگلے دن سفر کے لئے خود کو تیار کرنے کی خاطر آرام سے سو رہے تھے۔ کسی بھی وقت مصیبت آ سکتی تھی، لیکن لوگوں کو خیال تھا کہ پہرے دار اُن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ پہرے دار بھی اپنی اپنی جگہ چوکسی سے پہرا دے رہے تھے۔ انہیں اپنے فرض کا پُورا پُورا احساس تھا۔

رات ڈھلتی گئی۔ قافلے کا سردار مارواڑی سوداگر اپنے خیمے میں آرام سے کمبل اور گرم چادروں میں لپٹا سوتا رہا دولت کی تھیلیوں اور کاروبار کے سُنہرے سپنوں کو جھنجھوڑتے ہوئے خیمے کے دروازے پر کھڑے پہرے دار نے اُسے جگا دیا۔

کوئی اُس سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ یہ ملنے والے نے نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجا تھا۔ سوداگر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک مسلم نوجوان نوکر کے پیچھے پیچھے خیمے میں داخل ہوا۔

"ہم سب بھاری خطرے میں ہیں" نوجوان نے آتے ہی کہا۔

"کیا؟" سوداگر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس نے نوجوان کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پہرے دار کو باہر جانے کا حکم دیا۔

"تم کون ہو؟ مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

"دوپہر کو ہماری ملاقات ہو چکی ہے" رُستم نے جواب دیا۔

"ہاں، اب یاد آیا۔ کہو؟"

"سیٹھ، تمہارے قافلے پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ اگر جلدی ہی کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا تو سب تہس نہس ہو جائے گا۔"

"بات کیا ہے؟ تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟ پورے حالات سے مجھے جلد ہی مطلع کرو۔"

رستم نے پورا قصّہ کہہ سُنایا کہ کس طرح گھوڑا تلاش کرتے ہُوئے اُس نے ڈاکوؤں کے گرد کو دیکھا۔

"میں اُن کے اِتنا قریب تھا کہ صرف ایک کپڑے کی دیوار کا مجھ میں اور اُن میں فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اُن کی ایک ایک بات سُن سکتا تھا۔ اُن کی باتوں سے ہی مجھے پتہ چلا کہ وہ صبح ہم پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اُن کا ایک گروہ ایک طرف سے حملہ کرے گا اور دوسرا گروہ دُوسری طرف سے۔ دونوں گروہ نقارے کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر رہے تھے۔"

اُسی وقت چٹان کی طرف سے نقارے کی ہلکی سی آواز سُنائی دی جس کے جواب میں دُور کہیں نقارہ بجا۔

"بھگوان، ہمیں بچاؤ" مارواڑی بُری طرح گھبرا گیا تھا "اب کیا کریں؟ اے بھگوان میری کپڑے کی گانٹھیں! میری قیمتی کپڑے کی گانٹھیں کیسے بچیں گی! ہم پر ڈاکہ پڑنے والا ہے! سپاہی کہاں ہیں؟ پہرے دار کہاں ہیں؟ ڈاکوؤں سے حفاظت کرنے کے لئے ہی انہیں اچھا خاصہ معاوضہ دیا گیا ہے۔ یا تو وہ ہمیں بچائیں یا پیسہ واپس کر دیں۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے" وہ دھیرے دھیرے بڑبڑاتا رہا۔ اپنی اِس بوکھلاہٹ سے اُسے کچھ شرم بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"سوتے ہوئے آدمی کو اچانک جگا کر کہا جائے کہ ڈاکو ہم پر حملہ کرنے والے ہیں تو۔ سمجھے نوجوان؟"

"ہاں، میں سمجھ گیا۔ لیکن وہ معمولی ڈاکو نہیں ہیں۔ وہ راجپوت بُندیلے ہیں۔"

"بندیلے راجپوت! اے بھگوان! بُندیلے راجپوت اپنے علاقے سے اتنی دُور!"

"یہ بالکل سچ ہے۔ ایک جوان بُندیلے سردار کا یہیں کہیں آس پاس قلعہ ہے۔ وہ اور اُس کے آدمی ہم پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"بُندیلے مسافروں کے لئے خطرناک تو ہوتے ہیں لیکن میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اِسے بہادر بھی ہیں کہ اجمیر کے نزدیک، جہاں دربار لگا ہُوا ہے، وہاں بھی لُوٹ کھسوٹ کر سکتے ہیں۔ اگر شاہی دربار سے بیس میل دُور بھی جان اور مال محفوظ نہیں ہے تو پھر کوئی بھی محفوظ جگہ نہیں ہو سکتی۔"

"صرف ڈاکہ زنی ہی اُن کا مقصد نہیں ہے" رُستم بولا "اُن کا اصلی مقصد تو کچھ اور ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اُس مُسلمان لڑکی کو ضرور جانتے ہوں گے جو ایک ادھیڑ عمر عورت اور کچھ سپاہیوں کے ہمراہ اِس قافلے کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔ جوان بُندیلا سردار کا اصلی مقصد اُسی کو اُٹھا کر لے جانا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو قافلے کو بھی لُوٹ سکتے ہیں۔"

"میں کہتا ہوں، وہ پاجی کتّوں کی اولاد ہیں۔"

"بُندیلے سردار نے آج صبح اُس لڑکی کو راستے میں دیکھا تھا۔ اب وہ رات کو حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ لیکن اندھیرے میں لڑکی کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہوگا۔ میرے سامنے ہی ایک آدمی اُس سردار کے سامنے حاضر ہُوا جسے صورتِ حال کا پتہ لگانے کے لئے ہمارے پڑاؤ میں بھیجا گیا تھا۔

"اُس آدمی کا خاص مقصد اُس لڑکی کا پتہ لگانا تھا کہ وہ اِس وقت کہاں ہے۔ لیکن اُس

ی کہ خاتون کے بارے میں پتہ نہ چل سکا، اِس لئے بُندیلا سردار نے حملہ صبح تک کے لئے ملتوی کر دیا ہے اور دُوسرے گروہ کو بھی اس تبدیلی سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"یہ تو بُری خبر ہے" سیٹھ نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "کتنا اچھا ہوا کہ تم اِن باتوں کا پتہ لگا کر بروقت یہاں پہنچ گئے اور ہمیں خطرے کی اطلاع مِل گئی۔

اب ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ تم نے چٹان پر تقریباً ۵۰ آدمی دیکھے اور تمہارا یہ خیال بھی ہے کہ دُوسرے گروہ میں بھی اِتنے ہی آدمی ہوں گے۔

"قافلے میں تین سو آدمی ہیں۔ عورتوں اور بُوڑھوں کو چھوڑ کر کوئی دو سو تندرست جوان نکل آئیں گے۔ اِن میں سے آدھے آدمی ہتھیار بند سپاہی ہیں۔ اس لئے ہم ان کتّوں کو آسانی سے شکست دے سکتے ہیں۔

"نوجوان، ہمارے اِس احسان کے لئے میں تمہارا بہت شکرگزار ہوں۔ فکر مت کرو۔ میں سب ضروری انتظام کر لوں گا۔ سب سے پہلا کام تو پہرے داروں کو جگانا اور اُنہیں خطرے سے آگاہ کرنا ہے۔ اِس کے بعد اُنہیں اِس طرح تعینات کرنا ہے کہ وہ دو طرفہ حملے کا مقابلہ کر سکیں۔

"جاؤ، نوجوان، تھوڑا آرام کر لو۔ ہم صبح تک تو محفوظ ہیں۔ اس سے پہلے ہی ہماری تیّاری مکمّل ہو جائے گی۔"

مارواڑی پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اُس نے حالات پر قابو پا لیا ہو۔

رُستم خیمے سے باہر آکر اپنی جگہ لَوٹ آیا۔ لیکن سویا نہیں۔ اُس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ جس حسینہ نے اُسے اِتنا موہ لیا تھا، اُس پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ ایسی حالت میں وہ کیسے سو سکتا تھا۔

مارواڑی سوداگر حملے کا مقابلہ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔ اُس نے نوکروں کو بلا کر اُنہیں کئی حکم دے ڈالے۔ اُس نے خود پڑاؤ کے چاروں طرف سوتے ہوئے پہرے داروں کو جگایا اور انہیں ہوشیار رہنے کی تاکید کی کیوں کہ ڈاکوؤں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ پڑاؤ کے چاروں طرف جلتی ہوئی آگ کو اور تیز کر دیا گیا۔

جب وہ خیمے میں لوٹا تو ایک نوکر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس سے کچھ باتیں کرنے کے بعد سوداگر نے اپنے جسم کو شال سے اچھی طرح ڈھانپ لیا اور نوکر کے ساتھ دو بارہ باہر آ گیا۔ سوتے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے گزرتا ہُوا وہ پڑاؤ کے باہر آ گیا۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اُن کو کسی نے نہیں دیکھا وہ دونوں چشمے کی طرف بڑھ گئے۔ چشمے کے کنارے چلتے چلتے وہ اُس چٹان کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ وہ کافی آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ موٹے مارواڑی کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔

آدھے راستے میں اُنہیں ایک اور آدمی ملا جو اُنہیں چٹان کی چوٹی تک لے گیا۔ پھر وہ پڑاؤ کی طرف بڑھے۔ ایک پہرے دار نے اُنہیں ٹوکا۔ لیکن وہ بغیر کچھ کہے چار دیواری والے حصّے کے اندر کی طرف بڑھ گئے۔ آگ ابھی تک جل رہی تھی اور لوگ اُس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

جوان سردار نرسنگھ دیو بُندیلا اپنے آدمیوں سے الگ کچھ دور ایک گول چکنے پتھر پر بیٹھا ہُوا تھا، جس کا آدھا جسم اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ اُس کے ہتھیار پاس ہی زمین پر پڑے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کسی خیال میں گمؔ اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔

سوداگر اور نوکر کو وہیں چھوڑ کر، جو آدمی انہیں لے کر آیا تھا، سردار کے پاس گیا۔ اس نے کچھ دیر دھیرے دھیرے باتیں کیں اور پھر وہ سوداگر کے پاس واپس آکر بولا کہ اب آپ سردار سے مل سکتے ہیں۔

سوداگر آگے بڑھا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سردار کو پرنام کیا۔

"کہو، تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟" نرسنگھ دیو نے کہا "ہمیں تمہارے نوکر پر شک ہے، جو تمہارے ساتھ آیا ہے — یا تو اسے ہمارے جواب کے ساتھ واپس بھیج دو یا اسے پھانسی دے دو کیونکہ اس نے جاسوسی کی ہے"

"مہاراج، ہم معمولی مسافر ہیں" مارواڑی نے ادب سے کہا "ہمیں کسی کی جاسوسی کرنے سے کیا مطلب؟ پھر مہاراج، آپ تو بہت بڑی ہستی ہیں۔"

"پھر تمہیں ہماری موجودگی کا کیسے علم ہوا؟ بتاؤ!" مارواڑی کو جھکتے ہوئے دیکھ کر نرسنگھ دیو نے دھمکی دی "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم یہاں ہیں؟ کس نے بتایا؟"

"مہاراج آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک مسافر پڑاؤ سے ہمارا پیسا گھوڑا ڈھونڈ کر لیا تھا وہ گھوڑا ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں تک آپہنچا۔"

"اسے تم نے نہیں بھیجا تھا؟"

"میں قسم کھاتا ہوں، مہاراج، میں نے اسے یا کسی کو بھی آپ کی جاسوسی کرنے کے لئے نہیں بھیجا سب اچانک ہوا۔ میری بات کا یقین کیجئے۔"

"اچانک یا جان بوجھ کر تمہیں ہماری موجودگی کا علم ہو گیا، جسے ہم ابھی ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے خیر، کہو، ہم سے کس لئے ملنے آئے ہو؟"

"مجھے پتہ ہے، مہاراج راجے خاندانی ہیں اور صرف ڈاکوؤں کے سردار نہیں ہیں۔"

"میں ڈاکوؤں کا سردار!" نرسنگھ دیو زور سے ہنسا "واقعی تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔"

"میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا، مہاراج، آپ ہم غریب مسافروں کو لوٹنا نہیں چاہتے۔ پھر، مہاراج، ہمارا پیچھا کرنے میں آپ کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

نرسنگھ دیو نے کرخت لہجے میں کہا "کیا ہو سکتا ہے؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں مہاراج۔ آپ کی نظریں ہمارے مال و اسباب پر نہیں بلکہ ایک حسینہ پر ہیں، جو ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہے۔"

"بھئی، تم واقعی بہت دلچسپ آدمی ہو۔ ہمارے دل کی باتیں بتا رہے ہو۔ کافی سمجھدار آدمی معلوم دیتے ہو۔ تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ میں اس اندازہ کی وجہ اور کیسے میں نہیں الجھنا چاہتا۔ جس آدمی کے بارے میں تم نے ذکر کیا کافی دیر تک یہاں رہ کر ہماری باتیں سن گیا ہے۔ اسے اگر ہم پکڑ لیتے تو … خیر، اب کہو۔"

"مہاراج صرف اس حسینہ کو چاہتے ہیں۔ میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ ہم غریب مسافروں اور ہمارے مال و اسباب کو بخش دیں۔ اس لڑکی کو آپ جس طرح بھی چاہیں لے جائیں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہم آپ تک پہنچانے کی کوشش بھی کریں گے۔ ۔"

"ہاہاہا یہ تمہاری چال ہے۔ ہے نا۔ دو آنکھوں والا مکار! خود کو اور اپنے مال و اسباب
بچانے کے لئے جوان لڑکی کو سپرد کرنے کا سودا کرو گے؟"

"مہاراج، میری حالت پر رحم کھائیے۔ میں اِس قافلے کا سردار ہوں، جس میں تقریباً تین
آدمی اور سامان ہے" سوداگر نے گڑگڑا کر کہا " اِس جنگل بیابان میں اُن کی حفاظت کا ذمہ
ہر ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس ۵ ہتھیار بند سپاہیوں کا دستہ ہے، لیکن وہ کرائے کے
دمی ہیں۔ اپنے پیسے کے علاوہ ہماری حفاظت میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ وفادار بھی
ت ہو جائیں تو بھی کیا وہ اِس بہادر فوج سے ٹکرلے سکیں گے؟

"میں اور کیا کر سکتا ہوں مہاراج؟ میں آپ کے قدموں میں وہ تحفہ لاکر رکھ دوں گا، جس
کے آپ خواہش مند ہیں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ صرف اِسی طرح میں سب لوگوں اور
ان کے مال و اسباب کو بچا سکتا ہوں۔ اِتنے لوگوں کی جانیں بچانے کے لئے میں ایک آدمی کی
قربانی دے سکتا ہوں۔

اور وہ بے وقوف لڑکی آخر ایک عورت کی اوقات ہی کیا ہے؟ چاہے وہ کتنی ہی حسین
کیوں نہ ہو۔ آدمی سے ہمیشہ کمتر رہے گی۔ وہ آدمی کی غلام ہے، اُس کے جسم کی تشکیل ہی آدمی کے
عیش کے لئے ہوئی ہے۔ اور پھر مہاراج، کسی دوسرے آدمی سے الگ تھوڑے ہی ہیں؟ درحقیقت
لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اُس کے لئے اِس سے بڑی عزت کی بات اور کیا ہو سکتی
ہے؟"

"عزت اور انسان کے بارے میں تمہارے عجیب و غریب خیالات ہیں، کُتیا کا بچہ، لالچی کہیں
کا! لیکن تم جو مشورہ دے رہے ہو وہ مجھے منظور ہے۔ ٹھیک ہے، میں تمہارا تحفہ قبول کرنے کے
لئے تیار ہوں۔ اگر لڑکی مجھے سونپ دی گئی تو میں تمہارے مال و اسباب کی طرف آنکھ اُٹھا کر
بھی نہیں دیکھوں گا۔ لیکن تم اِس کا انتظام کیسے کرو گے؟ کیا تمہارا ارادہ اُسے قافلے کے سب
لوگوں کے سامنے یہاں بھیجنے کا ہے؟"

سوداگر نے انکار میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "اوہ! نہیں مہاراج، نہیں، میرے نیک ارادے
کو میرے لوگ غلط سمجھ لیں گے۔ مجھ سے سرداری کا رتبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چِھن جائے گا۔
کوئی بھی مجھ پر بھروسہ نہیں کرے گا۔

اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ میں لڑکی اور اس کے ساتھیوں کو بتاؤں گا کہ لڑکی
کو اغوا کرنے کے لئے جلدی ہی قافلہ پر حملہ ہونے والا ہے، اور ان کے لئے حفاظت کا یہی
طریقہ ہے کہ وہ خطرہ ٹل جانے تک قافلے سے الگ ہو جائیں، دوسرے راستے سے سفر کریں اور آگے
جاکر پھر قافلے میں شامل ہو جائیں۔

میں اُن کے ساتھ ایک آدمی بھیج دوں گا جو انہیں اجنبی علاقے میں راستہ بتلانے
کی غرض سے لے جائے گا۔ اب دیکھئے، مہاراج وہ آدمی آپ کا ہی ہوگا اور وہ انہیں آسانی
سے اُسی جگہ لے جائے گا جہاں آپ چاہیں گے۔

"شاباش، میرے دوست، شاباش" منگو دلو نے خوش ہو کر مارواڑی کی پیٹھ ٹھونکی
"تم بہت سمجھدار آدمی ہو"

قافلے کے سردار اور ٹنڈلے سردار کی بات چیت کافی دیر تک چلتی رہی۔ ساری بات

طے کر لینے کے بعد سوداگر اپنے نوکر اور جوان سردار کے آدمی کے ساتھ پہاڑی سے نیچے اُترنے لگا۔ اور چپ چاپ اپنے خیمے میں چلا گیا۔

پڑاؤ میں خاموشی چھا گئی۔ لوگ آرام سے سو رہے تھے۔ چٹان پر سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد نقارے کی آواز کے اشارے ہو رہے تھے جس کا جواب دوسری طرف سے برابر مل رہا تھا۔

رُستم نے آرام کرنے کے لئے اونچی جگہ پسند کی تھی تاکہ اُسے نیند نہ آسکے۔ اُس نے مارواڑی کو پہرے داروں کو جگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ موٹاپے کے باوجود اُس میں چستی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا رُستم نے محسوس کیا کہ خطرہ قریب آتا جا رہا ہے۔

پہاڑی پر بُندیلوں کے پڑاؤ میں جو کچھ اس نے سُنا تھا، اُس کے مطابق صبح ہوتے ہی حملہ کا خدشہ تھا۔ کیا کرائے کے پہرے داروں پر یقین کیا جا سکتا تھا کہ اُن کی مدد سے حملہ پچھاڑ دیا جائے گا۔ لیکن رُستم کو یقین نہیں تھا۔ اگر اُس کے پاس مغل شہ سواروں کا ایک دستہ ہوتا تو وہ پہاڑی پر ہی اُن کی دھجیاں بکھیر دیتا۔

اب جاگتے ہوئے پہرے داروں اور پڑاؤ کے چاروں طرف جلتی آگ کے علاوہ خطرناک حملے کا مقابلہ کرنے کی اور کوئی تیاری نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالاں کہ مارواڑی سیٹھ نے اُسے یقین دلایا تھا کہ حملے سے پہلے ہی پڑاؤ میں مقابلے کے لئے ہر طرح کی تیاری مکمل ہو جائے گی۔

مشرق میں مُرجھایا ہوا چاند کچھ اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ ستاروں کے مطابق رات کے تین بج چکے تھے۔ صبح کا اُجالا ہونے میں دو گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ پڑاؤ سے دُشمن کا مقابلہ کرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

رُستم نے سوچا، مارواڑی کو تلاش کر کے جلدی ہی کوئی قدم اُٹھانے کی ضرورت سمجھائے وہ اُسے جگانے ہی کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُس نے مارواڑی سیٹھ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

"تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی ہیں" اُس نے سرگوشی کی "صرف تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اگر بُندیل لیٹروں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو اُنہیں دونوں طرف تیروں اور تلواروں کی مضبوط دیواروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"میں نے پڑاؤ کے ہر آدمی کو آگاہ کر دیا ہے کہ حملے کے وقت اُس کی جگہ کہاں ہو گی۔ صبح ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے گھنٹی بجے گی اور سب ہتھیار بند آدمی اپنی اپنی جگہ سنبھال لیں گے ہر ایک دستے کا سربراہ بھی مقرر کر دیا گیا ہے۔ سارا کام میں نے چُپ چاپ مکمل کر لیا ہے"

"سیٹھ، تم عجیب شخصیت کے مالک ہو" رُستم نے کہا "حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے میں مجھے کیا کرنا ہے؟"

"میں یہی بتا رہا ہوں۔ تمہیں اِس وقت جگانے کا میرا یہی مقصد تھا۔ تمہیں ایک خاص کام سونپا جا رہا ہے۔ تمہیں حملے کا اصل مقصد تو معلوم ہی ہے۔ اِس لئے جوان لڑکی کی حفاظت کے لئے میں نے ایک اور ترکیب سوچی ہے۔

"میں اُس کے دستے کو چُپ چاپ دُوسرے راستے سے بھیجنا چاہتا ہوں۔ اِس لئے اگر بُندیلوں نے واقعی حملہ کیا تو اُنہیں اپنا شکار غائب ملے گا۔ تم میری بات سمجھے؟ اگر اُنہوں نے ہمیں شکست دے دی اور لڑکی کی تلاش میں پڑاؤ کے اندر گھس آئے تو وہ اُنہیں نہیں ملے گی۔

"چوں کہ اُن کا واحد مقصد جوان لڑکی کو ہتھیانا ہے، اِس لئے یہ اُمید کا بل ہے کہ ن کا حملہ ناکام رہے گا۔ وہ لوگ لڑکی تلاش کرنے میں مصروف رہیں گے۔ اُن کا ایک ستہ اُدھر دھاوا بول سکتا ہے، جہاں لڑکی ہو اور اس سے پہلے کہ ہم لوٹ کر آسے اُن کے مل سے بچائیں، وہ اُسے لے جائیں گے۔ اس لئے یہ اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے لئے بہت اچھا رہے گا کہ حملہ ہونے سے پہلے ہی وہ قافلے سے الگ ہو جائیں۔"

رستم نے تجویز پر غور کیا۔ واقعی سیٹھ نے معرکے کی بات کہی تھی۔ اگر بغیر کسی کو پتہ لگے جوان لڑکی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دُور نکل جائے تو وہ بچ سکتی ہے۔ حملے کے وقت ن کا قافلے کے ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

اِس منصوبے کی کامیابی کے لئے اِسے صیغۂ راز میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ اگر بدقسمتی سے حملہ آوروں کو اُس کے بھاگنے کا پتہ لگ گیا تو وہ اُسے ہر حالت میں پیچھا کر کے پکڑ لیں گے۔

"اُنہیں صرف تھوڑی دیر کے لئے قافلے سے الگ رہنا ہوگا" مارواڑی کہہ رہا تھا "خطرہ ٹلنے پر وہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گی۔ میں اُن کے ساتھ ایک رہنما بھیج دوں گا۔ جو جنگل کی پگڈنڈیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہے۔"

"تمہاری تجویز واقعی قابلِ تحسین ہے، سیٹھ۔ لیکن اِس بات کو بالکل راز میں رکھا جائے۔ اگر دُشمن کو کسی طرح اِس بات کا پتہ لگ گیا تو وہ لڑکی اُن کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔"

"تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ جوان عورت اور اُس کے ساتھیوں کو یہ سب بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔ صبح ہونے سے پہلے ہی اُنہیں الگ ہو جانا ہوگا، جس سے کسی کو بھی پتہ نہ چلے اِس لئے زیادہ وقت گنوانے کا موقع نہیں ہے۔

"ہم عورتوں اور اُن کے پہرے داروں کو جا کر اُنہیں خطرے سے آگاہ کئے دیتے ہیں اور اُنہیں اپنی تجویز بھی بتا دیتے ہیں۔ جاؤ، دوست، تم اُنہیں اپنی کہانی سُنا سکتے ہو۔ اِس سے اُنہیں یقین ہو جائے گا کہ خطرے کی بات سچ ہے۔ پھر میں اُن کی حفاظت کے لئے اپنی تجویز رکھ دُوں گا۔"

سوداگر اور رستم اُس جھونپڑے سے خیمے کی طرف بڑھے، جہاں دونوں خواتین سو رہی تھیں۔ پہرے دار اور کہار خیمے کے باہر گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کو دیکھتے ہی ایک پہرے دار اُٹھ بیٹھا اور اپنا نیزہ اُٹھا کر صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"ہش، ہم دوست ہیں" سوداگر نے نرمی سے کہا "ڈرو مت۔ تمہاری مالکن کے لئے ایک بہت ضروری پیغام ہے۔"

پہرے دار نے خیمے کے پاس روشن آگ کی جھلملاتی روشنی میں اُن کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ اُس نے قافلے کے سردار کو آسانی سے پہچان لیا۔ لیکن اُس کے ساتھ والے آدمی پر اُسے شک تھا۔

"کیا تم اِس وقت دونوں خواتین کو جگا سکتے ہو؟" سیٹھ نے پوچھا۔ "پہلے مجھے بات بتاؤ" پہرے دار نے جواب دیا "پھر میں سوچوں گا کہ اُنہیں جگانا چاہئے یا نہیں۔"

"ٹھیک ہے" مارواڑی رستم کی طرف مڑا "کہہ دو، جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔ بات سُن کر

ہی اُسے یقین ہو سکے گا۔ یہ سب پہرے داروں کا افسر ہے۔"

رُستم نے پہرے داروں کے افسر کے سامنے ساری کہانی دُہرا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی فوراً خیمے میں گھسا اور دروازے کے پاس نیزے کے سرے سے زمین تھپتھپانے لگا۔ نیند میں اُونگھتی آواز نے اندر سے پُوچھا

"کون ہے ؟"

"مُسافر ہے مالکن، جاگ جائیے۔ ضروری کام ہے۔"

خیمے کے دروازے پر ایک پردہ نشین عورت نمودار ہُوئی۔ یہ بوڑھی عورت تھی۔ اُس کے پیچھے جوان لڑکی کھڑی تھی۔ رُستم اور مارواڑی نے عورتوں کو سارا قصّہ کہہ سنایا۔

"یا اللہ، ہم لوگ خطرے میں پھنس گئے ہیں" ادھیڑ عورت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "اب آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

مارواڑی نے اپنی تجویز پیش کی، لوگوں کے جاگنے سے پہلے اُنہیں قافلے سے الگ ہونا تھا۔

"تو ہمیں یہ کرنا ہوگا؟" ادھیڑ عورت بولی "حفاظت کے لئے ہم قافلے میں شامل ہوئے تھے۔ اب زیادہ حفاظت کے لئے اسے چھوڑ کر اکیلے سفر کہاں کریں گے؟ حسین، تمہاری کیا رائے ہے؟"

"یہی سب سے اچھا راستہ نظر آتا ہے، محترمہ" سوداگر بولا۔ "خطرہ ٹل جانے پر آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتی ہیں۔ جنگل میں راستہ بتانے کے لئے ایک رہنما آپ کے ساتھ جا سکتا ہے۔"

"ہم اِن کے پہلے ہی احسان مند ہیں" رُستم کو دیکھتے ہوئے عورت بولی "لیکن ہمارے لئے یہ کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں؟ اگر اِنہوں نے ارادہ کر ہی لیا ہے تو ہمیں اِس میں کیوں اعتراض ہونے لگا۔ اِس سے ہماری طاقت میں اضافہ ہی ہوگا"

رُستم کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس کے لئے اِس سے زیادہ خوشی کیا ہو سکتی تھی۔ اب سے اصل میں دوستوں کی حفاظت کا کام سونپا گیا تھا۔

فیصلہ ہو گیا عورتیں سفر کے لئے جلدی ہی تیار ہو گئیں۔ اُنہوں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، کہاروں اور باقی تین پہرے داروں کو جگایا اور فوراً سفر کے لئے تیار ہونے کا حکم دیا۔ عورتوں نے چُپ چاپ پالکی میں بیٹھ کر کھڑکی بند کر لی۔ کہاروں نے اُسے کندھے پر اُٹھایا اور خیمے سے باہر نکل آئے۔ سوداگر نے اُنہیں جو راہ نما دیا تھا وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ رُستم پالکی کے آگے اور راہ نما کے پیچھے بائیں طرف چل رہا تھا۔ چاروں پہرے دار پالکی کے پیچھے تھے۔ اِس طرح اُنہوں نے خاموشی سے پڑاؤ کو چھوڑ دیا۔ مسافر ابھی تک گہری نیند سو رہے تھے اور صبح صادق ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔

رُستم پھولا نہ سما رہا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کاش راستے کی مُسافت کبھی ختم نہ ہو۔ تاروں کی چھاؤں میں وہ ہمیشہ اِسی پالکی کے ساتھ چلتا رہے۔

تو بھاگتے ہوئے رہزن سواروں کو مارواڑی سیٹھ کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ اپنی عقلمندی پر پھولا
نہیں سما رہا تھا۔ دو بے وقعت عورتوں کے بدلے اُس نے قافلے اور کپڑے کو
کا نٹوں کو لٹنے سے بچا لیا تھا اور اُن کے ساتھ اُس منحوس جوان کو بھی بھیج دیا تھا۔
یے میں داخل ہوتے وقت بھی اُس نے دوبارہ اپنی خوشی چھپانے کی کوشش کی۔
ڑی دیر تک جھپکی لے لینے کا ابھی وقت تھا۔ جب سے رستم نے اُسے جگا دیا تھا،
ایک پل بھی نہیں سو سکا تھا۔ چلو، آئی بلا تو سر سے ٹلی۔

اُسی وقت پہاڑی پر سے پڑاؤ کو دیکھنے والے آدمیوں میں ہلچل مچی۔ نرسنگھ دیو نے
دیا اور سپاہیوں کو جگانے کے لئے ڈھول بجنے لگے۔ لوگ جاگ گئے اور حملے کی تیاری کرنے
۔ کچھ دیر بعد وہ سب لوگ اپنے سردار کی راہنمائی میں تین قطاروں میں بٹے ہوئے پہاڑی
یچے اُتر رہے تھے۔

اب سویرا ہو چکا تھا۔ اُنہیں پڑاؤ اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سوئے
ئے پڑاؤ میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہوں۔ وہ اُس درّے کی طرف مڑ گئے
ں کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا۔

اُن کے پہنچنے کی جگہ ابھی چار میل دُور آگے تھی جہاں اُن کا آدمی مسافروں کو لے کر
پہنچنے والا تھا۔ تھوڑے سے پہرے داروں اور کہاروں کو ٹھکانے لگانا چٹکیوں کا کھیل تھا۔
منصوبہ بنایا گیا تھا کہ پالکی نرسنگھ دیو کے قلعے میں لے جائی جائے گی۔ یہ سب بہت آسان
ا۔ کچھ بھی حاصل کرنے کے لئے جنگ اور قتل و غارت اُس کے جنگجو مزاج کے لئے
یادہ موزوں تھی۔

جب وہ مقررہ جگہ پر پہنچے تو کافی دن نکل آیا تھا۔ راستے میں ایک موڑ پر وہ آگے
اتی ہوئی پالکی پر ٹوٹ پڑے۔ چاروں پہرے دار پالکی کے پیچھے چل رہے تھے۔ راستہ
تنگ تھا۔ درختوں کی شاخیں جھول رہی تھیں۔ اِس لئے حملہ کرنا بہت آسان تھا۔ سردار
نے سپاہیوں کو حکم دیا اور وہ پالکی کی طرف لپکے۔

پالکی کے پیچھے چلنے والے چار پہرے دار پاؤں کی آہٹ سے اُدھر متوجہ ہوئے۔ کہار
رُک گئے اور پالکی کو پہاڑ کی اوٹ میں ایک طرف لے گئے۔ چاروں پہرے دار اُس کے
آگے قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا مقصد تھا کہ اگر راجپوت سپاہی اُنہیں نقصان
ہیں پہنچانا چاہتے تو آگے نکل جائیں۔

جلدی ہی ساری بات عیاں ہو گئی۔ راجپوت سپاہی چاروں پہرے داروں پر ٹوٹ
پڑے۔ پالکی کے محافظ حالانکہ زمین پر کھڑے تھے پھر بھی وہ آخری دم تک لڑنے پر آمادہ
نظر آتے تھے۔ لیکن جب اُنہوں نے بے شمار راجپوت سپاہیوں کو دیکھا تو جنگل میں بھاگ
کھڑے ہوئے۔ کہار بھی پالکی کو وہیں چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گئے۔ راجپوت آسانی سے پالکی
پر قابض ہو گئے اور فوراً نرسنگھ دیو نے چھ آدمیوں کو پالکی اُٹھانے کا حکم دیا۔

اُسی وقت بُندیلا سردار اور اُس کے ساتھی اُس راستے پر واپس جا رہے تھے، جس
سے ابھی کچھ ہی دیر پہلے وہ آئے تھے۔ خراماں خراماں چلتی ہوئی پالکی کا دستہ اب بھی محاصرہ
سے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد وہ جنگل سے باہر کھلے میدان میں آ گئے۔ سردار نے

سب کو رُکنے کا حکم دیا۔ حکم کی تعمیل کرنے کے لئے پالکی اُٹھانے والے آدمی رُک گئے۔

نرسنگھ دیو راستے بھر خوب صورت قیدی کے دیدار کی خواہش دل میں دبائے چلا آرہا تھا۔ اب قلعے تک پہنچنے کے لئے ابھی کافی سفر پڑا تھا۔ اور نرسنگھ دیو کی بے قراری حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھی۔

وہ حسین لڑکی پہلے تو کچھ دیر مزاحمت کرے گی۔ یہ قدرتی بات ہے۔ وہ راجپوت ہے اور لڑکی مسلمان۔ ابھی تک کئی مسلمان بادشاہ کئی راجپوت شہزادیوں سے شادی کر چکے تھے شہنشاہ جہانگیر اور اُن کے والد ماجد شہنشاہ اکبر تو اس کی خاص مثال تھے۔ لیکن اب تک کسی راجپوت نے کبھی مسلم لڑکی سے شادی نہیں کی تھی۔ اِس لئے باضابطہ شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایسا وہ چاہتا بھی نہیں تھا۔ اُس کا مشاہدہ تھا کہ نرم اور محبت سے لبریز الفاظ اور بہترین تحائف کے ساتھ ساتھ کچھ زور زبردستی سے کام لے کر عورت کو راہِ راست پر لایا جا سکتا تھا۔ بوڑھی عورت شاید اُس کی ماں ہے۔ اُس کا کیا کرتا ہے۔ اِس بارے میں اُس نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا، حالاں کہ وہ اِس عمر میں بھی کافی حسین نظر آتی تھی۔

> آدھی رات گزرنے پر مارواڑی کے کہنے پر پہرے دار نے اُنھیں جگایا تو خیمے کے دروازے پر ایک پردہ نشین بوڑھی عورت نمودار ہوئی اس کے پیچھے جوان لڑکی کھڑی تھی۔

نرسنگھ دیو پالکی کے قریب آیا۔ اُسے عورتوں سے نرمی سے پیش آنا ہوگا۔ شروع میں ہی رُعب سے کام لینے یا سختی سے بات کرنے سے معاملہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ وہ ڈاکوؤں کا سردار نہیں راجپوت راجہ ہے۔ راجپوتی قانون ہی عورت سے عزت سے پیش آنا ہی بہت ضروری ہے۔

پالکی کے پاس آکر اُس نے ہلکی سی دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ کھلا نہیں۔ اُس نے پھر دستک دی۔ جواب ندارد۔ اُس نے دروازہ پر زور سے مکّہ مارا، دروازہ کھل گیا۔

پالکی کے اندر جھانکتے ہی اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ پالکی میں حسین عورت کی بجائے ایک آدمی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ نرسنگھ دیو نے بالوں سے پکڑ کر اُس آدمی کا سر جھٹکے سے اپنے سامنے کیا۔ یہ اُس کا اپنا سپاہی تھا جس کو اس نے پالکی کو اُس جگہ لانے کے لئے بھیجا تھا۔

اُس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کاٹ دی گئیں اور منہ سے کپڑا نکال دیا گیا۔ اُس نے ہانپتے کانپتے اپنی روداد سُنائی۔ وہ پالکی کر کے مقررہ جگہ کی طرف بڑھ رہا تھا ایک بار اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پالکی کے ساتھ چلنے والے شہ سواروں میں اُسے ایک کا چہرہ کچھ جانا پہچانا لگا۔ اُسے یاد آیا کہ یہ وُہی شہ سوار تھا جس نے پچھلے دِن کچھ

تک اُس کے ساتھ سفر کیا تھا، جب اُنہوں نے بیچ سڑک پر عورتوں اور پالکی
کیا تھا اور راستے میں اُس سے اُس کی بات چیت بھی ہوئی تھی۔
اُس نے شہ سوار سے اپنا چہرہ چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اُسے پہچان گیا
۔اُس نے دوسرے شہ سواروں کی مدد سے اُسے پکڑ کر زیر کر دیا اور اُس کے مُنہ
کپڑا ٹھونس کر پالکی میں بٹھا دیا تھا۔ دونوں عورتیں وہیں اُتر گئی تھیں۔ بعد میں اُسے
س ہوا کہ پالکی اُٹھا کر لے جائی جا رہی تھی۔ اُس نے چھٹپٹا کر بندھنوں سے نکلنے
کوشش کی لیکن وہ اِتنے کس کر بندھے ہوئے تھے کہ وہ کچھ نہیں کر سکا۔ وہ عورتیں
ں گئیں۔ اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔

"اُس مارواڑی کُتّے کو اِس کا مزا ضرور چکھایا جائے گا" نرسنگھ دیو نے دانت
تے ہوئے کہا "اُس کے سر کی بلی کو قربانی دی جائے گی۔ مجھے دھوکا دینے کا نتیجہ
معلوم ہو جائے گا۔"



"مجھے یقین نہیں آتا کہ اُس مارواڑی نے ہمیں جان بوجھ کر دھوکا دیا ہے" ایک سپاہی نے کہا "میرے خیال میں اِس ناکامی کا سبب اُس شہ سوار کا مجھے پہچان لینا ہے۔"

"لیکن اُس مارواڑی کُتّے نے تمہارے ساتھ اُس شہ سوار کو کیوں بھیجا؟ ہر حالت میں مجھے اُس پاجی سے بدلہ لینا ہے۔ میں اُس سے حقیقت اُگلوا لوں گا۔ اُس کی چکنی چُپڑی باتوں میں آ کر مجھے دو بے لٹیروں سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

نرسنگھ دیو نے کچھ سخت حکم دیئے۔
نقارہ بجا کر بندیلوں کے دُوسرے دستے کو پیغام دیا گیا۔ شہ سوار فوراً قطار میں کھڑے ہو گئے۔
۔ واڑی کو گرفتار کرنے اور لُوٹ کھسوٹ کرنے کے لئے اُس کے منصوبے کے مطابق
اُس کے ساتھیوں کو قافلے کا تیزی سے پیچھا کرنا تھا۔

لیکن دُوسرے دستے سے نقارے کے ذریعے جو پیغام مِلا اُس سے اُسے اپنا منصوبہ
بدلنا پڑا۔ پیغام سے پتہ چلا کہ مشرق میں کچھ مُغل شہ سوار دکھائی دیئے تھے۔ نرسنگھ دیو اپنی
لُوٹ کھسوٹ کا قصّہ مغلوں تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے قلعے میں لَوٹ چلنے کے
لئے فوراً نقارہ بجانے کا حکم دیا۔

اراولی پہاڑ کی اُونچی نیچی چوٹیوں کا منظر جس میں دَرّے اور گپھائیں، وادیاں اور تنگ
راستے ہیں، طویل جنگ کے سنسنی خیز قصّوں کے نظارے، جن میں خندق اور گھل دینے والی
مغل فوج نے ایک بہادر قوم کی بہادری اور حُبّ الوطنی کے بے پناہ جذبے کا ڈٹ کر مقابلہ
کیا، شاہی فوج کی لہر کو زبردست مقابلے نے محدود کر دیا تھا، حالاں کہ مقابلہ کرنے والوں

کے سامنے بڑی بڑی مشکلات تھیں۔ جب وہ میدان میں ہار گئے تو اراولی کے قلعوں کی دیواروں پر آزادی کا جھنڈا لہراتے رہے۔

کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی طرف لوٹنے کے دوران رانا پرتاپ ایرن پور پہاڑ کے اسی حصے میں کچھ عرصے کے لئے رہے تھے۔ جب لڑائی کے بدلتے ہوئے پانسے کے سبب انہیں وہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی تو وہ اپنے پڑاؤ کی یادگار میں محل یا جگمگاتی ہوئی عمارتیں نہیں بلکہ بانس کی کچھ جھونپڑیاں چھوڑ گئے۔ جلدی ہی انہیں موسم اور دیمک نے برباد کر دیا۔

لیکن وہ دشمن کو دھوکا دینے کے مقصد سے بنائی گئی تھیں۔ پہاڑی چٹان کو کاٹ کر کمرے، راستے اور دالان بنائے گئے تھے، جو آس پاس بڑی بڑی چٹانوں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھے۔ چٹانوں کی دراروں میں چھوٹے چھوٹے پودے اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں جن سے نیچے دیکھنے پر وہ جگہ بالکل چھپ گئی تھی۔

رانا اور اُن کے ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد یہ کمرے تاعمر خالی پڑے رہتے لیکن ایک نسل گزر جانے کے بعد جنوبی سلطنت بیجاپور کے دربار میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جن کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔

بیجاپور کا سلطان ابراہیم شاہ جب سخت علیل ہوا تو بڑے بڑے حکیموں کے علاج سے بھی اُسے افاقہ نہیں ہوا۔ اپنے علاج کے لئے اُس نے نئے حکیموں کو بُلایا۔ اور اُنہیں اِس بات کا احساس کرانے کے لئے کہ افاقہ نہ ہونے کی صورت میں اُنہیں سخت سے سخت سزا ملے گی، ناکام حکیموں کو قتل کرا دیا اور کچھ لوگوں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندوا دیا۔

جب اِس ترکیب سے بھی افاقہ نہ ہوا تو حکیموں کو پھانسی دی جانے لگی یا ہاتھیوں کے باڑے میں بھیجا جانے لگا۔ اِس سے حکیموں میں اتنی دہشت پیدا ہو گئی کہ بیجاپور میں دیا تک کوئی حکیم دیکھنے کو نہ ملا۔ سب لوگوں نے پڑوسی حکومتوں میں پناہ لے لی۔

اِن پناہ لینے والوں میں حکیم شہاب بھی تھا جو اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد آخر میواڑ۔ رانا پرتاپ کے پڑاؤ پر آ کر رہنے لگا۔ یہیں اُسے حکمت کرنے کی اجازت مل گئی۔

جنگ کے دوران رانا پرتاپ کو جگہ جگہ گھومنا پڑا۔ حکیم شہاب بھی اُن کے دُکھ سُکھ میں شریک رہا۔ اِسی عرصے میں حکیم شہاب کی شہرت سارے علاقے میں پھیل گئی۔ دُور دُور سے مریض وہاں آنے لگے۔

رانا پرتاپ کی وفات کے بعد جب رانا امر سنگھ اپنی فوج کے ساتھ دُوسری جگہ چلا گیا اُسی پہاڑی پر رہ گیا اور اُس کے علاج معالجے کا کام جاری رہا۔

رہنے کے لئے سنسان جگہ کو منتخب کرنے میں اُس کا مقصد بالکل دُوسرا تھا۔ حکیم اِس وقت کافی ضعیف ہو چکا تھا۔ کرمیوں کے مطابق اس کی عمر اِس وقت ۹۰ برس تھی۔ عرصہ پہلے وہ دنیاوی جھنجھٹوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ لیکن اِس پُرسکون جگہ میں وہ ایک نیک کام سر انجام دے رہا تھا۔ اپنے زندگی بھر کے تجربات، علم اور معلومات کو وہ لا دینا چاہتا تھا۔

کئی برسوں سے وہ ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ ایک شاندار یادگار، جو اُمید تھی کہ ... انتظار کرتے ... کھل ... جائے گا اور ... اُسے ... دے گی۔

ی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھے گی۔ اور وہ اُس کی تکمیل میں ہمہ تن معروف تھا۔
قافلے کے اِن واقعات سے دو چار ہونے کے ایک ہفتے بعد رُستم بھی اراولی پہنچ گیا۔ دونوں
ن۔ جن کی اُس نے مدد کی تھی، اُس کے ساتھ گپھا میں تب تک چھپی رہیں جب تک
ے وار اور کہار اُن کے پاس لوٹ نہیں آئے۔
اپنے دشمنوں سے بچتے بچاتے۔ چھپتے چھپاتے وہ تیزی سے راستہ طے کر رہے تھے۔ اُنہیں
۔ تھا کہ دشمن پر بھید کھلتے ہی وہ دوبارہ اُن کی تلاش میں نکل پڑے۔



"موجودہ قوتوں پر دے ہوئے مہنگائی الاؤنس سے ہمارا گزارہ چلنے سے رہا۔ دن بدن بڑھنے والی قیمتوں کے تناسب سے ہمیں الاؤنس دیا جائے۔"

بہادر نوجوان، ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔ کچھ مجبوریوں کی بنا پر ہم آپ سے کھُل مل نہیں سکے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے ہمارے پاس احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ افسوس کہ ہماری ملاقات دوبارہ نہ ہو سکے گی۔

اچھا الوداع، خدا حافظ!

رستم کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ اس پریشاں کن سفر میں خواتین کے چہروں پر ایک بار بھی شکن نہیں پڑی۔ ایک لمحے کے لئے بھی اُن کے چہروں پر خوف اور گھبراہٹ کے تاثرات نہیں اُبھرے۔ رستم نے سوچا۔ یقیناً وہ خطرے کی زندگی سے پہلے بھی دوچار ہو چکی ہوں گی۔ تبھی تو وہ اتنی خود اعتمادی سے سفر طے کر رہی تھیں۔

اس دوران ادھیڑ عمر عورت نے اُس پر پورا بھروسہ کیا تھا اور اس پُرخلوص تعاون کے لئے اُس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ لیکن حسینہ خاموش ہی رہی تھی۔ بس وہ کبھی کبھی رستم کو تشکر آمیز نظروں سے دیکھ لیتی

البتہ رستم کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ خواتین اُس پر بالکل بھروسہ نہیں کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے یہ بھی بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ کون ہیں اور اُن کی منزل کہاں ہے؟ اُنہوں نے اُسے صرف یہی بتایا کہ راستے میں کسی جگہ ایک حفاظتی دستہ اُن سے آملے گا۔

کہیں دشمن پیچھا نہ کر رہا ہو۔ اس خوف سے وہ جلدی جلدی چل رہے تھے۔ پالکی چھن جانے کے سبب دونوں عورتیں پہرے داروں کے گھوڑوں پر سفر کر رہی تھیں۔ شام تک حفاظتی دستہ اُن سے آملا، جس کی انہیں اُمید تھی۔ نئے دستے میں بیس شہ سوار تھے۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

ایک جگہ اُن کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ رستم نے خواتین کو خدا حافظ کہا۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔

"کیا آپ کو یہاں سے دور جانا ہے؟" ادھیڑ عمر خاتون نے پوچھا۔

"نہیں۔ بہت دُور نہیں۔ میں کل تک اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا" رستم نے جواب دیا۔

ادھیڑ عمر خاتون نے اپنے قریب گھوڑے پر سوار حسینہ کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا پھر رستم سے مخاطب ہوئی

"آپ سوچتے ہوں گے کہ ہم احسان فراموش ہیں کیونکہ کچھ مجبوریوں کی بنا پر ہم آپ سے کھُل مل نہیں سکے۔ لیکن نوجوان، ہم پر یقین کرو۔ یہ صرف ہماری بدقسمتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہمارے دلوں میں آپ کے احسانات کے لئے قدر نہیں ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری ملاقات دوبارہ نہ ہو سکے گی۔ آپ نے جس مصیبت کے وقت ہماری مدد کی، اس کے لئے ہم ہمیشہ آپ کے ممنون رہیں گے۔ اچھا، الوداع، بہادر نوجوان، خدا حافظ۔"



شوہر کے تبادلے

مقالہ • انیما

سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں کے اعلیٰ افسروں کو اکثر یہ شکایت کرتے سنا گیا ہے کہ اُن کے کتنے ہی ہوشیار اور ذہین ملازمین کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ اُن کی بیویاں ہیں۔ یہ بیویاں انھیں ایک ہی شہر، دفتر یا کام میں جکڑے رکھنا چاہتی ہیں کیوں کہ ان بیویوں میں خود کو نئے ماحول یا حالات کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

وہ کسی دور دراز جگہ پر اپنے شوہر کے تبادلے کی مخالفت کریں گی، چاہے اس تبادلے میں اُن کے شوہر کے عہدہ میں ترقی ہی ہو یا آگے ترقی کے زیادہ مواقع ملنے کی امید ہو۔ وہ سب یہی چاہیں گی کہ ایک ہی جگہ پر ہمیشہ رہا جائے، کیوں کہ انھیں جانے پہچانے ماحول اور دوستوں عزیزوں کے دائرے سے باہر نکل کر اجنبی جگہ پر جاتے ڈر لگتا ہے۔

اِس میں شک نہیں کہ جب ایک جگہ کافی دیر تک مقیم رہے اور بچے سکول میں اونچے درجوں میں پڑھتے ہوں تو اچانک کسی نئی جگہ جاکر ازسرِنو گھر بنانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے صرف ذرائع کی ہی نہیں بلکہ ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسے تبادلے سے شوہر بیوی کی شادی شدہ زندگی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے، خاص کر اُس وقت، جب تبادلے بہت جلدی جلدی ہوں۔ اور بیوی کئی بچوں سمیت اُن کے ساتھ قدم ملا کر چلنے میں خود کو مجبور پائے۔ وہ اکثر شوہر کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ دھکے کھانے سے انکار کر دیتی ہے اور کسی ایک مقام پر عام طور سے شوہر کے آبائی گھر میں یا پھر خود اپنے میکے میں رہ جانے میں ہی اپنی خیریت سمجھتی ہے۔

مغربی ممالک اور ہندوستانی سماج کے اُن طبقوں میں، جن پر مغربی تہذیب کا اثر زیادہ

نئی جگہوں پر جانے سے گھبرائیے نہیں۔ اپنے کو ڈھالنا سیکھیے۔

سے یہ ایسی علیحدگی کا انجام کئی بار تو طلاق کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آئے دن تبادلے کے چکر میں رہنے والے فوجی افسروں کے معاملے میں، جنھیں اکثر اپنے کنبے کو ساتھ رکھنے کی سہولت بھی نہیں ملتی، یہ بات خاص طور سے دیکھنے میں آتی ہے۔

لیکن یہاں ہم مجموعی طور پر ایسی بیویوں کا ذکر کر رہے ہیں جو اگر چاہیں تو ہر نئی جگہ پر اپنے شوہر کے ساتھ جا سکتی ہیں۔ بیویوں میں اگر خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی ذرا بھی صلاحیت ہو تو شوہر کے تبادلوں کے سبب کنبے کا نئی نئی جگہوں پر جانا اور رہنا مالی حالت سدھارنے کے علاوہ کنبے کے لئے سکون بخش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

نئی نئی جگہوں پر جانے سے ہی آدمی کو زیادہ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اِس لئے کنبے کا جگہ جگہ جانا بچوں کی صحت مند نشو و نما میں رخنہ انداز ہونے کی بجائے کافی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کو اپنے شوہر کے تبادلوں کی، خاص طور پر جب ان میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہو، کبھی بھی مخالفت نہیں کرنی چاہئے۔

پھر بھی جب آپ کے سامنے شوہر کے تبادلے کی بات آئے تو ایک سمجھدار بیوی کے ناطے آپ کو اس ضمن میں چند بنیادی باتیں دھیان میں رکھنی چاہئیں۔ نئے حالات کا سامنا کرنے اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے کے لئے درج ذیل باتیں ضروری ہیں۔

کبھی بھی یہ نہ سوچئے کہ نئی جگہ اور وہاں کا ماحول موجودہ جگہ کے برعکس ہوں گے۔ جیسے ہر جگہ کے لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح ماحول اور وہاں کی زندگی اور کام کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنے شوہر کی نئی جگہ پرانی جگہ سے کچھ کم مرتبے والی معلوم ہو تو صرف اتنی بات سے ہی دل برداشتہ نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ پرانی جگہ پر زیادہ عزت کی بنیاد بڑا حلقۂ احباب ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئی جگہ پر کافی میل جول بڑھ جانے کے بعد بھی ویسی مرتبہ پھر حاصل ہو جائے۔ پھر نئی جگہ ترقی کرنے کے زیادہ امکانات ہوں گے۔

پرانی جگہ جن آسائشوں کی آپ عادی ہو چکی تھیں، ویسی ہی آسائشیں اگر نئی جگہ میسر نہ ہوں، تو صرف اس وجہ سے آپ اپنا دل چھوٹا نہ کریں۔ جو بھی سہولیات میسر ہوں اُن سے ہی کام چلانے کی کوشش کریں اور تھوڑی تکلیف اُٹھا کر اپنی قوتِ برداشت کی آزمائش کریں۔ ہو سکتا ہے اِس طرح کی آزمائش سے آپ اپنے اندر پوشیدہ عمدہ باتوں کا ایک ایسا نیا ذخیرہ ڈھونڈ نکالیں جسے دیکھ کر آپ خود ہی محوِ حیرت رہ جائیں۔

نئی جگہ کے نئے حالات کے بارے میں کوئی آخری رائے قائم کرنے سے پہلے اُن کے ساتھ جہاں تک ہو سکے نبھانے کی کوشش کریں۔ ایسا نہیں کہ آپ آج تو نئی جگہ پر آئیں اور اگلے دن ہی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ آپ کے شوہر کو تنخواہ دو حصوں میں بانٹنا پڑے، جس سے اُن کی آمدنی برابر ہو جائے یا وہ تنگ آ کر اپنی پچھلی جگہ کے لئے ہی درخواست دے بیٹھیں۔

نئی جگہ پر جو نئے موقعے آپ کے شوہر اور خود آپ کو حاصل ہوں، اُن سے پورا پورا

فائدہ اٹھائیں۔ پچھلی جگہ کے موقعوں کا رونا کبھی نہ روئیں۔

جہاں آپ پچھلی جگہ کے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کریں اور پرانے تعلقات استوار رکھیں، وہاں نئی جگہ بھی خود آگے بڑھ کر نئے دوست بنائیں۔ نئی جگہ آنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ وہاں ہمیشہ ہی اجنبی بنی رہیں گی۔ یوں تو پرانی جگہ بھی پہلے اجنبی ہی تھی! مگر جس طرح آپ نے وہاں دوست بنائے اور اپنا ایک حلقۂ احباب بنایا، اسی طرح نئی جگہ بھی آپ دلچسپی سے اپنا حلقۂ احباب وسیع کریں۔ اس طرح آپ کو نئے دوست بھی ملیں گے اور نئے نئے تجربوں کے ساتھ نئی خوشی بھی حاصل ہوگی۔ نئی جگہ جو لوگ اور چیزیں آپ کو ناپسند ہیں، ان کو بار بار کریدنے کی بجائے آپ یہ دیکھیں کہ آپ خود ان کی اصلاح کے لئے کیا کر سکتی ہیں۔

اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ ترقی کرنا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اگر آپ کے شوہر کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ جگہ جگہ پھر کر ہی ترقی کر سکتے ہیں تو آپ کو بھی ایک سیاحت پسند عورت بننے میں تکلف کیوں ہو؟ کیا آپ اپنے شوہر کی ترقی نہیں چاہتیں؟ اس لئے ایسی حالت میں اپنی ازدواجی زندگی کو کوسنے کی بجائے آپ اس پر خوش کیوں نہ ہوں کہ اس بہانے آپ کو دنیا دیکھنے کا موقع مل رہا ہے سفر کرنے سے جسم متحرک رہتا ہے اور تندرستی بھی اچھی رہتی ہے۔ ●



'دیکھئے صاحب، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کافی ہاؤس نہیں بلکہ سرکاری دفتر ہے'

ہندی نظم

مجبوریاں

سس طرح آئی تمہاری یاد
جیسے کوار میں ساون چلا آئے
ہل اٹھے خاموشیوں کے ہونٹ
ہوگئی گیلی پلک کی چھاؤں
آگیا ہوں بھول کر پھر سے
میں کہیں بے ہوشیوں کے گاؤں
لرتا پُروائیوں کے ساتھ
جیسے پریتی کا دامن چلا آئے
درد بن کر لوٹ آئیں پھر
دُور جا کر وے پُرانے دِن
آگئے ہیں اشرُو پھر باھر
دیکھنے کو یہ سہانے چھن
دیکھ کر جاتا ہوا پریہ ساتھ
جیسے دوار تک آنگن چلا آئے
ہر دِشا میں لی تمہاری کھوج
ہر طرف آواز دی تم کو
ساز اپنی دھڑکنوں کا لے
زندگی کی لاج دی تم کو
اب بھلا ان کوششوں کے بعد
کیسے ہار کر یہ من چلا آئے

——— راجیندر کمار

پریا = محبوبہ، اشرُو = آنسو
چھِن = لمحات، دِشا = سمت



مقالہ • شکیلا بخشی

کُنبے کے دائرے میں

بچے کی دُنیا گھر تک ہی محدود ہوتی ہے، اِس لیے خانگی زندگی میں ظہور پذیر ہونے والے ہر واقعہ کا اُس کے نازک دل ودماغ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اِن میں سے کچھ واقعات تو ایسے ہوتے ہیں جو اُس کے ناپختہ شعور میں بے چینی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ واقعات ہیں گھر میں لمبی بیماری کے سبب سہما سہما اور گھٹن سے بھرا ماحول، کسی کی موت، معاشی بحران اور تفکرات، گھر میں نئے بچے کی آمد، کوئی سانحہ، جگہ کی تبدیلی، ماں یا باپ کا کسی الگ جگہ رہنا، طلاق وغیرہ۔

گھر میں کسی فرد کا اچانک بیمار ہو جانا یا مسلسل بیماری بھی بچے کے دل پر ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ پھر اگر یہ بیمار فرد اُس کی ماں ہے یا جس سے اُس کا بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ جیسے دادا دادی یا کوئی بھائی بہن، تو وہ بہت فکرمند ہو جاتا ہے۔ بچہ سمجھ نہیں پاتا کہ وہ کیوں لیٹا ہوا ہے، اُس سے ہنستا بولتا کیوں نہیں؟ گھر کے سب لوگ کیوں اُداس ہیں؟ اُس سے پہلے جیسا پیار کیوں نہیں کیا جاتا؟ بیماری کیا ہوتی ہے؟ ایک ہی آدمی کیوں بیمار ہے۔ کوئی دوسرا کیوں نہیں؟

بچہ سوچتا رہتا ہے۔ اُس کا دل نہ کھیل کود میں لگتا ہے، نہ لکھنے پڑھنے میں۔ ایسی صورت میں اُس کی تندرستی پر بھی غلط اثر پڑتا ہے اور دل پر بھی۔ اِس لیے گھر والوں کو چاہیے کہ بچے کی دل آزاری نہ کر کے اُس کی نفسیات کو سمجھیں اور پیار سے اُسے سب باتیں سمجھائیں۔

ماں کے بیمار پڑ جانے پر بچوں کو اکثر دو طرح کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یا تو اُن کی دل آزاری کی جاتی ہے یا اُنہیں بہت زیادہ لاڈ پیار کر کے بگاڑ دیا جاتا ہے۔ اُن کی ہر مناسب نامناسب ضد تسلیم کر کے اُنہیں بہلایا جاتا ہے تاکہ وہ ماں کی عدم موجودگی کا احساس نہ کریں۔ اور کھیل کود میں حصہ لیں۔

مگر یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔

ماں کے بیمار پڑنے پر بچے کی دیکھ بھال کی جائے۔ اُسے اتنا پیار بھی ضرور دیا جائے کہ وہ ماں کی کمی پر زیادہ دُکھی نہ ہو، مگر اُس کی ہر ضد کے آگے سر جھکا دینا ٹھیک نہیں۔ اِس کے علاوہ اُسے ماں سے بالکل الگ رکھنا بھی ٹھیک نہیں۔ اُسے ماں کے پاس لے جائیں یا جانے میں دُشواری نہ پیدا کریں مگر یہ ضرور سمجھا دیں کہ وہ ماں کے پاس کیوں نہیں سو سکتا۔ بیماری

چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے کہیں آپ اپنے بچے کی اہمیت کو نظرانداز تو نہیں کر رہی ہیں؟

اگر بچے کی کچی عمر میں ہی اُس کے اندر پیدا ہونے والے جذبات پر نظر نہ رکھی جائے تو وہ بڑا ہو کر سرکش اور آوارہ بھی بن سکتا ہے۔

کا ڈر پیدا کرنے کی بجائے اُسے سمجھائیں کہ بیماری کیوں آئی ہے اور کس طرح ٹھیک ہو جائے گی۔ گھر میں خطرناک بیماری کے باوجود بچوں کو اُس بیماری کا زیادہ احساس نہ ہونے دیں۔ اُن کی روزمرہ کی معمولات میں کوئی رُکاوٹ نہ ڈالیں اور اُن کے ساتھ غیر فطری طور پر پیش نہ آئیں۔

کنبے میں کسی فرد کی موت ہو جانے پر جو ماحول پیدا ہوتا ہے اُس کا بچوں پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ پھر وہ اگر بچے کی ماں یا اُس کا باپ ہے، تب تو اور بھی زیادہ۔ اُسے یہ سمجھانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ آدمی کہاں گیا یا کب لوٹے گا اور کیوں نہیں لوٹے گا؟ اکثر گھروں میں بچوں کو اُلٹے سیدھے جواب دئے جاتے ہیں، وہ بھی ہر آدمی کے ذریعے الگ الگ۔ اِس معاملے میں بڑوں کو بچوں کی نفسیات کے مطابق برتاؤ کرنا چاہئے اور ایک سیدھا سا جواب دینا چاہئے۔

اگر بچہ دس برس سے بڑا ہے اور کچھ سمجھنے لگا ہے تو ماہرینِ نفسیات کے مطابق بچے کو آخری رسُومات کی جھلک بھی دکھائی جانی چاہئے۔ چھوٹے بچوں کو بے کار کی امیدیں بندھانا بھی ٹھیک نہیں۔ اس کا اُن کی نفسیات پر بہت غلط اثر پڑتا ہے۔

اکثر بن ماں باپ کے بچوں کے ساتھ کچھ دن تک دُوسرے رشتے بیا یہ غلط قسم کا بہت زیادہ لاڈ پیار جتاتے ہیں۔ بعد میں جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو بچہ ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس لئے بچے کو دھیرے دھیرے پُورے حالات سے واقف کر دینا ہی ٹھیک ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے شروع سے ہی اس طرح ڈھالنا شروع کریں جیسا کہ اُسے بعد میں رہنا ہو۔

اگر ایسے بچے کو کچھ دن کے لئے کسی قریبی اور عزیز رشتہ دار کے یہاں بھیج دیا جائے تو وہ بھی اچھا رہے گا، کیوں کہ گھر میں ہر وقت گریہ و زاری کا ماحول اُس کے دل و دماغ میں زبردست ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ بعد میں بھی، جہاں تک ممکن ہو، بچوں کے سامنے اپنا دُکھڑا رونا، قسمت کو کوسنا، اُنہیں بدقسمت کہنا یا اُن پر ناراضگی ظاہر کرنا ٹھیک نہیں۔ انہیں آہستہ آہستہ حالات کا مقابلہ کرنے کے اہل بنانا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اُنہیں اپنا کام معمول کے مطابق کرنے کے لئے بھی تیار کرانا اَشد ضروری ہے۔

اگر بچہ ہاسٹل میں ہو یا والدین سے دُور، تو خط، پیغام وغیرہ کے ذریعے اُسے اپنے خلوص کا احساس کراتے رہیں۔ اُس کی عمر کے مطابق اُس کی زبان میں اُسے برابر خط لکھیں اور اُس میں بھی جواب دینے کا جذبہ پیدا کریں۔ خطوں میں علیحدگی کا احساس قطعاً نہ آنے دیں۔ اُس کی تعلیم، حلقۂ احباب، مشغلے اور پسند کی باتیں کریں اور اسے یقین دلائیں کہ اُس کی تمام چیزیں گھر میں بہ حفاظت رکھی گئی ہیں اور وہ اُس کے چھوٹے بھائی بہنوں یا کسی دُوسرے بچے کو بھی نہیں دی گئیں
تھوڑے سے وقت کے بدلے کا [illegible]

ر بچہ الگ نہ رہنا چاہے تو بڑے حالات
آسے واقفیت کرانا بھی ضروری ہے۔

و بار شہر کی تبدیلی یا ایک ہی شہر میں
ی ایک محلے سے دوسرے محلے میں منتقل
نے پر بچے کے دوست احباب جدا ہو جاتے
ں اور اسے نیا ماحول کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔
تو بچہ ہے، بڑا آدمی بھی اگر کسی نئی جگہ چلا
ئے تو خود اسے بھی ایسی صورت حال سے ہی
چار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ
وانگی سے قبل ہی بچے کو کچھ دن تک اس
بدیلی کی بابت بتاتے رہیں اور نئی جگہ کے
لئے اس کے دل میں شوق و کشش پیدا کر دیں۔
نئی جگہ جا کر بھی اس کی پریشانیوں اور مسئلوں
کو حل کرتے رہیں۔ مناسب معلومات اور ہدایات
حاصل کر کے وہ بہت جلد نئے ماحول میں اپنے
کو ڈھال لے گا۔

چھوٹے بچوں پر گھر کے جس واقعہ کا گہرا
اثر پڑتا ہے، وہ ہے گھر میں نئے بچے کی آمد۔
بچے کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا کہ یہ نیا بچہ کس
رح آیا؟ ماں اب اس کی ہی کیوں زیادہ دیکھ
بھال کرتی ہے؟

ایسی حالت میں اگر ماں قبل از وقت بچے
کی نفسیات کا مطالعہ نہیں کرتی اور اپنے نوزائیدہ
بچے کے مقابلے میں پہلے بچے کو یکسر فراموش کر دیتی
ہے تو پہلے بچے پر اس کا بہت غلط اثر پڑتا ہے۔
بچے میں حسد، نفرت، احساس کمتری اور بے عزتی وغیرہ
جذبات عود کر آتے ہیں اور وہ موقع پاتے ہی
نوزائیدہ بچے کو زور چا کھسوٹ ڈالتا ہے۔ اسے
اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ وہ ضدی بھی ہو جاتا ہے
اور ماں سے انتقام لینے کے لئے اسے تنگ کرنا
شروع کر دیتا ہے۔

اگر بچے کی کچی عمر میں ہی اس کے اندر
پیدا ہونے والے جذبات پر نظر نہ رکھی جائے

تو وہ سماج کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے اور
جرائم پیشہ بن جاتا ہے۔ اس لئے پہلے بچے
کے ساتھ بہت ہوشیاری سے برتاؤ کرنا چاہئے۔

ماں کو چاہئے کہ وہ نوزائیدہ بچے کی دیکھ
بھال کرتے ہوئے بھی بڑے بچے کے ساتھ
اپنے خلوص کا رشتہ بنائے رکھے اور اس کے
جذبات کو سمجھے۔ اس طرح کی بات دیکھ کر
بڑا بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہن سے پیار کرنے
لگے گا۔ چھوٹا بچہ کہاں سے آیا — اس کی بابت
بھی بڑے بچے کو بتا دینا ضروری ہے۔ بہت سی
مائیں ایسے موقعوں پر بچوں کو ڈرا بہکا دیتی ہیں،
یہ ٹھیک نہیں ہے۔

طلاق کو ایک عام واقعہ نہیں بلکہ سانحہ کہنا
مناسب ہوگا۔ کم از کم بچے کے لئے تو
یہ سانحہ ہی ہے۔ اس سے بچے کی نفسیات پر
وہی اثر پڑتا ہے جو ماں یا باپ کی موت سے
اس پر ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ موت
کی حالت میں تو وہ اس لئے صبر کرے گا کہ اس
پر کسی کا بس نہیں، لیکن طلاق کی حالت میں
زندہ ماں یا باپ کو وہ معاف نہیں
کر پاتا۔

ایسی صورت میں بچہ صرف ماں کے پاس
ہی رہتا ہے۔ اس وقت اس کی تمام
ہمدردیاں اپنی ماں کے تئیں اور غصہ باپ کے
تئیں ہوتا ہے۔ اگر بچہ باپ کے پاس رہ رہا
ہے تو ماں کے لئے اس کے دل میں نفرت اور
غصے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہی
جذبات بچوں کے دماغ پر اس بری طرح
اثر انداز ہو جاتے ہیں کہ ان کی اپنی خانگی زندگی
ویسے ہی حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔

یہ درست ہے کہ پانی جب سر سے اونچا
ہو جائے تو طلاق ضروری ہے، مگر یہ تو کوئی بات
نہیں کہ طلاق کا غلط اثر بچوں پر پڑے! طلاق

کوئی اچانک سامنے آنے والا سانحہ نہیں بلکہ اس کا زہر دھیرے دھیرے اندر ہی اندر بڑھتا جاتا ہے۔ اس میں کافی وقت لگتا ہے۔ اگر ماں باپ طلاق لینے کے لئے تیار ہو گئے ہیں تو انھیں ٹھنڈے دماغ سے بچوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہئے اور یہی کوشش کرنی چاہئے کہ اس خطرناک سانحہ کا کسی طرح کا بھی غلط اثر ان کے بچوں پر نہ پڑ سکے۔

لیکن انھیں بچانے کا مطلب لوگ یہ لیتے ہیں کہ بچوں سے معاملات پوشیدہ رکھی جائے جب راز کھل جاتا ہے تو بچے کی نفسیات پر اس کا اور بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور دونوں فریقین میں سے جس کے تئیں اس کے دل میں ہمدردی ہوتی ہے جھوٹ بولنے سے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ سمجھدار بچوں کو شروع سے ہی سب سمجھا دینا چاہئے اور طلاق کی قانونی کارروائی پوری ہونے تک انھیں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار کر لینا چاہئے۔ کم سن بچوں کو بعد میں رفتہ رفتہ سب بتا دینا چاہئے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال سکیں گے۔ اور وہ سرکش و جرائم پیشہ ہونے سے بھی بچ جائیں گے۔

یہ شوہر



کچھ دن پہلے انھوں نے فلم 'وقت' دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں 'وقت' کی دھوم دھام بھی زیادہ تھی اور ٹکٹ حاصل کرنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی، اس لئے وہ سنیچر کے دن کے ٹکٹ تین دن پہلے ہی لے آئے۔ آفس جاتے وقت کہہ گئے "دیکھو بھئی، تیار رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ فلم شروع ہو جائے کیوں کہ اس میں شروع کی غزل بہت لاجواب ہے۔ میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گا۔"

میں تیار ہو کر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیوں نہیں آئے؟ مجھے تو معلوم تھا کہ فلم ایک بجے ہی شروع ہو جانے والی ہے۔

کاموں میں وہ اتنے الجھ گئے کہ انھیں دھیان ہی نہ رہا کہ فلم ایک بجے شروع ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر آ رہے تھے تو دوست نے پوچھا "بھئی گھر جانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

وہ بولے "یار، 'وقت' پھر دیکھنے جانا ہے ٹکٹ بھی لے رکھے ہیں دیر ہو جائے گی۔ گھر پر بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔"

ان کے دوست نے کہا "مگر اس کا تو شو ٹائم گذر گیا"

وہ بولے "ارے میں تو بھول ہی گیا تین بجے کی میٹنی شو کے خیال سے جلدی جلدی جا رہا ہوں۔"

وہ سیدھے گھر آئے اور اپنے بھلکڑپن کے لئے اپنے آپ کو ہی کوستے ہوئے چپ چاپ کرسی پر دراز ہو گئے۔

— کُسم 'برمن' کلکتہ

اس فیچر کے تحت اپنے تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی — ایڈیٹر



جھرّیاں

آپ کے حُسن کی دُشمن!

مقالہ • راج کرشن

جوانی میں جلد بہت ملائم اور چکنی ہوتی ہے اس لیے اگر کھال کھنچتی ہے تو بعد میں پھر اُسی حالت میں آجاتی ہے مثلاً اگر کوئی ہنستا ہے یا منہ بناتا ہے تو اس کی کھال کھنچتی ہے لیکن بعد میں پہلے جیسی حالت میں آجاتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی

ر بڑھنے کے ساتھ چہرے پر بڑھتی ہوئی مر جھرّیوں کے بارے میں پریشان ہونا عورتوں ، فطرت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی بڑھا ہونا نہیں چاہتا۔ جھرّیوں والے چہرے ں اُداسی کسی کو پسند نہیں۔ ہر شخص ــ خاص ر خواتین، اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہیں۔

جھرّی چہرے پر ابھرنے والی وہ لائن ہے جو کھال کی اندرونی تہوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو اوپر ابھارتی ہے۔

اگر سچ کہا جائے تو جھرّیاں پڑنا یعنی کھال کا بوڑھا ہونا، کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ لکیریں بننا، کھال کا اندر کی طرف دھنس جانا، کھال کا لٹک جانا، عمر بڑھنے کے ساتھ ضروری ہے۔ پھر بھی ایسے طریقے ہیں جن سے کھال کے بوڑھے ہونے کے عمل کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ہاں بالکل روکا یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ٹھیک طرح سے جلد کی دیکھ بھال کی جائے اور حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کیا جائے تو جلد کی خوبصورتی برقرار رہ سکتی ہے۔

اکثر اخباروں میں ایسی کریمیں، لوشن وغیرہ کے اشتہار دکھائی دیتے ہیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے استعمال سے جھرّیوں کو بالکل ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے چکّر میں نہیں آنا چاہئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج تک ایسی کوئی دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے جو جھرّیوں کو مٹا کر جوانی کی مستی لوٹا سکے۔

سوال اُٹھتا ہے کہ جھرّیاں پڑتی کیوں ہیں؟ اس کے کئی اسباب ہیں۔ زیادہ دھوپ میں رہنے سے چہرے پر جھرّیاں پڑ جاتی ہیں۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی جھرّیاں جلد بڑھتی ہیں۔ خشک آب و ہوا اور زیادہ نمک کھانے سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے چالیس برس کی عمر کے بعد نمک کی مقدار کم کر دینی چاہیے۔

جاتی ہے ملائمی یا چکنا پن ختم ہوتا جاتا ہے۔ کھال بہت پتلی اور خشک ہو جاتی ہے اور گوشت کے جو لوتھڑے اُسے اس حالت میں قائم رکھتے ہیں وہ غائب ہو جاتے ہیں یا بے ڈھنگے ہو جاتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی تاؤ سے کھال کھنچتی ہے تو لوٹ کر اُسی حالت میں نہیں آتی۔ جہاں رگوں کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے وہاں کھال لٹک جاتی ہے۔ کھال کے خشک ہونے سے پہلے اُس کی اوپری سطح پر باریک لکیروں کا جال سا بچھ جاتا ہے۔ پھر اوپری جلد کے نیچے کی دوسری تہہ میں عمر کے سبب تبدیلی آنے سے جھریاں پڑنے لگتی ہیں اور جگہ جگہ کھال لٹک جاتی ہے۔

یہ تبدیلیاں آناً فاناً تو نہیں بلکہ برسوں بعد رونما ہوتی ہیں۔ اس لئے جھریوں کی روک تھام کے لئے جوانی میں ہی کچھ ترکیبیں استعمال میں لائی جانی چاہئیں۔ اس کے لئے درج ذیل ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

دھوپ میں الٹرا وائلٹ شعاعیں ہونے کی وجہ سے جلد میں جلدی ہی بڑھاپا آ جاتا ہے۔ جسم کو جتنا کھلا رکھا جائے وہ ان پر اپنا اثر جماتی رہیں گی۔ بہت سے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زیادہ دیر دھوپ میں رہنے سے کینسر بھی ہو جاتا ہے۔ ان کرنوں کی تیزی زیادہ تر دوپہر کے بارہ بجے سے دو بجے تک رہتی ہے۔

جلد کی تہوں میں جتنی زیادہ نمی ہو وہ اتنی ہی زیادہ ملائم اور مضبوط بنی رہے گی۔ اس کی عدم موجودگی میں کھال پر باریک باریک لکیریں پڑنے لگتی ہیں جو رفتہ رفتہ جھریوں میں بدل جاتی ہیں۔

تیل سے بنی ہوئی کریم یا لوشن کے استعمال سے جلد کی تہوں کی نمی خشک نہیں ہو پاتی اور اس سے وہ نرم اور ملائم بنی رہتی ہے۔ لیکن چوں کہ ان کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ہی رہتا ہے اس لئے انھیں روزانہ استعمال میں لانا چاہئے۔ جوانی میں جلد میں قدرتی تیل کی کافی، کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ مقدار بھی ہوتی ہے اس لئے صابون کے استعمال سے تب کوئی نقصان نہیں ہوتا، مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے بدن میں قدرتی چکنائی کی مقدار کم ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر بڑھنے پر صابن کا استعمال کم اور کریم کا استعمال زیادہ کرنا چاہئے۔

ایسا کوئی بھی وقت نہیں ہوتا جب چہرے پر کوئی تاثر ہی نہ پیدا ہو۔ لیکن مسلسل مُنہ سکوڑنا، بھوئیں چڑھانا بھی جھریوں کو دعوت دیتا ہے۔ اپنے چہرے کی ساخت اور انداز پر بھی کچھ کنٹرول رکھنا چاہئے۔

آپ کی جلد کی خوراک منہ سے ملتی ہے، اوپر سے نہیں۔ اس لئے اگر تندرستی ٹھیک نہ ہو، بدن میں خون کا دوران کم ہو تب بھی جلد پر اس کے تاثرات صاف طور پر جھلکنے لگتے ہیں۔ مطلوبہ نیند، مستقل ورزش اور متوازن غذا وغیرہ سب آپ کی تندرستی درست بنائے رکھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اچھی تندرستی ہی جلد کی خوب صورتی کی حفاظت کرتی ہے۔

آج کل مصنوعاتِ حُسن میں کچھ دوائیں ملا دی جاتی ہیں جس سے وہ کچھ دوا کا کام بھی کرنے لگتی ہیں۔ مثلاً ہارمون کریم۔ اس کریم کے استعمال کرنے سے کھال سوج جاتی ہے کیوں کہ رگوں میں پانی رُک جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ پھولی پھولی لگتی ہے۔ لیکن اس کا اثر بھی تھوڑی دیر تک رہتا ہے●



مقالہ • رامیشور ٹانٹیا

برما

جہاں چینیوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر کے اپنا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

میں رنگون کے مختلف قصبوں اور کاروبار دعوت والے لوگ بھی مدعو تھے۔ بھارت کی طرح یہاں بھی صنعت و حرفت میں راجستھانی لوگ ہی بازی لئے ہوئے ہیں۔ یہاں خاص بات دیکھنے میں آئی کہ زراعت کو بھی دھندے کے روپ میں ہندوستانیوں نے منظم کیا ہے یہاں خاص طور سے راجستھانیوں کے ہاتھ میں لکڑی اور چاول کی بڑی بڑی ملیں تھیں، کپڑے اور غلے کے کاروبار تھے۔ پچھلے دنوں درآمد برآمد کے کام میں بھی یہ لوگ نمایاں حصہ لے چکے تھے۔ بہت سے لوگوں نے برمی عورتوں سے شادیاں بھی کر لی ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ اتنا کرنے پر بھی سرکار کو ان پر بھروسہ نہیں ہے۔ میں حیران تھا، آخر بات کیا ہے؟ خاص کر بھارتیوں کے تئیں اس بے اطمینانی کی کیا خاص وجہ ہے

تسلیم شدہ بات ہے کہ برما کی تجارت اور صنعت میں بھارتیوں کا اثر اور دبدبہ رہا ہے۔ ۱۹۵۱ کی مردم شماری کے مطابق برما کی ۲۰۰۰۰۰۰۰ کی آبادی میں تقریباً ۱۰۰۰۰۰۰ بھارتی تھے جو اس وقت صرف ۲۰۰۰۰۰ رہ گئے ہیں اور جن میں اکثریت مزدوروں کی ہے۔ دوسری طرف چینیوں کی تعداد اس عرصے میں دگنی تگنی ہو گئی ہے۔

آندھرا، اتر پردیش اور بہار کے لوگ دولت کمانے یہاں آئے۔ پنجاب کے لوگ ساہوکاری کرتے تھے اور ٹھیکیداری کرتے تھے، کچھ تجارت پیشہ بھی تھے۔ راجستھانی لوگ یہاں خاص طور

سے تجارت کے لیے آئے تھے۔ بنگالی ملازم پیشہ اور وکیل و ڈاکٹر بھی تھے۔ مدراس کے کافی لوگ یہاں حاجی کاروبار کرتے تھے۔

برما کے لوگ ہندوستانیوں کی بہت عزت افزائی کرتے تھے بالخصوص برمی عورتیں تو ہندوستانیوں کے ساتھ رہنے میں بہت خوشی اور فخر محسوس کرتی تھیں۔ چاہے بغیر شادی کئے یا شادی کر کے۔ ایسا ہوا بھی خوب کھل کر۔

میں نے سڑکوں پر گھومتے ہوئے چٹ گاؤں کے مسلمانوں کے ساتھ خوب صورت برمی عورتوں کو دیکھا۔ برما کے اراکان علاقے میں یہ چٹ گانوی مسلمان کافی تعداد میں بس گئے اور ان سے پیدا شدہ اولاد کی تعداد بھی کافی بڑھی ہے۔ کچھ برس قبل ان مسلمانوں نے اراکان کو پاکستان میں ملا دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ تب برمی سرکار خواب غفلت سے بیدار ہوئی اور اسی وقت سے روک تھام اور دیکھ بھال ہونے لگی۔

برمی عورتیں اپنے شوہروں کا بہت احترام کرتی ہیں۔ مرد کمائے یا نہ کمائے، اس سے انہیں غرض نہیں۔ بس اس کی تندرستی ٹھیک رہے، یہ ضروری ہے۔ خود بڑی محنت سے بچوں کی پرورش کرتے ہوئے عورتوں کو ذرا بھی یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مرد عورتوں کی کمائی پر گھر میں بیٹھا افیون یا چنڈو کا نشہ کر رہا ہے یا غپ شپ میں مشغول ہے۔

برما میں عورتوں کو طلاق دینے کی مکمل آزادی ہے مگر بچے ہو جانے پر وہ محبت اور مادرانہ جذبے کے تحت جلدی طلاق نہیں دے پاتیں۔ اسی کا برا اثر یہ پڑا کہ یہاں کے لوگ آرام طلب، کام چور ہو گئے۔ نشہ بازی اور وقت گزاری کے لیے جوا کھیلنا ان کے محبوب مشغلے بن گئے۔ یہاں قیام پذیر مدراسیوں نے ان کی کمزوری کا خوب فائدہ اٹھایا۔ ضرورت پڑنے پر انھیں روپیہ دیا اور بعد میں جب روپے کی ادائیگی نہ ہوئی تو بدلے میں مکان اور جائداد ہڑپ لی۔

۱۹۴۷ میں بھارت سے برما کے علیحدہ ہونے سے قبل اس بارے میں کوئی بھی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ لیکن بعد میں یہ ایک فرقہ وارانہ سوال بن گیا اور ہندوستانیوں کی گہما گہمی رہی۔ اس میں غیر ملکیوں — خاص کر چینیوں کا زیادہ ہاتھ رہا۔

چین میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے پر وہاں کی سرکار نے برما کی حالت کا اچھی طرح مطالعہ کیا، جب کہ ہماری سرکار نے مایوسی کا رخ اپنایا۔ چینیوں نے یہاں اپنا اثر جمانے کے لیے بھارتیوں کے خلاف آگ بھڑکائی۔ بھارت اپنے پنچ شیل کے راگ ہی الاپتا رہا اور چین اپنا کام کرتا گیا۔ اس نے اپنے تیار مال کے لیے بازار پر قبضہ کر لیا اور جب وہاں کے باشندوں کو روزگار ملا تو وہ ان کے گن گانے لگے۔

آج دس لاکھ چینی برما میں ہیں۔ بھارت کی طرح پاکستان سرکار کو بھی پریشانی لاحق ہونی چاہیے تھی مگر پاکستان سرکار بیدار رہی اور اس نے چینیوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ آج پاکستان کی وہاں مخالفت نہیں کی جاتی۔ بہت سے پاکستانی شمالی برما میں آ کر بس گئے ہیں یہ تعداد اتنی تیزی سے بڑھنے لگی کہ برما سرکار کو اس میں مداخلت کرنی پڑی مگر اس طرح دونوں ملکوں کے مابین تعلقات میں کوئی کشیدگی نہ آ سکی۔ ہمارے ساتھ برما کے تعلقات اچھے نہ ہوتے ہوئے بھی بھارت سرکار نے ۱۹۵۷ میں برما کو تیس کروڑ روپے کا قرض دے دیا۔ اس کا خاطر خواہ کچھ بھی اثر نہ پڑا اور بھارت



وگ برما سرکار کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔

مسٹر گوُتھا نے ایک برمی عورت سے شادی کی ہے اور لباس بھی وہ اپنا برما کا ہی رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا "آپ برمی ہو گئے، مگر یہ تو بتایئے کہ برمی خوراک آپ کو ہضم ہوئی یا نہیں؟" انھوں نے ہنس کر کہا "کھانے کے معاملے میں میں ابھی تک ہندوستانی ہوں، کیوں کہ رما کے زیادہ تر لوگ گوشت خور ہیں اور چینیوں کی طرح مینڈھک، سانپ اور کیڑے مکوڑے ی ان کی مرغوب غذا ہیں۔"

مسٹر گُپتا سے میں نے معلوم کرنا چاہا کہ کیا سبھی برمی ہندوستانیوں سے غیر مطمئن ہیں یا نیوزم کے ہی پیروکار؟ انھوں نے بتایا کہ ہندوستانیوں کے تئیں نفرت کا اتنا زیادہ پرچار کیا گیا ہے کہ وہ بہت زیادہ پھیل گیا ہے۔ اُن کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ اگر بھارتی سرکار چاہے تو اس معاملے میں کافی حد تک سدھار ہو سکتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ برما کے سب باشندے ہندوستانیوں کے ساتھ نفرت کا برتاؤ کرتے ہوں۔ اور صرف کمیونسٹ نظام حکومت اور اصولوں میں یقین رکھتے ہوں حکومت بائیں بازو والوں کی ہے مگر بہت سے صحیح الدماغ برمی ایسے بھی ہیں جو اپنے ملک کی موجودہ صورت حالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ مجبوری یہ ہے کہ نہ تو وہ کسی پلیٹ فارم سے اپنی آواز اُٹھا سکتے ہیں اور نہ وہاں عوام کو اپنی اظہار رائے کی اجازت ہی ہے پریس پر پابندی ہے

دوسرے دن دوپہر کو سنگاپور جانے کا پروگرام بنایا۔ صبح ناشتے پر ہم مسٹر سونگ کے گھر گئے۔ وہاں آٹھ دس معزز ہندوستانی بھی مدعو تھے۔ ان میں سے کئی لوگ بہت اچھے سیاست داں تھے۔ مسٹر سونگ کی پہلے اچھی پریکٹس تھی۔ سیکڑوں ہندوستانی ان کے موکل تھے۔ بھارت اور برما کے آپسی تعلقات اور چین کی کارگزاریوں پر باتیں ہوئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ بھارت کی فراخ دلانہ یا کمزور فارن پالیسی کی وجہ سے ہی برما پر چین کا اثر زیادہ پڑا۔

برما سے جاپانیوں کے جانے کے بعد اون آنگ
سان کی زیر قیادت وہاں نئی سرکار
کی تشکیل ہوئی تھی لیکن ان کی کابینہ کے
سات ممبروں کو باغیوں نے ایک ساتھ
گولی مار دی۔ ۱۹۴۸ کی ۴ جنوری کو برما
انگریزوں کے ذریعے آزاد کر دیا گیا۔ پہلے وزیر اعظم
بنے مسٹر اُو نُو۔

آزاد برما کو جن مشکلات سے گزرنا پڑا،
شاید ہی دوسرا کوئی ملک اتنی مشکلات سے
گزرا ہو۔ اُو نُو کی کارگزاری، مقبولیت اور
سوجھ بوجھ کی وجہ سے دھیرے دھیرے دقتیں
دور ہو رہی تھیں۔ وہ خود سماج وادی نقطۂ نظر
کے حامی تھے مگر ان کی مخالفت نہ تو پارلیمنٹری ڈیموکریسی
سے تھی اور نہ وہ کمیونزم کے کٹر حامی تھے۔

چین کی قومی سرکار کی شکست کے
بعد وہاں کمیونسٹ سرکار نے اپنے پنجے
گڑا دئے تو عالمی سیاست میں ایک نئے باب
کا آغاز ہوا۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے سبھی ممالک
پر اس کا براہِ راست اثر پڑا۔ چین کا اقتدار
بڑھنے لگا۔ کمیونسٹ چین نے برما کی سیاست
میں اپنے پرانے طریقے کو استعمال کیا۔ چیانگ
کی ہاری ہوئی فوج کے بھیس میں چینی یہاں
گھس آئے۔ کرین لیڈروں کو اکسایا گیا۔ سرکاری
خزانوں کی لوٹ، ریل، تار و ٹیلی فون کو درہم
برہم کرنا اور ہڑتالیں کرانا روزانہ کا معمول بن
گیا۔ بھارتیوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی
گئی۔ اس طرح پرسکون ماحول میں بدمزگی پیدا
ہو گئی۔ کام دھندے ٹھپ ہونے لگے۔

علاوہ بریں ۱۹۵۳ میں چاول کے داموں
میں بہت زیادہ نرمی آگئی۔ چاول برما کے لئے
سونا ہے۔ اس کی درآمد سے غیر ملکی زر تبادلہ
حاصل ہوتا ہے۔ اس نرمی کے سبب برما کا
معاشی ڈھانچہ ڈانوا ڈول ہو گیا۔ برمی روپے
کی قیمت بازار میں کم ہو گئی۔ سُرخ چین ایسے
ہی موقعہ کی تاک میں تھا۔ اُس نے دباؤ ڈا
شروع کیا۔ نتیجے میں پریشان صورتِ حالات
میں کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر دسمبر ۱۹۶۵ میں
چین کے ساتھ برما کا سمجھوتہ ہو گیا۔ چین کی یہ
زبردست کامیابی تھی۔ اُسے انڈونیشیا کی
طرح برما میں براہ راست پیر جمانے کا اچھا
موقع مل گیا۔

۱۹۵۷ میں اُو نُو کو جنرل نیوِن کے حق
میں مستعفی ہو جانا پڑا۔ یہ اُن کی مقبولیت کی
ہی ایک مثال کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۶۰ کے جنرل
الیکشن میں اُن کی پارٹی کو کثرت رائے سے
کامیابی ملی۔

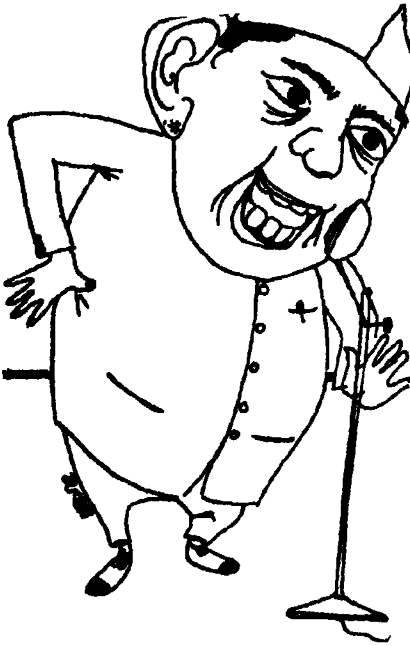
کمیونزم کبھی انتخاب کے حق میں نہیں رہا۔
سُرخ چین دن بدن طاقت مجتمع کر رہا تھا۔ برما
میں اُس کے جاسوس معروف کار رہتے تھے۔ ۲ مارچ
۱۹۶۲ کو جنرل نیوِن نے فوجی طاقت سے برما کی
قانون ساز اسمبلی پر قبضہ جما لیا اور اس طرح
بائیں بازو کی فوجی حکومت قائم ہو گئی۔

بھارت کی طرح برما بھی تیوہاروں کا
ملک ہے۔ بہت جوش و خروش اور خوشی سے
یہاں کے مرد و زن انھیں مناتے ہیں۔ ہولی
تیوہار ٹیمبولا تو کئی دن کی تیاری کے بعد منایا
جاتا ہے۔ مزدوروں کی ٹولیاں موٹر، ٹرک
یا پیدل خوشبودار پانی کے چھوٹے بڑے
برتن لے کر نکلتی ہیں اور دوستوں کے گھر
پہنچ کر ایک دوسرے کو شرابور کرتی ہیں۔
دوسرے دن ناچ گانے اور جلسے جلوسوں کا
انتظام ہوتا ہے۔

برما سرکار کے دئے ہوئے ایک دن
میں چاہے پورا برما نہ گھوم پایا۔ مگر جتنا دیکھا
اور جانا، اتنے سے کمیونسٹ ملک اور سرکار کا اچھا
تعارف مل گیا۔ ایک بجے ہمارا جہاز سنگاپور
کے لئے اڑا۔ لگ رہا تھا گویا یہ برما کی پہلی اور آخری
سیاحت ہے۔

طنز

کناورشی بھٹناگر



جلوس

کم سے کم ایک میل لمبا تو ہونا ہی چاہیے۔ آخر پبلک کا معاملہ جو ٹھہرا...

(ایک آراستہ پیراستہ ڈرائنگ رُوم۔ شیام لال ایک اخبار پڑھ رہا ہے۔ بدھو کمرہ صاف کر رہا ہے۔ باہر دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ بدھو دروازہ کھولتا ہے۔ باہر سے چمن لال داخل ہوتا ہے۔)

شیام: آیئے، تشریف رکھیے۔ کہئیے معاف کیجیے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔

چمن: آپ سچ کہتے ہیں۔ میں چمن لال ہوں۔ مجھ کو آپ نے پہلے نہیں دیکھا ہو گا۔ مگر جناب، ہم تو روز آپ کو دیکھتے ہیں۔ کل شام کو پریڈ گراؤنڈ میں آپ کا لیکچر سنا تھا۔ بڑا پُرجوش تھا۔ کیا بات تھی! ایسا زبردست لیڈر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ بڑی خوشی ہوئی۔

شیام: آپ تشریف رکھیے نا۔

چمن: (بیٹھ کر) آپ نے ایک بات بتے کی کہی تھی۔ ملک کی ترقی کا جو خاکہ آپ نے کھینچا تھا اس کا جواب نہیں۔

شیام: ہم تو حقیقت بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کو ہماری باتیں پسند آجاتی ہیں۔

چمن: اجی صاحب پسند کیوں نہ آئیں! ان میں وزن ہے، وہ حقائق پر مبنی ہیں۔

شیام: شکریہ! ہم ہمیشہ کوشش کریں گے کہ عوام کی خدمت کرتے رہیں۔

کردار

شیام لال۔ ایک سیاسی لیڈر

بدھو۔ شیام لال کا نوکر

چمن۔ مہاجرین کا نمائندہ

چمن:- اسی لئے تو آپ کے پاس بھاگا آیا ہوں۔ آپ کے سوا نہیں کون مصیبت سے نجات دلائے گا۔

شیام:- آپ کس مصیبت میں ہیں ؟ فرمائیے، کیا تکلیف ہے؟

چمن: اجی اس زمانے میں مصیبتوں کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ایک ہو تو آدمی بتائے مگر جناب کو ہم زیادہ پریشان نہیں کریں گے۔ صرف ایک تکلیف رفع کرنے کے لئے آپ کو کچھ کرنا پڑے گا۔

شیام:- فرمائیے۔

چمن:- قصہ یہ ہے کہ جگہ نہ مل سکنے کی وجہ سے ہم نے سرکاری زمین کے کچھ حصے پر اپنے کھوکھے ڈلوا دئے تھے۔ جگہ مین روڈ پر تھی۔ سرکاری نوٹسوں کی ہم نے پرواہ نہیں کی۔ آپ ہی بتائیے جناب ہم ان کو چھوڑ کیسے سکتے تھے! پھر سرکار نے ہم کو ایک نئی کالونی میں آباد کرنے کا فیصلہ کیا مگر وہ جگہ وہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اب بتائیے ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں! ہمارا تو سارا کاروبار ہی ٹھپ ہو جائے گا۔ ہم نے وہاں سے جگہ تبدیل نہ کرنے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے مگر جناب، اب آپ ملاحظہ فرمائیے حکومت کی من مانی پرسوں صبح پولیس کا ایک پورا دستہ آگیا اور انھوں نے ایک دم سارے کھوکھے توڑ ڈالے۔ اب بتائیے، کیا یہ ہماری حکومت کو زیب دیتا ہے؟ کیا یہ ہمارا ملک نہیں ہے؟ بتائیے، یہ صریحاً زیادتی نہیں! فرمائیے نا؟

شیام:- قطعی! یہ تو بہت ہی بے جا حرکت اور ناواجب قدم ہے۔

چمن۔ یہ بات ہوئی نا۔ مجھکو معلوم تھا کہ آپ ہماری مشکلات اور دقتوں کو جلد ہی سمجھ جائیں گے ایک عرصے سے سینکڑوں لیڈروں کے دروازوں پر دستک دے چکا ہوں، مگر ان لوگوں کو لیڈری کا نشہ ہے وہ بھلا اب ہم غریبوں کی فریاد پر کیا کان دھریں گے! اب آپ ہمارے لئے ضرور کچھ کیجئے۔ ایسا ہنگامہ کھڑا کیجئے اور اتنا شور مچائیے کہ ایک دفعہ تو گورنمنٹ کے بھی ہوش اڑنے لگیں۔ تقریریں کیجئے ستیہ گرہ کروائیے۔ ہڑتال کی اپیلیں جاری کیجئے اور دھرنا دیجئے آخر پبلک کا معاملہ ہے کڑی اور سخت کاروائی چاہئیے۔ ہاں، جناب!

شیام: میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ اس ظلم کے بارے میں کوئی احتجاجی قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ حکومت نے آخر عوام کو سمجھ کیا رکھا ہے! جب تک آپ آواز نہیں اٹھائیں گے شدید احتجاج نہیں کریں گے، ان لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی۔

چمن: آپ نے درست فرمایا ہے، مگر حضور، ہم غریبوں کی سنتا کون ہے! ہماری صدا تو نقار خانے میں طوطی کی آواز ہے۔ اس نیک کام کو تو آپ ہی پورا کر سکتے ہیں۔

شیام: ضرور، ضرور۔

چمن:- تو پھر ہمارا کام کب شروع کر رہے ہیں؟

شیام:- (سوچتے ہوئے) میرے خیال میں تو آپ کے معاملے کا آغاز ایک جلوس اور دو عام جلسوں سے ہونا چاہیے۔

چمن:- یہ تو بہت اچھا رہے گا۔

شیام:- آپ جلوس کتنا لمبا چاہتے ہیں؟

چمن: کم از کم ایک میل لمبا تو ہونا چاہئے۔

بدھو:- تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم از کم دو ہزار آدمی ہونے چاہئیں۔

شیام:- بدھو!

بدھو: چھوٹے سرکار، مجھے یہ تمام باتیں
نی یاد ہیں۔ کئی جلوس نکلوا چکے ہیں ہم
ے۔
چمن: میرے خیال میں ایک میل لمبا
یے رہے گا۔
بدھو: عورتیں کتنی درکار ہیں؟
چمن: جی!
شیام: اس سے جلوس میں رنگینی آ
انی ہے۔ عورتوں سے عوام پر زیادہ اثر پڑتا
ہے۔ اور آج کل تو اشتہار بازی کا زمانہ
ہے۔ عورتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔
یں چالیس عورتیں جلوس میں آگے اور
دس پندرہ پیچھے ہونی چاہئیں۔
بدھو: آپ کے آدمیوں میں سے جلوس
میں حصہ لینے والے مرد اور عورتوں کی تعداد
کتنی ہوگی؟
چمن: ہمارے لوگ زیادہ تر نوکری پیشہ
اور کاروباری ہیں۔ ان کے لئے کام سے
رخصت لینا مشکل ہو جائے گا۔ عورتیں تو شاید
بالکل نہ آسکیں۔
شیام: خیر، آپ کے آدمی نہیں آسکتے
تو کوئی بات نہیں۔ ہم سب بندوبست
کرلیں گے مگر آپ کا خرچ بڑھ جائے گا۔
چمن: خرچ؟
شیام: ہمارے پاس مشکل سے دو
تین سو لوگ ہیں۔
بدھو: باقی ہمیں کرایہ پر لانے پڑیں گے۔
دو گھنٹے کے لئے ایک آدمی کم از کم چار روپے
مانگتا ہے، مگر چونکہ ہمیں اکثر ان لوگوں کی ضرورت
پڑتی رہتی ہے، اس لئے ہمارے لئے رعایتی
نرخ دو روپے کا ہے۔ البتہ عورتوں کو تین
روپے ہی دینے پڑتے ہیں۔ بوڑھی عورتوں کی
دو چار روپے ہے۔
چمن: بوڑھی عورتیں!

شیام: دو چار بوڑھی عورتیں تو رکھنی ہی
پڑتی ہیں۔
بدھو: اور پھر اشتہار شائع کرنے ہوں
گے۔ جھنڈے اور بلّے وغیرہ بنوانے پڑیں گے۔
فوٹوگرافر لائے جائیں گے اور اگر آپ جلوس
سائیکلوں پر چاہتے ہیں تو اتھنّی فی کس علیحدہ
ہوگی۔
چمن: اس میں تو بہت خرچ آجائے گا۔
شیام: اتنا زیادہ نہیں۔ ہم اپنے ورکر
فری دے دیں گے۔
بدھو: بس ان کے چائے پانی کا خرچ
برداشت کر لینا۔
شیام: (حساب لگاکر) میرے اندازہ کے
مطابق پانچ ہزار میں سارا اہتمام ہو جائے گا
ایک میل لمبا جلوس کناٹ پلیس سے شروع
ہوکر پارلیمنٹ ہاؤس کے باہر دھرنا جا دے گا
ہر پچاس آدمیوں کے گروپ کے ہاتھ میں
جھنڈے ہوں گے۔
بدھو: آگے جھنڈے پکڑے ہوئے
خوب صورت لڑکیاں۔
شیام: ان کے پیچھے دو پینسٹھ ستر سال
کی بوڑھی عورتیں اور ان کے پیچھے ہمارے آدمی۔
بدھو: باقی جلوس میں کرائے کے آدمی۔
سب سے پیچھے پھر عورتیں، تیس پینتیس سال کے
درمیان عمر والی مگر تین نقش خوب صورت جلوس
کے عین وسط میں چل رہی عورتوں کی گود
میں بچے۔
شیام: ہر گروپ کی سائڈ میں دو دو
والنٹیر جوش دلانے اور نعرے لگانے کے
لئے۔ تین چار انچارج ہمیں باہر سے بھی بلانے
پڑیں گے۔ جلوس کو اثر انگیز بنانے کے لئے
یہ ضروری ہے۔
بدھو: ان کے آنے جانے اور رہائش کے
اخراجات بھی ادا کرنے ہوں گے۔

شیام: ایک بات جو میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔

چمن: کون سی بات؟

شیام: ایک ہزار روپے کا خرچ اور ایک نامور پبلک لیڈر کی حاضری۔

چمن: وہ کیسے؟

شیام: ہم اس کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی آمد سے حکومت کو پولیس وغیرہ کا زیادہ انتظام کرنا پڑے گا۔ زیادہ پولیس کی وجہ سے جلوس کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ پارلیمنٹ ہاؤس پر جا کر مظاہرین کو خطاب کریں گے تو بڑے بڑے لوگوں کی توجہ اِس جانب کھینچنا لازمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اِس مظاہرہ سے پارلیمنٹ میں کوئی سوال ہی پوچھ لے۔ تقریر کرتے وقت کوئی غیر ملکی فوٹوگرافر تصویر بھی کھینچ سکتا ہے۔

بدھو: بس صرف ایک ہزار روپے کی بات ہے۔

چمن: ایک ہزار تو کیا، اگر کام ہو جائے تو ہم ہزاروں روپے خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔

شیام: تو پھر ایسا کرو کہ پہلے رام لیلا گراؤنڈ میں ایک میٹنگ کا انتظام کرو۔ دس ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔ پانچ لیڈر میں لا دوں گا۔ آڈئینس یعنی لوگوں کا اجتماع بھی کر دوں گا۔

بدھو: نعرے میں لگوا دوں گا۔

شیام: یعنی آپ کا کیس اس ہوشیاری اور زور دار طریقے سے ڈیمانسٹریٹ کیا جائے گا کہ رائے عامہ آپ کے حق میں ہو جائے گی۔ گلے دن اخباروں میں آپ لوگوں کے فوٹو ائع ہوں گے۔ تمام مختلف زبانوں کے روں میں اداریہ لکھوا دوں گا اور پھر دیکھو ی شو مین شپ۔

بدھو: ہاں، پھر دیکھئے۔

چمن: تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ خرچ کی بالکل پرواہ نہ کیجئے۔ آپ سب انتظام شروع کر دیجئے۔

بدھو: تو لائیے ہاتھ ملائیے۔

(بدھو شیام سے ہاتھ ملانے لگتا ہے۔ پھر چمن لال سے ملاتا ہے۔)

شیام: تو پھر لائیے ایڈوانس اور میں اپنے آدمیوں کی آج ہی میٹنگ بلاتا ہوں۔

چمن: کتنا ایڈوانس چاہئے؟

بدھو: جتنا آپ دے سکیں۔

چمن: پانچ سو روپے ہیں اس وقت۔

شیام: چلے گا۔ ہاں، دو ہزار کل تک اور بھجوا دیجئے۔ باقی حساب کتاب بعد میں ہوتا رہے گا۔ حساب کے معاملے میں ہم بڑے صاف ہیں۔

چمن: کیوں نہیں! یہ لیجئے پانچ سو۔

شیام: یہاں رکھ دیجئے اور اپنا پتہ بھی دے جائیے۔

بدھو: آپ کی ایک فائل کھل جائے گی۔

چمن: جی، بہت اچھا۔ تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا نا؟

بدھو: سمجھو ہو گیا۔

شیام: آپ ذرا بھی نہ گھبرائیے۔

چمن: جی بہت اچھا۔

شیام: یہ ہمارا فرض بھی ہے۔ آپ مصیبت میں ہوں ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔

چمن: جی، بہت اچھا۔ آپ پر ہی ہماری امید ہے۔ اچھا نمستے۔

شیام: نمستے۔

بدھو: ہماری بھی نمستے۔

(چمن لال باہر جاتا ہے آہستہ آہستہ گرتا ہے)



غم دینے والے تجھ سے...

غم دینے والے تجھ سے بھی پیارا ہے تیرا غم
مجھ کو تمام عمر گوارا ہے تیرا غم

طوفاں کا کوئی خوف نہ ساحل کی آرزو
تو موجِ زندگی ہے کنارا ہے تیرا غم

اب کیا ڈرا سکے گی مجھے گردشِ جہاں
ہر شامِ غم میں صبح کا تارا ہے تیرا غم

شعلہ فشاں ہے دِل اور آنکھیں ہیں اشکبار
شبنم ہے تیری یاد شرارا ہے تیرا غم

تجھ کو غموں کا واسطہ خوشیاں نہ دے مجھے
لے دے کے ایک میرا سہارا ہے تیرا غم

اے آزمانے والے مجھے اور آزما!
ہر حال میں حسین ہے پیارا ہے تیرا غم

شیدا ہر ایک شعر پہ محفل تڑپ اٹھی
رنگِ غزل نے خوب نکھارا ہے تیرا غم

— شیدا اردمانی



جب مشینی پہرے داروں نے محبّت کرنے والے دو انسانوں کا راستہ روکا۔

سائنسی کہانی • گمان

عیسوی سال کی ۸۳ ویں صدی کے آخر برس میں گرمی کے دن ہیں۔

زمین کے ایک سو گیارہویں حصّے کے بہت اُوپر سے ایک خلائی راکٹ دھیرے دھیرے اُترتا آ رہا ہے۔ اس میں اس وقت کے مشہور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کالی ناگ سوار ہیں۔ اُن کی ہدایت کے بموجب راکٹ چاردمل گنپت کی جاگیر کی طرف اُترنے والا ہے کالی ناگ کا یہ روز مرّہ کا معمول ہے۔ وہ اس جاگیر کے ضعیف العمر مالک گنپت میں جذبۂ مناظرت پیدا کرنے کے لئے اس کا نفسیاتی ڈاکٹر بن کر آیا ہے۔ یہ نفسیات کا ایک نیا شعبہ ہے اور اس کے ماہرین کی آج کی دُنیا میں بہت زیادہ ضرورت ہے اکثر سب ہی بڑے لوگوں کو ہمیشہ اُن کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں۔

راکٹ کے ٹیلی سکرین پر جب اُس نے باہر کے منظر کا عکس دیکھا تو اس کے سیاہ چہرے پر حیرت کے جذبات اُبھر آئے۔ اس نے گنپت کی جاگیر کی طرف ایک آدمی کو پیدل جاتے دیکھا۔ یہ تعجب خیز بات تھی۔ 'کوئی جنگلی انسان ہوگا' اُس نے سوچا۔

راکٹ اب زمین کے بہت قریب آ چکا تھا، اس لئے زمین کا منظر کافی صاف نظر آنے لگا تھا۔ حدِ نظر تک زمین خالی پڑی تھی۔ کہیں کہیں کوئی خود کار مشین قدرت پر عبور حاصل کرنے میں سرگرداں نظر آ جاتی تھی. کب، کس پیڑ پر کیا پھل یا پھول لگتا ہے، کب کس شہد کی مکھی کو کس پھول پر جانا ہے۔ اب سب کام منصوبے کے تحت چل رہے تھے۔ ہر پرندے کا ایک الگ سبزہ اُڑانے کا کوڑ تھا۔ بارش بھی پہلے سے معین اوقات اور متعین مقامات پر ہی ہو سکتی تھی۔ مذنکلی

سے پُر امن موجی پرانی دنیا بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ ۸۳ ویں صدی کی یہ نئی دنیا ہر لحاظ سے پُوری طرح منصوبہ بند اور منظم تھی۔

دنیا میں کوئی بھی شے ایسی نہیں بچی تھی جس پر کہ عبور حاصل نہ ہو۔ پچھلی صدیوں میں آبادی کے بہت زیادہ دباؤ کی وجہ سے زمین کی زرخیزی تقریباً پُوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ کروڑوں آدمی بھوک سے مر گئے تھے

اور جو تھوڑے بہت زندہ بچے تھے وہ قحط کا شکار ہو رہے تھے۔ ہر ممکن فضول خرچی کو روک کر طرح طرح کی سخت پیش بندیاں کر کے زندہ بچے لوگوں کے لئے تھوڑی سی خوراک مہیا کی جا رہی تھی۔

دُور دُور تک پھیلے سپاٹ میدان کے عین درمیان گنپت کا محل ایک سیاہ دھبے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پانچ ایکڑ کے اُسی خطے کے چاروں طرف اونچے اونچے دیودار کے درخت کھڑے تھے، جن کی بڑھی ہوئی خشک ٹہنیاں مکان اور میدان پر پھیلی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سنگلاخ پتھروں کا بنا ہوا محل تھا، جس میں سب کام مشینوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ اس لئے اسے بہت مضبوط بنایا گیا تھا۔ اُس میں گنپت اور اُس کی پاگل لڑکی پلائینشا کے علاوہ سب مشینیں ہی رہتی تھیں۔

کالی ناگ نے درختوں کے پاس آتے ہی انسانی شکل کو محل کی طرف بڑھتے دیکھا۔ کئی وجوہ سے یہ ایک عجیب سی بات تھی! دنیا کی اشیا کا استعمال کرنے کے لئے بہت کم انسان بچے تھے۔ اس وجہ سے کوئی بھی اتنا غریب نہیں تھا کہ اُسے پیدل چلنا پڑے۔ دُوسرے یہ کہ انسان کو قحط وغیرہ جیسے بہت سے مصائب کا سامنا کرنے پر قدرت سے انتہائی نفرت ہو گئی تھی۔ اِس لئے زمین پر پاؤں رکھنا کسی بھی صحیح الدماغ انسان کو پسند نہیں تھا۔ پلائینشا جیسی کوئی پگلی ہی ایسا کر سکتی تھی۔

اُس آدمی کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا کر کالی ناگ نے راکٹ کو محل کے سامنے اُتار دیا۔ گنپت کا محل بہت بڑا تھا۔ اس میں کئی کھڑکیاں اور مینار تھے، ساتھ ہی لمبے لمبے گلیارے تھے اور فضول کی ٹیپ ٹاپ تھی۔

اُس کی آمد پر فوراً ہی ہل چل ہو گئی۔ ہلکے ایٹمی ہتھیار تانے ہوئے رنگین پہیوں والی محافظ مشینیں مختلف اطراف سے راکٹ کی طرف آنے لگیں۔

کالی ناگ جانتا تھا کہ یہاں بغیر اجازت حاصل کئے کوئی نہیں آسکتا۔ اُن دونوں دوستانہ تعلقات بُرے سمجھے جاتے تھے لیکن گنپت تو اور بھی زیادہ رُوکھا تھا۔ پھر پلائینشا جیسی بیٹی پانے کے سبب اُس کی زندگی میں غم ہی غم شامل ہو گیا تھا۔

"تم کون ہو؟" سب سے بڑی مشین نے پوچھا۔ وہ بالکل سپاٹ اور بدصورت تھی اور ڈائن لگتی تھی۔

"میرا نام ڈاکٹر کالی ناگ ہے۔ میں ماہرِ نفسیات ہوں" کالی ناگ نے جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنا منہ مشین کو دکھایا۔ مشین نے پہلے اپنے حافظہ کے کینوس پر پڑا ہوا عکس اور مختلف معلومات سے اس کی جانچ کی، پھر کہا "تم ڈاکٹر کالی ناگ ہو۔ چارودل گنپت کے ماہر نفسیات۔ تم کیا چاہتے ہو؟" مشین نے رُک رُک کر کہا۔

اُس کے اس طرح رُک رُک کر بولنے سے کالی ناگ جھنجھلا کر بولا "مجھے دس بجے چارودل گنپت نے نفرت کا انجکشن لینے کے لئے بُلایا ہے" اور ان باتوں کو مشین کے شعور تک پہنچنے کے لئے انتظار کرنا پڑا۔

"تم کو دس بجے گنپت نے نفرت کا انجکشن لینے کے لئے بُلایا ہے" مشین نے تصدیق کی "ادھر آؤ۔"

وہ مشین بڑی صفائی کے ساتھ گھ

اپنی مخروط کار آواز میں اپنے ساتھیوں سے
ہراتے ہوئے کہا "یہ گنپت کا ماسٹر
بات کالی ناگ ہے۔ اس کو دس بجے
بت نے نفرت کا انجکشن لینے کے لئے بلایا
ہے" اس نے یہ سب باتیں اس انداز
ں کہیں کہ اگر دوسری مشینوں کی سمجھ میں بات
آئی ہو تو وہ سب صورتِ حال سے آگاہ
ہو جائیں۔

درمیان کالی ناگ نے اپنے راکٹ
سی میں ایک بٹن دبایا اور اس کے
پہیے پھیل کر سمٹ گئے۔ جس حصے میں وہ بیٹھا
تھا وہ حصہ بقیہ راکٹ سے الگ ہو گیا اور
سے لے کر وہ مشینوں کے ساتھ محل کی جانب
اڑنے لگا۔

جب کالی ناگ دوسرے لوگوں کے
سامنے پہنچتا تھا تو خود کار پردے تن جاتے
تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کو ٹیلی سکرین
پر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ لوگوں کو ایک دوسرے
سے اتنی نفرت تھی یا کہئے خوف تھا کہ وہ
ی کو مدِ مقابل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے
یکے بعد دیگرے تمام مشینیں سیڑھیاں
ڑھ کر گلیارے میں پہنچ گئیں۔ وہاں ان پر
ایثم کش دوائیاں چھڑکی گئیں۔ اور پھر وہ
بارو مل گنپت کے روبرو پہنچ گئیں۔

گنپت کے کمرے میں آویزاں پردے
پر اس کا چہرہ نظر آیا۔ جس پر ماہرِ نفسیات
سے ملنے کی وجہ سے خفیف سی جھنجھلاہٹ
تھی۔ وہ عام طور پر ایسے ہی جھنجھلاتا رہتا
تھا، اس لئے تقریبوں میں اس کی بے
عزتی ہوتی تھی کیونکہ دستور کے مطابق کبھی
سی کے ملنے پر بے وقت کی نفرت اور غصہ
لانے سے دوسروں کو دبا دینا ہی اچھا سمجھا
تا تھا۔ اس وجہ سے خاص تقریبوں کے
موقعوں پر گنپت کو نفرت کا انجکشن دینے کے
لئے کالی ناگ کی ہی خدمات لی جاتی تھیں۔

کالی ناگ کو ایک مشین اسے گنپت
سے ایک گز کے فاصلے پر لے گئی۔ "مجھے
دیر ہوگئی" کالی ناگ نے جھلا کر کہا "کیوں
کہ میں تمہارے جیسے واہیات آدمی سے
ملنے کے لئے اپنے کو ایک منٹ بھی پہلے
آنے کے لئے مجبور نہ کر سکا۔ میں نے سوچا
تھا شاید دیر کرنے سے کوئی ایسا حادثہ
ہو جائے جس سے تمہارے منحوس چہرے
سے تمہاری ناک کٹ کر گر جائے۔ لیکن
افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ
تمہارے نتھنے چوہوں کے بڑے بڑے
بل ہیں جو تمہارے دماغ تک کھدے ہوئے
ہیں۔ گنپت، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ چلتے
وقت کبھی ان میں تمہارا پیر کیوں نہیں پھنس
جاتا اور تم گر کیوں نہیں پڑتے!"

کالی ناگ نے مریض کے چہرے پر

حساب



استاد: اگر تمہارے والد کوئی کام تین گھنٹے میں پورا کریں اور تمہاری والدہ بھی اسی کام کو تین گھنٹے میں کریں تو بتاؤ دونوں مل کر اس کام کو کتنی دیر میں پورا کریں گے؟"

چھوٹی لڑکی: تین گھنٹے میں۔

استاد: تم سب بے وقوف ہو۔ تین نہیں ڈیڑھ گھنٹے میں۔

چھوٹی لڑکی: جی، میں نے اس ڈیڑھ گھنٹے کو اسی میں شامل کر لیا ہے جو وہ آپس میں لڑ کر خراب کریں گے۔

چڑچڑاہٹ کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ گنپت کو مشتعل کرنا واقعی مشکل کام تھا، لیکن کالی ناگ بھی اپنے فن میں ماہر تھا، وہ مزید بے عزتی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن تم نہیں بڑ سکتے کیوں کہ تم اتنے گدھے ہو کہ تم اونچ نیچ کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ جب تمھیں افزائش نسل کے لیے تولیدی مرکز بھیجا گیا تھا، تب بھی تم یہ بھول گئے تھے کہ صرف اُس وقت ہی کسی آدمی کو پردے سے باہر آنے کا موقع ملتا ہے۔ تم سمجھتے تھے کہ پردے کے پیچھے سے ہی تم سب کچھ کر سکو گے۔ لیکن اُس کا انجام کیا ہوا؟ ایک پدّی سی چھوکری پیدا ہوئی! گنپت، تمھیں اپنے اوپر رونا کیوں نہیں آتا؟ ذرا سوچو اس بات پر تمھارے مخالفین کیا کہیں گے؟ وہ کہیں گے، کدّو سانڈ سا گنپت اور پدّی سی چھوکری! اور کہیں گے کہ یہ آدمی تو ڈھنگ سے بچّہ بھی نہ پیدا کر سکا۔"

ان گالیوں اور طنزیہ باتوں کا اثر دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ سکرین پر گنپت کے چہرے کے عکس پر غصّے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

"پلانیشا پر پُرانی نسلوں کا کچھ اثر ہے، اس کے علاوہ اس میں اور کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ خود تم نے بھی ایک بار کہا تھا" اس نے غصّے میں کہا۔

"قدیم تہذیب کا اثر!" کالی ناگ نے آگ میں گھی ڈالتے ہوئے کہا "کتنا پُرانا اثر ہے؟ وہ تو حد درجہ سیدھی ہے۔ سنا تم نے؟ وہ پیار کرنا چاہتی ہے" کہہ کر وہ بہت زور سے ہنسا "کتنی گندی بات



ہے! وہ زندہ رہنے کے لیے نفرت کر بھی نہیں سیکھ سکی۔ کیا وہ کسی جنگلی سے کم ہے؟ پگلی کہیں کی۔"

"وہ پاگل نہیں ہے" گنپت۔ پردے کے دونوں سروں کو غصّے سے پکڑتے ہوئے کہا۔ کالی ناگ نے سوچا کہ اس سے گنپت دس منٹ میں ہی جلسے میں لائق ہو جائے گا۔

اور زیادہ مذاق اڑاتے ہوئے ماہرِ نفسیات نے کہا "وہ پاگل نہیں ہے۔ پاگل کیوں ہونے لگی۔ تولیدی مرکز اسے یوں ہی بچّے پیدا کرنے کے حق سے کیا۔ عالمی سرکار نے بھی بلا وجہ ہی ٹیلی ووٹ دینے کا حق نہیں دیا۔ تجارتی کمیٹی نے بھی فضول ہی اسے



پلائینشا بولی "مگر ذرا ٹھہرو۔ مجھے محبت کرنے کے حق سے محروم کردیا گیا ہے"

کے حقوق نہیں دیئے۔ صرف تعلیمی کمیٹی نے اسے بیکار مین تفریح تک ہی محدود رکھا، بس! وہ یہاں قید بھی اسی لئے ہے کیوں کہ وہ بہت بڑی عالمہ ہے۔ کیوں؟ تم جھکی ہو گنپت؟ اگر اس لڑکی کو نہیں پہچان سکتے تو تھوڑی دیر میں اپنی گندی زبان سے یہ بھی کہنے لگو گے کہ اس کا رنگ برا نہیں ہے!"

گنپت بیٹھا بیٹھا غراتا رہا۔ پھر بولا "تمہاری یہ مجال؟ ... اور اگر اس کا رنگ میلا ہے بھی تو تمہیں کیا؟"

"اب تم ایسے احمقانہ سوالات بھی کروگے؟" کالی ناگ نے پرسکون لہجے میں کہا "تم اتنے زیادہ بے وقوف ہو کر تاریخ کے اتنے مختصر اور آسان واقعے کو بھی ٹھیک طرح سمجھ نہ پائے۔ نشا اس لئے گوری ہے کیوں کہ وہ ایک گندی نشانی ہے۔ بہت زمانہ پہلے ہمارے دشمن گورے تھے۔ ساری دنیا پر انھوں نے اپنا اختیار جما رکھا تھا۔ آخر مشرق سے حملہ کرکے ہمارے آباؤ اجداد نے انھیں ہمارا خون چوسنے سے روکا۔ ہمارے بزرگوں نے رسم و رواج کے مطابق شکست خوردہ لوگوں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ سمجھے؟ آگے کیا ہوا!

"کچھ نسلوں میں گوروں کا اثر کم ہوا اور دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ کوئی بھی گورا ڈیڑھ ہزار برس سے یعنی کثرتِ آبادی کے دور کے بعد سے نہیں دیکھا گیا۔ اور اب اچانک تم نے کہاں سے اس چھوکری کو لا ٹپکا۔ کیا تولیدی مرکز والوں نے تمہاری ملاقات کسی قدیم زمانے کی جنگلی عورت سے کرا دی تھی؟"

گنپت غصے سے ابل پڑا اور پردے پر اپنا گھونسہ ہلاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

"نکل جا" وہ چلّایا "اس بار تو حد سے آگے بڑھتا جا رہا ہے! ابھی نکل جا اور پھر ادھر کا رخ نہ کرنا۔ خبردار جو کبھی ادھر آنے کی ہمت کی۔"

دفعتاً اس نے جلسے میں شریک ہونے

ی غرض سے خود کار مشین کو اشارہ کیا۔
۔ہ جلسے میں اپنے مخالف لوگوں سے نپٹ
دمائی کے لئے کمربستہ ہوچکا تھا۔

گنپت کی غضب ناک شکل پردے سے ہٹ گئی تو کالی ناگ نے اطمینان کی سانس لی۔ نفرت پیدا کرنے کا کام کامیابی سے سرانجام دیا جا چکا تھا۔ کبھی بھی مریض کے منہ سے غصے میں نکل جاؤ، سن لینا ماہرِ نفسیات کی کامیابی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ گنپت اگلی بار بھی نفرت کا انجکشن لینے کے لئے اُسی کو یاد کرے گا۔ اس کے لئے مریض کی نفسیات کا پوری طرح جائزہ لینا بہت ضروری تھا۔ کیوں کہ سب لوگ اس طرح مشتعل ہوئے بنا مشینوں کا سہارا لے کر بالکل نکمے اور آرام طلب بنے رہتے تھے۔ اُن کی اندرونی نشوونما کئی صدیوں پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے کالی ناگ ماضی اور مستقبل دونوں کے ہی بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگا۔

زمین سے زیادہ اناج پیدا کرنے کے طریقوں میں انسان تھک کر کمزور ہو چکا تھا۔ ٹھیک بھی ہے، بنجر زمین پر کوئی تندرست رہ بھی کیسے سکتا ہے۔ سب لوگ غصے اور نفرت کے بل بوتے پر زندہ تھے۔ ورنہ مشینی دنیا میں پھر اُس کے وجود کی اہمیت ہی کیا تھی!

'تو نسلیں اس طرح ختم ہوتی ہیں' کالی ناگ سوچ رہا تھا۔ پتہ نہیں کسی دوسرے نے بھی یہ بات سوچی یا نہیں۔ شاید عالمی سرکار کو یہ بات معلوم ہو مگر وہ کر کیا سکتی تھی۔ جو بھی ممکن تھا وہ ہو ہی رہا تھا!

کالی ناگ نے مسئلے کی گہرائی تک پہنچ کر بھی اُس پر مغزپچی کرنا بےکار سمجھا اور دھیرے سے اُس نے اپنے کیبن کو واپس لوٹنے کا حکم دیا۔

گنپت کی محافظ مشینیں جا چکی تھیں۔ کالی ناگ اکیلے ہی اپنے کمرے میں آیا۔ باہر آ کر اُس کا کیبن برگد کے قریب کھڑے راکٹ کے پاس پہنچا۔

لیکن راکٹ میں کیبن جڑنے سے پہلے ہی کالی ناگ کی نظر ایک متحرک چیز پر

نامہ نگار کی رپورٹ



پیرس کے ایک فساد میں میتھو نامی ایک صحافی جب واقعے کی رپورٹ لینے گیا تو وہ بھی شدید زخمی ہوا۔ اسی دوران اُس نے اخبار کے مرکزی دفتر کو اپنے ایک دوست کے ذریعہ یہ اطلاع بھیجی کہ میں جائے واردات پر ہی ہوں اور بعد کے واقعات بھی جلد ہی بھیج دوں گا۔

کچھ دیر بعد ہی فوج نے آ کر گولی چلانی شروع کی جس سے میتھو بھی زخمی ہو کر گر پڑا۔ اُس کو گرتے دیکھ کر ایک ڈاکٹر نے آ کر کہا "ارے تم تو بہت زخمی ہو، چلو تمہیں اسپتال میں داخل کرا دوں۔"

میتھو نے جواب میں اپنا قلم اُسے تھماتے

ں کی بالائی منزل پر پلاٹینشا کھڑی تھی۔
آدھا جسم دیوار کی اوٹ میں تھا۔
رہ کالی ناگ دفعتاً اپنے کیبن سے
۔ حالاں کہ کھلے ماحول میں چلنے سے
لیف ہی ہو سکتی تھی کیوں کہ ہوا چل
ں اور اُس میں گلاب کے پھولوں
شبو بھی تھی۔ لیکن محویت کے عالم
، نکل ہی پڑا۔

اُس کے ہونٹوں کے علاوہ اُس کا تمام چہرہ زرد تھا، اُس کے بال گھنے کالے تھے جو ایک جگہ سر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور پھر کمر تک سیدھے لٹکے ہوئے تھے وہ دیوار کے درختوں کی طرف بدستور دیکھتے ہوئے واقعی پاگل نظر آ رہی تھی۔ کالی ناگ نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ اتنے غور سے کیا دیکھ رہی تھی۔

وہ جنگلی آدمی جسے اس نے آتے وقت اوپر سے دیکھا تھا، گنجان دیوار کی قطار میں سے اندر گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لڑکی اُس کی طرف متوجہ نہ تھی۔ وہ
محل کے قریب کے درختوں کی قطار
یکھ رہی تھی۔ وہ اُسی طرح دھیان
دیکھتے ہوئے محل کے پیچھے پہنچ گئی، کالی
، بھی اُس کے پیچھے بڑھتا گیا۔ وہ پیڑ
ں کی آڑ لیتا ہوا ہوشیاری سے اُس
پیچھے چل رہا تھا۔ اُس کی موجودگی سے
خبر ایک مالی مشین قریب ہی اپنے کام
مصروف تھی۔
پلاٹینشا محل کے پیچھے پہنچ چکی تھی۔ ہوا
ں اُس کا لمبا آنچل لہرا رہا تھا۔ ہوا میں
تی ہوئی سوکھے گلاب کی پنکھڑیاں اُس
ے پیروں کے قریب رقص کر رہی تھیں،

دفعتاً پھوار پڑنے لگی۔ سوکھی پتیوں پر بوندیں پڑیں۔ کچھ ہی دیر میں بارش رُک گئی۔ اس پھوار کا اثر نہ تو پلاٹینشا پر پڑا نہ جنگلی آدمی پر۔ پھول کی پنکھڑیوں پر بوندیں موتیوں کی طرح چمک اُٹھیں۔
کالی ناگ نے محسوس کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اشتیاق سے اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسی لمحہ اچکتے ہوئے سپاٹ میدان کے اُس پار ایک مشینی محافظ چوکنا ہوا۔ اور ایک نووارد کی آمد کی اطلاع دینے کے لئے وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا محل میں چلا گیا۔

ہوئے کہا "اسپتال بعد میں داخل کرانا، پہلے
براہ کرم میری رپورٹ پوری کر دو۔ میں نے
جو کچھ لکھا ہے اُسی کے نیچے یہ لکھ دو — شام
تین بج کر بیس منٹ — فوج کی گولیوں سے تین
اشخاص زخمی اور ایک چل بسا۔"
"کون چل بسا؟" ڈاکٹر نے حیرت سے
پوچھا۔
"میں!" میتھو نے جواب دیا اور فوراً ہی
کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔

منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اُس
ایک کے ساتھ چار دیو قامت محافظ
مشینیں تھیں۔ اُن میں سے ایک وہ بڑی مشین
تھی جس نے کالی ناگ سے آتے وقت
پوچھ تاچھ کی تھی۔ وہ پانچوں گلاب کی جھاڑ
سے ہو کر آگے بڑھ گئے۔ مالی مشین بھی
کے ساتھ اُس جنگلی آدمی کی طرف
بڑھی۔
اب وہ بچ کر کہاں جائے گا؟

نے سمجھا۔ اُدھر وہ آدمی اندر جاکر لان کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے قریب کے ایک پودے سے ایک سرسبز ٹہنی توڑ کر اپنی قمیض میں اس طرح لگا لی کہ پتوں میں اُس کا چہرہ چھُپ گیا۔ دُوسری ٹہنی اُس نے اپنے پیٹ میں لگالی مشینوں کے پاس آتے جاتے تیسری ٹہنی کو ہاتھ میں پکڑ کر اُس نے سر کے اُوپر اٹھا لیا۔

اُن مشینوں نے شور مچا کر اُسے گھیر لیا۔ دیوقامت مشین کھڑی ہو کر کھٹ کھٹ کرنے لگی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ آگے کیا کیا جائے۔

"تم کون ہو؟" مشین نے دریافت کیا۔

"میں گلاب کا پودا ہوں" اُس آدمی نے کہا۔

"گلاب کے پودے میں پھول ہوتے ہیں۔ تم میں نہیں ہیں" اُس دیوقامت مشین نے کہا اور اُس کی فولادی بندوق آدمی کے سینے کے سامنے آگئی۔

"میرے گلاب مُرجھا چکے ہیں" آدمی نے کہا "مگر پتیاں اب بھی زندہ ہیں۔ اگر تم پتیوں کے بارے میں ناواقف ہو تو مالی سے معلوم کرو۔"

"یہ کوئی پتیوں والی چیز ہے" مالی مشین سنجیدہ ہو کر بولی۔

"مجھے پتیوں کے بارے میں کافی معلومات ہے" دیوقامت مشین بولی "مجھے مالی سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں پتیاں پیڑ کا وہ حصّہ ہوتی ہیں جن کی وجہ سے پیڑ پودے سرسبز دکھائی دیتے ہیں۔"

"یہ کوئی پتیوں والی چیز ہے" مالی مشین نے دوہرایا اور اتنا اور جوڑ دیا "پتیوں کی وجہ سے ہی یہ ہری دکھائی دیتی ہے"

"مجھے پتیوں کے بارے میں پوری معلومات ہے۔ تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں" دیوقامت مشین بولی۔

قیاس تھا کہ دونوں مشینوں کی نوک جھونک آگے بھی چلتی مگر اُس وقت ایک تیسری مشین نے مداخلت کر دی "یہ گلاب کا پودا بولتا ہے!"

"گلاب کے پودے بول نہیں سکتے" دیوقامت مشین نے کہا اور چپ ہو گئی جیسے کسی اُلجھن سے دو چار ہو۔ پھر بولی "اس لئے یا تو یہ گلاب کا پودا نہیں ہے، یا یہ گلاب کا پودا بول نہیں رہا تھا۔"

"یہ کوئی پتیوں والی چیز ہے"

رنگین چھپائی کی مشین

فرانس میں آفسیٹ طرز کی ایک ایسی چھپائی کی مشین تیار ہوئی ہے جو بیک وقت کاغذ کے دونوں طرف چار رنگ چھاپتی ہے۔ یہ مشین ایک گھنٹے میں چار رنگوں کے ۶,۴۰,۰۰۰ صفحے چھاپ سکتی ہے

•

دُنیا میں سب سے زیادہ ان پڑھ لوگ پرتگال کی افریقی نو آبادی موزمبیق میں ہیں جہاں کُل آبادی کے ۹۹ فیصد مرد و زن پڑھنا ہی نہیں جانتے۔



ے کا پودا نہیں ہے۔ پودوں میں تنا
ہے۔ اس میں تنا نہیں ہے۔ یہ کوئی
دار جھاڑی ہے" مالی مشین بولی۔

نباتات کی گفتگو دیو قامت مشین
ماہرین کی فہم سے بالا تھی، اس لئے کچھ
خاموشی رہی۔
"میں خار دار جھاڑی ہوں" آدمی
ے کہا" اور مجھ میں قوتِ گویائی نہیں
ہے۔"
اتنا سنتے ہی سب مشینیں ایک ساتھ
لنے لگیں اور گھوم گھوم کر اس آدمی کو
اروں طرف سے زیادہ سے زیادہ دیکھنے
ی کوشش کرنے لگیں۔ آخر میں دیو قامت
شین نے کہا "یہ پتیوں والی چیز خواہ
کچھ بھی ہے، اسے اکھاڑ دینا بہتر ہے
اسے مار دینا چاہئے۔"
"تم میں اسے اکھاڑنے کی تاب کہاں!
یہ کام تو میرا ہے" مالی مشین نے کہا اور
اپنے پرزے ہلا ہلا کر مشینوں کو دھمکایا۔
دیو قامت مشین بھی محوِ حیرت تھی۔
اس نے کہا "چلو ہم چل کر اپنے آقا
بت سے اس بارے میں رائے لیں۔"
"چارو مل گنپت اس وقت جلسے کی
صدارت کر رہے ہیں۔"
"تب ہمیں چارو مل گنپت کا انتظار
کرنا چاہئے" دیو قامت مشین نے فیصلہ
کن انداز میں کہا۔
کالی ناگ کو اس جنگلی آدمی کی
بہادری پر بہت تعجب ہوا۔ اس آدمی کا
زندہ بچ رہنا واقعی ایک معجزہ ہی تو تھا۔ اگر
وہ بھاگنے کی کوشش کرتا تو یقیناً مار دیا
جاتا، کیوں کہ اس صورت میں مشینیں اپنا
کام بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتی

ہیں۔ اگر وہاں اکیلی ایک مشین ہوتی، تب
بھی وہ آدمی اسے چکمہ نہیں دے سکتا تھا،
کیوں کہ تنہائی میں مشین سوچ سکتی تھی۔
مگر کئی ایک ساتھ ہونے سے ان کی تقریباً
وہی حالت ہو جاتی تھی جو پہلے کئی آدمیوں
کے اکٹھے ہو جانے پر ہوتی تھی۔
ان مشینوں کے جاتے ہی وہ جنگلی آدمی
دوڑ کر لان پار کرتے ہوئے چپ چاپ
کھڑی پلاٹینشا کے پاس جا پہنچا۔ کالی ناگ
کھسک کر چپکے سے ان کے قریب کی ایک
جھاڑی کے پیچھے جا چھپا۔ وہ جنگلی آدمی
سحر زدہ سا دھیرے دھیرے پلاٹینشا کی
طرف بڑھ رہا تھا۔

پلاٹینشا بولی "تم نے بہت ہوشیاری سے کام
لیا....." جملہ پورا کرنے سے پہلے
اس کے سفید گالوں پر گلابی رنگ جھلک
آیا۔
"میں پورے ایک برس سے تم
تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں" وہ
اس کے بالکل سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ
ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ اس کے کپڑے
پھٹے ہوئے تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی
تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے پلاٹینشا کی آنکھوں
میں جھانک رہا تھا۔
"تم مجھ تک کیسے آ گئے؟" پلاٹینشا
نے نازک اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ اس
کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔
"شاید کوئی دلی جذبہ مجھے یہاں
کھینچ لایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا تم مجھے
پکار رہی ہو" اس نے کہا "پتہ نہیں کیا
بات ہے۔ شاید دنیا بھر میں تم ہی ایک
ایسی عورت ہو جو مجھے پیار کرنا چاہتی ہو
اور شاید پوری دنیا میں میں ہی ایک

واحد شخص ہوں جو تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ میں آگیا ۔ یہ سب کچھ فطری طور پر ہوا ہے مجھے اپنے اُوپر اختیار نہیں رہا تھا ۔"

"اوہ ! میں بھی یہی سوچا کرتی تھی کہ کبھی نہ کبھی کوئی تو ضرور ہی آئے گا" وہ بولی "اور کئی ہفتوں سے میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ تم آرہے ہو میرے پیارے۔"

"ہمیں جلدی کرنی چاہئے" وہ بولا، "میں نے ایک بار تو مشینوں کو چکمہ دے دیا کیوں کہ میں پہلے سے اُن کے بارے میں جانتا تھا ۔ یہاں سے باہر نکلنے پر راکٹ ملے گا، جس پر ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں ۔ ہم کہیں ایسی جگہ جائیں گے جہاں یہ غم نہ ہوں ۔ لیکن جلدی کرو ۔ کہیں تمہارے باپ کی مشینیں پھر نہ آجائیں ۔"

وہ پلاٹینشا کی طرف ایک قدم بڑھ آیا ۔

اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا ۔

"ٹھہرو" وہ بولی "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے ۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرو ۔ مجھے تولیدی مرکز نے اولاد پیدا کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے ۔ تم مجھے مت چھوؤ !"

"مجھے تولیدی مرکز سے نفرت ہے" وہ بولا "میں اس تمام تنظیم سے نفرت کرتا ہوں ۔ اب ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

پلاٹینشا نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹا لئے ۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا ۔ وہ بولی "تم سمجھتے کیوں نہیں ؟ یہ ناممکن ہے ۔"

وہ آہستگی سے خوشامدانہ لہجے میں بولا "میں تمہارے لئے دنیا کا ہر آرام ٹھکرا کر آیا ہوں ۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں ۔ تمہیں اپنی باہوں میں کس لینا چاہتا ہوں ۔"

"کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تم دُنیا میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے ؟"

"یقیناً" اُس نے لااُبالی پن سے کہا "تو بڑھ کر مجھے چھو لو" پلاٹینشا بو

اُسی وقت اُس کی آنکھوں میں موتی جیسے آنسو چمک اُٹھے ۔ اُس جنگلی آدمی کا بڑ ہوا ہاتھ اُس کے گالوں کی طرف اُٹھ گیا وہ اُسی طرح بے حس و حرکت اپنا سر تا ۔ کھڑی رہی ۔ اُس نے بڑی ملائمت سے اپنے ہاتھوں سے اُس کے آنسو پونچھے ۔ اُ وقت آسمان پر ایک دھماکہ ہوا ۔

پلاٹینشا کا بدن چُھوتے ہی شاید لمحہ بھ سے بھی کم وقت میں اُس لم کی اطلاع اعصابی مرکز میں بھی پہنچ گئی ۔ وہاں تولیدی مرکز کی طرف سے نکالے آیریٹس کے ذریعے تجزیہ ہوتے ہی م ہو گیا کہ وہ لمس کسی مرد کا ہے ۔ پلاٹین کے جسم کے سب سیل ایک ساتھ ہی بتر ہو گئے ۔ ردِ عمل اتنا زبردست تھ قریب کھڑا وہ جنگلی آدمی بھی زندہ نہ بچ

'ٹھیک ہی تو ہے' کالی ناگ سوچا 'جب ساری دنیا بھوک کا شـ ہو رہی ہے تو ایسی صورت میں اُن لوگوں کے ذریعے افزائشِ نسل کو اِ طرح روکا بھی کیسے جا سکتا ہے ؟ دلیـ دلیل ۔ یہی تو ساری مصیبت ہے ۔ اِسی وجہ سے تو تمام دنیا آنسوؤں میں ڈو جا رہی ہے ۔

وہ پودوں کے پیچھے سے ہوتا اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا ۔

ہوا تیزی کے ساتھ چل رہی تھ وہیں پڑی اُس کی لاش کو پھول اور

کے مُودے اُڑ اُڑ کر ڈھکتے جا رہے تھے۔

وہ جنگلی آدمی جان بھی کیسے سکتا تھا کہ پلائینشا کے بدن کی بناوٹ اسی طرح کی گئی تھی۔ تولیدی مرکز کے افسران، ماہرینِ نفسیات اور بذاتِ خود نسل کش لوگوں کے علاوہ یہ بات کسی اور کو نہیں بتائی جاتی تھی۔ پلائینشا اس انجام سے اچھی طرح واقف تھی۔ اُس نے اپنے آپ ہی اس طرح مرنا پسند کیا۔

'میں کہتا تھا نا کہ وہ پاگل ہے' کالی ناگ دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا اپنے راکٹ پر لوٹ آیا۔ اگر گنپت نے پھر سے نفرت کا انجکشن لینے کے لئے اُسے بُلایا تو اُس میں نفرت جگانے کے لئے حالیہ واقعہ بہت کار آمد ثابت ہوگا۔

کالی ناگ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ●

اپنی اپنی پسند



ایک آدمی بیمار ہوگیا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کو بُلایا۔ ڈاکٹر نے اُسے سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد کہا "مجھے ایک ہتھوڑا منگادیں تاکہ میں آپ کی اچھی طرح جانچ کرسکوں۔"

مریض نے گھبرا کر پُوچھا "کیا ہتھوڑے سے جانچ کریں گے؟"

"نہیں نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "میرے بکس کی چابی گم ہوگئی ہے اُسے کھولنا ہے۔"

— ایس ایم رفیق حسن پٹنہ

●

مریض نے ڈاکٹر سے پُوچھا۔ کیا میں گھی اور تیل کھا سکتا ہوں؟

ڈاکٹر نے کہا — ہاں۔ کھائیے۔

مریض نے دوبارہ دریافت کیا۔ کیا دودھ اور دہی بھی؟

ڈاکٹر نے کہا — ہاں!

مریض نے پھر پُوچھا — ڈاکٹر صاحب سبزی اور ترکاری بھی کھا سکتا ہوں؟

ڈاکٹر نے غصّہ سے جواب دیا۔ دیکھئے! آپ سب کچھ کھا سکتے لیکن میرا بھیجا نہ کھائیے۔

— شکیل احمد خان دربھنگہ

●

اپنے بیٹے سے فوجی کارنامے بیان کرتے ہوئے ایک کرنل نے کہا۔

"مجھے اُمید ہے کہ اب تمہیں محسوس ہوا ہوگا کہ تمہارے والد نے کیا کیا حاصل کیا۔ اور کتنا نام کمایا۔"

اُس کے بیٹے نے حیران ہوکر کہا "لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ کو اور دوسرے فوجیوں کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟"

— دانش امام رائے پور

●

بمبئی میں ایک آدمی شراب پی کر موٹر چلا رہا تھا۔ پولیس نے جب اُس کا چالان کیا تو اپنی صفائی میں اُس نے کہا "میں نشے کی وجہ سے پیدل چلنے سے معذور تھا۔ اس لئے موٹر میں جا رہا تھا۔"

— دھرم دیو دلیش،

اس نمبر کے تحت اپنے چٹکلے بھیجئے۔ ہم انھیں آپ کے نام سے شائع کریں گے — ایڈیٹر

سایہ در سایہ

پچھلے دنوں دلیپ کمار اور سائرہ بانو کی شادی ہونے پر لوگوں نے اُنہیں مبارک باد اور نیک خواہشات سے لاد دیا۔

لیکن ہمارے خیال میں اگر یہ مبارک باد بمبئی کے فلم سازوں کو دی جاتی تو زیادہ اچھا رہتا، کیوں کہ اس شادی کے ساتھ اُن کو ان دونوں 'ہستیوں' سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ دلیپ کو اپنی ناکامیوں کے سبب فلمی دُنیا سے کنارہ کشی کرنی پڑی ہے اور شادی کے بعد سائرہ بانو نے بھی فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

یہ بھی ایک بڑا دلچسپ اور عجیب اتفاق ہوا کہ جب تک دلیپ کمار فلمی دُنیا میں رہا وہ خود کو ایک 'عظیم اداکار' ہی نہیں ایک 'عظیم قلم کار'، 'ہدایت کار' اور 'ٹیکنیشین' بھی سمجھتا تھا۔ کتنے ہی فلم ساز اُس کی اِس 'عظمت' کی بھینٹ میں آکر شہید ہوگئے اور کتنی ہی فلمیں اس 'عظمت' کی مہر ثبت ہوجانے سے چوپٹ ہوگئیں۔ دلیپ کی 'عظمت' کا آخری شاہکار 'لیڈر' اور 'دل دیا درد لیا' تھیں، جن کی ناکامی تاریخی ہے۔

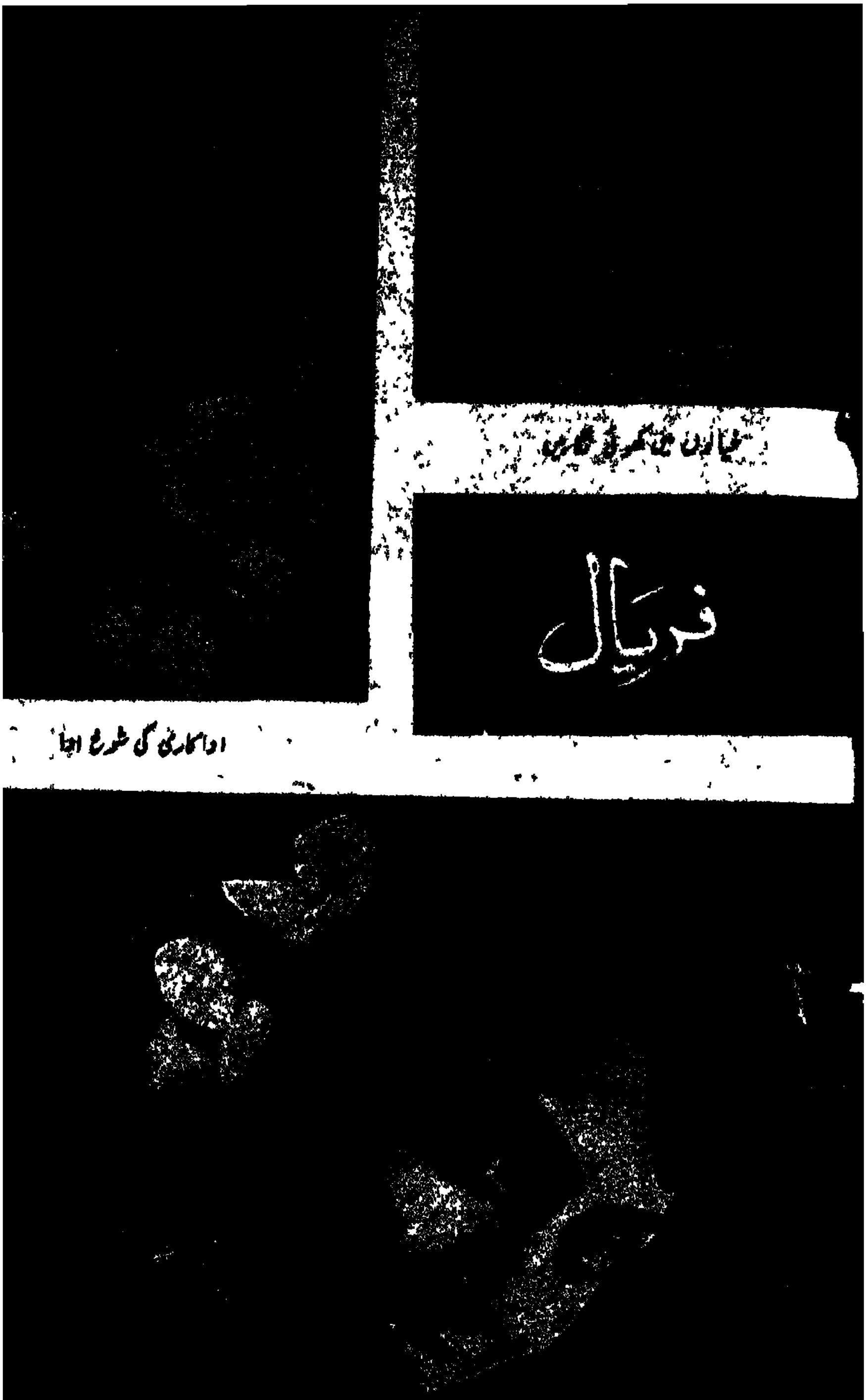
اداکارہ رقاصہ نسیم بانو کی بیٹی سائرہ کو خوبصورتی تو ورثہ میں مل گئی لیکن اُس کی پہلی فلم سے آخری فلم کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ فن کے نام پر صفر ہی رہی۔ وہ ہندوستانی فلمی دُنیا کی اُچھلتی کودتی خوبصورت سی گڑیا تھی جسے دیکھ کر دل بہلایا جاسکتا ہے، متاثر نہیں ہوا جاسکتا۔

خیر، چلئے۔ اگر یہ لوگ فلمی دُنیا میں رہ کر اس کی بھلائی نہ کرسکے تو جاکر ہی کر رہے ہیں یہ ان کا احسان کیا کم ہے!

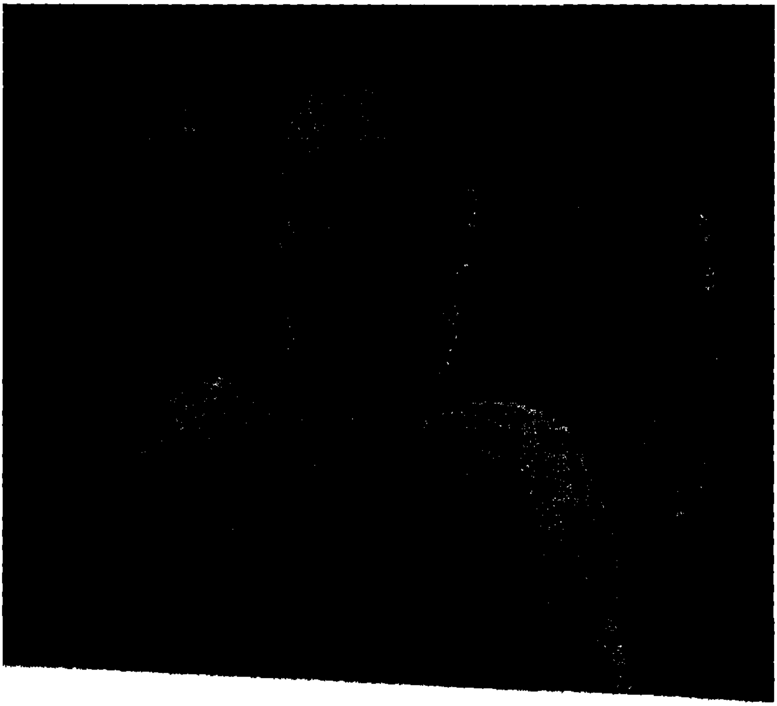
حال ہی میں اداکار وِشوجیت، جب بیروت کی شوٹنگ سے لوٹے تو اپنے ہمراہ کچھ [illegible] چیزیں بھی بھارت لائے۔ ان نوادرات [illegible] ایک تھا کسی درویش کا بنا ہوا طلسمی [illegible] جس میں ہر بلا کو ٹالنے کی قدرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

بمبئی لوٹتے ہی وِشوجیت کو فلُو نے آدبوچا۔ شاید درویش بابا فلُو نام کی اِس بلا سے متعارف نہیں تھے یا پھر اس سے بچاؤ کا منتر پھونکنا بھول گئے تھے۔ جو ہو، وِشوجیت کو ہار کر تعویذ کے بجائے ڈاکٹر کے 'کیپسول' پر بھروسہ کرنا پڑا، تب جاکر جان بچی۔ ●

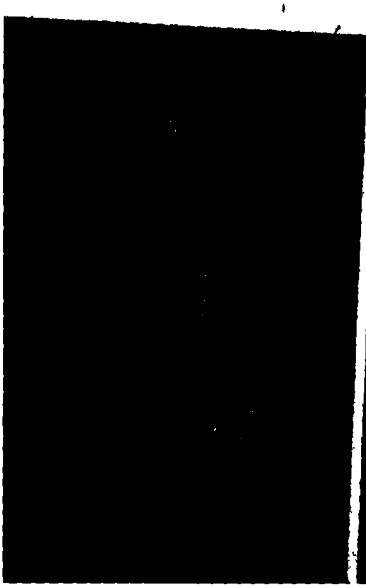
ششی کلا، فلمی دنیا کی منجھی ہوئی اداکارہ جس نے بہت تھوڑے وقت میں کبھی ہیروئن اور کبھی ویلن کا رول کمال ہوشیاری سے انجام دیا۔ 'ہمراہی اور راستہ'، 'وہ ایک رات کی'، 'گمراہ'، 'پھول'، 'پھول اور پتھر' میں وہ اپنی اداکاری سے [illegible] بھابی اور ویلن کے رول میں تو وہ بے مثال ہے۔ [illegible]


ثریا
اداکاری کی شروعات





فن اداکاری کے لئے گلیمر بھی ضروری ہے



یہ سادگی یہ پرکاری



بناؤ سنوار بھی تو ایک فن ہے

[illegible]

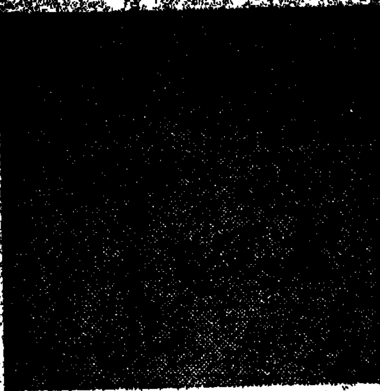
ہندوستانی فلم کی صنعت میں کم بجٹ کی فلموں کے برآمد نہ ہونے اور ہر سال کی مد آمد میں دشواریاں پیدا ہونے سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ [illegible] دنوں میں بھارت جو آج کل فلمی میدان میں دوسرے نمبر پہ شمار کیا جاتا ہے [illegible] کھو دے گا۔

کم سرمائے سے تیار شدہ 'اے [illegible]' اس سال چالیس فلموں میں سے [illegible] ۲۳ کرڑ فلمیں بن سکیں۔ 'کانٹے' اس سال کی کامیاب فلموں میں سے ایک ہے۔ [illegible] آنند کی ہدایت کاری بھی اس فلم میں [illegible] عروج پر پہنچی ہوئی ہے۔ او پی رلہن کی 'پھول اور پتھر' موہن سہگل کی 'دیور' [illegible] کی 'ممتا' اور ستیہن بوس کی 'میرے لال' بھی قابل ذکر ہیں۔

'پھول اور پتھر' کی کامیابی کا دارومدار [illegible] سینیریو اور ڈائلاگ پر ہے۔ فلم کوئی موشن پکچر تجربہ ہے اور نہ ہی [illegible] کا کوئی کمال، تاہم تجارتی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب رہی۔

'ممتا' کی کامیابی کا سہرا کہانی لکھنے والوں کے سر ہے۔ اداکاری کی بے شمار کمزوریوں کو بھی کہانی نے نبھا لیا۔ اسیت سین کی ہدایت کاری بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔

[illegible] سین ماں اور بیٹی کے ڈبل کردار [illegible] چندر کی وجہ سے کامیاب رہی [illegible] سہگل کی فلم 'دیور' میں تاثر [illegible] بہت اہم اور



[illegible] تھے جن کو بہت خوبی کے ساتھ دھرمیندر اور دیوان ورما جیسے [illegible] اداکاروں نے نبھایا۔

ستیہن بوس کی 'میرے لال' تکنیکی خامیوں اور کمزور ہدایت کاری کے باوجود بھی سال کی ایک نمایاں فلم رہی۔ اس نے بمبئی کی فلمی دنیا کو ایک نئے چہرے دیوکمار سے متعارف کرایا جو فلم میں ہیرو بنا۔ ہیروئن تھی اندرانی مکرجی، جس کو کبھی بھی فلم میں پانچ ہزار روپے نہیں مل سکتے۔

[illegible] پرکاش راؤ نے اپنی فلم 'سورج' تیار کر کے باکس آفس کامیابی حاصل کرنے والوں میں اپنا نام شامل کرا لیا حالاں کہ فلم میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔

جگدیش نرولا (محبت زندگی ہے) سورج پرکاش (نیند ہماری خواب تمہارے) ارجن (سہیلی)، کالی داس (بھیگی رات) من موہن دیسائی (بدتمیز)، ہرشی کیش مکرجی (بیوی اور مکان) اسیت مکرجی (اسا [illegible] اور آباد)، اسے آر کاردار (دل دیا درد لیا) اور ایل وی پرشاد (پیاری بانو) [illegible] ہدایت کاری [illegible]

[illegible]

[illegible]

... ١٩٦٦ ... میں ایک ...
... [illegible] ... آکے ... ہے
... [illegible] ... کی وجہ سے
... [illegible] ... کے ساتھ شیلیندر کی
فلم تیسری قسم میں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کرسکا۔
دلیپ کمار (دل دیا درد لیا) کی اداکاری کہانی کے غیر فطری کردار کی وجہ سے بے اثر رہی۔
راجندر کمار (سنگھرش) داسا نگر کی طرح پہلوان کے کردار میں اچھا رہا۔

دیو آنند (تیسری منزل اور پیار محبت)، ششی کپور (بدتمیز اور تیسری منزل)، سنیل دت (آمرپالی اور میرا سایہ) اور منوج کمار (دو بدن اور ساون کی گھٹا) سب دو دو فلموں میں سامنے آئے۔

اشوک کمار (بھیگی رات، ممتا، دادی ماں اور افسانہ) نے سب فلموں میں اپنا معیار برقرار رکھا۔ یہی بات ششی کپور (نیند ہماری خواب تمہارے اور پیار کئے جا)، پردیپ کمار (بھیگی رات اور افسانہ)، وشو جیت (یہ رات پھر نہ آئے گی، سگائی اور بیوی اور مکان)، جاے مکرجی (ساز اور آواز، لو ان ٹوکیو اور یہ زندگی کتنی حسین ہے) کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔

اداکاراؤں میں شرمیلا ٹیگور (یہ رات پھر نہ آئے گی، ساون کی گھٹا، انوپما اور دیور) کے ساتھ آشا پاریکھ (تیسری منزل، لو ان ٹوکیو، دو بدن اور آئے دن بہار کے) کے بہت چرچے رہے۔ جب کہ آشا پاریکھ نے ... فلموں میں فطری کام کیا اور دو بدن میں ایک ڈرامائی اداکارہ کی حیثیت سے، شرمیلا ... الہٰ ... کے علاوہ باقی تمام فلموں میں ... کی طرح اپنا کام انجام دیا۔
١٩٦٦ میں موسیقی کا بہت کام رہا۔
... پھر نہ آئے گی ... میں او پی



تیسری قسم کے فلم ساز مرحوم شیلندر

نیر کی موسیقی محض گوارا رہی مگر ... بہاریں پھر بھی آئیں گی، اور محبت زندگی ہے میں وہ کوئی نئی چیز پیش نہ کرسکا۔

روی (سگائی، پھول اور پتھر اور دو بدن)، روشن (دادی ماں اور ممتا)، لکشمی کانت پیارے لال (میرے لال، پیار کئے جا، آئے دن بہار کے، چھوٹا بھائی اور دیور)، کلیان جی آنند جی (سہیلی، نیند ہماری خواب تمہارے) نے اپنا معیار قائم رکھا اور کوئی جدت نہ پیدا کرسکے۔

شنکر جے کشن (سورج، لو ان ٹوکیو، آمرپالی، بدتمیز، ساون کی گھٹا، اور پیار محبت) کی بہترین موسیقی "سورج" کے گیت ـــ "بہارو پھول برساؤ" میں پیش کی ہے۔

١٩٦٦ میں کئی نئے چہرے سامنے آئے جن میں راجیش کھنہ (بہاروں کے سپنے، راز اور آخری خط) سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ببیتا (دس لاکھ، راز) کی آج کل زیادہ مانگ ہو رہی ہے اس میں صرف گلیمر ہے۔

اِس سال کی سب سے بڑی بدقسمتی گیت کار شیلیندر کی اچانک موت ہے۔ وہ ۱۴ دسمبر ١٩٦٦ کو اِس دارِ فانی سے کوچ کرگئے تیسری قسم اُن کا ایک نیا تجربہ تھا جس نے اُن کی زندگی ہی ختم کرڈالی۔ ـــ فنکار

چنپل چھاپا

****لاجواب *** بہترین ** عمدہ * معمولی - بے کار • واہیات

***آسرا

فلم ساز: مدن موہلا
ہدایت کار: ستیین بوس
ستارے: مالا سنہا، وشوجیت، امیتا، دیپک مکرجی، بلراج ساہنی، نروپا رائے، ڈیوڈ، پروین پال، جگدیپ

سماج کی نظروں میں گری ہوئی عورت کو سہارا دینے کے لئے جو جرأت مندانہ قدم اس فلم میں تجویز کیا گیا ہے وہ ہمارے سماج کے لئے ایک عمدہ مثال قائم کرتا ہے۔

دفعتاً طوفان میں کشتی اُلٹ جانے سے مالا سنہا کے والدین کی موت ہو جاتی ہے مالا اپنے ایک دُور کے رشتے کے چچا ڈیوڈ کے زیرِ سایہ رہنے لگتی ہے۔ ڈیوڈ کی بدمزاج بیوی پروین پال اُس کے ساتھ نوکرانی جیسا برتاؤ کرتی ہے، لیکن پھر بھی مالا سنہا اپنے کو اُس ماحول کے مطابق ڈھال لیتی ہے، اور کسی بھی طرح کا احتجاج یا مخالفت نہیں کرتی۔

ڈیوڈ اپنے پرانے رفیق بلراج ساہنی سے اپنی بیٹی امیتا کے لئے ان کے ڈاکٹر بیٹے وشوجیت کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لڑکی پسند کرنے کا فیصلہ وشوجیت پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وشوجیت ڈیوڈ کے گھر آنے جانے لگتا ہے، جہاں وہ امیتا کی بجائے مالا سنہا کے تیرِ نظر کا گھائل ہو جاتا ہے۔ ڈیوڈ کے لڑکے جگدیپ کی شادی کے موقعہ پر وہ مالا سنہا سے ملتا ہے اور اس سے رازدارانہ طور پر شادی کر لینے کا وعدہ کر کے حصولِ تعلیم کے لئے پردیس چلا جاتا ہے۔

اُس دوران مالا سنہا ماں بننے لگتی ہے اور نتیجے کے طور پر اُسے ڈیوڈ کے گھر سے مار پیٹ اور لعن طعن کر کے نکال دیا جاتا ہے۔ بلراج ساہنی مالا سنہا کو اپنے دوست کی بے یار و مددگار لڑکی سمجھ کر آسرا دیتے ہیں، حالاں کہ اُن کے کنبے میں اس کی زبردست مخالفت کی جاتی ہے۔ اُنھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے ہونے والے بچے کا باپ کون ہے۔

وشوجیت کے واپس آنے سے پہلے سماج کی طرف سے ٹھکرائی ہوئی مالا سنہا کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں وشوجیت اپنے والدین کے سامنے سب کچھ تسلیم کر کے مالا سنہا اور اپنے بچے کو بخوشی اپنا لیتا ہے۔

مالا سنہا کی اداکاری اعلیٰ درجے کی ہے۔ وشوجیت نے اپنے کردار میں بے حیائی سے کام لیا ہے مگر وہ سب بالکل فطری ہے بلراج ساہنی کا کام بہت منجھا ہوا ہے۔ ان کے کردار کو اس فلم میں سب سے زیادہ اُبھارا گیا ہے۔



امیتا اپنے بدمزاج عورت کے کردار میں اور اپنے تئیں دشوحیت کی طرف سے نفرت کا جذبہ اُبھارنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی ولین دیپک مکرجی کی آنکھ مچولی مضحکہ خیز ہے۔ نرو پارا سے اور ڈیوڈ کا کام معمولی ہے لیکن پروین پال نے اپنی اداکاری میں سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ جگدیپ نے اپنے بے تُکے الاپوں سے دل چسپی پیدا کرنے کی بجائے بوریت پیدا کی ہے۔

فلم کے سیٹ نیچرل ہیں۔ مکالمے نپے تُلے اور چُست ہیں۔ کہانی کی ایڈیٹنگ میں تجربے کار ہاتھ ہونے سے فلم بہت عمدہ بن گئی ہے۔ فلم میں ناچ اور گیتوں کی زبردستی ٹھونس ٹھانس نہ کر کے انہیں نطری طور پر سمویا گیا ہے۔ موسیقی کمزور ہے مگر ستین بوس کی ہدایت کاری بہت سدھی ہوئی ہے۔

★★ نیتاجی سبھاش چندر بوس

فلم ساز : آدرش

ہدایت کار : ہیمن گپت

ستارے : ابھی بھٹ، چاریہ، وپن گپتا، جے مالا، پدما دیوی، اُلہاس، نرنجن شرما

"تم مجھے خون دو، میں تمہیں آزادی دوں گا!" نیتاجی کی یہ بات آخر کار ایک حقیقت بن ہی گئی۔ جنگِ آزادی کا یہ بہادر جرنیل اگرچہ آج ہمارے درمیاں نہیں ہے مگر اُس کی یاد اب بھی ہمارے دل میں موجود ہے۔ موجودہ فلم کے ذریعے اُس کی یاد اور بھی تازہ ہو گئی ہے۔

فلم کا آغاز نیتاجی کے زمانۂ طالب علمی

[illegible] کے بحر کی
[illegible] یوسف [illegible] کر لیا
[illegible] کے [illegible]
[illegible] یا [illegible] کے [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] اور [illegible] آزادی میں کرتے
[illegible] اجمیل یا ترا۔
[illegible] دکھائی [illegible] حقیقت [illegible]
[illegible] کی کھائی پڑی تھی۔ ۱۹۵۰ کے
[illegible] میں جب وہ تیار ہوئے کہ ان کے والد
صاحب [illegible] تو یوسف انھیں وہاں سے
[illegible] کر اپنے گھر لے آئے۔ اپنے بیٹے پر [illegible]
حکومت کے ظلم سے دل گرفتہ ہو کر انھوں نے
[illegible] کا دیا ہوا "راے بہادر" کا خطاب
[illegible] کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اب نیتا جی
[illegible] گھر میں ہی نظر بند کر دیے گئے۔ گھر والوں
کے اصرار پر بھی انھوں نے شادی نہیں کی۔

[illegible]
بدل کر وطن سے باہر چلے گئے اور جاپان [illegible]
ہند فوج" کی تشکیل کی۔ ان کے نعرہ [illegible]
نے ایک بار پھر تمام ہندوستان میں حریت کی جوت
ہی جگا دی تھی۔ [illegible] ان کے
[illegible] جاپان [illegible]
تائی [illegible] اور ہیروشیما کی تباہی کے بعد وہ
ہوائی جہاز میں بیٹھ کر نامعلوم جگہ کے لیے چلے گئے
کہتے ہیں کہ اسی جہاز کے حادثے میں
نیتا جی کی موت ہو گئی لیکن فلم [illegible] کے آخری
منظر میں انھیں رخصت ہوتے دکھایا گیا ہے۔ [illegible]
نیتا جی کا کردار ابھی [illegible] چاہنے سے [illegible]
[illegible] ہے۔ کہیں کہیں احساس کا ایک [illegible]
ملتا ہے کہ اس پر نیتا جی کا گمان ہو سکے
[illegible] گیت نے نیتا جی کے [illegible]
کردار میں بہت [illegible]
[illegible] جب وہ ابھی کر [illegible]
جاتے ہیں تب ان کی اداکاری قابل [illegible]
ہے۔ [illegible]
[illegible] ہے۔ دوسرے کرداروں کو اپنا کام
دکھانے کا موقع بہت کم دیا گیا ہے۔
گاندھی جی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل
[illegible] کے تجزیہ کرتے ہوئے [illegible] کی
شکل سے مستعار لیے گئے ہیں۔ فلم میں [illegible]
جگہ گاندھی جی کے مناظر ہیں اور ان سے نیتا
جی کی ملاقات بھی دکھائی گئی ہے جو صرف [illegible]
کا ہی کمال ہے۔ لیکن گاندھی جی کا کردار [illegible]
فلم ساز و ہدایت کار [illegible]
[illegible]
فلم میں شروع سے آخر تک [illegible]
کا جذبہ [illegible] رہتا ہے۔
گیت اگرچہ تھوڑے ہیں لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible] اور ہدایت کار [illegible]

پچھلے بارہ مہینوں میں

★★★★ گائڈ
★★★ ممتا
★★ [illegible] ویران، اونچے لوگ، وقت، آرزو، شہید، بھیگی رات، جب آئے دن بہار کے، [illegible]،
★ ہمالیہ کی گود میں، خاندان، [illegible]، میرے صنم، چاند اور سورج، سہیلی، رشتے ناطے، چاندی کی دیوار، جب جب پھول کھلے، فرار، گمنام، [illegible]، بے خبر، تیسرا کون، نیلا آکاش، ساز اور آواز، [illegible]، آسمان محل، [illegible] دل [illegible]، [illegible] تصویر، [illegible]۔
[illegible]

عشق کیوں اُداس ہے...

— سوزؔ شرمن

مجھ کو کس سے آس ہے ۔۔۔ دل بہت اُداس ہے
مفلسی کے دور میں ۔۔۔ کون کس کے پاس ہے
زندگی ، یہ زندگی ۔۔۔ کانچ کا گلاس ہے
یہ نہیں تو کچھ نہیں ۔۔۔ سانس ہے تو آس ہے
حوصلہ اگر رہے ۔۔۔ یاس میں بھی آس ہے
خود سری کا آپ کی ۔۔۔ دل ادا شناس ہے
یہ متاعِ زندگی ۔۔۔ پھول کی سی باس ہے
دیکھ کے رنگِ چمن ۔۔۔ ہر کلی اُداس ہے
تم خفا ہو واقعی ۔۔۔ یا میرا قیاس ہے
اور کچھ نہیں تو کیا ۔۔۔ تیرا غم تو پاس ہے
لٹ رہا ہے کارواں ۔۔۔ رہنما اُداس ہے
زندگی کے موڑ سے ۔۔۔ کون روشناس ہے
حسن ہے برہم اگر ۔۔۔ عشق کیوں اُداس ہے
سوزؔ کم کرو فغاں ۔۔۔ تم سے التماس ہے

زورآور سنگھ

صفحہ ۲۵ سے آگے

آواز میں بول اُٹھا "مہاراج! اپنی تمام ادنیٰ خدمات کے صلے میں ملتجی ہوں۔ راجکماری کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دئے جانے کی درخواست کرتا ہے کیونکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے والہانہ پیار ہے۔"

مہاراج یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ وہ اس کے الفاظ ذہن کی ترازو پر تول رہے تھے۔ پھر انھوں نے گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے فرمایا

"زورآور سنگھ! ہم تمہاری صاف گوئی اور بے پناہ ایثار سے متاثر ہو کر تمہاری التجا منظور کرتے ہیں اور تمہیں اس انعام کے علاوہ ریاست چمبہ اور اس قلعے کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے۔"

اُسی منڈپ پر جہاں کچھ دیر پہلے اُن کی مسرتوں کا خون ہو رہا تھا، زورآور سنگھ اور چندرمکھی کبھی نہ ٹوٹنے والی ریشمی ڈور میں بندھ کر یک جان دو قالب ہو گئے۔ تھوڑے عرصے میں زورآور سنگھ نے اپنی شجاعت کی دھاک لداخ سے لے کر تبت کی سرحدوں تک جما دی۔ وہ جدھر نکل جاتا فتح و کامرانی اُس کا خیر مقدم کرتی۔ اُس کا نام مہاراجہ گلاب سنگھ کے جرنیلوں میں سب سے اُوپر تھا۔ چندرمکھی اور زورآور کے پیار کا یہ عالم تھا کہ چندرمکھی ہر مشکل مہم پر بھی اُس کے ساتھ جاتی

بالآخر ایک دن زورآور سنگھ نے تبت کی سرحدوں کو پار کر کے اپنے باپ کے قاتل ملسر سنگھ کا سر قلم کر کے انتقام کی پیاس بجھائی۔ وہ قزاقوں کے راجہ کی سرکوبی کر کے جب فتح و کامرانی کے پرچم لہراتا ہوا چمبہ لوٹ رہا تھا تو گرد و نواح کی برف پوش بلند پہاڑیوں سے گھری اُس جھیل کے کنارے زبردست برفانی طوفان کے ساتھ اچانک زلزلہ آ گیا۔ زمین پھٹ گئی اور وہ چندرمکھی اور اپنے ساتھیوں سمیت جھیل میں ڈوب کر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

بظاہر زورآور سنگھ مر گیا لیکن تاریخ کے صفحات میں آج بھی وہ بہادر جرنیل زندہ و جاوید ہے

جرمنی میں جب تک ہٹلر برسرِ اقتدار نہیں ہوا تھا تو وہ خود اور اُس کے ساتھی خفیہ طور پر بھیس بدل کر اپنا کام کیا کرتے تھے۔ ایک بار ہٹلر نے اپنے ساتھی گورنگ سے کہا "چلو آج دیکھیں کہ ہم اپنے کو پوشیدہ رکھ سکتے ہیں یا نہیں۔"

دونوں ایک شراب خانے میں گئے۔ بل کی ادائیگی کے وقت گورنگ نے شراب خانے کی بڑھیا مالکن کو کہتے سُنا "مسٹر گورنگ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

باہر نکل کر گورنگ نے ہٹلر سے اس کا ذکر کیا کہ وہ تو پہچانا گیا ہے۔ ہٹلر نے کہا "آؤ ایک بار پھر شراب پئیں اور اب کی بار میں بل ادا کروں گا۔"

شراب پینے کے بعد جب ہٹلر بڑھیا کے پاس گیا تو وہ کہہ رہی تھی "مسٹر ہٹلر آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ہٹلر کے منہ سے ایک دم نکل پڑا "مادام آپ نے ہمیں پہچانا کیسے؟"

بڑھیا نے بہت دھیرے سے کہا "تم مجھے نہیں پہچان سکے، میں گوئبلز ہوں۔"



بال سریتا • سجوشن بزاز



ٹیلی ویژن

جس کے ذریعے ہم گھر بیٹھے ہزاروں میل دور کی چیزوں کی شکل و صورت اور اس کا رنگ و روپ بھی دیکھ سکتے ہیں

سب سے پہلے ۲۷ جنوری ۱۹۲۶ کو ایک انگریز انجینئر جان ڈیرڈ نے لندن میں واقع رائل انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں کے سامنے ٹیلی ویژن کے عمل کا مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے میں اس نے پتلی کی تصویر ریڈیو کی لہروں کی مدد سے متصل والے کمرے میں بیٹھے ہوئے سائنسدانوں کے سامنے پیش کی۔ سائنس دانوں کے لئے یہ عجیب و غریب واقعہ تھا۔ انسانی تاریخ میں اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ تصویریں بھیجنے کی یہ ایک پہلی کوشش تھی۔ اس قسم کے خواب انسان ہزاروں سال سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے عملی شکل دینے کا سہرا قدرت نے جان ڈیرڈ کے سر ہی باندھا۔

جان ڈیرڈ کے عمل کے بعد ٹیلی ویژن کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ در آج سینما اور ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن بھی انسان کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ گزشتہ چند سال سے دلی میں بھی ایک ٹیلی ویژن سٹیشن کام کر رہا ہے۔

جس طرح ہم ہزاروں میل دور کی آوازیں ریڈیو کے ذریعے سن سکتے ہیں اسی طرح ٹیلی ویژن کے ذریعے گھر بیٹھے ہزاروں میل دور کی چیزوں کی شکل و صورت اور اس کا رنگ و روپ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سیٹ بھی دیکھنے میں ریڈیو سیٹ جیسا ہوتا ہے۔ لیکن ٹیلی ویژن کے اوپر کا ڈھکن اٹھانے پر اس میں ایک آئینہ نظر آتا ہے۔ دور دراز کے واقعات و حالات کے مناظر اس آئینے میں دکھائی دیتے ہیں۔

عموماً یہ بات سب کو معلوم ہی ہے کہ ریڈیو کے ذریعے آواز کو نشر کرنے سے پہلے آواز کی لہروں کو مائکروفون کے ذریعے برقی لہروں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں یہی برقی لہریں ریڈیو لہروں کی مدد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نشر کی جاتی ہیں اور مقررہ مقام پر ریڈیو سیٹ پر برقی لہریں ریڈیو لہروں سے علیحدہ کر لی جاتی ہیں اس کے بعد ان کو ٹیلی فون ریسیور میں آواز کی شکل میں تبدیل کر لیا جاتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی بھی قریب قریب یہی تکنیک ہے — آواز کی لہروں کے مقام پر یہاں روشنی کی شعاعوں کا استعمال کیا جاتا ہے ساتھ ہی مائکروفون کی طرح ایک ایسا آلہ بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کے ذریعے روشنی کی شعاعیں برقی لہروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آواز اور روشنی دونوں کو برقی لہروں میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔ شروع شروع میں ٹیلی ویژن کی روشنی کو برقی لہروں میں تبدیل کرنے کے لئے 'سیلینیم' دھات کا استعمال کیا گیا تھا لیکن سیلینیم میں بہت طرح کے نقائص تھے اور سائنس داں برابر ایسی دھات کی تلاش میں تھے جو 'سیلینیم' کا کام بھی دے سکے اور نقائص سے پاک بھی ہو چنانچہ فوٹو الیکٹرک سیل کی ایجاد نے اس مشکل کو بھی حل کر دیا یہ سیل ایک شیشے کا بنا ہوتا ہے جس کے اندر دیوار کے ایک حصے پر سوڈیم دھات کی ایک پتلی سی تہہ چڑھی ہوتی ہے۔ روشنی کی کرنیں جب اس دیوار پر پڑتی ہیں تو سوڈیم میں سے برقی ذرات کی ایک تیز بوچھار نکلنے لگتی ہے اور سیل میں ایک برقی رَو پیدا ہونے لگتی ہے۔ روشنی کی شعاعیں جتنی تیز ہوتی ہیں برقی رَو میں بھی اتنی ہی تیزی ہوتی ہے۔

تصاویر اور مناظر کو ٹیلی ویژن سیٹ تک لانے کی بھی ایک تکنیک ہے ہم جو تصویر چاہیں باریک باریک نقطوں کی مدد سے بنا سکتے ہیں۔ اخباری تصویریں بڑے بڑے نقطوں سے بنائی جاتی ہیں اس لئے وہ واضح اور صاف نہیں ہوتیں۔ نقطے جتنے باریک ہوتے ہیں تصویریں اتنی ہی عمدہ ہوتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر تصویر بھیجتے وقت اداکار کے چہرے پر روشنی کی ایک تیز شعاع ڈالی جاتی ہے یہ شعاع نہایت سرعت کے ساتھ اداکار کے چہرے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک برابر خطوں میں دوڑ جاتی ہے۔ اس عمل کو 'سکیننگ' کہتے ہیں۔

اس طرح کسی خاص لمحے میں چہرے کے صرف ایک نقطے پر روشنی رہتی ہے۔ اور اسی نقطے سے روشنی نکل کر فوٹو الیکٹرک سیل پر پڑتی ہے۔ چونکہ چہرے کے سبھی حصوں پر یکساں طور پر روشنی نہیں پڑتی، اس لئے فوٹو الیکٹرک سیل کی برقی لہر میں اسی طرح کا اتار چڑھاؤ موجود رہتا ہے۔ اسی کو ریڈیو براڈ کاسٹ کی طرح ان برقی لہروں کو ریڈیو لہروں کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

ریسیونگ سٹیشن پر برقی لہروں کو ریڈیو لہروں سے الگ کرکے دوبارہ شعاعوں میں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مشکل کام ہے۔ فوٹو الیکٹرک سیل روشنی کو برقی لہر میں بدل سکتا ہے، لیکن برقی لہروں کو روشنی میں تبدیل کرنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے سائنسدانوں کو کافی عرصہ تک مغز پچی کرنا پڑی نیان لیمپ (بلب) کے جال کا استعمال کیا گیا۔ اتار چڑھاؤ والی برقی لہریں ریسیونگ سٹیشن پر ٹھیک اسی عمل اور اسی رفتار سے ان نیان لیمپوں پر ڈالی جاتی ہیں جس طرح روشنی کی شعاعیں براڈ کاسٹنگ سٹیشن پر اداکار کے چہرے پر ڈالی جاتی ہیں۔ ایک ایک کرکے یہ بلب کم و بیش روشنی کے ساتھ ایک لمحہ کے لئے جل اٹھتے ہیں۔ اس طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام لیمپ ایک ایک کرکے روشن ہو جاتے ہیں۔

انسانی آنکھ کی یہ خصوصیت ہے کہ پتلی پر بنی ہوئی تصویریں دیر تک قائم رہتی ہیں۔ یعنی منظر غائب ہو جانے کے بعد بھی سیکنڈ کے دسویں حصہ تک میں اس کی تصویر موجود رہتی ہے۔ اس لئے اگر جدا جدا تصاویر ایک کرکے آتی جائیں اور ان کے درمیان کا فاصلہ ایک منٹ دس سیکنڈ سے زیادہ نہ ہو تو یہ تصویریں آپس میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی معلوم ہوں گی۔ ٹیلی ویژن سے تصویریں بھیجتے وقت اور ریسیونگ سٹیشن پر ان لہروں کو دوبارہ تصویروں میں تبدیل کرنے میں روشنی کی شعاع ایک نقطے سے گذرتی ہوئی پوری تصویر کے اوپر سے ہو کر ایک منٹ پچیس سیکنڈ میں ایک بار گزر جاتی ہے۔ اس لئے جس وقت تصویر کے ایک/ایک کرکے لاتعداد نقطے بنتے

ہیں تو دیکھنے والوں کی آنکھوں سے تصویر کے شروع کا حصّہ ابھی مٹنے نہیں پاتا کہ اس کا آخری حصّہ بھی بن جاتا ہے اور دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصویر کو سامنے دیکھ رہا ہے۔

پہلے نیان لیمپ کی بنی ہوئی تصویریں نہایت بھدّی ہوا کرتی تھیں، مگر بعد میں امریکن سائنسدانوں نے برسوں کی مسلسل کاوشوں کے بعد ٹیلی ویژن کی تصویروں کو زیادہ صاف بنانے کی ایک ترکیب ایجاد کی ہے۔ اب اس میں کیتھوڈ رے ٹیوب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کیتھوڈ رے ٹیوب میں برقی ذرّات کی ایک باریک مگر تیز بوچھار نکلتی ہے۔ ریسیونگ سٹیشن پر حاصل شدہ مدوجزر والی برقی لہروں کو کیتھوڈ رے میں داخل کردیتے ہیں۔ اب انہی لہروں کی طاقت کے مطابق برقی ذرات کی رفتار بھی گھٹتی بڑھتی ہے۔ ساتھ ہی برقی ذرات کی تیز شعاع کو شیشے کے پردے پر اسی رفتار سے یکساں خطوط میں گھما دیتے ہیں جس رفتار سے ٹیلی وائز کرتے وقت روشنی کی شعاعیں تصویر پر گھمائی جاتی ہیں۔

ان دونوں کاموں میں کامل مطابقت نہایت ضروری ہے۔ دونوں کی رفتار میں اگر سیکنڈ کے ۱۰لاکھویں حصّہ کا فرق ہوگیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ برقی ذرات کی بوچھار جب سامنے والے پردے پر پڑتی ہے تو ٹیلی ویژن سیٹ کے سکرین پر تا معاملہ چمک اٹھتا ہے۔ اس طرح پوری تصویر کو دیکھنے کے بعد ایک ایک نقطہ کر کے سیکنڈ کے ۲۵ ویں حصہ کے دوران نمایاں کرتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے اندر ۲۵ بار تصویر مصور ہوتی ہے ایسا کرنے کے لئے مقناطیس کے ذریعہ کیتھوڈ رے (برقی ذرات کی بوچھار) کو فی منٹ بیس میل کی رفتار سے تصویر کے دوسرے سرے تک دوڑنا پڑتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے مقبول عام ہونے میں ابھی تک ایک سخت دشواری پیش آرہی ہے۔ ٹیلی ویژن میں تبدیل ہونے والی ریڈیو لہریں عام ریڈیو لہروں سے کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ ٹیلی ویژن والی ریڈیو لہروں کا میدان زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔ اگر بہت اونچی جگہ سے ٹیلی ویژن کی لہریں چاروں طرف سے بھیجی جائیں جب بھی ۴۰-۵۰ میل کی حدود میں ان کی طاقت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے آج کل ٹیلی ویژن سٹیشن کے ۵۰ میل کے اندر ہی ہم اپنے ٹیلی ویژن سیٹ کا استعمال کرسکتے ہیں۔ سائنس داں اس کمی کو دور کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں امید ہے کہ وہ جلد ہی اس میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔ ایک وقت ہوگا کہ لوگ اپنے گھروں میں ریڈیو کی جگہ ٹیلی ویژن سیٹ استعمال کریں گے۔ ●

اپنا حصّہ

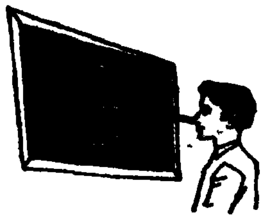
ایک لالچی آدمی نے ایک مزار پر جاکر دعا مانگی "اگر آپ مجھے دستِ غیب سے کچھ روپیہ دلادیں تو اُسی کے پانچویں حصّے کی نیاز مزار پر چڑھاؤں گا۔" اتفاق سے اُسی دن مزار کے قریب اسے ایک بٹوہ ملا جس میں چار سو روپے کے نوٹ برآمد ہوئے۔ وہ آدمی فوراً مزار پر گیا اور دست بستہ عرض کی "میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری مشکل آسان کردی مگر اپنا پانچواں حصّہ آپ نے پہلے ہی لے لیا۔"



مقالہ

راکیش

آنکھوں کی حفاظت



ایک تندرست نوجوان ہاتھ میں سفید بید لئے اپنا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ چوراہے پر وہ ٹھٹھک گیا۔ ایک بھدی شکل اور گندے کپڑے پہنے آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سڑک پار کرادی

یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ ایسے مناظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی کے دل میں بھی اندھوں کے لئے رحم اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے کتنی بیش قیمت چیز کھو دی ہے۔

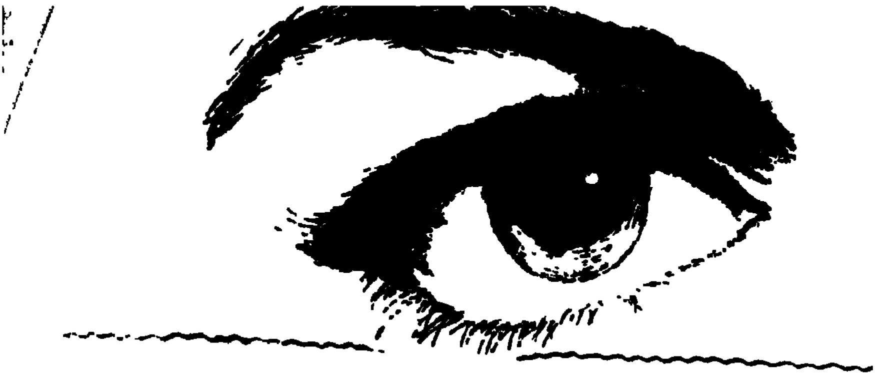
آنکھیں بڑی نعمت ہیں' ان میں سُرمہ لگایئے اور ان کی اچھی طرح حفاظت کیجئے' اس طرح کے اشتہارات اکثر آپ کی آنکھوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مبالغے سے کام نہیں لیتے۔ آنکھیں انسان کے رنج و غم اور جذبات کی صحیح طریقے پر عکاسی کرتی ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اس بات کی ضامن ہیں کہ ایسی آنکھوں والا آدمی زندگی سے مطمئن' سکھی اور خوش ہے۔ آنکھوں کا کام اس سے بھی اہم ہے۔

اتنا ہی نہیں' ان کے سامنے جو بھی اور جیسی بھی خوبصورت یا بدصورت چیزیں آتی ہیں' خواہ کاغذ پر بنی خوبصورت تصویریں ہی کیوں نہ ہوں' ان کا عکس دماغ پر اتار دیتی ہیں۔ اس طرح آنکھیں ایک دروازے کا کام کرتی ہیں جن کے راستے علم آدمی کے دماغ میں داخل ہوتا ہے اور زندگی کو سکھی بناتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری آنکھیں کس طرح کام کرتی ہیں۔ ہم اکثر آنکھ کی پُتلی اور اس کے بیچ کے نقطے کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ وہ آنکھیں نہیں جو دیکھتی ہیں۔ دیکھنے کا کام تو دماغ کرتا ہے۔ آنکھیں تو صرف ہمارے دماغ پر آنے والی چیزوں کا عکس ڈالتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نوزائیدہ بچہ' جس کی آنکھیں تو مکمل ہوتی ہیں مگر دماغ بہت ہی کچی حالت میں ہوتا ہے' آنکھوں کے ذریعے دماغ پر ابھرنے والے عکس کو پہچان نہیں پاتا۔ اس لئے کسی چیز کو اصلی شکل میں دیکھنے اور پہچاننے کا دارومدار دماغ کی نشو و نما پر ہے۔

تاہم جب کبھی ہمیں دیکھنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو ہم ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں ڈاکٹر آنکھوں کا معائنہ کرتا ہے اور عام طور پر چشمہ لگانے کی صلاح دیتا ہے۔

چشمہ استعمال کرنے سے آنکھیں ٹھیک نہیں ہو جاتیں بلکہ اس سے ہمیں اپنی کمزور آنکھوں کے ساتھ زندہ رہنا پڑتا ہے۔ ہم چشمہ اسی لئے استعمال کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی تو نہیں۔ اکثر لوگ اسی خام خیالی کا شکار ہیں کہ چشمہ لگانے سے آدمی عقل مند اور قابل بن جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ طبقہ ہی چشمہ کا استعمال کرتا ہے



مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان میں دوسروں کی نسبت زیادہ عقل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ تو مطالعہ کے وقت آنکھوں کا ناجائز استعمال ہے۔

پڑھتے وقت دھیمی روشنی ہونے، آنکھیں پھاڑنے یا گھورنے سے ان پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس سے جسمانی اور ذہنی اشتعال بڑھ جاتا ہے اور رات بھر سونے کے بعد بھی آدمی جب بیدار ہوتا ہے تو اس کے پپوٹے بھاری رہتے ہیں اور وہ بہت تکان محسوس کرتا ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ آنکھوں کے غلط استعمال سے پیدا شدہ اشتعال کو کافی عرصہ تک سکون نہیں مل پاتا۔

ان بُری عادتوں سے صرف اسی وقت رہائی ممکن ہوسکتی ہے جب پابندی سے ورزش کی جائے اور آنکھوں کا صحیح ڈھنگ سے استعمال کیا جائے۔

ماہرینِ نفسیات کی رائے ہے کہ ٹھیک طرح دیکھنے کے لئے آنکھوں کی پتلیوں کی صفائی کرنا بہت ضروری ہے ورنہ ان کی روشنی ہر لحظہ کم ہوتی جائے گی۔ اس لئے آنکھوں کی پلکوں کو جلدی جلدی جھپکانا بہت ہی ضروری ہے

آنکھیں کسی چیز کی صحیح تصویر پتلی کے بیچوں بیچ اتارتی ہیں۔ اس لئے کسی بھی چیز کا ہر حصہ اس بیچ کے حصے کے سامنے ہو۔ گھورنا کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ایک رکاوٹ ہے۔ اصل میں اس طرح دیکھنے میں رکاوٹ تو پڑتی ہی ہے اور کسی بڑی چیز کے ہر حصے کو ایک ہی شکل میں دیکھ پانا بھی ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس بُری عادت سے چھٹکارا پانے کے لئے ماہرین کی بتائی ہوئی کچھ ہدایات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔

جب کبھی آپ کسی بس یا ریل گاڑی میں سفر کریں تو درختوں یا مکانوں کو نہ گھوریں بلکہ انھیں پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھیں۔ آنکھوں کی رفتار کے بارے میں بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اگر کوئی پوسٹر یا نشان دکھائی دے جائے تو اس پر تیزی سے نگاہ ڈال کر فوراً آنکھیں بند کرلی جائیں۔ اس کے بعد جو کچھ آپ نے پڑھا یا دیکھا ہے اسے یاد کرنے کی کوشش کی جائے۔

متن کے الفاظ کو گھورنا نہیں چاہئے بلکہ اُن پر سرسری نگاہ ڈالی جانی چاہئے۔ اگر کسی چیز کی شکل پوری طرح نظروں میں نہ سما پائی ہو تو مطلق فکر نہ کریں اسے پھر بھی کبھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سیکھنے سے آپ کی یادداشت بڑھے گی اور ذہن پختہ ہوگا۔

تعارف کے موقع پر کسی کا چہرہ دیکھنے کے لئے اُس کی طرف گھورنا بدتمیزی میں شامل ہے۔ دوسرے آدمی کو بھی شرمندگی محسوس ہوگی۔ علاوہ ازیں آپ کی یادداشت بھی کمزور ہوجائے گی۔ اپنا دھیان اُس کی آنکھ سے دوسری

…ٹے، ناک، منہ اور پھر دوبارہ آنکھوں کی …لے جائیں۔ اس طرح آپ … کے چہرے …چھی طرح جائزہ لے سکیں گے اور اپنی یادداشت میں محفوظ بھی کر سکیں گے۔

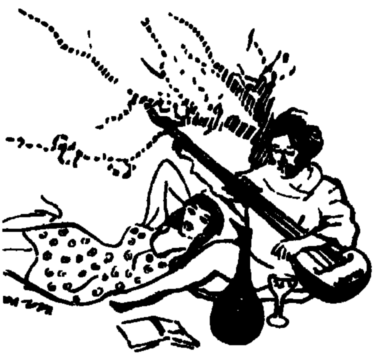
جن لوگوں کی نگاہ کمزور ہوتی ہے، پڑھتے وقت تیوریاں چڑھاتے ہیں اور ترچھی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے وقتی طور پر نگاہ تیز ہو سکتی ہے مگر اس سے آنکھ کے پٹھوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ پلکوں کو ہمیشہ ڈھیلا رکھنا چاہئے۔ جن لوگوں کی نگاہ کمزور ہے ان کو چاہئے کہ ایک موٹے کالے کاغذ کو چوکور کاٹ لیں جو چوڑائی میں کم اور لمبائی میں زیادہ ہو۔ اس کے بیچوں بیچ ایک باریک خط کاٹ کر بنا لیں۔ لمبائی چوڑائی میں خط چھپائی کی ایک عام لائن سے تھوڑا بڑا ہونا چاہئے۔ جو چیز آپ کو پڑھنی ہے، اس پر یہ کاغذ رکھ دیجئے اور پھر کٹے ہوئے خط سے پڑھئے۔ ایک لائن پڑھ چکنے کے بعد خط کو اگلی لائن پر کھسکا لینا چاہئے۔

پڑھتے وقت آرام سے بیٹھئے اور کافی روشنی رکھئے۔ رات میں ۶۰ واٹ یا اس سے زیادہ پاور کی روشنی رکھئے۔ جہاں تک ممکن ہو روشنی پیچھے سے آنی چاہئے تاکہ روشنی آنکھوں پر نہیں بلکہ کاغذ پر ہی پڑے۔

ہمارے ملک میں گرمی کا موسم لمبا ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب رہے گا کہ گھر سے باہر باغوں، سایہ دار مقاموں، بالکنی یا پورٹیکو میں بیٹھ کر پڑھا جائے۔ دن میں پڑھنے کے لئے یہ مقامات بہت عمدہ رہتے ہیں۔ پڑھتے وقت کافی روشنی ہو اور دل یا دماغ پر کسی طرح کا دباؤ اور زور نہ پڑے، ورنہ آنکھوں پر بہت برا اثر پڑے گا۔

باریک الفاظ کو پڑھنے سے بھی آنکھوں پر بہت زور پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں ایسے باریک ٹائپ والے الفاظ پڑھنے پڑتے ہیں، جنہیں پڑھنا آسان نہیں ہوتا۔ پڑھتے وقت آنکھوں کو جھپکتے رہنے سے آرام ملتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھوں کو ایک لمحے کے لئے بند بھی کیجئے اور آخری لفظ کو یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔ یاد رکھئے کہ پڑھنے کا کام دماغ کرتا ہے اور دیکھنے سے تو صرف یاد کرنے میں مدد ملتی ہے۔

آنکھوں کے ایک ڈاکٹر ڈبلو ایس واش کا کہنا ہے کہ پلک جھپکانا آنکھوں کی ایک اچھی



کسرت ہے۔ صبح سو کر اٹھتے ہی آنکھیں صاف کرنا ضروری ہے۔ دو سکنڈ انہیں بند کر کے ۱۵ بار آنکھوں کو جلدی جلدی اور دھیرے دھیرے جھپکائیں۔ اس کے بعد ایک آنکھ اچھی طرح کس کر بند کریں، پھر دوسری اور پھر بتدریج یہ عمل پانچ بار کریں اور آنکھیں خوب جھپکائیں۔

آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے سے بھی آنکھوں اور دماغ کو بہت آرام ملتا ہے۔ آرام سے

بیٹھ کر بند آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھئے، انگلیاں ماتھے پر رہیں، اس سے روشنی آنکھوں تک جانے سے رُک جائے گی۔ اس کے بعد تصور کیجئے کہ آپ کسی خوبصورت ماحول میں ہیں، یا عہدِ گذشتہ کے کسی واقعے کو یاد کریں۔ ماضی کے واقعات یا قدرتی مناظر تیز رفتار ہونے چاہئیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ تصور میں مناظر کو دیکھنے کی بجائے آپ گھورنے لگیں جس سے آنکھوں پر دباؤ پڑے اور وہ سخت ہو جائیں۔

پھر وہ بے نقاب آئے

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے
بامِ مینا سے ماہتاب اترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے
عمر کے ہر ورق پر دل کی نظر
تیری مہر و وفا کا باب آئے

—— فیض احمد فیض

اپنا دھیان کسی بات سے ہٹانے کے لئے تصور کرنے کی عادت ڈالیں۔ تصور کیجئے آپ کی ناک چاک کا ایک لمبا ٹکڑا بن گئی ہے اور بلیک بورڈ آپ کے سامنے ہے۔ آنکھیں بند کرکے آرام سے بلیک بورڈ پر ایک گھیرا بنانے کی کوشش کریں۔ یہ عمل پانچ بار کریں اور آنکھیں بند کئے ہی اس چیز کا تصور کریں۔

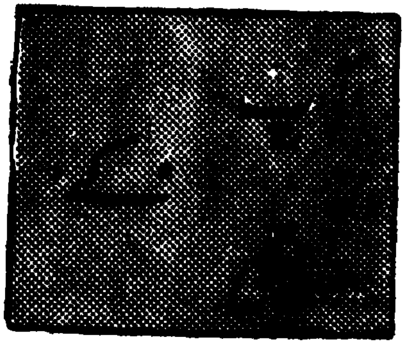
اس کے بعد اس گھیرے میں 'نکتے' کا نشان بنائیں۔ یہ عمل بھی بار بار کریں۔ اس کے بعد 'نکتے' کی علامت پر 'صفر' بنائیں۔ یہ بھی پانچ چھ بار کریں۔ اس کثرت کے بعد آنکھوں پر ہتھیلی رکھیں اور بلیک بورڈ پر اپنا نام پانچ بار لکھیں۔

آنکھوں کو آرام پہنچانے والی ایک کسرت آنکھوں کو دھوپ میں سینکنا بھی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر آنکھوں کی پتلیوں کو آہستہ سے بند کیجئے اور دھوپ کی طرف آنکھ کیجئے۔ اپنا سر پہلے آہستہ آہستہ اور بعد میں جلدی جلدی اِدھر سے اُدھر گھمایئے تاکہ بند آنکھیں روشنی کو کاٹتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف کو گھوم سکیں۔

ایک یا دو منٹ بعد ایک آنکھ کو ہاتھ سے ڈھک کر دوسری کو کھولیں۔ ساتھ ہی ساتھ سر بھی ہلاتے رہیں۔ جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں اور سورج سے کافی فاصلے پر بائیں ہاتھ کی طرف کسی ایک نشان کی طرف دیکھیں۔ سر جس طرف ہلے اسی سمت میں ایک نشان دیکھیں۔ اس عمل کو پہلے ایک آنکھ سے پھر دوسری آنکھ سے دوہرائیں۔ بعد میں دونوں آنکھیں بند کرکے سورج کی طرف منہ کر لیں۔ اس کے بعد آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر کسرت کریں۔

اگر آپ سورج کی روشنی برداشت نہیں کر سکتے تو اس کسرت کو بند آنکھوں سے کر سکتے ہیں، ہتھیلیوں سے ڈھکنے والی کسرت بھی کر سکتے ہیں، ایسا ایک یا دو ہفتے تک کرنا چاہئے، پھر آپ سورج کی روشنی کھلی آنکھوں پر بھی برداشت کر سکیں گے۔

جن لوگوں کی آنکھوں میں خرابی ہو، انہیں ہتھیلیوں والی کسرت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے۔ یہ کسرت ان کاموں کے بیچ بیچ میں روک کر کرنی چاہئے، جن میں مسلسل دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح آپ اپنی آنکھوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔



میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ میری عمر اس وقت ۱۹ برس ہے۔ جب میں سات برس کا تھا تو میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ کچھ تھوڑے بہت اثاثے سے گذارہ چلتا رہا۔ میری والدہ نے میری تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا جب اثاثہ ختم ہوگیا تو میری والدہ نے بچوں کی دیکھ بھال کا کام لے لیا۔ میرا خرچ ایک اور صاحب اٹھاتے ہیں اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ میں بی ایس سی تو کر ہی لوں۔ میری بھی یہ خواہش ہے مگر والدہ کی خرابیٔ صحت کا خیال آتا ہے۔ وہ کام نہیں کر سکتیں۔ سوچتا ہوں کوئی نوکری کروں مگر کوئی ایسا معقول ذریعہ نہیں ہے اگر نوکری بھی ملی تو تعلیم کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ سخت الجھن میں ہوں۔ مجھے کوئی مناسب رائے دیں۔

—— امام۔ گیا

● مشکلات میں ہی انسان کی آزمائش ہوتی ہے اور اس میں انسان سونے کی طرح کندن بن جاتا ہے۔ آپ کوشش کر کے کوئی نوکری تلاش کریں۔ مقامی طور پر نہ مل سکے تو قرب و جوار میں قسمت آزمائی کریں۔ اور اپنی والدہ کی کفالت کا بار اپنے ذمہ لیں۔ جہاں تک پڑھائی جاری رکھنے کا تعلق ہے یہ نوکری کے دوران بھی چل سکتی ہے —— ٹیوشن کر کے۔ بصورت دیگر ٹیوشن نہ ملیں اور نوکری مل جائے تو دلی یونیورسٹی سے کسی مراسلاتی کورس کے ذریعہ بھی تعلیم جاری رکھی جاسکتی ہے۔

●

میری عمر تیس سال ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل مجھے ایک ہندو لڑکی سے محبت ہوگئی وہ بھی مجھے پیار کرنے لگی ہم نے ایک ساتھ زندگی گذارنے کے سپنے دیکھے مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تین سال قبل اُس کی شادی ہوگئی۔ میں ابھی تک کوشش کے باوجود بھی اُس کو نہیں بھول پایا ہوں ہر لمحہ اُس کی یاد دل پر چوٹ لگاتی رہتی ہے میرے والدین اور دیگر اعزا شادی کرنے کو کہہ رہے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔ سب مجھ پر زور ڈال رہے ہیں کہ میں شادی کر لوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟

—— ع ب۔ رانچی

● بیتی ہوئی باتیں بھلا دیجئے، آگے کی سدھ لیجئے آپ تو ماشاءاللہ ذی ہوش انسان ہیں قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ لڑکی آپ کی رفیقۂ حیات نہ بنے۔ اب جب اُس کی شادی ہو چکی ہے تو اُس کی یاد میں آنسو بہانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ آپ کو دنیا میں کسی مشن کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ مطمئن زندگی بسر کریں اور یہ تکمیل اُسی وقت ہو سکتی ہے جب آپ شادی کر لیں اور ازدواجی زندگی بسر کریں۔

اس عنوان کے تحت ہم آپ کے مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے پتہ لکھا اور ٹکٹ لگا لفافہ آنا ضروری ہے۔ اپنے مسائل درج ذیل پتہ پر بھیجئے۔
کچن سریتا اردو جھنڈے والان اسٹیٹ نئی دلی
—— ایڈیٹر

کرکٹ کنٹرول بورڈ کے کارنامے

آج کل کوئی جگہ اور شعبہ ایسا نہیں بچا ہے جہاں پر کرپشن موجود نہ ہو۔ کھیل جیسے پاکیزہ شعبے میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔

ہر ٹیسٹ میچ میں اخراجات کی مدیں ۸ لاکھ تک پہنچ چکی ہیں جب کہ اس سے ہونے والی بابت ۲ لاکھ سے لے کر ۲½ لاکھ روپے سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ حیرت کا مقام ہے کہ کرکٹ کنٹرول بورڈ ہر فروخت شدہ ٹکٹ پر اپنا ۲۵ پیسے کا سرچارج لیتا ہے، گارنٹی کی رقم بھی لیتا ہے۔ اور کھلاڑیوں، ٹیموں کے سربراہوں اور ایسے افسران کے اخراجات کا کفیل بھی ہوتا ہے۔ سٹیٹ ایسوسی ایشن بھی یہ سب کام کرتی ہے۔

اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ میچوں سے ہونے والی آمدنی کا صحیح حساب کتاب ںہیں رکھا جاتا اور نہ اُس کی ٹھیک طرح جانچ ل ہی ہوتی ہے۔ عام طور پر سٹیڈیم میں ۴۵۰۰۰ لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے لیکن اندر تعداد سے زیادہ لوگوں کو داخل جاتا ہے اور پھر پولیس مجمع کو قابو میں لانے لئے لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کرنے رہ جاتی ہے تب عقدہ کھلتا ہے کہ سٹیڈیم ماشائیوں کی بھرمار ہے۔

اس بدنظمی کی اصل وجہ بوگس اور فرضی ں کی بہتات ہے یہ بات نہیں کہ ٹکٹ رکے ہوں یا انھیں غیر قانونی طریقے پر کسی سے پریس میں چھپوا لیا گیا ہو۔ نہیں، : فرضی ٹکٹ اس معنی میں ہیں کہ ایک ے فروخت کئے گئے ٹکٹوں پر ہی اور لوگ کھیلنے کے لئے ہال میں گھس آتے ہیں۔ ں کی اس ناجائز بکری کو منتظمین اُوپر ہی اڑا جاتے ہیں۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو گنی چنی تنخواہ پانے والے ل افسران نئی دِلّی جیسی جگہ پر اپنی شاندار کوٹھیاں کیسے بنا پاتے۔ ان افسروں کی بالائی آمدنی کی مختلف مدیں اور بھی ہیں۔ سٹیڈیم میں موجود سائیکل سٹینڈ، چائے، پھل اور پان فروشوں سے تو یہ لوگ منہ مانگے پیسے طلب کرتے ہیں۔ ساتھ ہی موٹی موٹی آسامیوں کو دعوت نامہ بھیج کر یہ لوگ اُن سے ایک ایک دعوت نامے پر پچاس پچاس روپے اینٹھنے سے بھی نہیں چوکتے۔

" ہر جگہ روپے کی ریل پیل ہے۔ کرکٹ کھیلنے والی ٹیمیں روپیے کے نظریئے سے ہی میچ کھیلنے کے لئے خاص خاص ممالک کا انتخاب کرتی ہیں۔ بھارت کے بارے میں تو اکثر لوگ بڑا غلط نظریہ بناتے ہوتے ہیں مگر کرکٹ کے میچ یہاں پھر بھی ہوتے ہیں اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ یہاں سے لوگوں کو گارنٹی کی معقول رقم مل جاتی ہے جب کہ دیگر ممالک میں اس رقم کا ایک خاص تناسب مقرر ہے۔

روپے کے بل بوتے پر ہی کچھ لوگوں نے کرکٹ کھلاڑی ہونے کی سند حاصل کرلی ہے۔ بھارت کی کرکٹ ٹیموں میں داخلے کے لئے ضروری ہے یا تو کھلاڑی میں حیرت انگیز قابلیت و صلاحیت اور استعداد ہو یا وہ کسی اکرکٹ کھلاڑی کا بیٹا ہو اگر کسی کے پاس

یہ دونوں صلاحیتیں نہ ہوں تو اُس کے پاس روپے کا پاسپورٹ ہونا ضروری ہے جس کی جھلک دِکھا کر وہ داخلہ پانے میں کامیاب ہوجائے گا۔

یہ بھی ایک تضاد ہے کہ جو کرکٹ ایسوسی ایشن اور اُس کے افسران بہت زیادہ آسودہ حال ہے اتنا ہی اُس کے کھلاڑی کرکٹ کے شائقین اور اپنے تماشائیوں کے سامنے بہت لچر مظاہرہ کرتے ہیں۔

کسی میں اتنا شوق اور جذبہ موجود نہیں ہے جو دَورہ کرنے والی ٹیموں کے مقابلے کے لئے میچ کھیلنے کا انتظام کرے۔ ابھی حال میں یو۔پی کے ایک صنعت کار نے اس میدان میں کچھ قدم اُٹھایا بھی تھا مگر معاملہ آگے نہ بڑھ سکا اور رنجیت و دلیپ رانجی ٹرافی میچ ویسے ہی گذر گئے۔

اس صنعت کار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ایسے مظاہرے بے لوث ہوکر کبھی نہیں کرتے بلکہ کھیل کو ذریعہ بنا کر وہ اپنی صنعت و تجارت کو فروغ دینے کا بیڑہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔

کھیل کے میدان میں پائے جانے والی کرپشن کی زندہ مثال بمبئی (بوگس ٹکٹوں کی فروخت) اور کلکتہ (یکم جنوری کو ہندو مسلم فساد) حالیہ واقعات ہیں جن پر انکوائری ہو رہی ہے کیا اچھا ہو کہ پوری کرکٹ کی تنظیم کی معاشیات کی بھی انکوائری ہوجائے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پہلے بھی کئی بار اس سلسلے میں تحقیقات ہوئی ہیں لیکن تعجب ہے کہ نتیجہ ہمیشہ ہی صفر رہا۔ غالباً یہ تحقیقات محض کاغذی خانہ پُری کرنے اور کچھ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے ہوا کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دن بہ دن کھیل کے میدان میں بدنظمی زیادہ پھیل رہی ہے۔ اور اس سے لوگوں کو اور شہ مل رہی ہے۔



مائیکل ڈلوا — گلبیر سنگھ

گلبیر سنگھ

دلّی میں آج کل جوان تیراکوں کی بھر[مار] ہو رہی ہے۔ محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فن میں پُوری مہارت بھی رکھتے [ہیں]۔ دِلّی سے باہر ہونے والے مقابلوں میں [بھی] اُنھوں نے اپنے فن کا کامیاب مظاہرہ ک[یا ہے]۔ اِنہی خوش نصیبوں میں سے ایک تیراک گلبیر [سنگھ] بھی ہے

سینٹ سٹیفین کالج کے اِس تیراک سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اُس نے واحد چیمپئن شپ جیت کر اکثر د[فعہ] اپنے کالج کا نام اُونچا کر کے اپنے شہرت حاصل کی ہے۔ ۱۰۰ میٹر فری سٹا[ئل] تیراکی میں وہ خاص مہارت رکھتا ہے

مائیکل ڈلوی

کرکٹ کے اس کھلاڑی میں بلا کی سُر[عت] ہے کرکٹ کے میدان میں ایک بار بیٹ س[نبھال] کر لگاتار رن بنانے شروع کر دیتا ہے۔ یہ ... اُس نے دہلی سینٹ سٹیفین کالج کی طرف

یل کر پیش کی۔ اُس نے کمال پُھرتی دکھائی ور کھیل کے افتتاح پر قریب تین سینچری کا سکور حاصل کیا۔

حالیہ نارتھ زون رانجی ٹرانی میچ میں فوجی ٹیم نے ۱۵۰ کا شاندار سکور کیا کرکٹ کے انتخاب کُنندگان نے مائیکیل ڈلوی کو انڈین یُونی ورسٹیوں کے کھلاڑیوں کے زمرے میں شامل کیا۔ اور جب ویسٹ انڈین کھلاڑی یہاں آئے تو اُس نے اوپننگ میچ میں اپنا کمال دکھایا۔ بدقسمتی سے عین وقت پر بارش نے کھیل کا مزا کرکرا کردیا تاہم باقی ماندہ میچ میں دوسرے یُونی ورسٹی کھلاڑیوں کے ساتھ ڈلوی نے کھیل کی باقی چپو کو بدستور برقرار رکھا۔ اور شائقین سے خوب دادِ تحسین پائی۔



ولیم گھوش

اس خاموش طبع کرکٹ کھلاڑی نے
ڑ سال بعد ریلوے کو نارتھ زون رانجی
ل میں وہ کامیابی دلائی جو اس سے پہلے
ی بھی کھلاڑی کے بس کی بات نہ تھی۔
' اپنے میدان میں ہنستے ہوئے خود کھیلنے کے
تھ ہی ساتھ وہ اپنے ساتھیوں کی ہمت
ھا کر اُنھیں خوب کھلاتا ہے۔ وہ نہ صرف
ک اچھا لیڈر ہی ہے بلکہ ہر زاویے سے
ک اچھا کھلاڑی بھی ہے۔ ●



... کی ملکیت اور دیگر تفصیلات ... کے بارے میں
بیان ... پریس ... ان کے بعد شائع ہونے والے پہلے شمارہ میں
شائع ۲۰

فارم چار، دیکھئے قاعدہ ۸

۱. شائع ہونے کی جگہ: نئی دلی
۲. وقت اشاعت: ماہانہ
۳. طابع: وشوا ناتھ قومیت ہندوستانی پتہ معرفت دلی پریس نئی دلی
۴. پبلشر کا نام: وشوا ناتھ قومیت ہندوستانی ... معرفت دلی پریس نئی دلی
۵. ایڈیٹر کا نام: وشوا ناتھ قومیت ہندوستانی ... دلی پریس، نئی دلی
۶. ان اشخاص کے نام اور پتے جو اس اخبار کے مالک اور حصہ دار ہیں یا جو اس کی پونجی کے ایک فی صدی سے زائد کے شیئر ہولڈر ہیں۔
دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ جھنڈے والا اسٹیٹ، نئی دلی

میں وشوا ناتھ بیان دیتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میری معلومات اور یقین کے مطابق درست اور صحیح ہیں

دستخط
وشوا ناتھ ملہ

آپ کے خطوط

سریتا فروری ۱۹۶۷ نظر نواز ہوا۔ کیفن کا مقالہ [illegible] میں پڑھا چاہتا ہوں، بہت دلچسپ رہا۔ ہمارے نوجوان طبقے کی اصلاح و ذہنی نشو و نما کے لئے ایسے مفید و معلوماتی مقالوں کی اشاعت بے حد ضروری ہے لیکن کیا ایک فیملی رسالہ جسے بچے، لڑکے، جوان، مرد و زن سب دلچسپی سے پڑھتے ہوں، اس میں ایسے مقالوں کا شائع ہونا واجب ہے

— خواجہ جمیل حسن، لکھنؤ

★

سریتا کے فروری شمارے میں کافی [illegible] شامل ہوئی ہیں، اور مجموعی طور پر یہ شمارہ کافی نکھرا ہوا ہے۔ کیفن کا مقالہ [illegible] [illegible] بہت پسند آیا۔

[illegible] کے صفحے میں [illegible] اقبال کی [illegible] حبیب اللہ کی دستاویز [illegible] عالمِ [illegible] بہت [illegible] ہیں۔ لیکن لاج ٹھاکر کی کہانی 'راجہ کی [illegible]' میری سمجھ سے قطعی بالا رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی کہانیوں کو آپ کیسے سریتا میں شامل کر لیتے ہیں۔ انجم قریشی چھپاردی کی نظم '[illegible] امیدوں کا' ایک اچھی کوشش ہے۔

— پیارا سنگھ بھاگی، ذخیرہ دلی

★

فروری شمارہ ابھی تک زیر مطالعہ ہے [illegible] سنگھ کی کہانی 'مشینوں کی بغاوت' آنے والے مشینی دور کی ایک تصویر ہے

آج کے عہد میں عشق و محبت کی بجائے سائنسی کہانیوں اور سائنسی معلومات کی اشد ضرورت ہے اور امید ہے کہ سریتا اس ضرورت کو پورا کرے گا۔ مقالہ 'آدرش بنام طرزِ عمل' بھی بہت بصیرت افروز رہا ہے۔

— عبدالاحد، مائیم سرینگر

★

فروری کے شمارے میں مقالہ 'آدرش [illegible]' [illegible] اور سوشلزم سے متعلق ایک [illegible] مقالہ ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مقالہ نگار نے اپنے [illegible] میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں، لیکن ان کا یہ کہنا کہ کانگریس اپنے دورِ اقتدار میں ایک بھی ایسا وزیر نہیں پیدا کر سکی جس کی ایمان داری اور طرزِ عمل شک و شبہ سے بالاتر ہو، اس سے میں متفق نہیں ہوں۔ وہ آنجہانی لال بہادر شاستری کو کس زمرے میں رکھتے ہیں، نہرو کا مزاج کے [illegible] کا کیا حال ہے؟

ہاں اس بات سے بھی ہمیں انکار نہیں کہ ہماری سرکاری مشینری میں کچھ ایسے غلط قسم کے عناصر داخل ہوئے جنھوں نے اپنی غلط کارروائیوں سے سماج دشمن ہونے کا ٹھوس ثبوت دیا۔ لیکن اس کا [illegible] مطلب نہیں کہ سب ہی لوگ ایسے ہیں

— جمیل الرحمان، [illegible]

سرِتیا (فروری) کا مطالعہ کیا۔
اس میں شک نہیں کہ آج کے سرِتیا میں کل کے شاندار مستقبل کی ایک جھلک نمایاں ہے۔
سرِتیا واقعی سماجی تعمیر کا ترجمان ہے۔
انیا مسعود جگنیہ اور شگفتہ بخش کے مقالے بھی کافی دلچسپ ہیں۔
حصۂ نظم میں سید محمود اور مشتاق علی شاہد کی نگارشات بہت پسند آئیں۔ گیان سنگھ کی کہانی "مشینوں کی بغاوت" تو بہت ہی عمدہ ہے۔
اس کے علاوہ حبیب اللہ کی کہانی "تلو تمایا عائشہ" بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ لیکن او ج ٹھاکر کی "ماجھ کی بارات" نہایت لچر کہانی ہے۔

—— حفیظ، بہار (یوپی)

★

جنوری ۱۹۷۶ کے سرِتیا کے مقالوں کی سنجیدگی قارئین سرِتیا کو قریب لانے میں ضرور معاون ثابت ہوسکے گی۔ ورنہ صرف دماغی عیاشیوں کے لئے تو اُردو کا بازار بھرا پڑا ہے۔
محمود ہاشمی صاحب کا مقالہ پسند آیا۔ لیکن ان کی یہ منطق کہ مسلمان بعد از مسیح کی تہذیب اپنائیں میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
سرِتیا کی انفرادیت سے اتنا مسحور ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ ڈائجسٹ برانڈ اردو فروش اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

—— جی جی ایم خان، بمبئی۔۸

★

محمود ہاشمی کو دلی مبارک باد عرض کرتا ہوں کہ انھوں نے ہندوستان میں بسنے والے چھ کروڑ بھونڈی افراد کی قابلِ رحم حالت کا جائزہ لیا۔ ان کے سامنے آئینہ رکھ دیا کہ وہ چاہیں تو اپنی صورت (اور سیرت بھی) سدھار سکتے ہیں، ورنہ بقول اقبال ——

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہمیں توی امکان ہے کہ آپ آئندہ بھی اس قسم کے معلوماتی مقالے شائع کیا کریں گے۔

—— حبیب الرحمٰن حبیب، جودھپور

★

ماہ جنوری کا سرِتیا پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ اب سرِتیا پہلے سے بھی حسین اور دلچسپ بن گیا ہے۔ کیا سرِتیا جیسے اردو رسالے کو دیکھ کر کوئی یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے؟
کہانیاں اور نظمیں کافی پسند آئیں۔ ہر ماہ سرِتیا میں ایک جاسوسی کہانی بھی رکھی جائے تو اور نکھار پیدا ہوگا۔

—— کے۔ زاہد تاپوری، گلاب گڑھ

★

نئے سال کا نیا "سرِتیا" (جنوری ۱۹۷۶) نظر نواز ہوا۔ ایسا دیدہ زیب اور دل کش جریدہ اردو زبان میں آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ سرِورق سے لے کر خاتمہ تک عنوانات تو پراثر، دلچسپ اور معلوماتی ہیں ہی۔ مگر جس ڈھنگ اور خوش اسلوبی سے آپ نے اسے پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سہ رنگی تصویریں اس میں چار چاند لگا رہی ہیں۔
اداریہ "موجِ سرِتیا" میں خیالات پختہ اور حق بجانب ہیں۔ مقالوں میں "چھ کروڑ ہندوستانی مسلمان"، "مولوی" اور "گندمی رنگ کے برطانوی" بے حد کامیاب ہیں۔ کہانیاں سب کی سب معیاری ہیں۔ غزلوں میں سید ابوالبرکات کا یہ شعر ——

"رقص کرتی ہے در و بام پہ افلاس کی گرد
دم نہ گھٹ جائے کہیں آج کے انسانوں کا"

بہت پسند آیا۔

—— حیدر نایاب، کٹک

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟
ہمیں اپنی رائے لکھئے —— ایڈیٹر


سریتا



۹۶واں شمارہ — مئی ۱۹۷۶

ماہنامہ سریتا

سماجی تعمیر نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر

وشوناتھ

زر سالانہ

ایک پرچہ ———— ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ایک سال ———— ۱۲ روپے
دو سال ———— ۲۲ روپے
———— ۱۵۰ روپے
غیر ممالک کیلئے: ایک سال ۱۶ روپے، دو سال ۳۰ روپے

سریتا کا ہر پرچہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ڈاک کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرچہ گم ہو جانے کی صورت میں ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے پر اگر پرچہ اسٹاک میں موجود ہوا تو دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔

اپنی رہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریداری نمبر کے ساتھ ہمیں فوراً دیجئے تاکہ سریتا آپ کو وقت پر مل سکے۔

مالکان دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دلی کے لئے دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ اور دلی پریس نئی دلی سے چھپوا کر شائع کرایا۔

مقام ادارت اور اشاعت: دلی پریس جھنڈے والا اسٹیٹ، رانی جھانسی روڈ، نئی دلی۔

۹۵ واں شمارہ — اپریل ۱۹۷۶

کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچر

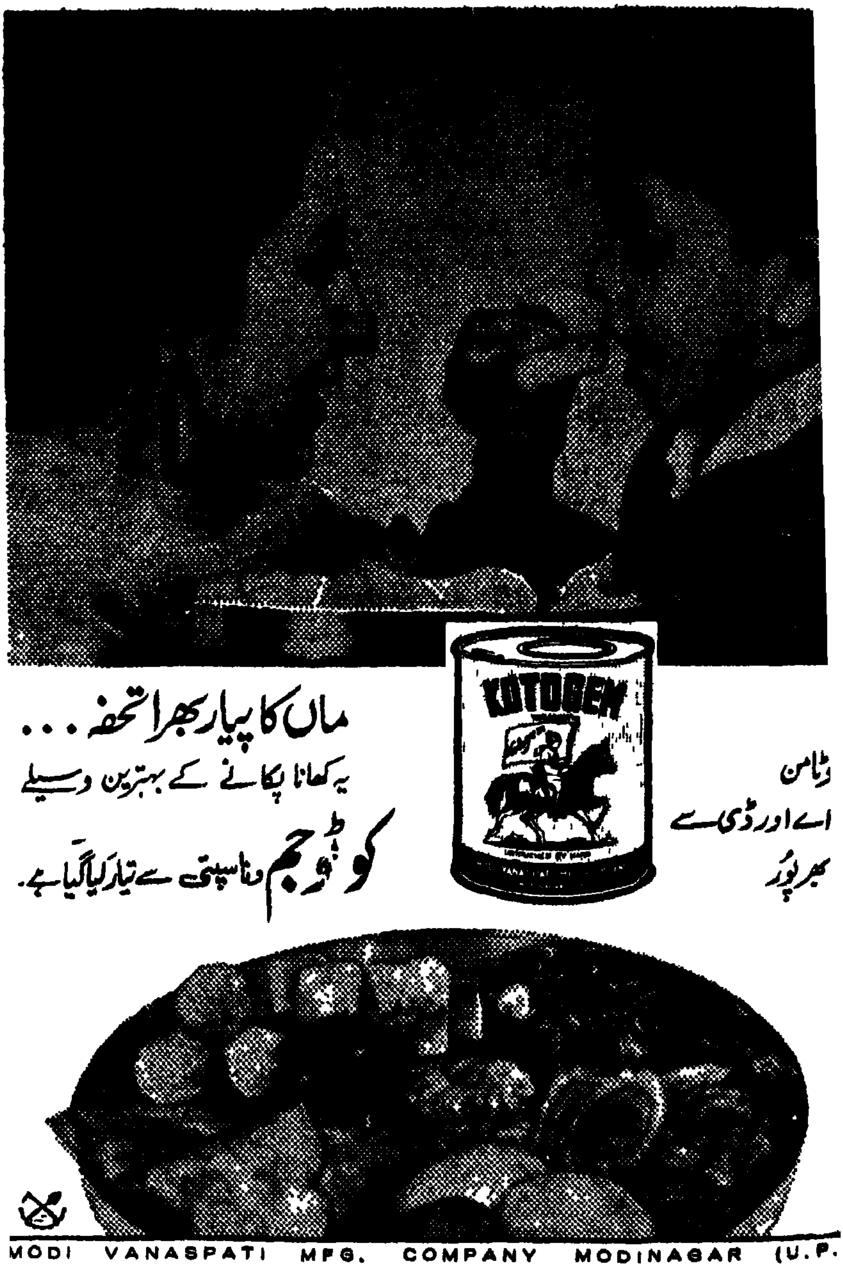
جب آپ
مانگ کر کھاتے نہیں
مانگ کر کپڑے پہنتے نہیں
مانگ کر بس، ٹرام یا ریل میں سفر کرتے
نہیں اور بغیر کرایہ ادا کئے کسی کے
مکان میں رہتے نہیں
تو پھر
مانگ کر کتابیں اور
رسالے ہی کیوں پڑھتے
ہیں؟

معذرت

ہمیں بہت افسوس ہے کہ پریس ملازمین کی ناجائز ہڑتال کی وجہ سے سریتا، اردو سریتا اور کاروان کے مارچ شمارے بروقت قارئین کی خدمت میں پیش نہیں کئے جا سکے۔ ہمارے لاکھوں قارئین کو جو تکلیف ہوئی ہم اس کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔

امید ہے کہ ہماری مجبوریوں کے پیش نظر ہمارے قارئین ہمیشہ کی طرح ہمیں تعاون دیتے رہیں گے۔

— ایڈیٹر



ماں کا پیار بھرا تحفہ...
یہ کھانا پکانے کے بہترین وسیلے
کوٹوجم وناسپتی سے تیار کیا گیا ہے۔
KOTOGEN
ٹامن
اے اور ڈی سے
بھرپور
MODI VANASPATI MFG. COMPANY MODINAGAR (U.P.



سریتا

اپنے احباب تک پہنچائیے

جی ہاں، آپ کے رشتہ داروں اور جان کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے 'سریتا' آج تک نہ دیکھا ہے نہ پڑھا ہے۔ کیا آپ ان کا اپنے محبوب رسالے سے تعارف کرانا پسند نہ کرینگے۔ آپ صرف نیچے دیا گیا کوپن بھر کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ہم ان صاحب کی خدمت میں 'سریتا' کی ایک کاپی بطور نمونہ روانہ کر دیں گے۔

نمونے کی کاپی کا کوپن

کوپن بھیجنے والے کا نام ____________________

پتہ ____________________

نمونے کی کاپی پانے والے کا نام ____________________

پتہ ____________________

اداریہ

موجِ سرِتا

اندرا گاندھی نے دُوسری بار وزارتِ عظمیٰ کا بار سنبھالنے کے بعد قوم کے نام اپنے پہلے ریڈیو پیغام میں کہاکہ بھارت ایک طاقت ور، اور ترقّی پذیر ملک ہے۔ اِس لئے سرکار میں ہوئی تبدیلیوں یا برسرِاقتدار پارٹی کانگریس کی اکثریت کم ہونے کی وجہ سے نااُمید یا خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

نہ جانے اندرا جی کو یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ چوتھے عام چناووں کے نتیجے میں کئی صوبائی سرکاروں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اور مرکز میں کانگریس کی بھاری اکثریت کم ہوئی ہے اس سے مُلک میں کسی طرح کی نااُمیدی پھیلی ہے یا لوگ خوف زدہ ہوئے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ ان نتائج نے لوگوں کو بڑا سکُون ملا ہے۔ اور نئی اُمیدیں بندھی ہیں کہ شاید اب کم از کم ان صوبوں میں جہاں لوگوں کی اکثریت نے غیرکانگریسی سرکاروں کو برسرِاقتدار کیا ہے عوام کی روز مرّہ کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ اِس لئے اندرا جی کا یہ خیال کہ چناووں کے نتائج سے لوگ نااُمید ہوئے ہیں، نہ صرف غلط ہے بلکہ نا موزوں بھی ہے۔ آخر لوگوں نے ہی اپنے ووٹنگ سے یہ تبدیلی کی ہے۔ پھر اِس کے باعث وہ خود ہی نااُمید کیوں ہوں گے۔

ہاں اگر لوگوں کو کچھ افسوس ہے تو صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے بہت سی اسمبلیوں کی طرح لوک سبھا کے لئے بھی ووٹ ڈالتے ہوئے کچھ زیادہ سمجھ داری اور عاقبت اندیشی سے کام کیوں نہیں لیا۔ خیر، اب لوگوں کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ اگلی بار — شاید ۱۹۷۲ سے پہلے ہی یہ کسر بھی پُوری کر دی جائے گی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اندرا جی نے اپنا پیغام نشر کرتے ہوئے پُرانی عادت کی وجہ سے 'قوم' کو 'کانگریس' کا ہم معنی سمجھ لیا اور جو بات انھیں صرف اپنے کانگریسی بہی خواہوں سے کہنی چاہئے تھی، اس کا پرچار وہ پوری قوم کے نام اپنے سرکاری پیغام میں کرگئیں۔ کچھ ہو، اب ملک میں ہوئی تبدیلیوں کے پیشِ نظر آ۔ کی وزیراعظم کو اپنے سوچنے سمجھنے اور عوام سے مخاطب ہونے کے طریقوں میں بھی کچھ تبدیلی کرنا چاہئے۔ کانگریسی وزیر اعظم کو اب یاس و نااُمیدی کی یہ باتیں صرف کانگریسی پارٹی کی بیٹھکوں میں ہی کرنی چاہئیں۔

اسی ریڈیو براڈکاسٹ میں اندرا جی نے یہ بھی کہاکہ آج ملک میں آزمائش کا جیسا مشکل وقت آیا ہے ویسا پہلے کبھی نہیں آیا۔ ہر طرف سے مانگیں اور اُمیدیں کی جارہی ہیں کہ ہمیں اپنے عوام کی اچھی اور خوش آیند زندگی کے لئے ان کی بنیادی

ضرورتوں کو پورا کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

آزمائشی دقت اور قلت سے بدحال عوام کو یہ اُمید تھی کہ وزیر اعظم اپنے اس ریڈیو نشریہ میں یہ بتائیں گی کہ ان کی سرکار موجودہ آزمائش میں کامیاب ہونے اور عوام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے ورنہ لوگوں کو اس اطلاع کی ضرورت نہیں تھی کہ بڑا مشکل وقت آگیا ہے یا یہ کہ لوگ بدحال ہیں۔ یہ باتیں تو وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں محسوس کر ہی رہے ہیں۔

لیکن وزیر اعظم نے جن دو چار مشکلات کا ذکر کیا اور اپنی سمجھ سے ان کے حل بتائے، ان میں عوام کو اپنی اصلی پریشانیوں کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔

مثلاً وزیر اعظم نے فرمایا "ہمیں یعنی سرکار کو اپنی سب قومی زبانوں کی ترقی کر کے کروڑوں کی تعداد میں سستی کتابیں شائع کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لینا ہے تاکہ لوگ ان کے ذریعے تحصیل علم کریں اور جدید سائنس و ٹکنالوجی کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں۔"

اصولاً یہ ایک بہت ہی ضروری و فائدہ مند بات وزیر اعظم نے کہی ہے۔ بھارت کے لوگوں کو جدید سائنس و ٹکنالوجی کی اشد ضرورت ہے اس سے تو کسی بھی حالت میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن بھارت جیسے ملک میں جہاں آزادی کے بیس برس میں ایک فی صد ان پڑھ بالغوں کو بھی خواندہ نہیں بنایا گیا۔ صرف کتابیں شائع کرنے سے علم کو فروغ کیسے مل جائے گا — یہ بات عام سمجھ سے قدرے بالاتر ہے۔

دوسری بات یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے میں سے بھی کثیر تعداد کے سامنے یہ پریشانی رہتی ہے کہ وہ سستی سے سستی کتابیں لینے کے لئے بھی پیسہ کہاں سے لائیں اور اگر پیسہ ہو بھی تو اُن میں ایسی کتابوں کے تئیں رجحان کیسے پیدا کیا جائے۔ یہ بھی ایک دقت ہے۔ اس طرح ان نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں بھی اصلی پریشانی گھوم پھر کر اسی معاشی و تہذیبی سطح پر آجاتی ہے جو بھارت کی تمام پریشانیوں کی جڑ ہے یعنی غریبی۔

دوسرے لفظوں میں سب سے پہلے لوگوں کی معاشی حالت کا کچھ سدھار ہونا چاہئے اور تب ہی وہ اتنے کافی تعلیم یافتہ مہذب ہو سکتے ہیں کہ علم و سائنس کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوں اور ان سے فائدہ اُٹھائیں۔

اسی طرح وزیر اعظم نے موجودہ مسئلہ خوراک کا ذکر کرتے ہوئے اس کمی کو دُور کرنے کے کسی ٹھوس اور عملی اقدام کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن سخت پریشانی کے اس دَور میں بھی جب کہ کروڑوں لوگ دانے دانے کو ترس رہے ہیں، ناکافی غذا کی پریشانی کا ذکر کرنا آپ نے بہت زیادہ ضروری سمجھا اور اس پریشانی کو اتنا ہی اہم بتایا جتنا کہ خوراک کی کمی کے مسئلے کا۔ آپ نے کہا کہ ناکافی غذا سے عوام کی تندرستی پر خراب اثر پڑتا ہے گویا اس حقیقت کا اس سے قبل کسی کو علم ہی نہیں تھا۔

●

امریکی اخبار 'نیویارک ٹائمز' نے تین ایسے بھارتی اداروں کے نام بتائے ہیں جنہیں امریکی سرکار کے خفیہ محکمہ کی مرکزی سراغرساں ایجنسی (سی۔ آئی۔ اے) کی طرف سے روپیہ ملتا ہے۔

ان تین اداروں کے نام ہیں — نمبر

، انٹرنیشنل یوتھ سینٹر، نیشنل سٹوڈنٹ
یس کونسل آف انڈیا اور فرینڈز آف انڈیا
ی ٹرسٹ۔ اخبار کے مطابق پہلے دو
روں کی معرفت اور تیسرے ادارے کو
ریکی کیئر ڈوڈ کی معرفت سی۔ آئی۔ اے کا
۔ پیہ ملتا ہے۔

مندرجہ بالا پہلے دو نوجوان طلبا
اروں کے عہدے داروں نے اس خبر
۔ رائے زنی کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں
س بات کا قطعی کوئی علم نہیں تھا کہ کچھ،
ریکی اداروں کی طرف سے انہیں جو روپیہ
تا ہے وہ در اصل امریکی خفیہ محکمے کا ہے۔
۔ بات قابلِ ذکر ہے کہ انٹرنیشنل یوتھ سینٹر
کے ٹرسٹی ایک کانگریسی ممبر پارلیمنٹ مسٹر
رویندر ورما ہیں۔ اور جناب رام کشن بجاج
اس کے منتظم ٹرسٹی ہیں۔ بھارت سرکار
کی وزارت داخلہ نے بھی اس خبر پر کسی
قسم کی رائے زنی کرنے سے انکار کیا
ہے۔

یہ بات درست ہوسکتی ہے کہ متعلقہ
بھارتی اداروں کو امریکی خفیہ محکمے کی طرف
سے روپیہ ملتا رہا ہو لیکن ان اداروں کے
منتظموں کو اس کا کوئی علم نہ رہا ہو جس
کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ادارے
امریکی محکمے کی مرضی یا دوسرے لفظوں میں
اُن کے حکم کے مطابق نہیں چلتے رہے ہیں۔
یعنی یہ اپنے کام میں آزاد ہیں۔

اس امر کو امریکی سوشلسٹ لیڈر
نارمن تھامس کی طرف سے دیئے گئے
ایک حالیہ بیان سے بھی تقویت پہنچی ہے۔
مسٹر تھامس نے کہا ہے کہ مجھے اس
بات کا قطعی علم نہ تھا کہ میرے بین الاقوامی
لیبر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ۱۹۶۱ سے
۱۹۶۲ تک کی مدت میں دس لاکھ ڈالر
سے بھی زیادہ کی جو مالی امداد ملی وہ سی
آئی اے کے خزانے سے آئی تھی۔ میں
اس سلسلے میں اپنی ناسمجھی یا بے وقوفی
کا اعتراف کرتا ہوں۔

اس ادارے کا صدر ہونے کے پیشِ
نظر مجھے اس بات کی درحقیقت جانکاری ہونی چاہئے
تھی لیکن مجھے کچھ علم نہ تھا۔

۸۲ سالہ مسٹر تھامس نے جو ۱۹۲۸ سے
۱۹۴۸ تک ایک سوشلسٹ اُمیدوار کی
حیثیت سے امریکہ کے صدارتی چناؤ کے
لئے چھ بار کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے بیان
میں یہ بھی کہا ہے کہ اس سی آئی اے نے
میرے ادارے کی کارکردگیوں یا اس کی
بنیادی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کبھی
کوشش نہیں کی۔ یہی بات شاید ان تین
بھارتی اداروں سے متعلق بھی کہی جا سکتی
ہے جو امریکہ سے روپیہ لیتے رہے ہیں۔

لیکن بھارت میں ایسے متعدد ادارے
اور منظم سیاسی جماعتیں بھی ہیں جو نہ صرف
اپنے غیر ملکی دوستوں سے مالی اِمداد ہی
لیتے ہیں بلکہ اُن کے نظریات اور اُن کی
پالیسیوں کو اس مُلک میں عملی شکل دینے
کے لئے تندہی سے کوشاں بھی رہتے ہیں۔ ایسی
دو سیاسی جماعتیں نام نہاد دائیں اور بائیں
بازو کی کمیونسٹ پارٹیاں ہیں۔ اور اُن کے
ماتحت کام کرنے والے وہ متعدد مزدور،
ثقافتی و نوجوان مورچے ہیں جو اس ملک
میں روسی یا چینی برانڈ کا کمیونزم لانے
کے لئے بلا روک ٹوک کام کر رہے ہیں۔
یہ سب اپنے غیر ملکی آقاؤں سے
نہ صرف مالی امداد ہی حاصل کرتے ہیں
بلکہ کھلم کھلا یہ پروپیگنڈہ بھی کرتے ہیں
کہ وہ اس مُلک کو ایک یا دوسری
کمیونسٹ طاقت کا دُم چھلا بنا کر ہی دم

ہیں گے۔ اور اسے آزاد نہیں رہنے دیں گے۔

ایسی حالت میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ بھارت سرکار امریکی اخبار کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی جانچ کرانے کا فیصلہ کرے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم کرے کہ کس کس بھارتی ادارے کو کن کن بیرونی ممالک سے خفیہ مالی امداد ملتی ہے اور ایسے ادارے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے نظریئے کو یہاں عملی جامہ پہنانے کے لئے کون کون سے حربے استعمال میں لاتے ہیں۔

اس طرح کی مکمل جانچ سے ہی یہ معاملہ حل ہو سکتا ہے۔ سیاسی جماعت اور پیسے کے سلسلے میں سابق ریل وزیر مسٹر پاٹل نے صاف کہا تھا کہ کانگرس تو صنعت کاروں اور تاجروں سے پیسہ لیتی ہے اور چناؤ لڑتی ہے۔ لیکن کمیونسٹوں یا دیگر کمیونسٹ نواز سیاسی جماعتوں کو کہاں سے پیسہ آتا ہے؟ مزدوروں کے چندے سے تو اتنا بڑا کام نہیں چل سکتا۔

لندن کے ہفت روزہ اخبار 'ایکنا بسٹ' نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں پھر چیلنج دیا ہے کہ بھارت میں عام چناؤ کے بعد بننے والی نئی مرکزی سرکار اور صوبائی سرکاروں نے اگر پہلے کی طرح غفلت برتی تو بھارت کی ہتھیار بند فوج کوئی قدم اٹھا سکتی ہے اور یہاں کے پارلیمانی نظام کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔

برطانوی اخبار نے اس سلسلے میں بھارتی فوجی افسروں کے میسوں میں ہونے والی بات چیت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی فوجی افسر اپنی روز مرہ کی بات چیت میں فوجی انقلاب وغیرہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، بلکہ یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فوجی افسروں اور اُن کے میسوں تک ان برطانوی اخبارات کے مقامی نمائندوں کی پہنچ ہے۔

اس اخبار نے کہا ہے " بھارت کے سامنے (فوجی انقلاب کے راستے میں) کئی بڑی دقتیں ہیں۔ سب سے بڑی تو یہ ہے کہ کوئی ایک ہردل عزیز فوجی لیڈر نہیں ہے۔ لیکن پاکستان میں جس طرح جنرل ایوب خاں سب کی رضامندی سے برسر اقتدار آئے تھے اُسی طرح کی کچھ کارروائی بھارت میں بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا ہونے سے پہلے اور کئی باتوں کا ہونا ضروری ہے۔"

اُن کئی باتوں میں سے اخبار نے سب سے پہلے رکھا ہے ' نئی سرکار کا بھی اُن ہی پرانی پالیسیوں پر چلتے رہنا اور اُسی طرح کی غلطیاں کرتے رہنا جیسی کہ پچھلی سرکاریں ۲۰ سال سے کرتی آرہی ہیں۔'

اِس برطانوی اخبار کا اصلی مقصد چاہے کچھ ہو لیکن اُس کے اس چیلنج کے بروقت درست ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ حالیہ انتخابات کے بعد بھی اگر ہمارا پارلیمانی نظام ملک کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو یہاں ایسے عناصر کی کمی نہیں جو اس سے زیادہ پُر اثر نظام پیش کرنے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ وہ نیا نظام پاکستان کی طرح پُرامن فوجی انقلاب کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور چین کی طرح خون ریز انقلاب لانے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نئے حاکموں کو اس جانب سے بروقت چوکنا ہو جانا چاہیئے۔

مقالہ

بسنت چٹرجی

انجام کا آغاز

ہندوستان کے رائے دہندوں نے کانگریس کو رَدّ کردیا ہے لیکن کسی دوسری پارٹی کو قبول کرنے کا اعلان ابھی نہیں کیا۔

یہ بھارت کے چوتھے عام انتخابات سے آزاد یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اب کانگریس کا شیرازہ بکھرنے لگا ہے۔ جوماتج سامنے آئے ہیں وہ کانگریس کے حامیوں اور محالفوا، دونوں کو ہی دم بخود کردینے والے ہیں۔

کانگریس ہائی کمان کے تینوں بڑے ستون ــ صدر کامراج، خزانچی اتولیہ گھوش اور مہامنتری میسم ــ ووٹران نے گرادئے۔ کامراج کو تو انہی کے انتخابی حلقے کے ایک جوان طالب علم لیڈر نے چت کردیا اور اتولیہ دادا کو بھی ایک غیر معروف دیہاتی کارکن نے دھول چٹادی۔

مرکزی کابینہ کے جن ۱۳ ممبران نے الیکشن میں حصّہ لیا، ان میں سے ہارنے والے ۵ وزرا ــ ایس کے پاٹل (ریلوے) سبرامنیم (خوراک)، شچین چودھری (خزانہ)، سنجیویا (صنعت) اور منوبھائی شاہ (تجارت) ہیں۔

ریاستی سطح کے جو وزیر اور ۱۶ نائب وزیر ہارے ہیں ان شہسواروں کے اسمائے گرامی ہیں۔ راج بہادر (اطلاعات ونشریات)، مہرچند کھنہ (بحالی ومکانات)، شاماس (دناعی پیداوار)، مشر (صنعت)، تربھون نارائن سنگھ (سپات)، الگیسن (پٹرولیم)، علاوہ بریں ہارنے والے نائب وزرا میں پیش پیش ہیں ــ شام ناتھ (ریلوے)، شاہ نواز خان (محنت)، آنسہ سوندرم رام چندرم (تعلیم)، پرمنیند شیکھر سکر (داخلہ)، احمد (پٹرولیم) شیام دھر مشر (خوراک) اور آنسہ چندر شیکھر (سماج کلیان)۔

کتنا نہ ہوتا کہ اگر مرکزی کابینہ کے ریاستی وزیر، جیسے وزیر خارجہ ایم سی چھاگلہ اور وزیر قانون پاٹھک بھی ان انتخابات میں حصّہ لیتے تو ان کے ساتھ کیا درپیش آتا۔ شاید تب ہارنے والوں کی تعداد جیتنے والوں سے کچھ زیادہ ہی رہتی۔

نئی لوک سبھا میں اگرچہ ایک بار پھر سے کانگریس کو اکثریت حاصل ہوگئی ہے لیکن اس بار یہ اکثریت اتنی کم ہے کہ کانگریس برسر اقتدار آکر بھی من مانی نہیں کرسکتی۔ اور کچھ نہیں تو یہ تو لازمی ہے کہ وہ آئین میں کوئی ردّو بدل نہیں کرسکتی۔ کانگریس کو اب پوری پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت بھی نہیں ملی، رہی سہی کسر راجیہ سبھا کے اگلے ضمنی انتخابات میں نکل جائے گی، جب قطعی طور پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مخالفین راجیہ سبھا میں پہنچ جائیں گے۔

آئین میں ترمیم کرنے کا مسئلہ اب ایک اور وجہ سے بھی اہم ہوگیا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق آئین کے کسی حصّہ میں پوری پارلیمنٹ بھی اب کوئی ترمیم نہیں کرسکتی۔

یہ حصّہ آئین کے شروع میں دئے گئے شہریوں کے بنیادی حقوق کا ہے۔

سپریم کورٹ نے شہریوں کے ان بنیادی حقوق میں کچھ پرانی ترمیموں کے ضمن میں فیصلہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ اب تک سے پہلے ان حقوق پر کچھ پیش بندیاں لگانے والی جو ترامیم ہو چکی ہیں وہ تو بدستور رہیں گی لیکن آئندہ مستقبل قریب میں ان میں کوئی نئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ اس طرح آئین میں دئے گئے شہریوں کے بنیادی حقوق اب خود پارلیمنٹ کی بھی دسترس سے باہر نکل گئے ہیں۔

۱۹۶۲ کے عام انتخابات میں لوک سبھا کی کل ۴۹۴ جگہوں کے لئے الیکشن ہوا تھا اور ان میں سے ۳۵۸ سیٹیں لے گئی تھی۔ یہ تعداد بعد میں بڑھ کر نئے انتخابات سے ٹھیک پہلے ۳۶۴ تھی۔ لیکن اس بار ۵۱۱ ممبران کی لوک سبھا میں کانگریس کو صرف ۲۸۲ سیٹیں ہی دستیاب ہو سکی ہیں یعنی جہاں پچھلی لوک سبھا میں کانگریس کو صرف اکثریت ملی تھی، وہاں اس بار تقریباً ۵۰ ممبران کی ہی اکثریت ملی ہے۔ جو کچھ بھی نہیں۔ اس کے برعکس صرف ایک حزبِ مخالف پرجا سوشلسٹ پارٹی کو چھوڑ کر باقی تمام مخالف پارٹیوں نے اپنی پوزیشن پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط کر لی ہے۔

۱۹۶۲ کے الیکشن کے بعد مخالف پارٹیوں کی تفصیل اس طرح تھی — کمیونسٹ (ایک گروپ) ۲۹، سوتنتر پارٹی ۱۸، جن سنگھ ۱۴، پرجا سوشلسٹ پارٹی ۱۲، دوسری پارٹیاں اور آزاد امیدوار ۶۰۔

یہ تفصیل حالیہ انتخابات سے پیشتر اس طرح تھی — سوتنتر پارٹی ۲۲، کمیونسٹ (دائیں بازو) ۳۴، جن سنگھ ۱۴، کمیونسٹ (بائیں بازو) ۱۱، سنیکت سوشلسٹ پارٹی ۱۱، پرجا سوشلسٹ پارٹی ۹، دراوڑ منیتر کڑگم ۸، دوسری پارٹیاں اور آزاد امیدوار ۲۹ اس کے علاوہ ۱۹ جگہیں مرجانے والے اور استعفیٰ دینے والوں کے باعث خالی تھیں۔

اب نئے انتخابات کے بعد پوزیشن یہ ہے سوتنتر ۴۳، جن سنگھ ۳۵، دراوڑ منیتر کڑگم ۲۵، سنیکت سوشلسٹ پارٹی ۲۳، کمیونسٹ (دائیں بازو) ۲۱، کمیونسٹ (بائیں بازو) ۱۹، پرجا سوشلسٹ پارٹی ۱۰، دوسری پارٹیاں و آزاد امیدوار ۴۸۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مخالف پارٹیوں میں سے سوتنتر پارٹی کو پہلے کی نسبت دگنی جگہیں اور جن سنگھ کو پہلے سے تگنی، سنیکت سوشلسٹ پارٹی کو بھی دگنی سے زیادہ سیٹیں حاصل ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں ۱۹۶۲ کے انتخابات کے بعد کثیر التعداد مخالف پارٹی کی جگہ ۲۹ افراد پر مشتمل ایک گروپ کمیونسٹ پارٹی نے لی تھی، وہاں اس بار یہ جگہ ۴۳ ممبران والی سوتنتر پارٹی کو ملی ہے دوسرا نمبر ۳۵ افراد پر مشتمل جن سنگھ پارٹی کا ہے۔ جب کہ کمیونسٹ پارٹی کل ملا کر پہلے کے مقابلے میں ۴۰ جگہیں حاصل کر لینے کے باوجود اختلاف کے باعث پانچویں اور چھٹے نمبر پر آگئی ہے۔ اگر وہ ایک پارٹی کی شکل میں کام کرے تو بھی اس کا نمبر سوتنتر پارٹی کے بعد ہی آپائے گا۔

اس طرح نئی لوک سبھا میں بڑی مخالف پارٹی کا کردار سوتنتر پارٹی ادا کرے گی اور چوں کہ اس پارٹی کا نظریہ عموماً جن سنگھ سے مطابقت رکھتا ہے اس لئے مالی معاملات میں دونوں پارٹیوں کی کل تعداد (کچھ دوسری پارٹیوں اور آزاد امیدواروں کے مل جانے سے) ۱۰۰ سے بھی زیادہ رہے گی۔ جب کہ ان کے مقابلے میں دونوں طرح کے کمیونسٹ صرف ۴۰ ہی ہوں گے۔ (۳) پوزیشن کو ہم اس طرح بھی ظاہر کر سکتے ہیں کہ حالیہ انتخابات سے جہاں کل ہند سطح پر کانگریس کی اکثریت پہلے کے مقابلے آدھے سے بھی کم رہ گئی ہے

...الیہ انتخابات نے ظاہر کر دیا ہے کہ کانگریس کے بائیکاٹ ... صورت میں عوام کا زیادہ رجحان نام نہاد دائیں بازو کی طرف ہے۔

...ان مخالف پارٹیوں میں نسبتاً زیادہ جگہیں سوتنتر ...رٹی اور جن سنگھ کو ملی ہیں نہ کہ کمیونسٹ ...رٹی کو۔ اس کا مطلب یہ ہے کانگریس کے ...ئیکاٹ کی صورت میں عوام کا زیادہ رجحان ...م نہاد دائیں بازو کی طرف ہوا ہے نہ کہ بائیں ...زو کی طرف۔ کل ملا کر ملک دائیں بازو کے ...رگوں کی طرف زیادہ جھکا ہے اس کا اثراب ...رکز میں کم اکثریت حاصل کرنے والی نئی کانگریس ...سرکار کی مجوزہ پالیسیوں پر یقیناً ہی پڑنا چاہیے ...ہ پڑے تو یہ خود کانگریس کے لئے نقصان دہ ...ثابت ہوگا

لیکن کانگریس کی اصلی اور کمر توڑ ہار تو ...صوبوں میں ہوئی ہے۔ ۱۶ صوبوں میں سے ۸ ...میں عوام نے اسے بالکل پسپا کر دیا یہ صوبے ...ہیں — پنجاب، اترپردیش، بہار، بنگال، اڑیسہ ...راجستھان، مدراس اور کیرل۔ ان میں سے پنجاب ...بہار، بنگال اور مدراس وغیرہ چار صوبوں کے ...وزراء اعلیٰ اور قریب قریب سب ہی صوبوں ...کے بیسیوں وزرا اور نائب وزرا انتخابات کی ...سولی پر چڑھ گئے۔ بہار کے وزیر اعلیٰ جناب ...کرشن دبتہ سہائے کی تو ضمانت تک ضبط ہو گئی۔ جہاں وزیر اعلیٰ جیتے، وہاں پردیش کانگریس ...کے صدر دلیا؟ دوسرے عہدیداران پٹ گئے۔ ...کئی ہی صبائی نوابوں کا تو بالکل صفایا ہی ہو گیا۔ ...اترپردیش کے کملاپتی ترپاٹھی اور اڑیسہ کے ...بیجو پٹنائک اس ضمن میں دو خاص مثالیں ہیں۔

دو صوبے — مدراس و کیرل۔ یہ کانگریس ...کے ہاتھ سے بالکل ہی نکل گئے۔ کیرل میں تو ...کانگریس کا ایک دم صفایا ہی ہو گیا۔ و ان کی ...مان سبھا میں اسے ایک نمایاں اپوزیشن پارٹی کا بھی مقام نہ مل سکا۔ ۱۳۳ افراد کے ہاؤس میں کانگریس کے صرف ۹ ہی ممبر گھس پائے، جو اپنے کو مخالف پارٹی تسلیم کرانے تک کو تیار نہیں۔ ان میں سے چھ ممبران کو اب محض ایک آزاد پارٹی کی صورت میں بیٹھنا ہوگا جب کہ حکومت کی باگ ڈور ۱۱۷ ممبران کے کمیونسٹ اتحاد دی مورچے کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ وزیر اعلیٰ پہلے ہیں ۱۹۶۷ کی کمزور کمیونسٹ سرکار کے سربراہ مسٹر نمبودری پاد ہ لیکن اس بار ان کی کمیونسٹ سرکار کافی مضبوط ہوگی۔

مدراس میں دراوڑ منیترکڑگم کو حیرت انگیز کامیابی ملی۔ اس پارٹی نے مرکز میں مدراس کے تمام وزیروں کا صفایا کیا اور لوک سبھا میں مدراس کی ۳۹ سیٹوں میں ان تمام ۲۴ جگہوں پر قبضہ کر لیا جن کے لئے اس نے اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ اب مدراس میں اس پارٹی کی حکومت ہے۔ اس پارٹی کا نعرہ تھا ہندی کی مخالفت۔ اس لئے مدراس میں اس کے برسر اقتدار آنے سے ہندی کو پورے بھارت کی قومی زبان بنانے اور صوبائی کام کاج کی زبان بنانے کے پروگرام پر یقیناً ہی کچھ اثر پڑے گا۔ حقیقت میں یہ صرف مدراس کی ہی پارٹی ہے اور کسی دوسرے صوبے میں اس کا کوئی نام و نشان بھی نہیں ہے۔

کانگریس کو اکثریت نہ دینے والے باقی چھ صوبوں میں سے اگرچہ ۵ میں وہ سب سے بڑی کانگریس پارٹی کی شکل میں سامنے آئے ہیں لیکن کچھ دوسری پارٹیوں کے ساتھ ملا کر سرکار بنانے کی حیثیت میں وہ صرف راجستھان اور اترپردیش میں ہی ہیں۔ پنجاب میں سنت گروپ

اکالیوں و جن سنگھ اور کمیونسٹوں کے مشترکہ مورچے نے سرکار بنائی ہے۔

باقی ۴ صوبوں ـــ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں غیر کانگریسی سرکاریں بن گئی ہیں۔ بنگال میں فی الحال لیفٹسٹ سمیت ۱۴ آزاد پارٹیوں کی سرکار بنی ہے جس کے سربراہ باغی بنگلا کانگریس کے بانی و سابق صوبائی کانگریس کے صدر، مسٹر اجے مکھرجی ہیں۔

اڑیسہ میں سب سے بڑی پارٹی کی جگہ بی سوتنتر پارٹی نے اور کانگریس کا نمبر دوسرا ہے۔ اسی لئے سوتنتر پارٹی و جن کانگریس کی لیڈر شپ میں ملی جلی سرکار بنی ہے۔ بہار میں بھی جہاں کانگریس سب سے بڑی پارٹی ہے اور دوسرے نمبر پر سنیکت سوشلسٹ پارٹی ہے۔ قریب قریب یہی پوزیشن سامنے آئی وہاں سنیکت سوشلسٹ پارٹی، سوتنتر، کمیونسٹ اور جن سنگھ وغیرہ کی ملی جلی سرکار بنی۔

باقی آٹھ صوبوں میں جہاں کانگریس کو اس بار بھی کم و بیش اکثریت ملی ہے، سب سے زیادہ حیرت انگیز نتیجے سامنے آئے مدھیہ پردیش کے۔ خود کانگریسیوں کو بھی وہاں کامیابی کی امید نہیں تھی لیکن کہا جاتا ہے کہ وزیر اعلیٰ مسٹر مشر نے انتخابات سے کچھ پہلے غریب کسانوں کا لگان وغیرہ معاف کرنے کے جو قدم اٹھائے۔ ان کا امید افزا اثر پڑا۔ نتیجے کے طور پر کانگریس بازی لے گئی۔ کچھ بھی ہو۔ مدھیہ پردیش کے نتائج سے مسٹر مشر کی ساکھ بہت اونچی ہو گئی ہے اور اس لحاظ سے مرکزی امور میں ان کی دخل اندازی بھی پہلے سے زیادہ ہو گی۔

دوسرے کانگریسی لیڈر جن کی ساکھ موجودہ انتخابات کے بعد اونچی ہوئی ہے، وزیر داخلہ مسٹر چوان ہیں۔ اُن کے مہاراشٹر میں نہ صرف کانگریس نے دوسرے صوبوں کی نسبت کہیں زیادہ اکثریت حاصل کی بلکہ وہ خود بھی

پیسے والا تو ہر جگہ چاندی کے چھپّے
لیکن غریب کی کون سُنے۔ اِس لئے

عوام کے زیادہ ووٹ لے کر لوک سبھا کے لئے منتخب ہو گئے۔

براہ راست مرکز کے تحت صوبوں میں سے دلّی میں کانگریس کا جیسا صفایا ہوا، اُس سے اس کے ہم پلّہ باقی تینوں صوبوں ـــ تری پورا، منی پور و ہماچل پردیش سے میں اُس کی تمام کامیابی کی چمک ماند پڑ گئی۔ دلّی میں جن سنگھ نے کانگریس کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے اور یہ پوزیشن دِلّی کے مرکزی راج دھانی ہونے کے ناطے جن سنگھ کی عزت میں چار چاند لگانے والی بات بن گئی ہے۔

جن سنگھ نے دِلّی کی لوک سبھا کی سیٹوں میں سے ۶ پر اور کارپوریشن و میٹرو پالیٹن کاؤنسل، دونوں پر قبضہ کیا ہے اور اس میٹرو پالیٹن کو چاہے کابینہ بنانے کے مجوزہ اختیارات نہ ملے ہوں لیکن اس پر اور دلّی لوک سبھا کی سیٹوں پر جن سنگھ کا اقتدار رہنے سے پورے ملک میں اس پارٹی کی ساکھ یقیناً ہی بہت اُبھری ہو گی۔ اس وقت بھی، تازہ انتخابی نتائج کے پیش نظر وہ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں جہاں وہ پہلے ہی نمایاں مخالف پارٹی تھی اب پہلے سے بھی دگنی طاقت ور ہو گئی ہے۔ اتر پردیش میں تو جن سنگھ نے کمال ہی کر دیا ہے، قریب قریب ۰۰ اجگہوں پر اُس کا قبضہ ہے اور آندھرا، میسور و مہاراشٹر جیسے کچھ دوسرے صوبوں میں بھی جہاں پہلے اس کا کوئی کیبنٹ ممبر نہیں تھا اب اس کے کئی کئی ممبران ہیں۔ یہ تمام باتیں اس پارٹی کی بہت تھوڑے عرصے کی کامیابی اور روز افزوں مقبولیت و اقتدار کے متاثی ہیں۔

ٹاکر یا کسی دوسرے طریقے سے اپنا جائز و ناجائز کام نکال لے جاتا ہے

اُس نے پوشیدہ طور پر رائے دہندگی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔

دوسری دو پارٹیاں جنھوں نے صوبوں میں بھی خاصا نام کمایا ہے، سوتنتر پارٹی اور سنیکت سوشلسٹ پارٹی ہیں۔ پہلی پارٹی نے گجرات اور راجستھان میں خاص کامیابی حاصل کی اور پہلے کی نسبت اپنی تعداد بڑھا کر کانگریس کے بعد دوسرا نمبر حاصل کر لیا ہے جب کہ اڑیسہ میں وہ کانگریس سے بھی اوپر سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں حاوی ہو گئی ہے۔ سنیکت سوشلسٹ پارٹی کو یوں تو سبھی صوبوں میں قابلِ ذکر کامیابی ملی ہے لیکن بہار میں وہ ۶۷ سیٹیں لے کر کانگریس کے بعد دوسرے نمبر پر آگئی ہے۔ اور اتر پردیش میں وہ جن سنگھ کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔

صوبوں کی ودھان سبھاؤں کی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ اُن ۸ صوبوں کے علاوہ جنھوں نے کانگریس کو بالکل ہی رد کر دیا ہے اُن دوسرے صوبوں میں بھی جہاں اُسے ازسرِنو اکثریت حاصل ہوئی ہے صرف مہاراشٹر کو چھوڑ کر ہر جگہ اس کی حالت پہلے سے کمزور ہوئی ہے جب کہ ہر ایک صوبے میں مخالف پارٹیوں کی طاقت بڑھی ہے لوں بھی کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس تناسب میں کانگریس لوک سبھا میں کمزور ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ صوبوں میں کمزور ہوئی۔ اصلیت یہ ہے کہ اگر صوبوں کی صحیح پوزیشن مرکز میں ہوتی تو کانگریس کو لوک سبھا میں بھی اکثریت نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن ووٹران کی کافی زیادہ تعداد کی اب بھی یہ عادت سی ہے کہ ودھان سبھا کے ووٹ کانگریس کی مخالفت میں ڈالنے پر بھی لوک سبھا کا ووٹ اُس کے حق میں ڈال دیتے ہیں براہِ راست کانگریس کو ووٹ دینے والے اقلیتی فرقے نے تو خیر دونوں ہی ووٹ اس کے حق میں ڈالے۔ اسی سے لوک سبھا میں کانگریس کو اکثریت مل گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ مرکز میں اس نقلی اکثریت کے باوجود کانگریس کی جو زبردست ہار ہوئی ہے، اس کے اصلی اسباب کیا تھے اور ان سے آگے کے لئے کیا نتیجے نکالے جائیں۔

کانگریس کی موجودہ ہار کا پہلا اور سب سے بڑا سبب ہے صرف دیش بھر کی مہنگائی اور خوراک کی تنگی جس سے ملک کا تمام غریب اور متوسط طبقہ بری طرح پسا ہوا ہے۔ حالیہ روپے کی تخفیف سے اس مہنگائی میں اور تیزی آئی ہے اس قدم سے خود سرکار کی ساکھ پر جو بُرا اثر پڑا ہے وہ الگ ہے۔ اناج کی کمی کے لئے تو ملک کے اکثر علاقوں پر مسلط خشک سالی کو بھی الزام دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس خشک سالی کو دور کرنے کے لئے صوبائی سرکاروں کو پہلے سے آبپاشی وغیرہ کا مناسب انتظام کرنا تھا، لیکن مہنگائی کے لئے تو براہ راست سرکار کی وہ چند پالیسیاں ہی واحد ذمہ دار ہیں، جن پر وہ پچھلے ۲۰ برس سے نام نہاد منصوبہ بند معاشرتی ترقی پر عمل کرتی آ رہی ہے۔

عوام ان پالیسیوں کی تکنیکی تفصیل کو چاہے نہ سمجھیں، لیکن وہ اپنی آنکھوں سے اتنا تو دیکھتے ہی ہیں کہ کانگریس اور اُس کی سرکاروں سے رابطہ رکھنے والے کچھ خاص لوگ، بڑی تیزی سے مالامال ہوتے جا رہے ہیں، اور عوام

ملک ہو دن بدن غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اس سے وہ بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کانگریس کی پالیسیاں اور منصوبے وغیرہ صرف بڑے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہی ہیں اور مہنگائی اسی فائدے کو ان بڑے لوگوں تک پہنچانے کا صرف ایک وسیلہ ہے۔ اسی صحیح یا غلط سمجھ سے عام غریب لوگ کانگریس کے خلاف ہو گئے۔ ساتھ ہی اُن میں پہلے سے کچھ زیادہ سیاسی بیداری بھی آ گئی جس سے انھوں نے اس بار اپنے ووٹ کا کچھ زیادہ استعمال کیا، جب کہ آسودہ حال لوگوں نے شاید کانگریس کی فتح کے قبل از وقت تصور کے تحت اس بار اپنے ووٹ کا کم استعمال کیا۔

مہنگائی کا دوسرا نتیجہ سرکار کے نچلے طبقے کے ملازمین اور پولیس وغیرہ تک میں لگاتار بڑھتی ہوئی بے اطمینانی ہے۔ اس سلسلے میں جو تحریکیں سامنے آئیں اور ان کے جو نتائج سامنے آئے اُن سے یہ انتشار کم ہونے کی بجائے اور زیادہ بڑھا۔ کل ملا کر نچلے درجوں کے اکثر سب ہی ملازمین، پولیس والے اور ماسٹر صاحبان وغیرہ کانگریس اور اس کی سرکاروں کے سخت مخالف ہو گئے۔ ان لوگوں نے عوام کے ساتھ اپنے براہ راست اور روزانہ کے تعلقات کی وجہ سے مخالف پارٹیوں سے بھی زیادہ کانگریس کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ کہیں کہیں تو سیدھے الیکشن میں بھی کانگریس کے خلاف کام کیا اور اس کے امیدواروں کو ہرانے میں ہاتھ بٹایا۔

تیسرا سبب جو زیادہ مستقل نوعیت کا تھا سرکاری حلقوں میں بڑھتی ہوئی وہ بدعنوانیاں اور رشوت ستانی ہے جس سے عام لوگوں کا جینا ناک میں دم رہتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ پیسے والے تو ہر جگہ چاندی کے جوتے لگا کر یا کسی

دوسرے [illegible]
جاتا ہے لیکن غریب کے لئے ہر دروازہ بند ہے۔ اس لئے جو ایک دروازہ غریب سے غریب کے لئے بھی کھلا ہوا تھا یعنی پوشیدہ طور پر رائے دہندگی کرنے کا دروازہ اُس غریب نے استعمال کیا اور نتیجے کے طور پر کتنے ہی علاقوں میں کانگریس کا تختہ اُلٹ دیا۔

ایک اور سبب کانگریسی مدبروں کا غرور اور دھاندلی بھی تھا۔ کانگریسیوں کو پچھلے ۲۰ برس کے اقتدار سے اپنی دھاک اور کامیابی کا اتنا یقین اور گھمنڈ ہو گیا تھا کہ وہ عام حاجت مند کے ساتھ بات تک کرنا خلافِ شان سمجھنے لگے تھے۔ یہی نہیں، وہ ہر جگہ من مانی کرتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ہر شہر اور ضلع میں اپنے غنڈے پال رکھے تھے بلکہ وہ خود کو بھی بہت بڑے شہدے غنڈے اور دادا سمجھتے تھے۔ کانگریس پارٹی میں خاص طور پر نیچے سے اوپر تک ایسی ہی دادا گیری کا دور دورہ تھا۔ صوبوں کے ذمہ دار وزیر تک غنڈوں کو شہ دیتے تھے اور کسی پابند قانون، تھانے دار کے ہاتھوں ان میں سے کسی کے پکڑے جانے پر ٹیلی فون پر ہی اسے رہا کرا دیتے تھے۔ ان سب باتوں سے عام لوگ ان کانگریسی گرو گھنٹالوں اور داداؤں کو خاص طور سے عمدہ سبق سکھانے پر تلے بیٹھے تھے اسی نقطۂ نظر کا اثر یہ ہوا کہ مرکز اور صوبوں میں کتنے ہی کانگریسی داداؤں کا صفایا ہو گیا۔ جو اِکا دُکا بچ گیا ہے اس کی بھی خیر نہیں ہے۔

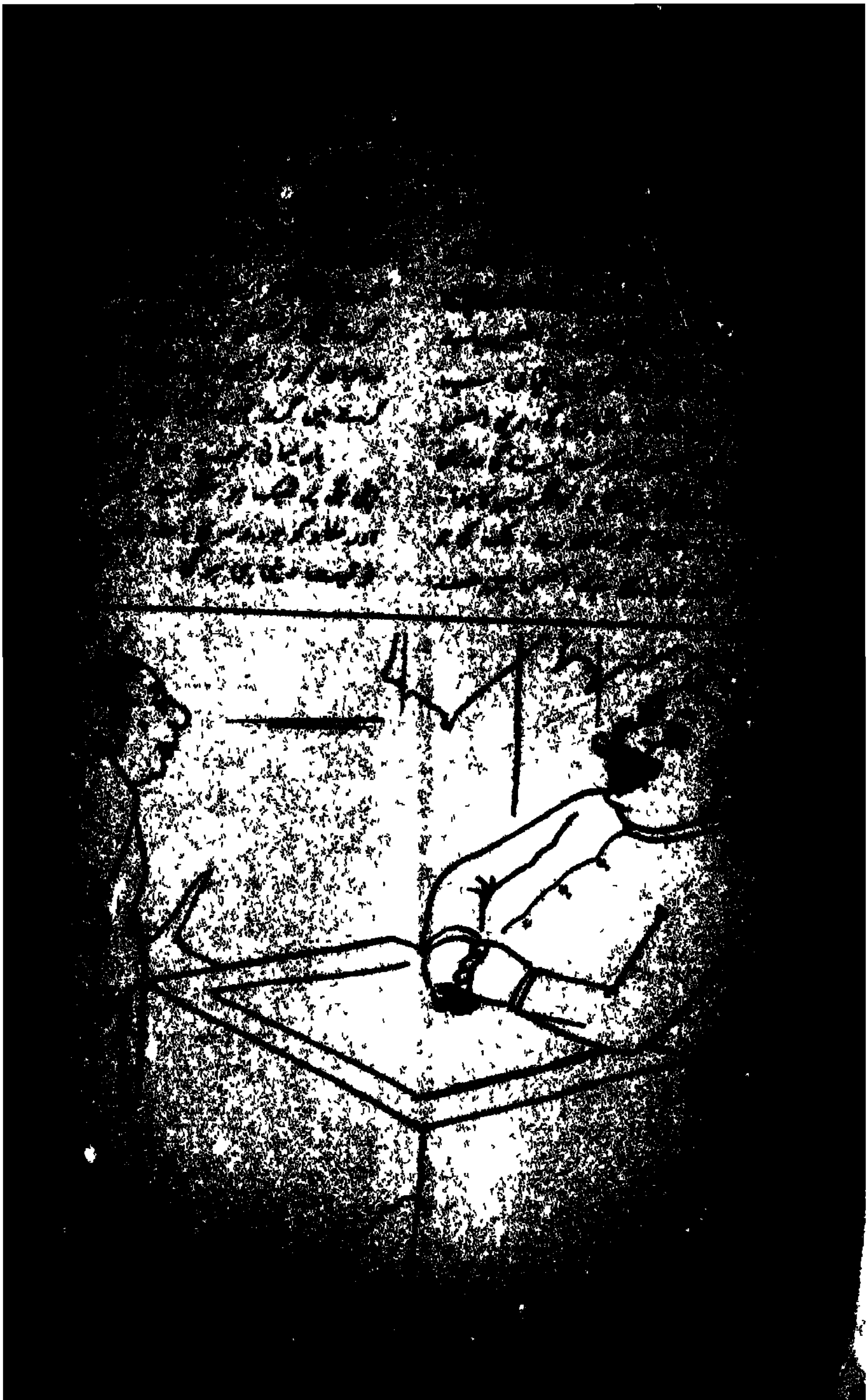
پانچواں سبب خود کانگریسیوں کی اندرونی گُٹ بندی اور انتخابات میں آپسی فساد ہے۔ کانگریسی ٹکٹ نہ ملنے یا کسی اور وجہ سے الگ ہو کر آزاد امیدواروں کی شکل میں لڑنے والوں کی پوزیشن تو پھر بھی مروجہ سیاست کے پیشِ نظر غلط نہیں تھی، لیکن کانگریسی امیدواروں [illegible]
[illegible]

[illegible] رائے [illegible] رجحان —
[illegible] بہت سے کانگریسی امیدوار [illegible] سے ہار گئے جبکہ ان کی کامیابی [illegible] امید تھی۔ یہ صورت حال یوں تو ہر [illegible] لیکن اس کے دو خاص مرکز تھے [illegible] اور بہار۔ ان دونوں صوبوں میں [illegible] خاص طور پر اپنی گٹ بندی کی وجہ سے [illegible] عوام کو تھوڑی سی بیداری سے اٹھاتیں۔ ان دو صوبوں میں، زیادہ تر عوام کمزور اور جاہل ہیں۔ لگتا ہے یہ دونوں خوبیاں [illegible] بھاشا کے ساتھ بھی نکل گئیں۔

ایک چھٹا اور آخری سبب یہ تھا کہ اس [illegible] مخالف پارٹیوں نے صرف کئی صوبوں میں اپنے ووٹ بٹنے نہیں دیئے بلکہ زیادہ تر [illegible] پر کانگریس کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور بہتر کردار کے امیدوار بھی کھڑے کئے [illegible] میں عام لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مخالف پارٹیوں کی بیان کردہ پالیسیوں سے بھی زیادہ ان کے امیدواروں کو پسند کیا۔ ضرور یہی بات کانگریس پر بھی صادق آتی ہے۔ جو بھی کانگریسی کامیاب ہوئے ہیں وہ زیادہ تر اپنی مقامی شہرت یا ذاتی اثر کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں نہ کہ اپنی پارٹی کی صحیح یا غلط پالیسیوں کی وجہ سے۔ اسی نظریئے سے ان انتخابات کو زیادہ تر لوگوں کی رسہ کشی کہا جا سکتا ہے حالاں کہ ہر ایک پارٹی کی پالیسیوں نے بھی کچھ نہ کچھ کارگزاری ضرور انجام دی ہے۔ خاص طور پر کانگریس کے نظریات نے جو منفی طور پر کئی [illegible] میں اس ہار کا سبب بنے ہیں جب کہ مخالف پارٹیوں کی پالیسیوں کا ابھی آغاز ہی باقی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بہار و مدراس نے کانگریس کی پالیسیوں کو ترک کر دیا ہے لیکن ابھی کسی دوسری مخالف پارٹیوں کی پالیسیوں کو ماننے کا اعلان [illegible] سے نہیں کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ الیکشن کے ان نتیجوں اور ان کے اسباب سے آئندہ کے لئے کیا سبق لیا جا سکتا ہے۔ ایک بات صاف ہے کہ اب اکثر سب ہی پارٹیوں کو، کانگریسی اور کیا آزاد، ملک کے کسی نہ کسی حصے میں حکومت کرنے کا سلیقہ آ جائے گا۔ اس لئے ان حالات کا ان کی مرکزی [illegible] باوجود ملک کی کارروائیوں اور پارلیمنٹ [illegible] ان کے کردار پر اچھا اثر پڑے گا۔ اب پارٹی کو مرکز یا صوبوں میں سرکار کی مخالفت کرتے ہوئے سوچنا ہوگا کہ کسی دوسرے صوبے میں خود اس کی سرکار بھی ہے، جس کی نکتہ چینی کی جا سکتی ہے۔ اس بات کا خاطر خواہ اثر یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک پارٹی میں پہلے سے کچھ زیادہ سنجیدگی آ جائے۔ سرکاروں کی تنقید تعمیری پہلوؤں پر ہونی چاہیے۔ مرکزی اور تمام صوبائی سرکاریں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کام کر دکھانے کی مقابلہ بازی میں مشغول ہو جائیں۔ لیکن اسی صورت حال کا ایک برا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی کچھ کام نہ ہو سکے اور سب ہی پارٹیاں صرف ایک دوسرے کی سرکار میں کیڑا نکالنے کے فضول اور نقصان دہ اقدامات [illegible]

[illegible] کانگریسی امیدوار جیتے ہیں وہ زیادہ تر اپنی مقامی شہرت [illegible] سے ہیں نہ کہ اپنی پارٹی کی صحیح یا غلط پالیسیوں کی وجہ سے



بچوں کے منہ سے

مُنّا کو ڈیڈی بہت پسند ہیں۔ بات بھی ایسی ہی ہے۔ ڈیڈی مُنّا کو روزانہ چاکلیٹ لایا کرتے ہیں۔ جب بھی ڈیڈی اُس کو چاکلیٹ لاتے وہ ممّی کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ ایک دن جب کہ مُنّا ڈیڈی کے لائے ہوئے چاکلیٹ کھا رہا تھا۔ ممّی نے پوچھا۔

"کیوں مُنّا جب تمہارے ڈیڈی تم کو چاکلیٹ دیتے ہیں۔ تو تم مجھ کو بھول جاتے ہو۔؟"

مُنّا جھٹ سے بولا "آپ بھی مجھے کوئی چیز دیجئے میں ڈیڈی کو بھول جاؤں گا۔"

—— عبدالعلیم صدیقی۔ یادگیر

ایک آدمی نے اپنے بیٹے کی سکول رپورٹ دیکھتے ہوئے ڈانٹا "تم اس طرح ہر سال کلاس میں پیچھے رہے تو آخر بڑے ہوکر کیا بنو گے؟"

"رکشا چلاؤں گا" لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

—— ایس ۔ ایم رفیق حسن۔ پٹنہ

ٹیچر نے ایک مرتبہ سکول کے طالب علم خالد سے پوچھا کہ جلال الدین اکبر بادشاہ کس عمر میں [illegible] خالد نے جواب دیا "ماسٹر [illegible]

"صاحب آج ہی آگیا نے نصیحت کی تھی کہ اچھے بچے کبھی بھی بڑوں کو جواب نہیں دیتے۔"

—— کے. زاہد۔ تسار پور

•

مُنّا ریڈیو بجا رہا تھا۔ میں نے اسے منع کیا اور کہا "مُنّا فضول بجلی خرچ نہ کرو دیکھو نا اگلے ماہ بل کتنا زیادہ آگیا ہے۔"

اس نے فوراً کہا "اسی وجہ سے تو میں سیلون لگا رہا ہوں تاکہ وہیں کی بجلی خرچ ہو۔"

—— شکیل احمد، جالوزی بہار

•

میرا بھائی جس کی عمر ۸ برس ہے سلیٹ پر سوال حل کر رہا تھا میں نے اُس سے پوچھا "تالاب میں ۴۵ مینڈھک ہیں ان میں سے ۱۱ مرگئے۔ باقی کتنے بچے؟"

وہ جلدی سے بولا "پینتالیس۔"

"کیسے؟" میں نے پُوچھا تو وہ بولا "تالاب میں جو مینڈھک مرے وہ بھی تو اسی میں رہے ہیں۔ اس لئے پینتالیس مینڈھک ہی رہے۔"

—— سیّد منصور علی۔ سرونج

میرے چھوٹے بھائی نے ایک روز مجھ سے کہا "بھائی جان جو باجہ آپ نے مجھے دیا تھا وہ بہت ہی عمدہ تحفہ ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا "واہ! یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ وہ تمہیں اتنا پسند آیا۔" اُس نے بہت ہی بھولے پن سے کہا "بھائی جان جب بھی میں اُسے بجاتا ہوں، امّی دس پیسے دے کر مجھے باہر بھیج دیتی ہیں۔"

—— شکیل احمد خان دربھنگہ (بہار)

> اس فیچر کے لئے اپنے تجربے بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
>
> —— ایڈیٹر

مقالہ • آشا رانی وہرا

تعلیم میں ملاوٹ

میں نے پڑھا تھا کہ تعلیم ایک ایسی قومی غذا ہے جس میں ملاوٹ برداشت نہیں کی جانی چاہئے۔

ہاں، ملاوٹ ہی تو ہے سرکاری بڑے سکول، چھوٹے سکول، ٹین کے چھپروں اور خیموں میں چلنے والے سرکاری سکول، گلی گلی کوچے کوچے میں کھلی ہوئی تعلیم کی دکانیں جو کم پست معیار اور گھٹیا درجہ کی ہیں اور گنتی کے پبلک سکول، جھونپڑیاں، کچے پکے چھوٹے مکان اور بیچ وسط میں ان سب پر طنز کرتی ہوئی قہقہہ زن سربلند عمارتیں ہی زمین و آسمان کے فرق کو نمایاں کرتی ہیں۔

ہماری موجودہ تعلیم کے بارے میں ایک نہایت بدرنگ تصویر پیش کر رہے ہیں یہ سکول [illegible] سے بیش بہا سرمائے، بچوں کا بے پناہ نقصان، قومی ذہانت و علمیت اور کردار کے ساتھ کتنا بدترین مذاق ہے! ماہر تعلیم یک زبان ہو کر اس کی مذمت کر رہے [illegible] ان کی آواز میں آواز ملا کر [illegible]

[illegible] رہے ہیں، سرپرست شکایت کرتے ہیں مگر عملی طور پر سب برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں گویا اس حالت سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کئی بار لا علاج مرض کہہ کر اس دھاندلی کو برداشت کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ مگر کیا اس حالت سے چھٹکارا نہیں مل سکتا؟

موجودہ حالات میں، حکومت کے محدود ذرائع کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم کے فروغ کے زاویۂ نگاہ سے اگر اس لعنت کو لا علاج مرض کی شکل میں تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی انتظام اور نگہداشت سے متعلق چشم پوشی تو ہرگز برداشت نہیں کی جا سکتی۔

ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دئے جانے کے بارے میں منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ 'سکول چلو' مہم کے ہفتے اور پکھواڑے منائے جا رہے ہیں۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۰ تک بھارت کی کل آبادی میں سے ۳۲ فی صد بچے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگیں گے۔ (اور یہ تعداد ۱۴ کروڑ سے زیادہ ہوگی۔) لیکن ان حالات اور انتظام کے برقرار رہتے ہوئے ہم اس تعداد پر فخر کریں!

پبلک سکولوں میں تو عام لوگوں کے لئے 'داخلہ بند' کے بورڈ آویزاں ہیں مگر مقابلے کے امتحانوں اور اعلیٰ ملازمتوں کے انتخاب میں، عموماً وہی لوگ لئے جاتے ہیں جنہوں نے ان سکولوں میں تعلیم و تربیت حاصل کی ہو۔ کیا اس کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسی نوکریاں اور سہولتیں ایک محدود طبقے کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ سکول یا تو اعلیٰ طبقے کے آسودہ حال کنبوں کے بچوں کے لئے ہیں یا پھر ان رہنماؤں کے بچوں کے لئے جو بھارت میں بنیادی تعلیم کے [illegible]

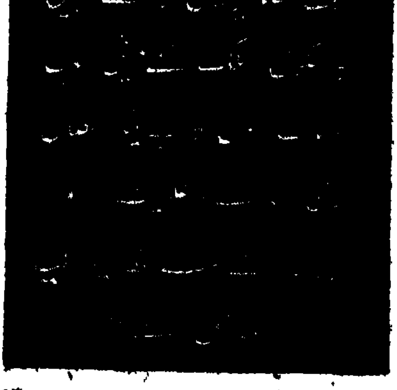
بیڑا اٹھا کر ان بے روزگار معمار تعمیری کرتے
ہتے ہیں۔ ایک سوشلزم کی جانب گامزن ملک
ں عوام کے ساتھ کیسا مذاق ہے یہ؟
سرکاری سکولوں میں بھیڑ بھاڑ ہے۔
انتظامی غلط اخراجات اور ناتجربہ کاری ہے۔
تنخواہ دار استادوں کے ہاتھوں تعلیم اور طلبا
دونوں کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ فقط ٹیوشن
رکھنے والے یا غیر معمولی قابلیت کے مالک طالبعلم
ہی وہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر داخلے میں
بھی دشواری پیش آتی ہے۔ دو دو تین تین
شفٹیں لگتی ہیں، شامیانوں میں جماعتیں لگتی
ہیں۔ کم سے کم سہولیات مہیا کی جاتی ہیں۔
تاہم بھی ضرورت مند طلبا داخلے سے محروم
ہیں۔

قناتوں اور شامیانوں کے سکولوں میں
قدرت کی ستم ظریفی نازل ہوتی ہے۔ کڑکتی
سردی، جھلسانے والی لو، چلچلاتی دھوپ اور
برسات سے پیدا ہوا کیچڑ اور بدبو۔ سال بھر
پریشانی اور برسات میں سکول بند کر دینے
کی نوبت، کیوں کہ کلاسیں جہاں لگتی ہیں وہ
جگہ تالاب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

پرائیویٹ دکانوں کا تو اور بھی بُرا حال
ہے۔ اس پر معرکے کی بات یہ ہے
شہروں میں طلبا کی تعداد کا تین چوتھائی
حصہ ان دکانوں میں جانے کے لئے مجبور
ہے — کوئی دیگر سکولوں میں داخلہ نہ
ملنے کی وجہ سے، کوئی زیادہ فیس
دے کر بہتر تعلیم پانے کے لالچ میں، کوئی
سیجمنٹ کے اخراجات برداشت نہ کر سکنے
کے سبب، کوئی فیل ہو جانے کی صورت
میں ایک یا دو سال بچانے کے لئے اور
کوئی روزگار کے ساتھ پارٹ ٹائم تعلیم جاری رکھنے
کی غرض سے ان دکانوں کا آسرا لیتے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان سکولوں کے منتظمین اور
اور لوگوں کی ملی بھگت سے یہ سب چل رہا
ہے۔ ایک طرف ضرورت ہے، مجبوری ہے،
دوسری جانب اس سے فائدہ اٹھانے اور
پیسہ بٹورنے کی خود غرضی ہے۔ سرکاری پابندیاں
بھی ہیں لیکن برائے نام۔ سرکار کی ناک کے
نیچے کیا کیا دھاندلی چل رہی ہے، اس کے
کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

نام: سپرنگ فیلڈس، نیو سپرنگ فیلڈس،
سمر سائل، اکادمی، آدرش سکول،
گز گز کے دو اور ان میں بھی آٹھ دس کلاسیں۔
کھیلنے کی جگہ — زینہ، تنگ گلیاں اور گندی
نالیاں۔ ایک جگہ میں نے دیکھا۔ نیچے دالان
میں حلوائیوں کے دن بھر گرم رہنے والے
چولہے ہیں اور اوپر دو کمروں میں دلی کی
گرمی میں جھلستے ہوئے چھوٹے بچوں کا
کوئی 'سپرنگ سکول'۔
ایک جگہ سکول میٹرک تک چلتا ہے



اور پرنسپل آٹھویں فیل ہے ۔ ایسی بھی مثالیں ہیں
جو تلاش کرنے پر جا بجا مل جائیں گی ۔ یہ سکول
جب اچھی فیس لیتے ہیں ، اچھے گھروں کے
بچے ان میں پڑھتے ہیں تو پھر ان کے ایسے
پرکشش نام کیوں نہ ہوں! نام کا نفسیاتی اثر
کون نہیں جانتا. اسی لئے تو تعلیم کے معیار
کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اشتہار بازی اتنی بہتر
کی جاتی ہے تو معیار بھی اچھا کیوں نہ ہوگا۔
والدین ان ہی باتوں پر غور کر کے مطمئن ہو
جاتے ہیں. اس کاروباری دور میں ان کے
پاس اتنی فرصت کہاں کہ وہ خود آکر دیکھیں.

معیار کی بات بھی آپ کو بتادیں. ان سکولوں
میں زیادہ تر اُستادوں اور اُستانیوں
کو ۳۰ روپے سے لے کر ۶۰ روپے تک
تنخواہ دی جاتی ہے. اسی لئے یا تو غیر تربیت
یافتہ اور ناقابل معلّم ملتے ہیں یا پھر نوکری کی
تلاش میں پریشان معلّم نوکری نہ ملنے تک
یہاں وقت گزارنے کے لئے چلے آتے ہیں.
تنخواہ کم دی جاتی ہے ، رسید زیادہ کی لی
جاتی ہے۔ کیوں کہ منتظمین کو اسی بنا پر
فیس اور گرانٹس لینی ہوتی ہیں ۔ گرانٹ دیر
سے ملی تو مہینوں تک تنخواہ ندارد اور کم ملی
تو تنخواہ بھی کم کر دی جاتی ہے۔ گرمی کی تعطیلات
ہوتے ہی پرانے معلّموں کی 'چھٹی' اور سکول
کھلتے ہی نئے معلّموں کی بھرتی شروع ہو جاتی ہے
تعطیلات کی تنخواہ کی بچت کو مدِنظر رکھتے ہوئے
ایسا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ پھر پرانے معلّم
ترقی بھی تو مانگتے ہیں ۔
کھیلنے کا میدان نہیں ، لائبریری نہیں،
تعلیم کی سہولیات نہیں. بیٹھنے کے لئے معقول
و مناسب جگہ نہیں. کہیں کہیں تو پاخانہ اور
نل تک نہیں ملیں گے. سکول کے اشتہار
میں لکھا ہوتا ہے : جدید طرز پر تعلیم...

کی تعلیم ... بچوں کی ذہنی ...
زیادہ مناسب ہو تو ... قابلِ معلّم ... اور
جانے کیا کیا!
کچھ بچے ذہین ہوتے ہیں ، کچھ کو
پھر والدین یا بھائی بہن پڑھا لیتے ہیں اور
ٹیچر ماہانہ رپورٹ میں لکھ کر بھیج دیتے
کہ بچہ فلاں فلاں مضامین میں کمزور ہے
توجہ دیجئے) اور کچھ ٹیوشن رکھ لیتے ہیں
باقی بچے طلبا یا تو فیل ہو جاتے ہیں یا رشوت
دے کر اگلی جماعت میں بھیج دیئے جاتے
ہیں۔

اگر ٹیچروں کو نہ بھر پیٹ روٹی ملے



ذ مستقبل کا تحفظ ہی تو وہ ذمہ داری کیوں ا
تاہم پرائیویٹ سکولوں کے غریب ٹیچر
محنت کرتے ہیں. کیوں کہ سکولوں کے
کی جانب سے چھٹی میں نکال دئے جا
کا خوف جو سر پر سوار رہتا ہے. لیکن سر
سکولوں کے ٹیچر اس خوف سے بھی آزاد

ایک پُرلطف بات اور ہے وہ یہ کہ دو
سکولوں میں جہاں آج کل داخلہ
دشواری ہے. ان داخلوں کے ضابطے قائل
ہیں۔ یہ دو اشتہار ملاحظہ فرمائیے

"ٹیوشن سینٹر، ایم سکینڈری، انٹر، بی اے، ایم اے، پربھاکر، ساہتیہ رتن، مہا رتن،... ساہتیہ رتن، مہا بنیادی تعلیمی مرکز...

... امتحان میں فیل ہونے والے طلبا پریشان نہ ہوں، ایک سال ضائع کرنے کی ضرورت نہیں... امتحان بغیر پاس کئے ... میں کامیابی کی گارنٹی۔ نشستیں محدود ہیں، جلدی کریں۔ پتہ..."

اب بتایئے ان طلبا کے بہی خواہ سکولوں سے عوام کی کشش کیوں نہ ہو؟ کچھ بارسوخ (؟) سکولوں کے منتظمین کو تو امتحانات

جان کی امان

ایک سیاسی پارٹی کے نیتا نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے سامعین سے درخواست کی کہ وہ الیکشن لڑنے کے لئے چندہ دیں۔ کچھ لوگ مہربند ڈبے لے کر ہجوم میں گھس گئے۔

جب وہ لوگ واپس آئے تو کسی ڈبے میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ نیتا نے کہا "شکر ہے میرے لوگ تو ڈبوں سمیت زندہ سلامت بچ آئے۔"

پاس کروانے اور جعلی سندیں دلانے میں بھی دسترس حاصل ہے۔ گزشتہ سال بھوپال کا ایک مدیر، دلی کا ایک پرنسپل، ایک ٹیچر اور رجسٹرار کے دفتر کا ایک کلرک یعنی ایک پورا گروہ پکڑا گیا تھا اس گروہ نے طالب علموں کو فی طالب علم چار سو روپے کے حساب سے بغیر امتحان پاس کئے سرٹیفکیٹ دلائے تھے۔ ایک غریب طالب علم کو نصف فیس یعنی دو سو روپے میں سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کرنے پر اس نے رپورٹ کر دی تو سب کا پردہ چاک ہو گیا

امتحانوں میں نقل کروانا، پرچے پہلے بتا دینا، مل ملا کر اور رشوتیں دے کر امتحانوں کے معقول نتائج نکلوا لینا تو عام بات ہے۔ ٹیوشن والے طلبا کو پاس کرانے کے لئے خاص توجہ دی جاتی ہے۔

ایسے سکولوں کی مینیجنگ کمیٹیوں پر گول مال کے مقدمے چلتے ہیں۔ یہاں اساتذہ تنخواہیں نہ ملنے پر بھوک ہڑتال یا توڑ پھوڑ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کمیٹی کے ممبران کے باہمی اختلافات کا شکار ٹیچر اور سٹوڈنٹ دونوں کو بننا پڑتا ہے۔ سکول چلانے کے لئے یا دوسرے حریف سکولوں سے آگے نکلنے کے لئے جائز اور ناجائز حربے آزمائے جاتے ہیں۔ اور اس کے باوجود ایسے سکولوں میں زیر تعلیم طلبا سے با اخلاق، صاحب کردار، باعمل اور ضابطہ ہائے دستور کے پابند بننے کی توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔

لازمی تعلیم کا اطلاق کرنے یا نیشنل سٹوڈنٹ ہیلتھ سکیم کا اجرا کرنے سے پہلے ان موجودہ بدعتوں کا انسداد کیا جانا چاہئے۔ لازمی تعلیم اور مقوی غذا دینا تو بہت بڑی باتیں ہیں۔ اگر ان کے لئے روپے تیار کئے جا سکتے ہیں، اگر تعلیم پر صحیح معنوں میں سنجیدگی سے توجہ دی جا رہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ حکومت باخبر ہوتے ہوئے بھی ان وسیع ترین بدعتوں کا انسداد نہیں کر سکتی؟

ایک طرف تو معلموں کو بہتر تنخواہیں دینے کی تجویز زیر غور ہے، دوسری جانب پرائیویٹ سکولوں کے معلموں کو اس قابل رحم حالت میں رکھا جا رہا ہے۔ زیادہ سکول کھولنے کی تجویز کے ساتھ سکولوں کے معیار اور طرز تعلیم کی اصلاح کو بھی فراموش نہیں کیا جانا چاہئے۔ کیا گرانٹ دیتے وقت حکومت سکول

کے انتظام سے متعلق سخت پابندیاں عائد نہیں
کر سکتی؟ کیا وہ سکولوں کو گریڈوں میں تقسیم
کر کے اسی کے مطابق فیس کی شرح مقرر نہیں کر سکتی
تاکہ غریب والدین کو زیر بار نہ ہونا پڑے؟ کیا
پست معیار کی، غیر صحت مند اور واہیات قسم
کی حامل تعلیم کی ان تجارتی دکانوں کے کھولے
جانے پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی؟
ایک دو صوبوں میں ایسی پابندیاں عائد
کر کے پھر کیوں اٹھا لی گئیں؟ کیا استانیوں
اور اساتذہ کے لئے ضابطۂ اخلاق جیسے قوانین
نہیں بنائے جا سکتے؟ کیا دیہاتوں کی جانب
اساتذہ کو راغب کرنے کے لئے انہیں مزید
سہولتیں فراہم کر کے شہری علاقوں کی بے روزگاری
کے مسئلے کو کسی حد تک حل نہیں کیا جا سکتا؟
کیا سیاسی پارٹیوں اور لیڈران کی طرف سے
تعلیمی شعبوں میں مداخلت بند کرنے کے لئے
موثر قانون سازی نہیں ہو سکتی؟
ان سب اور بیشتر سوالات کے جوابات
تلاش کئے بغیر تعلیم کے فروغ اور تعلیم کی [illegible]
کے کاغذی اعلانات فضول ہیں۔

چلتا ہے

نظم | احمد منیر

چلتا ہے نہیں رکنے کا — بیتا ہے نہیں آنے کا
بیت گیا سو بیت گیا
ہے نہیں پچھتانے کا
چلتا ہے . .

سمجھ دار سوچو تو — جیون سے ہے کتنے دلوں کا
مست پون کے جھونکوں میں / بہتا ہو جیسے تنکا
پر پوچھو کچھ ٹھیک نہیں
اس کے سُر ٹھکانے کا
چلتا ہے . . .

[illegible] نشاط رکو بسا نٹر — جیو، جیو اور جینے دو
منہ کو جھاگ کے چھلکاؤ — پیار کا امرت پینے دو
جگ سے ہے مٹ امرت
پینے اور پلانے
چلتا ہے . .

من کا اک تارا چھیڑو — ناچو، گاؤ، لہراؤ
آج تو اپنا بس ہے — کون نہ جانے کل کیا ہو
ہے کا یہ اڑتا پنچھی
ہاتھ نہیں پھر آنے کا
چلتا ہے . . .



کہانی • رشیدہ خان

اَن داتا

مگر ویران اور بند ہے۔ اور جو اَب صرف ایک یادگار ہے
اس قلعہ میں کبھی ایک دُنیا آباد تھی۔ راجہ
صاحب مع اپنی رانیوں کے یہیں رہا کرتے تھے۔
پُورے قلعہ میں بساطِ سیاست بچھی رہتی تھی۔
آقا سے لے کر نوکر تک اِس بساط پر اپنے اپنے
مہرے چلاتے نظر آتے تھے۔ ایسے جوڑ توڑ چلائے
جاتے تھے کہ عقل دنگ رہ جائے۔
اس قلعہ کے لوگ دو پارٹیوں میں بٹے

دروازہ کھلتے ہی غضبناک راجہ مع اپنے شکاری کتّوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اچانک اُس کی نظر کمرے میں رکھے بڑے صندوق پر پڑی۔ بجلی کی طرح جھپٹ کر اُس نے صندوق کا پٹ کھول دیا اور...

میں نے جب آنکھ کھولی تو یہی سُنا اور سمجھا کہ راجہ اُس شخص کو کہتے ہیں جو شراب پیتا ہے، ریس کھیلتا ہے، عیاشی کرتا ہے اور بڑے بڑے جرائم کر کے بھی جیل نہیں جاتا بلکہ دربار میں بیٹھ اَن (اناج) کھلانے والوں کا گلا کاٹ کر 'اَن داتا' کہلاتا ہے۔ اس کے کپڑے پیرس میں دُھلتے ہیں، شراب فرانس سے آتی ہے، علاج یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹر کرتے ہیں اور اُس کے بچّے لندن میں تعلیم پاتے ہیں۔ اُس کے ریس کے گھوڑے پھل اور میوہ جات کھاتے ہیں اور ان سب اخراجات کا بوجھ بھوکے مفلس اور جاہل عوام کے کاندھوں پر رکھا جاتا ہے۔

ایسے ہی ایک 'اَن داتا' کی سرزمین نہر سنگھ گڑھ میری ننھیال تھی جہاں اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا۔ میں نے وہ شاندار قلعہ اندر سے بھی دیکھا ہے جو ایک پہاڑی پر بنا ہے اور جو اپنے وجود میں ہزاروں داستانیں چھپائے آج بھی کھڑا ہے

ہوئے تھے ایک بیوہ رانیاں اور اُن کے ملازم جو قلعہ کے پچھلے حصّے میں بسے ہوئے تھے اور دوسرے راج بھون کی رانیاں اور اُن کے نوکروں کا ایک لشکر۔

بیوہ رانیاں جو 'داتا' یا 'رانی ماں' کہلاتی تھیں آپس میں بڑے چھوٹے کی دیواروں سے منقسم تھیں۔ وہ رانیاں جو کسی راجہ کی بیٹیاں یا بہنیں تھیں اُن کی جاگیریں مقرر تھیں۔ جو رانیاں جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، اُن کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ اِن جاگیروں اور تنخواہوں میں بھی مرتبے کا خیال رکھا گیا تھا

اِن رانیوں کے علاوہ ایک قسم رانیوں کی اور بھی تھی جنھیں نہ تو رانی کہہ سکتے تھے۔ اور نہ ہی لونڈی۔ اُن کی بہت معمولی تنخواہیں مقرر تھیں۔ قلعہ کی زبان میں اُنھیں 'پاسوان' کہا جاتا تھا۔ پاسوانیں بیاہتا نہیں ہوتی تھیں۔ جو لونڈی راجہ صاحب کی نظر میں مقبول ہو جاتی اس کے پاؤں میں سونے کا ایک کڑا ڈال دیا

جاتا تھا۔ یہ اس [illegible] نشانی تھی کہ اب یہ معمولی لونڈی نہیں رہی بلکہ اسے راجہ صاحب کے بستر تک پہنچنے کا پکا پکا حق حاصل ہو گیا ہے۔

ان سب رانیوں اور داسیوں سے بھی جب راجہ صاحب کا دل بھر جاتا تو پھر وہ ریاست سے باہر تفریح کی غرض سے نکل جاتے تاکہ ریاست کے جھگڑوں سے دُور رہ کر اپنی صحت بحال کر سکیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب راجہ صاحب اپنی صحت کی بحالی کے لئے کشمیر گئے تو وہاں سے ایک معمولی حیثیت کی کشمیری لڑکی کو رانی بنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ سترہ اٹھارہ سال کی یہ کشمیری لڑکی حسن کا ایک نادر نمونہ تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن سے مخمور رہتی تھیں اور گالوں پر ہمیشہ گلاب کھلے رہتے۔

راجہ صاحب بھی اپنی شدہ بدھ سمجھ کے اسی کے ہو رہے۔ ایک سے ایک قیمتی ہیروں اور جواہرات سے رانی کا جسم سجایا۔ اطلس اور کمخواب میں سر سے پیر تک اسے ڈھانک دیا، اشارے پر دوڑنے والے خادموں کی ایک فوج عطا کر دی، کئی گاؤں جاگیر میں مرحمت فرما دیئے۔ محل میں روز ہی کوئی نہ کوئی تفریحی پروگرام رہتا تاکہ اس آزاد پنچھی کا دل پتھر کے اس پنجرے میں گھبرا نہ جائے اور وہ خوش رہے۔

مگر نہ جانے کیوں رانی کا دل نہ ہیرے جواہرات سے خوش ہوتا، نہ ناچ رنگ کی محفلوں میں لگتا اور نہ کنیزوں کے سوانگ بھرنے پر ہنستا۔ وہ اس طرح محل کی ایک ایک بات کو دیکھتی۔ جیسے کوئی گرفتہ ہرنی اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھتی ہے۔ ہاں، اگر

[illegible] وہ کھٹول [illegible]

[illegible] بھری مکتی کے [illegible]

"اب تو میری [illegible] اسی کی طرح ہوگا۔ گورا گورا سا سفید [illegible] کے گالے کی طرح۔

"مُوسی، تجھے وہ کشمیری ملن کا گیت یاد ہے جس کی دُھن "الغوزہ" پر چندر بجایا کرتا تھا؟

"مُوسی، چندر نے قسم کھائی تھی کہ وہ میرے سوا کسی سے . . ." اور مُوسی گھبرا کر

مُوسی کہتی "بیٹی، ایک ہندو عورت تو شوہر کے علاوہ کسی کا دھیان بھی پاپ سمجھتی ہے۔"

اس کے نازک لبوں پر ہاتھ رکھ دیتی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر سمجھاتی۔

"بیٹی پچھلی باتیں بھولنے میں ہی بھلا ہے۔ بچپن تو معصومی کی بات ہے اور ایک ہندو عورت تو اپنے خاوند کے سوا کسی کا دھیان کرنا بھی پاپ سمجھتی ہے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ بھگوان نے تمہیں اتنی بڑی رانی بنا دیا۔ ایسے کیوں کے بھاگ ہوتے ہیں اور پھر راجہ صاحب تمہارا کتنا خیال کرتے ہیں، بھگوان تمہارا سہاگ امر کرے۔"

مگر زبردستی کا سہاگ امر ہونا تو زیادہ دن قائم بھی نہ رہ سکا۔ دو سال کے اندر ہی راجہ صاحب پرلوک سدھار گئے رانی بھرپور حسن و شباب کا ایک چھلکتا ہوا تھی، جیسے بھوگ اور [illegible]



نی ماں کا خطاب قبول کرنا پڑا۔ ساتھ ہی راج
بھون خالی کر کے قلعہ کے پچھلے حصے میں منتقل
ہونا پڑا کیونکہ رسم کے مطابق راج بھون میں
ریاست کا راجہ اور اُس کی رانی ہی رہ سکتے
تھے۔ راجہ کے مرنے کے بعد اُن کا گود لیا
ہوا لڑکا راجہ بن کر راج بھون میں آگیا۔ کہتے
ہیں اِسی وارث نے راجہ صاحب کو کسی طوائف
کے ہاتھوں زہر دلا کر ختم کرا دیا تھا اور پھر طوائف
کو ہزاروں روپے دے کر بھوپال سٹیشن بھجوا
دیا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور اُس کی رفتار نے
[illegible] بھلا دیا کہ کبھی
اس راج بھون میں ایک کشمیری رانی کا راج
تھا جس کا [illegible] کے لئے [illegible] جانے

کیا کیا ہتھکنڈے کھیلا کرتے تھے۔ ملازم اس
کے حکم کو بجا لانے میں ایک دوسرے پر
سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے اور اگر
رانی کسی دن کسی ملازم کا نام لے کر اُس سے کسی
کام کو کہتی تو وہ دن بھر دوسروں سے یہ بات
کہتے نہ تھکتا تھا کہ آج سرکار رانی نے فلاں
کام خاص طور سے مجھ سے کرایا۔

آج یہ سب کچھ صرف ایک خواب تھا۔ راج محل
کی بساطِ سیاست اُلٹ چکی تھی۔ اب اُس کی جگہ نئی
بساط اور نئے مہروں نے لے لی تھی۔ مگر اچانک
ہی ایک واقعہ نے سب کے ذہنوں کو جھنجھوڑ
کر رکھ دیا۔

ایک دن مہاراج صبح سویرے اپنے باغ
میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ ایک
کنیز خاموشی سے آکر پیچھے کھڑی ہوگئی۔ جب

مہاراج کنور سے اس نے آگے بڑھتے ہوئے ان کے چرن چھو کر کہا،
"مہاراج کی جے ہو" اور پھر خاموش کھڑی ہو گئی۔

• •

مہاراج نے سوالیہ نگاہوں سے کنیز کی طرف دیکھا مگر جب وہ بدستور سر جھکائے خاموش رہی تو پوچھا،
"کیا بات ہے؟"
"ان داتا!"
"کیا کہنا چاہتی ہو؟"
"سرکار وہ ... چھوٹی ماں جی نا" لونڈی گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔
"کیوں؟ کیا ہوا چھوٹی رانی ماں کو؟" مہاراج نے فکرمند ہو کر پوچھا۔
"سرکار، میری زبان نہیں کھلتی مگر... آپ کی ریاست کی آن خطرے میں ہے" لونڈی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"صاف صاف کہو، کیا بات ہے؟ ڈرو نہیں، تمہیں کچھ نہ ہوگا۔"
"ان داتا۔ چھوٹی رانی ماں کے پاس رات کو کوئی آدمی...؟"
"خاموش" راجہ نے کڑک کر کہا۔ ان کی بھنویں تن گئیں اور غصہ سے آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ وہ تھوڑی دیر بے چینی سے ٹہلتے رہے پھر کچھ سوچ کر کنیز کے پاس رک گئے۔ جیسے اندر اندر کسی بات کا فیصلہ کر چکے ہوں۔
"اگر یہ بات غلط ہوئی تو؟" انھوں نے کنیز کو مخاطب کیا۔
"ان داتا ہمارے مائی باپ ہیں۔ میری گردن اڑا دیجیے گا۔"
"ہوں۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"
"سرکار، مجھے سنتری نے بتایا تھا کہ وہ کئی دن سے دیکھ رہا ہے کہ قلعے کے پچھلے دروازے سے [illegible] اور گھونگھٹ نکالے محل سے باہر جاتی ہیں اور تین بجے واپس آتی ہیں۔ ان کے منہ پر گھونگھٹ ہوتے ہیں مگر پھر بھی ایک کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مرد ہے۔ سرکار! رات بڑی رانی ماں کے کہنے سے میں نے دروازے پر کان لگا کر سنا تو اندر سے کسی مرد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ ان کے کہنے پر ہی میں آپ کے پاس...!"
"تم جا سکتی ہو" راجہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور لونڈی اس طرح بھاگی جیسے سولی پر چڑھتے چڑھتے ایک دم معافی کا پروانہ مل گیا ہو۔
رات کی تاریکیوں نے قلعہ پر اپنا سایہ ڈال کر اسے ایک ہیبت ناک دیو کی شکل میں بدل دیا تھا۔ سردی غضب کی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں بند آتش دانوں کے پاس بیٹھے آرام کر رہے تھے۔ صرف چھوٹی رانی ماں اس سردی سے بے نیاز کسی سے محو کلام تھی۔
"چندر، آج تو نہ جانے کیوں تمہارے الغوزے پر وہی پرانا ملن کا گیت سننے کو دل چاہ رہا ہے!"
"نہیں کنور، میں یہاں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا جس سے کسی کو شک ہو۔ اپنے دیس پہنچ جانے دو، پھر ملن سیج پر ہی وہ راگ سناؤں گا" چندر نے شرارت سے رانی ماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اور رانی شرما کر اس کے سینے سے لگ گئی پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
"چندر، بھگوان جانے، ہمارے سپنے کبھی پورے بھی ہوں گے یا نہیں۔ میرا دل ڈرتا ہے

آکر اپنے دشمن بھی جاگیں۔ ...
بی آ رہی دیہاتیا، چوکیدار، بندوق رکھے
تا ہوا سنتری، یہ سب ہمیں کیسے نکلنے دیں گے چندا

کے ساتھ اتنی آ ہو اس نہ ہو گی۔
بھگوان جب میں ان سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں آ سکتا ہوں تو تمہیں باہر لے جانے کی بھی مجھ میں ہمت ہے۔ بس دو تین دن کی بات ہے۔ شام آجائے تو پھر بندوبست کروں گا۔ لے، یہ برفی کھا۔ تو شوق سے برفی کھاتی ہے نا۔ آج ایک برفی دکان پر رکھی دیکھ کر مجھے یاد آگیا۔ چندر نے برفی کا دونا آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دھت۔ رہا وہی گنوار کا گنوار۔ ارے مجھے یہاں کون سی برفی کی کمی ہے۔ اتنی کھاتی ہے کہ جی بھر گیا ہے" اب تو رانی کھکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے دانت ہونٹوں پر اس طرح سج گئے جیسے گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنم کے قطرے۔

اچانک ایک گرج دار غصے سے کانپتی آواز نے اس کی ہنسی کا گلا گھونٹ دیا۔

"دروازہ کھولو چھوٹی ماں —— کواڑوں پر مکے برساتی ہوئی آواز پھر گونجی اور رانی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز راجہ کے سوا کسی کی نہیں تھی۔ وہ ایک دم خوف سے زرد پڑ گئی۔ جیسے کسی نے جسم کا خون چوس لیا ہو۔ بڑی مشکل سے بولی "کون ہے؟ لال (بیوہ رانیاں راجہ کو لال کہتی تھیں) ؟"

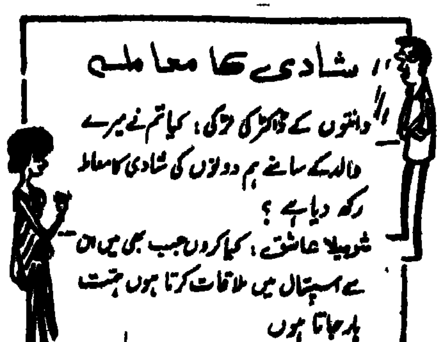
"ہاں، میں دروازہ توڑ دوں گا چھوٹی ماں۔ جلد کھولو۔"

"مگر میں سو رہی ہوں" لرزتی ہوئی آواز کمرے کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔

اور جیسے ہی دروازہ کھلا، غضبناک راجہ اپنے دو شکاری کتوں کے اندر داخل ہوا۔ اس کی متجسس نگاہیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک نظریں کمرے میں رکھے ایک بڑے صندوق پر رک گئیں۔ بجلی کی طرح جھپٹ کر راجہ نے صندوق کا پٹ اٹھایا، اندر سے پڑے گنہگار کو بالوں سے پکڑ کر راجہ نے باہر گھسیٹا اور اپنے شکاری کتوں کی زنجیر چھوڑ دی۔ کئی دن سے بھوکے رکھے گئے یہ خوفناک کتے آن واحد میں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے۔

"نہیں۔ نہیں" چھوٹی رانی پاگلوں کی طرح کتوں پر جھپٹی مگر بیچ ہی میں راجہ کے مضبوط ہاتھوں نے اسے روک لیا اور وہ ان مضبوط ہاتھوں میں بے ہوش ہو کر جھول گئی۔

صبح ریاست میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ رات چھوٹی رانی ماں کو سانپ نے ڈس لیا۔ ارتھی کے ساتھ خود راجہ صاحب



ننگے سر شامل تھے۔ صرف قلعے کی دو وفادار کنیزیں یہ جانتی تھیں کہ جب وہ اپنی بدنصیب رانی کو سویرے اٹھانے گئیں تو اس کے کمرے میں خون اور ہڈیوں کے بچے کھچے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے اور رانی دلہن کی طرح سجی اپنی مسہری پر مردہ پڑی تھی۔ مسہری کے نیچے جھولتے ہوئے ہاتھ کی انگوٹھی سے وہ بڑا اور قیمتی ہیرا غائب تھا جسے وہ ہمیشہ پہنے رہا کرتی تھیں۔

ساتھ ہی پیٹ کا ہوا سا گیسٹرک جوس بھی نکل جاتا ہے اور اس کے ساتھ تیزابیت بھی۔ پیٹ میں تیزابیت کا فقدان ہوتے ہی خون میں بھی اس کی مقدار کم ہونے لگتی ہے اور دل کچھ گھبرانے لگتا ہے۔ اسی تیزابیت کی وجہ سے اگر کبھی وجہ سے کھانے کے ساتھ پیٹ میں کبھی مرض کے جراثیم پہنچ جائیں تو وہ اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔

ہماری خوراک میں نائٹروجن آمیز ایک شے پروٹین بھی شامل رہتی ہے



خالی پیٹ

۱۔ خوراک نلی کا والو
۲۔ ڈیوڈینم کا والو
۳۔ پائی لورس
۴۔ پیٹ کے اندر گوشت کی جھریاں۔
۵۔ فنڈس۔

خاص کر دال، گوشت، مچھلی، انڈہ اور دودھ میں پروٹین زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ پروٹین کے ٹوٹ جانے پر اس سے نائٹروجن نکلتا ہے جو ہمارے بدن کے ہر ٹشو اور سیل کا ایک خاص جزو ہوتا ہے۔ نائٹروجن ہی کی صورت میں جسم کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

پروٹین کے ذرات بڑے مضبوط ہوتے ہیں جو آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتے لیکن جوں ہی یہ ذرات پیپسن اور تیزاب کی زد میں آتے ہیں ان کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔

گیسٹرک جوس میں پائے جانے والے ہائیڈروکلورک ایسڈ کی مقدار کبھی کبھی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر اس ایسڈ کو ہاتھ سے صرف چھو لیں تو ہاتھ میں زخم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ پیٹ کے اندر کی اتنی ملائم جھلی اور پٹھوں پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر یہی کیفیت کچھ دیر تک رہے تب پھوڑا یا زخم ہو جاتا ہے۔

پیٹ کے نچلے سرے 'پائی لورس' یا آنتوں میں کھانے کی آمد پر خون میں ایک ہارمون 'گیسٹرین' جھلی سے نکل کر بہہ جاتا ہے۔ اس سے گلٹیوں پر گیسٹرک جوس تیار کرنے کے لئے دباؤ پڑتا ہے۔ یہ صرف خیال ہی ہے جس کے ثبوت میں ڈاکٹروں نے گیسٹرین میں موجود 'اینٹی رد گیسٹرون' نامی ہارمون کا ایک خاص انجکشن خون میں لگا کر دیکھا کہ وقتی طور پر بھوکے پیٹ میں بھی گیسٹرک جوس پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

کسی فکر، غم، غصہ، جلن یا بے زاری کے سبب دل کچھ بھاری سا ہوتا ہے تو اس کا براہ راست اثر پیٹ کے گلینڈز پر پڑتا ہے اور رس پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا ہضم ہونے میں کافی دیر لگ جاتی ہے۔

متلی کی وجہ یہ ہے کہ کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی آنت میں

ہے اور پھر پیٹ یا دونوں کے ساتھ
کا بدبودار گیس اور رس وغیرہ سب
باہر آجاتا ہے۔ جب تک پیٹ خالی نہیں
جاتا تب تک پٹھوں کے سکڑنے چلتے
نے کی ہچکیاں منہ سے نکلتی رہتی ہیں۔
ت کچھ نکل جانے کے بعد دل کچھ مطمئن
تا ہے اکثر اس کے بعد پسینہ آتا ہے
پھر تھوڑی کمزوری بھی محسوس ہوتی
، جو منہ صاف کرکے کچھ دیر لیٹ جانے
، بعد ٹھیک ہو جاتی ہے۔

قے ہونے کے اکثر تین اسباب ہیں ـــ
قے پیٹ کے متعلقہ حصوں کے اپنے خود
، اشتعال کے سبب ، ذہنی خلفشار اور دوا
زہر کے ردِ عمل کی صورت میں۔

پیٹ اور اس سے متعلقہ اعضاء جیسے
ان کا نچلا حصہ ، کھانے کی نلی ، پیٹ کی
ل وغیرہ اتنے ملائم اور لچکی پیدا کرتے
ے ہوتے ہیں کہ اگر کھانے کے ساتھ
ھر کے سے زیادہ کھا لیا جائے یا شراب
ی نشیلی چیز کا بہت زیادہ استعمال کر لیا
ئے تو قوتِ ہاضمہ بگڑنے کی نوبت آجاتی
ہے۔ اس لئے قدرت نے پیٹ کو یہ
یت بخشی ہے کہ فالتو چیزوں کو نکال دیتا
ہے۔

اکثر چھوٹے بچّوں اور ادھیڑ عمر کے
تمام افراد کو کبھی کبھی پیٹ درد کی شکایت
رہتی ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے زیادہ
کھانا۔ لذیذ کھانا پاکر بچّے اور کبھی کبھی بڑے
لوگ بھی ضرورت سے زیادہ کھانا کھا
لیتے ہیں اور اوپر سے شربت پانی پی لیتے
ہیں۔ یہ تمام مقدار پیٹ کے حجم سے زیادہ ہوتی
ہے۔ اس سے پیٹ کے پٹھوں کے دباؤ
کی وجہ سے کھانا آنتوں یا کھانے کی نلی کے

[illegible] داخل ہونے کی کوشش کرتا
ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیٹ میں درد ہونے
لگتا ہے۔ اکثر ٹھیک طرح نہ چبانے اور
بڑے بڑے لقمے نگل لینے یا کسی ثقیل چیز
کو کھا لینے سے بھی پیٹ درد کی شکایت
لاحق ہو جاتی ہے۔

پیٹ کا درد نفسیاتی طور پر بھی ہو جاتا
ہے۔ کیوں کہ پیٹ کے پٹھوں کو چلانے کا کام
دماغ کی نسوں پر منحصر رہتا ہے اس لئے جب
کبھی دماغ پر چوٹ پہنچتی ہے یا کسی دوسری
وجہ سے یہ حصہ اثر انداز ہوتا ہے تو پیٹ
کے پٹھوں کی رفتار مدھم یا بند ہو جاتی ہے۔

بھرا پیٹ



۱۔ خوراک کی نلی
۲۔ پیٹ
۳۔ ڈیوڈینم
۴۔ چوتھی پرت
۵۔ تیسری پرت (آڑی)
۶۔ دوسری پرت (ترچھی)
۷۔ پہلی پرت (سیدھی)

اس سے کھانا پیٹ میں کافی دیر تک جوں
کا توں پڑا رہتا ہے اور یہی درد کا سبب
بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض اوقات
پٹھے اپنا کام تیزی سے کرنے لگتے ہیں
کھانا جلدی ہی پس کر آنتوں میں آ
ہضم نہیں پاتا۔ یہ بھی درد کا ایک
ہے۔

پیٹ میں وجہ کے بازو ائی سے کبھی چوٹ لگ جاتی ہے تب بھی پیٹ کے پٹھوں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اس کا اثر دوسرے حصوں پر بھی پڑتا ہے اور قدرتاً پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔

کھانا کھانے کے فوراً بعد خلافِ فطرت کوئی بھاری چیز اٹھانے یا بھاگنے دوڑنے سے بھی پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔

کبھی کبھی پیٹ میں تیزاب کی مقدار کم ہو جاتی ہے جس سے کھانے میں بدبو آجاتی ہے۔ اس سے کئی طرح کی گیسیں۔ ہائیڈروجن، سلفائڈ (اس یعنی سڑے ہوئے انڈے کی بدبودار گیس، کاربن ڈائی آکسائڈ میتھین وغیرہ سے پیٹ پھول جاتا ہے اور زیادہ دباؤ پڑنے کی وجہ سے کھانے کی نلی کا منہ کھل جاتا ہے۔ اس سے ڈکار کے راستے یہ گیسیں باہر نکلنے لگتی ہیں۔

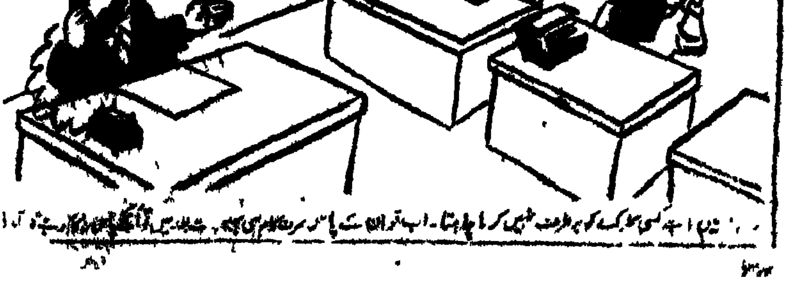
عام حالت میں اشیائے خوردونوش کے ساتھ اگر ہوا بھی زیادہ تعداد میں پیٹ میں چلی جاتی ہے تو وہ بھی ڈکار بن کر باہر آجاتی ہے اور اگر پیٹ میں تیزاب زیادہ مقدار میں ہے تو کچھ تیزاب بھی کھانے کی نلی میں پہنچ جاتا ہے اور تب کھٹی کھٹی ڈکاریں آنے لگتی ہیں۔

زیادہ تر بھوک کا [illegible] ہے۔ اس کی وجہ سے دل [illegible] ہے۔ سر اور کمر میں درد بھی ہونے لگتا ہے ہاتھوں پیروں میں سستی سی آجاتی ہے بھوک کی اشتہا بڑھنے کی کئی وجوہ ہیں پیٹ کا پھولنا، گیس کی تیزی، تکان ہونا اور پاگل پن وغیرہ سے، پیٹ کے کے ذریعے جلدی سے کھانا آنتوں میں اور زہر بڑھ جانے سے۔

بھوک بالکل نہ لگنے کا خاص سبب یہ ہے کہ پیٹ میں گیسٹرک جوس کی کم تیاری یا پٹھوں کی سست رفتاری، ذہنی تفکرات، غم، غصہ، زیادہ دیر تک دماغی کام کرنا، کسرت نہ کرنا وغیرہ وغیرہ

کھانے پینے میں چکنائی کا زیادہ استعمال کرنے، چائے پینے، عورتوں کے کھٹی چیزیں کھانے، بچوں کے مٹی کھانے اور سرکہ وغیرہ پینے سے بھی بھوک بہت کم لگتی ہے۔

شاید آپ کو تعجب ہو رہا ہو کہ پیٹ کی تھیلی کے بغیر آدمی کی زندگی ممکن نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آدمی پیٹ کے بغیر بھی اپنا کام صرف آنتوں سے چلا سکتا ہے۔



میں اب بھی اس کو برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ اب تو ان کے پاس [illegible]

کہانی • اجے

بدنام

کیا وہ واقعی ایسا تھا ؟

...ج تمھیں خط لکھ رہی ہوں مشکل
ج اِسلئے دِنوں کی ملاقات میں پہلے کبھی
ں خط نہیں لکھا کبھی ایسا کوئی موقع ہی نہیں
یونکہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں قیام
ے تھے کچھ اس مشکل سماج کا بھی ڈر تھا۔
آج خط لکھنے کے سوا دوسرا چارہ بھی تو نہیں
؟ اب میں تمھیں چھوڑ کر دوسرے شہر میں
ئی ہوں یعنی اپنی سسرال ۔ اب خط نہ لکھنا
پنے تئیں بھی بے انصافی ہوگی اور تمھارے
لئے بھی ۔

آج میں وہ سب کچھ کہنا چاہتی ہوں جو
ہ کر بھی کبھی کہہ نہ سکی اور تمھارے سامنے
شاید اب بھی نہ کہہ سکوں۔

آج سب کچھ یاد کرکے بنا کسی حجاب
ے لکھ رہی ہوں۔ صبح کا وقت ... سمٹتی پرچھائیاں
. میں گھر سے تھوڑی دور سڑک کے کنارے
ٹ پاتھ پر سکول بس کے انتظار میں کھڑی
ول جاتے بچوں کو دیکھ رہی تھی چھوٹے چھوٹے
ہائی بہن ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جا رہے تھے !
ں سوچ رہی تھی، کیا بڑے ہونے پر یہ
ماج انھیں اسی طرح چلنے کی اجازت دے
ے گا ؟ شاید نہیں۔

اُسی وقت یکایک تم پر نظر پڑی تم مجھ سے
تھوڑی دور کھڑے کسی کتاب میں غرق تھے کتاب پر لکھا تھا
"زندگی اور فلسفہ"۔ جی چاہا دیکھتی رہوں ۔ لیکن
ایک نظر ہی ڈال سکی۔ وہ ایک نظر کیا تھی، جیسے بالکل
عجیب سا میرے دِل پر چھا گیا۔ شاید وہ ایک ممتا تھی
ایک محبت تھی جس کا تصور کبھی کبھی اچانک
ہی بندھ جاتا ہے۔

بس آگئی۔ ہم دونوں اُس میں سوار ہوگئے۔
تم نے ڈرائیور سے کہا "کیشو، دیر ہوگئی ہے
مجھے یونی ورسٹی اُتار دو گے ؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! بس
تو وہیں سے گذرتی ہے" ڈرائیور نے کہا۔

"شکریہ" کہتے ہوئے جب تم پیچھے کی طرف
مڑے تو کیشو نے کہا " ارے پیچھے کہاں جا رہے
ہو ؟"

"نہیں نہیں" کہتے ہوئے تم پیچھے بچوں
کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ آگے شاید تم اِسی
لئے نہیں آئے کہ وہاں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔
یونی ورسٹی کے پاس بس رکی ۔ تم اُتر گئے
اور بس پھر چل پڑی ۔ میں کھوئی کھوئی سی بیٹھی
رہی ۔ تمھیں یاد ہے نہ ! وہی ہماری پہلی
ملاقات تھی ۔

پھر کئی دِنوں تک تم سے ملاقات نہ
ہوئی ۔ لیکن تمھاری یاد مجھے آتی رہی۔

ایک دِن سکول جاتے ہوئے بس
اچانک رُک گئی ۔ میں نے دیکھا تم جا رہے
تھے۔ کیشو نے تمھیں آواز دی ۔ تم آگئے۔
کیشو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا " لیٹ ہو
جاؤ گے، بس میں آجاؤ "

" نہیں نہیں ۔ روزانہ میں اسے اچھا نہیں
سمجھتا ! اور آج تو میں لیٹ بھی نہیں ہوا "

" ارے ، آ بھی جاؤ ، یار ! کون سے تم
اتنے موٹے ہو کہ ہماری بس تمھیں لے

جانے سے انکار کرنے کی وجہ کہہ کے سمجھ پر تم اگلی سیٹ پر میرے برابر آ بیٹھ گئے اور بس چل پڑی۔

"ششیل جی، یہ بہن جی ہمارے سکول میں پڑھاتی ہیں — آشا ورما۔ اور بہن جی، آپ ہیں میرے عزیز دوست ششیل کوشل۔ آپ کے پڑوسی ہیں، آج کل ایم اے کر رہے ہیں۔"

کیشو نے ہمارا تعارف کرایا۔ اس طرح ہماری جان پہچان ہوئی۔

"آپ کس سبجیکٹ میں ایم اے کر رہے ہیں؟" میں نے ذرا کسی جھجک کے پوچھا۔

"جی، میں... انگریزی میں..." ہچکچاتے ہوئے تم نے جواب دیا۔

"پریویس یا فائنل میں؟"

"پریویس میں" سیٹ پر ہاتھ رگڑتے ہوئے تم نے آہستہ سے جواب دیا۔

"نہیں جی، یہ ادیب بھی ہیں" کیشو نے پھر لقمہ دیا۔

میں کچھ کہنے والی تھی کہ تمہارے ہونٹوں کی جنبش دیکھ کر چپ ہو گئی۔ "جی، میں ادیب نہیں ہوں۔ دو ایک کہانیاں شائع ہو جانے سے تو کوئی ادیب نہیں بن جاتا۔"

اسی طرح کبھی کبھی ہماری ملاقات ہو جاتی۔ تم کبھی کبھی مجھے کوئی رسالہ پیش کر دیتے جس میں تمہاری کوئی کہانی چھپی ہوتی۔ میں تمہارے لئے محرک بن گئی اور تم نے میرے لئے ہی کہانیاں لکھیں۔ تم نے میرے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ اپنے آپ میں سب کچھ سمجھ جاتی تھی۔ تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہی تمہاری شخصیت کے مختلف پہلو میری نظروں کے سامنے کھلتے گئے۔

اس دن تم بس میں میرے پاس بیٹھے تھے۔ تب ایک بچہ جو ننگے پاؤں دوڑتا ہوا بس میں سوار ہونے کے لیے جا رہا تھا [illegible] آ گئے ہی [illegible] کر گر پڑا۔ اس کے پاؤں [illegible] کیل چبھ گئی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ [illegible] سے اترا لیکن اس سے پہلے تم بچے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ بچے کو گود میں لے کر تم اپنے [illegible] ہاتھ پر لے آئے تھے اور دھیرے دھیرے اس کے پیر میں چبھی کیل نکالی تھی۔ میں یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی اور

"میں مانتی ہوں ششیل کہ تمہارا کردار بہت ہی پیچھے کیوں پڑے ہیں تمہارے آدرش"

بھی بہت سے لوگ دیکھ رہے تھے۔ لیکن کیشو کے علاوہ ہم میں سے کوئی تمہارا ہاتھ بٹانے آگے نہیں بڑھا۔ تمہاری فرض شناسی کتنی عظیم ہے!

ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔ موسم سرما کی ایک صبح تم پاس والے تنبولی کی دکان کے سامنے برآمدے میں کھڑے شاید بس کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بھی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ اسی وقت ایک البیلی حسینہ آ ٹپکی۔ بظاہر وہ فلم کی شوٹنگ کے دوران بھاگی ہوئی کوئی اداکارہ دکھائی دیتی تھی۔ بڑھیا چست کپڑے۔ اونچی ایڑی کے سینڈل، چہرے پہ کریم اور پاؤڈر کی دبیز تہیں! ہونٹوں پہ گہری لپ اسٹک، ناگن کی طرح لمبی لمبی چوٹیا۔ یونیورسٹی کی نہیں تو کسی کالج کی طالبہ تو ضرور ہی رہی ہوگی وہ۔

تمہاری طرف دیکھتے ہی وہ دکان پر آ کر پان کھانے لگی۔ دکان کے آدم قد آئینے میں اپنے میک اپ کو بغور دیکھا اور کچھ مسکراتی ہوئی تمہارے سامنے چہل قدمی کر



دکھ ہیئے ایک بار بھی اس کی طرف
، نہ میں شادی کا بھی ہمارے سامنے کبھی
کوئی سب پوچھی رہیں۔

پر بھی وہ حساس تا اتنہ نہیں ہوئی اور
تمہارے برابر بھی تھوڑی ایک کرسی
رکھی تم نے تب بھی کوئی دھیان نہ دیا
ی اور ہم دونوں اس میں سوار ہوگئے

ہے لیکن شہر کے لوگ آخر تمہارے
پر تو سماج کے لئے ایک مثال ہے۔"

مرے نظریے کو تقویت ملی اور اس
تصدیق بھی ہوئی کہ اونچے معیار
شخصیت پستی کی طرف کبھی نہیں جھکتی۔
"بھی جی، پڑھائی کیسی چل رہی ہے آپ
؟" کیشو نے مجھ سے معلوم کیا۔
"انگریزی میں تھوڑا خدشہ ہے" میں
نے جواب دیا "اور تو سب ٹھیک چل رہا
ہے۔"
"آپ ...سا امتحان دے رہی ہیں؟"
...پوچھا
"...ائر سیکنڈری کا۔"
"اگر میرے تعاون سے آپ کی انگریزی ٹھیک
...لے تو میں..."
"مدد کی تو مجھے ضرورت ہے" میں نے کچھ
...چے ہوئے کہا "میں پتا جی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"
اس کے بعد اگلے دن ہی میں نے کیشو کی
معرفت تمہیں پتا جی کی رضا مندی کا پیغام
...دیا۔
پھر ہفتے میں دو تین بار میرے گھر آکر تم
...انگریزی پڑھانے لگے۔ میرے والدین تمہارے اخلاق

سے بہت متاثر ہوئے۔ میری انگریزی میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہونے لگی۔

اس طرح ہمارا میل جول بڑھتا گیا اور تمہیں دیکھنے سمجھنے کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔ اس وقت میں جذبات اور احساسات کے ایک عجیب دور سے گزر رہی تھی۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ تمہارے تئیں میرے دل میں محبت جلوہ گر تھی اور میں ہمیشہ ہمیشہ سے تمہیں جانتی ہوں۔

اس وقت تمہاری تمام کہانیوں میں میرے لئے محبت کا گہرا تاثر تھا۔ ہر کہانی تم مجھے ہی محرک بنا کر لکھتے تھے۔ اپنی ملاقاتوں میں تم نے کبھی اپنے جذبات وخیالات کو لفظی جامہ نہیں پہنایا۔

سال پورا ہوگیا۔ میں نے ہائر سکنڈری پاس کرلیا۔ تم ایم اے پرویس میں راجستھان یونی ورسٹی میں فرسٹ رہے۔

کچھ ماہ بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے میرے خیالات میں یک دم زبردست تبدیلی آگئی۔ معلوم نہیں تم نے کس جذبے کے

محبت ایک کنوارا تھا۔ مجھے یہ کنوارا پن اچھا لگتا
تھا خوشی ہوتی۔ بھائی بہن کے تعلقات کو
سے کراہیت سے نفرت کے پیمانے کہانیاں لگتی
ہیں۔ گویا بھائی بہن کا رشتہ سماج میں سے
رہ نہیں۔

میری ایک سہیلی جو تمہیں جانتی تھی بات
چیت کے دوران اس نے وہ نام لیا
اور ورق گردانی کرنے لگی۔ دفعتاً اس نے
سوال کیا "یہ شکیل کون ہیں؟ وہی تو نہیں
جو یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں؟"

"ہاں وہی" میں نے جواب دیا۔

"یہ عجیب صاحب تو آج کل پورے
شہر میں بدنام ہیں۔"

سہیلی کے منہ سے یہ بات سن کر میں
ہکا بکا رہ گئی۔

"وہ کیسے؟" میں نے طاقت سمیٹ کر
پوچھا۔

"واہ، جیسے تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ انہیں
تو یونیورسٹی سے نکالے ہوئے بھی ایک
مہینہ ہو گیا۔"

"یہ سراسر جھوٹ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔
میں شکیل کو بہت قریب سے جانتی ہوں۔
وہ بلند کردار کا لڑکا ہے۔"

"ہوگی مجھے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا
ہے۔ میں نے تو جیسا سنا تھا کہہ دیا مگر
بہت سے لوگ جب ایک ہی بات کہتے
ہیں تو اسے مطلق جھوٹ بھی نہیں کہا
جا سکتا۔ اس میں تھوڑا بہت حقیقی عنصر شامل
ضرور رہتا ہے۔"

مجھے بہت افسوس ہوا۔ میرے خاموش ہو
جانے سے یہ بات چیت جم
نہیں سکی۔ میرا ارادہ بھانپ کر ہی شاید
میری سہیلی جلدی چلی گئی۔

کس بات کا بڑا شدید صدمہ تھا وہ!
دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے
تھے۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ شکیل کو یونیورسٹی
سے نکال دیا گیا؟ اگر ایسا ہوتا بھی تو وہ مجھے
ضرور بتاتے۔

لیکن کیا میرا یقین بے بنیاد ہے؟ جسے میں
نے اتنی اونچی جگہ دی، وہ ایسا عیب
کام کیسے کر سکتا ہے۔ اسے کیا ہو گیا۔ کیا
جوانی کے نشے میں وہ اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ
میرا ذرا بھی خیال نہ رہا۔ مجھے آدرش کا آدرش
دینے والا ہی میرے لئے کلنک کا ٹیکہ ثابت
ہو گیا۔

کسی سوال کا کوئی تشفی بخش جواب نہ
اختیار ہی نہ ہوتا تھا کہ تم پر لگا یہ الزام سچ
جتنا سوچتی تھی افسوس ہوتا تھا۔ میرے دل
ایک ٹیس، ایک چبھن ہوتی تھی۔

شام کو تمہارے آتے ہی میں نے سوال
کیا "کیا یہ سچ ہے کہ تمہیں یونیورسٹی سے
نکال دیا گیا ہے؟"

"ہاں" تم نے اداس ہو کر کہا تھا۔

"کیوں؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں ایک دم چپ کھڑی رہ گئی تم

"آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟"

"میں تو یہ مانتی ہوں شکیل" میں

پُر یقین لہجے میں جواب دیا "تم بہت اونچے
کردار کے مالک ہو۔"

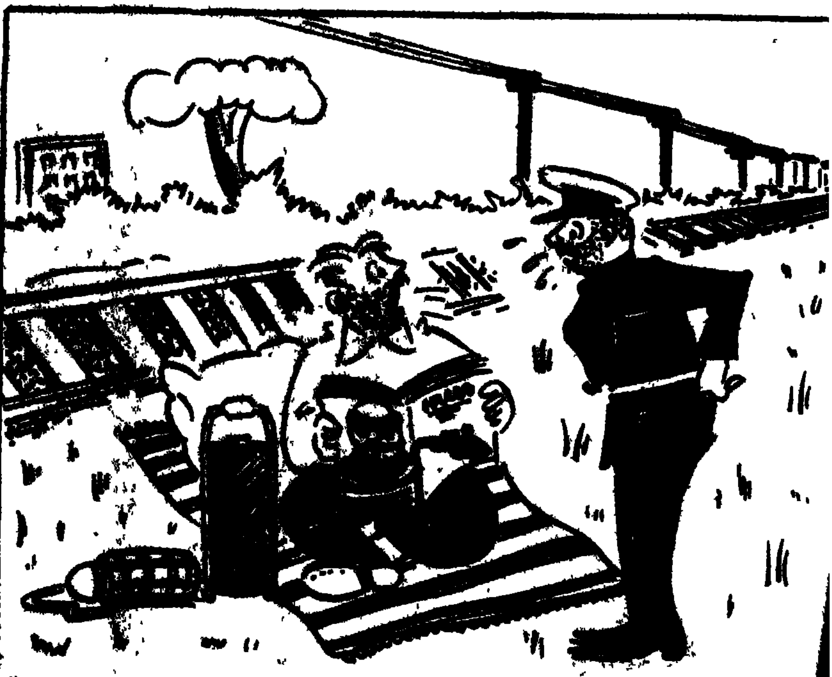
تم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
میں اطمینان بھی شامل تھا۔

"الزامات کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"بات تو اسی والی رانی ہے۔ تمہیں
وہ ایک نیا جیسا جوان لڑکی چھیڑنے کی
کوشش کی تھا اور میں نے اس کے ایک

وہ جب سے ساتھ ہی پڑھتا تھا میں
استعفیٰ دے کر بیٹھی رہ سکتی ہیں کہ
تمہارے شہر میں بدنام کرنا نا ممکن ہو تو پہلی
سب نے افواہوں پر یقین کر کے سب سے کیسے
ر کر کے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔
پھر سامنے میز پر رکھی کتابوں تک شدت
کر تم رونے لگے، جیسے آنسو پیشانی کو
وؤں کے سیلاب میں بہا دینا چاہتے تھے
میں مجھے دیر تک ہے جس ہو کر سکتا
ں رہی تھی۔
کتنا غیر اخلاقی اور کتنا غیر سماجی کام ہے
ں بے قصور کو بدنام کرنا۔ اپنی مطلب
ی نہ ہونے پر انسان کتنا ذلیل کام کر گزرتا
، یہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا۔
تمہارے آنسوؤں کا سیلاب جب کچھ

مجھے جواب میں سے [illegible] تم
ز کر دو مشکل، اس سارے [illegible] کا نام ہی
[illegible] سے پہچان گیا
[illegible]
[illegible] سکتا۔ تم
ان کتوں کی [illegible]
تم نے [illegible] کس
اور تمہارے [illegible] گی۔
اگر تم سے [illegible] ہو جاتا تو [illegible] کر دی
[illegible] میں تمہارا مقام وہی رہتا جو
تیں میرے دل میں [illegible] آگئی۔ لیکن
سمجھا تمہاری آرزو تصویر تو سماج کے لئے
ایک مثال ہے۔ تم [illegible] کے [illegible] کی
طرح صاف و پاک ہو عظیم ہو۔
— تمہاری بہن، آشا



خودکشی کرنے کے لئے آتے آتے میں کھانا اور ایک جاسوسی ناول بھی لے آیا ہوں تاکہ گاڑی لیٹ ہو"



تیرا جلوہ تیری قامت...

تیرا جلوہ، تیری قامت رقص میں رہنے لگے
سینۂ شاعر میں اب تو شعر ہی ڈھلنے لگے

ہے نگاہ آشنا یا بے رخی کی ہے ادا
ہم تمہاری عادتوں سے اور بھی ڈرنے لگے

کچھ اشارے، کچھ کنائے، شرم اور خاموش تم
دھیرے دھیرے عشق سے نازیں سے ہونے لگے

آہ کرتا تھا تو رسوائی تری ہونے لگی
ضبط کرتا ہوں تو میرے دل، جگر جلنے لگے

نرم سانسوں کی ہے خوشبو کیف [illegible] میں گھلی
کیا میرے ہونٹوں پہ رکھ کے ہونٹ تم سونے لگے

ایسی کنول سی رس بھری آنکھیں ذرا سی اونگھتی
چاند، تارے، آسماں انگڑائیاں لینے لگے

بھیگی بھیگی رات ہے، اللہ [illegible] لاجواب ہے
دیکھ کر یہ پھر [illegible] ہم [illegible] لگے

— مظفر احمد

…پوشاک کے راستے میں لوگوں کے بداخلاقی اور بدعنوانی کا زلزلہ آنا چاہئے۔
…مخالف نظریات ہے تو سمجھا جا سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہے

…لوگ اس پوشاک کو پہنتے کے…یاں ہیں۔ اگر ان کا بس چلے تو تنگ اس پہننے والوں کا گولی سے اڑا دیں۔ آخر …سب کیوں؟ کیا واقعی چست پوشاک …ایک گناہ یا بدکرداری ہے؟

کچھ لوگ اسے بداخلاقی اور عریانی سے منسوب کرتے ہیں۔ اگر یہ نظریہ ٹھیک …ہیں ہے۔ فیشن اور عریانیت دو الگ الگ …چیزیں ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے سے …راست تعلق نہیں ہے۔ پھر اگر کوئی …فیشن کرتا ہے تو اسے بداخلاق کیوں کہا …جاتا ہے؟ لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں سب …کا جھکاؤ چست پوشاک کی طرف ہے۔ اس …وقت یہ کہنا کہ یہ رجحان لوگوں کو گمراہ کرے گا، اُنہیں بداخلاق بنائے گا، اس لئے اس پر پابندی لگانی چاہئے، بڑی عجیب وغریب بات ہے۔

آج ہم اس دور میں سانس نہیں لے رہے ہیں جب لباس اور ستر پوشی کے لئے بھی اُستادوں کی صلاح لی جاتی تھی۔ عورتوں کے سر سے دوپٹہ اُترنے پر انہیں بدچلن تصور کیا جاتا تھا۔ اب یہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ موجودہ ترقی پسند زمانہ اپنی تیز رفتار کے مطابق ہمیں بھی آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اگر ہم اُس کی آواز کو لبیک کہہ کر …ملا کر چلتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے۔ …س سے تو ہماری شان، عزت اور تہذیب …کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر اگر ہم دوسروں …لباس کو اپناتے ہیں تو کیا حرج ہے۔ یہ …ہی کو معلوم ہے کہ غیر ممالک (بالخصوص …برطانیہ) میں لباس میں چست …آ رہی ہیں اور اسی مناسبت سے وہاں

آج ساری دنیا نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اخلاق اور کردار میں امریکہ اوّل نمبر پر ہے۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ انہیں بداخلاقی کی طرف مائل ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ آج پیرس کے ہوٹل میں اگر کوئی ہندوستانی جائے تو شرم سے اُس کی گردن تک جھک جائے گی۔ وہاں کی رقاصاؤں کے عریاں رقص دیکھ کر وہ ایک لمحہ بھی ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتا۔ لیکن

چست پوشاک

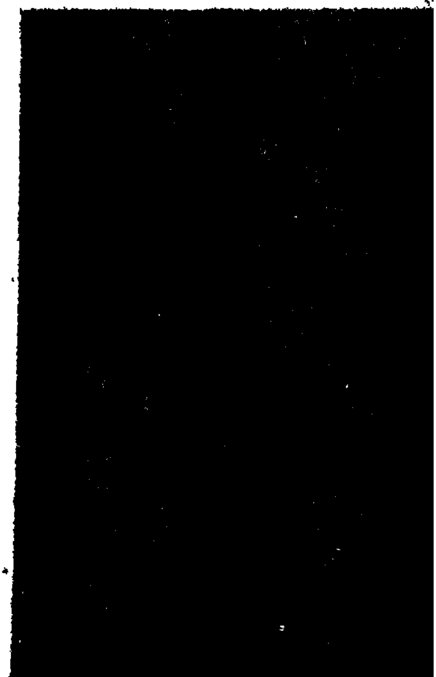
آخر اتنی ہائے توبہ کیوں؟

وہاں کے لوگوں پر اس کا کچھ بھی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ رقاصاؤں کے فن کی داد دینے کے لئے وہ تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی بات چست پوشاک کے ساتھ بھی صادق آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ابھی ہم لوگ پردہ کے رواج سے صرف ایک قدم آگے بڑھ پائے ہیں۔ ہمارے دلوں میں قدامت پرستی گھر کئے ہوئے ہے اور ہم لوگ پُرانی روایات سے الگ ہونے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

آج بھی بہو چست پوشاک پہن کر گھر میں آ جائے تو بے عزتی کی بات سمجھی جاتی ہے "ہائے اللہ ساس سسر کا ڈر بھی

نہیں۔ بس اب گھر کا ماحول ہو گیا۔

ایسی باتیں تو بہت سے خاندانوں میں کی کمی نہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک لڑکی کی شادی ہوئی اور وہ سسرال گئی۔ ایک دن اس نے چست پوشاک تو درکنار، صرف اٹھا پٹا ڈال کر ساری پہن لی۔ پھر تو ساس سے نہ رہا گیا۔ خود ہی سے ننگے بدن



کو دیکھ لیا۔ کیا حرج ہے رہ گئی ہاں ایسے وقت آتا ہے چلا جاتا ہے۔ فیشن بھی وقت کے ساتھ آتا ہے اور اپنی چمک دمک دکھا کر چلا جاتا ہے۔ پھر یہ رونا پیٹنا کیسا؟

دس پہلے تین بٹن کا کرتہ چلا پھر دو بٹن کا۔ پھر ایک بٹن کا۔ لڑکیاں سکرٹ پر آئیں، پھر فراک میں بھی

اور اب کرتے میں پھر ان کے سامنے آ رہی ہیں۔ غرارہ کی جگہ تو شلوار نے لے لی۔ فیشن آتا ہے کل ختم۔ یہ جانے کا عجائب کیوں دیکھا جا سکے؟ کیا چست پتلون، شلوار اور کرتے ہیں ہی رنگ بد اخلاقی ہو سکتے ہیں، فراک تو کھل کر۔ کیا یہ صرف واہمہ ہے کہ تنگ کپڑے سماج کے لئے بگاڑ ہیں۔ اگر چست کرتا اور شلوار دیکھ کر مغلوب ہو جانے والے لوگ حقیقت کی تلاش کریں تو یہی دیکھیں گے کہ تنگ لباس ہر کسی پر نہیں پھبتا۔

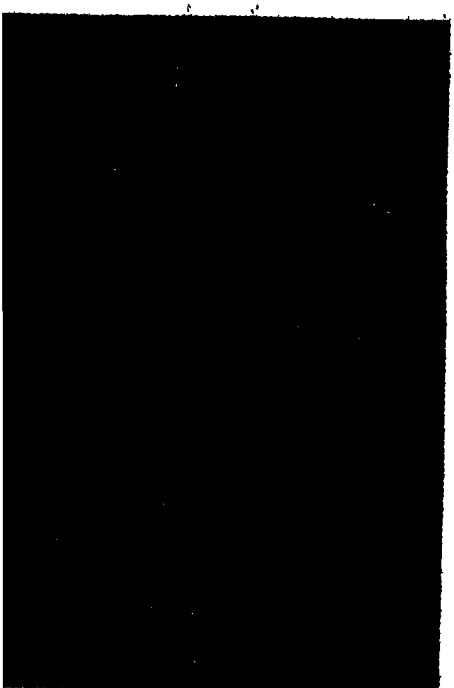
سڑک پر چلنے والے سو میں سے پچاس کی حد تک بھی لڑکے لڑکیاں دیکھنے کو ملیں گے جو چست پوشاک میں بہت بھدے لگتے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر عام آدمی بھی ہنستا جاتا ہے۔ چست کپڑے یہاں غیر اخلاقی نہیں ہیں اور وہ صرف اس لئے کہ حسن کی وہ کشش، دبلی نرمائی اور بچپن ان لوگوں میں میسر نہیں ہے۔ حقیقت میں بد چلنی کی آگ میں گھی ڈالنے والا سبب کپڑا نہیں۔ لڑکے یا لڑکیاں چاہے چست یا ڈھیلا لباس کیوں نہ پہن لیں اگر ان کا چال چلن اچھا نہیں تو یہی بد چلنی کی نشانی ہے۔ اگر تہذیب ہی جذبات کو بھڑکاتا ہے تو کپڑے کا کیا قصور ہے؟

کچھ لوگ ماحول اور آب و ہوا کے لحاظ سے چست لباس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کے مطابق چست پوشاک غیر ملکیوں کے مزاج کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے ان ہی کے لئے مناسب ہے، ہماری لڑکیوں کے لئے نہیں۔ اگر یہ حقیقت تسلیم بھی کر لی جائے تو وہ لڑکے لڑکیاں جو چست پوشاک پہن رہے ہیں، خراب آب و ہوا کی وجہ سے بیماری کا شکار کیوں نہیں ہو جاتے؟

...ں اور بھی چست پوشاک میں کوئی
...ی جتا ... نظر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بہت سے
...چست پوشاک کھلے کپڑوں کی نسبت
...ں میں زیادہ پھرتی اور چستی پیدا کرتی
...ہے، اس سے کپڑے کی بچت تو ہوتی
...ی ہے، ساتھ ہی کام میں کوئی دشواری
بھی نہیں ہوتی۔

...پوشاک کو عریاں کہا جاتا ہے
چست کپڑوں کو دھوتی کی طرح اس میں
سلیقہ نہیں۔ مجھے اس میں عریانیت کا وہ
پہلو نہیں دکھائی دیتا جو آدھے پیٹ کے
بنا آستین والے بلاؤز میں ہے، ڈائیکران
کی اُن پتلی ساڑیوں میں ہے، جن میں
بدن کا ہر حصہ صاف دکھائی دیتا ہے، انڈر
ویئروں اور باڈیوں کی غریب صورتی جھلکتی
ہے۔ چست پوشاکیں زیادہ دنوں تک چلنے
کے لیے موٹے کپڑوں کی بنتی ہیں۔ انھیں
پہننے پر جسم اوپر سے نیچے تک پوری طرح
ڈھکا رہتا ہے اور اس طرح کسی بھی طرح
کا بے ہودہ پن نہیں نظر آتا۔
یہ دلیل بالکل غلط ہے کہ چست پوشاک
میں بدن کا اُبھار اور تناؤ دکھائی دیتا ہے۔
کولہوں اور چھاتیوں کا اُبھار اور تناؤ اُلٹے
پلّے کی تین پلیٹ کی ساری میں، جسے آج
کل سب ہی لڑکیاں اور عورتیں پہنتی ہیں،
ویسا ہی رہتا ہے۔ حقیقت میں غرارہ اور
فراک میں بھی ویسا ہی رہتا ہے۔ یہی نہیں
کوئی کپڑا پہنا جائے بدن پر کیا فرق پڑے گا۔
ہاں اس سے مجھے اتفاق ہے کہ
چست پوشاکیں اتنی تنگ نہ ہوں کہ آدمی
سے گھومنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا ختم ہو جائے۔
تنگ لباس کو بدنام کرنے والے دراصل
وہی لوگ ہیں جو اسے پہنتے ہیں۔ اُن کے

کپڑے اتنے تنگ اور چست ہوتے ہیں
کہ تھوڑا تیز چلنے، جھکنے اور بیٹھنے پر انھیں
پھٹنے کا خطرہ یاد آ جاتا ہے۔
مجھے حضرت گنج کی وہ شام یاد ہے
جب بہت زیادہ تنگ لباس پہنے ایک
نازک اندام حسینہ رکشہ پر بیٹھی لاریٹو،
کی طرف جاتی ہوئی کنکھیوں سے حضرت



گنج کی رونق دیکھ رہی تھی۔ رکشے کے ذرا
سے جھکولے پر وہ زمین پر آ رہی اور کئی بار
کی کوشش کے بعد بھی اپنے آپ نہ اُٹھ سکی۔
ایسا ہی ایک واقعہ نشاط گنج روڈ پر
ایک طالب علم کے ساتھ ہوا۔ وہ جب
سائیکل پر بیٹھنے لگا تو اس کی پتلون پھٹ
گئی اور آخر اسے سکول کے ایک روم میں
بیٹھ کر ایک ساتھی کو گھر بھیج کر دوسری
پتلون منگانی پڑی۔

عُریاں نہیں، بے پردگی تو بہت ہے۔ [illegible]
تنگ پتلونوں، کرتوں اور شلواروں میں چست
چست کپڑوں میں نہیں۔ اکثر لوگ چست
اور تنگ پوشاک میں فرق نہیں محسوس
کرتے۔ مگر دونوں میں زمین آسمان کا
فرق ہے [illegible] کہ چست [illegible]،
[illegible] نہیں انہیں
[illegible] میں [illegible] کی ضرورت پڑتی ہے دو
[illegible] علاوہ [illegible] انہیں پہننے والا انسان
نظر آتا ہے [illegible] نہیں۔

●

یہ لڑکیاں



ٹرین کے ایک لمبے سفر میں میرے ایک دوست بھی ساتھ تھے۔ سینٹرل سٹیشن پر ہمارے کمپارٹمنٹ میں دو لڑکیاں داخل ہوئیں ایک ٹیڈی لباس میں اور دوسری ٹی شرٹ نیکر میں ملبوس تھی۔

اور ہمارے دوست نے رعب جمانے کی خاطر ہینڈ بیگ سے دو کتابیں نکالیں اور ورق گردانی کرنے لگے۔ دوسری کتاب دراصل لڑکیوں سے متعارف ہونے کے لیے نکالی تھی مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ لیکن ان کو زیادہ دشواری نہیں پیش آئی جب کہ لڑکی نے اُن سے کہا۔

"کیا آپ یہ کتاب دے سکتے ہیں؟"

"جی ہاں، ضرور، شوق سے" ہمارے دوست نے بے تکلف ہونے کی غرض سے کہا۔

لڑکی کتاب لے کر اس کے مطالعہ میں محو ہو گئی۔

اگلے سٹیشن پر لڑکیوں کو اترنا تھا۔ کتاب واپس کرنے پر پتہ نہیں میرے دوست نے لڑکی سے کیا کہہ دیا کہ وہ قدرے خفگی سے بولی "دیکھیے مسٹر، کتاب دے کر آپ نے ہم پر کچھ احسان نہیں کیا ہے۔"

"لیکن۔ لیکن" ہمارے دوست ہکلانے لگے۔

لڑکی ہنسی انداز میں بولی "نہیں مسٹر، یہ [illegible] کوئی بات ہوئی — بدتمیز لڑکے۔"

دوسری لڑکی جو اب تک خاموش تھی اس نے پھر کمنٹ کر دیا "گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔"

"جی ہاں" میں نے طنز کے زہر سے نشتر مزاح کی خوشگواری میں سموتے ہوئے کہا "آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔"

— ابن خلیق، کانپور

●

بس سٹاپ پر بھیڑ بہت تھی کافی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ دو ٹیڈی فیشن کی لڑکیاں بھی قطار میں کھڑی تھیں لوگ ان پر طرح طرح کے آوازے کس رہے تھے اور وہ سب طرف سے بے پرواہ آپس میں ہنس ہنس کر گپ شپ کر رہی تھیں۔ بسیں آتیں دو چار لوگوں کو سوار کرتیں اور چلی جاتیں۔ جب وہ صرف چار آدمیوں کے پیچھے رہ گئی تھیں کہ اتنے میں ایک عورت اپنے بیمار بچے کو چادر میں لپیٹے ہوئے آئی اور قطار میں پیچھے کھڑی ہو گئی۔ ان میں سے ایک لڑکی بیمار بچے کی ماں کے پاس آئی اور بولی کہ تم میری جگہ چلی آؤ کیونکہ تمہارا بچہ بیمار معلوم ہوتا ہے بارش میں بھیگ کر اور نقصان ہو گا۔ سب مرد جو پہلے آوازے کس رہے تھے شرم سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

— محمد فاروق کنٹریکٹر، بمبئی

اس قسم کے اچھے تجربات بھیجیے۔ شائع ہونے والے ہر تجربے پر [illegible] کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ — ایڈیٹر

...نہیں پایا۔ جس میں ۱۹۰ روپے نقد تھے اور انہوں نے جا کر تھانہ میں جمع کرا دیا۔ پرس میں سونے کے زیور تھے۔ ابھی تک پرس کا دعویدار نہیں آیا۔

——روزنامہ پیغام، کانپور
بھیجنے والے، منظور احمد امجدی۔ بہار

●

پنجاب سٹیٹ الیکٹریسٹی بورڈ کا ایک سینئر کلرک جو شاید ہندوستان میں ایک واحد انسان ہے۔ اب تک باقاعدگی سے ہر مہینے ایک دن کی تنخواہ قومی دفاعی فنڈ میں دیتا ہے۔ اس کا نام مدن موہن ہے اُس نے کہا ہے کہ جب تک ہنگامی حالت موجود ہے وہ چندہ دیتا رہے گا۔ یہ فنڈ ۱۹۶۲ میں مسٹر نہرو کی اپیل پر شروع کیا تھا جب چینیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔

——آزاد ہند، کلکتہ
(بھیجنے والے، محمد عمر عادل۔ دولت پور)

●

بحری ماہرین کی اطلاع کے بموجب ایس ایس پروگریس جہاز کے کپتان کی حاضر دماغی کی بدولت طوفان سے مدراس بندرگاہ کو کم نقصان پہونچا ورنہ طوفان کے زور سے جہاز بندرگاہ کے تنگ راستہ تک پہونچ گیا تھا۔ کپتان نے یہ سوچا کہ اس راستے پر اگر جہاز پھنس گیا تو لمبی مدت کے لئے کسی اور جہاز کا گزرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے اپنے جہاز کو بندرگاہ کے اندر داخل ہونے کی بجائے طوفان کے خلاف آگے بڑھایا جہاز بائیں طرف جھک کر دیوار سے ٹکرا گیا۔

——اجالا، کلکتہ
(بھیجنے والے، فضل احمد تسنیم، مظفر پور)

> اس فیچر کے لئے اپنے تراشے بھیجئے شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ ——ایڈیٹر

شاباش

تری چوڑ میں ایک نو برس کی لڑکی نے دوسرے بچوں کو جن میں اس کی بہن بھی شامل تھی ایک ڈیورپرائمری اسکول کے ملبے سے نکالا۔ اس اسکول کی عمارت گذشتہ ہفتہ گر گئی تھی۔ ان بچوں کو بچانے کی کوشش میں لڑکی پر بھی ملبہ گر گیا اور وہ زخمی ہو گئی۔ لڑکی کو علاج کے لئے اسپتال میں داخل کر لیا گیا ہے۔

——روزنامہ "خلافت" بمبئی
(بھیجنے والے، محمد اسلم۔ بمبئی)

●

بال گنج سٹیشن کے قریب بوندیل لیول کراسنگ کے گیٹ بند ہونے کے باوجود دو لڑکے آنے والی ٹرین سے بے خبر ریلوے لائن پار کر رہے تھے کہ دفعتاً گیٹ مین کی نظر اُن پر پڑی اور اُس نے دونوں لڑکوں کو ریلوے لائن سے پرے دھکیل دیا مگر اسے اپنی جان بچانے کی مہلت نہ مل سکی اور ٹرین اُس کے ٹکڑے کرتی ہوئی گزر گئی۔

——دستیشمین، کلکتہ
(بھیجنے والے، امان اللہ خان۔ کلکتہ)

●

ایک آٹو رکشا ڈرائیور نے اس وقت اپنی ایمانداری اور نیک نیتی کا ثبوت دیا جب کہ اس نے نئی دلی ریلوے سٹیشن پر ایک

راجپوتانہ کے پولیٹکل ایجنٹ نے جب راجہ بوندی کو ایک خط لکھا کہ اُن کے مہمان بوندی دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہاں کے قدرتی اور تاریخی مقامات کا تذکرہ وہ اکثر سُن چکے ہیں۔ اس لئے وہ ان مقامات کو دیکھنے کے متمنی ہیں اگر ممکن ہو تو شکار کا انتظام بھی کروا دیں۔

اس وقت بوندی پر رام سنگھ کی حکومت تھی۔ انگریز ملک کے چپے چپے پر قابض تھے۔ راجستھان کو چھوڑ کر سبھی جگہ وہ اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ راجستھان کے اندرونی معاملات میں اُن کا دخل نہیں کے برابر تھا۔ لیکن یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اس علاقے پر بھی قابض ہو جائیں گے۔ اس لئے خط منظور کر کے مہاراجہ نے بہت خوش اسلوبی سے جواب بھجوا دیا کہ مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام سلطنت کرے گی۔

بوندی تاریخی اہمیت کا مقام تو ہے ہی، قدرتی مناظر کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی نرالی شان ہے۔ گھنے جنگل، درختوں سے لدے پہاڑ، سانپ کی طرح لہراتی، بل کھاتی، اچھلتی کودتی ندیاں سبھی اس علاقے میں کافی ہیں۔ پانی کی افراط اور جنگلوں کے سبب جنگلی جانوروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ شیر، چیتے، تیندوے، سور اور ریچھ جیسے خونخوار جانوروں سے لے کر سانبھر، چیتل، ہرن اور خرگوش وہاں بہت زیادہ ہیں۔

وہاں بہت سی شکارگاہیں ایسی ہیں جہاں ہر وقت شکار کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ آج کل ان میں کچھ کمی ہو گئی ہے، کیونکہ جانوروں کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ ان کو مار کر کھانے والوں کی تعداد میں جس رفتار سے زیادتی ہو رہی ہے اُس رفتار سے جانوروں میں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگل کاٹے جا رہے ہیں، جہاں وہاں بند باندھے جا رہے ہیں، جن کے سبب گھنے درختوں اور ہر وقت بہنے والے چشموں کی بھی کمی ہوتی جا رہی ہے۔

جن دنوں کی یہ بات ہے، اُن دنوں جنگلی جانوروں کی طرف خاص دھیان دیا جاتا تھا۔ جنگلوں کے تحفظ کا خاص انتظام تھا۔ اُن کو کاٹنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ شیر جیسے جانوروں کے رہنے کی جگہوں کی تو سرکار مرمت

کہانی

راجہ کا

مچان پر چڑھنے سے کیا تو ایک ہی سطح پر آ منے

بھی کراتی تھی، جس سے برسات یا گرمی میں وہ جنگل چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ نہ چلے جائیں۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے حاضری بھلو مقرر تھے۔

بوندی علاقے میں تو کئی مشہور شکارگاہیں ہیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ رام گڑھ، بھیم تال، تلواس اور بانس کھول۔

کئی مقامات پر تو شکاریوں کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کے لئے بہت اچھا انتظام ہے اس لئے جب پولیٹکل ایجنٹ صاحب کے مہمانوں کے آنے کی اطلاع ملی تو مہاراجہ

نے رام گڑھ کی مشہور شکارگاہ کو ان کے سے
روں کھا اور شکار کی کل تیاریاں گوکڑا کے
مہاراجہ بلونت سنگھ کے سپرد کر دیں۔

رام گڑھ بوندی سے مینران جانے والے راستے پر پی پاپا سے کچھ آگے، سڑک کے
بائیں طرف تقریباً تین میل اندر گھنے جنگلوں میں ہے۔ رام گڑھ کا راستہ تنگ اور دو
پہاڑیوں کے بیچ سے گزرتا ہے۔ چاروں طرف

برج راج شرما

استقبال

فائدہ ؟ عزت افزائی سامنے ہو کر کی جانی چاہیئے

گھنے جنگل سے گہری پہاڑیوں کو پار کرتی ہوئی اونچی نیچی زمین میں راستہ بنا کر آگے بڑھتی ہوئی میز ندی مسافروں کو مسحور کر دیتی ہے۔ اس پورے ہی غیر آباد اور پُرسکون جنگلی علاقے میں جنگلی جانور بہت بے فکری سے گھومتے ہیں۔ ندی میں یہاں ایک گہرا گڑھا ہے جس کا پانی کبھی نہیں سوکھتا۔ حصولِ آزادی سے قبل جب کہ راجہ اپنی ریاست کا مختارِ کُل سمجھا جاتا تھا، ہر سال رام گڑھ میں شکار کا انتظام ریاست کے ذریعے ہوتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، کیوں کہ اس علاقے کے دوسرے جنگلوں



کی طرح اِسے کاٹا نہیں گیا ہے۔ یہاں کی قدرتی خوبصورتی بدستور قائم ہے۔

گوکڑا کے مہاراجہ بلونت سنگھ، جن کے ذمے شکار کا انتظام تھا، بہت ہی بہادر اور باہمّت شخص تھے۔ وہ شکار کے بڑے شوقین تھے۔ اپنی زندگی میں اُنھوں نے بہت سے شیروں کا شکار کیا تھا۔ اُن کے شکار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی شیر کو مچان پر بیٹھ کر نہیں مارتے تھے۔ اونچائی پر بیٹھ کر بندوق سے شیر مارنا، اُن کے تئیں شکار کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ اُسے شیر کا قتل تصور کرتے تھے۔ وہ بہادری

کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ عظیم شاعر [illegible] کے باپ شاعر ہاشمی دہلوی نے اپنے [illegible] کلام کے شعری انتخاب میں اس ہی بلونت سنگھ کی بہادری اور شجاعت کی تعریف کے پل باندھے ہیں۔

رام گڑھ میں تعینات ، جانوروں کو مطلع کرتا گیا کہ جلدی ہی وہاں شکار کے لئے آ نکا / لگنے والا ہے۔ اس لئے ہوشیار ہو کر انھوں نے شیر کی ٹوہ لینا شروع کی۔ ویسے اُن کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہ جنگل کے بادشاہوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھا کرتے تھے۔ اسی درمیان کچھ وقت کے لئے ایسا بھی ہوا کہ اس کام کو آسان بنانے کی غرض سے ، وہاں سے کچھ میل دور کھڑ گاؤں میں ٹیلی فون کا بندوبست کروا گیا تھا۔ لیکن جس وقت کی ہم بات کر رہے ہیں۔ تب وہاں کچھ نہ تھا۔ اطلاع آدمیوں کے ذریعے ہی بھیجی جاتی تھی۔ ایجنٹ صاحب کے مہمانوں کے لئے کی جانے والی شکار کی تیاریوں میں کہیں خامی نہ رہ جائے ، اس کی فکر سب کو رہتی تھی۔

رام گڑھ سے اطلاع ملی کہ شیر کا شکار بھی کیا جا سکے گا کیونکہ ایک شیر کئی دن سے مستقل طور پر ایک گپھا میں ہی رہ رہا ہے۔ مہاراجہ بلونت سنگھ نے اطلاع پر یقین کر کے بوندی مہاراجہ نے گذارش کی کہ مہمانوں کو کبھی بھی بلایا جا سکتا ہے۔ شکار کا انتظام مکمل ہو جانے سے بلاوا بھیج دیا گیا اور تب مقررہ تاریخ پر ایجنٹ صاحب اپنے مہمانوں کے ساتھ بوندی تشریف لے آئے۔ ریاست کی طرف سے اُن کی خاطر مدارات ہوئی۔ اُن لوگوں نے بوندی میں تین دن قیام کیا اور آس پاس کے تاریخی دیدہ مقامات کی سیر کی۔ چھٹے دن صبح سویرے پاؤں نے رام گڑھ کے لئے کوچ کیا۔

مہاراجہ بلونت سنگھ [illegible] کے [illegible] موجود تھے۔ [illegible] کا مکمل انتظام [illegible] کے ایک طرف ، جہاں [illegible] کرنے [illegible] کر جانے والے پر جنگل میں جانے کا ایک راستہ بچا جاتا تھا۔ وہ جہاں کافی اونچائی پر بنائے گئے تھے۔ اتنا اونچے کہ وہ [illegible] کو [illegible] کے پاس کے درختوں کے بیچ بیچ کیا گیا تھا۔ مچان شیر کی نگرانی پر تعینات تھے۔

گرمی کی شروعات تھی ، چیت کا مہینہ ہوگا لیکن دن میں کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ شیر

> ## بھلا بھی نہ سکوں ...
>
> اس کی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
> ڈھونڈنے اُس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
>
> مہربانی سے وہ دل میں وہ کریں گے انکار
> داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
>
> کوئی پوچھے تو محبت سے ، یہ کیا ہے انصاف
> وہ مجھے دل سے بھلا دے میں بھلا بھی نہ سکوں
>
> — امیر مینائی

کر پانے پر مارنے کے لئے بھی موسم بہت مناسب ہے۔ مکمل طور پر دوپہر کا اچھا جاتا ہے اس کی وجہ ہے کہ گرمی کی دوپہری میں اسے تلاش کرنا نہیں پڑتا۔ وہ وقت جنگل کے بادشاہ کا آرام کا ہوتا ہے۔ اُس کی آرام گاہ ایک بہت ٹھنڈے مقام پر جہاں پانی بھی قریب ہو ، ہوتی ہے۔ شکار کے شوقین لوگ ، دھوکے باز ملازم کی طرح یہ انتظام کئے رہتے ہیں۔ اس طرح تیار سب انتظامات بھی وہاں تیار تھے۔ رات بھر پیٹ بھرنے کے لئے بھٹک کر

... ہوئے ... آمد ...
جاتا ہے ... میں شکار کرتا ہوتا ہے
دن اُن کی خوراک کا بندوبست پاس
کر رہا ہوتا ہے جس سے اُس کے اُسی مقام
دیئے آنے کا اعتبار ہو سکے۔

دن شیر کے لئے قریب ہی ایک پڑے
ں باندھا گیا تھا۔ وہ طلوع آفتاب
ے قبل ہی اپنی گپھا میں چلا گیا تھا۔ ہانکا نے
م اطلاع مہاراجہ صاحب کو دے دی تھی۔



ادھر بلندی سے روانہ ہو کر پارٹی دن کے
ریب دس بجے رام گڑھ پہنچی۔ بلونت سنگھ
نے اپنے مہمانوں کا استقبال کیا۔ پہاڑوں کی
وب صورتی اور گنجان جنگل کو دیکھ کر وہ لوگ
محو ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے شکار کی
یاری پر سرسری سی نظر ڈالی۔ مچانوں کا معائنہ
کیا۔ بلونت سنگھ نے بتایا کہ شکار بارہ بجے
کے بعد ہوگا، اِس لئے لوگ آرام کی خاطر
ڈیروں میں چلے گئے۔ ویسے وہاں آرام کے
لئے محل بنے ہوئے ہیں مگر اُن دنوں اُن میں مرمت

مہاراجہ بلندی ہی قیام پذیر ہوتے تھے۔ بلونت سنگھ بلندی کے معزز جاگیردار تھے اس لئے وہ اُسی میں ٹھہرے تھے۔ مہمانوں کے لئے ڈیروں کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔

لنچ کے بعد لوگ شکار کے لئے روانہ ہوئے۔ بلونت سنگھ نے ہانکے والوں کو ایسے کھڑا کیا کہ شیر کی گپھا تین طرف سے گھر گئی اور بھاگ کر بچ نکلنے کے تینوں راستے رک گئے۔ مہمانوں کو سیڑھیوں سے مچانوں پر پہنچا دیا گیا، جہاں اُن کے بیٹھنے، آرام کرنے اور حسب ضرورت پانی وغیرہ پینے کا بندوبست تھا۔ ایک مچان پر مہمان اور دوسرے پر ایجنٹ صاحب بلندی کے کچھ سرداروں کے ساتھ بیٹھے۔ مہاراجہ بلونت سنگھ مچان کے نیچے، تلوار لئے کھڑے رہے۔ ایجنٹ صاحب نے بصد احترام اُن سے گزارش کی کہ وہ بھی اُن کے پاس مچان پر آ جائیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ میں کبھی مچان پر بیٹھ کر شکار نہیں کرتا۔ میرے بارے میں آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ اگر شیر مجھ پر جھپٹا تو اُس کی عزت افزائی کے لئے میرے پاس کافی طاقت اور حوصلہ ہے۔ پھر وہ بھی راجہ ہے۔ اُس کا استقبال تو ایک ہی سطح پر آمنے سامنے ہو کر کیا جانا چاہئے۔

انگریز یہ سن کر حیران رہ گئے۔ اُنھوں نے پہلی بار ایسا آدمی دیکھا تھا جو جان کی پروا کئے بغیر شیر سے ٹکرانے کے لئے تیار تھا۔

اتنے میں ہی ہانکا شروع ہوا۔ ڈھول تاشے بجنے لگے۔ آدمیوں کا ہو ہو شروع ہو گیا۔ تمام جنگل چیخ و پکار سے گونج اُٹھا اور شور مچاتے آدمیوں کا غول دھیرے دھیرے سکڑنے لگا۔ شور گپھا کے اُوپر سے بھی کیا جانے لگا لیکن گپھا میں سے کوئی جانور نہیں آیا۔ آدھا گھنٹہ گزرا۔ ایک بجا اور پھر ڈیڑھ بج گیا۔ لیکن سب

کوششیں بیکار گئیں۔ بھالو کو شک ہو گیا کہ گپھا میں شیر ہے ہی نہیں، رپورٹ غلط دی گئی ہے۔ شیر ہوتا تو اتنے شور و شرابے میں وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ رپورٹ دینے والے بھالو سے دریافت کرنے کے لئے کہا گیا۔ بلونت سنگھ نے اسے بلایا۔ بھالو نے جھک کر عرض کیا۔

"ان داتا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے شیر کو اندر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ تب سے میں وہیں، سامنے کے پیڑ پر ٹنگا بیٹھا ہوں۔ شیر اندر ہے۔ اگر وہ اندر نہ ہو تو مجھے آپ جو سزا چاہیں دے دیں۔"

اب کیا ہو؟ انگریز بھالو کی بات پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ بلونت سنگھ کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ آخر پھر کوشش کی گئی۔ پھر ڈھول بجے، شور ہوا اور گپھا کی طرف پتھر پھینکے گئے۔ لیکن شیر نہ نکلا۔

اب ایجنٹ صاحب بڑے ناراض دکھائی دینے لگے۔ ان کو وقت برباد ہونے کا اتنا رنج نہ تھا جتنا اس بات کا رنج تھا کہ مہمان سوچیں گے کہ اتنی سی بھی تیاری نہ ہو سکی۔

بلونت سنگھ ایجنٹ کے تیور بھانپ گئے۔ خود ان کو بھی بڑا برا لگ رہا تھا۔ سوچتے تھے کہ یہ لوگ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہوں گے۔ اس لئے شیر کو گپھا سے باہر لانے کا بیڑہ انھوں نے اٹھایا۔ انھوں نے پاس کھڑے ایک آدمی کو نزدیک بلایا اور اس سے کچھ کپڑے منگوائے اور انھیں اپنے بائیں ہاتھ پر کہنی تک لپیٹا۔ اپنی تلوار ایک طرف رکھی اور کمربند میں بوندی کی بنی مشہور تلوار کھونس کر گپھا میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔

ان کو ایسا کرتے دیکھ ایجنٹ صاحب نے انھیں ایسا باہمت قدم اٹھانے سے روکا۔ لیکن وہ مانے نہیں۔ اور سب کے دیکھتے دیکھتے وہ گپھا

[illegible]
[illegible] کا سر گپھا کے اس طرف تھا اور دم دوسری طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں جنگل کا بادشاہ بے فکر سویا پڑا تھا۔

بلونت سنگھ نے اسے دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے۔ بجلی کی سی سرعت سے جھپٹ کر انھوں نے اس کی دم پکڑ لی اور اسی تیزی سے شیر کے سنبھلنے سے پہلے ہی گھسیٹ لئے چلے۔ مگر وہ بھی شیر تھا، بھیڑ تو تھا نہیں۔ ایک لمحے میں بجلی کو بھی مات کر دینے والی طاقت سے جھٹکا دے کر اس نے اپنی دم چھڑا لی اور دہاڑ کر سامنے جھپٹا۔

اس کا وہ روپ کتنا خوفناک تھا۔ اسی کا لقمہ، دو پیروں والا انسان، اسی کے گھر میں گھس کر ایسی بے ادبی کرے، اس کی اتنی جرأت ہو؟ یہ بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر، بھرپور طاقت سے دہاڑتا ہوا وہ ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے غصے بھرے دہکتے انگارے جیسے دیدے، پورے طور پر کھلا منہ، لمبے دانت اور ان میں لپلپاتی زبان — سبھی ایک ساتھ بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ زندہ موت سامنے کھڑی تھی۔

بلونت سنگھ نے جب اسے اس طرح منہ کھول جھپٹتے دیکھا تو بڑی پھرتی سے اپنا کپڑوں سے لپٹا ہوا ہاتھ اس کے منہ میں دے دیا اور داہنے ہاتھ سے کمر میں کھونسی تلوار کھینچ لی۔ شیر نے پوری طاقت سے ہاتھ کو چبا ڈالا۔ لیکن چوں کہ ہاتھ پر کپڑے لپٹے تھے، اس لئے دانت بدن کو نہ چھو پا رہے تھے۔ دونوں پنجے بھی ان کے بدن [illegible] سکے۔ ان کے لمبے ہاتھ سے الجھا [illegible]

(آگے صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیے)

اب ہنسنے کی باری ہے

فلم میں کام کرنے کے لئے ایک لڑکی آئی تو ہدایت کار نے کہا "ہمیں اس وقت ایک ایکٹرس کی ضرورت ہے جسے ایک منظر میں شیر کے گلے لگنا ہوگا۔"

"یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا" لڑکی نے سہمتے ہوئے کہا "اگر ایسا رول مجھے کرنا ہے تو میں واپس جا رہی ہوں۔"

ہدایت کار نے بڑی ملائمت سے کہا "ارے بھئی اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اس شیر سے تم کیوں گھبراتی ہو؟ اسے تو دودھ پلا کر پالا گیا ہے۔"

"دودھ پر تو میں بھی پلی تھی" لڑکی نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا "لیکن اب میں گوشت خور ہو گئی ہوں۔"

●

استاد نے اپنی کلاس کے تمام طالب علموں سے 'ہمارا کتا' موضوع پر ایک مقالہ لکھنے کو کہا۔

بعد میں جب استاد کاپیاں جانچنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ احسن اور امجد دونوں بھائیوں کا مضمون حرف بہ حرف ایک جیسا ہے۔

استاد نے دونوں کو بلا کر کہا "تم دونوں کا مضمون بالکل ایک جیسا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ نقل کس نے کی ہے؟"

دونوں لڑکے ایک ساتھ بولے "ہم نے نقل تو کسی نے نہیں کی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم دونوں کا کتا ایک ہی ہے۔"

●

ایک مشہور تاجر کو ایک اداکارہ سے محبت ہو گئی۔ اس نے شادی کا بھی فیصلہ کر لیا مگر اپنی تسلی کے لئے اس نے ایک جاسوس کو اس اداکارہ کے حالات کا پتہ لگانے پر مقرر کیا۔

کچھ دن بعد جاسوس نے اس تاجر کے پاس جو رپورٹ بھیجی اس میں لکھا تھا:

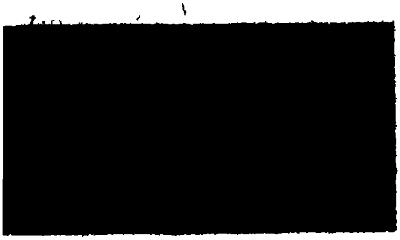
"بہت مشہور و معروف عورت ہے۔ اس کی پچھلی زندگی بھی ٹھیک رہی ہے، اس کے دوست و احباب بھی ٹھیک ہیں۔ ہاں پریشانی کی بات یہ ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے وہ ایک ایسے آدمی کے ساتھ شادی کا منصوبہ بنا رہی ہے جس کے کردار پر لوگوں کو شک ہے۔"

●

ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھا کر باہر نکلی تو اسے یاد آیا کہ اس کا کچھ سامان اندر رہ گیا ہے۔ وہ ہوٹل میں جا کر میز کرسیوں پر اپنی چیز تلاش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بیرا اندر آ کر بولا "معاف کیجئے گا صاحب تو آپ کا باہر انتظار کر رہے ہیں۔"

اکبری انصاف

تلاشی کہانی مقابلہ... تیسرا انعام .... [illegible]



۱۵۶۲ء ۲ مارچ کا دن تھا۔ نماز جمعہ کے بعد [illegible] اکبر حرم میں تشریف لے گئے۔

"کیا بات ہے جودھا بائی؟ تمہیں کیا ہوگیا؟" بادشاہ نے پوچھا۔

جودھا بائی کا چہرہ دیکھ کر وہ چونک گئے۔ مہارانی کا چہرہ اترا ہوا تھا، آنکھیں سرخ تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رو کر بیٹھی تھیں۔

"کیا بات ہے جودھا؟ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ آخر بات کیا ہے؟ ایسی صورت کیوں بنا رکھی ہے؟"

جودھا بائی کی آنکھوں میں پانی تیر گیا "مجھے معاف کر دیجئے مہابلی، آج ایک دردناک کہانی سُنی تھی۔ کہانی حقیقت تھی اِس لئے از خود آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔"

"کس کی کہانی؟ صاف صاف بتاؤ نا۔"

"اب سوچتی ہوں آپ کو سناؤں یا نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آخر ایسی کیا بات ہے؟ خاموش کیوں ہوگئیں؟"

"مہابلی" جودھا بائی کا گلا بھر آیا۔

"مہارانی جودھا بائی، تمہیں کس بات کا صدمہ ہے۔ تم ہماری سب سے چہیتی بیگم ہو۔ تمہاری پریشانی کی وجہ جان کر ہم اپنی پریشانی دُور کرنا چاہتے ہیں۔"

جودھا بائی نے بادشاہ کی طرف دیکھ کر دونوں کی نظریں ملیں۔ "میں حضور کے ماموں صاحب قبلہ کے خلاف کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ اجازت ـــ"

"اجازت ہے۔"

"آج بی بی فاطمہ محل میں حاضر ہوئی تھیں۔ اپنی بیٹی زہرا آغا کی جان بخشی کی فریاد کر رہی تھیں۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو زہرا [illegible] بیگم ہیں۔"

"نہیں عالم پناہ، آپ کے ماموں صاحب قبلہ خواجہ معظم اپنی بیگم زہرا آغا کو جان سے مار دینے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ کل صبح وہ انہیں اپنی محل سواری میں لے جا رہے ہیں۔"

"مگر اس کی وجہ؟"

"زہرا آغا کی چھوٹی بہن دیپا ہے۔ خواجہ معظم نے اُس کے ساتھ نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"لڑکی کا نام رتنا ہے۔"

"وہ تو ابھی کم سن ہے۔ مشکل سے ۱۵ برس کی ہوگی۔"

"یہی بات زہرا آغا نے بھی کہی تھی جس کی پاداش میں اُسے فی الفور سزائے موت سنا دی گئی۔ اسی وقت اُس کی مشکیں کس کر تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔"



ی دیوار بھی حائل نہ ہو پائی اور
بھی تصور نہ کیا تھا....

"سمجھا" بادشاہ متفکر ہوئے "بہت بڑی خبر ہے۔ خواجہ معظم نے زُہرا آغا کو کوٹھری میں بند کر کے نہایت بے ہودہ حرکت کی ہے۔ عجیب بات ہے کہ بی بی فاطمہ نے ابھی تک دربار میں کوئی فریاد نہیں کی۔"

"بی بی فاطمہ حضور سے خائف ہیں۔"

"ہم اُسے اچھی طرح جانتے ہیں، مگر ڈرنے کی وجہ؟"

"خواجہ معظم حضور کے ماموں صاحب ہیں۔ آپ کی امی حضور کے چچا زاد بھائی۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟"

"بی بی فاطمہ کو پتا ہے ... تھا کہ کہیں ...پ ..."

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شاید بی بی کو میرا خیال جاننے کی ضرورت نہیں۔"

"مگر ہم جاننا چاہتے ہیں۔"

"دو باتیں ہیں۔ ایک تو بی بی فاطمہ کو ڈر ہے کہ آپ کے ماموں صاحب کے خلاف سرِعام فریاد کرنے سے آپ کی بدنامی ہو گی۔ حضور شاید بی بی فاطمہ کو ہی قصوروار ٹھہرا دیں۔"

بادشاہ خشمگیں ہو کر بولے "بڑی بے ہودہ دلیل ہے۔ دوسری کیا بات ہے؟"

"کہیں سرِعام فریاد کرنے پر خواجہ معظم غصے میں آ کر بی بی فاطمہ کا بھی خون

"خو کر دیں۔" جودھا بائی نے جواب دیا۔

"یہ بات ایک حد تک درست ہے" بادشاہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ وہ ابھی تک بیٹھے بھی نہیں تھے۔ جودھا بائی نے بیٹھنے کے لئے کہا تو بادشاہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیا تمہیں ہمارے انصاف کے بارے میں کچھ شک ہے جودھا بائی؟"

"میرے شک کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے ظلِ الٰہی؟ دنیا والوں کو دیکھئے۔"

"جودھا" بادشاہ غصے سے کانپنے لگے۔

جودھابائی نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"ہم جواب چاہتے ہیں جودھا! دنیا کو ہمارے انصاف میں کیوں شک ہے؟ بزدلوں کی طرح خاموش کیوں ہو گئیں؟ جواب دو۔"

"میں بزدل نہیں ہوں" جودھا بائی کا چہرہ بھی غصے سے تمتما اٹھا "اگر ظلِ الٰہی میں جواب سننے کی ہمت ہے تو عرض خدمت ہے۔ دنیا سمجھتی ہے کہ بادشاہ اپنے ماموں خواجہ معظم کو سزا نہیں دے سکتے۔"

"دنیا ایسا کیوں سمجھتی ہے؟" بادشاہ پھر نرمی سے بولے۔

لیکن جودھا بائی نرم نہیں پڑیں "خواجہ معظم نے آپ کے ابا حضرت حضرت شہنشاہ ہمایوں کے دربان خواجہ ساقدی کا خون کیا، کس نے انہیں سزا دی؟ انہوں نے آپ کے خسر مرزا عبدل ملک پر سرِعام حملہ کیا، کس نے انہیں سزا دی؟"

بادشاہ کچھ پریشان ہو کر بولے "اور پھر؟"

[illegible] کی کس نے انہیں سزا دی؟"

"[illegible] سے باہر [illegible] بیگم [illegible] اس وقت تو ہم نے انہیں سزا دی تھی۔"

"[illegible] شریف [illegible] لیا تھا [illegible] ٹھیک [illegible] آپ کو ابھی بہت ہوا دے دیکھئے گا۔"

"اس وقت کے حالات اور تھے جودھا بائی۔"

"ضرور انصاف یہی کیا جو حالات پر مبنی ہو۔ وہ تو محض ایک سودا ہے جو اپنے نفع نقصان کے حساب سے چکایا جاتا ہے۔"

جودھا بائی نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ وہ خود ہی پچھتا گئی لیکن بات منہ سے نکل چکی تھی۔

بادشاہ کچھ نہیں بولے۔ ایک پل جودھا بائی کی طرف دیکھا اور تیزی سے باہر چلے گئے۔

خواجہ معظم کی حویلی جمنا کے اُس پار تھی۔

بادشاہ نے بیس آدمی ساتھ لے کر دریا پار کیا۔ اکثر شکار کے لئے بھی وہ اس طرف آیا کرتے تھے۔ یہاں اُن کے قیام کے لئے ایک آرام گاہ تھی، جہاں بادشاہ سلامت آرام فرماتے تھے۔ مرزا مسعود بیگ کے علاوہ ساتھ کے تمام آدمی شکاری تھے۔ سب یہی سمجھے کہ بادشاہ شکار کے لئے ہی دریا پار ٹھہرے ہیں۔

بادشاہ نے مرزا مسعود بیگ کو کچھ سمجھا کر ساتھ میں اپنا ایک محافظ دے دیا اور خواجہ معظم کے پاس بھیج دیا۔ اور خود بڑی بے چینی سے اُن کے واپس آنے [illegible]



ظاہر کرنے لگے۔ ان کی عجیب حالت تھی۔
اکبر کو اس وقت ۲۲ برس کی
ی۔ اب وہ دربار کی باگ ڈور اپنی طرح
سنبھال چکے تھے۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے
ا رواج ختم کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں سے
جزیہ لینا بند کر دیا گیا تھا۔ دربار میں بہت
سے ہندو راجہ ٹوڈر مل، مان سنگھ، بیربل،
بہارا مل وغیرہ بڑے عہدوں پر فائز تھے۔
بادشاہ کی نگاہ میں ہندو، مسلم، غریب امیر
سب برابر تھے۔ بادشاہ انصاف کے قدر
دان تھے۔ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنا
چاہتے تھے۔ جودھا بائی کی کڑوی بات
انہیں بہت ناگوار گزری۔ یہ ایک حد تک
درست بھی تھا اس لئے بادشاہ ضبط کر گئے۔
خواجہ معظم سے نپٹ کر ہی وہ جودھا بائی کی
بات کا جواب دے سکتے تھے۔

بادشاہ نے مرزا مسعود بیگ کو خواجہ
معظم کے پاس انہیں سمجھانے کے لئے ہی
بھیجا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خواجہ معظم زہرا
آغا اور اس کی چھوٹی بہن رشید آرا کو
ان کی ماں بی بی فاطمہ کے پاس پہنچانے کے
لئے راضی ہو جائیں گے۔ نہ ماننے پر مرزا
مسعود بیگ کو حق تھا کہ اپنی بات دھمکی سے
منوا لے۔ بادشاہ اس چھوٹی سی بات
کے لئے خود خواجہ معظم کے پاس جانا
مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

بادشاہ مرزا مسعود بیگ کا انتظار کر
رہے تھے اور سوچ رہے تھے شام کی بات
جب بی بی فاطمہ کی دونوں بیٹیاں اپنی ماں
کے پاس پہنچ جائیں گی، تب جودھا کو اپنی
بات کا کتنا افسوس ہوگا جو اس نے جلدی
میں بغیر سوچے سمجھے کہہ دی تھی۔
مرزا مسعود بیگ کچھ دیر سے آئے اور

آتے ہی ایک خون آلود چھرا بادشاہ کے
سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" بادشاہ نے پوچھا "کیا
تم نے معظم کو قتل کر دیا؟"

"نہیں جہاں پناہ، خواجہ نے اپنی بیگم
کا خون کر دیا ہے۔"

"تم نے میرا حکم سنایا تھا؟"

"سنایا تھا حضور" مسعود بیگ نے کہا
"سنتے ہی خواجہ معظم پاگلوں کی طرح چلانے
لگے۔ بولے — بادشاہ کو میرے نجی معاملات
میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں
اپنی طاقت ابھی دکھاتا ہوں۔ میں انہیں روک
نہیں سکا۔ وہ بھاگتے ہوئے اندر گئے اور
اسی لمحہ ان کے حرم میں سے چیخ و پکار سنائی
دی۔ پھر آکر چھرا مجھے دیا اور کہنے لگے۔ میں
نے اس بدذات کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔
بادشاہ سے کہنا واپس چلا جائے اور پھر کبھی
میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔
میں کچھ بھی نہ کر سکا۔"

"ایک بادشاہ کی اس سے بڑی

"تو یہی اور کیا ہو سکتی ہے؟" اکبر نے کہا "چلو میرے ساتھ۔"

بابر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ غصے سے اُن کی سانس پھول رہی تھی۔ گھوڑے پر سوار ہوتے ہی مرزا مسعود بیگ بولے "حضور خواجہ معظم لڑائی پر آمادہ ہیں۔ اتنے تھوڑے آدمیوں کے ساتھ۔"

"بکواس بند کرو" بادشاہ نے ڈانٹا "ایک کی جان جا ہی چکی ہے۔ دیر کرنے سے رشید آسا کے لئے بھی خطرہ ہے۔"

معظم کی حویلی پر لڑائی کی کوئی خواجہ تیاری نہیں تھی لیکن وہ خود لڑنے پر آمادہ تھا۔

بادشاہ چار آدمیوں کے ساتھ آرہے تھے۔ باقی آدمی پیچھے تھے۔ خواجہ معظم اُس وقت اپنی چھت پر تھے۔ انہوں نے بادشاہ کو آتے دیکھا اور فوراً نیچے اُتر آئے۔

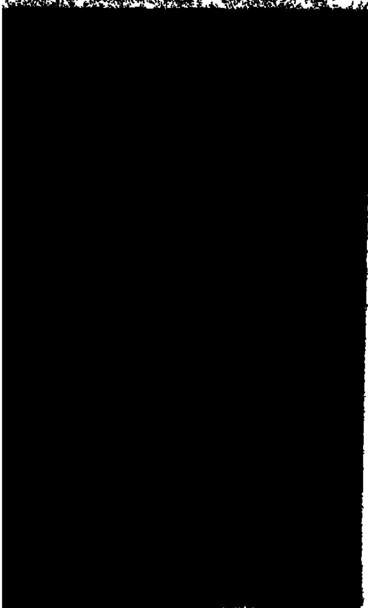
حویلی ایک چہار دیواری میں تھی جس کا باہر والا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ پہرے دار بادشاہ کو پہچانتا تھا۔

بادشاہ نے اندر آکر خواجہ معظم کو دیکھا۔ وہ نہتے کھڑے تھے۔ ساتھ میں دو خدمت گار تھے جو تلواروں سے لیس تھے۔

بادشاہ گھوڑے سے اُتر پڑے۔ اپنے ماموں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

خواجہ معظم ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ گورا رنگ تھا اور دوہرا بدن۔ سر کے بال پک گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ مسکرا کر بولے "ہمارا بھانجہ جلال الدین محمد اکبر ہم سے ملنے آیا ہے۔"

بادشاہ خاموش کھڑے رہے۔



"کیا اپنے ماموں سے ناراض ہو؟"

بادشاہ چُپ رہے۔

"ہم سے ملنے آئے ہو یا لڑنے؟ صاف جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"کچھ بھی سمجھیں۔ آج ہم اپنا وہ فرض ادا کرنے آئے ہیں جو ہمیں بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زہرا کہاں ہیں؟"

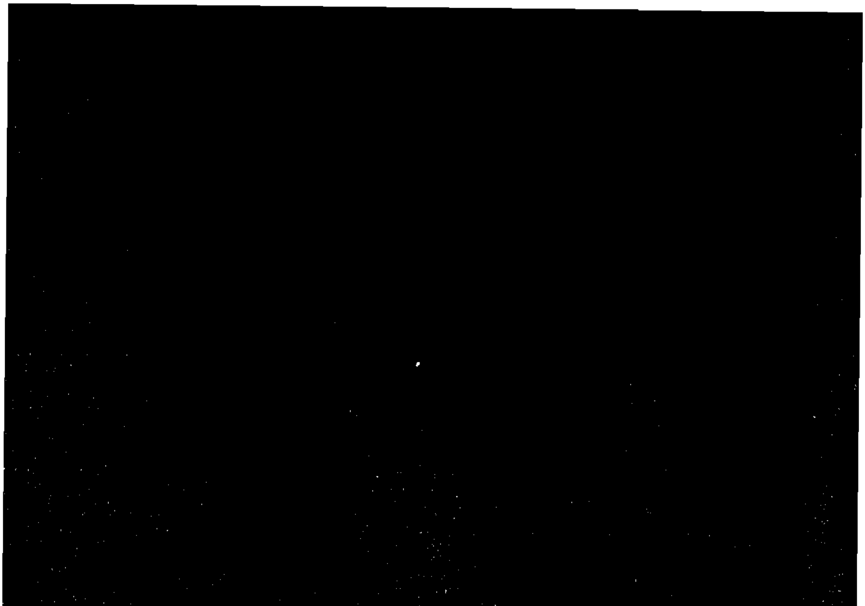
"یہ بات کس حیثیت سے دریافت کر رہے ہو؟" خواجہ معظم نے غصے سے کہا۔

"شہنشاہِ ہندوستان کی حیثیت سے۔"

"بادشاہ کو کسی کی بیوی کے بارے میں پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"ہمیں پورا حق ہے۔"

"ہماری بیگم زہرا [illegible] بھا[illegible] شان میں [illegible]"



ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو ہم نے اُسے سزائے موت دے دی۔"

"آپ کو سزائے موت دینے کا کیا حق تھا؟"

معظم بہت حیران ہوئے "اپنی خواجہ عورت کو سزا دینے کا بھی حق نہیں ہے مجھے! کیا کہہ رہے ہو؟"

"کوئی حق نہیں ہے۔ قانون کی نگاہ میں آپ قاتل ہیں۔ اب ہم آپ کو سزا دینے آئے ہیں۔ سزائے موت ——"

"دیکھتا ہوں مجھے کون سزا دیتا ہے" خواجہ معظم نے اپنے خدمت گاروں کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے اپنی تلوار نکالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا مرزا مسعود بیگ نے اسے اپنی تلوار سے مار گرایا۔ اپنے ساتھی کو گرتا دیکھ کر دوسرا خدمت گار وہاں سے بھاگ گیا۔

اتنے میں بادشاہ کے امدادی بھی وہاں آ گئے۔ خواجہ معظم کو اب اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بادشاہ ان کے خلاف اتنا بڑا اقدام اٹھائیں گے۔ انھوں نے بڑی بے چارگی سے اکبر کی طرف دیکھا۔

"ہم اب بھی آپ کو موقع دیتے ہیں" بادشاہ نے کہا "اپنے بے قصور ہونے کا آپ کوئی ثبوت پیش کر دیں تو آپ کو بری کر دیا جائے گا۔"

"میں بالکل بے قصور ہوں" خواجہ معظم بڑی نرمی سے بولے۔

بادشاہ کے اشارے پر دونوں طرف سے دو دو آدمیوں نے خواجہ صاحب کو پکڑ لیا۔

"کیا اپنے بے قصور ہونے کا کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟"

"ضرور کر سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے حویلی میں اکیلے جانے دیا جائے۔"

"اکیلے کیوں؟ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔"

"تمھارا وہاں جانا مناسب نہیں۔"

"بالکل مناسب ہے۔ وہاں سے ہی کورا زہرا آغا قتل ہو ہی چکی ہیں اب صرف رشید آغا ہی

ہوگی۔ وہ بچی ہے ہم سے پردہ کہاں کرتی ہے"

"نہیں نہیں۔ حویلی میں جانے کا آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر میرے بے قصور ہونے کا ثبوت چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ہی پڑے گا"

"یہ نہیں ہو سکتا" بادشاہ نے حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم خود ہی ثبوت تلاش کر لیں گے"

بادشاہ حویلی میں گئے۔ وہاں بالکل سناٹا تھا سب غلام اور باندیاں شاید بھاگ چکے تھے۔ بادشاہ کے پیچھے خواجہ معظم کو زبردستی لے جایا جا رہا تھا۔

پشت والے کمرے میں تالا لگا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا "اس میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ہے"

بادشاہ نے اشارہ کیا۔ ایک آدمی نے تلوار سے کمرے کا تالا توڑ دیا۔ اندر کا حال دیکھ کر بادشاہ حیران رہ گئے۔ ایک چارپائی پر ایک ۱۵ یا ۱۶ برس کی لڑکی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے آنکھ کھول کر بادشاہ کی طرف دیکھا۔

بادشاہ کے اشارے پر اس کی رسیاں کاٹ دی گئیں۔ منہ کا کپڑا نکال دیا گیا۔ خوف زدہ لڑکی کو مرزا مسعود بیگ نے تسلی دی "ڈرو نہیں بیٹی۔ تمہیں بچانے کے لئے بادشاہ سلامت خود تشریف لائے ہیں"

"کیا یہی آپ کا ثبوت ہے؟" بادشاہ نے رشیدہ آرا کی طرف اشارہ کرکے خواجہ معظم سے پوچھا۔

خواجہ صاحب خاموش رہے۔ بادشاہ نے رشیدہ آرا سے پوچھا "تمہیں کس نے [illegible] تھا؟ خواجہ معظم نے؟"

"جی ہاں"

[illegible]

"لیکن تمہارے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟"

"وہ میرے ساتھ زبردستی شادی کرنا چاہتے تھے۔ میری آپا کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے مجھے باندھ دیا" رشیدہ آرا بہن کی یاد میں آنسو بہانے لگی۔

"کہاں ہے تمہاری آپا؟"

رشیدہ آرا آگے آگے چلتی ہوئی ایک تہہ خانے کے دروازے کے سامنے جا کر رک گئی۔ تہہ خانے کا تالا توڑا گیا۔ فرش پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ ایک طرف زہرا آرا کی لاش پڑی تھی۔ لاش خون سے لت پت تھی۔ چھاتی پر خنجر کا زخم تھا۔ رشیدہ آرا غش کھا کر لاش پر گر پڑی۔

"بے وقوفی کا سب سے بڑا ثبوت یہی تھا؟" بادشاہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے "کیا اب بھی کچھ کہنے کی گنجائش ہے؟"

خواجہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"جواب چاہئے" بادشاہ گرجے۔

"مجھے کچھ نہیں کہنا ہے" خواجہ معظم نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں سزائے موت دی جاتی ہے" بادشاہ نے حکم سنایا پھر مرزا مسعود بیگ سے بولے "اس کے ہاتھ پیر باندھ کر جمنا میں پھینک [illegible]"

اب تک اور بہت سے لوگ آگئے تھے۔ مرزا مسعود بیگ نے موقع کی نزاکت کا احساس کرکے دیکھا کہ اس بار ایک قاصد بھیج [illegible] بھاگا ہوا گیا کہ میر جان بخش [illegible] کو لے آئے تھے۔ بادشاہ نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

بادشاہ نے زہرا آرا کی لاش [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

مرزا مسعود بیگ نے آگے بڑھ کر جلدی سے عرض کیا: [illegible] ہے لیکن وہ [illegible] نہیں ہے۔"

بادشاہ نے کچھ سوچا پھر کہا: "اسے باہر نکال لو اور کوتوال کے حوالے کر دو۔ وہاں اسے پھانسی دے دی جائے گی۔"

جس وقت بادشاہ حرم میں پہنچے آدھی رات بیت چکی تھی۔ شاہزادی جودھا بائی انتظار کر رہی تھیں۔ بادشاہ کی آمد سے پہلے ہی محل میں سب خبریں پہنچ چکی تھیں۔

بادشاہ تھکے ہوئے تھے اور اداس بھی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے تھوڑی دیر بعد بولے: "زہرا آغا کی موت کا افسوس ہے ہم نے انتہائی کوشش کی لیکن وقت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔"

جودھا بائی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر بعد بادشاہ پھر بولے: "تمہیں کیا ہو گیا جودھا بائی؟"

"کچھ نہیں جہاں پناہ" جودھا بائی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "آج تو آپ بہت تھک گئے ہوں گے"

"ہاں، کچھ تھکان ضرور محسوس کر رہا ہوں"

بادشاہ نے جودھا بائی کے آنسو دیکھ کر کہا "زہرا آغا کے مرنے کا بہت افسوس ہے نا تمہیں؟"

"افسوس نہیں ہے جہاں پناہ، مجھے تو اس کی قربانی پر ناز ہے۔ آج سب کو آپ کے انصاف پر بھروسہ ہو گیا ہے۔ جس متحدہ سلطنت کا خواب آپ دیکھا کرتے ہیں اس کی بنیاد زہرا آغا کے قتل سے مضبوط ہو چکی ہے۔"

"کاش ہم خواجہ جعفر کے پاس پہلے پہنچ جاتے یا مسعود بیگ کو وہاں نہ بھیجتے تو شاید اس کی جان بچ جاتی" بادشاہ دھیرے دھیرے بولتے رہے "لیکن شاید وقت کو یہ منظور نہیں تھا۔"

بادشاہ آگے بات پوری نہ کر سکے۔ ان کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھی چھلک آئے۔



"جہاں پناہ، میں نے اپنی موجودگی میں ان پر کوئی آنسو گیس نہیں چھوڑی۔ یہ صرف ایک ساڑھی کیلئے اس نے [illegible] رہے ہیں"

وقت میری عمر ۲۲ سال [illegible] اور صاحب
اُس وقت مقبول [illegible] میں سے ہم اسے کی
ڈگری بھی لی تھی میں بہت خوش
تھا۔ مگر اس ڈگری کو حاصل کرنے کے
لئے اتنے امتحان پاس کرنے پڑے کہ

[illegible] پاس [illegible]
کیا ہو سکتی تھی؟ اگر [illegible] ہوا اور [illegible] کا جواب
تھا۔ پھر میرا میڈیکل ٹیسٹ ہوا اور مجھے ایک
ہفتے تک اپائنٹمنٹ آرڈر کے لئے انتظار
رہنے کے لئے کہا گیا۔

آخر کار میں نے سرکاری نوکری حاصل
کر ہی لی۔ مجھ سے زیادہ خوش قسمت بھلا
کون ہوگا؟ میں نے جو چاہا وہ حاصل کر لیا
تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے میرا جوش
سرد پڑتا گیا اور فکر بڑھتی گئی۔ ہفتہ گزر جانے
کے بعد بھی میرا اپائنٹمنٹ آرڈر نہیں آیا۔

طنز • ایس شری دھر

سب سے پہلے نکمے



میں بور ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے آئی اے ایس
کے چکر میں پڑنے کی میری ہمت نہیں پڑی۔
جب کہ یہ امتحان دینا نوجوانوں کا مشغلہ بن
چکا ہے۔

آئی اے ایس امتحان نہ دینے پر بھی
میں سرکاری نوکری کرنا چاہتا تھا۔ پشتوں
سے میرے خاندان کے لوگ سرکاری گزیٹڈ
افسر ہوتے آئے ہیں۔ پھر بھلا میں اپنی خاندانی
روایات سے الگ رہنے کی بات کیسے سوچ
سکتا تھا۔

ایک وزارت میں اسسٹنٹ کے عہدے
پر کام کرنے کے ایک اشتہار کے جواب میں
میں نے بڑے جوش و خروش سے درخواست
بھیجی۔ جان پہچان والے کچھ بڑے لوگوں نے
بتایا کہ سرکار جلد ہی ایک نیا شعبہ کھولنے
جا رہی ہے اور ابھی سے اس میں لئے
جانے والوں کے [illegible] بعد میں بڑا افسر بننے کا

جب پندرہ دن گزر گئے تو مجھے شک ہوا کہ
کہیں میرا اپلیکیشن رد تو نہیں کر دیا گیا۔ جب
زیادہ انتظار نہیں ہو سکا تو میں نے اس شعبہ
کے متعلق افسران سے ملنے کی ٹھانی۔ انھوں
نے میری بات بہت اطمینان سے سن کر
کہا "میں تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ آپ کام کرنا
شروع کر چکے ہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں
ہے۔ آپ جا کر متعلقہ افسر سے ملئے۔ ان کے
پاس آپ کی فائل ہے۔ وہ آپ کو بتائیں
گے کہ کیا بات ہے؟"

متعلقہ افسر کے پاس جاتے وقت میں
سوچنے لگا کہ وہ افسر جس نے میرا انٹرویو
لیا تھا، میرا اپلیکیشن کر کے بیٹھ گیا۔ اس
نے اس بات کی طرف دھیان کیوں نہ دیا
میں آ گیا کیوں نہیں بلایا گیا۔ اب مجھے کام پر
[illegible] کسی قدر [illegible] کام ہوگا۔ متعلقہ
افسر کے پاس [illegible] نے بتایا کہ یہ

اپائنٹ منٹ آرڈر ابھی ٹائپ [illegible]
اصل میں ٹائپسٹ صاحب دو [illegible] میں
کیا کریں؟ جیسے ہی ٹائپسٹ آتا ہے آپ کا [illegible]
اور تین دن میں تقرری کی اطلاع بھی بھیج
جائے گی۔"

وہاں سے جان آئی اور میں گھر لوٹا۔ میری عجیب بات تھی کہ ڈاکٹروں نے میری جانچ کر کے ٹھیک سمجھ لی مگر رپورٹ بھیجنے میں اتنی دیر لگا دی۔ بڑی امیدوں کے ساتھ میں انتظار کرنے لگا۔ ہر روز بڑی

[redacted]



بے چینی سے گزر رہا تھا۔ میری الجھن بڑھ رہی تھی۔

ایک ہفتہ گزرا۔ دس دن بیتے، پھر بھی آرڈر نہیں آیا۔ میں متعلقہ افسر کے پاس پھر گیا۔ وہ بولے "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ ابھی انتخاب کئے ہوئے لوگوں کی لسٹ گم ہو گئی ہے، ابھی ڈھونڈھ رہا ہوں۔ آپ دو دن اور انتظار کیجئے۔"

اس طرح اس نے مجھے پھر ٹال دیا۔

میرے دوست سمجھ گئے کہ میں نے نئی نوکری کی بات محض گپ شپ ہی اڑا دی ہے۔ جب کبھی میں ان سے کچھ دن اور انتظار کرنے کے لئے کہتا، ان کا شک یقین میں بدلتا جاتا تھا۔ ان دو دنوں میں خوشی کے مارے میرا کھانا پینا تک چھوٹ گیا۔ لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔

میں پھر اس افسر کے پاس گیا تو وہ بگڑ اٹھے۔ "[illegible] غلطی ان کی نہیں میری ہی

ہو۔ لیکن اس بار میں اپائنٹ منٹ آرڈر مانگنے کے لئے نہیں بلکہ اسے جلدی نکلوانے کے لئے گیا تھا۔ میں نے انہیں ۵۰ روپے دیئے، جو انہوں نے بنا کسی حیل و حجت کے لے لئے، یہاں تک کہ شکریہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ پھر دوسرے ہی دن وہ لفافہ میرے یہاں پہنچ گیا جس کا میں اتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

اپائنٹ منٹ آرڈر پانے کے دوسرے ہی دن ٹھیک ساڑھے نو بجے، میں کام شروع کرنے کے لئے آفس جا پہنچا، لیکن وہاں مجھے خالی عمارت ہی ملی۔ صرف ایک بوڑھا چپراسی دکھائی دیا جو کمر دوہری کئے فرش جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "دفتر دس بجے کھلتا ہے یا بعد میں؟" میری طرف دیکھے بغیر جواب میں اس

[illegible]

[illegible] کام کے [illegible]

[illegible] کہ کام [illegible]

پھر سے کوئی [illegible] کبھی نہیں

[illegible] پاس سے دن بھر [illegible] میں [illegible]

یا یہ آدھ دن میں [illegible] رہا اور [illegible]

کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ جو کچھ کام

دستیاب تھا میں نے دو دن کی تنخواہ بنائی۔

تیسرے دن مجھے کمرے میں ایک نئی

میز کرسی دکھا دی۔ میرا ٹھکانہ بدل گیا۔

افسر نے مجھے بلا کر کچھ چارٹ اور کچھ اعداد و

شمار دیے۔

"ان کی ٹیبل بنائیے" انھوں نے کہا۔

"لیکن سر.... سر!" میں نے گھبراتے

ہوئے کہا "میں نے پہلے کبھی یہ کام نہیں کیا

ہے۔ اگر کوئی سمجھا دے تو..."

"غلطی کر کے سیکھا جاتا ہے" انھوں نے

مجھے صلاح دی اور ہاتھ کے اشارے سے

واپس جانے کو کہا۔

اس طرح میرا کام شروع ہو گیا۔

کام کرنے پر مجھے پتہ چلا کہ کام کوئی زیادہ مشکل

نہیں تھا۔ میں محنت اور ایمان داری سے

کام کرتا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے دوسرے

ساتھیوں میں یہ بات [illegible]۔ ہم باتیں

کرتے تھے، ہنسی مذاق کرتے تھے اور ایسی

ایسی گندی باتیں کرتے تھے کہ میرا سر

چکرا جاتا تھا۔ جب [illegible] کا [illegible] چاہئے

پہنچ [illegible] جاتا۔ وہ [illegible] کام پورا

کر کے اپنے افسر کو دے دیا۔

"تم نے اتنی جلدی کیوں کر لیا؟" وہ

بولے "یہ کام تو تمہیں دو دن کے لئے دیا

گیا تھا۔ اب تمہیں اور کیا کام دیں؟ [illegible]

[illegible]۔ تم [illegible] جا کر کہیں [illegible]

[illegible]"

نے جواب دیا "[illegible] یہاں [illegible]

کوئی وقت پر نہیں آتا۔ سب آدھا گھنٹہ

دیر سے آتے ہیں اور آدھا گھنٹہ پہلے چلے

جاتے ہیں۔"

راز کی یہ بات بتا کر وہ چلا گیا۔ میں

نے آدھا گھنٹہ ان اچھی میز کرسیوں اور

رجسٹروں کے بیچ گزارا۔ اپنی گھبراہٹ

دور کرنے کے لئے کبھی اپنے جوتوں سے

کھیلتا رہا اور کبھی چشمہ صاف کرتا رہا۔

آدھ گھنٹے [illegible] سرکاری [illegible] کا

[illegible] شروع [illegible] ایک سے ایک گندے

[illegible] ان میں سے کچھ

کے کپڑوں [illegible] کی بو آ رہی

تھی [illegible] نے مجھے [illegible] کر جنہیں

[illegible] کر [illegible] بات ہی کی۔ ان کے بیچ

[illegible] گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میری خواہش

[illegible] کر میں [illegible]

[illegible] میں اپنا [illegible]

[illegible] ایک ادھیڑ عمر [illegible]

[illegible]

[illegible] سر!" [illegible]

ساتھ [illegible]

تو [illegible] لڑکوں کو [illegible]

[illegible]

"[illegible] ساتھی تھا [illegible]

نے [illegible]

میں [illegible] کر [illegible]

نے [illegible] کہا "ارے [illegible]

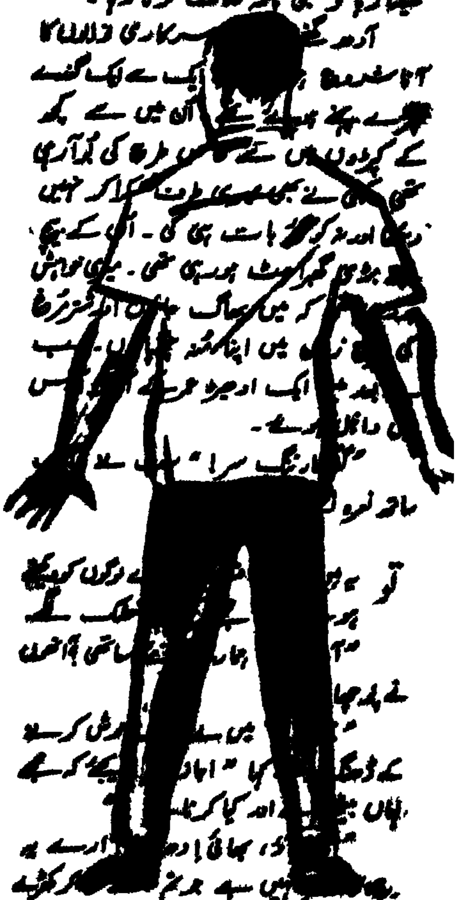
یہاں [illegible] اور کیا کر [illegible]

[illegible] بھائی [illegible] ارے یہ

[illegible] سب [illegible]

ہے۔ یہاں ہم لوگ آرام سے کام کرتے ہیں۔

تمہارے آپ کو تھکا رہے ہو۔"



[illegible]
مجھے اسے برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا
اور میرے ساتھی چہرہ پریشانی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اسی لئے میں نے بھی بوریت دور کرنے کے لئے کینٹین میں جاکر ایک پیالہ چائے پینا ٹھیک سمجھا۔ جب میں وہاں تب بھی کوئی کام نہیں کر رہا تھا، لیکن وہ پہلے سے کہیں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ مجھے حاضری کا رجسٹر دیا گیا اور لوگوں کی حاضری بھرنے کے لئے کہا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کے لئے ایم اے پاس کی کیا ضرورت تھی۔

جب کسی طرح وہ دن گزرا تو میں گھر جانے کے لئے اٹھا۔ دوسرے لوگ رکے رہے۔ افسر نے مجھے بتایا کہ کئی پینڈنگ کاموں کو پورا کرنے کے لئے رک رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس کام کو دن میں کیوں نہیں کیا گیا جبکہ سب بے کار بیٹھے رہے یا چائے پیتے رہے؟ افسروں نے ناراض ہو کر مجھے ایسے دیکھا، جیسے، یہ مجھے ڈانٹ کر نکال رہا ہو۔ کسی کو بھی دفتر کے بعد رکنے کے لئے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ سب خود بخود رک جاتے تھے۔ اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ سب کو اوور ٹائم کام کرنے کا پیسہ ملتا تھا۔

ماحول یہی؛ کچھ دن بعد، میں نے تجربہ ایسے کیا کہ میں بھی اس سانچے میں ڈھلتا جا رہا ہوں۔ ایک دن میں نے دیکھا، سب کے سب عجیب طریقوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا۔ افسر سے پوچھا تو پتہ چلا کہ آج [illegible] ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس میں [illegible] سے ایک [illegible] آتا ہے۔ اس لئے سب کے سب اچھی

[illegible] دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ سب پسند نہیں تھا، اس لئے میں نے آڈٹ جانے کے لئے کوئی خاص کام نہیں کیا۔ کچھ دن بعد میرا نام کانفرنس میں جانے کے لئے تجویز کیا گیا۔ پہلے تو مجھے تعجب ہوا، مگر جلدی ہی وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ کانفرنس آڈٹ میں نہ ہو کر دلّی میں ہونے والی تھی۔

میں کلرک ہی نہیں، افسر بھی سوتے تھے۔
آفس میں تھے۔ اس کانفرنس کے لئے پروگرام کی لسٹ بنا کر ہم لوگوں نے ڈائریکٹر کے پاس بھیج دی تھی۔ ایک ہفتے تک وہ اُن کی میز پر پڑی رہی۔ ہفتہ بیت جانے پر وہ گھبرائے ہوئے ہمارے کمرے میں آئے اور بولے، "تم لوگ کتنے بے وقوف ہو، کوئی بھی ہوتے



مجھے بتایا گیا کہ دفتر کے سب لوگ ایک ساتھ جھاڑو لگاتے ہیں

[illegible] سادی اتنی غلطیاں نہیں کر سکتا۔ چاہے تم سب کو ساری رات جاگ کر کام کرنا پڑے، تو یہ کام کل سویرے تک مجھے ٹھیک حالت میں ملنا چاہئے۔

ہمارے افسر نے کہنے کی کوشش کی کہ یہ کام ایک ہفتہ پہلے بھیجا گیا تھا، پہلے کیوں نہیں دیکھا گیا؟ مگر ڈائرکٹر صاحب اَن سُنی کر کے نکل گئے۔ پھر کیا تھا، ہم لوگوں نے ساری رات جاگ کر کام کیا۔ کام پورا ہو جانے پر ہمارے افسر نے ڈائرکٹر کو فون کر کے پوچھا کہ کیا پروگرام کی کاپی آپ کے پاس بھیج دی جائے؟ انھوں نے کہا کہ وہ آ کے دوسرے دن ہی دیکھیں گے۔ پھر ہم لوگوں سے بات ہوئی کہ محنت بیکار کرائی گئی؟ اگلے دن ڈائرکٹر صاحب نے معذرت آمیز لہجے میں کچھ کہا اور پھر سب نے اُن کی تعریف کی۔

ایک بار مجھے ایک چارٹ بنانے کے لئے کہا گیا۔ مجھے ریسرچ کا کچھ تجربہ تھا، اس لئے میں نے وہ کام بہت اچھی طرح کیا۔ جب اڈیشنل سکریٹری نے یہ جاننا چاہا کہ وہ کام کس نے کیا ہے تو میرے افسر نے خود [illegible] شرطیں آ سکے گا۔

دفتر کے ساتھیوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہی ہو گیا۔ افسر ہی جاننے کے بعد مجھے لگا کہ ایک نئے ملازم سے میں نے کچھ ٹھیک دیا گیا جو میرے افسر نے مجھ سے کام پر آنے والے دن کہا تھا۔ میں نے تو اس سے بھی آگے ایک صلاح کی بات اٹھائی۔

"اگر تم کام نہیں کرو گے تو شکست کھاؤ گے اور اگر کرو گے تو ہوشیار سمجھے جاؤ گے۔ شستی سے رہنا ہی اچھا ہے، کیونکہ ہوشیاری دکھائی تو سب کام تم ہی پر ڈال دیا جائے گا۔"

میں اب ڈائرکٹر ہوں۔ میری عمر ۴۰ برس کی ہے اور میرا خاندان مختصر ہے۔ میرا لڑکا ۱۶ برس کا ہے۔ ابھی سے وہ اتنا ہوشیار اور چالاک ہو گیا ہے جتنا کہ میں ۲۵ برس میں تھا۔ وہ کہتا ہے "میں انجینئر یا ڈاکٹر وغیرہ نہیں بنوں گا، میں تو آپ کی طرح کسی دفتر میں سرکاری نوکری کرنا پسند کروں گا۔" میں اسی کشمکش میں ہوں کہ کیا کرنا چاہئے۔

ہوائی کار

جرمنی میں ایک ہوائی کار تیار ہوئی ہے جس میں دو پنکھے لگے ہیں ایک بائیں سے دائیں طرف چلتا ہے اور دوسرا اس کے برعکس۔ دونوں پنکھے اپنی اپنی سمتوں میں چلنے لگتے ہیں تو ہوائی کار اوپر اٹھ جاتی ہے۔ ایک مخصوص بٹن دبانے پر یہ کار ہیلی کاپٹر بن کر ہوا میں اڑنے لگتی ہے اور بوقت ضرورت سڑک پر پہیوں کے ذریعے چل بھی سکتی ہے۔

اس کی رفتار ۸۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے، ہیلی کاپٹر بن کر یہ [illegible] میٹر تک اونچا جا سکتی ہے۔ اگر اس کی پیٹرول کی ٹنکی ذرا بڑی ہو تو یہ زیادہ اونچائی تک جا سکتی ہے۔ اس کا استعمال زیادہ تر ٹریفک کی روک تھام کے لئے مناسب ہے جس میں ایک سپاہی ہوا میں اُڑتے ہوئے بھی سڑک کے ٹریفک کو کنٹرول کر سکتا ہے۔ مستقبل قریب میں ہی اس کو مختلف شعبوں میں بھی استعمال کیا جائے گا۔



شراب اور شباب

سلسلہ وار ناول — جان او [illegible]

گذشتہ سے پیوستہ

شہنشاہ جہانگیر کا شاہی [illegible] تھا۔ اس کا [illegible] نے اسے ایک معتبر منصب دار زعیم کو ایک مہم [illegible] سامنے تھا زعیم کو غلط اطلاعات کر دی جانے کی [illegible] وہاں ایک [illegible] کو دیکھ کر وہ اس پر حملہ آور ہوا [illegible] زعیم بھی ایک قافلے کے ساتھ ہو لیا۔ ایک پہاڑ پر [illegible] ایک گھڑ سوار [illegible] کر دیکھ کر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ [illegible] وہ گھبرا کر بھاگ گیا، زعیم نے فوراً اپنے گھوڑے کی [illegible] کے کنارے کھڑا پایا۔ وہ گھبرا سا کر آ [illegible] تھا [illegible] کچھ ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ اور آس [illegible] دیں چھوڑ کر وہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ [illegible] اس [illegible] گھوڑے کی ایک [illegible] سی دیکھی۔ اور جھانکنے پر اس نے دیکھا کہ [illegible] پر عجیب ۲۵ آدمی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ زعیم فوراً اپنے قافلے کی [illegible] سردار [illegible] کو [illegible] کہا کہ ان کے قافلے پر بھیڑیے ڈاکو حملہ کرنے والے ہیں۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ [illegible] کی حفاظت کی [illegible] اپنی ماں کے ساتھ برقع پوش نوجوان لڑکی کا اغوا کرنا چاہتے ہیں، جو کہ ان کے قافلے کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔

قافلے کا سردار اپنے قافلے کو ڈاکوؤں کے حملے سے بچانے کے لئے بڑی ہوشیاری سے ان کے سردار سے ملا اور برقع پوش لڑکی اس کے سپرد کرنا چاہتے کی ترکیب مرتب کی۔ مگر زعیم کی ہوشیاری اور بہادری سے [illegible] سردار کا منصوبہ عمل پیرا نہ ہو سکا [illegible] زعیم [illegible] لڑکی اور اس کی ماں کو اس سازش سے [illegible] گیا۔

زعیم کو اس بات کا [illegible] پریشان [illegible] تھا [illegible] کے گھوڑوں پر سفر کر رہی تھیں۔ قافلہ [illegible] تھے۔

ایک جگہ ان کے سامنے [illegible]

[illegible]

[illegible] بعد بیل سے بیں [illegible]

[illegible] دکھوں کو اور بھی گہرا کر دیا تھا۔ [illegible]

[illegible] سے رو تا اور ایک جان باز [illegible]

[illegible] بہت مختصر تھی اور لڑکی نے آنکھ سے [illegible]
[illegible] کرے پھول اٹھا کر آنسو کی [illegible]
[illegible] کا منتظر نظر بنے ہیں [illegible]
[illegible] جہاں تک ممکن ہو سکا وہ لڑکی کے [illegible]
[illegible] میں سے اپنی طرف لگتے ہوئے [illegible]
[illegible] اب وہ کبھی دوبارہ نہیں ملیں گے۔
[illegible] نہیں ملیں گے' ادھیڑ عمر عورت [illegible]
[illegible] رہے تھے۔ [illegible] آتا تھا کہ اب [illegible]

[illegible]

رستم ابھی اس نظارے کو ٹھیک طرح دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ پیچھے ہونے والی [illegible] وہ چونک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سامنے ایک خونخوار [illegible] کھڑا اُسے غضب ناک نگاہوں سے گھور رہا تھا اور دُم بھی ہلاتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو رستم ہڑبڑا اُٹھا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل گیا اور چیتے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار۔ چیتا کچھ دیر تو اُسے گھورتا رہا، پھر خراماں خراماں چلتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ رستم ذرا کر پیچھے ہٹ گیا لیکن چیتے پر نظریں جمائے رہا۔

اُسی وقت چبوترے کے کنارے سیڑھیوں سے آتا ایک آدمی دکھائی دیا۔ وہ چیتے کی طرف لپکا اور اُس کی گردن میں لوہے کا پٹہ ڈال دیا اور رستم سے بغیر کچھ کہے چیتے کو لے کر واپس چل دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں چابک تھا جسے وہ چیتے کے اُوپر ہوا میں گھما رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں چیتا اور اُس کا مالک دونوں سیڑھیوں سے نیچے اُتر کر غائب ہو گئے۔ چبوترے کے کنارے سے رستم اُنہیں پُل پار کرتے اور سیڑھیوں کے نیچے اُترتے ہوئے دیکھتا رہا۔

آگے جانے کے لئے کسی راستے یا سیڑھی کی تلاش میں رستم نے چبوترے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ وہ دُوسرے سرے پر آ گیا اور نیچے سیڑھیوں سے اُتر کر صحن میں پہنچ گیا۔ صحن کے سامنے کمرے تھے جو محرابوں میں سے دکھائی دیتے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی طرح استعمال کئے جاتے تھے۔ بالائی چبوترہ، جہاں سے وہ اُترا تھا، دراصل عمارت کی چھت تھی۔ چٹان کاٹ کر بنائے گئے کمروں کا رُخ مشرق سے مغرب کی طرف تھا۔ وہ اِس طرح بنائے گئے تھے کہ اُن میں دن کے وقت کافی روشنی رہتی تھی۔

اُس کی معلومات کے مطابق یہ حکیم کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اُس نے اندر گھسنے کا اِرادہ کیا۔

"تم کون ہو نوجوان؟"

رستم نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن اُسے کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر اُس نے اپنے بائیں طرف مڑ کر دیکھا تو کھچڑی داڑھی اور گنجے سر والا ایک آدمی نظر آیا۔

"کیا حکیم شہاب یہیں رہتے ہیں؟" رستم نے پوچھا۔

"ہاں، حکیم صاحب یہیں رہتے ہیں۔ فرمائیے۔ میں اُن کا ملازم مراد بخش، آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"مجھے مدرسے کے [illegible] کسی سلسلے میں بھیجا ہے مُراد۔"

لہجہ میں شائستگی تھی لیکن آواز بڑھاپے کے سبب کانپ رہی تھی۔

مُراد فوراً اُٹھا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا چپ چاپ کمرے سے باہر دروازہ پار کر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم ذرا رک کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

[illegible] ایک عالی شان کمرے میں کھڑا تھا۔ یہ آخری کمرہ تھا۔ اُس طرف [illegible]
[illegible] قسم کے [illegible]

کمرے میں بھی الماریاں رکھی تھیں۔ کچھ الماریوں میں ٹین کے ڈبے، تانبے کی پتیلیاں اور کاغذ کے ڈھیر اور کتابیں رکھی تھیں۔ رستم نے کونے میں رکھی انگیٹھی کی طرف دیکھا جس میں آگ اب بھی دہک رہی تھی۔ پاس ہی دھونکنی پڑی تھی۔ کمرہ اچھا خاصا مطب نظر آرہا تھا۔

دوسرے سرے پر کھڑکی کے پاس بھاری تختہ رکھا تھا۔ ایک طرف ایک عمر رسیدہ آدمی پُر وقار ڈھنگ سے بیٹھا ہُوا تھا۔ سر پر چپکی کالی ٹوپی میں سے برف کی طرح کچھ سفید بال نظر آرہے تھے۔ گہری جھریوں سے بھری چوڑی پیشانی، لمبی اور چوڑی ناک، اور تیز چمکدار آنکھیں جو اُوپر جھکے سفید ابروؤں سے بالکل ڈھک گئی تھیں۔ وہ کالے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے زیب تن کئے ہوئے تھا۔ تخت پر قلم، دوات اور کاغذ پڑے تھے۔ وہ ایک کاغذ پڑھ رہا تھا، جسے اپنے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے قریب کئے ہوئے تھا۔ دُوسرے ہاتھ میں پَر کی قلم تھی۔ جیسے ہی مُراد اُس کے قریب پہنچا اُس نے کاغذ سے نظریں اُٹھائے بغیر کہا "مُراد شیشی بھر دو۔"

مُراد نے تخت سے پتھر کا ایک سیاہی دان اُٹھایا اور اُسے قریب رکھی الماری سے ایک شیشی نکال کر بھر دیا۔

"کافی ہے، مُراد۔ کیا تم نے آج صبح خان کو دوا دی تھی؟"

"ہاں، مالک۔"

"تم نے ہدایات دی تھیں؟"

"دی تھیں، مالک۔"

"ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔ دوبارہ سونا مت۔ دواخانے کے قریب بیٹھے رہنا۔"

مُراد جانے کے لئے مُڑا، تبھی حکیم نے ذکر کے بیچ رُستم کو دیکھ لیا۔ اُس نے اُس کی طرف گھورتے ہوئے پُوچھا "یہ کون ہے؟"

رستم نے آگے بڑھ کر ادب سے سلام کیا اور کہا تھا۔

"جناب حکیم صاحب، میں اجمیر سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ بادشاہ بیگم نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی اُن کا ایک خط بھی آپ کے نام ہے۔"

حکیم صاحب نے ہاتھ بڑھا کر خط رستم سے لے لیا۔ اُنہوں نے مہر کو غور سے دیکھا، پھر توڑا اور خط آنکھوں کے قریب لے جا کر پڑھنے لگا۔ ذکر کرا ابھی تک کمرے میں دیکھ کر اُس نے کہا "مُراد گھڑا خالی ہے۔ جاؤ، اسے بھر لاؤ۔"

جب مُراد گھڑا لے کر باہر چلا گیا تو حکیم رستم سے مخاطب ہوا۔

"نوجوان، بیگم بادشاہ نے خط میں جو کچھ کہا ہے وہ ناممکن ہے۔ میں نے پچھلے دو برس سے ہر جگہ آنا جانا بند کر رکھا ہے۔ میں صرف اُن کا علاج کرتا ہوں جو یہاں آتے ہیں۔ ویسے بھی اتنی دُور دراز جگہ کے لئے سفر کرنا اب اِس عمر میں میرے لئے ممکن نہیں۔ لیکن میں یہ بیگم کی جرأت بھی نہیں کر سکتا کہ مغل شہنشاہ خود میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔"

"جناب عالی، بیگم بادشاہ کی پُرخلوص التجا کو نامنظور کرنے سے پہلے آپ اُس پر اچھی طرح غور کریں" رستم نے کہا "التجا کرنا اُن کی شان کے خلاف ہے۔ وہ صرف حکم دیتی ہیں اور ان کے

شہنشاہ خاوند کی وسیع سلطنت میں اُن کے حکم کی ہر حال میں تعمیل کی جاتی ہے۔"

"تم نے صحیح کہا نوجوان، لیکن میں اُن کے حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ میں اُن کی رعیت نہیں ہوں۔"

حکیم کی جرأت اور صاف گوئی پر رُستم اُسے حیرت سے تکتا رہ گیا۔ اُس کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں کوئی بادشاہ بیگم اور شہنشاہ جہانگیر کی شان میں بے ادبی کرنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے۔

"جناب، آپ پہلے شخص ہیں، جسے میں نے ملکۂ معظمہ اور شہنشاہ عالم کی شان میں گستاخی کرتے دیکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیگم بادشاہ نے جو آپ کو عزت بخشی ہے وہ آپ کو منظور نہیں۔ سلطنت کے اِتنے بڑے بڑے حکیموں کو نظر انداز کر کے اُنہوں نے مجھے اِتنی دُور آپ کو بُلانے کے لئے بھیجا ہے، یہی کیا کم ہے۔ اگر بادشاہ سلامت شفا یاب ہو گئے تو آپ کو مُنہ مانگا انعام ملے گا۔"

"نوجوان، کوئی بات کہنے سے پہلے اُس پر غور کر لینا اچھا ہوتا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اِس لالچ اور دھمکیوں سے متاثر ہو جاؤں گا؟ نہیں، کبھی نہیں۔ خُدا کے فضل سے ۹۰ کے سِن میں ہُوں۔ اب میری زندگی کا مقصد صرف آنے والی نسلوں کے لئے علم طب کے بیش قیمتی اور مفید نسخے لکھ کر چھوڑ جانا ہے۔ شہنشاہ کی مجھ جیسے آدمی کو انعام و اکرام سے مالا مال کرنے کی کیا اوقات ہے!"

"حکیم صاحب، میں جانتا ہوں کہ اِس ضعیف العمری میں پیسے کی آپ کے لئے اہمیت نہیں ہے۔ لیکن انعام آپ کو دولت کی شکل میں ملے گا، یہ بھی تو ضروری نہیں۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو شہنشاہِ عالم اِس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں آپ کی مشکلات کو آسان کر سکتے ہیں۔ اِس کے لکھنے کے لئے وہ کئی منشی آپ کی خدمت میں بھیج سکتے ہیں۔ آپ شاہی کتب خانے کے بیش قیمتی خزانے سے مدد حاصل کر سکتے ہیں، جس سے آپ کے کام کی سب مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ ایسے سیکڑوں طریقے ہیں۔"

"اور اگر میں علاج میں ناکام رہا تو؟ آخر میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدل تھوڑے ہی سکتا ہوں۔ ایک حکیم کے ناطے صرف شفا کے قدرتی طریقے سے مدد کر سکتا ہوں۔ فرض کرو کہ اگر میں علاج میں ناکام رہا تو مجھے کیا سزا ملے گی؟"

"مجھے اِس طرح کی کسی سزا کا علم نہیں ہے۔ آج تک دربار میں ناکام ہونے پر کبھی کسی حکیم سزا نہیں دی گئی" رُستم نے جواب دیا۔

"لیکن یہ بادشاہ کی مرضی پر ہے۔ کئی برس پہلے میں ایک سلطان کے دارالسلطنت میں حکمت کرتا تھا۔ اُن دنوں میں جوان تھا، دُنیاوی خواہشات، دولت اور شہرت حاصل کرنے کی مجھے ہمیشہ دُھن سوار رہتی۔ تبھی سلطان علیل ہوا اور انتقال فرما گیا۔ لیکن اُس کے مرنے کے ایک دن پہلے جن بدقسمت حکیموں نے اُس کا علاج کیا، اُنہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا کیونکہ وہ اُسے شفا یاب نہیں کر سکے تھے۔ بس ایک میں تھا جو لوگوں کی نظروں سے بچ کر بھاگ نکلا۔

"لیکن خواہشات اور شہرت نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میں بیس برسوں تک اِدھر اُدھر مارا مارا

پھرتا رہا۔ اُنہی دِنوں میرا کئی شاہی خاندانوں سے واسطہ پڑا لیکن میرے دماغ میں اُن کے لیے کوئی عزت نہیں رہ گئی تھی۔ تبھی اچانک میری ملاقات رانا پرتاپ سے ہو گئی۔ میں نے برسوں اُن کی خدمت کی اور اُن کے بعد اُن کے چھوٹے رانا کی خدمت کی۔ وہ لوگ بھی بادشاہ تھے لیکن زندگی میں زیادہ تر وہ مغلوں سے بچ کر بھاگتے رہے۔

"تمہارے شہنشاہ جہانگیر اور ان کے والد اکبر نے اُنہیں بہت پریشان کیا اور پہاڑوں میں دھکیل دیا۔ میں اپنے سرپرست میواڑ کے راناؤں سے احسان فراموشی نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے دُشمن کی سُنہری چمک دمک میں کبھی نہیں پھنسے۔ ویسے مجھے اپنے پیشے کے اصول کے مطابق ہر ضرورت مند کے پاس جانا چاہیے۔"

حکیم نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "شہنشاہ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف عیش و عشرت اور شراب نوشی کی بیماری ہے۔ اُن کے مال خانے میں جتنی بھی شراب، افیم اور دُوسری نشہ آور چیزیں ہیں، سب سے پہلے اُنہیں وہاں سے باہر پھنکوا دیا جائے۔ پھر اُنہیں روز صبح شام اپنے باغ میں تفریح کے طور پر مٹی کھودنی چاہیے۔ اس کے علاوہ انہیں ہارون الرشید کی طرح بھیس بدل کر رعایا کی اصلی حالت سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ اِس مشورے پر عمل کریں تو اُنہیں شراب نوشی سے نجات مل سکتی ہے۔"

حکیم چُپ ہو کر گدّی پر لیٹ گیا۔ وہ اِتنی دیر بولنے سے تھک گیا تھا۔ مُراد گھڑا بھر کر لے آیا تھا۔

"کیا آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں حکیم صاحب!" رُستم نے پوچھا "کیا آپ یہی مشورہ دینا چاہتے ہیں؟"

"بہت سنجیدگی سے نوجوان، تمہارے شہنشاہ کی حالت کے لیے یہی مشورہ مفید رہے گا" پھر وہ مُراد سے مخاطب ہُوا "مُراد، اِس پانی سے ایک پیالہ بھر دو۔"

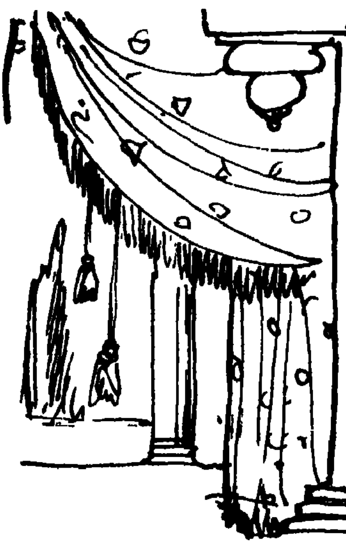
مُراد نے حکم کی تعمیل کی۔ حکیم نے چسکی لی۔

"آدمی کی پیاس بجھانے کے لیے اِس سے بہترین شے اور کوئی نہیں ہے" اُس نے کہا، "اِس کے بجائے آدمی نے اُلٹا راستہ اپنا کر صحت مند اور قدرتی پھلوں اور اناجوں کو کشید کر کے نقصان دہ شراب تیار کی۔ حضرت رسول اللہؐ نے، نشہ کے استعمال سے باز رہنے کی سخت تلقین کی ہے۔"

رستم خاموشی سے حکیم شہاب کی باتیں سُنتا رہا۔



حکیم کا مشورہ تھا "شہنشاہ کو کوئی بیماری نہیں صرف عیش وعشرت اور شراب نوشی کی بیماری ہے اُن کے مال خانے میں جتنی شراب، افیم اور دوسری نشہ آور چیزیں ہوں، سب سے پہلے اُنھیں دُور کیا جائے۔ پھر اُنھیں روز صبح شام اپنے باغ میں تفریح کے طور پر مٹی کھودنی چاہیئے..."



رستم تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس مسئلے کو کس طرح یہ سمجھایا جائے کہ وہ حالات کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ حکیم کو لئے بغیر لوٹ جانے کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ناکام رہا۔ اگر وہ ملکہ معظّمہ کو حکیم کا مشورہ بتائے تو اِس میں ملکہ کو اپنی توہین محسوس ہوگی۔ ویسے بھی جب سے وہ بادشاہ بیگم بنی ہیں خوشامد اور چاپلوسی کے سوا اور کچھ سُننا پسند نہیں کرتیں، اِس لئے اُس نے پھر حکیم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔

"جناب حکیم صاحب، میری ایک عرض ہے۔ آپ کی ذہانت اور تجربے پر شک کرنے کا حوصلہ مجھ ناچیز میں نہیں ہے۔ لیکن شراب کی لت میں پھنسے آدمی کو یہ صلاح دینا کہ شراب پینا بند کر دے، بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی لنگڑے سے کہا جائے کہ وہ لنگڑا کر نہ چلے۔ یا کسی زخمی آدمی سے کہا جائے کہ اُس کے جسم سے خون نہیں بہنا چاہیئے۔ میں بیگم بادشاہ کے سامنے صرف یہ مشورہ لے کر کیسے لوٹ سکتا ہوں!

"میں اِس وقت ترقی اور خوشحالی کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ بادشاہ بیگم کی مجھ پر نظرِ عنایت ہے۔ ظاہر ہے کہ ترقی کرنے کا مجھ میں عزم ہے۔ جو بھی جوانی کے اِس دور سے گزرا ہے۔ وہ میری اِس خواہش کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

"بیگم بادشاہ نے مجھے بڑی اُمیدوں سے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اُنہیں مایوس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر میرے لئے دربار میں کوئی مقام نہیں رہ جائے گا اور میرے سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے۔

"پھر اِس سے بھی بڑا سوال بادشاہ سلامت کی صحت کا ہے، جو کہ نہ صرف بادشاہ بیگم

کے لئے بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اگر صحت کی خرابی نے بادشاہ سلامت کو بستر پر لٹا دیا تو تخت کے وارثوں میں فوراً خونیں جنگ چھڑ جائے گی۔

"ذرا غور فرمایئے حکیم صاحب، اگر خانہ جنگی شروع ہو گئی تو بد نصیب رعایا کا کیا حال ہوگا! ذرا سوچئے تو کہ کتنے معصوم بچے، عورتیں اور آدمی کچھ سنگدل اور حرص و ہوس کے شکار لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن جائیں گے۔ خیال کیجئے کہ جنگ کے ساتھ قحط اور فاقہ کشی کا بھی دور دورہ ہوگا اور اس طرح کتنے بے قصور لوگ موت کا نوالہ بن جائیں گے!"

حکیم نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکا "بس بس، کافی ہے نوجوان! تم نے اپنی ملکہ کی طرف سے بہت اچھی وکالت کی ہے۔ میں تمہاری وفاداری کی داد دیتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چل تو نہیں سکتا لیکن اِس کے علاوہ تم بتاؤ کہ میں کس طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"



"میں اِس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اِس کا فیصلہ آپ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ اچھا تو یہ ہو کہ آپ اجمیر تشریف لے چلیں۔ اور خود ہی شہنشاہ عالم کا علاج کریں۔ میں آپ کے سفر کو حتی الامکان آرام دہ بنانے کی کوشش کروں گا؟"

"نہیں، یہ ممکن نہیں۔ میں درباروں اور بادشاہوں سے بہت اُکتا چکا ہوں۔ بادشاہ لوگ وفاداری اور خدمت کو بہت جلدی بھول جاتے ہیں اور ذرا سی بات پر پیچ پا ہو جاتے ہیں۔ صرف میواڑ کے رانا ہی ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی میں نے ایک طویل عرصے تک اُن کی خدمت کی ہے اور اُن کو بہت رحم دل پایا ہے۔

"تمہاری خاطر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ بادشاہ کے استعمال کے لئے ایک عرق دے دیتا ہوں۔ اِس عرق میں یہ خوبی ہے کہ اِسے پینے والا شراب سے نفرت کرنے لگے گا۔ لیکن اس کا اثر پوری طرح تبھی ہوتا ہے، اگر مریض اپنی مرضی سے اِس کا استعمال کرے۔ اس کو تیار کرنے میں تین چار دن لگیں گے۔ تب تک تمہیں ٹھہرنا پڑے گا، تم چاہو تو تب تک کسی خالی کمرے میں ٹھہر جاؤ، یہاں جو مریض آتے ہیں اِنہی کمروں میں ٹھہرتے ہیں۔ مراد تمہیں وہاں پہنچا دے گا اور تمہارے آرام کا خیال رکھے گا۔"

رُستم کے پاس سوائے حکیم کی بات ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ حکیم کے مشورے سے تو عرق ہزارہا درجے بہتر تھا۔ اب واپس جاکر وہ اپنے کام کا نتیجہ تو بادشاہ بیگم کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ رُستم نے حکیم کا شکریہ ادا کیا اور مُراد کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

مُراد نے رُستم کو ایک کمرے میں لے جاکر ٹھہرا دیا۔ اِس کمرے کا منہ بھی جنوب کی

طرف تھا اور یہاں سے سامنے دُور تک پھیلی وادی دکھائی دیتی تھی جس میں طرح طرح کے جنگلی پودے اور جڑی بُوٹیاں اُگی ہوئی تھیں۔ رُستم اپنا گھوڑا پہاڑی کے نیچے ہی چھوڑ آیا تھا مُراد کو ساتھ لے کر ایک اور راستے سے اپنا گھوڑا بھی اُوپر لے آیا۔ مُراد کو اُس نے کافی انعام دینے کا وعدہ کیا، جس سے اُس کی خدمت گذاری میں تیزی آگئی اور وہ دِل و جان سے رُستم کی خدمت کرنے لگا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ رُستم کو کمرہ بہت پسند آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مُراد کھانا لے آیا۔ اِس کے ساتھ ہی وہ دو موم بتیاں، ایک انگیٹھی اور گھوڑے کے لئے چارا بھی لے آیا تھا۔ رُستم کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

کھاتے وقت وہ مُراد سے یہ بھی پُوچھتا رہا کہ اُس کے مالک حکیم صاحب اور وہ اِس خوب صُورت وادی میں کس طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ مُراد جو کافی باتُونی نظر آتا تھا پُرانے قصے کہانیاں لے کر بیٹھ گیا۔ جس میں راناؤں کا ذکر پیش پیش تھا۔

"مُراد، ایسا لگتا ہے کہ حکیم صاحب کی طرح تمہارے دل میں بھی رانا پرتاپ کے لئے بہت عزت ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ تم سچے مسلمان ہوتے ہوئے بھی دینِ اسلام کے دُشمن اور بُت پرست کافروں کے سردار کی اِتنی عزت کیوں کرتے ہو اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کے کٹر دُشمن رانا پرتاپ نے اپنے علاج کے لئے ایک مسلمان حکیم کو ہی کیوں منتخب کیا؟"

"جی، جنہیں پُوری بات معلوم نہیں، اُنہیں یہ بات عجیب ہی لگے گی" مُراد نے جواب دیا "ہلدی گھاٹی کی لڑائی سے کچھ دِن پہلے کی بات ہے۔ اُن دنوں میں اور حکیم صاحب چھاؤنی میں تھے۔ تب میری عمر صرف پندرہ برس تھی۔ مان سنگھ مغلوں کا سپہ سالار تھا۔ ایک مغل سردار اُس کا نائب تھا، جس کی ماتحتی میں ہم تھے۔

"ایک روز تیسرے پہر مغل سردار نے حکیم صاحب کو کہلا کر بھیجا کہ وہ ایک ایسی نیند آور دوا تیار کریں جس کا کوئی ذائقہ نہ ہو۔ اِس دوا کو لے کر وہ شام کی دعوت میں آجائیں، جو کہ سردار کے خیمے میں ہونے والی تھی۔

"حکیم صاحب نے ہدایت کے مطابق دوا تیار کی اور اُسے لے کر سردار کے خیمے میں جا پہنچے جہاں وہ اور اُس کے دوست بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ حکیم صاحب کو دیکھتے ہی مغل سردار نے، جو نشے میں جھوم رہا تھا، پاس بُلا کر اُس دوا کے بارے میں پُوچھا۔ حکیم صاحب نے دوا کی شیشی اُس کے آگے رکھ دی۔ مغل سردار نے فوراً شیشی جھپٹ لی۔ اِس پر حکیم صاحب نے کہا کہ اِس دوا کا استعمال بہت احتیاط سے کیا جانا چاہئے ورنہ اِس سے جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ سردار نے تب ایک خالی پیالہ اُٹھایا۔

"حکیم صاحب، اِس میں دو عورتوں کے لئے دوا ڈال دیجئے۔"

"تو یہ دوا آپ کے اپنے لئے نہیں ہے" حکیم صاحب نے دوا اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے بالکل نہیں۔ میرے پاس نیند لانے کا اِس سے بہتر نسخہ ہے" مغل سردار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "حکیم صاحب میں آپ کو ایک راز کی بات بتاتا ہوں" وہ نشے میں بولا "آج صبح دو راجپوت عورتیں پکڑ کر لائی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک

بہت ہی اونچے خاندان یعنی رانا پرتاپ کی بھتیجی ہے اور دُوسری اُس کی داسی ہے۔ اس وقت وہ میرے حرم میں ہیں۔ دونوں نوجوان ہیں اور بلا کی حسین بھی۔ انہوں نے یہاں کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اِس لئے ہمیں براہمن رسوئیے کا انتظام کرنا پڑا اور اب وہ اُن کے لئے کھانا بنا رہا ہے۔ یہ دوا اُن کے لئے منگائی گئی ہے۔ 'اِدھر آؤ' اُس نے ایک نوکر کو آواز دی اور اُسے نیند کی دوا کا پیالہ دیتے ہوئے اُس کے کان میں بہت آہستہ سے کچھ ہدایتیں دیں۔

"وہ نوکر نیند کی دوا لے کر چلا گیا تو ایک بار پھر اُس سردار نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور بڑبڑایا 'اُس تنگ مزاج کافر سے اب بدلہ لیا جائے گا۔ لعنت ہو اُس پر۔ وہ ہمیں کمتر سمجھتا ہے اور اپنے خاندان کی عورتوں کی شادی دینِ اسلام کے فرزندان سے کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے، جبکہ دُوسرے راجپوت بخوشی اِس بات کے لئے رضامند ہو رہے ہیں۔ اب اُس کی بھتیجی کو ایک مسلمان کے حرم میں رکھا جائے گا۔ یہ دوا اُسے اور اُس کی خادمہ کو گہری نیند میں بے ہوش کر دے اور جب دوبارہ بیدار ہوں گی تو اُن کا غرور، اکڑ، خاندان کی عزت سب مٹی میں مل چکی ہو گی۔ ہاہاہاہا۔ اُس نوجوان حسینہ کو میں ..... اور اُس کی خادمہ کو جو چاہے سنبھال لے'

"اُس کی باتیں سُن کر حکیم صاحب کا دل نفرت سے بھر اُٹھا۔ انہیں یہ سوچ کر بہت پریشانی ہو رہی تھی کہ اُنہیں دھوکے میں رکھ کر یہ دوا تیار کرائی گئی تھی جس سے دو بے گناہ لڑکیوں کی زندگی برباد ہونے والی تھی۔

"حکیم صاحب شروع سے ہی شرع کے پابند ہیں۔ اپنی زندگی میں ایک بار بھی انہوں نے دُنیا کے دو گناہوں شراب اور شباب کو نہیں چکھا ہے۔ یہ باعث انہیں اِس لئے بھی ناگوار گزر رہی تھی کہ کچھ دن پہلے چھاؤنی کی کچھ مسلمان عورتیں رانا پرتاپ کے ہاتھ لگ گئی تھیں جنہیں اُس نے پورے احترام اور عزت کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔

"آخر حکیم صاحب کے دماغ میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اُنہوں نے شیشی میں بچی ہوئی دوا کو کسی نہ کسی طرح مغل سردار کی شراب میں ملا دیا۔ سردار نے شراب کے دو چار گھونٹ بھرے اور ایک طرف لڑھک گیا۔ سردار کے بے ہوش ہوتے ہی چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔

"اِس افراتفری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکیم صاحب چُپ چاپ وہاں سے کھسک گئے اور گھوڑے پر سوار ہو مجھے پیچھے بیٹھنے کی ہدایت دے خود راجپوت چھاؤنی کی طرف سرپٹ بھاگے۔ اُس رات گھوڑے کی پیٹھ پر سفر کرتے ہوئے ہم نے کن خطرات کا سامنا کیا اور کتنی بار بال بال بچے یہ سب ہم ہی جانتے ہیں۔ بس اتنا ہی بتا دینا کافی ہو گا کہ آدھی رات تک ہم رانا پرتاپ کی چھاؤنی میں جا پہنچے۔

"رانا صاحب اپنے سرداروں کے ساتھ بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اپنے خاندان کی دو لڑکیاں مغلوں کے ہاتھ پڑ جانے کا اُنہیں اتنا غم تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے جب دونوں قیدی لڑکیوں کے بارے میں رانا کو بتایا تو وہ کھڑے ہو گئے۔ کچھ سرداروں نے ہم پر شک کیا کہ ہم دشمن کے بھیجے گئے جاسوس ہیں اور ہمیں کسی سازش کے تحت بھیجا گیا

ہے لیکن رانا کی نظریں فوراً ہی آدمی کو پرکھ لیتی تھیں۔ اُنہوں نے ہم پر یقین کیا اور فوراً دھاوا بولنے کی تیاری کرنے لگے۔

"حکیم صاحب نے اُنہیں مغل سردار کے خیمے کا راستہ دکھایا۔ حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ راجپوتوں کے راستے میں جو بھی آیا اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اور بروقت لڑکیوں کو بچا کر وہ اپنے ڈیرے پر لوٹ آئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حکیم صاحب بھی راجپوتوں کے ساتھ ہی لوٹے۔

"اِس طرح حکیم صاحب اور رانا کی دوستی کی بنیاد پڑی اور زندگی بھر قائم رہی۔ ہلدی گھاٹی کی شکست کے بعد حکیم صاحب نے اپنی مرضی سے ہی رانا کے ساتھ جنگلوں میں رہنا منظور کیا اور ہر دُکھ اور تکلیف میں رانا کا ساتھ دیا۔ جہاں کہیں بھی حکیم صاحب گئے وہیں مُراد بخش بھی گیا۔ اسی طرح چالیس برس گزر گئے۔ رانا پرتاپ وفات پا گئے۔ حکیم صاحب بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن ہم دونوں ابھی تک ایک ساتھ ہیں اور جب تک جان میں جان ہے ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

رستم کھانا ختم کر چکا تھا۔ مُراد کی رام کہانی بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ برتن سمیٹ کر جانے لگا تو بولا،

"یہاں رات کافی سرد ہوتی ہے۔ آپ کو کمبلوں کی ضرورت پڑے گی۔"

رستم نے کہا کہ اُس کے پاس کچھ کمبل ہیں۔

"دروازہ بند کرنے کے لیے اِدھر کچھ تختے پڑے ہیں اور کچھ بھاری پتھر بھی پاس ہی پڑے ہیں۔ جنگلی جانوروں سے حفاظت ضروری ہے۔"

"کیا یہاں جنگلی جانور زیادہ ہیں؟" رستم نے پُوچھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی احتیاطاً دروازہ بند کر لینا اچھا ہے۔"

تب رستم کو اُس چیتے کا خیال آ گیا جسے پہاڑی پر چڑھتے وقت اُس نے دیکھا تھا۔

"کیا اِس پاس کوئی ایسا آدمی رہتا ہے جو جنگلی جانور پالتا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔ پھر اُس نے اُس چیتے کا قصہ سُنایا جو اُسے ملا تھا "یہ چیتا یہاں کدھر سے آ گیا؟ اسے کس نے پالا ہے؟"

مُراد نے بتایا کہ اُسے اِس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ لیکن اُس کے لہجے سے رستم کو شک ہوا کہ اِس بارے میں اُسے کافی باتیں پتہ ہیں لیکن وہ بتانا نہیں چاہتا۔

مُراد چلا گیا۔ رستم اب اِس چٹان کے بنے ہوئے کمرے میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ نوجوان مہدی کے لیے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا کیوں کہ آج تک ہمیشہ وہ ایسی ہی جگہوں میں رہا تھا جہاں اور لوگ بھی ساتھ رہتے تھے۔

موم بتیوں کی روشنی میں پتھر کی ننگی دیواریں سنسان اور بھدی لگ رہی تھیں۔ کمرے کے اندر موت کا سا سناٹا تھا۔ صرف دروازے میں لگے تختوں پر باہر سے ہوا کے تھپتھپانے کی آواز اِس سناٹے میں اُبھر رہی تھی۔ اِس کے علاوہ باہر کبھی کبھی اُس کے گھوڑے کے سُم پٹخنے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔

> قدیم مصری لوگ بلیوں کی بہت زیادہ قدر و منزلت کرتے تھے۔ بلی کے مر جانے پر نہ صرف اُس کی ممی تیار کی جاتی بلکہ اظہارِ غم میں اس کنبے کے تمام افراد اپنی بھویں بھی صاف کرا دیتے تھے۔



اُس کے سونے کے لیے فرش پر گھاس بچھا گیا تھا۔ اِس بستر پر لیٹ کر اُس نے اپنی ڈ کر آنکھیں بند کرلیں تاکہ سیاہ دیواروں سے اُسے پناہ مل سکے۔ ایک عجیب طرح کی گھٹن ے محسوس ہونے لگی۔ جیسے یہ دیواریں چاروں طرف سے اندر کی طرف کھسکتی آرہی ہوں۔

وہ اُچھل کر بیٹھ گیا۔ موم بتی قریب قریب پگھل چکی تھی۔ لیکن ابھی تک جل رہی تھی۔ اُس ہ دروازے کے ساتھ لگے بھاری پتھر کو ایک طرف لڑھکا دیا اور تختے ہٹا دیئے۔ ہوا کا تیز ونکا اُس سے سرسراتا ہُوا گزر گیا۔ جلتی ہوئی موم بتی کی لَو لرز اٹھی۔ رُستم کمرے سے باہر گیا۔ اُس کا گھوڑا اُسے دیکھ کر ہنہنا اُٹھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اور ہیں بھیانک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

نیچے وادی سے کوئی گیدڑ اچانک چیخ اُٹھا اور اُس کی ڈوبتی ہوئی آواز پر دُوسرے یدڑ چلّائے۔ آس پاس پھیلی جھاڑیوں میں جگنو ننھے ننھے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ وہ ہیں ادھر اُدھر اُڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔

سامنے پہاڑی کی تلہٹی میں ایک جگنو آہستہ آہستہ اُڑ رہا تھا۔ لیکن کیا یہ واقعی جگنو تھا۔ سی کی ٹمٹماہٹ میں جگنوؤں کی سی روشنی نہیں تھی بلکہ یہ روشنی کچھ سُرخی مائل تھی اور ٹھہری رئی تھی۔ یہ روشنی اُوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تبھی ایک اور روشنی اُس کے پیچھے نظر آئی و اُسی طرح بڑھنے لگی۔

رُستم انہیں دل چسپی سے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک تیسری روشنی پہاڑی کے نیچے نظر آئی اور وہ بھی پہلی دو روشنیوں کے پیچھے چلنے لگی۔ اِسی طرح ایک ایک کرکے دو روشنیاں اور دکھائی دیں۔ اور پانچوں ایک قطار میں پہاڑی کے اُوپر بڑھنے لگیں۔ سب ے آگے والی روشنی جو اب پہاڑی کی چوٹی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ یکایک کہیں ب ہو گئی۔ باقی روشنیاں اُوپر کی طرف آتی رہیں۔ لیکن اُس جگہ پہنچتے ہی ایک ایک کے سب غائب ہوگئیں۔

رُستم کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا کہ شائد روشنی پھر دکھائی دے لیکن پھر ایسا نہیں ب وہاں پہلے کی طرح جگنو ہی چمک رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ سب کیا تھا! پانچ روشنیاں تھیں۔ کہیں یہ مشعلیں اُٹھائے پانچ آدمی تو نہیں تھے؟ زیادہ اُمید ات کی تھی کہ یہ کوئی قافلہ تھا۔ اور دُور سے صرف مشعلیں ہی نظر آرہی تھیں۔

دن کی روشنی میں تو اُسے یہاں کا سارا علاقہ اُجاڑ بیابان لگا تھا۔ پھر رات کے وقت گھومنے والے یہ لوگ کون تھے؟ ممکن ہے کہ وہ ڈاکو ہوں، جو دن میں چھپے رہتے ہوں لیکن رات کے اندھیرے کی اوٹ میں اپنے کاروبار کے لئے نکلے ہوں یا پھر جنگل میں رہنے والے بھیلوں کا کوئی قبیلہ ہو۔ اُس نے یہ سُن رکھا تھا کہ میواڑ کی ٹین کی کانوں میں بھیل کام کرتے ہیں، شاید اُس نے اُنہی مزدوروں کو کام سے لوٹتے ہوئے دیکھا ہو۔

رات زیادہ سرد ہو گئی تھی۔ رُستم محسوس کر رہا تھا کہ اب اُسے اپنے کمرے میں لوٹ جانا چاہئے۔ اُس تنہائی کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ وہ اندر چلا گیا، پہلے کی طرح مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور پھوس کے بستر پہ لیٹ کر دھیرے دھیرے نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

اگلی صبح جب مُراد ناشتہ لے کر آیا تو رُستم نے مُراد کو بتایا کہ رات اُس نے پہاڑی پر چڑھتی کچھ مشعلوں کو دیکھا تھا۔

رُستم جوں ہی واپس مُڑا اور
رُک گئے۔ کوئی اس
دونوں طرف سے گھِرا
کے دروازے سے باہر
کھڑے پہرے دار کے
آواز لگاتار

"آپ کی آنکھوں کو دھوکا ہُوا ہے جناب،" مُراد نے کہا "ریگستان میں بھی مسافروں کو اِسی طرح دھوکا ہوتا ہے۔ اُنہیں لگتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے محل، باغات اور آبشار دیکھ رہے ہیں۔ جب کہ دراصل وہاں ریگستان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں نے اُنہیں اتنا ہی صاف دیکھا تھا جیسے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ میں بالکل ہوش و حواس میں تھا۔ پانچ الگ، الگ روشنیاں تھیں۔ میں نے اُنہیں گِنا تھا۔ سب روشنیاں قطار میں چوٹی کے اوپر گئی تھیں۔ اِس میں ذرا بھی غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔"

"پھر وہ کیا ہو سکتا ہے؟" مُراد نے حیرت سے پُوچھا۔

"یہی تو میں تم سے پُوچھ رہا ہوں۔ تم یہاں بہت دنوں سے رہ رہے ہو۔ کیا اِس علاقے میں کوئی ڈاکوؤں کا گروہ تو نہیں رہتا؟"

"ڈاکوؤں کا گروہ؟"

"تمہیں پتہ ہے نا کہ اِدھر سے مسافروں کے قافلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور نیچے میدان میں قصبے اور گاؤں بھی ہیں۔ ممکن ہے کہ میں نے جب دیکھا ہو تو وہ ڈاکہ ڈالنے کے بعد لُوٹ کا سامان لے کر آ رہے ہوں۔"

"حضور ابھی نوجوان ہیں۔ اِس لئے عجیب و غریب باتوں کا تصور کرتے ہیں" مُراد نے جواب دیا "کئی برسوں سے یہاں کبھی ڈاکو کا نام تک نہیں سنا گیا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیو کہ رات کا وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب بہت عجیب و غریب چیزیں جنگلوں میں

گھومتی ہیں۔ ایسی چیزیں جو نہ انسان ہوتی ہیں اور نہ حیوان۔ ایسی آگ بھڑکتی ہے جو انسان کی جلائی ہوئی نہیں ہوتی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ . . ."

"جی ہاں، جن روشنیوں کا ذکر آپ کر رہے ہیں وہ انسانی نہیں ہیں۔ اِس طرح کے معاملات میں اُلجھنے کی کوشش مت کیجئے۔ مجھے یاد ہے کہ اِس چکر میں پھنس کر ایک آدمی کا بُرا حشر ہوا تھا۔ وہ حکیم صاحب سے کبھی پُرانے مرض کا علاج کرانے آیا تھا۔ اُسے بھی اِسی کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ایک دن اُس نے مجھے بتایا کہ اُس نے نیچے آگ بھڑکتی ہوئی دیکھی تھی۔ میں نے اُسے آگاہ کر دیا کہ وہ اِس چکر میں نہ پھنسے، لیکن اُس نے پروا نہیں کی۔ کچھ دنوں بعد وہ اچانک غائب ہو گیا۔ ہمیں اُس کے قدموں کے نشان وادی تک ملے، اُس کے آگے کچھ پتہ نہ چلا۔ پھر وہ کبھی نہیں لوٹا۔"

تب ہی اُس کے قدم
طرف آرہا تھا۔ رستم
اُٹھا تھا۔ پیچھے مُڑ کر سُرنگ
جانے کا مطلب تھا دہاں
ہاتھوں پڑنا۔ قدموں کی
قریب آرہی تھی

وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ بھوت پریتوں کو لوگ مانتے تھے۔ رستم بھی اِس سے بچا ہوا نہیں تھا۔ بچپن میں اُس نے بھی بھوت پریتوں اور بدکار روحوں کے بہت سے قصے سُن رکھے تھے لیکن پھر بھی اُس کی رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اِس لیے اُس کے حوصلے نے خوف پر قابو پا لیا۔ جو کچھ مُراد نے بتایا تھا اُس سے اُس کی دِلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

دِن بھر رُستم سامنے کی پہاڑی کی طرف دیکھتا رہا۔ خرگوش اور دوسرے چھوٹے موٹے جانوروں اور پرندوں کو چھوڑ کر اور اُسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ مُراد اُن روشنیوں سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن اُس کے سامنے لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔ اِس لئے اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اِس معاملے میں ضرور چھان بین کرے گا اور اِس راز کے بارے میں پتہ لگانے کی کوشش کرے گا۔

دوپہر کے وقت مُراد کھانا لے کر آیا۔ اُس نے خبر دی کہ حکیم صاحب کے تجویز کردہ نسخے کی تمام دوائیں اکٹھی کر لی گئی ہیں اور نسخہ دو تین دِن میں تیار ہو جائے گا۔

شام ڈھلتے ہی رُستم اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے کے کنارے تک گیا۔ یہاں سے ایک پگڈنڈی نیچے وادی میں اُتر جاتی تھی۔ جہاں ایک بل کھاتی ہوئی ندی بہہ رہی تھی۔ رُستم پگڈنڈی سے اُتر کر ندی تک جا پہنچا۔ ندی کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا۔ وہ کنارے کنارے چلتا ہوا لکڑی کے بنے ایک پُل کے پاس پہنچ گیا جو ندی کے پاٹ پر دو درختوں کے موٹے موٹے تنے ڈال کر بنایا گیا تھا۔ رُستم پُل پار کر کے دُوسری طرف جا پہنچا۔

اُس نے بہت غور سے زمین کی چھان بین کی۔ اُسے وہاں بہت سے قدموں کے نشان ملے جن سے پتہ چلتا تھا کہ بہت سے جانور یہاں سے گزرتے ہیں۔ پیروں کے نشان سے تو یہ گھوڑے اور گدھوں کے سُموں کے نشان لگتے تھے۔ اِن نشانوں کے پیچھے چلتا ہُوا وہ پہاڑی کے موڑ سے گھوم کر دُوسری طرف جا پہنچا اور بڑھتا ہُوا اُس جگہ آ گیا جہاں چٹانوں کی اُونچی قطار اُبھرنے کے سبب پہاڑی کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک ایک لمبی چوڑی دیوار بن گئی تھی۔

سُورج ابھی غروب ہی ہُوا تھا اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رُستم واپس لَوٹ پڑا، کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اِس بیابان پہاڑی پہ رات کے اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔ سامنے چٹان پر بیٹھی موروں کی ایک جوڑی نے اپنی گردنیں لمبی کر کے بڑے انداز سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور درختوں پر بیٹھے پرندوں کا جھُنڈ ایک طرف اُڑ گیا۔ رُستم تیزی سے قدم بڑھاتا ہُوا ندی کی طرف لَوٹ آیا۔

اچانک اُسے محسوس ہُوا کہ کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اُس نے مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں ڈُوبتی ہوئی جھاڑیوں اور چٹانوں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا اسے اپنا واہمہ سمجھ کر وہ چپ چاپ آگے بڑھتا رہا اور اُس پل کو پار کر کے دُوسری طرف آ گیا۔

یہاں سے حکیم صاحب کی رہائش گاہ تک چڑھائی بالکل سیدھی تھی۔ آدھی چڑھائی چڑھنے کے بعد اُسے محسوس ہُوا کہ ندی میں کسی چیز کے چھپاک سے گرنے کی آواز آئی ہے۔ تعاقب کئے جانے کا احساس پھر زندہ ہوا تھا۔ اُس نے اپنے دِل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ندی میں گرنے کی آواز شائد اُس کے پاؤں سے لُڑھکنے والے کسی پتھر کی ہو۔ لیکن پھر بھی راستے بھر وہ شک اُس کے دماغ پر مسلّط رہا۔

اُس پہاڑی پر رات ایک بار پھر گھر آئی تھی۔ رُستم کی یہ رات بھی پچھلی رات کی طرح ہی گزری۔ حالاں کہ اُس رات رُستم نے کئی بار اُٹھ اُٹھ کر دیکھا لیکن روشنیاں نظر نہ آئیں۔

پھر اگلا دن ــــ وہی اُکتا دینے والا ماحول۔ رُستم نے طے کر لیا کہ آج تمام دن یہاں ٹھہرنے کے بجائے وہ سامنے والی پہاڑی کی چھان بین کرے گا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اُس نے تھوڑی دیر کے لئے جھپکی لی اور بہت احتیاط سے خود کو مسلح کر کے وہ اُسی پگڈنڈی پر ندی کی طرف نیچے اتر گیا۔

ایک بار وہ پھر اُس چٹانوں کی دیوار کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ چٹانوں کے اِس سلسلے کے ساتھ ساتھ دُوسرے کنارے تک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ جُڑی ہوئی چٹانوں کی ایک لمبی قطار چلی گئی تھی۔ یہ سلسلہ دائرے کی شکل میں تھا اور آگے ایک پہاڑی کی چوٹی سے جُڑا ہوا تھا جو مشرق کی طرف ڈھلان کی صُورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ رُستم کے دِل میں دُوسری طرف دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ یہ دیوار ۲۰ فٹ سے کم اُونچی نہ تھی۔ اور دیکھنے سیدھی تھی اِس پر چڑھنا ناممکن نظر آتا تھا۔

سُورج اب دھیرے دھیرے مغرب کی گہرائیوں میں غرق ہونے کی تیاری کر رہا

لیکن ابھی تک روشنی باقی تھی۔ رُستم کافی تھک چکا تھا اِس لئے سستانے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ابھی تک اُس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہُوا تھا۔ اُس کے سامنے جھاڑیوں سے ڈھکی ہُوئی پہاڑی ڈھلان تھی اور پیچھے اُونچی چٹانوں کی دیوار۔

ہوا کا ایک جھونکا پیچھے سے تیرتا ہُوا آیا۔ رُستم کے جسم میں ایک تازگی سی پیدا ہوئی۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور آنکھیں بند ہونے لگیں کہ اچانک وہ اُچھل کر اُٹھ بیٹھا۔ ہوا پیچھے کہاں سے آرہی تھی جب کہ اُونچی چٹانوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہوا تھا۔

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اُس سمت دیکھنے لگا۔ کچھ دُور اُسے پتھر کے کچھ ٹکڑے پڑے نظر آئے جو یقیناً اُن ہی چٹانوں کا حصہ لگتے تھے۔ پاس جانے پر رُستم نے دیکھا کہ اِس چٹان میں تقریباً چھ فٹ اُونچا اور کوئی تین فٹ چوڑا ایک درّہ بنا ہوا ہے.... یہیں سے ہَوا آرہی تھی۔

اُس نے اندر جھانکا۔ اُس کے منہ کے عین سامنے چٹانوں کی دیوار تھی۔ لیکن بائیں اور دائیں طرف یہ درّہ پھیلا ہوا تھا۔ سُرنگ نما یہ زیرِ زمین دوزر راستہ اِتنا بڑا تھا کہ ایک آدمی اِس میں بغیر سر جھکائے آرام سے چل سکتا تھا۔ لیکن کچھ ہی قدم آگے چلنے پر راستہ بند نظر آیا۔ اُس نے اچھی طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھا لیکن کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ پھر واپس لوٹ آیا۔

اب وہ دُوسری طرف چلا۔ یہ راستہ پہلے کی نسبت کافی دُور تک چلا گیا تھا۔ آخر وہ گُھپ اندھیرے میں جا پہنچا، جہاں اُسے ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرنا پڑا۔ زمین بہت ناہموار تھی اور اُس کے پاؤں میں کئی بار اُبھرے ہوئے پتھروں سے ٹھوکر لگی۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ صرف سنسناتی ہوئی ہَوا کی سیٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ پھر یہ سُرنگ اچانک دائیں ہاتھ کو مُڑ گئی۔ اب زمین کچھ ہموار تھی۔ موڑ پار کرتے ہی اُسے کچھ فاصلے پر روشنی دکھائی دی۔ اور آگے بڑھنے پر یہ روشنی اور تیز ہوتی گئی۔ کچھ ہی دُور اُسے راستہ نظر آیا۔

اُس کے پار کیا ہوگا؟ رُستم سرنگ کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ وہ اندر جھانکنے ہی والا تھا کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جس کو اس ویرانے میں سُننے کی کبھی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کوئی بہت ہی مدھر سُروں میں ستار پر گا رہا تھا۔

وہ سانس روکے کھڑا رہا۔ یہ آواز بہت دِل فریب تھی۔ رُستم اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بھول گیا کہ وہ کہاں ہے۔ تصور کے پَروں پر اُڑتا ہوا وہ ایسی دل فریب دُنیا میں پہنچ گیا جہاں نور تھا، حُسن تھا، عشق تھا اور جہاں شباب وقت کی قید میں نہیں تھا۔

گانا ختم ہُوا تو اُس کا طلسم بھی ٹوٹا اور ایک بار پھر رُستم کو ہوش آیا کہ وہ کسی سُرنگ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ بہت احتیاط سے اُس نے اندر جھانکا۔ اُس کے سامنے ایک وسیع

تھا۔ اُسے کچھ مویشی چرتے ہوئے نظر آئے۔ دائیں طرف جھاڑیوں کی باڑ خوب صورتی سے تراشی ہوئی تھی۔

یہ صرف قدرت کے ہاتھوں کی کرامات نہیں ہو سکتی تھی۔ پھل دار درختوں اور پھولوں کے پودوں میں انسانی کاریگری صاف نظر آ رہی تھی۔ پودوں کی روشوں کے درمیان دو مور ناچ رہے تھے۔ پچھلی شام اُسے شائد یہی مور نظر آئے تھے۔ سامنے گیہوں کا ایک کھیت لہلہا رہا تھا۔

رُستم یہ سب کچھ دیکھ کر اِس نتیجے پر پہنچا کہ باہر کی نسبت اندر ہریالی زیادہ تھی۔ بلکہ اراولی کے بنجر علاقے میں یہ نخلستان کی طرح لگ رہا تھا۔ اِس ہریالی کا ایک سبب تو سامنے ہی قدرتی جھیل تھی۔ جس کو دیکھ کر اُس نے اندازہ لگایا کہ سال بھر برسنے والا پانی یہاں جمع ہوتا رہتا ہے۔ سُرنگ میں کھڑے کھڑے باقی سب باتیں تو بھانپ لی تھیں لیکن یہاں کون لوگ رہتے تھے، اِس کا پتہ لگانا اِتنا آسان نہیں تھا۔

لیکن کیا وہ اِسی کام کی خاطر یہاں آیا تھا؟ یہاں تک آنے کا تو ایک ہی سبب تھا۔ اس کا اشتیاق۔ پرسوں رات کی روشنیوں کا راز اب فاش ہو چکا تھا۔ ظاہر تھا کہ اِس جگہ کے رہنے والے لوگوں کو باہری دُنیا سے رابطہ قائم رکھنا پڑتا ہوگا۔ لیکن اُس کا یہ وہم کہ یہاں ڈاکو رہتے تھے، اب غلط معلوم پڑ رہا تھا۔ یہ جگہ ڈاکوؤں کے اڈے جیسی قطعی نہیں تھی۔

پھر اُسے ایک اور خیال آیا۔ آخر اُس جگہ کے لئے اتنے پیچیدہ اور خفیہ راستے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر یہاں بالکل امن و امان ہے اور اگر یہاں کے باشندوں کو چھپ کر رہنے کی ضرورت نہیں تو اُنہوں نے ایک کشادہ راستہ یہاں کیوں نہیں بنایا؟ سوال واقعی کافی پیچیدہ تھا۔ اور گُتھی اُس سے سُلجھ نہیں پا رہی تھی۔

پھر وہی ساز کے تاروں کے جھنجھنانے کی آواز۔ کوئی ستار کے تار کس رہا تھا اُس نے اُدھر دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ اُسے جھیل کے عین وسط میں ایک چبوترہ بنا ہوا دکھائی دیا۔ اِس چبوترے کے ہر طرف سجاوٹی پردے لگے ہوئے تھے۔ موسیقی یہیں سے اُبھر رہی تھی۔ وہاں کوئی موجود تھا۔

وہ دروازے سے تھوڑا سا اندر کی طرف جھکا تاکہ حالات کا بخوبی جائزہ لے سکے۔ لیکن فوراً اُس نے اپنی گردن اندر کھینچ لی۔ دروازے کے اندر بائیں طرف چٹانوں کی اوٹ میں ایک مسلح پہرے دار کھڑا تھا۔ رُستم کی قسمت اچھی تھی کہ اُس وقت اُس آدمی کا چہرہ دُوسری طرف تھا، ورنہ نتیجہ اچھا نہ نکلتا۔ رُستم نے وہاں سے کھسک آنے میں ہی اپنی بہتری سمجھی۔ وہ واپس مُڑا۔

اور تبھی اُس کے قدم رُک گئے۔ کوئی اُس طرف آ رہا تھا۔ رُستم دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ پیچھے مُڑ کر سُرنگ کے دروازے سے باہر جانے کا مطلب تھا وہاں کھڑے پہرے دار کے ہتھے میں پڑنا۔ قدموں کی آواز لگاتار قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف سرکا اور دروازے کے پاس پہنچ کر اُس نے ایک بار پھر باہر جھانکا۔

وہ پہرے دار اب بھی اُسی طرح کھڑا تھا۔ لیکن اُس کے کھڑے ہونے کے انداز سے رُستم کو تسلی ہوئی۔ پہرے دار کا سر اُس کی چھاتی پر جھکا ہوا تھا اور وہ اُونگھ رہا تھا۔ اِس سے اُسے بچنے کی اُمید نظر آئی۔ وقت بہت کم تھا۔ قدموں کی آواز اب ایک دم قریب آ گئی تھی۔

کچھ گھر کی • کچھ جگ کی

مقالہ • انیما



مصیبت کے دنوں میں

ہمارے ملک میں، خاص طور پر اکثر عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ وقت چاہے اچھا ہو یا بُرا کنبے کی پرورش کی تمام ذمّے داری صرف مَردوں پر ہے۔ وہ یہ نظر انداز کر جاتی ہیں کہ کبھی کبھی گاڑی کو گڑھے میں سے نکالنے کے لئے ایک اور کندھے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جیسے یہ بات عام گاڑی کے لئے درست ہے ویسے ہی زندگی کی گاڑی کے لئے بھی۔

خانگی زندگی میں کچھ ایسے جھیلے آتے رہتے ہیں، جیسے قرضہ، بیماری، شوہر کی بے روزگاری یا رٹائرمنٹ وغیرہ، جن میں بیوی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلانا ضروری ہوجاتا ہے۔ بیوی کی طرف سے اِس طرح کی مروّجہ امداد دراصل میاں بیوی کے اشتراک کی سب سے عُمدہ مثال ہے۔ ایسی مدد کے ذریعے بیوی صرف اپنی خودی یا خودکفیلی کے جذبے کی ہی تکمیل نہیں کرتی، بلکہ اپنے کنبے کی بھلائی کے لئے خُون پسینہ ایک کرتی ہے۔ بیوی کے اس ایثار کو آپ کنبے کے تئیں اُس کا مصیبت کے دنوں کا فرض کہہ سکتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہر بیوی، کسی مصیبت یا پریشانی کے وقت خود ہی اپنا کوئی سلسلہ شروع کر کے یا نوکری کر کے گھر کی کفالت کا بار نہیں اُٹھا سکتی۔ اِس میدان میں بیوی کیا کر سکتی ہے، اس کا دائرہ عموماً بہت محدود ہوتا ہے۔ اکثر بیویاں کسی بھی طرح کے کام کے لئے تربیت یافتہ نہیں ہوتیں۔ لیکن جن حالات میں زیادہ پڑھی لکھی اور خاص تربیت یافتہ ہوتی ہیں، اُن حالات میں بھی انہیں عام معاشی افادیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اور مصیبت کے دنوں میں تو خاص طور پر اپنی قابلیت یا تربیت کو کام میں لانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

لیکن بہت سی عورتیں، جو اپنے طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتیں، وہ اس معاملے میں بالکل بے بس ہوں، ایسی بات نہیں ہے۔ عورتیں اگر آزادانہ طور پر کچھ بھی نہیں کر سکتیں، تب بھی اُن کے شوہر مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے جو جو خاص جتن کر رہے ہوتے ہیں، اُن میں وہ بہت حد تک ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔

مثلاً وہ ایسے وقت میں اپنا نجی اور گھر کا خرچ کافی حد تک گھٹا سکتی ہیں گھر کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کام، جو پیسے دے کر کراتے

جارہے تھے — جیسے کپڑے دُھلانا، پریس کرانا، بچوں کو سکول پہنچانا، جوتوں کی پالش برتنوں کی صفائی وغیرہ، اُن سب کو بیوی اپنے ذمّے لے سکتی ہے۔ پھر قرض یا بے روزگاری کی صُورت میں شوہر باہر سے کچھ ایسے کام لانے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ جن میں تعلیم یافتہ بیوی کی مدد اُس کے بوجھ کو کافی ہلکا کر سکتی ہے۔

کافی پکّی عمر میں اگر شوہر کی نوکری چھوٹ جائے یا فوری ریٹائرمنٹ پر نابالغ بچوں کی وجہ سے گھر کا خرچ ویسے کا ویسا بنا ہوا اور اُس حالت میں نوکری مل جانے کی کوئی اُمید بھی نہ ہو تب شوہر اپنی بچت وغیرہ کے روپیوں سے اگر کوئی چھوٹا موٹا دھندہ شروع کرنا چاہے تو اس میں کوئی بیوی بلا شک وشبہ بہت بڑا سہارا اور مددگار ثابت ہوسکتی ہے شوہر باہر جاکر مال بیچ سکتا ہے اور بیوی دفتر حساب کتاب سنبھال سکتی ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی بھی کام جسے میاں بیوی مشترکہ طور پر شروع کریں اور چلائیں، وہ اکثر ہی کامیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ میاں بیوی جس حد تک ایک دوسرے کو سہارا دئے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو ٹھوس مدد دے سکتے ہیں ویسا کسی بھی طرح کی دوسری کسی ملازمت داری میں دیکھی جاتی ہے اور نہ ممکن ہی ہے۔

ایک بیوی ہونے کے ناطے آپ کو یہ بات ہمیشہ دھیان میں رکھنی چاہئے کہ گھریلو زندگی میں کسی بھی موقع پر کوئی آفت نازل ہو سکتی ہے جس سے آپ کی مالی حالت بگڑ جائے ایسی حالت کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے۔ اور اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ آپ ابھی اسی وقت جب کہ شاید آپ کے خانگی معاملات اِتنے خراب نہیں ہیں، کوئی خاص تربیت حاصل کریں یا اپنے اندر کچھ ایسی قابلیت پیدا کرلیں جس کی دُنیا کے معمولی کام دھندے میں کچھ قیمت ہو۔

ہر عورت کو ٹائپنگ، حساب کتاب اور خط وکتابت کرنا سیکھ لینا چاہئے۔ اگر لگے ہاتھوں شارٹ ہینڈ بھی سیکھ لی جائے تو بہت اچھا رہے گا۔ جہاں دوسرے پیشے کے لوگ بیکار پھرتے ہیں، سٹینو ٹائپسٹ تلاش کے بعد ملتے ہیں یا دستیاب بھی نہیں ہوتے۔ یہی حال اکاؤنٹینٹ کا ہے۔ دونوں کام عورتوں کی شان کے شایان ہیں مغربی ممالک میں تو اکثر تمام سٹینوگرافر اور اکاؤنٹینٹ عورتیں ہی ہیں۔

یہ چند ہنر سیکھ لینے سے آپ کو نوکری یا خود اپنا کاروبار دونوں میں بہت مدد ملے گی۔ ●



تو جو مل جائے...

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
ترا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

— فیض احمد فیض

مقالہ • کنچن



کیا آپ مہاسوں سے پریشان ہیں؟

اکثر نوجوان لڑکیوں کو مہاسوں سے پریشان دیکھا گیا ہے۔ پریشانی لڑکوں کو بھی کم نہیں ہوتی مگر لڑکیوں کو تو اپنے مستقبل کی فکر دامن گیر ہونے لگتی ہے۔ ایک خوبصورت چہرہ جب مہاسوں سے داغ دار ہو جاتا ہے تو خوبصورتی بدصورتی میں بدل جاتی ہے۔ لڑکیوں کے لئے خوبصورتی سب چیزوں سے بڑھ کر ہے اور وہ اسے کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتیں۔ اس لئے پریشانی حق بجانب ہے۔ لیکن پریشانی تو مسئلے کو اور الجھاتی ہے۔ کوئی بھی مرض ہو، وہ فکر اور پریشانی سے بڑھے گا۔ اس لئے آپ پریشان نہ ہوں اور اپنے مہاسوں کا علاج کریں۔

مہاسے اکثر چکنے چہرے پر ہی نکلتے ہیں۔ کیوں کہ چکنی جلد پر مہاسوں کو جڑ پکڑنے کا موقع ملتا ہے اور خشک جلد پر کم۔ ایک سبب پیٹ کی خرابی یا گرمی بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے مہاسوں کے لئے اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے علاجوں کی طرف دھیان دینا ہوگا۔

آیورویدک کے اصول کے مطابق جب خون گرم ہونے پر ہوا اور کف اسے روک دیتے ہیں تب وہ پھنسیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عورت کے ایام ماہواری میں خرابی یا کمی بیشی ہونے کو بھی اس کا سبب مانا گیا ہے۔ ایام ماہواری کے دوران گندے خون کا باہر نہ نکلنا یا جنسی بھوک کی خواہش کی تکمیل نہ کرنا بھی نوعمری میں مہاسے نکلنے کا ایک خاص سبب مانا گیا ہے۔ مگر ایسا سب کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پیٹ کی خرابی، خون میں گرمی اور چکنی جلد یہ تینوں باتیں ہی مہاسے پیدا کرتی ہیں۔

یہ روگ آغاز جوانی میں ہی ہوتا ہے۔ منہ پر پھنسیاں نکلتی ہیں اور یہ پھنسیاں بڑھ جانے پر درد پیدا کرنے لگتی ہیں۔ کچھ حالت میں ہی انھیں چھوڑ دیا جائے تو درد اور سوجن بڑھ جاتی ہے اور جلد کا رنگ لال یا کالا پڑ جاتا ہے۔ پھنسی ایک دو دن بعد سوکھ جاتی ہے لیکن اس کا نشان رہ جاتا ہے۔ بچے پر پھنسی کو اگر چھیلا نہ جائے تو سوکھنے پر وہ کالی پڑ جاتی ہے اور دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ جلد پر اس کا گہرا نشان نہیں بن پاتا۔ کئی بار مہاسوں سے پورا چہرہ بھر جاتا ہے۔ کبھی کبھی بڑے بڑے سے پھوڑے بھی ابھر آتے ہیں اور چہرے کو بدنما بنا دیتے ہیں۔ لیکن مہاسوں کو اگر چھیلا نہ جائے تو جلد پر ان کے زیادہ داغ نہیں پڑتے۔ بالفرض پڑتے بھی ہیں تو تھوڑے دن بعد مالش کے ذریعے انھیں دور کیا جا سکتا ہے۔

اندرونی علاج کے لئے درج ذیل باتوں کی طرف دھیان دیں:

خون میں گرمی پیدا کرنے والی چیزوں یعنی مرچ، تیل، کھٹائی، چائے، گوشت، مچھلی وغیرہ کے استعمال سے پرہیز کریں۔

پیٹ صاف رکھیں۔ صبح اٹھ کر گرمیوں میں

ٹھنڈے اور سردیوں میں نیم گرم پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر پی لیں۔

آنولے کوٹ کر (آنولے کا سفوف) رات کو پانی میں بھگوئیں اور صبح سویرے انہیں میس کر چھان لیں اور پی لیں۔ اس کے بجائے اگر وٹامن سی کی گولیاں استعمال کریں تو وہ بھی ٹھیک رہیں گی۔

ڈاکٹر سے مشورہ کر کے وٹامن بی کمپلیکس کی گولیاں بھی لی جاسکتی ہیں۔

تلی ہوئی، ثقیل اور دیر ہضم چیزوں کا استعمال نہ کر کے پھل اور ہری سبزیوں کو خوراک کا جزو بنائیں۔ دن میں کم سے کم ایکبار کچی سبزیوں کا سلاد ضرور کھائیں۔

اندرونی علاج کے ساتھ ساتھ بیرونی علاج پر بھی دھیان دیں۔ تیل کی مالش کی ہوئی جلد کے مساموں میں میل جلد ہی بھر جاتا ہے، جو مساموں کو بند کر دیتا ہے، اور اس سے بدن کی گرمی خارج نہیں ہو پاتی۔ اس سے بھی مہاسے ہو جاتے ہیں۔ جلد کے سوراخوں کو کھولنا اور چہرے پر خون کے دوران کو بڑھانا ضروری ہے۔

اس لئے آپ اس ترکیب کا استعمال کریں۔ چہرے کو سلفر لوشن سے آہستہ آہستہ صاف کریں۔ پھر ایک نرم تولیہ گرم پانی میں بھگو کر اس سے چہرے کو ڈھک کر بھاپ دیں۔ بھاپ دینے سے جلد کے مسام کھل جائیں گے۔ پھر کلینزنگ کریم لگا کر صاف کریں اور دوبارہ بھاپ دیں۔ گرم پانی کا تولیہ ہٹا کر ٹھنڈے پانی کا تولیہ رکھیں۔ اس طرح روزانہ تین چار بار گرم اور ٹھنڈی بھاپ دینے سے جلد کے سوراخ بھی کھل جائیں گے اور خون کا دوران بھی بڑھ جائے گا۔

اور بھی طریقہ ہے۔ اینٹی سیپٹک لوشن لگائیں پھر سلفر لوشن۔ مہاسوں کو کبھی حالت میں کبھی نہ چھیلیں ورنہ وہ چہرے پر بھدے داغ چھوڑ دیں گے۔ اگر داغ زیادہ پڑ گئے ہوں اور چہرہ بدنما لگنے لگا ہو تو کسی بیوٹی کلینک میں جاکر علاج کرائیں۔ اور بیماری سے نجات پائیں۔

کسی اسپتال میں الٹرا وائلٹ شعاعوں کے علاج سے بھی داغ اور مہاسے دور کئے جاسکتے ہیں۔ ۲

نیم کی چھال کاٹ کر اس کے اندرونی حصے میں پانی ڈال کر اسے گھسیں اور پھر اس لیپ کو چندن کی طرح اسے مہاسوں پر مل لیں، پھر مالش کریں۔ اس سے مہاسے ٹھیک ہو جائیں گے۔

مہاسوں سے بچنے کے لئے اپنا ایک مستقل پروگرام بنائیں اور اس پر عمل کریں۔ سیر، کسرت، کام اور آرام کے توازن پر دھیان دینا ضروری ہے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہنے کی بے ضابطگی بھی خطرناک حالات پیدا کر دیتی ہے۔ ۱

اپنے خیالات پاکیزہ رکھیں۔ گندا ادب اور فحش تصویریں دیکھنے سے بدن کی اندرونی رگوں میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے مہاسوں کا یہی ایک خاص سبب ہے۔ جاسوسی یا رومانی کہانیاں پڑھنے سے بھی پرہیز کریں۔ تناؤ پیدا کرنے والی برائیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔

تفکرات اور غصے سے بھی دور رہنا چاہئے۔ مہاسے نکلنے سے لڑکے لڑکیاں ایک عجیب طرح کے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور بیکار فکر کرنے لگتے ہیں۔ یہ فکر بھی ان کے روگ میں اضافہ کرتی ہے۔ خاموشی اور صبر کے ساتھ مہاسوں کا علاج کریں۔ اگر پھر بھی داغ دور نہ ہو سکیں تو اپنے بناؤ سنگھار اور میک اپ سے ان کو چھپائیے۔

لڑکیوں کو ماہواری میں اگر کچھ دقت پیش آئے تو فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔

اس طرح درستی احتیاط اور صبر سے علاج کرنے پر اس روگ سے رہائی ممکن ہو سکتی ہے۔ ●

> یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟
> ہمیں اپنی رائے لکھئے — ادارہ

وقت تھا...

نہ میں وہی، نہ تم وہی، سمے ہمیں بدل گیا

اسیر اندھکار ہیں
بھٹک رہے تھے من

نہ پھڑ دے رہی دھرا
نہ جیوتی دے رہا گگن
نہ ساتھ آج چاندنی
نہ پاس دیپ راگنی
یہ تن کہیں بہک گیا، چرن کہیں سنبھل گیا
پکار تو اٹھی مگر
تمہیں نہ پاس لا سکی
تڑپ اٹھی، بڑھی، گری
مگر سمجھ نہ پا سکی
عجیب ایک تھا سمے
سنگار کا دُلار کا
سگندھ سا بکھر گیا سمیر سا نکل گیا
جہان نے کہا سدا،
کہ پیار ایک بھول ہے
ہر ایک پھول شوخ ہے
کہ ستیہ صرف دھول ہے
پرنتو ویگ پیار کا
کبھی رکا کبھی نہیں
بسنت تھا بہک گیا، سمندر تھا مچل گیا
ہر ایک بات اور تھی
ہر ایک بات اور ہے
ہر ایک رات اور تھی
ہر ایک رات اور ہے
نہ زمانے خلف رہا
رتی سراں کا یتھک
سندھا سمے سمے ایک دن ڈھل گیا

— رام کمار چترویدی



مقالہ

ہمارے بچّے اور ہم

آج کل یہ شکایت بہت عام ہوگئی ہے کہ سکول جانے والے بچّوں میں لاابالی پن شدت پکڑ کر بدتہذیبی اور بدنظمی کی آخری حدود میں داخل ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ تعلیم کا صحیح جذبہ نہ صرف ختم ہوگیا ہے بلکہ یہ بچّے سماج کے لئے ایک مستقل خطرہ ثابت ہونے کا امکان رکھتے ہیں۔ اِس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ اِن بچّوں کی بابت نہایت ٹھنڈے دل اور سائنسی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔

غیر ممالک میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہمارے یہاں فی الحال اس پر نہ کوئی توجہ ہے اور نہ ایسے حالات ہیں کہ اُن پر غور کرنے کی کسی کو فرصت ہو، حالاں کہ اس کی سب سے زیادہ ضرورت آج ہمیں ہی ہے

ہندوستان ایک ترقی پذیر مُلک ہے ہمیں دُنیا کی دوسری قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا ہونا ہے اگر یہ سچ ہے کہ کسی ملک کا مستقبل اس کے بچّوں سے وابستہ ہوتا ہے تو آج ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ایک قابل فخر سماج اور ملک کی تعمیر کے لئے اپنے بچّوں کے اس اہم مسئلے پر غور کریں۔

سماج کی نشوونما میں عام طور پر اور بچّے کی شخصیت کے ارتقاء میں خصوصًا تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بچّے کی زندگی کا وہ دور جس میں وہ بن یا بگڑ سکتا ہے اس کا سکولی دور ہے۔ یہی وہ دور ہے جب اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ یا تو وہ آنے والے سماج کا ایک درخشاں اور تابناک فرد بننے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے یا صحیح ہدایت و تربیت نہ ملنے کی وجہ سے اِسی سماج کے لئے ایک رستا ہوا ناسور بن جائے اس سے بچّہ نہ صرف سماجی حیثیت سے بلکہ معاشی نقطۂ نظر سے بھی سب کے اور خود اپنے لئے بھی ایک بوجھ بنا رہتا ہے۔

سیرل برٹ وہ قابل احترام ہستی ہے جس نے سب سے پہلے مستقبل کے ان معصوم معماروں کے اس اہم مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا۔ ۱۹۲۰ میں، برٹ نے ایک صنعتی شہر میں واقع ایک بہت بڑے سکول کا دورہ کیا اور وہاں کے ہیڈ ماسٹر کی مدد سے تمام کلاسوں میں سے ایسے بچّوں کو الگ چھانٹ لیا جو اُستادوں کے لئے مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اس طرح کے تئیس طلباء و طالبات کو اِکٹھا کرکے مسٹر برٹ نے ایک کلاس بنائی۔

مسٹر برٹ لکھتے ہیں: "ہمارے سامنے پڑی ہوئی بنچوں پر تیئس بچّوں کے ہنستے اور ہمیں گھورتے ہوئے، اپنی اپنی طرز کے مخصوص چہرے عجیب معلوم ہو رہے تھے۔ ہر چہرے پر اس کی اپنی شخصیت کی چھاپ لگی دُور سے نظر آ رہی تھی۔ میرے سامنے فطرت کے اِتنے سارے نمونے موجود تھے۔ میں نے تجویز کیا کہ میں ان میں سے ہر بچّے کا نفسیاتی مطالعہ کروں گا۔"

چنانچہ مسٹر برٹ نے ہر بچّے کا الگ الگ انٹرویو لیا، اس سے سوالات پوچھے اور ہر ایک کی کیس ہسٹری تیار کی اور اس کے پیشِ نظر انہیں



مختلف میدانوں میں تربیت دینی شروع کی اُس دن سے آج تک مسٹر برٹ ایسے بچوں سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔

ایک مشہور ماہر نفسیات فریڈ۔ جے۔ شنیل نے دیکھا کہ اس قسم کے بچے دو گروپوں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ایک گروپ تو ان بچوں کا ہے جو پڑھنے لکھنے میں بہت کم زور ہیں ہر سپیشل کلاس میں ۲۰ سے ۵۵ فی صدی تک

بیگم شمیم ذکا صدیقی

اگر اپنے بچے میں ہم خودی، عزّتِ نفس، خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری نہیں پیدا کر سکتے تو ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ دوسروں کو اس کے لئے مجرم قرار دیں۔

ایسے بچوں کی تعداد ہوتی ہے۔ ان کی کمزوری لازمی طور پر محض ان کی دماغی ناپختگی کا نتیجہ نہیں ہوتی علاوہ تعلیم کے علاوہ کچھ بیرونی وجوہات سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ تعلیم پر مطلق توجہ نہیں کرتے اس لئے یہ کمزوری بڑھتی رہتی ہے۔

دوسرے گروپ میں وہ بچے ہیں جو ذہانت کے اعتبار سے تو نارمل ہوتے ہیں لیکن کسی خاص تعلیمی مضمون میں بہت پست ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کا علاج صرف نفسیاتی طریقے سے ہی ممکن ہے۔

ہمارے ملک میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچے کی نفسیات کی طرف توجہ دینا تو کجا یہ تک محسوس نہیں کرتے کہ بچہ بھی کچھ سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ خیال بہت قدامت پسندانہ ہے کہ حساب۔ اپنے بچے کا بُرا بھلا ہم سوچیں گے۔ ہمیں اپنے بچے کی جسمانی صحت، دماغی صلاحیت، جذباتی برتاؤ اور اس کے ماحول کے اثرات کا احساس ہونا چاہیئے۔

دیکھا گیا ہے کہ جو بچہ اپنی کلاس میں کسی بھی مضمون میں کمزور ہوتا ہے وہ اپنی شخصیت میں ایک کمی محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ احساس دھیرے دھیرے اس کی شخصیت کے ارتقاء پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس کے اُس خصوصی مضمون پر بھرپور توجہ کی جائے اور وہ کلاس میں اچھا کام کرنے لگے تو خود بخود اس میں خود اعتمادی اور ہمت و جرأت پیدا ہونے لگتی ہے۔ سکول

یہ  بیویاں

میں جب لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا میری عدم موجودگی میں میرے دوست علیم کی شادی ہوئی جو بدقسمتی سے ہائی سکول تک نہ کر سکا تھا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد کی بات ہے کہ ایک دن میں پٹنہ کے ریستوران میں چائے پی رہا تھا۔ اُسی وقت علیم مع اہلیہ کے ریستوران میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ آج کتنے دنوں بعد علیم سے ملاقات ہوئی ہے اور ساتھ میں اُس کی بیوی بھی ہے جس کی تعریف میں اس نے کاغذ کے کتنے اوراق سیاہ کر ڈالے تھے۔ علیم کی بیوی سامنے کی کرسی پر آکر بیٹھ گئی جبکہ علیم نہ جانے کیوں باہر پھر لوٹ گیا تھا۔ وفورِ شوق نے ضبط کا بند توڑ دیا اور میں پوچھ ہی بیٹھا "وہ شخص جو آپ کے ساتھ تھے کیا آپ کے شوہر ہیں؟"

"وہ۔۔ وہ" چیخ پڑی "شوہر تمہاری بہن کا ہوگا، میرا تو نوکر ہے!"

عزت کا سوال تھا معافی چاہتے ہوئے ریستوران سے میں جب باہر نکلا تو علیم سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے تپاک سے مِلا اور گلے ملتے ہوئے کہا "دوست اپنی بھابی سے بھی تو ملو۔ وہ اندر بیٹھی ہیں" میں نے گھر پر آکر ملنے کا بہانہ کر کے پیچھا چھڑایا اور راستہ بھر سوچ رہا کہ کیا علیم کے یہ جملے "تمہاری بھابی بڑی نیک طبیعت، خوش مزاج، شوہر پرست وغیرہ وغیرہ ہے۔ اسی بیوی کی تعریف میں لکھے گئے تھے۔ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہا تھا۔

۔۔۔ جمال رشد آسام

سے کے مضامین اور بچے کی ذہنی صحت میں بڑا قریبی تعلق ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ ہماری ایک ذرا سی توجہ ہمارے معصوم بچے کی زندگی اس کے مستقبل اور ہمارے سماج کے لئے رحمت ثابت ہو سکتی ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء میں آج کل جو بدنظمی اور انتشار پھیلا ہوا ہے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے ماہرینِ تعلیم پر یہ راز کھلا ہے کہ ان تمام برائیوں کا انسداد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ابتدائی اور سیکنڈری سٹیج میں ہی بچوں کے ذہن سے اِس قسم کے خیالات نکال دیئے جائیں۔ اگر اس وقت انہیں صحیح تربیت اور مناسب ہدایت مل جائے تو اُن کی تمام آئندہ زندگی کی بنیاد پختہ ہو جاتی ہے

مثل مشہور ہے کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے ہیں۔ جس بچے کا رجحان پستی کی طرف ہوتا ہے اسے بھی ایک ہوشیار ماں یا باپ یا ٹیچر باآسانی پہچان سکتا ہے۔ میری ریسرچ کے مطابق کم از کم دس علامتیں ایسی ہیں جن سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں بچے میں ضرور کوئی نہ کوئی جسمانی، دماغی، ذہنی یا اخلاقی کمزوری ہے جو آگے چل کر اس کی مستقل عادت بن سکتی ہے اور یہی مستقل عادت مجرمانہ ذہنیت میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ وہ علامتیں یہ ہیں۔

(۱) بچے کا انگلی چوسنا۔ (۲) دانتوں سے ناخن کاٹنا۔ (۳) بہت زیادہ شرمانا۔ (۴) بدمزاجی کا مظاہرہ کرنا۔ (۵) اپنے ہم جماعتوں کو ستانا اور چھیڑنا (۶) کلاس میں یا کلاس کے باہر جھوٹ بولنا۔ (۷) اپنے ہم جماعتوں کے قلم، پنسل، کتابیں کاپیاں چُرانا (۸) دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرنا۔ (۹) کلاس میں مٹر مچانا۔ (۱۰) سکول سے بھاگنا۔

انگلی چوسنے، دانتوں سے ناخن کاٹنے اور بہت زیادہ شرمانے کا مطلب یہی ہے کہ بچے میں احساس کمتری ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں اس کو حفظانِ صحت کے ابتدائی اصول تک نہیں سکھائے گئے۔ اس کی ذمہ داری اتنی ٹیچر پر نہیں جتنی ماں باپ پر ہے۔ عموماً ٹیچر کے سامنے بچہ انگلی چوستے یا ناخن کاٹتے ہوئے شرماتا بلکہ گھبراتا ہے۔ اس لئے اکثر ٹیچر کو بچے کی عادت کا پتہ نہیں ہوتا۔

یہ کام بچے کے سرپرست کا نہیں بلکہ ماں کا ہے وہ بچے کو اس عادت سے روکے۔ وہ اپنے آگے اسے یہ نہ محسوس ہونے دے کہ وہ دوسرے بچوں سے کم تر ہے۔ اسے بھی اتنا ہی پیار کرے۔ تاکہ اسے محسوس ہو کہ گھر میں اس کا بھی کچھ مقام ہے۔ اگر ماں باپ گھر کی چھوٹی موٹی باتوں میں اس کا مشورہ بھی لیتے رہیں تو بہت اچھا ہو۔ اس سے اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

بدمزاجی کا مظاہرہ وہ بچہ کرتا ہے جسے عموماً گھر میں ماں باپ دانستہ یا نادانستہ اس کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً سردیوں کے دن ہیں اور بچہ آئس کریم کے لئے ضد کرتا ہے۔ ماں پہلے تو اُسے منع کرتی ہے پھر جھڑکتی ہے اور پھر مارتی ہے۔ بچہ ضد کرتے کرتے رونے لگتا ہے اور آخر تنگ آ کر ماں یا باپ اُسے آئس کریم دلا دیتے ہیں۔

ماں باپ کو چاہئے کہ اگر بچے کی فرمائش جائز ہو تو اس کے پہلی ہی بار مانگنے پر اُسے وہ چیز دے دیں اور دیتے وقت نہ بُرا منہ بنائیں نہ پیشانی پر بل ڈالیں۔ بلکہ اس طرح دیں کہ بچے کو احساس ہو کہ ماں باپ مجھ سے خوش ہیں۔ اور اگر اس کی فرمائش ناجائز ہے تو پھر اُسے صرف ایک بار منع کریں لیکن اس طرح کہ وہ منع کرنا

یہ



شوہر

عید کے موقع پر ہم لوگوں نے گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ میرے دوست نے اپنی بیوی کے لئے ریڈی میڈ کپڑے اور ایک سینڈل خریدا۔

سٹیشن قریب ایک میل کے فاصلے پر تھا اور ٹرین صبح پانچ بجے جاتی تھی اس لئے ہم دونوں رات کو ہی وہاں پہنچ گئے اور بنچ پر بیٹھے بیٹھے سو گئے ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے جوتے نیچے ہی اُتار دیئے۔

دفعتاً مسافروں کے شور اور انجن کی گڑگڑاہٹ سے ہماری آنکھ کھُل گئی۔ گاڑی آگئی تھی۔ ہم لوگ اُس میں سوار ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ اب وہاں دیکھا تو کوئی بھلا مانس ہمارے جوتے ہی لے کر رفو چکر ہو گیا تھا اب ہم دونوں ننگے پیر تھے۔ گاڑی چھوٹنے میں دیر نہ تھی۔

میرے دوست نے فوراً اپنے تھیلے سے اپنی بیوی کے چپل نکالے اور اُنھیں پہن لیا۔ میں نے اُن سے کہا "حضرت زنانہ چپل پہن رہے ہیں، کوئی کیا کہے گا؟"

ہنس کر بولے "بھئی آج کل کے فیشن نے میاں بیوی میں کوئی فرق نہیں رکھا۔"

مجھے اس وقت ہنسی بھی آرہی تھی اور رونا بھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ سینڈل کسی کی زینت کے بجائے کسی کا ہمدرد بن گیا تھا۔ اپنی اس ادھیڑ بن میں میں اپنے ننگے پیروں کو بالکل ہی بھول گیا تھا

——شمیم احمد، مظفر پور (بہار)

یہ شوہر اور یہ بیویاں نمبروں کے لئے اپنے تجربات [illegible]
شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں [illegible]

ذاتی کوئی معنی رکھتا ہو۔ اور بچے پر اس کا اثر پڑے

یاد رکھئے کہ بچہ بھی بہت بڑا نفسیات داں ہوتا ہے۔ وہ آپ کے چہرے، آپ کے لہجے اور آپ کے انداز سے سمجھ جاتا ہے کہ اس انکار میں کتنا وزن ہے۔ اور وہ آپ کی کس کمزوری سے کس طرح فائدہ اُٹھا سکتا ہے ضد کر، یا چیخ کر یا رو کر۔

باقی علامتیں دراصل ایک ہی بات کے چار پہلو ہیں اور چاروں ہی تاریک۔ یہ چاروں بنیادی طور پر بچے میں احساسِ کمتری کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔ بچہ اپنی خامیوں، کمیوں اور کمزوریوں کو جانتا ہے اور محسوس کرتا ہے لیکن اس کی فطرت چاہتی ہے کہ جماعت کے دوسرے بچے اس کی جانب متوجہ ہوں۔ یہ تقاضا اس کی انا کرتی ہے۔ لیکن یہ توجہ کلاس کے ساتھ پڑھائی لکھائی وغیرہ سے جو کہ اُسے حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے وہ جھنجھلا کر ان طلباء سے گویا انتقام لیتا ہے جو اسے نظر انداز کرتے رہتے ہیں وہ انہیں چھیڑتا ہے ان کی نقلیں اتارتا ہے ان کی ہنسی اڑاتا ہے اور اس طرح ان پر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی کوئی حیثیت اور شخصیت رکھتا ہے۔ اس خرابی کا علاج کبھی ٹیچر کے ہاتھ میں تھا لیکن آج کل جب کہ سکولوں کی کمی کے باعث ایک ایک کلاس میں ساٹھ ستر لڑکے پڑھتے ہیں۔ ٹیچر کے لیے یہ قطعاً ناممکن ہے کہ وہ ہر طالب علم پر انفرادی توجہ دے سکے۔

ہم اپنے گھر میں اپنے بچے پر خود توجہ دیں اس کی خامیوں اور بری عادتوں کو خود دور کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے بچے میں جب ہم خود ہی عزتِ نفس، خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری پیدا نہیں کر سکتے تو ہمیں ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے کو اس کے لئے مجرم قرار دیں۔

اپنی کسی غلطی کو چھپانے کے لئے بچہ جھوٹ بولنا بھی شروع کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی ہر غلطی پر اسے بری طرح جھڑکتے ڈانٹتے بلکہ مارتے ہیں۔ جھوٹ بولنے کی عادت چھڑانے کا ایک آسان علاج یہ ہے کہ سو میں ساٹھ بار اس کی غلطی کو نظر انداز کر دیا جانا چاہئے۔ بڑی غلطی ہو تو اس پر سختی سے بازپرس کریں اور درجہ بدرجہ اس بات کی ٹریننگ دیں کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو ہمیں آکر بتا دے۔ اب ہم اُسے ایک دوست کی طرح اس غلطی کے نتائج سمجھائیں۔ اس سے نہ صرف وہ غلطی سے بچتا ہے بلکہ جھوٹ بولنے کا خیال بھی بچے کو نہیں آتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے ماں باپ ہمدردی سے میرے مسئلہ پر غور کریں گے۔

چوری کی عادت بھی گھر میں پڑتی ہے بچے کی جائز خواہشیں پوری کیجئے۔ وہ چوری کیوں کرے گا؟ سکول میں کاپیاں، کتابیں وہ اس لیے چراتا ہے کہ آپ اس کی ضروری چیزوں کا خیال نہیں رکھتے یا وہ اُن پیسوں کو بازار میں اپنے شوق پر خرچ کر دیتا ہے۔ بچے کو کاپیاں، کتابیں پنسل، قلم وغیرہ خود دلا دیں اور گھر پر اس کی ضرورت کے مطابق اسے اچھا کھلائیں پلائیں

بچے کا سکول سے بھاگنا کسی وجہ سے ہوتا ہے میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسے ایسے مضامین دلا دیئے ہیں جن میں اس کا دل نہیں لگتا جب دل نہیں لگتا تو اس بات کو ذہن کیسے قبول کرے؟ وہ نہ کلاس میں اس مضمون پر توجہ دیتا ہے۔ نہ گھر آکر کبھی پڑھنے کا خیال اُسے آتا ہے بلکہ اس مخصوص مضمون کے نام سے ہی اُسے جھرجھری آنے لگتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بے توجہی پر کلاس ٹیچر

پہلے تو اُسے ڈانٹتا ہے پھر اُسے اُسی کی طرح کے دوسرے بچوں کے ساتھ پیچھے کی کرسیوں پر بٹھا دیتا ہے۔ اب پوری کلاس اُسے حقیر اور اپنے سے کمتر سمجھنے لگتی ہے چنانچہ بچہ اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ اس پیریڈ میں کلاس ہی میں نہ جائے۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہ کئی کئی پیریڈ سکول سے غائب رہنے لگتا ہے۔

بچے کو سکول بھیجتے وقت والدین کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ مستقبل میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائے۔ اور اُس وقت وہ مطلق یہ نہیں سوچتے کہ ان کے بچے کی فطرت اس سے کیا تقاضہ کرتی ہے، اس کا ذہن کس بات کو قبول کرتا ہے اور وہ اپنے شوق سے کس چیز کو پڑھنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔

ہر ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ مستقبل میں ایک مثالی شخصیت ثابت ہو۔ لیکن یہ یاد رکھئے کہ اس ارادے اور خواہش کو عملی جامہ پہناتے وقت آپ اور ہم ضرورت سے زیادہ جوش و خروش سے کام نہ لیں۔ ہمارا یہ غیر ضروری جوش اس کے مستقبل کو تباہ بھی کر سکتا ہے۔ جو نہ صرف بچے کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے نقصان دہ ہوگا ●



"ڈاکٹر صاحب اب مجھے سنائی تو صاف دینے لگا مگر لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کے گانوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا۔"

ہاتھ پیر ہلائے بغیر قارون کا

خزانہ حاصل کرنا کون نہیں چاہتا...



کرامات

کہانی • گمان سنگھ

سنیل بے کار ضرور تھا لیکن نااُمید نہیں تھا عام لوگوں کی طرح وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ اُس کے ہاتھ قارون کا خزانہ آ جائے اور وہ زندگی کے مزے لوٹے۔ جب کبھی وہ سوچتا کہ روپیہ کمانے کے لئے جان توڑ محنت کی بھی ضرورت ہے تو وہ جھنجھلا اُٹھتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسے مل تو سب کچھ جائے لیکن ہاتھ پیر نہ ہلانا پڑیں۔

ظاہر ہے ایسے آدمی کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے وہ یہ کہ وہ دوسروں کی جمع شدہ دولت پر ہاتھ صاف کرے۔ سنیل بھی اسی راستے پر چل پڑا۔ دھوکے اور دھمکیوں کے ذریعے وہ جانے انجانے سب لوگوں سے روپیہ اینٹھنے لگا۔

آپ شاید پوچھیں کہ پھر تو وہ ڈاکے بھی ڈالنے لگا ہوگا؟ یقیناً یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ بڑے سے بڑے کام کے کرنے میں بھی اُسے کوئی جھجک تھی بلکہ اس کی وجہ تھی اس کی بزدلی وہ اتنا کمزور دل تھا کہ خطرے کے کام سے تھوڑے سے ہی اُس میں کپکپی آ جاتی تھی۔

ایک دن شہر کے ایک کونے میں کسی گندے سے چھوٹے ہوٹل میں جو اُسی کی طرح آوارہ جوانوں، مفرور مجرموں اور فسادیوں کا اڈہ تھا۔ سنیل بیٹھا ہوا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ دل ہی دل میں وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا کہ کس طرح کچھ روپوں پر ہاتھ صاف کیا جائے۔

ہمت کر کے اُس نے ایک قلم کار سے ٹیلی فون ملایا جس کو حال ہی میں سرکار کی طرف سے نقد انعام ملا تھا اور کہا "دیکھو مفت میں جو روپیہ تمہارے ہاتھ لگا ہے اُس کا ایک تہائی فوراً میرے حوالے کر دو ورنہ ——"

"ورنہ کیا؟" اُس طرف سے آواز آئی۔

"ورنہ موت کا مزا چکھو گے" سنیل نے دھمکی دی۔

دوسرے دن غصے میں بھرا ہوا سنیل اُس ادیب کے بارے میں معلوم کرنے

گیا تو اُسے بتایا گیا کہ کل شام کو وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا کہ اچانک کرسی سے گرا اور مر گیا۔

سُشیل کا دل دھڑکنے لگا 'تو کیا سچ مچ اُس میں کچھ رُوحانی طاقت آگئی ہے'، اپنی اس طاقت کو آزمانے کے لیے اُس نے گلی میں پھرتے کتوں، پیڑوں پر بیٹھی چڑیوں پر ان ہی الفاظ کا تجربہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھیر ہو گئے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ایسی طاقت کا مالک ہو گیا ہے جس سے ہر کسی کو قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے چار چھ دشمنوں کو فون کیا اور کہا — "ورنہ موت کا مزا چکھو گے" اور وہ سب اس دھمکی کو سنتے ہی مر گئے۔

اُس نے سوچا 'اگر سچ مچ میرے اندر اتنی عظیم طاقت آگئی ہے تو اُس کا بے کار استعمال کرنے سے کیا فائدہ؟'

وہ شہر سے باہر جا کر ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ پہاڑی بالکل غیر آباد تھی۔ آدمی تو آدمی وہاں کوئی پیڑ پودا بھی نہیں تھا۔ ہاں ایک چھوٹا سا مندر ضرور تھا جہاں کبھی کبھار کوئی عقیدت مند آ جاتا تھا۔

مندر میں جا کر سُشیل بیٹھ گیا اور اطمینان سے مستقبل کے منصوبے بنانے لگا۔ وہ فوج کے سپاہیوں سے ملے گا، کمانڈروں سے ملے گا، انہیں کہے گا میرا ساتھ دو، جو اُس کا کہنا مانے گا اُسے اپنے ساتھ لے لے گا۔ جو انکار کرے گا اُس سے کہے گا 'موت کا مزا چکھو'۔ اس طرح وہ وفادار افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی فوج بنا لے گا اور کہے گا 'اب میں کمانڈر ہوں'۔

اپنی سکیم پہ خوش ہو کر سُشیل اٹھ کھڑا ہوا اور سوچنے لگا 'فوج کا کمانڈر بن جانا کتنی اچھی بات ہو گی! ہر قسم کا آرام، منہ سے لفظ نکلتے ہی کام پورا، ہر جگہ عزت، ہر جگہ استقبال!'

اتنا ہوتے ہوئے بھی اُسے کچھ گھبراہٹ سی تھی۔ کیا کمانڈر بننے سے زیادہ کوئی بات نہیں۔ کیوں نہ وہ بادشاہ بن جائے۔ کمانڈر کے مرنے کے بعد ضروری نہیں کہ اُس کے کنبے کے افراد بھی کمانڈر بن جائیں لیکن بادشاہ کا تو خاندان آگے بھی چلتا رہتا ہے۔ بادشاہ کی دولت اور رہن سہن کے ٹھاٹ باٹ بھی نرالے ہوتے ہیں۔

سُشیل اپنی خوشی پر قابو نہ رکھ سکا! زور سے بول پڑا "اب بادشاہ ہی بن کر رہوں گا۔ کمانڈری میں کیا رکھا ہے؟ اور پھر میرے پاس یہ منتر تو ہے ہی کہ 'موت کا مزہ چکھو!'

سُشیل کے یہ الفاظ وہاں کس کے کانوں میں پڑتے؟ اُس ویران اور سنسان علاقے میں دُور دُور تک کوئی آدمی، جانور اور پرندہ نہیں تھا۔ آواز مندر کی دیواروں سے ٹکرا کر اُسی کے کانوں میں گونج گئی۔ آگے اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔

اگلے دن لڑکوں نے پولیس کو خبر دی کہ کوئی آدمی، جس کے بدن پر کسی طرح کا زخم نہیں ہے مندر میں مرا ہوا پڑا ہے۔

عہدِ ماضی کی باتیں

اُستاد نے اپنے شاگرد سے پوچھا "تم نے تاریخ کا پرچہ کیوں چھوڑ دیا؟"
شاگرد نے باادب کہا "سر، اُس میں تمام سوالات اُس وقت کے تھے جب کہ میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا"

مقالہ • کمار کیشپ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں



آج انتہائی قدامت پسند ماہر سیارگان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ پوری کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں زندگی کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ آج اکثر سائنس داں اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ہماری کہکشاں میں اور دوسرے ستاروں کے نظاموں میں بہت سے ستاروں کے گرد سیاروں کی ایسی تنظیم ہے جیسی کہ سورج کے گرد ہے اور ان سیاروں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہی اس حالت میں ہے کہ اس پر زندگی کی نشوونما ہو سکے یا ہو رہی ہو یا ہو کر ختم ہو چکی ہو۔

اس بارے میں سب سے پہلے ایک امریکی ماہر ڈاکٹر آٹو سٹروو نے کچھ بنیادی تحقیق کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف دھیمی رفتار سے چلنے والے ستاروں کے گرد ہی سیاروں کی تنظیم ہو سکتی ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے ہماری کہکشاں میں پائے جانے والے امکانی سیاروں کی تعداد کا تخمینہ اس طرح لگایا۔

کہکشاں کے کل ... ارب ستاروں میں سے صرف دس فی صد ہی اتنی آہستہ روی سے گھومتے ہیں کہ ان کے گرد سیارے ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر نظام سیارگان میں اوسطاً پانچ سیارے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف ہماری کہکشاں میں ہی تقریباً ...،...،...،۵ سیارے گردش کر رہے ہیں۔ ان سبھی پر زندگی کی نشوونما ہو سکے، یہ ضروری نہیں لیکن ڈاکٹر سٹروو کا خیال ہے کہ ان میں سے ...،...،...،۱ سیاروں پر تو کسی نہ کسی طرح کی زندگی ضروری ہے اور اس تعداد کو اور بھی کم کرتے ہوئے وہ ایسے سیاروں کی تعداد ...،...،۱۰ تک مانتے ہیں جن پر نہ صرف زندگی ہے بلکہ باشعور جاندار بھی رہتے ہیں۔

کسی سیارے پر زندہ عناصر ہیں یا نہیں، اس کا انحصار کئی باتوں پر ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ متعلقہ سیارے اپنے مدار کے مرکزی ستارے (سورج) سے نہ تو بہت دور جا ئیں

ہ د اسس کے بہت قریب ہی آئیں۔ پہلی
رت میں یہ انتہا ٹھنڈا اور دوسری صورت میں
ے انتہا گرم اسس پر زندگی کے امکانات کم کردے
۔ سیارہ اتنا بڑا بھی ہونا چاہئے کہ اپنے کشش
قل سے اپنے چاروں طرف ہوائی کرہ کو گرفت میں رکھ
سکے۔ لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ ہائیڈروجن جیسی ہلکی
گیس بھی اس کے کرۂ ہوائی میں پھنسی رہ جائے،
جس سے میتھین اور امونیا جیسی زہریلی گیسیں پیدا
ہوتی ہیں۔

یہ بات ہمارے نظام شمسی کے بڑے سیاروں
۔ مشتری اور زحل کے کرۂ ہوائی میں ظہور پذیر
ہوئی ہے، یہ پوری طرح سے صرف زہریلی گیس میتھین
کے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کے لئے
سیارے پر کچھ نہ کچھ پانی ہونا ضروری ہے۔
لازمی طور پر ایک اور بات کہنی پڑتی ہے کہ ہم
کسی جگہ زندگی کے ہونے نہ ہونے کا اندازہ
صرف انہی اصولوں کی بنیاد پر لگا سکتے ہیں، جن
سے ہم متعارف ہیں۔ اسس لئے یہ غیر ممکن نہیں
کہ دوسرے سیاروں پر زندگی کی شکل اور اس
کی نشو و نما کے اصول زمین سے بالکل مختلف
ہوں۔

زمین پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کئی طرح کے
جان داروں میں اپنے کو حالات کے
مطابق ڈھالنے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے
دائمی برف سے ڈھکے قطبوں پر کائی، لچن وغیرہ
کئی طرح کی نباتات زندہ رہتی ہے۔ اس کے
برعکس ابلتے ہوئے پانی کے چشموں کے بالکل نزدیک
کئی طرح کے کیڑے مکوڑے بھی دیکھے گئے ہیں۔
ان حالات میں یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اگر کوئی
سیارہ زمین کی نسبت بہت زیادہ ٹھنڈا یا
بہت زیادہ گرم ہے تو اسس پر زندگی نہ
ہو نہیں سکتی۔
اب کائنات میں کہکشاں ۔ جیسے اربوں

ستاروں کے جھنڈ ہیں۔ انھیں سائنس داں کائنات
(کائنات دستاروں کا نظام) کہتے ہیں۔ یعنی کل کائنات
میں چھوٹی چھوٹی کائناتیں اور اسس بنیاد پر پوری
کائنات میں صرف ایسے سیاروں کی تعداد ہی
ناقابل تصور ہو جاتی جن پر انسان جیسے باشعور
جان دار موجود ہو سکتے ہیں۔

اندازہ ایسے اصولوں پر قائم ہے جن
سے ہم پوری طرح واقف ہیں یعنی زمین
پر پیدا ہونے والا کاربن و آکسیجن سائیکل (چکر)
ہے جس کے مطابق حیوان آکسیجن میں سانس
لیتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائڈ چھوڑتے
ہیں، جب کہ پیڑ پودے کاربن ڈائی آکسائڈ
کھاتے ہیں اور آکسیجن چھوڑتے ہیں۔
لیکن ہر جگہ زندگی اسی تبادلے کے اصول
پر قائم ہوگی یہ ضروری نہیں۔ ہارن کیلی فورنیا
یونی ورسٹی کے ایک کیمیا داں ڈاکٹر مولی دن
کے خیال میں کاربن و آکسیجن کے علاوہ کچھ
دوسرے عناصر کے بھی ایسے چکر ہو سکتے
ہیں، جن سے زندگی برقرار رہ سکے۔ ایک طریقہ
'سیلی کون نائٹروجن' ہے۔ کئی دوسرے
سائنس داں بھی اسس نظریے کی تصدیق کرتے
ہیں کہ دور افتادہ ستاروں کے نظام میں
ایسے سیارے موجود ہیں جہاں زندگی کے
آثار ہیں اور ان کا دار و مدار کاربن کی بجائے
سیلی کون پر منحصر ہے۔ اور جو نائٹروجن میں
سانس لیتے ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ دوسری طرح کے
زندہ عناصر کیسے ہوں گے۔ اسس کا ایک جامع
جواب صرف تصور اور تحقیق کی بنیاد پر نہیں
دیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صرف نباتات کی
کچھ عجیب شکلیں ہوں یا صرف حیوانات کی ہی
ایک سائنس داں کی یہ بھی رائے ہے کہ کچھ
سیاروں پہ ایسے جان دار عناصر بھی ہو



ہماری کہکشاں سے باہر کروڑوں ستاروں کا ایک اور نظام

سکتے ہیں جو نہ نباتات کی شکل کے ہوں اور نہ حیوانات کے اور یہ ایسے ہوں جن کا ہم تصوّر بھی نہ کر سکیں۔

امریکی ہارورڈ یونی ورسٹی کے ایک سابق پروفیسر ڈاکٹر ہارلو شیپلے کا خیال ہے کہ اگر ہم کچھ ایسے سیّاروں پر جائیں جو جسامت، مسافت اور درجۂ حرارت وغیرہ میں بالکل ہماری زمین کی طرح ہوں تو ہم وہاں ویسے ہی جاں دار عناصر پائیں گے جو ہماری زمین پر موجود ہیں یا کسی وقت میں موجود تھے۔

جہاں تک باشعور جانداروں کا سوال ہے وہ جسمانی طور پر انسانوں جیسے ہی ہو سکتے ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ زندگی کی نشوونما میں پوری طرح ہماری زمین کے انسانوں جیسے نہیں ہوں گے۔ وہ ارتقا میں یا تو ہم لوگوں سے بہت زیادہ آگے ہوں گے یا بہت زیادہ پیچھے اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کے سیّاروں پر زندگی کی ترقی کے لیے مناسب حالات ایک ہی وقت پر وجود میں نہیں آئے ہوں گے۔ ادھر چونکہ زمین پر انسانی تاریخ صرف کچھ

ہزار یا لاکھ برس ہی پرانی ہے، اس لئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان شاید پوری کائنات میں سب سے کم عمر باشعور جان دار ہے۔ کس کو پتہ ہے کہ کتنے دوسرے سیاروں پر کتنے دوسری طرح کے انسانوں جیسے جان دار کب سے رہتے چلے آرہے ہیں یا ہزاروں لاکھوں برس تک نشوونما پانے کے بعد ان کا وجود ختم ہو چکا ہے؟

اس ضمن میں ہارورڈ یونی ورسٹی کے ایک دوسرے پروفیسر ڈاکٹر جارج سیبس نے ایک بہت عجیب نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر آئنس ٹائن کے ایک اصول کے مطابق کائنات کی ایک حد مقرر ہے یعنی اس میں ستاروں وغیرہ کی ایک مقررہ تعداد ہے، تب تو اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ ہماری زمین کے انسانوں کو پوری کائنات میں اور کسی بھی سیارے پر بالکل اسی طرح کے حالات یا زندگی کے ایسے ہی روپ مل سکیں کیوں کہ اس صورت میں سیارے کی نشوونما بالکل مختلف ہوگی۔ کسی سیارے پر ہو بہو انسان جیسے جان دار موجود ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیارہ کروڑوں سالوں تک ٹھیک انہی حالات سے گزرا ہو جو زمین پر رہے ہیں اور ایسا اتفاق ایک محدود کائنات میں ممکن نہیں ہے۔

لیکن اگر بائل، بونڈی اور نارلیکر کی نئی تھیوری کے مطابق کائنات مکان اور زمان دونوں میں محدود ہے تو پھر ایک طرف تو جاندار کے رہنے کے لائق سیاروں کی تعداد بھی غیر محدود ہوگی اور دوسری طرف ٹھیک انہی جیسے جانداروں کی تعداد بھی غیر محدود ہوگی کیونکہ لامحدود میں سب کچھ لامحدود ہی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ایک طرف تو ٹھیک ہماری زمین جیسے لاتعداد سیارے ملیں گے اور دوسری طرف ٹھیک ہم جیسے انسانوں یا جان داروں کی مختلف اور مخالف شکلیں بھی ہوں گی اور یہ سب صرف اس وقت کے نہیں ہوں گے بلکہ سبھی زمانوں کے ہوں گے یعنی جس جس حالت میں سے ہماری زمین گزری ہے ان سبھی کے ہو بہو نمونے اس لامحدود کائنات میں بستے موجود ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنے آپ میں بھی لامحدود ہے۔ نعشاً انسان کی عقل اس مقام پر آکر جواب دے دیتی ہے مگر شاید آئنس ٹائن نے ہی درست کہا ہے۔ کائنات واقعی لامحدود نہیں ہے۔

وہ دن جلد آئے گا جب سب عقدے حل ہو جائیں گے ●

سب سے چھوٹا سکول



دنیا کا سب سے چھوٹا سکول مغربی جرمنی کے شمالی ماریرین ساحل پر ایک چھوٹے سے جزیرہ میں واقع ہے۔ اس جزیرہ کا نام گریٹر ہے۔
اس کا رقبہ ۵۰ ۶ ایکڑ ہے۔ حال ہی میں اس سکول کے طالب علموں کی تعداد دُگنی ہو گئی ہے۔ یہ سکول دنیا میں سب سکولوں سے چھوٹا ہے۔ اب تک اس سکول میں صرف ایک ہی طالب علم زیر تعلیم تھا۔ اس کی عمر آٹھ سال اور نام والکرائڈ ہے۔ اب اُس کی چھوٹی بہن ہائیک موسبن جس کی عمر چھ سال ہے۔ سکول میں داخل ہو گئی ہے۔ جزیرہ کی آبادی نو کنبوں (۹ بالغوں اور چار بچوں) پر مشتمل ہے یہ کنبے وہاں کئی پشتوں سے بس رہے ہیں۔ صوبائی سرکار کے پروگرام کے تحت جزیرہ میں بہت سے بہتری کے کام ہو چکے ہیں۔ ٹیلیفون لگایا جا چکا ہے۔ ایک کشتی ہفتہ میں تین دفعہ ڈاک پہنچاتی ہے۔

شکست کی آواز



میں ایک شاعر ہوں کس صدی کا ؟
جو گھومتا ہوں
سڑک سڑک اور کوچہ کوچہ
لئے بیاض اپنی
اپنے ہاتھوں میں بیچنے کو !
میں اتنا مجبور ہو چکا ہوں
کچھ اپنی ہی زندگی کے ہاتھوں
لٹا رہا ہوں
جو سستے داموں
صداقتوں کو
جنہیں زمانے کا زہر پی کر
کسی طرح
پالیا ہے میں نے — !
لطافتوں کو
جنا ہے جن کو
میری ہی آزردہ آتما نے !
مسرّتوں کو
کہ جن کی خاطر
جہاں کی ہر آگ میں جلا ہوں !
میں اپنے بچّوں کو
جن کو اپنے ہی خونِ دل سے
جواں کیا ہے ...
لٹا رہا ہوں
کہ زندگی کا ہے قرض مجھ پر
جسے بہر حال ہے چکانا
میں بیچتا ہوں کلام اپنا

مگر خریدار زخمِ دل کا
کوئی نہیں ہے۔

یہی تو ہے زندگی کا دھوکہ
میں آج تک تو نہ جانے کب کا ہی
مر گیا ہوتا اس جہاں میں
مگر ہوں زندہ
میں اپنی سوچوں کی گرمیوں سے۔

میں سوچتا ہوں
کہ پو پھٹے گی
ضرور اک دن
میری بھی اُس رات کا سویرا
ضرور ہوگا
میں ایک شاعر ہوں اس صدی کا !

— اشفاق احمد اعظمی

کہانی • آر کے مُورتی

فرض کا دائرہ

پرسکون ماحول میں اندھیرے کا سہارا لے کر دشمن کے بہت سے ایجنٹ توڑ

کانسٹبل رسول نے ادھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ دُور دُور تک دیودار اور چیڑ کے درختوں نے پہاڑی کو ڈھک رکھا تھا۔ دُور ہوا کے پنکھوں پر اٹھکیلیاں کرتا بادل کا ایک ٹکڑا درختوں کو چھوتا بھاگا چلا جا رہا تھا۔ کانسٹبل رسول کھویا کھویا سا اس منظر کو تب تک دیکھتا رہا جب تک کہ بادل کا ٹکڑا اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا۔

اگست کا مہینہ تھا۔ برسات کی شدت میں کمی آگئی تھی۔ کشمیر کی دُھلی دُھلی وادیاں اور نکھر آئی تھیں۔ برسات ختم ہوتے ہی یہاں پھر سیاحوں کی چہل پہل شروع ہوجائے گی اور کشمیر کے چپے چپے میں رونق پھیل جائے گی۔ ستمبر کا مہینہ ہی یہاں کے لوگوں کی تقدیر جگا دیتا تھا اور سال بھر کی کمائی لوگ ان ہی دو تین مہینوں میں کر لیتے تھے۔

رسول کو یاد آیا کہ اس کے دوست حمید کو ٹٹو سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ اس ٹٹو پر وہ مسافروں اور سیاحوں کو پہاڑوں کی چوٹیوں، خاص کر گلمرگ اور برف سے ڈھکی ڈھلانوں پر لے جایا کرتا تھا۔ ماحول بہت دل کش اور پُرسکون تھا۔ کہیں بھی لڑائی جھگڑے اور بغاوت کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔

گھنے درختوں سے گذر کر آرہی سورج کی شعاعوں نے مخملی گھاس پر آڑی ترچھی لکیریں سی بنا دی تھیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا میں بسی مہک سانسوں میں اترتی جا رہی تھی۔ رسول قدرت کے اس دل فریب منظر میں محو ہوا ادھر ادھر گھومتا رہا۔

ایکایک اس نے انگڑائی لی۔ بدن میں سستی آنے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں ملیں اور چُست ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے تو سستی کچھ دور ہوئی۔

اسی بیچ اس کی بیوی وہاں آگئی۔

"آئی جان۔ آج تو تم بہت حسین نظر آرہی ہو۔ خیریت تو ہے؟" رسول نے بیوی سے مذاق کیا "کہیں مجھے بہکانے کے چکر میں تو نہیں ہو؟"

"میں آپ کو کیوں بہکاؤں گی؟ میرا تو باقاعدہ آپ سے نکاح ہوا ہے اور میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے پیار کو رہتی دنیا تک اسی طرح بنائے رکھے،" بیوی بولی۔

"تمہیں تو اللہ کے بجائے میری تابعداری کرنی چاہئے"

رسول نے اسے پھر چھیڑا

"توبہ توبہ، خدا کے قہر سے نہیں ڈرتے۔ کیا اناپ شناپ منہ سے نکال رہے ہیں،" رسول کی بیوی۔



پھوڑ کا موقع ڈھونڈ رہے تھے

پے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "اللہ کی مہربانی سے
ی تو ہم اتنے خوشحال ہیں۔"

"ارے، آج تو بڑی بوڑھیوں کی طرح لیکچر جھاڑ رہی ہو
کہیں مُلّانی بننے کا ارادہ تو نہیں ہے؟" رسول
نے اُسے پھر چھیڑا۔

"آپ باتیں بہت کرتے ہیں۔ میں ابھی آپ کے
لئے چائے لاتی ہُوں، وہی آپ کا مُنہ بند کرے گی"
سول کی بیوی نے شرارت سے کہا۔

رسول ہو ہو کر کے ہنسنے لگا۔ جب وُہ جانے لگی
دیر تک اُسے دیکھتا رہا ابھی اُس نے زندگی کی بیس
ہاریں ہی تو دیکھی تھیں اور اس کا حُسن پورے شباب پر
ما۔ پچھلے دنوں اننت ناگ میں تبادلہ ہونے کے بعد ہی
آلی جاں سے اُس کی مُلاقات ہُوئی تھی۔ جلدی ہی وہ
س کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گیا تھا اور بعد میں یہ
بال کتنے کتنے نکاح کے رُوپ میں بدل گیا تھا۔

رسول کی نظروں میں وُہ لازوال حسن کا مجسّمہ تھی۔
ں ایک اچھی بیوی کی سب خوبیاں تھیں۔ اسی لئے
ل اتنا خوش تھا۔ دوسرے وہ باپ بھی بننے والا

"یہ لیجئے چائے" اُس نے رسول کی طرف پیالی
بڑھاتے ہُوئے کہا "پولیس سٹیشن سے محمُود آیا ہے انسپکٹر
صاحب نے آپ کو اسی وقت یاد کیا ہے۔ جلدی کیجئے"

"محمود کو اندر بلا لاؤ تاکہ وہ بھی ایک پیالہ چائے
پی لے"

"میں نے اس سے چائے پینے کے لئے کہا ہے،
وُہ بیٹھک میں انتظار کر رہا ہے"

"خیریت تو ہے؟" رسول نے بیٹھک میں گھستے ہُوئے
کہا "آج انسپکٹر صاحب نے اس وقت کیسے یاد
فرمایا؟"

"خیریت نہیں ہے" محمُود بولا "انسپکٹر رشید
صاحب کو خبر ملی ہے کہ گھس پیٹھئے اس علاقے میں بھی
گھس آئے ہیں اُن کا مقابلہ کرنے کے لئے فوراً روانہ
ہونا ہے۔"

"بھئی پہلے چائے پی لو، پھر مجھے سارا قصّہ سناؤ"
رسول بولا۔

"رسول" محمُود نے چائے کی چُسکی لیتے ہُوئے کہا
"اُس وقت تم کافی چھوٹے رہے ہو گے لیکن تم نے سُنا
ضرور ہو گا کہ ۱۹۴۷ میں بھی پاکستانی گھس بیٹھئے کشمیر
میں گھس آئے تھے اب ۱۷ سال بعد پاکستان نے پھر
گھس پیٹھئے بھیجے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مجاہد
کہتے ہیں۔ سب پولیس چوکیوں پر اطلاع کر دی گئی ہے

اور ہمیں فوراً کارروائی کرنے کا حکم ملا ہے۔"

"یہ تو واقعی بُری خبر ہے" رسول بولا "جب ۱۹۴۷ء میں گھس پیٹھئے آئے تھے تو میری عمر کُل دس سال تھی۔ لیکن اُن دنوں کی یاد اب بھی میرے دماغ میں تازہ ہے مجھے ایک گھس پیٹھیا جان سے ہی مارے دے رہا تھا کیونکہ میں نے اپنا سوئیٹر اُسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ شکر ہے کہ اس وحشی کو رحم آگیا اور اس نے کچھ تھپڑوں کے بعد جان بخش دی۔"

"معلوم نہیں، دشمن کیوں ہمارے ملک کا امن تباہ کرنے پر تُلا بیٹھا ہے ہم خوشحال ہیں۔ ہم خوش ہیں ہم پاکستان میں شامل ہونا نہیں چاہتے۔ ہندوستانیوں نے آج تک تن من دھن سے ہمیں پیار کیا ہے۔ پھر بھی پاکستانی ریڈیو ڈھنڈورہ پیٹ رہا ہے کہ کشمیر کے لوگ مسلمان ہیں اور ہندوستانی حکومت سے خوش نہیں ہیں۔ کیا بکواس ہے!"

مذہب نے پہلے بھی کئی بکھیڑے کھڑے کئے ہیں میرے والد مرحوم تیس سال پہلے اسی بکھیڑے کی نذر ہوگئے۔ وہ پاکستان میں شامل ہونے کے حق میں تھے کیونکہ وہاں سب مسلمان رہتے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے کئی دلیلیں رکھیں لیکن وہ میرے خیالات سے متفق نہیں ہوئے کچھ دنوں بعد وہ اچانک غائب ہوگئے۔ معلوم نہیں ان کا کیا ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے خیالات کے اختلاف کے سبب ہی وہ یہاں سے چلے گئے۔ میں نے ان کا پتہ لگانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔"

"یہ پُرانی باتوں کے سوچنے کا وقت نہیں ہے انسپکٹر رشید ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اٹھو جلدی کرو۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔"

کچھ ہی لمحوں کے بعد رسول وردی پہنے اندر سے بیٹھک میں آیا۔ اس نے اپنی ٹوپی کو ترچھی کرکے سر پر جمایا۔ اور بیوی کی طرف پیار بھری نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔

رسول اور محمود سیلوٹ کرنے کے بعد انسپکٹر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

"کیا آپ لوگوں کو خبر مل گئی؟" انسپکٹر رشید نے پوچھا۔ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کا ادھیڑ آدمی تھا جو اپنی نرم دلی اور خوش اخلاقی کے سبب اپنے ماتحتوں کا ہر دلعزیز تھا۔

"نہیں جناب" رسول نے جواب دیا

"**پاکستانی** گھس پیٹھئے ہماری سرحدوں میں گھس آئے ہیں۔ خبر ملی ہے کہ وہ اہم عمارتوں اور پُلوں کو برباد کرنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ لوگوں میں افراتفری پھیل جائے اور چاروں طرف بھگدڑ مچ جائے۔ حالت بہت تشویش ناک ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب اور کہاں توڑ پھوڑ شروع ہو۔ میں خاص خاص اہم ناکوں پر پولیس کے دستے بھیج رہا ہوں میں تمہیں اور محمود کو احمد اور ٹیکو کے ساتھ پاور ہاؤس کی حفاظت پر تعینات کر رہا ہوں۔"

"بہت بہتر جناب"

"تم لوگوں کو پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہونا چاہیئے اگر ضرورت پڑے تو گولی تک چلانے سے بھی گریز نہ کرنا۔ اس حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جھجک یا رحم کو دل سے نکال دو۔ تم لوگوں کا پہلا اور آخری فرض اپنی ڈیوٹی ہے۔ ہمیں اب یہ بھی پتہ نہیں کہ ہم لوگوں میں کون غدار ہے ہمارے رشتے دار، دوست، یار کوئی بھی دشمن کا ایجنٹ ہو سکتا ہے اس لئے ایسی کارروائیوں کے بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتاؤ۔ سب کچھ خود تک محدود رکھو۔ اور ہاں خیال رہے کہ پاور ہاؤس کی حفاظت سب سے اہم کام ہے۔ اُس کی حفاظت کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹانے کے لئے میں تمہیں اختیار دیتا ہوں۔"

"بہت بہتر جناب۔"

"ہتھیاروں سے لیس ہو کر جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم سب میں سے کوئی دشمن کے ہاتھوں زخمی ہو! سُنا ہے گھس پیٹھئے پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہیں اور جان ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہیں۔ اس لئے ہر وقت چوکس رہنا"

"بہت بہتر جناب"

"مجھے اُمید ہے کہ حالت جلدی ہی سُدھر جائے



اچانک رسول کو کچھ یاد آیا اور
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
پھیل گئی۔

گی اور ہم اُسی طرح امن چین سے رہیں گے "
رسول اور محمُود صُبح اور آدھی رات کو چھ چھ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے تھے۔ دونوں وستے دن رات جاگ کر اپنا فرض پوری طرح انجام دے رہے تھے۔

دراصل اُن کے سامنے اتنا اہم مقصد تھا کہ وُہ اپنی دکھ تکلیفیں سب بھُول گئے۔ ہر ایک اپنے فرض کو پوری طرح نبھانے کی کوشش کر رہا تھا
فرصت کے وقت وہ ریڈیو سنتے، جس سے گھُس پیٹھیوں کے ذریعے کی گئی توڑ پھوڑ اور بھارتی فوج کے ذریعے کی جانے والی کارروائی کا اندازہ ہوتا رہتا تھا۔

اُس رات آسمان بالکل صاف تھا۔ رسول اور محمُود نے ڈیوٹی سنبھالی اور پاور ہاؤس کے چاروں طرف چار پانچ راؤنڈ لگانے کے بعد گیٹ پر آکر شفاف آسمان میں تیرتے چاند کو گھورنے لگے۔ ماحول بہت پُرسکوں تھا لیکن اندھیرے کا سہارا لے کر دشمن کے بہت سے ایجنٹ توڑ پھوڑ کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے

"ہوا بہت ٹھنڈی ہے" محمُود نے کہا۔

"ہم لوگوں پر ٹھنڈ اور گرمی کوئی اثر نہیں کر سکتی" رسول نے جواب دیا "ہم لوگ سپاہی ہیں ہم لوگوں کا فرض لوگوں کی حفاظت کرنا ہے ہمارا فرض دشمن کو سرحد کے پار بھگانا ہے"

"رسول، میں نے اتنا وفادار سپاہی آج تک نہیں دیکھا"

اچانک رسول نے گھُوم کر وہاں دیکھا جہاں دیوار ایک طرف مُڑ گئی تھی۔

"کیا تم نے کوئی آواز سُنی؟"

"نہیں" محمود نے کہا "کیا بات ہے؟"
"آؤ ذرا ایک نظر دیکھ لیں" دونوں اُس طرف چل دئے۔
"سُنا تم نے؟" رسول نے یک دم محمود کو کندھے سے پکڑ کر روکتے ہُوئے کہا۔ کچھ ہی دیر پہلے کچھ فاصلے پر ایک پتھر لُڑھکتا ہُوا ڈھلان کی جھاڑیوں میں اُلجھ گیا تھا۔
"وہ لوگ یہاں بھی آ پہنچے ہیں" محمود نے کہا۔
"کوئی بات نہیں" رسول نے لاپرواہی سے کہا "ایسا لگتا ہے وُہ ہماری موجُودگی سے بے خبر ہیں۔ آؤ چُھپ کر ان کا پیچھا کریں تاکہ ان کی مرمت اچھی طرح کی جاسکے۔"

دونوں ایک پیڑ کے پیچھے جا چُھپے۔ چاند کی روشنی پھیکی پڑنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی سب چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ دونوں سپاہی سانس روکے انتظار کر رہے تھے۔ اسی وقت ایک کُتا بھونک اُٹھا اور اس کے بعد کئی اور کُتے بھونکنے لگے۔
"دال میں کچھ کالا ضرور ہے" رسول پھُسپھُسایا۔
"لیکن جب تک ہم زندہ ہیں کوئی پاور ہاؤس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا" محمود مٹھیاں بھینچتا ہُوا بولا۔
وُہ اسی طرح سانس روکے کافی دیر تک بیٹھے رہے کوئی ایک گھنٹے بعد انہیں پھر پھُسپھُساہٹ سی سنائی دی۔ محمود نے گردن گھما کر دیکھا۔ سامنے دیوار پر ایک سایہ ہاتھ ہلا ہلا کر ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔
کچھ ہی دیر بعد کچھ اور بھی سائے دیوار پر چڑھ گئے۔ اُن میں سے دو دیوار کے اندر کود گئے اور ایک نے دیوار سے بھاری سا تھیلا نیچے لٹکا دیا۔ اس کے بعد وُہ بھی نیچے کُود گیا۔ اُن میں سے ایک تھیلا کھولنے لگا اور باقی اِدھر اُدھر گھوم کر فلیتہ لگانے کے لئے جگہ تلاش کرنے لگے۔
"کیا اس ڈرامے کو ابھی چلنے دیں؟" رسول بولا "یہ بارُود لگانے کے چکّر میں ہیں۔"
"ٹھہرو۔ ابھی ہمیں کچھ دیر اور چپ چاپ پڑے رہنا چاہئے" محمود بولا "دیکھتے نہیں اُن کے پاس ہتھیار ہیں۔ ذرا بھی آہٹ ہونے پر وہ لوگ گولی چلا دیں گے"

"ہم یہاں سے لیٹے لیٹے فائرنگ کیوں نہ کریں؟"
"میں کوشش تو یہی کرُوں گا کہ یہ زندہ ہی ہمارے ہاتھ لگ جائیں۔ اس سے ہمیں ان کی بہت سی باتوں کا پتہ چل جائے گا اور اس طرح ہم ان کے ہتھیاروں کو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے" رسول نے کہا۔
"میں تم سے متفق ہوں" محمود بولا "لیکن کہا نہیں جا سکتا کہ ہم انہیں زندہ بھی پکڑ پائیں گے یا نہیں انہیں اپنی کامیابی پہ پورا پورا بھروسہ ہے؟"
"[illegible] آدمی کو بھی ہم زندہ پکڑ لیں تو کام بن جائے" [illegible] سول بولا۔

اسی دوران گھُس پیٹھیے پاور ہاؤس تک پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے جلدی سے کچھ تار پاور ہاؤس کی دیوار سے باندھے اور ان کے ساتھ ٹائم بم باندھ دیا۔ بم کا فیوز اُس نے ایک جھاڑی کے نیچے چھُپا دیا۔ یہ کام انہوں نے بنا کسی رُکاوٹ کے تھوڑی ہی دیر میں کر لیا تھا۔
"وہ پاور ہاؤس اُڑانے والے ہیں" رسول پھُسپھُسایا "ذرا ٹھہرو۔"
"اب ٹھہرنے کا وقت نہیں" رسول بولا "تھوڑی سی دیر ہمارے لئے بہت مہنگی پڑے گی۔ آؤ اب انہیں پکڑ لیں۔"
"تب پہلے ہوا میں گولی چلا کر انہیں ہوشیار کر دو کہ ان کی ہر حرکت پر پولیس کی نظر ہے اور یہ اس وقت پچاس سپاہیوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ اپنے اپنے ہتھیار پھینک کر یہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں۔"

رسول نے اُسی وقت اپنی رائفل اُٹھا کر ہوا میں فائر کر دیا اور چلّایا "سرینڈر، اپنے ہتھیار پھینک دو اور ہاتھ اُوپر اُٹھا کر آگے بڑھو۔ پچاس سپاہی اس وقت پاور ہاؤس کو گھیرے کھڑے ہیں اس لئے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"
تینوں گھُس پیٹھیوں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔

انہوں نے بھاگنے کی اندھادھند کوشش کی۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ پولیس کے کتنے سپاہیوں نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ان میں سے ایک چلّایا "یہ جھوٹ ہے۔ ہمارے جاسوسوں نے ہمیں یہاں پولیس کی موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔"

رسول نے محمود کی طرف گھوم کر پوچھا "بولو اب کیا کریں؟"

"یہاں سے ان پر گولی چلاؤ۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر انہیں ہماری جگہ کا علم ہوگیا تو حالت بہت خراب ہو جائے گی" محمود نے کہا۔

اس بیچ تینوں گھس پیٹھیے بدقسمتی نے دیوار کی طرف ہٹتے جا رہے تھے۔ جیسے ہی اُن میں سے ایک دیوار پر چڑھا۔ رسول نے گولی داغ دی گھس پیٹھیا تیزی سے اُچھلا اور دیوار کے نیچے آگرا۔ محمود اپنی رائفل پر جھنجھلا رہا تھا۔

جیسے ہی گھس پیٹھیوں نے اپنے ساتھی کو گرتے دیکھا وہ ہڑبڑا گئے اور تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگے رسول کی گولیوں نے ان کا تیزی سے پیچھا کیا۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ تیسرا گھس پیٹھیا تیزی سے اُس کی طرف بھاگا آ رہا ہے۔ وہ بُری طرح گھبرایا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر غصہ بھی جھلک رہا تھا۔ وہ گولیوں کی بوچھار میں تیزی سے بھاگا آ رہا تھا۔

اچانک رسول چلّایا "پروردگار، مجھے ہمت دے۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

اُس کے ہاتھ رُک گئے۔ تب اُنگلی رائفل خاموش ہوگئی۔ وہ اب بھی بھونچکا سا کھڑا گھورے جا رہا تھا۔

محمود چلّایا "گولی چلاؤ رسول، نہیں تو وُہ بھاگ جائے گا؟"

اُسی طرح کھڑے کھڑے رسول نے رائفل اُٹھائی اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی بھاگتے ہُوئے گھس پیٹھیے کی کھوپڑی کو چھیدتی ہُوئی نکل گئی تھی۔ رسول نے رائفل پھینک دی اور رونے لگا۔

"ارے ہمت رکھو، رسول۔ لڑائی میں دِل ہلکا کرنے سے کام نہیں چلے گا ٹھیک ہے کہ کسی کو جان سے مارنا کوئی کھیل تماشا نہیں ہے لیکن کبھی کبھی یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے۔"

"تم نہیں جانتے محمود" رسول نے لڑکھڑاتے ہُوئے گھس پیٹھیے کی طرف بڑھ کر کہا۔ اُس نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

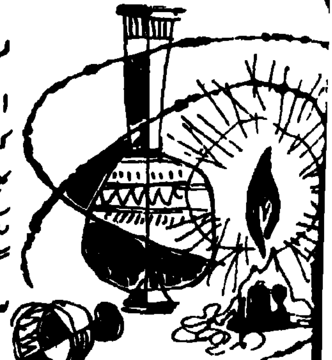
"یہ میری کرنی کا پھل ہے رسول، تم نہ روؤ۔ میں تمہاری بانہوں میں مر رہا ہوں۔ اسی سے میری روح کو بہت سکون ملے گا" گھائل گھس پیٹھیے نے دھیرے سے کہا اور اُس کی گردن ایک طرف کو لُڑھک گئی

"رسول، تم اسے کیسے جانتے ہو؟" محمود نے پوچھا

رسول نے لاش کو ٹھیک طرح سے زمین پر لٹا دیا اور روندھے ہُوئے گلے سے بولا "محمود، یہ میرے والد صاحب ہیں۔" ●

رہنے دو ابھی . . .

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے
پھر دیکھیے، اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی، پیمانۂ صہبا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
— غالب



ریلوں نے، جو پچھلی صدی کے وسط میں وجود
میں آ ... تیں، صنعتی انقلاب لانے میں
بہت اہم کام کیا اور ... انسانی ترقی میں بہت
زیادہ مدد کی۔ دوسری جنگ عظیم کے آخر میں
کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ریل گاڑیاں

آثار نظر نہیں آتے کہ ریلوے ٹرانسپورٹ میں
تکنیکی ترقی معراج تک پہنچ چکی ہے۔ ایسی کوئی
بات نہیں ہے۔ ریلوں میں آج بھی بہت سی
نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور آئندہ بھی ایسا
ہوتا رہے گا۔

کمار

مقالہ

کل کی ریل گاڑی

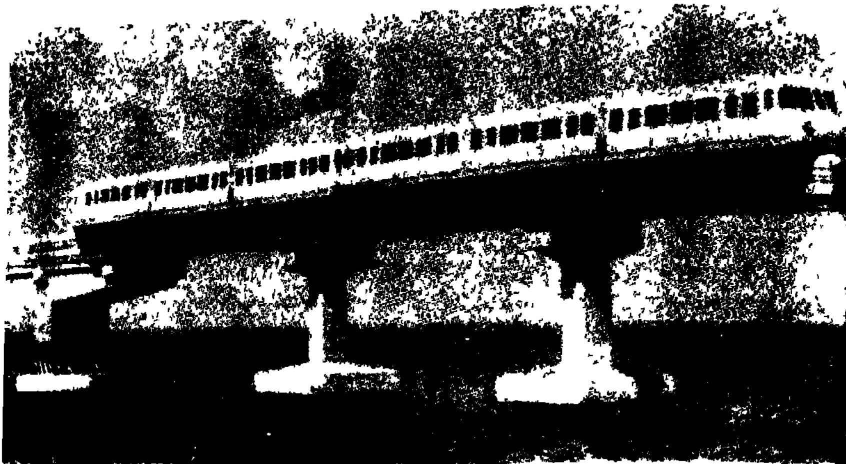
اب سڑک اور ہوائی سروسز کے آگے ہار مان
جائیں گی اور ان کی پہلی جیسی اہمیت نہیں
رہے گی۔ لیکن جلد ہی انھیں اپنا نظریہ بدلنا
پڑا، کیوں کہ رسل و رسائل کی جو بڑھتی
ضرورتیں سامنے آئیں انھیں پورا کرنے میں
دوسرے انتظامات ناکافی معلوم ہوئے،
اس سے ریلوں کی حقیقی افادیت کے بارے
میں صحیح علم ہوا اور ریلوں کا استعمال کم ہونے
کی بجائے برابر بڑھتا ہی گیا۔

ریلوں کا خاص فائدہ یہ ہے کہ وہ ایک
ہی بار میں بہت سا مال یا سینکڑوں مسافروں
کو لے جا سکتی ہیں۔ مثلاً ایک لاکھ مسافروں
کا مسئلہ ہو تو ان کے لیے معمولی لمبائی کی
صرف پچاس یا سو ریل گاڑیاں کافی ہیں۔
اسی طرح ایک بڑے شہر یا صنعتی علاقے کی
روزمرہ سپلائی کے لیے بھی اتنی ہی مال
گاڑیوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، جب کہ ان کے
مقابلے میں شاید دو ہزار بسوں یا ٹرکوں کی
ضرورت پڑے۔

پھر یہ تو موجودہ حالت ہے۔ اس شعبے
میں آئندہ اور کیا تکنیکی ترقی کی گنجائش ہے،
وہ ایک الگ بات ہے۔ اور ابھی تو ایسے کچھ

یہ درست ہے کہ تکنیکی انقلاب
فائدہ رسل و رسائل کے تمام ذرائع کو پہ
گا، صرف ریلوں کو ہی نہیں۔ لیکن اتفاق
ریلوں کی بناوٹ بھی کچھ ایسی ہے کہ وہ ا
ترقی سے فائدہ اٹھا سکیں گی۔ ریلوں کی سد
سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا پاور یونٹ
یعنی انجن باقی ٹرین سے بالکل الگ ہوتا۔
اس میں یہ سہولت رہتی ہے کہ ریلوں میں کس
طرح کی طاقت کا استعمال کر لیا جائے۔ کوئلہ
جلا کر بھاپ سے چلنے والے انجن، ڈیز
جلا کر چلنے والے انجن، گیس ٹربائن انجن
اے سی، ڈی سی بجلی کے انجن۔۔۔
ان کے لیے ایک جیسے مفید اور کا
ہیں، اس لیے اگر مستقبل میں ایٹمی طا
یا کسی دوسری طرح کا ایندھن عام صنع
میں آنے لگا تو یقیناً اس سے فائدہ ا
میں ریلیں ہی پیش پیش رہیں گی۔

مسافروں کے بیٹھنے کے ڈبے



ریل گاڑی کی تکنیک میں ہر دن نئی ایجادات ہو رہی ہیں یہ سب سے موثر ریل گاڑی ہو کر دنیا میں ایسی نوعیت کی پہلی ایجاد ہے۔

رسل و رسائل کے دیگر انتظامات کے مقابلے میں ریلوں کو ایک اور سہولت بھی دستیاب ہے۔ وہ ہے ان کے راستے میں بھیڑ بھاڑ کا نہ ہونا۔ ریلیں اپنی مستقل پٹڑیوں پر چلتی ہیں، اس سے ان کی ٹریفک پرابلم ایک حد تک محدود رہتی ہے جب کہ سڑک آمدورفت یا سمندری جہازوں کے معاملے میں یہ دقت دو طرفہ ہوتی ہے اور ہوائی رسل و رسائل میں بلندی سمیت سہ طرفہ۔ (اب تو خلائی راکٹوں کے وجود میں آجانے سے وقت یا زمانے کے چوتھے بازو پر بھی غور و فکر ہونے لگا ہے)

آخری بات یہ ہے کہ ریلیں نہ صرف قومی سطح پر منظم ہوتی ہیں، بلکہ اکثر ان کا سلسلہ دوسرے ملکوں کے ریل سسٹموں سے بھی جڑا رہتا ہے۔ یورپ اور دونوں شمالی و جنوبی امریکہ میں اور ادھر چین اور روس کے راستے یورپ تک ایک ہی سلسلہ ہے۔ اس بین الاقوامی نوعیت کی وجہ سے ریلوں کے لئے یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ ایک ملک میں جو ترقی یا سُدھار ہو، اُس کی دوسرے ممالک میں بھی تقلید کی جائے۔

یہ تمام باتیں ریلوں کی مدد سے بہت جلدی کی گئی ترقی اور وسعت کے لئے خوش گوار ہیں، اور انہی کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اگلے بیس برس میں ریلوں کا کیا روپ ہوگا۔

جاپان نے پہلے ہی اس سوال کا جواب اپنی مشہور ٹوکیڈو لائن کی تعمیر کرکے دے دیا ہے۔ یہ نئی لائن جو زمین سے کچھ اوپر اٹھا کر کنکریٹ کے کھمبوں پر بنائی

ور آرام دہ ہوں گے اور اُن کے اندر کا ماحول کسی جدید جیٹ جہاز کی طرح ہوگا

ق ہے۔ صرف تیز رفتار ٹریفک کے لئے
ہے، بس پر چلنے والی گاڑیاں ۲۰۰ کلومیٹر
گھنٹہ سے زیادہ تیز رفتار سے دوڑتی ہیں،
ب کہ دوسری لائنیں کم رفتار ٹرینوں کے لئے
چھوڑ دی گئی ہیں۔

جاپان کا یہ تجربہ بہت زیادہ کامیاب
ثابت ہوا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے
کہ اگلے بیس برس میں دوسرے بہت سے
ملکوں میں بھی (برطانیہ اور مغربی یورپ
میں تو خصوصاً) اسی طرح کے انتظامات
کے جائیں گے۔ یورپ کی نئی ریلیں اب کی
نسبت زیادہ ہموار بنا رد کے دور تک جانے
والی) اور متحد ہو جائیں گی۔ اس کے کئی
شواہد آثار ابھی سے ظاہر ہونے لگے
ہیں۔ جیسے آبنائے برطانیہ وسط کے نیچے
سے سرنگ، مینائل اور آلپس کے پہاڑوں
میں کم اونچائی پر نکالی جانے والی نئی سرنگیں
وغیرہ۔ ان سے مغربی یورپ میں ریل کی
آمد و رفت میں تیز رفتاری، آرام اور سہولیات
آ جائیں گی۔

تیز رفتار ایکسپریس ٹرینوں کے لئے
بچھائی جانے والی نئی پٹریاں آج کی پٹریوں
سے کچھ مختلف نہیں ہوں گی۔ ان پر بھی گٹا
ہوا پتھر ڈالا جائے گا یعنی کنکریٹ کے ایسے

کل کی یہ ریل گاڑی آج سے زیادہ آرام دہ اور تیز رفتار ثابت ہوگی۔ ضروریات کے مطابق اس میں ہر قسم کی سہولیات میسر ہونگی۔





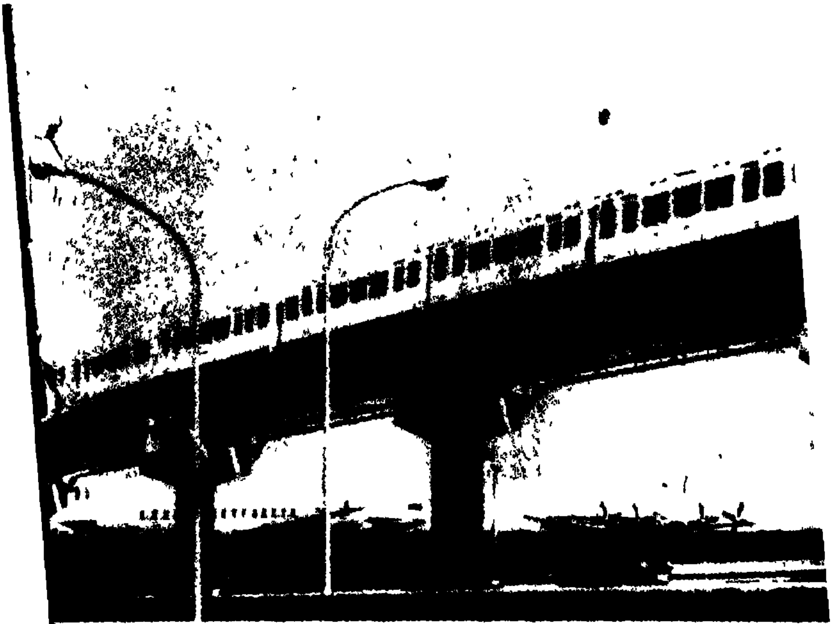
ڈیکنڈ لائن کا ایک نظارہ

سلیپر ہوں گے، جو ٹرین گزرنے کی گھڑگھڑاہٹ اور آواز کو زائل کردیں۔ سائنسی تحقیق سے آمیزش کئے ہوئے اسپات کی ایسی پٹریاں بھی بن سکتی ہیں جو اپنے طور پر ہی اس ضرورت کو پوری کردیں اور تب پتھر ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

ایک بات تو یقینی ہے۔ مستقبل کی تیز رفتار ریل گاڑیوں کے لئے لال ہری روشنی کے سگنلوں کی گنجائش نہیں ہوگی، یہ سب رفتار کو کم کرتے ہیں۔ اس لئے ان سب کی بجائے زیادہ تر ریڈیو رابطے سے ہی کام لیا جائے گا اور ٹرینوں کے کنٹرول اور ہدایت کے تمام کام آٹومیٹک ریڈیو والے آلات کے ذریعے انجام دیئے جائیں گے۔ ریلوے اسٹاف کے علاوہ مسافروں کو بھی یہ آسانی رہے گی کہ وہ جب چاہیں کسی بھی اسٹیشن سے اپنا رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔

ان ٹرینوں کے ڈرائیور بھی ایک طرح کے چیف انجنیئر ہوں گے۔ ان کا کام صرف اپنی جگہ پر بیٹھ کر سامنے کے میٹروں پر نظر رکھنا ہی ہوگا۔ چلتی گاڑی سے متعلق تمام باتیں ان میٹروں پر ریکارڈ ہوتی رہیں گی، اور کہیں بھی کوئی خرابی ہونے پر متعلقہ میٹر اس کی اطلاع دے گا، اور تب ڈرائیور۔ انجنیئر کا کام ہوگا کہ اس خرابی کو فوراً دور کرے۔ گارڈ کا کام بھی اب کی نسبت بہت زیادہ تکنیکی ہوجائے گا۔ اسے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہی ٹرین کے تمام مسافروں کی ضروریات کا دھیان رکھنا ہوگا اور انہیں پورا کرنا ہوگا۔

مسافروں کے بیٹھنے کے ڈبے اب کی نسبت زیادہ خوب صورت ہوں گے اور ان کے اندر کا ماحول بہت ہی زیادہ خوش گوار اور آرام دہ ہوگا۔ گاڑیوں کے نیچے ایسے اسپرنگ لگے ہوں گے جن سے اندر بیٹھے لیٹے ہوئے مسافروں کو چلنے کا ذرا سا بھی جھٹکا محسوس نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں تمام ڈبے مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہوں گے اور اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ بالکل



جاپان کی یہ ریل گاڑی ایئرپورٹ کے زمین دوز ریلوے سٹیشن سے نکل کر مونو لائن پر چل رہی ہے۔

سنائی نہیں دے گی۔ وہ اکثر ایسا محسوس کریں گے جیسے کسی جدید جیٹ جہاز میں اڑے جا رہے ہوں۔

ان سہولیات کے علاوہ مسافروں کو اپنی ضرورت کی تمام چیزیں۔ جیسے ناشتہ، کھانا، چائے پانی وغیرہ اور ہمیشہ استعمال میں آنے والی سب چیزیں چلتی ٹرین میں ہی مل جائیں گی کہنا نہ ہوگا کہ مستقبل کی ریل گاڑیاں آج کل کی نمائشی ٹرینوں کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہہ ہونے والے دروازوں کے ذریعے جڑی ہوں گی اور ڈبوں میں ایک طرف چلنے پھرنے کے لئے گیلری بنی ہوگی۔ ان ٹرینوں میں سفر کرنے والے لوگوں کی دلچسپی کا بھی پورا خیال رکھا جائے گا، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما، کھیل تماشے سب ٹرین کے اندر ہی موجود ہوں گے۔ اس سے مستقبل کے یہ ریل کے سفر کچھ لوگوں کے لئے آرام کرنے اور دل بہلانے کا ذریعہ ثابت ہوں گے، جب کہ کچھ دوسرے لوگوں کو پڑھنے پڑھانے یا کچھ ضروری دماغی کام کرنے کے لئے اپنے گھر کی بجائے ان ریل گاڑیوں کا خاموش اور آرام دہ ماحول زیادہ موافق رہے گا۔

مستقبل کی ریلوں کی افادیت نجوم اور فلکیات میں بھی لی جا سکتی ہے۔ ٹرین کی چھتوں پر رصدگاہ بھی بنائی جا سکتی ہیں اور ان سے حیرت انگیز معلومات دریافت کرنے کا کام بھی لیا جا سکے گا۔

دھوپ چھاؤں

فارموسا کے ایک نئے شادی شدہ جوڑے نے طلاق کی درخواست دی ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر رہنا چاہتے ہیں۔ میاں بیوی دونوں ٹیچر ہیں۔ سرکاری قانون کے مطابق کسی بھی مدرسہ میں ایک ساتھ میاں بیوی کا تقرر نہیں ہوسکتا۔

—— روزنامہ 'سالار' بنگلور

(بھیجنے والی، نسرین شاہینہ، میسور)

●

اکویڈور کا ایک شہری اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ 'ہنی مون' منانے کے لئے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اس ہوٹل میں ایک کھلونا ریل گاڑی نے اس شخص کو اتنا متاثر کیا کہ وہ پانچ دن تک اپنی نئی نویلی دلہن کی سدھ بدھ کھو بیٹھے

پانچ دن کے بعد جب اُسے ہوش آیا تو اُس کی بیوی ہوٹل کے بیرے کے ساتھ کہیں ہنی مون منانے جاچکی تھی —— 'بلٹز' بمبئی

(بھیجنے والے۔ شہریار سعید، حیدرآباد دکن)

●

ڈھاکہ کے ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ سید حسن کو اینٹی کرپشن پولیس نے سرکاری افسروں کے چال چلن کے قانون کی خلاف ورزی رشوت ستانی اور ایک عورت کی آبروریزی کرنے کے الزام میں گرفتار کرلیا انہیں ایک مقامی عدالت نے ضمانت پر رہا کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی [illegible] عورت مہرالنساء زوجہ دلاور حسین نے ایک شخص محی الدین پر آبروریزی کا مقدمہ دائر کیا سُنا جاتا ہے کہ سید حسن علی نے دلاور حسین سے رشوت لی اور اس شرط پر مہرالنساء کے حق میں فیصلہ دینے کا وعدہ کیا کہ اسے مہرالنساء کے ساتھ شب باشی کی اجازت دیدی جائے۔ دلاور حسین نے اینٹی کرپشن پولیس کو اطلاع دیدی اور سید حسن علی دلاور کے مکان پر پکڑے گئے۔ —— روزنامہ 'عصر جدید' کلکتہ

(بھیجنے والی:۔ ملکہ زینت، نسرین، الہ آباد)

●

یوپی۔ بورڈ کے امتحانات کے فارم نے اس سال سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ فارم کی کمی سے ۲۵ پیسے کا یہ فارم ۳۰ روپے سے لیکر ۷۰ روپے تک بکتا رہا۔ اور یہ بھی خوش قسمت حضرات کو ہی مل سکا ۱۲۰ فارم کے لئے چھ ہزار افراد نے کوشش کی ان میں سے زیادہ تر دلی اور پنجاب کے باشندے تھے۔

—— روزنامہ 'خلافت' دلی

(بھیجنے والے شمیم ناہد سرونجی، بھوپال)

●

پٹیالہ کے قلعہ کے اندرونی حصہ میں واقع ایک مندر میں وہ آگ آج بھی جل رہی ہے، جو ریاست پٹیالہ کے پہلے فرمانروا بابا اعلیٰ سنگھ نے دو سو سال پہلے جلائی تھی۔

پنجاب سرکار اس آگ کو روشن رکھنے کے لئے ہر سال چالیس ہزار روپیہ خرچ کرتی ہے۔ مگر کوئی عام آدمی یا کوئی بڑے سے بڑا سرکاری افسر اس مندر میں داخل نہیں ہوسکتا اس مندر میں سابق مہاراجہ کے خاندان کے ہی لوگ جاسکتے ہیں۔ —— ہفتہ وار 'بلٹز' بمبئی

بھیجنے والی۔ مسعودہ صدیقی جھارسوگڑہ (اڑیسہ)

اس بار کی بہترین کٹنگ پر انعام کی مستحق
مس مسعودہ صدیقی ضلع سمبل پور (اڑیسہ) رہیں۔

میں نے جلدی سے کافی ختم کر دی، بل ادا کیا اور چلتے وقت نمستے کہہ کر ایک بار پھر اُس کا دھیان اپنی طرف کھینچا۔ اُس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کی۔

مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ میرے گھر آئے گا کیوں کہ اُس کا آنا کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھے کیا لینا دینا۔ مگر نہیں، وہ اُسی رات تقریباً دس بجے آ پہنچا۔ اُس نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازے پر جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔

"ارے تم! ایسی کیا جلدی تھی، بھائی، کل آجاتے۔"

"کل کو کہاں فرصت ہے جناب! سوچا، چلو ہوتا آؤں اور پھر جب آپ مل گئے تو ایک سے دو بھلے۔"

"کیا مطلب ہے، میں سمجھا نہیں۔"

"ایسی بھی سمجھنے کی کیا جلدی ہے بھائی زندگی میں ایک بار کچھ سمجھ میں آجاتے تو سمجھو کہ ناؤ کنارے لگ گئی۔"

تیزی رفتار



ایک دن اکبر بادشاہ نے اپنے درباریوں سے پوچھا "ہر وقت کون چلتا ہے؟"

جواب میں کسی نے سورج، کسی نے زمین اور کسی نے چاند کو بتایا۔ بادشاہ نے یہی سوال بیربل سے پوچھا تو اُنھوں نے جواب دیا — "حضور بنیے کا سُود ہر وقت چلتا ہے اسے کبھی بھی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ سُود در سُود دن دُگنی رات چوگنی تیزی سے چلتا رہتا ہے۔"

اُس نے چاروں طرف کمرے میں نظر ڈالتے ہوئے کہا "کہاں پڑے ہیں آپ بھی! اچھا پہلے کہانی سُنو، یہ بات پھر ہوگی۔"

"کیسی کہانی؟"

"بھول گئے۔ میں نے کہا تھا نا کہ گھر آکر میں تمھیں اپنی کہانی سناؤں گا۔ اس چوڑی دار پاجامے اور شیروانی کی کہانی۔"

میں بھی جم کر بیٹھ گیا اور وہ کہانی سنانے لگا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ گھر والے مجھے نکما سمجھتے تھے۔"

"مگر اب کون کہے گا؟"

"خیر، اب کی بات چھوڑو، اب تو عقل آہی گئی۔"

"ہاں لگتا تو ہے" میں نے بات آگے کھسکائی۔

"تو ایک دن گھر سے تنگ آکر میں اپنے ایک دوست کے یہاں گیا، جس کا ایک کاؤنٹر میں شراب کا ٹھیکہ چلتا ہے اور بڑے بڑے نیتا اُس کے دوست ہیں۔ میں نے اُسے اپنی رام کہانی کہہ سُنائی جسے سُن کر اُسے مجھ پر ترس آگیا۔ اُس نے مجھے اپنے ہی پاس ٹھہرا لیا۔ رات کو ایک آدمی ٹھرّا پینے آیا تو اُس نے اُسے پلانے سے پہلے اپنے پاس بُلا کر کہا 'دیکھو یہ میرا آدمی ہے اور مصیبت زدہ ہے۔ اس کی مدد کرو۔' اُس نے مجھے نیچے سے اُوپر تک دیکھا اور بولا 'کل اسے میرے پاس بھیج دینا۔ اس کے رہنے، کھانے کا انتظام کرا دوں گا۔ فی الحال گاؤں گاؤں گھومتا رہے گا اور لوگوں کو نیکی کی راہ پر چلنے کی ترغیب دے گا۔ عقل سے کام لیا تو کچھ بن جائے گا

"میں تعجب سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا اس کے بعد شربے کا ایک کوزہ چڑھا کر وہ چت ہو گیا۔ دوسرے دن میں اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے مجھے کام بتایا اور کام کے طریقے بھی۔"

"کام کے طریقے؟" میں ہونّق سا اُس کی تقریر سن رہا تھا۔

"ہاں، اُس نے بتایا کہ کام کا طریقہ ہوتا ہے۔ کرو کم، کہو زیادہ۔ دوسروں کے کام میں بُرائی نکالو۔ اس طرح اُس کی صحبت میں تقریباً تین برس رہا۔ اِس عرصے کو میں اپنی زندگی کی کریم سمجھتا ہوں۔ میں نے اس خدمت کے دوران تجزیہ کیا کہ واقعی میں بڑا نامعقول ہوں اور جو کام مجھے پندرہ برس پہلے کر لینا چاہئے تھا، صحیح طریقے سے اسے اب بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہیں میں نے یہ بھی سیکھا کہ اگر آدمی ترقی کرنا چاہتا ہے تو تین چیزوں سے صرف وہ زبانی تعلق رکھے کیوں کہ آگے بڑھنے والوں کے راستے کی یہ تین بڑی رکاوٹیں ہیں — ایمان داری، لگن اور سچائی۔ ترقی چاہنے والوں کے لئے یہ تین باتیں بہت ضروری ہیں — عیب جوئی، چاپلوسی اور خود نمائی۔ ہاں، ایک مزے کی بات اور بتاؤں کہ میں نے نیک چلنی کا اصل مطلب بھی وہیں سمجھا۔"

"وہ کیا؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"ایک دن اُستاد بیٹھے ہوئے تھے..."

"اُستاد کون؟" میں نے اُسے ٹوکا۔

"ارے بھائی جس نے پریشانیوں کے عذاب سے نجات دلا کر ایک نئی زندگی بخشی۔"

"اچھا اچھا، سمجھا" دراصل مجھے اُس کی باتوں میں بڑا لطف آ رہا تھا۔

وہ کہنے لگا "میں نے شربے کی بُرائی کر دی، شربا پینا نیک چلنی کے خلاف ہے، بس پھر کیا تھا اُستاد سیخ پا ہو گئے 'نیک چلنی جانتے بھی ہو، کیا ہوتی ہے۔ کون کہتا ہے شراب پینا نیک چلنی کے خلاف ہے دُنیا میں کوئی چیز نیک چلنی کے خلاف نہیں — ہر چیز آسی کے اِرد گرد گھومتی ہے!' مجھ میں اتنا دَم کہاں کہ اُن سے بحث کرتا۔ اُنھوں نے کہا 'سنو، نیک چلنی کا مطلب ہے جو ہمیشہ قائم رہے۔ ہمیشہ کیا قائم رہے؟ چار چیزیں — پیسہ، شربا، عورت اور عیش۔ یہ چاروں چیزیں کسی کو نصیب نہیں ہوں گی، اِکّا دُکّا کی اور بات ہے' اِتنا تو میں سات پُشت میں بھی نہ جانتا اسے کہتے ہیں صحبت کا پھل۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکا تو میں نے ٹوکا "ابھی کتنی لمبی ہے کہانی؟"

"ارے بھائی اصلی کہانی شروع ہی کہاں ہوئی۔ اچھا لو، اب آسے شروع کرتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ اطمینان سے بولنے لگا "اِس

ہزار داستان



ایک ریستوراں میں بورڈ لگا تھا یہاں سب زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک دن ایک غیر ملکی سیاح وہاں آیا اور اس نے تعجب سے مالک سے کہا "آپ تو کافی زبانیں جانتے ہیں میں آپ سے مل کر کافی خوش ہوا۔"

"بالکل نہیں،" مالک نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، "سب زبانیں میں نہیں بولتا۔ غیر ملکی سیاح یہاں آتے ہیں وہی اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔"

طرح تین سال تک میں اُس کے پاس رہا مگر تجربے کے سوا اور کچھ حاصل نہ کر سکا. بس شام تک گھوم کر آنے کے بعد چند سکّے ہی میری جیب میں ہوتے۔ ویسے کھانے پینے کے لئے کوئی کمی نہیں تھی۔ ساتھ میں کئی بہنیں بھی کام کرتی تھیں۔ اب دھیرے دھیرے میرے دل میں ایک سے ایک اُونچے خیال پیدا ہونے لگے۔ زندگی کا اصلی لطف اور عیش کے موقعے تو ابھی رہ ہی گئے تھے۔ اِس لئے میں نے ایک دن اُستاد سے عرض کیا 'کیا میں یُوں ہی زندگی بھر لوگوں کو نیکی کا درس ہی دیتا رہوں گا؟'

وہ بولے 'کیوں' کیا تھک گئے۔ ابھی کچھ دِن اور رُکو، پھر وہ کسی کام میں لگ گئے۔

دوسرے دن میں نے آنکھیں چھیڑا تو وہ مجھے ایک منتری کے پاس لے گئے پہلے مجھے باہر روک دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اندر گیا تو لگا کہ چکر کھا رہا ہوں۔ سچ مچ وقت بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ وہ منتری مجھے دیکھتے ہی پہچان تو گیا مگر اُس وقت کچھ بولا نہیں میری بھی ہمّت نہیں ہوئی کہ کچھ پُوچھوں کیوں کہ ایک جیسے بہت سے آدمی ہوا کرتے ہیں۔ اُستاد نے تعارف کرایا "سرکار اس خادم کا نام ہزاری ہے۔ تین سال سے سچائی کا پرچار کر رہا ہے دیواروں پر نشہ بندی کے اشتہار چپکاتا ہے۔ اس پر کچھ نگاہِ کرم ہو جاتے۔" اُس نے ایک بار میری طرف گھُور کر دیکھا اور مُڑ کر بولا 'اچھا، تم جاؤ، اسے میرے پاس چھوڑ جاؤ'

"اُستاد چلے گئے اور میں اُس کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بھی اندر چلا گیا اور اُس کے بعد ایک ٹیپ ٹاپ اردلی کے ذریعے مجھے اندر بلوایا۔ اُس کی رہائش گاہ میں پہنچتے ہی میرے آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے سُنا ہے جنّت بڑی پُرلطف جگہ ہے مگر وہ مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ اُس وقت میں زندہ ہی جنّت میں تھا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "کہو تمھارا نام ہزاری ہے نا؟" اُس کی بے تکلفی سے میں جھینپ گیا۔

"جھینپ کیوں رہا ہے بھائی؟ مجھے پہچانتا نہیں کیا؟ چمن کو بھول گیا؟"

"بھولا نہیں مگر..."

"اگر مگر چھوڑ یار، یہ سب تو وقت کی مہربانی ہے اِسنا آج کل کیا کرتا ہے؟ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ پہلے کیوں نہیں آیا اِدھر؟"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ آخر بڑی مشکل سے کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ چمن لال تم ہی ہو۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کہیں..."

"مرکھپ گیا ہوں گا۔ ہے نا؟" اُس نے جواب لگایا "ہزاری تو بدھو ہی رہا۔ جب



ابھی آتا ہوں...

گذشتہ مہینے پہلی مرتبہ جب میں کلکتہ آیا تو ہوڑہ اسٹیشن پر زکر سٹریٹ جانے والی ٹرام کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک آدمی آیا اور پُوچھنے لگا "شاید آپ پہلی مرتبہ کلکتہ آئے ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں" وہ کہنے لگا "کہاں جائیے گا آپ؟" میں نے بتایا کہ وہاں ہمارے رشتہ دار رہتے ہیں۔ وہ کہنے لگا "وہ تو نوکری کرتے ہیں نا؟" میں نے کہا "ہاں" پھر وہ اِس انداز سے گاؤں کی باتیں کرنے لگا جیسے ہمارے گاؤں ہی کا کوئی آدمی ہو۔ میں نے سوچا آدمی تو بہت اچھا ہے ہو سکتا ہے ہمارے رشتہ دار کو جانتا

وقت دروازے پر دستک دیتا ہے تو اچھے دن آتے دیر نہیں لگتی۔ اب تیرا بھی وقت آگیا ہے۔"

"میری بھی جھینپ مٹتی جا رہی تھی۔ میں نے پوچھا "مگر یہ بتا اس طرح کا موقع تیرے پاس کیسے آگیا۔ جیل تو تو کبھی گیا نہیں۔ ملک کی بھی خدمت کبھی کی نہیں تو پھر؟"

"ہاں، یہی تو عجیب کھیل ہے قسمت کا، بزاری، مگر اب تو دُنیا جانتی ہے کہ میں نے ملک کی خدمت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جیل گیا تھا اور سرکاری گورے افسروں کو مار کر ایک لمبے عرصے کے لئے فرار رہا تھا۔ مجھ پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔۔۔"

"مگر یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"ہو نہیں گیا، کرنا پڑا یہ سب۔"

"وہ کیسے؟"

"سنو، بتاتا ہوں۔ دراصل آزادی کے بعد قسمت نے اصلی شہیدوں کو نظر انداز کر کے دیگر لوگوں کے دروازوں پر دستک دی ۔۔۔ وہ جو ایمان داری کا لبادہ اوڑھ کر وطن کے دیوانے بنے رہے اور اس موقعے کو پہچان نہیں سکے اور اُن میں سے ڈھیر سارے اب تک ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ جو چالاک تھے اُنھیں یہ موقع بہت سازگار آیا۔ اُس وقت میں سادھو کے بھیس میں نیپال کے پہاڑوں میں چمٹا بجایا کرتا تھا تُم ہی کیا پوری بستی جانتی ہے کہ کس طرح میں ایک بے قصور آدمی کو مار کر فرار ہو گیا تھا گھر بار قُرق ہو جانے کی خبر اخباروں میں آئی مگر پھر بھی میں آ نہیں سکا۔ آٹھ برس تک اِدھر اُدھر دھکے کھاتا رہا اور جب مُلک آزاد ہوا تو بڑی مشکل سے کھدر کے ایک دھوتی کرتے کا انتظام کیا۔ اُس کے بعد پارٹی کے دفتر میں جا کر اپنا نام لکھوایا اور یہ بھی بتایا کہ میں مفرور ہوں اور میں نے ایک انگریز افسر کا قتل کیا تھا۔ نام درج کرنے والے نے مجھے بڑی عزت بخشی۔ بس اُسی دن نئے جنم کا جنم ہوا

ہو گا۔ پھر وہ کہنے لگا "احمد آپ کے کون لگیں گے؟" میں نے بتایا کہ وہ ہمارے چچا زاد بھائی ہیں۔ اُس آدمی نے بڑے یقین سے کہا "ابھی وہ بڑا بازار کپڑا خریدنے آئے ہیں میں اُن ہی کے محلّے میں رہتا ہوں چلئے اُن سے مِلا دوں۔" اب مجھے کوئی اعتراض بھی نہ تھا کیوں کہ بات چیت سے ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہ تھا آگے آئے تو کہنے لگا "پیسے ہوشیاری سے رکھئے۔" تھوڑی دُور چل کر اپنے دو پانچ پانچ کے نوٹ بھی مجھے رکھنے کے لئے دیدیئے۔ اب تو مجھے ذرا بھی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ کچھ دُور آئے تو کہنے لگا "آپ نئے آدمی ہیں لایئے میں ہی رکھ لیتا ہوں۔" میں نے اپنا پرس جس میں دس روپے کا نوٹ تھا دو پانچ کے نوٹوں کے ساتھ دیدیا۔ جب ہیریسن روڈ کے پاس آئے تو وہ کہنے لگا "آپ یہ پرس رکھیئے میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔ آپ یہیں کھڑے رہیے۔" اور میں ایک خاص جگہ کھڑا رہا۔ گھنٹوں گزر گئے اور وہ نہیں آیا۔ میں نے پرس کھول کر دیکھا تو روپے بھی غائب تھے۔ سوچنے لگا۔ یہ کیا ہوا۔ ہوا تیز چل رہی تھی سمجھا ہوا میں اِدھر اُدھر ہو گئے ہونگے جب وہ آدمی واقعی نہیں آیا تو میں اپنی حماقت پر نہایت شرمندہ ہوا۔ اور پیدل ہی منزلِ مقصود کی راہ لی

۔۔۔ منصور عالم، کلکتہ

"اب تو وقت میرے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ میں پارٹی کی خدمت میں جی جان سے جُٹ گیا۔ اور اگلے الیکشن میں اکثریت سے چن لیا گیا۔ لوگ تین بار مہاتما گاندھی کی جے کے بعد ایک بار چمن لال کی جے کے نعرے لگانے لگے۔ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے میں آسمان پر اُٹھ گیا۔ پھر لوگوں کے طفیل سے میں منسٹری بھی بن گیا۔ منسٹری بننے کے بعد مجھے ایک عالیشان بنگلہ ملا۔ اُس میں بے شمار تحفے آتے۔ جن چیزوں کو میں خواب میں بھی نہ دیکھ سکتا تھا وہ سب مجھے ملیں۔ گھر بار کا لگاؤ تو میں بہت پہلے ہی ترک کر چکا تھا اس لئے اُن لوگوں کے لئے میں مَرا ہوا ہی بنا رہا۔ رہ بھی کون گیا تھا۔ اُس کے بعد میری ایک ہی تمنا اور رہ گئی تھی۔"

"وہ کس کی؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا تو اُس نے بتایا "اب یہ بھی بتاؤں کیا؟"

میں نے اُس کے بالوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ خوب ہنسا "اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہزاری! دِل تو جوان ہے ہی۔ مگر میرا خادم جو کبھی کسی انگریز کے کا اردلی تھا مجھ سے بولا "سرکار گھر بار کی محبت ختم کرو۔"

"لیکن . . .؟"

"اُس کی آپ کیا فکر کرتے ہیں مالک، ہر رات ایک نئی آسکتی ہے۔ ویسے اگر گھر بار میں پھنس گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ابھی آپ کنوارے ہیں۔ یہی ٹھیک ہے۔ کوئی کچھ شک بھی نہیں کرے گا۔"

"میں نے اُس کی نیک صلاح مان لی اور شادی نہیں کی۔ کام چلتا رہا۔ اور اب جدھر بھی نظر ڈالو۔ زیادہ تر نیتا غیر شادی شدہ ہی ملیں گے۔ میں نے گرہ لگائی کہ نیتا کا کنوارا رہنا ہی ایک خوبی ہے۔ میں نے کبھی تنہائی کا احساس نہیں کیا۔ تمھیں بھی نہیں محسوس ہوگا۔ اچھا اب تم تھک گئے ہوگے۔

"اسی درمیان ایک حسین لڑکی دو گلاس انار کا رس لے کر آئی۔ ایک اُس نے لیا ایک میں نے۔ پھر وہ اُٹھا کیوں کہ کسی افتتاح کے لئے اُسے باہر جانا تھا۔ نوکروں سے تاکید کر دی 'دھیان رکھنا'۔ اُس کے بعد وہ خوب بن ٹھن کر بڑی شان سے شیورلیٹ کار میں جا بیٹھا۔"

میں کافی بور ہو رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ جلد اپنی رام کہانی ختم کرے۔ مگر وہ پھر کہنے لگا "تو جناب، میں اُس کے یہاں قریب ایک مہینہ رہا۔ میں نے اُس کی ہی زبانی سنا کہ اُس کا کروڑوں کا بزنس ہے۔ کئی کمپنیوں کا حصے دار ہے۔ اُس نے بے شمار پرمٹ بٹوا دئے ہیں۔"

ہزاری رُکا تو میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا "اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔ ایک دن میں چمن لال کے پاس بیٹھا تھا وہ مجھ پر بہت مہربان سا لگ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا 'ہزاری اب بے وقوفیاں چھوڑو۔ آدمی بننا چاہتے ہو تو ایک کام کرو۔ مجھ سے خرچ لو اور عوام کی بے لوث خدمت کرو۔ اگلے الیکشن میں صرف دو سال اور رہ گئے ہیں۔ ٹکٹ میں تمھیں دلا دوں گا۔ پارٹی کی طرف سے میں سب انتظامات کرا دوں گا۔ تم فوراً چن لئے جاؤ گے۔ پھر تمھارا موقع آجائے گا۔ اور تم آدمی بن جاؤ گے۔ ابھی یہ ملک اس لائق ہے کہ اِسے لُوٹا کھایا جا سکتا ہے۔ سمجھے!'

"تب سے میں جنتا کی سیوا کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ والے میرے مددگار ہیں۔ سچ کہتا ہوں بھیا، آج ترقی کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی کام نہیں ہے!" کہہ کر وہ اُٹھا۔

ہزاری چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ میری آنکھوں میں نیند تھی مگر میں کافی دیر تک نہیں سو سکا۔

لوکیشن شوٹنگ

—— شاکمال ——

بمبئی کی فلمی دُنیا کا بھی عجیب حال ہے آج کل وہاں غیر مُلکی زرِمبادلہ کو ایسی فلموں کی لوکیشن شوٹنگ میں لگایا جا رہا ہے جن کی بیرونی ممالک میں کوئی کھپت یا ضرورت نہیں ہے۔ سرکار بھی چُپ ہے۔

پروڈیوسر ڈائرکٹر راج کی فلم 'راؤنڈ دی ورلڈ' کو کیوں کوئی دیکھے جب کہ میکائل ٹاڈ نے اسی موضوع پر اپنی فلم '۸۰ دن' بنا کر لوگوں کو مسحور کر رکھا ہے۔

فلموں کی لوکیشن شوٹنگ کے لئے افریقہ پر نظرِ انتخاب پڑتی ہے۔ ڈائرکٹر سکھ دیو کی فلم 'مائی لو' کے آؤٹ ڈور مناظر کینیا اور تنزانیہ میں پہلے سے تیار کر لئے گئے ہیں۔ خیال ہے کہ فلم کامیاب رہے گی کیونکہ اس میں اداکارہ شرمیلا ٹیگور اور نواب پٹودی کے نیروبی میں شوٹنگ کے دوران چلنے والے رومانس کی داستان ہے۔

ڈائرکٹر دلال گوہا بھی اپنی فلم 'سفری' کی لوکیشن شوٹنگ کے لئے افریقہ گئے ہیں پھر نیروبی نواسی پروڈیوسر شتروجیت پال اپنی فلم 'امانت' (منوج کمار، سادھنا، محمود، بلراج ساہنی اور رحمان وغیرہ ستاروں پر مشتمل) کی تکمیل کے لئے افریقہ کیوں نہ جائیں گے۔

شتروجیت کے ایک بھائی کل دیپ بھی اپنی ایک طویل رنگین فلم 'واسنا' (جس میں راج کمار، پدمنی، ورشہ جیت، کمد چھگانی اور راجیندر ناتھ وغیرہ ستارے ہیں) تیار کر رہے ہیں۔

اس سال ۲۷ جنوری کو اداکار دیو آنند بھی فلم سازوں کی فہرست میں آگئے ہیں۔ وہ اپنی ایک طویل فلم تیار کرنے میں کوشاں ہیں۔ فلم میں خود دیو آنند، وحیدہ رحمان اور نیا چہرہ —— زاہدہ (جو اداکارہ نرگس کی ایک بھتیجی ہے) کا رول ہے۔

فلموں میں کسی اصول، قانون اور ضابطے کی پابندی نہیں کی جا رہی ہے۔ فلم 'دو اِن ٹوکیو' کی بمبئی میں حالیہ سلور جوبلی کے موقع پر تقسیم کنندہ جی پی سپّی نے پریس کو بتایا کہ فلم ساز کو یہ اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی فلم بنا سکتا ہے اور اس پر کسی بھی طرح کی پابندی نہیں ہے۔



فلم 'ہم راز' میں سُنیل دت، راج کمار وغیرہ ستاروں کے ساتھ نیا چہرہ 'وِمّی'

نہیں اور جانی واکر بھی کوئی نئی چیز پیش نہیں کر سکا ہے۔ ہاں نئے اداکار سنجیو کمار اور سجیت کمار — دونوں نے اپنے رول سنجیدگی سے نبھائے ہیں۔

فوٹو گرافی میں کوئی نمایاں بات نہیں۔ گیتوں میں سوقیانہ پن ہے اور موسیقی بینڈ ماسٹروں والی۔ اڈیٹنگ اور ہدایت کاری مایوس کن ہے۔

•

★ راز

فلم ساز : جی۔پی۔سپی
ہدایت کار : رویندر دوے
ستارے : راجیش کھنہ، ببیتا، شیودا سنی،
آئی ایس جوہر، لکشمی چھایا

• بناکسی 'راز' والی اس فلم کو دیکھ کر تماشائی کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی فلم نہیں بلکہ کوئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھا ہے۔

راجیش کھنہ ایک سی شکل و صورت والے جڑواں بھائیوں کا رول ادا کرتا ہے۔ ایک بھائی محبت کرنے کے گناہ میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے اور دوسرا ایک حادثے میں اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے۔ ببیتا شیودا سنی 'ڈپلیکیٹ' راجیش کھنہ کو اپنا 'اوریجنل' عاشق سمجھ کر اس کے ساتھ معاشقہ لڑانے لگتی ہے۔

ساتھ ہی کچھ عجیب و غریب واقعات کا بے بنیاد سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ آئی ایس جوہر لکشمی چھایا پر فدا ہو کر بازاری قسم کی پیروڈیاں الاپتا ہے۔ سپرو، راہل وغیرہ ہیرو ہیروئن کی ملاقات میں رخنہ اندازی کرتے ہیں تو ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، رتن مالا واسیت سین محبت کے متوالوں کے تیئں ہمدردی دکھاتے ہیں۔

آخر میں وہ راز جو تماشائیوں کو پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے سکرین پر آ جاتا ہے اور ہیرو ہیروئن کے خواب آور ملن کے ساتھ فلم ختم ہو جاتی ہے۔

راجیش کھنہ اور ببیتا کی اداکاری میں کچھ وزن ہے۔ آئی ایس جوہر نے ہنسانے کے بہانے بور کیا ہے۔ لکشمی چھایا کا کام کوئی خاص نہیں ہے۔ سپرو، کمل کپور اور راہل اپنی اپنی جگہ ناکام ہیں۔ رتن مالا کا کام کچھ فطری ہے اور ہریندر چٹوپادھیائے واسیت سین اوسط درجے پر ہیں۔

آرٹ ڈور رنگین فوٹو گرافی بہت عمدہ ہے مگر سیٹ سب بے تکے اور بھدے ہیں۔

موسیقی معمولی ہے مگر ایک گیت — 'اکیلے ہیں چلے آؤ —' دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ ہدایت کاری مایوس کن ہے۔

پچھلے بارہ مہینوں میں

★★★★ گائیڈ
★★★ ممتا، آسرا
★★ نیتاجی سبھاش چندر بوس
وقت، آرزو، شہید، بھیگی رات، جبن، آئے دن بہار کے، نئی عمر کی نئی فصل،
★ ہمالیہ کی گود میں، خاندان، دو دل، بے خبر، تیسرا کون، نیلا آکاش، ساز اور آواز، سورج، آسمان محل، دو بدن، دل لگی، جوہر ان کشمیر، تصویر، پیار محبت، بدتمیز، سگائی، دل نے پھر یاد کیا، علی بابا چالیس چور۔

راجہ کا استقبال : صفحہ ۵۰ سے آگے

پیروں پر کھڑا شیر بلونت سنگھ کو دھکیلتا ہوا گپھا سے باہر آگیا۔

مچان پر سے لوگوں نے بلونت سنگھ کو شیر سے اس طرح اُلجھتے دیکھا تو اُن کی سانس کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔

اُدھر بلونت سنگھ نے بائیں ہاتھ کو ذرا اپنی طرف کھینچ کر شیر کو تلوار کی مار کے اندر کھینچا اور داہنے ہاتھ میں پکڑی تلوار پوری طاقت کے ساتھ لپک کر شیر کے پیٹ میں گھسا کر اس طرح گھما دی کہ شیر کی انتڑیاں باہر جھانکنے لگیں۔ ایک لمحے میں نقشہ ہی بدل گیا۔ شیر کے پچھلے پیر کانپے، آنکھیں بند ہوئیں اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ ایک بار پھر اُس نے ناکام کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے چھٹپٹا کر ایک طرف لڑھک گیا۔

دم توڑتے شیر کی دُم پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بلونت سنگھ مچان کے نیچے لے آئے۔ انگریز مہمان حیرت سے اُن کا منہ تاکتے رہ گئے۔

مہمانوں پر اس واقعے سے ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ شیر کی بجائے جنگل سے دو ایک چیتل مار کر ہی وہ لوٹ آئے۔

بوندی مہاراجہ کو اپنے شکار کے سفر کا قصہ سناتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ بلونت سنگھ بہت ہی خوں خوار آدمی ہے۔ ●

یہ  لڑکے

میرے کالج کے پاس ہی لڑکوں کا انجینرنگ کالج ہے۔ میں اور میری ایک سہیلی جب کالج سے گھر کے لئے روانہ ہوتیں تو اس کالج کے دو لڑکے روزانہ ہمارا تعاقب کرتے اور ہم پر آوازے کستے۔ ایک دن اُنھوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ میری سہیلی نے اُن سے کہا "کیا یہ تمھارے باپ کی سڑک ہے جو اس طرح راستہ روک کر کھڑے ہو؟"

اُن میں سے ایک نے برجستہ کہا۔ "باپ کی تو نہیں البتہ جہیز میں ضرور ملی ہے"

ہم دونوں اُن کی اس حرکت پر تلملا کر رہ گئیں اور اُنھیں سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن جب اُنھوں نے پھر ہمارا پیچھا کیا تو ہم اُنھیں دیکھ کر مسکرا دیں۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور ہم سے گفتگو بھی کرنے لگے۔ دو تین دن تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اُنھوں نے ہم سے کچھ دیکھنے کے لئے اصرار کیا تو ہم نے فوراً منظوری دے دی اور ساتھ ہی اُنھیں اپنے گھر کا پتہ بھی دے دیا تاکہ وہ ہمیں لینے کے لئے وقتِ معیّنہ پر پہنچ جائیں۔

اگلے دن وہ دونوں بن ٹھن کر ٹھیک وقت پر گھر آ گئے۔ ہم دونوں اُس وقت چھت پر بالٹیوں میں کالا رنگ گھولے تیار بیٹھی تھیں جیسے ہی اُنھوں نے دروازے پر دستک دی۔ ہم نے فوراً چھت سے اُن کے اوپر کالا رنگ انڈیل دیا۔

—— مدھو توسنی وال، کان پور

اِس فیچر کے لئے اپنے تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ —ایڈیٹر

آن دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ بعد میں تمام زندگی ہنسی خوشی گزری۔ کتنا حسین تصور ہے یہ! کاش حقیقی زندگی میں بھی محبت کرنے والوں کی ازدواجی زندگی اتنی ہی خوشگوار ہوتی۔

ناولوں، کہانیوں، فلموں، دوسرے لوگوں کی کہی سُنی باتوں سے ہر لڑکی کے سامنے پیار کی رنگین تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں کہ کس طرح نوجوان لڑکے لڑکیاں آپس میں پیار کرتے ہیں، اپنے ساتھی کے ساتھ پُرمسرت زندگی بسر کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جدا ہو جانے پر تڑپ اٹھتے ہیں، آہیں بھرنے لگتے ہیں پھر وہ اپنے لئے بھی ایسے ہی ہوائی قلعے بنانے لگتی ہے۔ اس کے دل میں اپنی آئندہ زندگی کی رنگین تصویریں سجنے لگتی ہیں کہ محبت کی دنیا میں کبھی تو اس کا بھی کوئی محل تعمیر ہوگا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بھی



کوئی لڑکا اس کی زندگی میں آتا ہے اور فلمی ستاروں کی نقل کرتا ہوا پیار کا ڈھونگ رچاتا ہے تو وہ بلا پس و پیش اس لڑکے کو اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے۔ وہ اُس کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی اور اسے مختلف ناموں سے (جو اُسے فلموں سے یا اِدھر اُدھر کی کتابوں سے مل جاتے ہیں) مخاطب کرنے لگتی ہے

اگر کوئی اسے یہ بات سمجھانا چاہے کہ ایسے آدمی سے شادی کرنے سے کیا فائدہ جو اس کی ضرورتوں کو بھی پورا نہیں کر سکے گا اور نہ ہی مستقبل میں اس کو کسی طرح کا تحفظ دے سکے گا تو وہ بے غیرتی سے جواب دیتی ہے "ہندوستانی لڑکی صرف ایک بار ہی اپنے شوہر کا انتخاب کرتی ہے اور پھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ چاہے وہ ظالم اور اندھا ہی کیوں نہ ہو؟"

اگر پھر بھی کوئی اس پر سمجھداری، ہوشیاری اور دور اندیشی سے کام لینے کے لئے دباؤ ڈالے تو وہ اپنا ارادہ بدلنے کی بجائے خودکشی کرنے تک پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

پیار کے سلسلے میں آج کل جتنے غلط نظریے قائم ہیں، اتنے کسی اور چیز کے بارے میں نہیں۔ لگاتار پروپیگنڈے سے پیار کو سبھی طرح کی خوشیوں کا مرکز سمجھ لیا گیا ہے، جس کے مل جانے پر محبت کرنے والے ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کسی بھی طرح کی

فکر یا پریشانیاں نہیں ہیں۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ شادی کے بارے میں پیدا ہونے والے ہر طرح کے جھگڑے ختم کرنے کا ایک ہی آسان طریقہ ہے۔ لَو میرج (محبت کی شادی) پیار کو پارس سمجھا جاتا ہے جس کے چھو جانے سے آپسی جھگڑے مستقل انس میں بدل جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ پیار میں یہ سب باتیں

لڑکے نے فلمی ستاروں کی طرح پیار کا ڈھونگ رچایا تو لڑکی اُسی کو اپنا مجازی خُدا سمجھنے لگی۔



ناممکن ہوں لیکن جس طرح کی نفسیات یا جذباتیت کا رجحان لڑکے لڑکیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسے سچے معنوں میں پیار کبھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس پیار کا ۹۵ فی صد تو صرف ایک قسم کا نشہ ہی ہوتا ہے۔ اس طرح کے خبط پر زندگی کو داؤ پر لگا دینے سے بہت سی لڑکیوں کی زندگی شادی کے بعد مصیبتوں میں پھنس جاتی ہے۔

حقیقی پیار اتنی آسانی سے نہیں مل سکتا۔ یہ تو دیرینہ تعلقات، مسلسل ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کرنے اور اسے حاصل کرنے کے لئے جھوٹے طریقوں کا استعمال نہ کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ حالت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب دونوں محبت کرنے والوں میں سے کسی کے دل میں خودغرضی اور دھوکا

، ہو۔ لیکن لڑکے لڑکیوں کے روزمرہ کے پیار میں، جسے ہم عملی زندگی میں عمل میں کہتے ہیں اور غلطوں میں تو جس کی بھرمار ہوتی ہے، ان تمام باتوں کی کمی ہوتی ہے۔

اکثر چہرے کی کشش یا طرزِ گفتگو اور آدابِ محفل کے انداز سے متاثر ہوکر وہ پیار شروع کر دیتے ہیں اور جلدی ہی اس میں اتنی شدت آجاتی ہے کہ وہ انھیں ایک طوفان کی طرح اپنی زد میں لے لیتا ہے۔ ایسی حالت میں پیار کا خیال ہی سب سے اہم ہوتا ہے۔ ایسے پیار میں دونوں ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو پانے کے لئے بےقرار رہتے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی دونوں ہی ایک دوسرے کی خامیوں کو نظرانداز کرکے اور اچھائیوں کو بڑھا چڑھا کر دیکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو آدرش مان بیٹھتے ہیں۔

لیکن یہ چکا چوند عارضی ہوتی ہے۔ وہ حسین خواب جن میں ایک دوسرے کی خوشگن رفاقت و پیار بھری حرکتوں کے علاوہ مزید کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا اور جن میں عملی زندگی کی ٹھوس پریشانیوں کو یکسر نظرانداز کردیا گیا تھا، حقیقت کی تیز دھوپ میں صبح کی شبنم کی طرح غائب ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت انھیں یک لخت محسوس ہونے لگتا ہے کہ پیار ان کے لئے کپڑے اور کھانا مہیا نہیں کرسکتا اور نہ زندگی کی مشکلات پر قابو پانے میں ہی ان کی مدد کرسکتا ہے۔

اس حقیقت سے روشناس ہوکر خوابوں کے محل ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ آدرش جس کا ڈھونگ رچا کر دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہوئے تھے، (اس دنیا میں جہاں روزی کمانے کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے) غائب ہوجاتا ہے۔ شوہر صبح گھر سے روانہ ہوکر دفتر جاتا ہے اور کئی گھنٹے کام کرنے کے بعد شام کو تھکا ہارا واپس آتا ہے۔ بیوی بھی تمام دن چھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ ایسی زندگی کے خلاف جلد ہی دونوں کے دل میں ایک بغاوت پیدا ہوجاتی ہے۔

شادی ہونے سے پہلے کی ملاقاتیں تو صرف ان کے پیار میں شدت پیدا کرنے اور ان کو ترسانے ہی کا کام کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو آدرش سمجھنے لگتے ہیں۔ شادی ہونے کے بعد جب ساتھ رہنے سے ان کے ارمان پورے ہوجاتے ہیں تب انھیں ایک دوسرے میں عیب نظر آنے لگتے ہیں۔ مسلسل قرب ملن سے ذرا ذرا سی برائیاں اتنی ہی بڑی دکھائی دینے لگتی ہیں جتنی کہ شادی سے پہلے اچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔

وہی پیاری لڑکی اب جھگڑالو نظر آنے لگتی ہے، جو یہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ہمیشہ اس کی، اس کے بچوں اور گھر کی طرف ہی دھیان دیتا رہے۔ وہی پُرکشش نوجوان جو ہمیشہ لڑکی سے پیار کی بھیک مانگتا تھا، اب اسے جاہل اور غیرمہذب نظر آنے لگتا ہے، جسے خود کی آزادی کے علاوہ کسی اور بات سے تعلق نہیں رہتا۔ نوجوان کو اپنے خوابوں کی شہزادی میں

اب کوئی جاذبیت نظر نہیں آتی اور وہ آہستہ دوسری تمام عام لڑکیوں کی طرح ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور نوجوان بھی اپنی تمام شان و شوکت اور چمک دمک سے خالی صرف ایک عام انسان ہی رہ جاتا ہے۔

تصور میں بننے والی تصویر چکنا چور ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پیار کے بندھن ٹوٹنے لگتے ہیں۔ پیار کی بجائے اب آپس میں اختلافات کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور ان کا وہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے جس کے سہارے انھوں نے ایک دوسرے سے بڑی بڑی امیدیں باندھی تھیں۔

سکھی ازدواجی زندگی کے لئے پیار لازمی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے قبل از وقت تیاری کی جائے۔ ایک ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شامل ہونے سے یہ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ چاہے یہ پیار غزلوں اور نظموں میں بیان کئے ہوئے خیالی پیار جیسا نہ ہو، پھر بھی وہ سطحی پیار کی نسبت (جس کی امید پر کوئی لڑکی اپنی آئندہ زندگی نچھاور کر دیتی ہے) زیادہ پائدار اور مستقل ہوتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ رومانی شادیوں کی نسبت والدین کے ہاتھوں انجام پانے والی شادیاں زیادہ خوش گوار اور پائدار ہوتی ہیں۔

پرسکون ازدواجی زندگی کے لئے پیار کا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ ضروری ہے اُن کا اپنا گھر ہونا۔ پھر جب تک

قبل از وقت تیاری نہیں کی جاتی

سماج کا ڈھانچہ اتنا نہیں بدل جاتا کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح کام کریں، انھیں شوہر کی طرف سے گزارے کے لئے خرچ بھی ملنا چاہئے۔ عورت جس مرد سے شادی کرتی ہے اُس کی معاشی حالت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنی بیوی کی سبھی ضروریات کا ذمہ اپنے اوپر لے۔

میں نے بہت سی ایسی لڑکیاں بھی دیکھی ہیں جو اپنی زندگی میں آنے والے کسی بھی پہلے لڑکے سے ہی پیار کرنے لگتی ہیں اور ایسا کرنے میں وہ اس بات کو قطعاً فراموش کر دیتی ہیں کہ وہ لڑکا اپنی بیوی کی ذمہ داریاں برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں۔ وہ پیار کے نشے میں اندھی ہو کر شادی کر لیتی ہیں مگر بعد میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔

کسی آدمی سے پیار کرنا اور بعد میں اُس سے شادی کر لینا بُری بات نہیں ہے۔ لیکن رفیق زندگی کے انتخاب میں صرف اس بنا پر فیصلہ کر لینا کہ آپ کو اس سے



کچھ آنس ہے، مناسب نہیں۔ معاملے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور و خوض کر لینا ضروری ہے کہ وہ آپ کا شوہر اور آپ کے بچوں کا باپ ہونے کا اہل ہے۔ ایک جوڑا چپل یا ایک عدد ساری خریدنے میں ہی آپ کو کئی دن لگ جاتے ہیں لیکن اس آدمی کے انتخاب میں، جس پر آپ کی زندگی کا دارومدار ہے، آپ بہت جلد بازی کرتی ہیں۔

تجارت میں جب کوئی کسی کو اپنا پارٹنر بناتا ہے تو وہ اس نئے آدمی کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس کا چال چلن، اس کا نظریہ اور معاشی حالت وغیرہ وغیرہ۔ پھر شادی بیاہ کے معاملات میں بھی کیوں نہ ایسی ہی ہوشیاری برتی جائے!

یاد رکھئے کہ جو لڑکی کسی لڑکے سے پیار کر رہی ہے، خود اس حالت میں نہیں ہوتی کہ وہ لڑکے کی اچھائیاں برائیاں پرکھ سکے، اس کی نظروں میں تو وہ ہمیشہ ہی نیک صفت اور محبت مند دکھائی دیتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہو تو وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہی کیوں ہوگی؟ اس لڑکی کے سرپرست اس بات کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ اصلیت کیا ہے۔

والدین یا سرپرستوں کے ذریعہ طے کی گئی شادیوں میں چاہے شاعرانہ تصور کی کمی ہو، لیکن آج بھی مثالی ازدواجی زندگی کی مثالیں اسی طرح کی شادیوں میں ملیں گی۔ آپ اپنے طور بھی حقائق کا پتہ لگا سکتی ہیں۔

بھارت میں اس بات کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے اعداد و شمار نہیں مل سکتے، کیوں کہ پیار اور شادی سے متعلق تمام باتیں یہاں راز میں رکھی جاتی ہیں لیکن امریکہ میں، جہاں زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں مفصل پرچار کیا جاتا ہے اور لوگوں سے مشورے طلب کئے جاتے ہیں، والدین یا ان کی مرضی سے کی گئی شادیاں رومانی شادیوں کی نسبت زیادہ کامیاب ہوتی ہیں۔

ہماری کارگذاری



ہر اک گھر کو سیاست کا اکھاڑہ کر دیا ہم نے
ہر اک نازک بدن شہری کو گاما کر دیا ہم نے
گھروں میں جا بجا گاندھی کو دیواروں پہ لٹکایا
کھڑا ہر موڑ پر نہرو کا پتلا کر دیا ہم نے
سبھی قدروں کو کوشش کر کے اُلٹا کر دیا ہم نے
ذرا بھی جس نے چھوں کی آس کو سیدھا کر دیا ہم نے
اُجالے سے جو ڈرتے تھے اُنہیں چمکا دیا ہم نے
اسی کوشش میں تھوڑا سا اندھیرا کر دیا ہم نے
وہ ٹیڑھے راستے جن سے گذرنا جرم تھا پہلے
انہیں پر چل کے جا بر سب کا چلنا کر دیا ہم نے
گنہگاروں کا سر دُنیا میں اُونچا کر دیا ہم نے
ذرا کردار کا معیار نیچا کر دیا ہم نے
جو اپنے تھے اُنہیں جھٹ کیا سے کیا کیا کر دیا ہم نے
سیاسی چھاؤں کو سایہ ہُما کا کر دیا ہم نے
کسی ٹیلے کو جادو سے ہمالہ کر دیا ہم نے
کسی نالے کو چھُو منتر سے گنگا کر دیا ہم نے
جو سوکھے تھے وہ سوکھے رہ گئے اس میں خلاکس کی
جو چکنے تھے اُنہیں کچھ اور چکنا کر دیا ہم نے
زبانیں مختلف اور اُن کی تحریریں جدا ان کا
سبھی کو بس اسی خاطر انگوٹھا کر دیا ہم نے
جو پہلے ایک تھے دو کر نہ سکتا تھا جنہیں کوئی
اُنہیں کو تین تیرہ نو اٹھایہ کر دیا ہم نے
نہیں ہوا ابھی کچھ پھر بھی ہیم وزر سدا [illegible]
[illegible] کر دیا [illegible] ٹوٹا کر دیا ہم نے
[illegible]



ستیا • ابرار محسن

جانشین

کچھ دیر پہلے راجہ جس کا سر قلم ؟

بہت دنوں کی بات ہے کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا اس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ اس کا خزانہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا مگر وہ اس میں سے کچھ بھی اپنے اوپر خرچ نہ کرتا تھا کیونکہ اُس کا کچھ ایسا خیال تھا کہ خزانہ دراصل رعایا کی امانت ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اُسے رعایا کی بھلائی کے کاموں پر ہی صرف کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رعایا اپنے بادشاہ سے بہت خوش تھی اور سدا اس کے لئے دُعائیں کیا کرتی تھی۔

بادشاہ طاقتور بھی بہت تھا کیونکہ اچھے بادشاہوں کے ساتھ رعایا کی طاقت ہوا کرتی ہے۔ اس کی بہت بڑی فوج تھی اور سپاہی بڑے ہی وفادار تھے۔ اسی لئے آس پاس کے دوسرے بادشاہوں کی اِتنی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ اس ملک کی طرف نگاہ اُٹھا سکیں۔

ملک میں ہر طرف امن تھا، لوگ خوشحال تھے۔ زِندگی کے دِن بڑے مزے میں گزر رہے تھے۔

مگر بدنصیبی سے بادشاہ سلامت کے ایک ہی آنکھ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ واقعی امیر غریب، چھوٹے بڑے سب کو ایک نظر سے دیکھتا تھا اور انصاف کرتا تھا۔

بادشاہ بوڑھا ہو چلا تھا مگر اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیچارے نے بہت مِنتیں مانگیں، فقیروں اور درویشوں کو خوب دولت دی۔ آخرکار اُسے احساس ہو ہی گیا کہ یہ سب بیکار ہے اور اِن باتوں سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

”اب کیا ہوگا؟“ بادشاہ نے ملکہ سے کہا ”میری زندگی کے دن پُورے ہو رہے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ تخت کا جانشین کون بنے گا؟ جو بادشاہ اپنے بعد اپنا جانشین نہیں چھوڑتے لوگ ان کے مرنے بعد اُنھیں بھول جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں آپ“ ملکہ نے اُداس ہوکر کہا ”اب ہم اپنی بدنصیبی کو کیا کریں؟“

اِتفاق سے بادشاہ کا بوڑھا وزیر بھی وہیں موجود تھا۔ وہ کہنے لگا ”بادشاہ سلامت! اِنسان کا نام اولاد سے نہیں بلکہ نیک کاموں سے زندہ رہتا ہے۔ آخر آپ کو جانشین چھوڑنے کی اِتنی فکر کیوں ہے؟ اور پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ جانشین آپ کی ہی اولاد ہو؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپکا بچّہ اچھا بادشاہ ہی ثابت ہوگا؟ وہ بُرا بھی تو ہوسکتا ہے اور تب لوگ آپ کو اچھے نام سے یاد نہ کریں گے جو کچھ بھی نام آپ نے بھلے کاموں سے کمایا ہے وہ بھی باقی نہ رہے گا۔“

”تو پھر ہم کیا کریں؟“ [illegible] بے بسی



وزیر نے ادب سے کہا "ایک بادشاہ کے لئے یہ بات بڑی ضروری ہے کہ وہ عقلمند ہو، نادان نہ ہو، بہادر ہو بزدل نہ ہو۔ سچی بات کہے اور پسند کرے، جھوٹی بات سے نفرت کرے۔ آپ کا ملک بہت بڑا ہے تلاش کیجئے۔ جس کسی میں یہ خوبیاں نظر آئیں اُسے جانشین بنا دیجئے چاہے وہ بھکاری ہی

...کرنے کو تیار تھا لیکن

کیوں نہ ہو۔ آدمی کا کام پیارا ہوتا ہے چام نہیں۔"

بادشاہ دیر تک سوچتا رہا، پھر کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہو مگر مشکل یہ ہے کہ ایسا آدمی کِس طرح تلاش کیا جاتے؟"

"اس کی ترکیب میں بتادوں گا۔" وزیر نے کہا۔

اگلے دن ملک میں اعلان کرا دیا گیا، کہ بادشاہ سلامت کی خواہش ہے کہ لوگ انھیں ان کی اچھائیاں اور بُرائیاں بتائیں۔ ایک مقررہ دن تمام لوگ دربار میں حاضر ہوجائیں۔ ہوسکتا ہے کہ بادشاہ سلامت خوش ہوکر کسی خوش نصیب کو مالا مال کردیں۔

بادشاہ کا یہ انوکھا اعلان سُن کر تمام لوگ تعجب میں پڑ گئے۔ انعام کا نام سُن کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔

مقررہ دن پر ہزاروں لوگ دربار میں جمع ہو گئے۔ ایک ایک کرکے وہ بادشاہ کے سامنے سر جھکاتے اور اُس کی تعریفوں میں پُل باندھ دیتے۔ شاعروں نے اُس کی تعریف میں لمبی لمبی نظمیں لکھی تھیں۔

"ہمارا بادشاہ دنیا کا بہترین انسان ہے"

ایک آدمی نے بادشاہ کی ایک خوبی بتائی۔

"ہمارا بادشاہ عقلمندی میں جواب نہیں رکھتا" دوسرے نے کہا۔

تیسرا بولا "ہمارا بادشاہ اس قدر حسین ہے کہ چاند بھی اس کے سامنے شرماتا ہے۔"

لوگ آتے رہے اور بادشاہ کی خوبیاں گناتے رہے۔ جو بھی بادشاہ کی تعریف ختم کر چکتا وزیر ٹھنڈی سانس بھر کر اس سے کہتا "تم جا سکتے ہو۔"

جب دربار میں تھوڑے لوگ باقی رہ گئے تو بادشاہ نے وزیر سے کہا "اتنے بہت سے لوگوں نے ہماری تعریف کی مگر تم نے سب کو رُخصت کردیا۔ تمھاری ترکیب میری سمجھ میں بالکُل نہیں آئی۔"

"صبر سے کام لیجئے حضور" وزیر نے کہا "سب سمجھ میں آجائے گا۔"

اس کے بعد باقی لوگوں کو بُلایا گیا جنھوں نے بادشاہ کے گُن گائے اور وزیر نے اُن سب کو رُخصت کردیا۔ دربار میں صرف ایک نوعمر لڑکا کھڑا رہ گیا۔ اس کے جسم پر پھٹے پھٹے کپڑے تھے مگر اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔

وزیر نے لڑکے سے کہا "تم اپنے بادشاہ کی شان میں کچھ نہیں کہنا چاہتے؟ خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں، وزیر صاحب" لڑکے نے بلند آواز میں کہا "ان تمام لوگوں نے جھوٹ بولا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" وزیر نے سوال کیا۔

لڑکے نے بڑے اطمینان سے کہنا شروع کیا "وہ اس طرح کہ ایک شخص نے کہا ہے کہ بادشاہ کے حسن کے سامنے چاند بھی شرماتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ بادشاہ خوبصورت بالکل نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی تو آنکھ بھی ایک ہی ہے۔"

"خاموش گستاخ" بادشاہ دہاڑا اور میان سے تلوار نکال لی۔

"صبر بادشاہ سلامت" وزیر نے بادشاہ سے کہا۔

"دوسری بات" لڑکے نے بادشاہ کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "ان لوگوں نے بادشاہ کی عقلمندی کی تعریف کی ہے حالانکہ بادشاہ بالکل بیوقوف ہے۔"

"زبان کھینچ لوں گا بدکلام" بادشاہ نے بپھر کر کہا۔

"صبر بادشاہ سلامت" وزیر نے دھیرے سے کہا۔ پھر لڑکے سے مخاطب ہوا "یہ تم کیسے ثابت کرو گے؟ تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟"

لڑکا مسکرا کر کہنے لگا "جب یہ لوگ بادشاہ کی تعریف کر رہے تھے تو بادشاہ کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا حالانکہ بادشاہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تعریف سچی نہیں ہوتی جو منہ پر کی جائے۔ کیا بادشاہ میں کوئی عیب نہیں؟ اگر ہے تو ان لوگوں میں سے کسی نے آپ سے بتایا؟ نہیں۔ جو لوگ ہماری خرابیاں ہمیں نہیں بتا سکتے وہ اگر تعریف کریں تو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ عقلمندوں کا کہنا ہے تعریفوں کے پل باندھنے والے سب کے سب لوگ جھوٹے فریبی، لالچی اور خوشامدی ہیں۔ بادشاہ کو ایسے لوگوں سے خبردار رہنا چاہیے سمجھدار لوگ اپنی تعریفوں کی بجائے اپنی کمزوریوں کو زیادہ غور سے سنتے ہیں۔"

لڑکے کی بات سن کر بادشاہ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"وزیر۔" اس نے وزیر سے کہا "تمہاری بات ہماری سمجھ میں آگئی۔ واقعی یہ لڑکا ہمارا جانشین بننے کے لائق ہے کیونکہ یہ بہادر، بے خوف، عقلمند اور سچا ہے۔"

کہا جاتا ہے بادشاہ کے مرنے کے بعد وہی لڑکا تخت پر بیٹھا اور بہت ہی اچھا بادشاہ ثابت ہوا۔

●

کیا آپ جانتے ہیں

دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری واشنگٹن میں واقع امریکی ایوانِ نمائندگی کی ہے، جس میں ۱۹۶۲ میں ۴۱،۸۷۵،۰۰۰ کتابیں موجود تھیں۔ دوسرا نمبر ماسکو میں واقع لائبریری کا ہے جہاں ۱۹،۰۰،۰۰۰ کتابیں ہیں۔

●

دُنیا میں سب سے طویل قومی ترانہ یُونان کا ہے جو ۱۵۸ لائنوں میں ہے۔ جاپان، یردن اور سان مرینو کے قومی ترانوں میں صرف چار چار لائنیں ہیں جب کہ بحرین ... تو ایک بھی لفظ نہیں ہے۔

ناردرن ریلوے!

اطلاع

یکم اپریل ۱۹۶۷ سے نادرن ریلوے کے ٹائم ٹیبل پر عام نظرثانی کی جائے گی اور اہم تبدیلیاں حسب ذیل ہوں گی۔

۱۔ جنرل

(۱) بمبئی سنٹرل۔ نئی دلی، نئی دلی ہوڑہ، اور نئی دلی۔ امرت سر کے درمیان چلنے والی ایرکنڈیشنڈ گاڑیوں کی فریکوینسی بڑھا کر ہفتہ میں تین بار مندرجہ ذیل دنوں کو کردی جاتے گی۔

(ا) بمبئی سنٹرل سے نئی دلی تک۔ بدھوار، شکروار اور ایت وار کو۔

(ب) نئی دلی سے بمبئی سنٹرل تک۔ سوموار، بدھ وار اور شکروار کو۔

(پ) نئی دلی سے ہوڑہ تک منگل وار، شکروار اور ایت وار کو۔

(ت) ہوڑہ سے نئی دلی تک منگل وار، ویروار اور ایت وار کو۔

(ٹ) نئی دلی سے امرت سر تک سوموار، ویروار اور سنیچر وار کو۔

(ث) امرت سر سے نئی دلی تک ایت وار، منگل وار اور شکروار کو۔

(۲) نمبر ۲۱ ڈاؤن ایرکنڈیشنڈ ایکسپریس مدراس سے ویروار اور سنیچر کو چلے گی۔

(ب) نمبر ۲۲ اَپ ایرکنڈیشنڈ ایکسپریس نئی دلی سے سنیچر وار اور سوموار کو چلے گی۔

۲۔ گاڑیاں جو بڑھا دی گئیں۔

(i) نمبر SU ۱/ ۲SU سہارنپور اور انبالہ چھاؤنی کے درمیان چلنے والی اب انبالہ سٹی تک آیا جایا کریگی۔

(ii) ۱۰۷ ڈاؤن/ ۱۰۸ اَپ جھانسی اور لکھنؤ کے درمیان چلنے والی اب سلطانپور تک آیا جایا کرے گی۔

(iii) ۴۹۔ اَپ/ ۵۰ ڈاؤن، ہوڑہ اور جون پور کے درمیان چلنے والی اب سلطانپور تک آیا جایا کرے گی

(iv) ۳AP / ۴AP۔ پٹی اور امرت سر کے درمیان چلنے والی اب کھیم کرن تک آیا جایا کرے گی۔

(v) JRD ۱/ ۲JRD رتن گڑھ اور ڈیگانا کے درمیان چلنے والی اب میڑتا روڈ تک آیا جایا کرے گی۔ اور اس کا نیا نمبر JRM ۱/ ۲JRM ہوگا۔

(vi) KJP ۱ دلی کشن گنج اور پانی پت کے درمیان چلنے والی اب نئی دلی تک بڑھا دی گئی ہے۔ اور اس کا نیا نمبر NJP ۱ ہوگا

۳۔ گاڑیاں جن کی رفتار بڑھا دی گئی۔

نمبر شمار	گاڑی نمبر	مابین سٹیشن مابین	وقت جو بچا
۱۔	۲ ڈاؤن	امرت سر مغل سرائے	۳۲ منٹ

نمبر شمار	گاڑی نمبر	مابین سٹیشن راستے	وقت جو بچا
۲-	۱۴ اَپ	مغل سرائے - دِلّی	۲۰ منٹ
۳-	۱۰ ڈاؤن	ڈیرہ دون مغل سرائے	۱۰ منٹ
۴-	1 URN	اسالہ - ننگل ڈیم	۴۰ منٹ
۵-	1 MSN	میرٹھ شہر - ننگل ڈیم	۱۰ منٹ
۶-	۲ JJP	جودھ پور - پوکران -	۶۰ منٹ
۷-	۳ JJP	پوکران - جودھ پور	۵۵ منٹ
۸-	۴ JJP	جودھ پور - پوکران	۴۰ منٹ
۹-	۹۸ ڈاؤن	بارمیر - جودھ پور	۱۵ منٹ
۱۰-	۲ FB	فیروز پور - بھٹنڈہ	۲۰ منٹ
۱۱	۶ JRJ	جالندھر شہر - جیجوں دوآبہ	۱۵ منٹ
۱۲-	۵ JRJ	جیجوں دوآبہ - جالندھر شہر	۱۵ منٹ
۱۳-	۳ PBJ	پٹھان کوٹ - جوگندر نگر	۱۵ منٹ
۱۴-	۲ SRN	ننگل ڈیم - سہارن پور	۱۵ منٹ
۱۵	۷ DG	غازی آباد ، دِلّی	۱۵ منٹ
۱۶-	1 DP	دِلّی - پانی پت	۱۵ منٹ
۱۷-	۲ LF	فیروز پور - لدھیانہ	۱۰ منٹ
۱۸-	۳ NJ	نواں شہر - جالندھر شہر	۱۰ منٹ
۱۹-	1 ALJ	جاکھل - امرت سر	۱۰ منٹ
۲۰-	1 ABQ	امرت سر قادیان	۱۰ منٹ
۲۱-	۲ DR	روہتک - دِلّی - (سنیچر وار)	۱۰ منٹ

۴- نئے سٹیشن کھولے گئے -

نمبر شمار	سٹیشن	مابین
۱-	بولبی کلاں -	سریلا کورو کشیتر -
۲-	رام چندر پور	اونچا ہار - لچھمن پور
۳-	ل	لال گڑھ - درباری

۵- نئے ٹھہراؤ مہیا کئے گئے -

نمبر شمار	گاڑی نمبر	سٹیشن
۱-	۴۱-اَپ / ۴۲ ڈاؤن	منڈی دھورا
۲-	۴۵-اَپ / ۴۶ ڈاؤن اور ۵۷-اَپ / ۵۸ ڈاؤن	جنڈیالہ
۳-	۸۳-اَپ	دِلّی شاہدرہ

۴۔	۱۵۔ آپ /۱۵۲ ڈاؤن	جگادہری ورکشاپ
۵۔	۳۳۔ آپ	چکی ٹیک
۶۔	۵۹۔ آپ	کوروکشتر
۷۔	۱۰۔ ڈاؤن	روسا
۸۔	۲ SN، ۱ DP، ۴ DP اور ۳ DP	ہولسی کلاں
۹۔	۳۴۴۔ ڈاؤن	کیلاں والی پنجاب
۱۔	۲ AC	کبیر پور
۱۱۔	۴۷۔ آپ / ۴۸۔ ڈاؤن	چوکھنڈی
۱۲۔	۳۷۱۔ آپ اور ۴ DSU	پیلی خاص
۱۳۔	۳۵۱۔ آپ/۳۵۲۔ ڈاؤن	دریا پور اور لچھمی پور
۱۴۔	۲ MSN	بامن ہیری
۱۵۔	۳۷۱۔ آپ	صاحب آباد
۱۶۔	۱۵۔ ڈاؤن	کانپور اور لکھنؤ کے درمیاں مام سٹیس۔
۱۷۔	۲۴۔ ڈاؤن	پٹیل نگر
۱۸	۲۳۱۔ آپ	بجواسن
۱۹۔	۹۳۔ آپ / ۹۴۔ ڈاؤن	دین
۲۰۔	۹۵۔ آپ /۹۶۔ ڈاؤن	سری بالاجی اور الائی
۲۱۔	3 BKF	ڈھائی بالم گڈھ۔
۲۲۔	۱ NJP، ۱ RDG اور ۲ DR	گنسدھرا

۶ نئے کنکشن مہیا کئے گئے۔

(i) ۲ AF کا ۱ SL کے ساتھ سلطان پور پر۔

(ii) ۹۶ ڈاؤن کا ۲ JRM کے ساتھ میرٹھ روڈ پر۔

۷۔ ٹھہراؤ منسوخ کئے گئے۔

(۱) ۱ BKF اڈھائی بالم گڈھ پر۔

۸۔ گاڑیوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں۔

۱۔ ۲ ڈاؤن۔ امرت سر ہوڑہ میل امرت سر سے ۲۰ – ۲۱ بجے کی بجائے ۵۰ – ۱۹ بجے روانہ ہوگی۔ اور مغل سرائے ۳۰ – ۲۰ کی بجائے ۳۰ – ۱۹ بجے پہنچے گی۔

۲۔ ۶۴۔ آپ طوفان ایکسپریس دلّی سے ۱۰ بجے کی بجائے ۵ – ۱۰ بجے روانہ ہوگی۔

۳۔ ۸۱۔ آپ ائیرکنڈیشنڈ ایکسپریس نئی دلّی ۱۰ – ۱۱ بجے کی بجائے ۱۱ بجے پہنچے گی۔

۴۔ ۱۰۔ ڈاؤن دہرہ دون ایکسپریس، دہرہ دون سے ۲۰ – ۱۸ بجے کی بجائے ۲۰ – ۱۹ بجے روانہ ہوگی۔ اور مغل سرائے ۳۵ – ۱۲ بجے کی بجائے ۲۵ – ۱۷ بجے پہنچے گی۔

۵۔ ۴۴ ڈاؤن مصوری ایکسپریس دہرہ دون سے ۳۰-۱۹ بجے کی بجائے ۲۰-۱۸ بجے روانہ ہوگی اور دلّی ۵۵-۴ بجے کی بجائے ۴۰-۵ بجے پہنچے گی۔

۶۔ ۲۵ اَپ ایئرکنڈیشنڈ ایکسپریس نئی دلّی سے ۲۵-۱۱ بجے کی بجائے ۵۰-۱۱ بجے روانہ ہوگی اور امرتسر ۱۵-۱۹ بجے کی بجائے ۳۵-۱۹ بجے پہنچے گی۔

۷۔ ۱۳ اَپ اپر انڈیا ایکسپریس دلّی ۲۰-۱۰ بجے کی بجائے ۵-۱۰ بجے پہنچے گی۔

۸۔ D ۱ M دلّی ۵-۱۰ بجے کی بجائے ۵۰-۹ بجے پہنچے گی۔

۹۔ URN ۱ ننگل ڈیم ۲-۲۳ بجے کی بجائے ۴۰-۲۲ بجے پہنچے گی۔

۱۰۔ ۳۴۵ اَپ بھٹنڈہ سے ۳۰-۹ بجے کی بجائے ۴۵-۱۰ بجے روانہ ہوگی۔

۱۱۔ ۱۰۵ ڈاؤن لکھنؤ ۳۵-۱۲ بجے کی بجائے ۱۵-۱۳ بجے پہنچے گی۔

۱۲۔ CB ۱ چندوسی سے ۵-۸ بجے کی بجائے ۷ بجے روانہ ہوگی اور بریلی ۴۰-۱۱ کی بجائے ۵۵-۹ بجے پہنچے گی۔

۱۳۔ CM ۲ مرادآباد سے ۴۰-۵ بجے کی بجائے ۴۵-۴ بجے روانہ ہوگی۔

۱۴۔ ۳۹ ڈاؤن جودھپور دلّی میل جودھپور سے ۳۵-۱۴ بجے کی بجائے ۲۵-۱۴ بجے روانہ ہوگی۔

۱۵۔ ۷۹ اَپ جودھپور۔ باڑمیر ایکسپریس جودھپور سے ۳۰-۲۲ بجے کی بجائے ۲۵-۲۲ بجے روانہ ہوگی۔ اور باڑمیر ۱۵-۴ بجے کی بجائے ۳-۴ بجے پہنچے گی۔

۱۶۔ ۹۸ ڈاؤن باڑمیر جودھپور ایکسپریس۔ باڑمیر سے ۵۰۔ بجے کی بجائے ۳۰-۲۳ بجے روانہ ہوگی اور جودھپور ۵-۶ بجے کی بجائے ۱۵-۵ بجے پہنچے گی۔

۱۷۔ BKF ۳ فاضلکا سے ۲۵-۱۵ بجے کی بجائے ۱۵-۱۵ بجے روانہ ہوگی اور کوٹ کپورہ ۴۷-۱۸ بجے کی بجائے ۳۵-۱۸ بجے پہنچے گی۔

۱۸۔ BBB ۳ بیکانیر ۴-۶ بجے کی بجائے ۳۵-۶ بجے پہنچے گی۔

۱۹۔ BSA ۱ الوپ گڑھ سے ۳-۱۰ بجے کی بجائے ۱ بجے روانہ ہوگی اور صورت گڑھ ۱۵ بجے کی بجائے ۵۵-۱۴ بجے پہنچے گی۔

۲۰۔ BSA ۳ الوپ گڑھ سے ۲۵-۲۰ بجے کی بجائے ۲۰-۲۰ بجے روانہ ہوگی اور صورت گڑھ ۵۰-۲۳ بجے کی بجائے ۴۵-۲۳ بجے پہنچے گی۔

۲۱۔ BRB ۲ ریواڑی سے ۱۰-۶ بجے کی بجائے ۴۵-۱ بجے روانہ ہوگی اور بھٹنڈہ ۲۵-۱۴ بجے کی بجائے ۳۰-۱۱ بجے پہنچے گی۔

۲۲۔ BRF ۲۔ ریواڑی سے ۱۵-۲ بجے کی بجائے ۱-۶ بجے روانہ ہوگی اور فاضلکا ۵۰-۱۹ بجے کی بجائے ۳۵-۲۰ بجے پہنچے گی۔

۲۳۔ BKF ۴ کوٹ کپورہ سے ۲۱ بجے کی بجائے ۳۰-۱۹ بجے روانہ ہوگی اور فاضلکا ۱۵-۔ بجے کی بجائے ۴-۲۲ بجے پہنچے گی۔

۲۴۔ BSA ۲۔ صورت گڑھ ۳۵-۹ بجے کی بجائے ۱-۹ بجے پہنچے گی۔

۲۵۔ BHS ۱ حصار سے ۷ بجے کی بجائے ۱۵-۶ بجے روانہ ہوگی اور سادُول پور ۱۰-۹ بجے کی بجائے

۲۶۔ JSB ۱ سمدری سے ۵ بجے کی بجائے ۴-۵ بجے روانہ ہوگی اور بھیلڑی ۵۰-۱۱ بجے کی بجائے ۵۵-۱۰ بجے

۲۷۔ JJP ۱ پوکران سے ۳۵-۔ بجے کی بجائے ۴-۱۱ بجے روانہ ہوگی اور جودھپور ۵۵-۶ کی بجائے ۱۵-۱۸

۲۸۔ JJP ۳۔ پوکران سے ۲۰-۱۰ کی بجائے ۴۵-۲۳ بجے روانہ ہوگی اور جودھپور ۱۵-۱۷ کی بجائے ۴۵-۵ بجے

۲۹- JRD 1 ۔نیا نمبر JRM 1 ۔ ایکسٹنشن کے بعد رتن گڑھ سے ۱۶-۰۵ بجے روانہ ہوگی اور میڑتا روڈ ۴۰-۵۰ بجے پہنچے گی۔

۳۰- JRD 2 ۔نیا نمبر JRM 2 ۔ ایکسٹنشن کے بعد میڑتا روڈ سے ۳-۰۲ بجے روانہ ہوگی اور رتن گڑھ ۱۰-۳۵ بجے پہنچے گی۔

۳۱- JBM 1 ۔ باڑمیر سے ۸-۳۰ بجے کی بجائے ۷-۳۰ بجے روانہ ہوگی اور منا باؤ ۱۲-۳۵ بجے کی بجائے ۱۳-۳۵ بجے پہنچے گی۔

۳۲- JPB 1 ۔ پیپر روڈ سے ۱-۳۵ بجے کی بجائے ۱ بجے روانہ ہوگی۔ اور بلارا ۳-۰۵ بجے کی بجائے ۳ بجے پہنچے گی۔

۳۳- JBM 2 ۔ منا باؤ سے ۱۵-۳۰ بجے کی بجائے ۱۴-۳۰ بجے روانہ ہوگی اور باڑمیر ۲۱-۴۰ بجے کی بجائے ۲۰-۴۰ بجے پہنچے گی۔

۳۴- JJP 2 ۔ جودھ پور سے ۱۰-۳۰ بجے کی بجائے ۹-۱۵ بجے روانہ ہوگی اور پوکران ۱۴-۰۵ بجے کی بجائے ۱۵-۱۵ بجے پہنچے گی۔

۳۵- JJP 4 ۔ جودھ پور سے ۲۳-۲۵ بجے کی بجائے ۲۳-۱۵ بجے روانہ ہوگی اور پوکران ۶-۰۵ بجے کی بجائے ۵-۱۰ بجے پہنچے گی۔

۳۶- JBJ 2 ۔ جودھ پور سے ۲۰-۳۰ بجے کی بجائے ۱۹-۴۵ بجے روانہ ہوگی اور بلارا ۰۰-۵۵ بجے کی بجائے ۰۰-۰۵ بجے پہنچے گی۔

۳۷- JL 6 سٹیم ٹرین جالندھر شہر سے ۷-۴۵ بجے کی بجائے ۶-۵۵ بجے روانہ ہوگی اور لدھیانہ ۹ بجے کی بجائے ۸-۵۵ بجے پہنچے گی۔

۳۸- JL 7 سٹیم ٹرین لدھیانہ سے ۱۲-۲۰ بجے روانہ ہوگی جیسے کہ اب چلتی ہے اور جالندھر شہر ۱۳-۲۵ بجے کی بجائے ۱۴-۰۰ بجے پہنچے گی۔

9A - جن گاڑیوں میں ایئرکنڈیشنڈ کوچ کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔

۱- پارشیل ائرکنڈیشنڈ کوچ نمبر ۱ اَپ/ ۲ ڈاؤن میل گاڑی کے ساتھ (دِلی۔ کالکا) ہفتہ میں تین بار کی بجائے روزانہ سے چلے گی۔

۲- ایک فل ائرکنڈیشنڈ کوچ روزانہ ۴۱ اَپ مسوری ایکسپریس کے ساتھ دِلی سے دہرہ دون تک یکم اپریل ۱۹۶۷ سے ۴۲ ڈاؤن ایکسپریس کے ساتھ دہرہ دون سے دِلی تک ۲ اپریل ۱۹۶۷ سے چلا کرے گی۔

۳- ایک فل ائرکنڈیشنڈ کوچ روزانہ بمبئی سنٹرل اور پٹھانکوٹ کے درمیان ۳۳ ڈاؤن/ ۳۳ اَپ اور ۳۴ ڈاؤن/ ۳۴ اَپ میل گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی۔ الگ پارشیل ائرکنڈیشنڈ کوچ دِلی اور امرت سر کے درمیان ۳۱ اَپ/ ۳۲ ڈاؤن میل گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی۔

۴- ایک پارشیل ائرکنڈیشنڈ کوچ ہفتہ میں تین بار دلی اور وارانسی کے درمیان نمبر ۱۴ ڈاؤن/ ۱۳ اَپ اپر انڈیا ایکسپریس گاڑیوں کے ساتھ بجائے فرسٹ کلاس کوچ کے جیسا کہ ذیل میں درج ہے چلا کرے گی۔ بہرحال فرسٹ کلاس کوچ باقی چار دنوں میں بدستور چلے گی۔

دِلی سے سوموار، بدھ وار اور سنیچر وار کو۔

وارانسی سے ایتوار، منگل وار اور شکروار کو۔

۵- ایک پارشیل ائرکنڈیشنڈ کوچ ہفتہ میں دو بار ۹۱ اَپ/ ۹۲ ڈاؤن بیکانیر میل گاڑیوں کے ساتھ دلی اور بیکانیر کے درمیان حسبِ ذیل طور پر صرف ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ تک چلا کرے گی۔

دِلی سے سوموار اور ویروار کو۔

بیکانیر سے منگلوار اور شکروار کو۔

۶- پارشیل ائرکنڈیشنڈ کوچ نمبر ۳۹ اَپ/ ۴۰ ڈاؤن جودھ پور میل گاڑیوں کے ساتھ (دِلی۔ جودھ پور) ہفتہ میں دو بار کی بجائے ہفتہ میں تین بار حسبِ ذیل طور چلا کرے گی۔

دِلی سے سوموار، بدھ وار اور سنیچر وار کو۔

جودھ پور سے ایتوار، منگل وار اور ویروار کو۔

۹- جن گاڑیوں پر ایئر کنڈیشنڈ کوچ بند کر دی جائے گی۔

۱- پارشیل ایئر کنڈیشنڈ کوچ جو ہفتہ میں تین بار نمبر ۵۹ اپ / ۶۰ ڈاؤن سرینگر ایکسپریس گاڑیوں کے ساتھ نئی دلی اور پٹھانکوٹ کے درمیان چلتی ہے۔

۱۰- تھرو چلنے والے یا درمیان میں آنے جانے والوں ڈبوں کے چلنے میں رد و بدل

۱- ایک مکمل ایئر کنڈیشنڈ کوچ۔ ایک فرسٹ کلاس اور ایک تھرڈ کلاس (3-TIER) ہر ایک سنٹرل اور پٹھانکوٹ کے درمیان ۳ ڈاؤن / ۳۲ اپ اور ۳۳ ڈاؤن / ۴ اپ میل گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی۔

۲- ایک کمپوزٹ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس اور ایک پارشیل سلیپر کوچ جو بمبئی وکٹوریہ ٹرمنس اور لکھنؤ کے درمیان ۵ ڈاؤن / ۱۰۷ اپ اور ۱۰۸ ڈاؤن / ۵۰ اپ گاڑیوں کے ساتھ چلتی ہے آئندہ ۱۰۷ اپ / ۱۰۸ ڈاؤن کے ساتھ سلطان پور تک آیا جایا کرے گی۔

۳- کمپوزٹ فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس بوگی جو آگرہ چھاؤنی اور لکھنؤ کے درمیان ۸۴ ، ۸۴ اور ۸۳/ ۱۲A کے ساتھ چلتی ہے اس کے بجائے فل فرسٹ کلاس بوگی چلے گی۔ سیکنڈ کلاس اکاموڈیشن ختم کر دی جاتی ہے گی

۴- ایک تھرڈ کلاس بوگی جو دلی اور کوٹ دوار کے درمیان ۳۱ اپ / ۶ ڈاؤن ۱ KN کے ساتھ براستہ سہارنپور چلتی ہے اب براستہ گجرولہ ۲۴ اپ / ۲ SM / ۱ KN گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی۔

۵- ایک کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس جو دلی اور کوٹ دوار کے درمیان ۴ اپ / ۲ ایس ایم / KN ۲ کے ساتھ چلتی ہے اب KN ۱ مسافر ایکسپریس کے ساتھ نجیب آباد سے کوٹ دوار پر لگا دی جاتی گی۔

۶- میرٹھ سٹی لکھنؤ سروس یعنی کمپوزٹ فرسٹ اور سکنڈ کلاس کوچ اور تھرڈ کلاس کوچ اور بلند شہر لکھنؤ کمپوزٹ فرسٹ اور تھرڈ کلاس تھرو کیریج آئندہ بجائے مراد آباد کے ہاپوڑ میں ۳ ڈاؤن میل کے ساتھ تبدیل کر دی جائے گی

۷- ایک تھرڈ کلاس کوچ دلی اور مغل سرائے کے درمیان ۴ ڈاؤن / ۱۲ اپ اپر انڈیا ایکسپریس کے ساتھ چلتی ہے آئندہ صاحب گنج تک آیا جایا کرے گی۔

۸- ایک ایڈیشنل فرسٹ کلاس کوچ دلی اور انبالہ کے درمیان ۱ اپ / ۲ ڈاؤن میل گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی بجائے ایک تھرڈ کلاس کوچ کے جو بند کر دی جائے گی۔

۹- ایک کمپوزٹ فرسٹ / سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس اور ایک تھرڈ کلاس کوچ جو دلی اور ڈیگانہ کے درمیان ۸۹ اپ / ۹۰ ڈاؤن کے ساتھ چلتی ہے اب ۸۹ اپ 1JRM / ۹۵ اور ۹۶ / 2JRM / ۹۰ ڈاؤن 1JRD اور 2JRD گاڑیوں کے ساتھ جودھ پور تک آیا جایا کرے گی۔

۱۱- ڈائیننگ کار روٹ کا چلنا۔

ڈائیننگ کار نمبر ۳۰۵ اپ / ۴ ڈاؤن جودھ پور میل گاڑیوں کے ساتھ جودھپور اور دلی کے درمیان چلنے کی بجائے صرف ...گڑھ اور جودھ پور کے درمیان لگا دی جائے گی۔

۱۲- جودھ پور میل گاڑیوں سے متعلق

ایک ایڈیشنل تھرڈ کلاس کوچ ۳۰۳ اپ / ۴ ڈاؤن جودھ پور گاڑیوں کے ساتھ دلی اور جودھپور کے درمیان چلے گی

گاڑیوں کے اوقات

... اور سیکشنوں ... اور ... گاڑیوں میں اکاموڈیشن کی درجہ بندی کی ایڈجسٹمنٹ کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنے کے لئے ... اپریل ۱۹۶۷ کا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیں، جو ریلوے کے بکنگ ... اور ... بک سٹالوں سے مل سکتا ہے۔

ملک کے مایۂ ناز کھلاڑی

اشوک گنڈوترہ

۱۸ برس کے اس کرکٹ کھلاڑی میں غضب کی پھرتی اور کہنہ مشقی ہے۔ لفٹ ہینڈڈ بلّہ باز ہونے کے ساتھ ہی ایک کامیاب لفٹ آرم باؤلر بھی ہے۔ فیلڈنگ میں تو یہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اپنے ان ہی اوصاف کے باعث وہ کرکٹ کے میدان میں اُسی جگہ کود پڑتا ہے جہاں کا پہلو کمزور ہوتا ہے اور اپنی ٹیم کو کامیابی دلا دیتا ہے۔

۲۴ر نومبر ۱۹۴۸ میں اشوک برازیل میں پیدا ہوا۔ ہوا۔ جب یہ ۱۸ ماہ کا ہوا تو والد صاحب کے ساتھ بھارت آیا جو اس وقت وزارت امور خارجہ میں ملازم تھے۔ اشوک کی تعلیم و تربیت دِلّی میں ہوئی۔

تعلیم و کھیل — دونوں میں اشوک سبقت لئے ہوئے ہے۔ دِلّی سکول میں رہ کر اس نے فرسٹ ڈویژن میں سینیئر کیمبرج امتحان پاس کیا۔ آج کل وہ سینٹ سٹیفن کالج میں بی اے آنرز میں معاشیات کا فرسٹ ایئر سٹوڈنٹ ہے۔

۱۹۶۵ میں جب اُس نے نارتھ زون کے لئے کوچ بہار ٹرافی جیتی، یہ اُس کے لئے ... صرآزما موقع تھا۔ ایسٹ زون نے ۱۵۵ ... ن سامنے تھے جب کہ نارتھ زون کے



چار وکٹوں پر کل ۴۱ رن ہی تھے۔ جب کمانڈ اشوک کے ہاتھ لگی تو وہ رن بنانے لگا۔ ۹۵ رن پورے کرنے کے بعد وہ آؤٹ ہو گیا۔ دوسرے اوور میں وہ گر گیا اور اس کی کہنی میں کچھ چوٹ آ گئی لیکن دن پورا ہوتے ہوتے وہ اپنی سنچری پوری کر چکا تھا۔

نارتھ زون کے کُل ۳۵۹ رن بنے، جن میں اکیلے اشوک کے ۱۵۸ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسٹ زون ایک اننگ سے بازی ہار بیٹھی۔ یہ سب اشوک کی ہی محنت کا ثمرہ تھا۔

"یہ کیا میچ ہے؟" اشوک کہتا ہے "اصلی میچ تو سینٹ سٹیفن اور ہندو اسٹر کالج کا فائنل تھا جو حال میں ہی دِلّی میں کھیلا گیا۔"

حقیقت میں میچ کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ دونوں ٹیموں میں بازی مارے جانے کی زبردست

ش کمش چل رہی تھی اور آخرکار اشوک
، جان ٹرڈ کرشتوں سے سینٹ سٹیفن نے
، کامیابی حاصل کی۔

پہلی باری میں ہندو کالج کے کھلاڑیوں
نے ۱۵۰ رن بنائے جب کہ سینٹ سٹیفن
اوں نے ۴۹۶ رن بنائے۔ اس سے ہندو
کالج کی ٹیم میں ایک جوش آیا اور اُس کے
کھلاڑیوں نے ۵۲۵ رن بنا لئے مگر سینٹ سٹیفن
کھلاڑیوں کے دوبارہ میدان میں آ جانے
سے ہندو باؤلروں نے اندھا دھند گیند پھینکنی
شروع کر دی۔ پھر بھی سات کھلاڑیوں نے
۱۲۲ کا سکور کر لیا تھا اور کھیل کے پانچویں
دن کے لئے صرف ۰ ۰ رن حاصل کرنے باقی تھے

اُس وقت تک ہندو کھلاڑی ۱۴ سالہ
اشوک کے فن سے نا بلد تھے۔ اُس صبح اُس
کے کئی ساتھی آؤٹ ہو گئے مگر وہ جواں مردی
سے ڈٹا رہا اور آخر کار بہادری کے ساتھ
میچ جیتنے میں کامیاب ہوا۔

دو سال پہلے اشوک کو بہترین سکولی
کھلاڑی منتخب کیا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب
قطعی نہیں ہے کہ اُس کی دلچسپیاں صرف
سکول اور کالج تک ہی محدود ہیں۔ پچھلے سال
اُس نے دلی ٹیم میں کھیل کر ... کو
ہرایا اور رانجی ٹرافی حاصل کی۔ اتنا ہی نہیں
وہ دلی یونیورسٹی ٹیم میں رہ کر عثمانیہ
کے خلاف بھی کھیلا۔

۱۹۶۵ - ۶۶ میں لندن سکول لڑکوں
کے خلاف انڈیا کے ساتھ کھیلا اور آخر کار
پانچواں اور فائنل ٹیسٹ جیت ہی لیا جبکہ
پہلے چاروں میچ ڈرا رہے تھے۔

آل انڈیا سکولز ٹیم کی طرف سے وہ

مگر وہاں کچھ ایسے ناگفتہ بہ حالات درپیش
آئے کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

نوجوان مشق کرکٹ کھلاڑی بھی اشوک
کے مداح ہیں۔ نیوزی لینڈ کھلاڑی برٹ
سٹکلیف نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔
اُس میں آگے بڑھنے اور کامیابی حاصل
کرنے کا زبردست ولولہ ہے۔ وہ دن بہ
دن ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔

البتہ اشوک دو کرکٹ کھلاڑیوں سے
بہت زیادہ مرعوب ہے۔ اُن میں سے
ایک ہیں بلے باز ٹیڈ ڈیکسٹر اور دوسرے باؤلر
رچی بیناڈ، لیکن اب اشوک خود بھی دوسروں
کو متاثر کر رہا ہے۔

کھلاڑی



اُرن گھوش

فٹ بال کے میدان میں دیانت داری
کے ساتھ جن کھلاڑیوں نے اپنے فن کا مظاہرہ
کیا، اُن ہی میں سے ایک کھلاڑی اُرن
گھوش بھی ہے۔ ٹیم کے دوسرے کھلاڑیوں
کو اُس سے بڑی تقویت رہتی ہے کیونکہ
وہ بچاؤ کرنے میں اوّل نمبر پر ہے۔

۱۹۶۰ کے روم اولمپکس میں اُسے بھارت
کی نمائندگی کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ اُس
وقت سے لے کر اب تک بھارت نے
جتنے بھی مقابلوں میں شرکت کی، اُرن گھوش
سب میں پیش پیش رہا۔

...سے کھیلا اور روس کے خلاف ...
... میں بھی وہ بھارت کی طرف ...
... ساتھ انگلینڈ بھی گیا
مفصل



والے فٹ بال مقابلے میں تو اُسے ٹیم کا
کپتان بھی بنا دیا گیا۔ اُس کی جملہ خوبیوں
در کھیل میں اُس کی دل چسپی کے پیش نظر
کچھ دن پہلے اُسے ارجن ایوارڈ سے بھی
ہ فراز کیا گیا۔

بشن سنگھ بیدی

۔ تی میں ہونے والے کرکٹ میچ
میں ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کا مقابلہ کرنے
کے لئے جب پرائم منسٹر الیون میں بشن
سنگھ بیدی کا نام شامل کیا گیا تو وہاں کوئی ایسی
مید نہیں تھی کہ وہ اتنا کامیاب کھلاڑی
ت ہوگا۔

اُس نے اتنے شاندار طریقے سے
ؤلنگ کی کہ میچ کے انتخاب کنندگان نے
ں کو نہ صرف دوسرے میچوں میں شامل کیا
یرونی ممالک کا دورہ کرتے وقت بھی
و کو اپنے ساتھ رکھا۔ اور یہ سب اُس
یوں کے پیشِ نظر ہوا۔

نواسی لفٹ آرم سپنر بیدی



بھی زندگی کی صرف بیس ہی بہاریں دیکھ
پایا ہے مگر اُس نے باپو نادکرنی اور سلیم
دُرانی جیسے کہنہ مشق کھلاڑیوں کی کمی کو
پورا کر دیا ہے۔ رانجی ٹرافی میچوں میں تو
اُس نے پہلے ہی کامیابی حاصل کر لی تھی
ویسٹ انڈیز کھلاڑیوں کے مقابل دو ٹیسٹ
میچوں میں اُس نے ۹ وکٹ لیے۔

دیپو گھوش

آج کے بیڈمنٹن کے اوّل نمبر کھلاڑیوں
میں وہ پیش پیش ہے۔ ندو ناٹیکر جیسے کہنہ
مشق کھلاڑیوں کی طرح اب وہ منظرِ عام پہ
آنے لگا ہے۔ حالیہ نیشنل بیڈمنٹن میں تین
سیمی فائنلوں میں دنیش کھنہ کو ۱۵ — ۷، ۳ — ۱۵،
۱۷ — ۱۵ تک ہارنے سے بچایا۔
مدراس اسٹیٹ انوی ٹیشن بیڈمنٹن
ٹورنامنٹ میں ٹاپ کھلاڑی سُریش گوئل
کو بُری طرح ہرایا اور اپنے نام کی دھوم
مچا دی۔ دیپو بہت ہوشیار ہے اور ہر بار
اپنا سٹائل بدل دیتا ہے۔

آپ کے مسائل

میرے ایک نہایت عزیز دوست کے چہرے پر پرانے چیچک کے داغ ہیں۔ بتائیے یہ کس طرح انھیں دور کیا جا سکتا ہے

—ن، آسنسول

● چہرے کے داغ کو مستقل طور پر دور کرنے کے لئے اچھے پلاسٹک سرجن کی صلاح لیں۔ لیموں کا رس اور بیسن کا اُبٹن بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

●

میری لمبائی کم ہے۔ میری عمر ۲۰ سال ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا قد ۴ انچ سے بڑھ جائے مگر اس طرح کہ میرا چہرہ نہ پھیلے۔

— ایم کھنہ، جون پور

● آپ رسّی پکڑ کر جھولنے والی کسرتیں کر سکتے ہیں اور قد کی موزونیت سے اپنے لباس کا انتخاب کر کے اپنے چھوٹے قد کو چھپا سکتے ہیں۔ ایڑی والا جوتا بھی آپ کو بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شخصیت کی کمیوں پر کفِ افسوس ملنے سے اچھا ہے کہ آپ اپنے لباس کی طرف خاص توجہ دیں۔ خوراک کے معاملے میں بھی آپ کو محتاط رہنا پڑے گا۔ چھوٹے قد کے ساتھ موٹاپا زیب نہیں دیتا۔ اس لئے آپ ان چیزوں سے قطعاً پرہیز کریں جن سے بدن میں چربی بڑھتی ہے۔ یا موٹاپا آتا ہے۔

●

میرا چہرہ کالا پڑ گیا ہے۔ مگر جسم سفید ہے۔ چہرے پر مہاسے بھی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میرا چہرہ دھوپ سے کالا ہوا ہے اب یہ سفید نہیں ہوگا۔ براہ کرم کوئی علاج بتائیے۔

— خالد میاں خان۔ کھرگون (ایم پی)

● کیل، پھنسی، مہاسے وغیرہ کے لئے بازار میں کئی قسم کے کریم یا لوشن ملتے ہیں۔ داغوں پر وہاسنگ کریم لگاتے رہئے۔ کچھ دن بعد یہ داغ ہلکے پڑ جائیں گے۔ پاؤڈر لگاتے وقت لیکٹو کیلامن کا بھی استعمال کیجئے۔

خون کی صفائی کے لئے سادہ غذا کا استعمال کیجئے۔ روزانہ کچھ کسرت کیجئے۔ ہفتے میں ایک بار فاقہ کریں تو خوشگوار نتیجہ ملے گا۔ اس دن صرف پھل استعمال کیجئے۔

مہاسے دور کرنے کے لئے ڈیڑھ کلو پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر اسے اُبالیں۔ پانی جب ایک سو گرام رہ جائے تو اسے شیشی میں کر لیں۔ روزانہ روئی سے اس کو اپنے چہرے پر ملیں۔ صندل میں کافور ملا کر چہرے پر رگڑنے سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔

●

مجھ پر موٹاپا چھا رہا ہے۔ میرے ہاتھ پیر میں درد رہتا ہے۔

— محمد یوسف خان ماعان، بھیونڈی مہاراشٹر

● موٹاپا کم کرنے کے لئے جہاں غذا پر پرہیز ضروری ہے وہاں کسرت بھی بہت ضروری ہے۔ آپ اپنی غذا میں دہی، مکھن، گھی، چینی، مٹھائی وغیرہ چربی بڑھانے والی تمام اشیا کو بالکل نکال دیں۔ دن میں صرف دو بار ہلکی غذا لیں۔ اور کھانے کے دوران پانی بالکل نہیں

ایڈیٹر

اپنے مسائل کے لئے اس پتے پر خط لکھیں۔
کیپٹن سریتا اردو جھنڈے والان سٹیٹ نئی دلی

آپ کے خطوط

سریتا دن بہ دن خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ اس سخت محنت کے لئے آپ یقیناً قابلِ مبارکباد ہیں۔

— رضا حصری، لکھنؤ

●

سریتا جنوری ۱۹۶۷ نظر نواز ہوا۔
م ندیم صاحب اور ہاجرہ مسرور صاحبہ کی کہانیاں 'دنیا آکاش سے نئے ستارے' اور 'مارِ آستین' بہت پسند آئیں۔ علاوہ ازیں محمود ہاشمی صاحب کا فکر انگیز مقالہ 'چھ کروڑ ہندوستانی مسلمان' بھی بہت خوب ہے۔
مجموعی طور پر سریتا نہ صرف تفریحی ہے بلکہ نئی معلومات سے بھرپور اور سبق آموز بھی۔

— سید نجم الہدیٰ عظیم آبادی، بردوان

●

جنوری ۱۹۶۷ کے سریتا میں رامیسور ناٹیا کا سفرنامہ 'برما' پڑھا۔ برمی حکومت کا عام ہندوستانیوں پر ظلم کرنا پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ہمارا پڑوسی ملک اپنے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کرے۔

— ج۔ ح۔ ریب، کلکتہ

●

بے شک سریتا، نئی نسل کا معلم ہے۔ اگر آپ کی نوازشیں اسی طرح نئی پود کو نصیب ہوتی رہیں تو کوئی احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوگا۔ اس وقت شاید آپ کے علاوہ کوئی ادارہ ایسا نہیں جو ایمانداری کے ساتھ کام کر رہا ہو۔ آپ کا یہ قدم اُردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کا ادب اور ادیب آپ کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

— سید ابوالبرکات سلمی، کانپور

●

'سریتا' ایک صحت مند رجحان اور مقصدی ادب کا واحد جریدہ ہے۔

— محمود واجد، جمشید پور

سریتا جنوری [illegible] میں محمود ہاشمی صاحب کا مقالہ 'چھ کروڑ ہندوستانی مسلمان' سیاسی بیداری پیدا کرنے والا ہے۔ اگر اس طرح کے دیگر مضامین مسلمانوں کی نظر سے گزریں تو انشاء اللہ مسلمانوں میں سیاسی و قومی بیداری پیدا ہوگی۔
کلجگی جیون نقلم مہیش چندر اگروال زمانۂ حال کی عکاسی میں کامیاب ہے۔

— حسین بریگیڈ، ہانجرولہ

●

نئے ہندوستان کی تعمیر میں آپ کا رسالہ جو کام انجام دے رہا ہے اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ فرسودہ نظام کو بدلنے کی کوشش اور غلط رسم و رواج سے ٹکر لینا بس اسی کا کام ہے۔

— علیم اقبال، دتیا، بہار

●

فروری ۱۹۶۷ کا سریتا نظر نواز ہوا۔
ششی شنکر کی کہانی 'نئے قدم نئی راہیں' ہندوستان کی قومی یکجہتی کے لئے سنگِ میل ہے۔ لیکن میرے خیال شادی بیاہ کے بندھنوں

سے زیادہ آسان اور قابلِ عمل حل راکھی بندھن ہوگا۔ اگر اسے اپنایا جائے تو مذہبی تعصب ومنافرت کی خلیج پاٹی جاسکتی ہے۔

—— محمد انیس الرحمٰن ساقی، کلکتہ

●

یوں تو سریتا میں ہر چیز ہی شاندار ہوتی ہے لیکن مجھے موجِ سریتا بے حد پسند آتا ہے۔ کافی وزنی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت پسندانہ بھی بہت ہوتا ہے۔

لیکن فروری ۱۹۶۷ کے شمارہ میں موجِ سریتا میں مجلس مشاورت کے نو نکاتی منشور کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے مجلسِ مشاورت کا ۱۳ ردسمبر ۱۹۶۶ والا فیصلہ نہیں پڑھا اور اگر پڑھا بھی تو حقیقت پر پردہ ڈال دیا۔ مجلس کے انتخابی فیصلے میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ مسلم ووٹران صرف مسلم امیدوار کو ہی ووٹ دیں۔

—— خورشید انوار گیلانی، گیا

●

فروری ۱۹۶۷ کا سریتا پڑھا۔ یوں تو سب مضامین معیاری اور تعمیری ہیں مگر نکہت اقبال کی کہانی 'موم بتی' اس شمارے کی جان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سریتا کا معیار بڑھتا رہے گا۔

—— سید ماجد قادری، مہاراشٹر

●

مارچ ۱۹۶۷ میں راج کرشن کا بصیرت افروز مقالہ 'تجربات' پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اور میں نے اپنی بہت زیادہ اصلاح کرلی۔ اگر میں ایسا مضمون پہلے پڑھ لیتا تو ڈاکٹروں پر خرچ کیا ہوا کافی روپیہ بچا سکتا تھا۔

کنادرشی بھٹناگر کا طنز 'جلوس' بھی بہت عمدہ رہا۔

—— بی۔ آر۔ رتنا جین

یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ مارچ ۱۹۶۷ میں اندرجیت دت کی تاریخی کہانی زور آور سنگھ پورے رسالے کی جان ہے اور ہند کا قسط وار ناول 'شراب اور شباب' بھی اپنی پوری دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔

وصی اقبال کی کہانی 'تائی بشیرن' بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔

—— احمد ضیا، مدراس

●

مارچ ۱۹۶۷ کا سریتا نظر نواز ہوا۔ گماں سنگھ کی سائنسی کہانی 'لمس دھماکہ اور موت' اپنی طرز کی انوکھی تخلیق ہے۔ سائنسی ترقی کی جھلک دکھانے کے ساتھ ساتھ اس میں انسانی مجبوری بھی دکھائی گئی ہے۔

فریدہ خاتون کا مقالہ محبوب کا تصور کلاسیکل شاعری میں، بھی بہت پسند آیا۔ شیدا رومانی کی نظم نے تو سماں ہی باندھ دیا۔

—— پربھات کمار، بھیل واڑہ

●

مارچ ۱۹۶۷ کا سریتا دیکھ کر تو بے اختیار آپ کے انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے گلزار، فریدہ خاتون، انیا، راکیش کے مضامین نیا پاکستان، محبوب کا تصور کلاسیکل شاعری میں، شوہر کے تبادلے، آنکھوں کی حفاظت بہت پسند آئے۔

اس کے علاوہ اندرجیت دت، وصی اقبال کنادرشی بھٹناگر کی کہانیاں زور آور سنگھ، تائی بشیرن، جلوس بھی کم دلچسپ نہیں رہیں۔ نظموں میں شیدا رومانی اور راجیندر کمار کی تخلیقات بے حد پسند آئیں۔

—— سرفراز الحق، امروہہ

اپنی پسند اور ناپسند سے ہمیں ضرور مطلع کیجیے۔

—— ایڈیٹر


سریتا



ماہنامہ سریتا

سماجی تعمیر نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر

وشوناتھ

زر سالانہ

فی پرچہ ——— ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ایک سال ——— ۱۲ روپے

دو سال ——— ۲۲ روپے

تاحیات ——— ۱۵۰ روپے

غیرممالک کے لئے ایک سال ۱۶ روپے دو سال [illegible]

سریتا کا ہر پرچہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ڈاک کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس لئے پرچہ گم ہو جانے کی صورت میں ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے پر اگر پرچہ اسٹاک میں موجود ہوا تو دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔

اپنی رہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریداری نمبر کے ساتھ ہمیں فوراً دیجئے تاکہ سریتا آپکو وقت پر مل سکے۔

مالکان دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دلی کے لئے دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ اور دلی پریس نئی دلی سے وشوناتھ نے طبع اور شائع کرایا

مقام ادارت اور اشاعت: دلی پریس جھنڈے والا اسٹیٹ، رانی جھانسی روڈ، نئی دلی ۱



کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچر



مضمون نگاروں سے

"سریتا" میں لکھنے والے کرم فرماؤں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مسودہ بھیجتے وقت ٹکٹ لگا اور پتہ لکھا لفافہ بھیجنا نہ بھولیں۔ ان کی عدم موجودگی میں مسودہ واپس نہیں بھیجا جائے گا اور نہ ہی ادارہ "سریتا" پر مسودہ تلف ہونے کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

ـــــــ ایڈیٹر

جب آپ
مانگ کر کھاتے نہیں
مانگ کر کپڑے پہنتے نہیں
مانگ کر بس، ٹرام یا ریل میں سفر کرتے
نہیں اور بغیر کرایہ ادا کئے کسی کے
مکان میں رہتے نہیں
تو پھر
مانگ کر کتابیں اور
رسالے ہی کیوں پڑھتے
ہیں؟

متفرق معلومات کے لئے پڑھئے

نثر و نظم

تاریک سویرا	احمد شجاع پاشا	۳،۷۵
آدمی اور انڈے	موپاساں	۱،۷۵
جُوا	سری رام آہوجہ	۳،۵۰
جانور	دت بھارتی	۳،۵۰
صبح بہار (کلیات)	اختر شیرانی	۸،۰۰
کانچ کے پتلے	کرپا شنکر بھاردواج	۵،۰۰
چوٹ	دت بھارتی	۴،۰۰
ذوقی نظریں	کرپا شنکر بھاردواج	۵،۰۰
مرکز	سہیل اعظمی	۲،۰۰
بادۂ مشرق (منظوم)	ساغر نظامی	۴،۵۰
تنہیاں (نظم)	ساحر لدھیانوی	۶،۰۰
سیف و سبو (")	جوش ملیح آبادی	۵،۰۰
لکھنؤ کا شاہی اسٹیج	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۵،۰۰
جنگل میں دھنک	منیر نیازی	۴،۵۰
دستانہ / دیوکرینی لوک کہانی	(ماسکو)	۰،۲۵

علم و فن

دولت کمانے کے ڈھنگ	تسکین حافظ آبادی	۳،۰۰
کماؤ کماؤ	سی۔ بی۔ سہگل	۱،۰۰
ورزش سازی	"	۲،۰۰
رہنمائے فوٹو گرافی	"	۲،۰۰
بیسویں صدی کا کشیدہ کاری	...	۲،۰۰

درزی ماسٹر	....	۲،۵۰
الیکٹریشین گائیڈ	درشن سنگھ وہرہ	۵،۵۰

اِسلامی کتابیں

میاں بیوی	...	۱،۷۵
جنت کی کنجی	...	۲،۲۵
جنت کی ضمانت	...	۲،۰۰
جنت کا ٹکٹ	...	۰،۷۵

دھارمک کتابیں

بھگوت گیتا بمعہ مہاتم (گلیز کاغذ)	...	۱،۷۵
مہا بھارت (گلیز کاغذ)	...	۱۰،۰۰
والمیکی رامائن نثر	...	۴،۰۰

صحت و مسرت

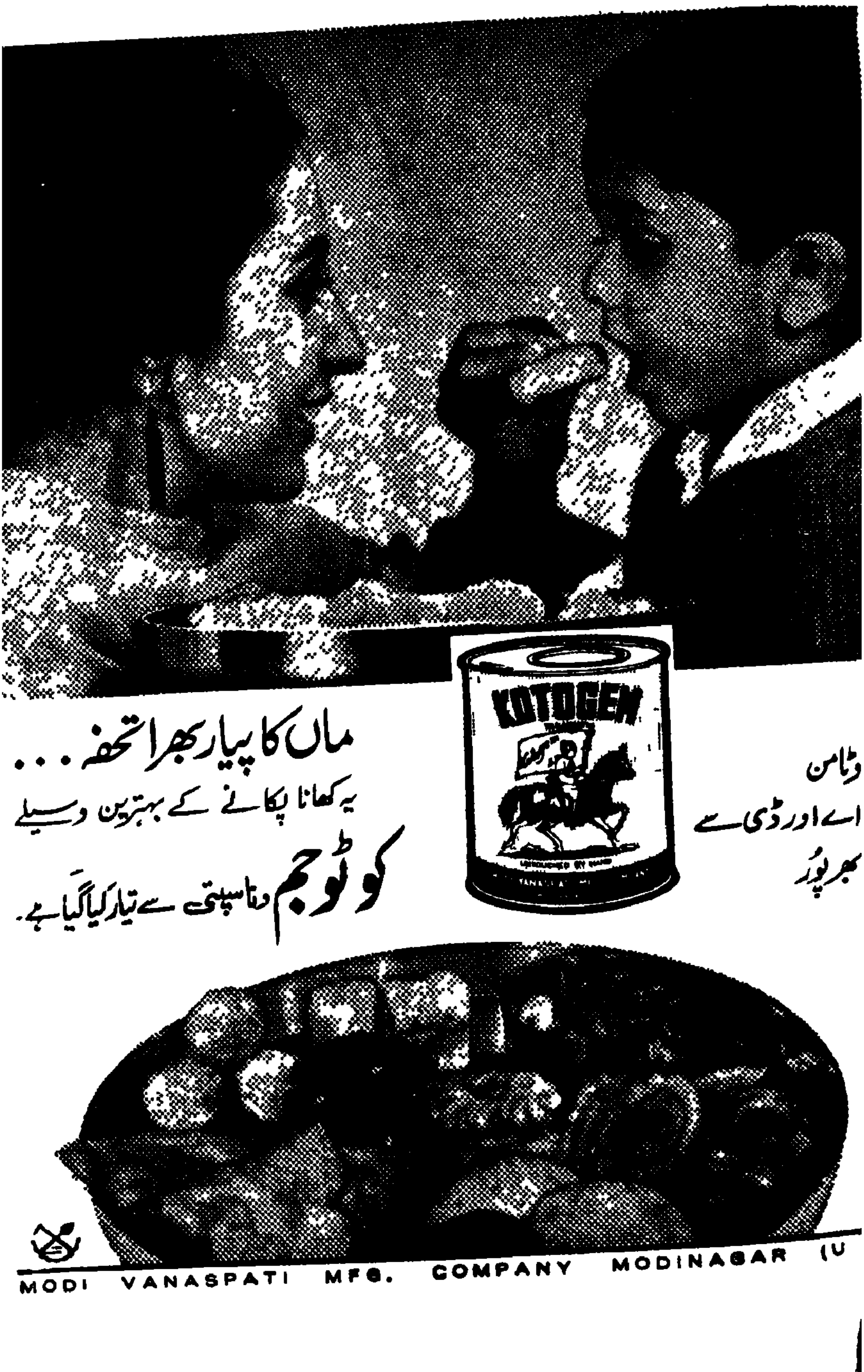
ہدایت نامہ خاوند	کوی راج ہرنام داس	۲،۰۰
” ” بیوی	”	۲،۰۰
” ” صحت	”	۲،۰۰
” ” غذا	”	۲،۰۰
” ” زچہ بچہ	”	۲،۰۰
برتھ کنٹرول	ڈاکٹر ستیہ وتی	۵،۰۰
رہنمائے گرہست	کاشی رام چاولہ	۴،۰۰

(محصول ڈاک علاوہ)

دِلّی بک کمپنی • ۱۲/ایم کناٹ سرکس • نئی دِلّی



مجھے
ہمیشہ
چاق و چوبند
رہنے کا
گُر آتا ہے
میں ہمیشہ اپنے پاس پچنول کی ایک شیشی رکھتا ہوں۔ مجھے بھی بہت پسند
ہے۔ لیکن شادی کا کھانا کھانے کے بعد دو گولیاں پچنول کی کھانا کبھی نہیں بھولتا۔
پچنول آپ کو بھی ہضم کی خرابی سے پیدا ہونے والی سب بیماریوں سے
بچاتا ہے۔ معدہ میں ٹھہری ہوئی بیرابیت کو دور کرتا ہے۔ ثقیل غذاؤں کو
جلد ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے اور اپھارہ دور کرتا ہے۔
پچنول
ہمدرد
دہلی کانپور ۰ پٹنہ


KOTOGEN
ماں کا پیار بھرا تحفہ . . .
یہ کھانا پکانے کے بہترین وسیلے
کوٹوجم وناسپتی سے تیار کیا گیا ہے۔
وٹامن
اے اور ڈی سے
بھرپور
MODI VANASPATI MFG. COMPANY MODINAGAR (U

موجِ سریتا

راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے عہدے کا حلف لیتے ہی جو سب سے پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ آپ سیدھے جین منی سوشیل کمار اور شرنگیری مٹھ کے شنکر آچاریہ کی خدمت میں اُن کا آشیرواد لینے کے لئے حاضر ہوئے۔ ان دونوں موقعوں کی تفصیلی خبریں اور تصویریں وغیرہ تمام اخباروں میں چھپیں۔ اور ملک بھر میں خوب واہ واہ ہوئی۔

اِس سلسلے میں ایک ساتھ کئی سوال اُٹھتے ہیں:

پہلا یہ کہ کیا سیکولر بھارت کے راشٹرپتی کے فرائض میں یہ شامل ہے کہ وہ عہدہ سنبھالتے ہی کسی مذہبی پیشوا کے حضور میں حاضر ہو اور اُس سے آشیرواد اور تحریک حاصل کرے؟

اگر کوئی راشٹرپتی نجی طور پر ایسی عقیدت رکھتا ہو تو کیا اس کا اس طرح عمل کرنا ایک ذاتی قدم ہوگا یا ایک سرکاری اور آئینی فریضہ؟ اگر یہ نجی بات ہے تو اس کو مشتہر کیوں کیا جاتا ہے۔ اور اگر سرکاری ہے تو پھر یہ کچھ خاص مذاہب اور فرقوں تک ہی محدود کیوں رہتا ہے؟

یہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کے معاملے میں کسی نجی عقیدت کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا کیوں کہ مسلمان ہونے کے ناطے انہیں نہ مذکورہ جین منی کے ساتھ کوئی عقیدت ہو سکتی ہے اور نہ کسی شنکر آچاریہ سے۔ تو پھر وہ انہی دو بزرگواروں کے پاس کیوں گئے؟

ایمان داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے مذہب اسلام کے کسی ہندوستانی پیشوا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس سے اپنی کامیابی کے لئے برکت کی دعا کراتے۔ اس کے بعد وہ ترتیب وار ہندو، جین، سکھ، عیسائی، یہودی اور پارسی مذاہب کے پیشواؤں کے پاس جا سکتے تھے۔ اگر وہ ایسا کرتے تبھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے واقعی اپنے عہدے کی رسم نبھائی ہے۔

لیکن صاف بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو مذکورہ جین منی اور شنکر آچاریہ کے دربار میں محض اس لئے بھیجا گیا تاکہ ان کے انتخاب میں ہندو فرقہ پرستوں میں جو مخالفانہ ردِعمل ہوا اس کا تدارک ہو جائے لیکن کیا یہ بات ایک مسلمان بزرگ کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتی نہیں؟ اور کیا اس طریقے سے ملک کے ایک سربراہ کے ذریعہ ہی دکھاوے اور مکاری کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی؟

ذاکر صاحب نے بھی اپنی کمزوری کے تحت جو کچھ کیا اس سے کسی ہندو کو ہندو دھرم میں اُن کا عقیدہ ہو جانے کا یقین نہیں آئے گا اور نہ مسلمان کی نظر میں ان کی عزت کچھ بڑھے گی۔

دلی ایڈمنسٹریشن نے ایک ایسی اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت دلی میں گھی کی پیداوار بڑھانے کے لئے یہاں کے بھکاریوں سے کام لینے کی کوشش جا رہی ہے۔

یہ ایک اچھی اسکیم ہے۔ اس سے گھی کی پیداوار خواہ نہ بڑھے لیکن اگر اس کی بدولت کچھ بھکاریوں کو روزی کمانے کے لئے محنت کرنے کی عادت

بائے تو صرف اتنی بات بھی خود اُن پر اور سماج پر ایک
بہت بڑا احسان ہوگی۔

بھکاریوں سے کام لینا ہمیشہ بہت مشکل ثابت
رتا ہے خاص طور پر بھارت میں۔ یہاں بھیک یا
رات دینے کو اتنا بڑا ثواب سمجھا جاتا ہے کہ اس کے
بارے بے شمار نکھٹو لوگ کئی دوسرے محنت کش
بقوں سے بہتر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
اسے یہاں اب سے پہلے بھکاریوں سے کام لینے کی
نی بھی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ان میں سے بہ مشکل
کوئی کامیاب ہوئی ہے۔

دلی کی اس نئی اسکیم کے تحت بھکاریوں کو چونکہ
ـ طرح سے زبردستی ہی پکڑ کر کام پر لگایا جائے گا۔
ـ لئے ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ جتنا کھائیں
۔ اتنا اپنی محنت سے پیدا بھی کر دیں گے۔ محنت تو
کریں گے نہیں۔ اس لئے یہ اسکیم پیداوار بڑھانے
ذریعہ بننے کی بجائے خرچ کا ہی ایک محکمہ ثابت ہوگی۔

ایسی حالت میں کیا یہ زیادہ مناسب نہ ہوگا کہ اس
کیم کا خرچ چلانے کے لئے سیدھے سرکاری خزانہ
۔ روپیہ دینے کی بجائے صرف ان لوگوں پر ایک ٹیکس
دیا جائے جو دان پُن اور ثواب کمانے کے بہت
اہش مند رہتے ہیں۔

بہتر تو یہ ہے کہ ملک بھر کے گداگروں کی پرورش
۔ لئے تمام مندروں، مٹھوں، مسجدوں اور اسی طرح
متبرک مقامات پر ایک بھاری بھرکم "ثواب ٹیکس"
دیا جائے۔ اس سے یہ مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔

مغربی پاکستان میں ان دنوں غلام کیمپوں کا
بڑا چرچا ہے۔ یہ قصہ کچھ اس طرح
روع ہوا کہ ایوب سرکار اپنے جاسوسوں کے ذریعے
لی کہ مغربی پاکستان صوبائی سرکار کے محکمۂ آبپاشی
لی نے پاکستان کے نئے سندھ پراجیکٹ کے
ے میں کھدائی وغیرہ کے جو ٹھیکے دئے ہیں، ان
ام کرنے والے مزدوروں سے غلاموں کے طور
کام لیا جا رہا ہے۔

پتہ چلا کہ ٹھیکیدار لوگ جو شمال مغربی سرحدی
علاقہ کے خونخوار پٹھان ہیں۔ دور دور سے غریب دیہاتیوں
کو پکڑ کر لے آتے ہیں۔ اور پھر انہیں نازی ڈھنگ کے
نظربندی کیمپوں میں قید کر کے ان سے زبردستی کام
کراتے ہیں۔

اس پر ایوب نے تحقیقات کا حکم دیا۔ اور
پولیس نے چھاپے مارے۔ پولیس کے مطابق اب
تک ۲۰۰ سے زیادہ غلاموں کو ان کیمپوں سے چھڑایا
جا چکا ہے۔ اور پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی
ایسے کیمپوں کی تلاش جاری ہے۔

آزاد کرائے گئے غلاموں نے بتایا کہ ان کے
پیروں میں رات کے وقت زنجیریں ڈال دی جاتی تھیں
تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں۔ کئی مزدوروں کے پیروں میں
زنجیروں کے نشان تھے اور بہت سے تو اپنی یادداشت
تک کھو چکے تھے۔ تین مثالیں ایسی بھی ملیں جن میں
مزدوروں کے معاوضہ مانگنے پر ٹھیکیداروں کے مسلح
پہرے داروں نے انہیں جان سے مار ڈالا تھا۔

یہ سب واقعات بیسویں صدی کے ۶۷ ویں
سال میں اپنے کو ایک جدید مسلم ملک کہنے والے
پاکستان میں رونما ہوئے ہیں۔ ویسے اسلام میں
غلامی ممنوع نہیں۔ اور سعودی عرب میں یہ طریقہ
آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے لیکن پاکستان
جیسے ترقی پذیر ملک میں اس بدعت کا اس طرح
دوبارہ چپکے سر اُٹھانا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کہیں
یہ کمیونسٹ چین کی دوستی کا اثر تو نہیں؟

کمیونسٹ چین میں اس طریقے کو غلامی نہیں
کہتے۔ بلکہ کمیونسٹ ڈسپلن کہتے ہیں۔ لیکن مزدوروں
سے کام لینے کا طریقہ کم و بیش ویسا ہی ہے جیسا کہ
پاکستان کے ان پٹھان ٹھیکیداروں نے اپنایا۔ یعنی
بندوق، زنجیر اور کوڑے کا طریقہ!

ایک عجیب بات ہے کہ جب کبھی بھارت کی کسی
جماعت یا تنظیم کو امریکہ یا روس سے پیسہ ملنے
کے سلسلے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ پیسہ ان ملکوں کے

خفیہ جاسوسی محکموں کی طرف سے آتا رہا ہے تو سبھی متعلقہ لوگ یک لخت شور مچانا شروع کر دیتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا غضب ہو گیا ہو۔

یہ لوگ اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ پیسہ خواہ جاسوسی محکمے سے آئے یا تعلیمی محکمے سے۔ وہ ہوتا تو ان ملکوں کی حکومتوں کا ہی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں (یا کسی بھی ملک میں) جن تنظیموں کو یہ روپیہ ملتا ہے ان سے لازمی طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ روپیہ دینے والے ملکوں کے حق میں پراپیگنڈہ کریں گی۔

جاسوسی محکموں کے ذریعے روپیہ دینے میں سہولت صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان محکموں کے اخراجات کا کوئی کھلا حساب نہیں ہوتا اور نہ ایک ایک مد کی منظوری لینی پڑتی ہے۔ اس لئے جب یہ بڑے ملک کسی غیر ملکی تنظیم کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے جاسوسی محکموں کے ذریعے اپنے یہاں کی کسی امدادی تنظیم کو روپیہ پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے یہ روپیہ ہندوستان وغیرہ میں بٹتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ایسی مدد لینے والی تنظیموں کے عہدے دار بھی یہ پتہ چلنے پر کہ روپیہ جاسوسی محکموں کی وساطت سے آ رہا ہے۔ ایک دم گھبرا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ اس سے اس معاملے کو خواہ مخواہ ایک ایسی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جس کا یہ مستحق نہیں ہے۔ مالی مدد ہر صورت میں مالی مدد ہی ہے۔ اور اپنے ساتھ کچھ تقاضے لاتی ہے۔ آخر آج ہمارا سارا ملک ہی ان دو بڑے ملکوں امریکہ اور روس کی مدد پر جی رہا ہے۔ پھر ان کے جاسوسی محکموں سے بھی کچھ مدد مل جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ جو ملک ہمیں روٹی کھلائیں گے وہ ہمارے ملک میں جاسوسی بھی کرائیں گے۔ پھر یہ چیخ و پکار کیوں؟

کئی اسٹیٹوں کی غیر کانگریسی سرکاروں نے مزدور، مالک جھگڑوں میں پولیس کے دخل نہ دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ اصولاً تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ جھگڑے عموماً روپے کے لین دین پر ہوتے ہیں جو دیوانی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کا نپٹارا عدالت میں ہونا چاہئے۔ لیکن اس بات کا مطلب یہ نہیں کہ اگر ایک فریق دوسرے کا سر پھوڑ دے یا اس کی جائداد لوٹ لے تب بھی پولیس موقعہ پر کھڑی تماشہ دیکھتی رہے۔

آخر پولیس کا تو فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ اس لئے کسی بھی حالت میں 'مزدور جھگڑوں میں دخل اندازی نہیں' کا نعرہ غلط اور نامعقول ہے۔

اس نعرے کے خطرناک نتیجوں کی ایک مثال ہمارے سامنے تب آئی جب دلی کے تمام پولیس ورکروں نے اچانک ہڑتال کر دی۔ اور ہوم منسٹر صاحب کی کوٹھی پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ بالکل دوسرے مزدوروں کی طرح۔ اگر سرکار یہاں بھی اس نعرے پر عمل کرتی تو لوگوں کے جان و مال کا کیا حال ہوتا۔ آخر پولیس والوں کا بھی مزدور مالک جھگڑا تھا یعنی تنخواہ وغیرہ بڑھوانے کا۔ پھر کیوں دوسری پولیس بلا کر سرکار نے دست اندازی کی؟ ظاہر ہے کہ اصول ہی غلط ہے۔ کیا کیرل، پنجاب یا مغربی بنگال کی سرکاریں اپنے صوبوں میں پولیس کی ہڑتال ہونے پر دوسری پولیس یا فوج کی مدد نہیں لیں گی؟

دلی پولیس کی ہڑتال کا کم از کم اتنا فائدہ ہوا کہ مرکزی اور مقامی افسروں کو یہ پتہ چل گیا کہ مزدور تحریکوں میں منتظمین کی کیا درگت ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہو گیا ہوگا کہ اگر پولیس میں ڈسپلن کی ضرورت ہے تو مزدور تحریکوں میں بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔

پھر آج مغربی بنگال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ اس کا مقصد اس صوبے کے انتظامی و صنعتی ڈھانچے کو اس حد تک درہم برہم کر دینا ہے کہ مستقبل کی کسی حکومت کے لئے بھی اس کی صورت حال کو سنبھالنا ممکن ہی نہ رہے۔ اس معاملے میں مرکز کی کوئی ذمہ داری ہے؟

ہری ونش

صدرِ جمہوریہ

جو آئین کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلاتا ہے، جو پوری فوج کا سپریم کمانڈر ہے اور جسے وزیرِ اعظم مقرر کرتا ہے۔ مگر حقیقت کیا ہے؟

راجیندر پرشاد دو بار ملک کے راشٹرپتی
...ٹر چنے گئے اور پچھلے پانچ برسوں سے
...ڈاکٹر رادھا کرشنن اس عہدے پر فائز تھے لیکن
...پتی کے عہدے کے بارے میں جتنی عوامی
...اس بار ہوئی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔
...مرکز اور اسٹیٹوں میں حکومت صرف کانگریس
...تھی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی جو فیصلہ
...کی وہ سارے ملک میں لاگو سمجھا جاتا تھا۔
...ت نہیں رہی۔ کئی صوبوں میں غیر کانگریسی
...قائم ہوئی ہیں اور مرکز میں بھی کانگریس کی
...اکثریت نہیں رہی۔ اس بار کے صدارتی
...میں ڈاکٹر ذاکر حسین راشٹرپتی چن لئے گئے۔
...وں میں ایک خیال زور پکڑتا جا رہا ہے
...شٹرپتی، اُپ راشٹرپتی اور گورنر وغیرہ ایسے
...ے چاہئیں جو صحیح معنوں میں پارٹی پالیٹکس
...تر رہ کر کام کر سکیں

...پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بھارت کے
...کا چناؤ کس طرح ہوتا ہے:
...۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ملک میں جو آئین نافذ ہوا
...کے مطابق آج ساری حکومت چل رہی ہے۔
...دفعہ ۵۲ کے مطابق یہ انتظام کیا گیا کہ

بھارت یونین کی ساری طاقت راشٹرپتی کے ہاتھ میں ہوگی اور وہ اس طاقت کا استعمال یا تو خود کرے گا یا اپنے ماتحت افسروں کے ذریعہ کرائے گا۔ دفعہ ۵۳ میں کہا گیا ہے کہ فوجوں کا سپریم کمانڈر بھی راشٹرپتی ہوگا اور اِن اختیارات کا استعمال آئین کے مطابق کرے گا۔ دفعہ ۵۸ کے مطابق راشٹرپتی کے عہدے کے لئے نیچے دی گئی قابلیتوں والا آدمی ہی امیدوار ہو سکتا ہے

۱۔ وہ بھارت کا شہری ہو۔
۲۔ وہ ۳۵ سال کا ہو۔
۳۔ وہ لوک سبھا کا ممبر چنے جانے کی قابلیت رکھتا ہو
۴۔ وہ کسی فائدے کے سرکاری عہدے پر فائز نہ ہو۔

دفعہ ۵۴ اور ۵۵ کے مطابق بھارت کے راشٹرپتی کا الیکشن ایک انتخابی حلقے کے ذریعے ہوتا ہے۔ جس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبران اور اسٹیٹوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے چنے ہوئے ممبران ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے نامزد ممبران اور قانون ساز اسمبلیوں کے نامزد ممبر اس الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے۔ یہ الیکشن ایک خاص طرح کے طریقے

ہوتا ہے۔ اس طریقے کو انگریزی میں شکل
سفریبل ووٹ سسٹم کہا جاتا ہے یعنی واحد قابل
تال ووٹ سسٹم۔ اسمیں میں ووٹیں خفیہ پرچی کے
یعہ ڈالی جاتی ہیں اور سب ہی صوبوں کو برابر کی
ندگی دی جاتی ہے پارلیمنٹ اور مختلف اسٹیٹوں کی قانون
ز اسمبلیوں کو برابر نمائندگی دی جاتی ہے۔ ہر
ٹیٹ کی قانون ساز اسمبلی کے ہر ممبر کو کتنے ووٹ
ینے کا حق ہوگا، یہ پتہ لگانے کے لئے اسٹیٹ کی
ں آبادی کو وہاں کی قانون ساز اسمبلی کے کُل چُنے
وئے ممبروں کی تعداد سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔
پھر حاصلِ تقسیم کو ۱۰۰۰ سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

آخری مردم شماری کے مطابق اترپردیش کی آبادی ۷،۳۷،۴۶،۴۰۱ ہے۔ اور وہاں قانون ساز اسمبلی کے چُنے ہوئے کل ممبروں کی گنتی ۴۲۵ ہے۔ اس طرح یو۔پی کے ہر ممبر کے ووٹوں کی تعداد ۱۷۴ ہوگی۔ جموں اور کشمیر صوبے کی آبادی ۴۳،۱۰،۰۰۰ ہے۔ قانون ساز اسمبلی کے ممبروں کی گنتی ۷۵ ہے اس لئے وہاں کے ہر ممبر کے ووٹوں کی تعداد ۵۹ ہوگی۔ اس طرح سترہ اسٹیٹوں کے ووٹوں کی کل تعداد اس بار کے الیکشن میں ۴،۳۰،۸۵۱ تھی۔ جس کی اسٹیٹ وارانہ تفصیل اس طرح ہے:

نام اسٹیٹ	قانون ساز اسمبلی کے ممبروں کی تعداد	ہر ممبر کے ووٹ
آندھرا پردیش	۲۸۷	۱۲۵
آسام	۱۲۶	۹۴
بہار	۳۱۸	۱۴۶
گجرات	۱۶۸	۱۲۳
ہریانہ	۸۱	۹۴
جموں اور کشمیر	۷۵	۵۹
کیرالہ	۱۳۳	۱۲۷
مدھیہ پردیش	۲۹۶	۱۰۹
مدراس	۲۳۴	۱۴۳
مہاراشٹر	۲۷۰	۱۳۶
میسور	۲۱۶	۱۰۹
ناگالینڈ	۴۶	۸
اڑیسہ	۱۴۰	۱۲۵
پنجاب	۱۰۴	۱۰۷
راجستھان	۱۸۴	۱۱۰
اترپردیش	۴۲۵	۱۷۴
مغربی بنگال	۲۸۰	۱۲۵

اسٹیٹوں اور بھارت یونین میں مساوات رہے، اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ہر ممبر کے ووٹ نکالنے کے لئے دونوں ایوانوں کے چُنے ہوئے ممبروں کی کل تعداد سے قانون ساز اسمبلیوں کے سارے ووٹوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جو جواب آتا ہے اس کو ۱۰۰۰ سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ کے چُنے ہوئے ممبر ۷۴۸ ہیں۔ ۵۲۰ لوک سبھا کے اور ۲۲۸ راجیہ سبھا کے۔ اس حساب سے اس دفعہ کے الیکشن میں پارلیمنٹ کے ہر ممبر کے ووٹوں کی تعداد ۵۷۶ تھی۔

راشٹرپتی کے الیکشن کا طریقہ بہت ہی مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر اسٹیٹ کو اس کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دی جاتی ہے تاکہ چھوٹے چھوٹے اسٹیٹ راشٹرپتی کے الیکشن میں فیصلہ کن حصہ لیں۔ سارے ملک کو یک جہتی کے رشتے میں باندھنے کے لئے پارلیمنٹ کے ممبروں کو اسٹیٹوں کے کل ووٹوں کی تعداد جتنے ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتے تو بڑے بڑے اسٹیٹ کسی کو بھی اپنی مرضی سے راشٹرپتی چُن لیتے اور چھوٹے اسٹیٹوں کی رتی بھر بھی پرواہ نہ کرتے۔ اُپ راشٹرپتی کے الیکشن کا طریقہ بھی راشٹرپتی الیکشن جیسا ہی ہے مگر اسے پارلیمنٹ کے دونوں

شکل ٹرانسفریبل ووٹ سسٹم سے چنتے ہیں۔ اس
ہں اسٹیٹوں کی اسمبلیوں کے ممبر حصہ نہیں لیتے۔

راشٹرپتی کے عہدے کی میعاد پانچ سال ہے۔
اُسے دوسری بار پانچ سالوں کے لئے بھی چُنا
اسکتا ہے۔ تیسری بار چنے جانے پر کوئی رکاوٹ
بندش نہیں ہے مگر عموماً ایسا کیا نہیں جاتا۔

اشٹرپتی کو ہر ماہ دس ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے۔
س کے علاوہ غیر ملکی مہمانوں کے لئے کار اور سفر
ؤنس اور بنا کرایہ رہائش کی سہولت ملتی ہے۔
۔ ۱۹۶۶ء کے سال میں ۶٫۶۴٫۰۰۰ روپے بھتے
شکل میں راشٹرپتی کو دیئے گئے۔

راشٹرپتی کے اختیارات اور حقوق کے بارے میں

مرحوم ڈاکٹر راجیندر پرشاد
اپنی زندگی کے دوران سوال اٹھایا تھا۔ ۲۸ر نومبر
۱ء کو قانون ایسوسی ایشن کا سنگِ بنیاد رکھتے
ئے انہوں نے کہا تھا "آئین میں ایسی کوئی پابندی
ہے جس کی رو سے راشٹرپتی کو اپنی وزارت
سفارشر۔ کے مطابق کام کرنا پڑے۔"

ڈاکٹر رادھاکرشنن بھی بڑی آزادی سے کئی بار
خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اس سال یومِ جمہوریہ
ل شام کو انہوں نے اپنی براڈکاسٹ تقریر میں جو
کہا تھا اسے مخالف پارٹی کا کوئی بھی ممبر پسند
نا ہے۔ جس وقت ملک میں کانگریسی حکومت کی
ت اکثریت چل رہی تھی۔ اس وقت بھی
، کے حقوق کی نگرانی کے لئے راشٹرپتی کی
ہی نظر جاتی تھی۔ آج جب کہ کانگریسی اکثریت
حد تک کم ہو گئی ہے راشٹرپتی کے عہدے
بزرگ کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔
کی سیاست دانوں نے اس عہدے کی
ارٹی پالیٹکس کے نظریے سے دیکھا تو یہ ملک
تہ غیر انصافی ہوگی۔

آئین کی دفعہ (۱) ۷۴ خاص معنی رکھتی ہے۔
ں کہا گیا ہے: "راشٹرپتی کو اپنے فرائض کی
ادائیگی میں تعاون دینے کے لئے وزیروں کی ایک
کونسل ہوگی جس کا سربراہ پردھان منتری ہوگا۔"

دفعہ (۱) ۷۵ میں کہا گیا ہے: "پردھان منتری
کو راشٹرپتی نامزد کرے گا اور دوسرے وزیروں کو
پردھان منتری کی سفارش پر نامزد کرے گا۔" ان
دفعات میں شکوک کو رفع کرنے کے لئے آئین ساز
اسمبلی میں ہوئی بحثوں کا ذکر کرنا لازمی ہے۔ جولائی ۱۹۴۷ء
کو آئین ساز اسمبلی میں ملک کے لئے پارلیمانی نظام منظور
کر لیا گیا اور بھارت کے لئے برطانیہ کے طرز پر
آئین بنانے کی منظوری دی گئی۔ قانونی صلاح کار
سر بی۔ این راؤ کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ راشٹرپتی کو
اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کا حق دیا جائے۔

۲۱ر جولائی ۱۹۴۷ء کو بھی شری جواہر لال نہرو
نے فیڈرل آئین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار
کرتے ہوئے کہا تھا "ہم پارلیمانی نظام کو اپنانا
چاہتے ہیں اس لئے سبھی حقوق اور اختیارات
وزارت کے پاس رہیں گے لیکن ہم یہ بھی نہیں
چاہتے کہ راشٹرپتی کو کوئی اختیار ہی نہ ہو۔ ہمارے
راشٹرپتی کی فرانس کے پریذیڈنٹ جیسی پوزیشن
نہیں ہے۔ اگرچہ ہم نے انہیں اختیار نہیں دیئے لیکن
ہم نے ان کے عہدے کو پُر حقوق اور پُر وقار جگہ دی
ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہیں امریکہ کی طرح حفاظتی
فوجوں کا سپریم کمانڈر بھی بنایا گیا ہے۔"

اِس طرح جو اصول بنائے گئے ان کی بنیاد پر
ہی آئین کی مسودہ ساز کمیٹی نے ڈاکٹر
بھیم راؤ امبیڈکر کی رہنمائی میں آئین کا مسودہ تیار
کیا۔ اس مسودے کو ۴ر نومبر ۱۹۴۸ء کو آئین ساز
اسمبلی کے سامنے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیدکر نے
کہا "آئین کا جو مسودہ تیار کیا گیا ہے اس کے
مطابق ہمارے راشٹرپتی کو وہی درجہ حاصل ہے
جو برطانیہ کے آئین میں بادشاہ کو حاصل ہے۔ وہ
حکومت کا سربراہ تو ہے لیکن وہ مجلسِ انتظامیہ کا
سربراہ نہیں۔ وہ ملک کا نمائندہ تو ہے لیکن قوم

کا حاکم نہیں۔ عموماً اسے سبھی کام وزارت کے مشورے سے کرنے ہوں گے۔ وزارت کے مشورے کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکے گا۔"

اس موقع پر ایک ممبر نے سوال کیا "اگر کسی معاملے میں راشٹرپتی اپنی وزارت کا مشورہ نہیں مانتا تو کیا آئین کی خلاف ورزی ہوگی اور کیا اس کے لئے راشٹرپتی پر فرد جرم لگانا پڑے گی؟"

اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا "جی ہاں، اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں۔"

انہوں نے یہ بھی کہا "پارلیمانی طرزِ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اُسے دو بہت بڑے اختیارات حاصل ہیں — پردھان منتری کی نامزدگی اور پارلیمنٹ کا خاتمہ۔"

اس بارے میں مسٹر گرانیول اسٹن نے ایک شائع شدہ کتاب "بھارتی آئین" میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ راشٹرپتی ڈاکٹر راجیندر پرشاد کئی بار سمجھ لیتے تھے کہ انہیں بہت زیادہ حقوق حاصل ہیں حالاں کہ آئین کے مطابق انہیں وہ اختیارات حاصل نہیں تھے۔ ایک بار ۱۸ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو انہوں نے جواہر لال نہرو کو ایک نوٹ بھیجا جس میں یہ خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ بلوں کی منظوری دیتے وقت اپنے آزادانہ فیصلے سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ عارضی پارلیمنٹ ہندو کوڈ بل پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت نہرو نے بلا تامل یہ نوٹ شری کرشنماچاری اور شری سیتلواڈ کو بھیج کر اس بارے میں رائے مانگی۔

شری سیتلواڈ نے ۲۴ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو لکھا "ہمارے آئین کی دفعہ (۱) ۷۴ بہت صاف ہے۔ راشٹرپتی کو اپنی وزارت کے مشورے پر ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔" شری کرشنماچاری نے ۲ر ستمبر اور ۸ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اس بارے میں خط لکھے۔ دونوں خطوں میں انہوں نے صاف کہا کہ راشٹرپتی کے لئے اپنی وزارت کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔ شری اسٹن کا یہ بھی کہنا ہے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اس طرح کے خیالات کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔

سپریم کورٹ نے بھی اس بارے میں ایک فیصلے میں کہا "یونین کے انتظامیہ اختیارات راشٹرپتی کے پاس ہیں۔ لیکن دفعہ ۷۴ کے مطابق راشٹرپتی کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے وزیروں کی کونسل ہوگی جس کا سربراہ پردھان منتری ہوگا۔"

اس طرح راشٹرپتی رسم اور آئین کے مطابق سربراہ تو ہے لیکن انتظامیہ اختیارات و حقوق صرف وزیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ غرض بھارت کے راشٹرپتی کو وہ اختیارات حاصل نہیں ہیں جو امریکہ کے پریذیڈنٹ کو حاصل ہیں۔ امریکہ کا پریذیڈنٹ قوم کا لیڈر ہونے کے علاوہ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر بھی ہوتا ہے۔ اور اُسے پارٹی پروگرام کو عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ بھارت کا راشٹرپتی سیاسی گروہ بندی سے بالاتر رہتا ہے۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ راشٹرپتی اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے کام لے سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "دفعہ (۲) ۷۴ میں کہا گیا ہے کہ کیا وزیروں نے راشٹرپتی کو مشورہ دیا اور اگر دیا تو کیا مشورہ دیا؟ اس سوال کی کسی عدالت میں پڑتال نہیں کی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ راشٹرپتی کے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے راستے میں کوئی آئینی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہمارے آئین میں یہ بھی کہیں نہیں لکھا ملتا کہ راشٹرپتی وزارت کے کسی فیصلے کو رد نہیں کر سکتا۔ آئرلینڈ کے آئین کی طرح ہمارے آئین میں کوئی صاف دفعہ نہیں ہے کہ راشٹرپتی کو ہر معاملے میں وزارت کے مشورے کا پابند رہنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ ہمارے آئین میں کچھ ہدایتی اصول دیئے گئے ہیں۔ اگر کسی بل کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوان پاس کر دیتے ہیں اور راشٹرپتی کے مطابق وہ بل ان ہدایتی اصولوں کو توڑتا ہے تو کیا تب بھی راشٹرپتی کو اس بل کی منظوری دے دینی چاہئے؟"

یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ایسی حالت میں



بھارت کے دوسرے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کئی بار آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہو سکتی ہے جب کہ کسی بھی پارٹی کی اکثریت نہ رہے اور کوئی پائیدار لیڈر شپ دکھائی نہ دے۔ ایسی حالت میں راشٹرپتی کی فوقیت ہی فیصلہ کن اور مسلّم سمجھی جائے گی۔ اسی طرح جو پردھان منتری نامزد ہوگا وہ بہت حد تک راشٹرپتی کے سہارے ہی ہوگا اور اس طرح بالواسطہ طور پر ساری حکومت راشٹرپتی کے ہی ہاتھ میں رہے گی جب کہ براہِ راست وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ایسا وقت بھی پڑ سکتا ہے کہ پردھان منتری اپنے کام میں ناکامیاب ہو جاتا ہے تو ایسی حالت میں راشٹرپتی ہی ساری کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ فوجوں کو سول اختیارات بھی سونپنے پڑتے ہیں۔ قحط زدگان کی مدد اور پُر تشدد گڑبڑ کو روکنے کے لئے ایسے قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس وقت مسلح فوجوں کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے ساری سیاسی طاقت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ کچھ سیاست سازوں اور فوجی افسروں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ جائے گا۔

راشٹرپتی کے اپنے اختیارات کی بنیاد وزارت سے بہت زیادہ وسیع ہوتی ہے۔

وزارت میں چنے گئے نمائندے ہی ہوتے ہیں جو صرف لوک سبھا کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ لیکن راشٹرپتی نہ صرف پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے بلکہ اسٹیٹوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے سامنے بھی جواب دہ ہوتا ہے۔ دفعہ ۷۸ کے مطابق پردھان منتری کا یہ فرض ہے کہ وہ وزارت کے سبھی فیصلے راشٹرپتی کی جانکاری میں لائے۔ یونین کے انتظامیہ معاملوں اور آئین کے بارے میں راشٹرپتی کو اپنی جانکاری دینی ہوتی ہے۔ آئین کے مطابق جو اختیارات راشٹرپتی کو حاصل ہیں انہیں دوسرے ہاتھوں میں نہیں سونپا جا سکتا۔

ہمارے ملک میں کچھ دنوں سے یہ رجحان زور پکڑ رہا ہے کہ وزارت کو زیادہ سے زیادہ اختیارات اور ذمہ داریاں سونپ دی جائیں۔ اس سے بات اُلٹی ہو جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ پارلیمنٹ وزارت پر اپنا کنٹرول رکھے۔ مگر ہو یہ جاتا ہے کہ وزارت کا پارلیمنٹ پر کنٹرول ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لئے تو ہمارے آئین سازوں نے پردھان منتری اور دوسرے وزیروں کو نامزد کرنے کا اختیار راشٹرپتی کو دیا۔ اگر

ظامیہ اور قانون سازی کے اختیارات ایک جگہ پر ،جائیں تو نتیجہ خطرناک ہوگا۔ جن ملکوں میں نظام ،امت ہے وہاں آئین میں خاص دفعوں کے ذریعہ اف طور پر بتایا گیا ہے کہ وزارت کا سربراہ کیسے ہ کیسے بنایا جاتا ہے۔ ہمارا آئین اس معاملے ں خاموش ہے۔ یہاں اس ڈھنگ کی کوئی نہ نہیں ہے کہ کیسے اور کیسے وزارت کا سربراہ مزد کیا جائے گا۔

جمہوریہ فرانس کے آئین میں صاف لفظوں ںکھا ہے کہ وزیروں کی کونسل کا سربراہ تب تک مزد نہیں کیا جائے گا جب تک اُسے نیشنل اسمبلی ں پورا تعاون اور نمائندوں کی پوری اکثریت کی مایت حاصل نہ ہو۔ برما کے آئین میں بھی وزیر اعظم ں نامزدگی کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے ام لیا گیا ہے۔ ہمارے آئین میں ایسا کوئی صاف عدہ نہیں ہے۔ اِس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے ۔ ایسی حالت میں راشٹرپتی کیا کرے گا جب کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوگی۔ ایسی حالت میں اشٹرپتی اس آدمی کو نامزد کرے گا جسے دوسری ارٹی یا پارٹیوں کو ساتھ ملاکر اکثریت حاصل کرنے کا قین ہو۔ ہوسکتا ہے کہ راشٹرپتی کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ وزیروں کی کونسل کو اجتماعی طور پر توڑ سکے۔ لیکن کسی وزیر کو انفرادی طور پر عہدے سے ہٹانے کا اختیار اُسے حاصل ہے۔ راشٹرپتی کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ کسی بدعنوان وزیر کو وزارت سے الگ کردے خواہ اکثریت اس کے ساتھ ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک وزیروں کو برطرف کرنے کا سوال ہے راشٹرپتی کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

اِن سبھی حالات پر غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ راشٹرپتی سرکار کا رسمی سربراہ ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ہر حالت میں برسراقتدار پارٹی کے ذریعہ ہی نامزد کیا ہوا ہو۔ آئین کے مطابق وہ ایک پُراثر وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ملک و قوم کے مفاد پر بد اثر ڈالنے والے اہم معاملوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ آج تک عوام نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ اِس کا فائدہ برسراقتدار پارٹی نے اُٹھایا ہے۔ آج جب کہ حالات بہت بدل چکے ہیں۔ ہمیں اس بات کی مخالفت کرنی ہی ہوگی کہ راشٹرپتی صرف رسمی سربراہ ہو۔ راشٹرپتی کا ذاتی اثر اور شخصیت بھی اس جانب بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ تین اختیار تو اُسے ہر وقت حاصل ہیں: حوصلہ بڑھانے کا اختیار۔ مشورہ دینے کا اختیار۔ اور وارننگ دینے کا اختیار۔ اگر راشٹرپتی یا کسی بھی ملک کے قومی سربراہ کی شخصیت پُراثر ہے تو وہ سبھی کچھ کر اِن تین اختیارات کے دائرے میں کرسکتا ہے۔

آخر میں یہ بتانا نہایت ضروری ہے کہ اگر راشٹرپتی کسی حالت میں آئین کو توڑتا ہے تو آئین کی دفعہ ۶۱ کے مطابق پارلیمنٹ کے کسی ایوان میں اس پر الزام لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ۱۴ دن پہلے لکھ کر اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر اُس ایوان کے ایک چوتھائی ممبروں کے دستخط ہوں۔ اگر ایک ایوان میں اس طرح کی تجویز دو تہائی اکثریت سے پاس ہوجاتی ہے تو دوسرا ایوان اس الزام کی جانچ پڑتال کرے گا۔ ایسی حالت میں راشٹرپتی کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں حاضر ہوکر اپنی صفائی پیش کرے۔ اگر وہاں بھی وہ قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے تو اُسے عہدے سے الگ کردیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے راشٹرپتی کا عہدہ خالی ہوجائے تو چھ مہینوں کے اندر یا اس مہلت کے پورا ہونے سے پہلے ہی نئے راشٹرپتی کو چُنا جانا ضروری ہے۔

راشٹرپتی کسی کو بھی دی گئی سزائے موت معاف کرسکتا ہے۔ لیکن کورٹ مارشل اور فوج کے مجرموں پر یہ رعایت لاگو نہیں ہوتی۔ وہ کسی ملک کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کرسکتا۔ یہ کام صرف پارلیمنٹ کا ہے۔



جو میزبان کے لئے بلائے جان ثابت ہوئے

تمام دنیا کے بحری سوداگروں کی سرائے کالی کٹ۔

مالابار کے ساحل پر عظیم الشان ہندوستانی شہر۔ مرغ کی اذان جہاں تک سنائی دیتی ہے اتنے ہی فاصلے تک شہر کی حدود ہے۔ شہر کے پس منظر میں فلک بوس مغربی گھاٹ کے پہاڑ، اُونچا کا پہاڑی اور سنگلاخ زمین کے اس سرحدی شہر کی آمدورفت کا واحد راستہ سمندر ہے۔ طوفانی اور اتھاہ بحیرہ عرب کالی کٹ کے پاس آکر پرسکون ہوگیا ہے۔

جغرافیائی اور ساحلی بناوٹ کے سبب ری جہازوں کے لنگرانداز ہونے سے متعلق س بندرگاہ کی ماہیت کے بارے میں یا بھر کے جہازی مطمئن تھے۔ چین، پیگو، لاکا، اوبچ، مصر، مومباسا، موزمبیق ملکوں ے بحری جہاز اپنا سامان لادکر یہاں آکر گرانداز ہوتے اور تجارت کرتے تھے۔

بحری سوداگروں کو اپنا سودا سلف رخت کرنے اور دیگر مال خریدنے میں ہولت و آسانی یہاں دستیاب ہوتی تھی سری کسی بندرگاہ پر مہیا نہیں تھی فروخت ہ مال کے روپے کا فقط چالیسواں حصہ سرکاری ٹیکس کی صورت میں جمورین کے کارندے وصول کرتے تھے۔ غیر فروخت شدہ مال پر کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ بندرگاہ پر چہل پہل ختم ہوچکی تھی۔ بنیئے، بقال، منشی، محرر، قلی، کباڑی سب اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہوکر بندرگاہ سے چلے گئے تھے۔ سمندر کے کنارے مختلف ملکوں کے سوداگر پختہ چبوترے پر کھڑے مصروفِ گفتگو تھے۔

اِن سوداگروں کے قدوقامت، خدوخال، جسمانی رنگت، زبان اور اندازِ گفتگو سب ہی مختلف تھے، لیکن خرید و فروخت اور لین دین میں استعمال ہونے والی زبان سب کی ایک تھی۔ زرد رنگ کے چینی، تانبے جیسی رنگت کے سیلونی، ملایا اور سیام کے باشندے، سیاہ فام موٹر حبشی اور سرخ رنگ کے ایرانی۔ رنگ برنگے لوگ شام کے رنگین ماحول میں تجارت کے خشک کام سے فراغت پاکر زندہ دلی سے قہقہے لگا رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے شنگھائی کے مینگ پاؤ نے سرخ آنکھوں والے آبنوسی چہرے کے موٹر تاجر کریم سے ہنستے ہوئے کہا "تم نے ریشم کی کافی آج بہت ہی

بیٹھے والوں میں مارلی مچھ سے۔ نہ معلوم مجھے کیا ہوگیا تھا کہ اِن سونے کے چند سِکّوں کے عوض اتنی بیش قیمت چیز دینے کو تیار ہوگیا۔

کریم کی کُند اور شفّاف بتیسی آبنوسی چہرے پر کِھل اُٹھی۔ اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا "کیا چین میں اب سونے کی قیمت کم ہوگئی ہے؟"

اِس جملے پر سب ہی تاجروں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ ساحل کے گوداموں میں بنے جھروکوں میں رہنے والے ہزاروں کبوتر اِس آواز سے چونک کر آسمان میں اُڑ گئے۔

گوڑ ریاست کے پتلی مونچھوں والے سوداگر لکشمن نے دُبلے پتلے پست قد ملیائی سارتھواہ سے مہین ململ کے عوض چندن کی لکڑی لے لی تھی۔ برما سے ہاتھی دانت لانے والے تنومند برمی تاجر آنگ سین نے کہا "کیا یہ سارا چندن گِھس کر تم ماتھے پر ہی لگا لیتے ہو لکشمن؟"

اس کا اشارہ گوڑ ریاست کے نوجوان کے ماتھے پر لگے چندن کے ٹیکے کی طرف تھا۔ لکشمن نے ہنستے ہوئے اپنے گلے سے لٹکتا موتیوں کا لمبا ہار دکھا کر کہا "ابھی تو ویراپلی سے اِس کے لائے ہوئے موتیوں کا سودا بھی تو کرنا ہے۔"

گھر پہنچ کر ایک دُوسرے کی خوشبو کا لطف اُٹھائیں گے۔" سب لوگ اِس مذاق پر ڈھیر سے ہنس دیے۔

سُورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ دوپہر کی چلچلاتی دُھوپ میں شام کی ٹھنڈک آگئی تھی۔ ناریل کے جھنڈوں اور بڑے بڑے برگد کے پیڑوں سے چھن کر آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا فرحت بخش رہی تھی۔ مغرب کی نماز ادا کرنے جا رہے اسمٰعیل نے کہا "بھائی، اجازت دو، ہم تو نماز ادا کرنے چلے۔"

وجے نے کہا "ابھی کیا جلدی ہے، شام کو مجھے بھی تو نارائن مندر کی آرتی میں شامل ہونا ہے۔"

پتہ نہیں کیسے انجانے ہی اسمٰعیل کے منہ سے نِکل پڑا "تم بُت پرستوں کا کیا، جب چاہو سجدہ کرلو، اپنے مذہب میں تو..."

اس کی بات ابھی ختم نہیں ہو پائی تھی کہ کریم کی کڑک دار آواز سے سب کانپ اُٹھے "خبردار، جو دُوسروں کے مذہب



کے بارے میں کوئی ایسا ویسا لفظ کہا۔"

اسمٰعیل سہم گیا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کریم نے آہستہ سے کہا "اگر بندرگاہ کا اعلیٰ آڑھتی خواجہ قاسم یہ سُن لیتا تو تمہاری شامت آجاتی۔" پھر آواز کو قدرے تیز کرکے تقریر کے انداز میں وہاں موجود سوداگروں کو مخاطب کرتے ہوئے

ویراپلی لنکا کا مشہور موتیوں کا تاجر تھا۔ مگدھ کے تاجر تارکیشور نے اپنی لائی ہوئی کستوری کے عوض جنوب کے تاجر چیٹی سے اگربتی اور کافور کا سودا کیا تھا۔ اُس نے کہا "اور دیکھیے نا ہم خوشبودار چیز کے بدلے خوشبودار چیز کی تجارت کرتے ہیں۔ میں اور چیٹی دونوں اپنے



[illegible]

بولا "راجہ جمہورین ہندو ہے، لیکن کالی کٹ میں غیر ملکی مسلمانوں کی آبادی دیکھو۔ ان کی عبادت کے لیے دو مسجدیں بنی ہیں۔ شہر میں ہر ایک کو اپنے اپنے عقیدے اور مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی پوری آزادی ہے لیکن ..."

اس کی بات کو درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے لکشمن نے کہا "لیکن اس مذہب اور عقیدے سے متعلق گفتگو، بحث و مباحثہ، دنگہ فساد قطعی ممنوع ہے، جرم ہے۔"

اسمٰعیل نے مجرموں جیسا چہرہ بنائے وجے سے مخاطب ہو کر کہا "بھائی، میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ کے ...."

وجہ سے نے کا اسس کا بڑھا ہوا ہا تھ بڑ لیا اور دونوں بغلگیر ہو گئے۔

جب اِسس قسم کے بین الاقوامی پیار و بحبت کے رشتے کا منظر شام کے غروب ہوتے سورج کی روشنی میں پر تقدس لگ رہا تھا کہ موپلے اُدھر آیا۔

اسس کا بد حواس چہرہ دیکھ کر سب ہی لوگ ایک ساتھ چونک پڑے۔ اُس کے مُنہ سے "سفید کُتے" جیسا کوئی لفظ نکلا اور وہ بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ سب لوگ تجسس اور اشتیاق سے اُسے گھیر کر قسم قسم کے سوال پُوچھنے لگے مگر لگا تار دوڑتے رہنے کے سبب اُسس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے اُسس نے سب کو کچھ دیر رُکنے کا اشارہ کیا۔ مغرب کی نماز ادا کرنے والے اور شام کو آرتی میں شامل ہونے والے کسی کو بھی مسجد یا مندر جانے کا ہوش نہ رہا۔ سبھی اس نووارد سے اسس کی داستان سُننے کے لئے بے قرار ہو گئے۔

موپلے نے جو کچھ بھی ٹوٹے پھُوٹے الفاظ میں کہا اسس کا مفہوم یہ تھا کہ دو جہازوں نے کپا کٹاؤ کے سامنے آکر لنگر ڈال دیئے ہیں۔ اِن میں عجیب و غریب شکل کے سفید چمڑی کے لوگ ہیں۔ ان جہازوں میں بہت سی توپیں لگی ہوئی ہیں۔ کپا کٹاؤ کالی کٹ سے پانچ میل کے فاصلے پر ساحل پر بسا ہُوا تھا۔

سب تاجروں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ خاص طور سے مُور تاجران بہت خفا نظر آ رہے تھے۔ مُور تاجران گورے سمندری ڈاکوؤں، اِن کی حرص و لالچ، اِن کی بے رحم خصلت اور طاقت سے پیشتر ہی واقف تھے۔ ان سے ان کی پہلے ہی سمندر میں کئی بار مُٹھ بھیڑ ہو چکی تھی۔ افریقہ کے ساحلی علاقوں پر ان کی یلغار ہونے لگی تھی۔ وہ فکر مند تھے، بھارت کا ساحل ان گورے ڈاکوؤں کے ناپاک چنگل سے ابھی تک بچا ہوا تھا، اب خُدا ہی حافظ ہے!

شمالی سمت میں آنکھیں بچھائے سب ہی سوداگر دل تھامے بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔ کچھ لوگ اِن گوروں کا انتظار اشتیاق سے کر رہے تھے تو کچھ لوگ خصوصًا مُور سوداگر نفرت و خوف سے۔ کچھ لوگ جوش میں آکر ان نوواردوں کے مظالم اور حرص و ہوس سے متعلق گفتگو کر رہے تھے اور کچھ سرگوشیوں میں مشغول تھے۔

کچھ دیر بعد شمال میں سطح سمندر پر دو کشتیاں نظر آئیں اور کالی کٹ کی بندرگاہ پر منتظر لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں رُک گئیں۔

اطلاع پاکر بندرگاہ کا اعلیٰ آفیسر خواجہ قاسم بھی اپنے کچھ ملازموں کے ہمراہ آپہنچا تھا۔ سب ہی کی کمر میں دمشقی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ ان تلواروں کو ہی وہ عرومی کہتے تھے۔

اِن کشتیوں کے پیچھے دیوقامت جہاز بھی آتے نظر آئے۔ ان جہازوں کی توپیں کالی کٹ بندرگاہ کا رُخ لینے کی صورت میں اختیار کئے ہوئے تھیں۔

کشتیوں سے گزر کر کئی لوگ کالی کٹ کی سرزمین پر اُتر آئے۔ ان کے لیڈر کا رنگ شاید کبھی گورا رہا ہوگا مگر افریقی سمندر پر آگ برساتے سورج کی تپش اور سمندری ہوا کے سبب اب تانبے جیسا ہو گیا تھا لمبے چوڑے جسم پر زری دار زرد ساٹن کا

انگرکھا، انگرکھے پر چھاتی کے پاس بڑی سی صلیب، کمر سے رانوں تک مخمل کا بنا جانگیا اور رانوں سے نیچے پیر چمڑے کے جوتے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سر پر گول ٹوپی اور اس میں لگا ہوا پر۔ چہرہ نوکیلی داڑھی سے ڈھکا ہوا، آنکھوں میں فاتحانہ مسکراہٹ۔ پُروقار شخصیت۔

شاید اس مسکراہٹ میں خواجہ قاسم کو مکر و فریب کا گمان ہوا۔ شخصیت سے تکبر و غرور۔ ان سے بے حد جو کنا رہنا ہے۔ وہ اپنی عروسی کے دستے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا اور سنجیدگی سے پوچھا "تم لوگ کون ہو؟ یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

داواسنے نامی ایک گجراتی دلال مترجم کی حیثیت سے نوواردوں کے ہمراہ موزمبیق سے آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا "آپ پرتگال کے راجہ ڈان مینوئل کے نمائندے جنرل واسکوڈی گاما ہیں۔ آپ کے بحری بیڑے میں کئی جہاز تھے۔ ان میں سے دو جہاز سمندری طوفان میں بھٹک کر ادھر آ گئے ہیں۔ یہاں وہ بھٹکے ہوئے جہازوں کے لئے قدرے انتظار کریں گے۔"

ایسا ان سے اس غرض کے تحت کہا گیا تھا تاکہ مغربی ملکوں کی تجارت پر تسلط جمائے مؤر تاجر شروع میں ہی اشتعال میں نہ آ جائیں کہ یہ تجارتی مقصد کے حصول سے آئے ہیں۔ حادثے کا شکار اور رحم و ہمدردی کا پیکر بن کر بھیڑیا بھیڑ کی شکل میں سرزمینِ بھارت پر آیا تھا۔

واسکوڈی گاما کا خیال تھا کہ اتر کر راجہ سے شرفِ باریابی حاصل کیا جائے لیکن داواسنے نے یہ مشورہ دیا کہ نیران کے ضامن کو جہاز پر بطور ضمانت رکھے ایسا قدم اٹھانا ڈی گاما کے لئے خالی از خطرہ نہ ہو گا۔

تین روز اسی حالت میں گزر گئے اور اس دوران مچھلی، مرغ اور پھل وغیرہ فروخت کرنے کے لئے بہت سی کشتیاں آ کر جہازوں سے لگیں اور ان کو پرتگالیوں سے منہ مانگے دام ملے، بلکہ دو مانگے پر چار ملے۔ سادہ لوح باشندوں کو بہکانے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا۔ کالی کٹ کے سارے باشندوں میں ان گورے تاجروں کی فراخ دلی کے بارے میں چرچے ہونے لگے اور بات راجہ کے کانوں تک



"ہم نے ان کا آدھا مطالبہ پورا کر دیا ہے — مہنگائی بڑھا دی ہے آگے چل کر الاؤنس بھی بڑھا دیں گے۔"

پہنچی۔ انہوں نے ایک اعلیٰ عہدے دار نائر کو تحقیقات کرنے ڈی گاما کے جہاز پر بھیجا۔ نائر کو وہی فرضی داستان سنائی گئی۔ داوا نے نائر کے ساتھ راجہ کے دربار میں حاضر ہوا اور اس فرضی داستان کو دہرانے کے بعد یہ بتایا کہ پرتگالی کچھ مرچ مصالحے اور دواؤں کی خرید کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ اس نے اپنی طرف سے مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ میلندے کے راجہ کو واسکو ڈی گاما نے کیا کیا بیش بہا چیزیں تحفہ کے طور پر دی ہیں

جموریں رواداراور ایمان دار راجہ تھا۔ اس کی ریاست کے ضابطہ ہائے دستور کو تسلیم کرنے والی ہر قوم کے سوداگروں کے لیے اس کی بندرگاہ کھلی ہوئی تھی۔ اس نے اجازت دے دی کہ مرچ، ادرک، دارچینی وغیرہ جتنی مقدار میں وہ لوگ خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں۔ روائتی طور پر راجہ نے نووارد جہاز کے لیے پھل اور مرغوں کی سوغات بھیجی۔

یہ خبر سنتے ہی مور تاجر طبقے میں کھلبلی مچ گئی۔ چھ سو سال سے ان کا سکہ یہاں جما ہوا تھا۔ قاہرہ اور مکہ سے وہ یہاں آکر آباد ہوگئے تھے اور ان کا بھیجا ہوا سامان قاہرہ، قسطنطنیہ کے راستے سارے یورپ میں فروخت ہوتا تھا۔ اگر فرنگی تاجروں نے یہاں پاؤں جما لیے تو تجارت کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ ساحلی علاقوں دابول سے کوچین تک ہر جگہ جہاں کہیں بھی موروں کی تجارتی بستیاں وجود میں آچکی تھیں، یہ افواہ پھیلائی گئی کہ وہ گورے پرتگالی یہاں تجارت کی نیت سے نہیں آئے ہیں بلکہ ان کے منصوبے کچھ اور ہی ہیں۔ وہ جاسوس



ہیں اور بھارت کے ان حکمرانوں کی طاقت کا سراغ پانے آئے ہیں۔ اگلے سفر میں یہ اپنی فوجی طاقت کے ساتھ حملہ آور ہو جائیں گے اور اس ملک پر قبضہ کرلیں گے۔

خود حفاظتی کے جذبے سے بھری ہوئی ان باتوں میں کتنی دور اندیشی تھی اور کتنی خود غرضی پنہاں تھی، اس کی شاہد تاریخ ہے۔

بہرحال مور تاجروں نے سرگرمی سے راجہ کے اس فیصلے کو تبدیل کرانے کی کوشش کی۔ انہوں نے رشوت کے زور پر بندرگاہ کے اعلیٰ افسران (جو کہ اعلیٰ عہدے دار بھی تھے) راجہ کے قاضی یا وزیر قانون کو ہم خیال بنا لیا۔ طلائی سکوں کے توسط پر انہوں نے افسران کو خرید کر راجہ کے پاس اپنے موقف کی وکالت کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ انہوں نے راجہ کو صلاح دی کہ ان فرنگیوں کے کبھی صلح نامہ یا معاہدے پر دستخط نہ کئے جائیں اور نہ ہی ان کو بندرگاہ پر کوئی آڑھت کھولنے دی جائے۔

کوئی جام کھنکھنایا نہیں...

تمام نغمگی سے تمہارے دم سے تھی — تمہارے بعد کوئی جام کھنکھنایا نہیں
یہ اور بات ہے اُن آنکھوں کا ہوا اثر ورنہ — پئے بغیر کبھی کوئی لڑکھڑایا نہیں
ترس گئی ہے زمیں بادلوں کی صورت کو — کسی ندی نے کوئی گیت گنگنایا نہیں
اُجڑ گیا ہے کسی زلزلے میں شہرِ وفا — نہ جانے پھر اُسے ہم نے بھی کیوں بسایا نہیں
قتیلؔ کیسے کٹیں گے یہ دوپہر غم کے
مرے نصیب میں اُن گیسوؤں کا سایہ نہیں

— قتیلؔ شفائی

لہٰذا دوبارہ جب دلال دادا سے آیا تو راجہ نے بغیر کچھ کہے ہی اُسے رُخصت کر دیا۔

اِس بار داوا نے کو بھیجتے وقت واسکو ڈی گاما نے بڑی عقل مندی کی۔ اس نے اس کے ساتھ جوآ او نیونس نامی ایک پیشہ ور مجرم کو بھیجا۔ دور دراز کے سمندری سفروں میں ایسے ہی پرانے مجرم اور پیشہ ور قسم کے مجرم کام کرنے آتے تھے۔ انہیں بھیجنے میں خاص مقصد تھا۔ یونس عربی اور ایرانی زبانیں بول اور سمجھ لیتا تھا۔ کالی کٹ کے لوگوں میں اِن فرنگیوں کے بارے میں کیا ردِ عمل ہے، اِس سے متعلق صحیح تفصیل حاصل ہو سکتی تھی۔ لہٰذا جہاز سے اُترتے وقت واسکو ڈی گاما نے یونس کو علیحدگی میں لے جا کر کہا "تم پر ہم لوگوں کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ آنکھیں اور کان کھول کر ...ر زبان بند رکھو گے۔ اچھی طرح ...ننا اور ہر بات سُننا مگر کسی سے ...ل نہ کرنا۔ نہ تو ہمت ہارنا اور نہ استقلال کا دامن چھوڑنا۔"

...ن جلالی سکوں کی سازش سے ...کے چاروں طرف ایسی ناکہ بندی اور صف آرائی کر رکھی تھی کہ داوا نے اور یونس نہ تو دن بھر راجہ سے ملاقات کر سکے اور نہ ہی رات کو انہیں جہاز پر لوٹنے دیا گیا رات کو کوتوال کے عملے کے لوگ انہیں سرائے میں لے گئے۔

سرائے میں قسم قسم کے لوگ تھے۔ نیونس اپنے کان کھڑے کر کے سب کچھ سُننے کی کوشش کر رہا تھا۔ بولنے کی ممانعت ہونے پر بھی گفتگو سُنتے ہوئے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نمایاں ہوا ہو تبھی ایک موُر نے آکر دھیرے سے کیسٹیلین زبان میں اُس سے بات کی۔ زبان سُن کر وہ چونکا، لیکن فوراً اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ یہ دوست ہے۔ اس نے نیونس سے کہا کہ اس کا اصلی نام طلیرول پیریر ہے اور وہ سیول کا رہنے والا ہے۔ درحقیقت زندگی بھر عورت کی رفاقت سے دُور رہ کر ادھیڑ عُمر میں ایک خوب صورت عورت سے اس کا عشق ہو گیا تھا اور اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اُس نے مذہبِ اسلام قبول کر کے اس سے شادی کر لی تھی اور اب اس کا نام احمد پرویز تھا۔ نیونس نے جوش

میں آکر پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

تھوڑی دیر بات چیت کے بعد پرویز نے کہا "یہاں کھُل کر کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ تم ہمارے گھر چلو۔"

کوتوال کے محلے سے اجازت لے کر پرویز یونس کو اپنے گھر لے آیا۔ یونس کو یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا تھا کہ سادہ پوشاک والے پرویز کی کتنی بڑی کوٹھی ہے۔

دسترخوان بچھایا گیا۔ ناریل کے ٹکڑوں کے ساتھ بھُنا ہوا گوشت، سرسوں اور گرم مصالحے سے سی ہوئی مچھلیوں کی طشتریاں اور گرم گرم ناں دیکھ کر یونس کا دل کافی فراخ ہوگیا۔ اس نے راحم کے لئے بطور تحفہ لائی ہوئی شراب کی بوتل اپنے تھیلے سے نکال لی۔ پرویز کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ حبشی غلاموں کو اس نے نقل کے کمرے میں مہمان کے لئے بستر لگانے کا حکم دیا اور اس کے بعد انہیں رخصت دے دی تھوڑی دیر بعد اپنی کیسٹیلین زبان میں یونس سے اس نے کہا "کیا تمہاری طبیعت اس پری جمال کو دیکھنے کے لئے مشتاق نہیں ہے جس کی خاطر میں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا؟"

جیل خانے سے نکل کر جہاز کی خشک زندگی میں آنے والے یونس کے لئے عورت کا نام ہی کشش کا باعث تھا۔ تاہم خود کو کافی ضبط میں رکھتے ہوئے اس نے پرویز سے کہا کہ مکاں مالکن کے دیدار حاصل کر کے وہ خود کو خوش قسمت تصور کرے گا۔

پرویز اندر گیا اور بہت دیر بعد بیٹھک میں واپس آیا۔ اس کے پیچھے کالے لبادے میں ایک عورت آئی جس کی محض آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اُس نے آکر اسلامی انداز میں یونس کو آداب کیا۔ لیکن آداب کا جواب دینا بھی یونس بھُول گیا تھا۔ وہ حیرت سے اپنی جوانی کی تمام بھوک آنکھوں میں لئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں آنکھیں چار تھیں مگر زبان پر مہر سکوت تھا پھر اچانک بغیر کچھ بولے وہ پردے کی آڑ میں اندر چلی گئی۔ یونس کے منہ سے ایک مبہم سی آواز نکلی۔ پرویز نے دریافت کیا "کیا کہا؟"

یونس نے گویا اپنے آپ سے ہی کہا "کچھ نہیں۔ بڑے خوش قسمت ہو تم میری طرف سے مبارک باد۔"

کھانا کھاتے ہوئے تھوڑی دیر تک مؤرّ تاجروں کے پرتگالیوں کے تئیں مخالفانہ نظریات اور ان کی سازشوں سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔



قدرت کا نظام

جنگلی چوہے پچیس دن میں جوان ہو جاتے ہیں۔ ہر اکیس دن کے بعد ایک جوڑا دو سے نو تک بچے دیتا ہے۔ اس طرح ایک سال میں دس لاکھ چوہے ہوجاتے ہیں۔ لیکن دوسرے جانور اسی رفتار سے ان چوہوں کو کھا جاتے ہیں۔

دفعتاً اندر کی ڈیوڑھی کی طرف سے دروازے پر دستک ہوئی۔ پرویز اُٹھ کر فوراً اندر چلا گیا۔

واپسی پر اس کے چہرے پر تبسم اور اور مسکراہٹ تھی، بولا "فاطمہ کہتی ہے کہ خبردار اس اجنبی کی کوئی مدد نہ کرنا۔ اس کی امداد کرنا کبھی خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ پھر اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا "میرے بال کریا دھوپ میں سفید ہوئے ہیں۔ مجھے دوست دشمن کی پہچان نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ اطمینان کے ساتھ مرغے کی ایک ٹانگ ذائقے سے چبانے لگا۔

پرتگالی شراب کی بوتل کھل چکی تھی۔ پرویز بہت دنوں کے بعد بہترین شراب کا ذائقہ چکھ رہا تھا۔ باتوں میں لطف آرہا تھا۔ زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔ یونس کی آنکھوں میں فقط دو پیاسی آنکھیں تیر رہی تھیں۔ وہ محتاط تھا۔ اپنے جنرل کے حکم کے مطابق اُسے محتاط رہنا تھا۔ مگر اپنے گھر میں پرویز کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ جام پر جام چڑھا کر نشے کی کیفیت کو متواتر بڑھائے جا رہا تھا۔ ایک بار تو چلنے کی کوشش کرتے ہی اس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ یونس نے اسے سنبھال کر بٹھایا تو اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہا "مجھے میری خوابگاہ تک پہنچا دو۔ غلاموں کو میں چھٹی دے چکا ہوں۔"

یونس کے حامی بھرنے پر اس نے آخری گھونٹ پیا اور اپنے ہوش گنوا کر قالین پر لڑھک گیا۔ اس کی جانب للچائی نظریں ڈال کر قدرے اطمینان و سکون محسوس کرتے ہوئے یونس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے اپنے دوست کے ادھیڑ اور لاغر جسم کو اپنے توانا بازوؤں میں اُٹھا لیا اور پردہ ہٹا کر اندر کی طرف چلا۔ اس ڈیوڑھی میں جہاں پرویز کی خوابگاہ تھی، وہ جگہ یونس کو معلوم نہیں تھی، مگر وہ یہ یقینی طور سے جانتا تھا کہ وہ دو پیاسی نگاہیں اب بھی عالمِ بیداری میں ہوں گی۔

ناریل کے تیل کے چراغ پیتل کے بلند چراغ دانوں پر جگمگا رہے تھے۔ دو قدم آگے بڑھتے ہی فاطمہ مل گئی۔ کالا لبادہ نہ ہونے پر بھی ناک پر نقاب بدستور تھا۔ آبدیدہ آنکھوں میں وہی پیاس جھلک رہی تھی، پتلیاں کچھ کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ کے اشارے پر اس نے اپنے دوست پرویز کو پلنگ پر لٹا دیا۔ نیند ہی میں پرویز کچھ بڑبڑایا اور بالکل خاموش ہو گیا۔

یونس کو ایسا محسوس ہوا کہ فاطمہ نے پرویز کی طرف حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کمرے میں روشن چراغ کو اپنا دامن لہرا کر بجھا دیا۔

پھر سلیس عربی میں ایک سنجیدہ آواز سُنائی دی "آیئے۔"

مبہوت سا نیونس اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں نیونس کے سونے کے لئے بستر بچھایا گیا تھا۔ ناریل کے تیل کا چراغ یہاں بھی روشن تھا۔ اشارے سے نیونس اپنے بستر پر سعادت مند کی طرح جا بیٹھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کٹ پتلی کی طرح کسی کے اشارے سے کیا کر رہا ہے۔ تبھی اُسے بہت ہی نرم لہجے میں سُنائی پڑا "آپ میرے شوہر سے کیا چاہتے ہیں؟ وہ اکیلے آدمی ہیں اور آپ کی مدد کرنے سے وہ تمام مؤر تاجر طبقے کے دُشمن بن جائیں گے؟"

نیونس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ تاہم ہمت کر کے ہنستے ہوئے اس نے کہا "اور آپ نے پرویز کو بُلا کر اس بارے میں آگاہ کر دیا ہے؟"

کاجل سے عاری آنکھوں کو نیونس کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے فاطمہ بولی، "یہ میرا فرض تھا۔ جس نے میری خاطر اپنا مذہب، اپنا معاشرہ، اپنے رشتہ دار سب کو چھوڑ دیا ہو اور جو میرے کہنے کو خدا کا حکم تسلیم کرتا ہو اس کے لئے کیا میں اتنا بھی نہ کروں؟"

نیونس نے کوئی تاثر قبول کئے بغیر ہی کہا "کیا آپ کا فرض یہ نہیں ہے کہ آپ کا شوہر صحیح کام کرے اور معصوم اور بے گناہ غیر ملکیوں کو ان ظالم مؤر لوگوں کے چنگل سے بچائے؟"

فاطمہ کی آنکھیں گویا مسکرانے لگیں "اس سے بہتر سکو تا مدہ ت" اس کی آنکھوں میں کوئی خاموش دعوت تھی جس کی کشش سے کھنچ کر نیونس اپنے بستر سے اُٹھ کر فاطمہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اُس نے اطمینان سے کہا "ہماری مدد کرنے سے ہم پرتگالیوں پر اس کا احسان ہو گا۔ پرویز کو ہم دولت سے مالا مال کر دیں گے۔"

"دولت؟" فاطمہ کی آنکھوں میں گویا طنز اُبھر آیا اور بے اختیار بول پڑی "دولت؟ دولت کی ہمیں کوئی کمی نہیں۔ بولو، اجنبی، سونے کے علاوہ تم اور کیا دے سکتے ہو؟"

نقاب کے بادل میں سے کوندتی ہوئی بجلی نے نیونس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ ایک حوصلہ مندی سے اُس کا تمام جسم لرز سا رہا تھا۔

ذہنی توازن کو برقرار رکھتے ہوئے نیونس نے کہا "پرتگالی شہنشاہ کی نوازش ہو گی تو پرویز کو اعلےٰ رتبہ حاصل ہو گا، ڈان مینوئل کے محل میں اسے عزت و احتشام حاصل ہو گا۔"

اچانک گویا بلوری فانوس جھن جھنا کر گر پڑا۔ فاطمہ کے مسلسل قہقہے پھوٹ پڑے جس میں طنز تھا، شکوہ تھا، دعوت تھی۔ گویا گھٹن بھرے کمرے میں آندھی کے تیز و تُند جھونکے آ گئے تھے، جن سے چراغ بجھ گئے تھے اور باہر کی چاندنی بھی خراماں خراماں جھروکوں کے راستے اندر داخل ہو گئی تھی۔ مولسری اور چمیلی کی خوشبو سے کمرہ بھر گیا تھا۔ باہر کوئی پرندہ چہچہا اُٹھا تھا۔ ماحول میں عجیب سا کیف آور سُرور گھل گیا تھا۔ فاطمہ کی نقاب اُلٹ چکی تھی اور ایک پری چہرہ نمایاں ہو گیا تھا، جو کہ چاندنی کی مدھم روشنی میں پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ نیونس کے بازوؤں کی گرفت میں فاطمہ کا سارا وجود لرز رہا تھا دونوں میں بحیرۂ عرب کا تلاطم رواں تھا

رات پہلو بدل رہی تھی - چاند کہیں ڈوب چکا تھا - مغربی گھاٹ کے جنگلوں میں آسمان سے شبنم گر رہی تھی - کائنات پر سکوت طاری تھا -

اور پرتگالیوں کو اس بے یار و مددگار شہر میں ایک معتمد رفیق مل گیا تھا جو اپنی بیوی کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا -

اس کے بعد پرتگالی نوواردوں اور مُور تاجروں کے زیر اثر سرکاری عہدے داروں میں ایک قسم کی کشمکش شروع ہوئی - کالی کٹ میں آباد مُور تاجر راجہ سے مُلاقات کی راہ میں پرتگالیوں کے سامنے ایک کے بعد دوسری رکاوٹ ڈالتے جا رہے تھے - انہیں دام فریب میں لاکر ہلاک کرنے کے منصوبے باندھے جا رہے تھے - لیکن پرویر کی وجہ سے فرنگیوں کو ساری سازشوں کے بارے میں پیشتر ازیں آگاہی ہو جاتی تھی اور وہ چوکنے اور محتاط ہو جاتے -

راجہ کے بھائی کے بھتیجے اور دو بائروں کو پرتگالیوں نے اپنے جہاز میں اونچے عہدوں پر فائز کر رکھا تھا - قاضی یا منصف کے بھتیجے کی تقرری اور ماسرد کی پرویر کی ہی سفارش اور رسائی کے تحت ہوئی تھی - پرویر کی ہی صلاح اور تحریر کے مطابق یہ لوگ منہ مانگے دام پر سُنٹھ، ادرک اور سرخ دار چینی کی بھاری مقدار میں خرید رہے تھے - مُور تاجروں کے علاوہ اب کوئی فرنگیوں کا مخالف نہ رہ گیا تھا - آخر کار وہ دن بھی آیا جب بڑی دھوم دھام سے واسکو ڈی گاما ساموریز (زمورین) سے ملاقات کرنے کے لئے روانہ ہوا -

کالی کٹ کی کشادہ سڑکوں کے دونوں طرف باشندوں کی بھیڑ اُمڈ پڑی تھی - جلوس کے آگے نوبت اور تاشہ بجانے والوں کی ایک ٹولی چل رہی تھی - ایک نائر اس کے پیچھے ایک تفنگ ہاتھ میں لئے چل رہا تھا اور گاہے بگاہے نوواردوں کے احترام میں ہوائی گولی داغ رہا تھا - تین ہزار مسلح سپاہی اس



جب میں نے تمہاری شکل پر نظر ڈالی ہی نہیں تو نسل کہاں سے بناتا!

لہرایا ہے آنچل . . .

موسم کے ساغر چھلکے ہیں لہرایا ہے آنچل کوئی
تم نے گیسو کھول دیئے ہیں یا برسا ہے بادل کوئی
کچی نیند سے اٹھ کر اسکی انگڑائی ایسی لگتی ہے
کاندھے پر رکھ کر الٹا دے جیسے مئے کی چھاگل کوئی

واعظ نے میخانے میں کیا کوئی سیاسی چال چلی ہے
پھینک رہا ہے ساغر کوئی توڑ رہا ہے بوتل کوئی
شاید پھر ایک اور انوکھا تاج محل بننے والا ہے
صحرا کی مٹی دامن سے چھان رہا ہے پاگل کوئی

ساز طبیعت بہلاتے ہیں سرگم دل کو سمجھانے میں
رات کے سینے پہ سر رکھ کر جب روتی ہے پائل کوئی

راہی کو اب پوچھو ۔ سے ہو ۔ آہی کا یہ حال ہے یارو
مارا مارا گھوم رہا ہو جیسے تنہا گھائل کوئی

—حبیب الرحمٰن راہی—

کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ واسکو ڈی گاما نے
دل ہی دل میں سوچا "ہمارے ملک والوں
کو کیا خبر کہ ہمارا کتنا احترام ہو رہا ہے۔"
شاہی محل ایک میل کے علاقے میں بسا
ہوا تھا۔ محل کے صدر دروازے سے داخل
ہو کر وہ بہت سے عالی کمروں میں سے گزرتے
پھر وہ اس محل کے سامنے آ کھڑے ہوئے
جہاں جموریں کی رہائش تھی۔ آپا نہ نا مسودی
راج پروہت آ کر ان سے گلے ملا اور سب
ہی لوگوں کو بہت بڑے مجلسی کمرے میں
لے گیا۔ مجلسی کمرے کا فرش ہرے مخملی قالین
سے ڈھکا تھا۔ دیواروں پر رنگ برنگے ریشمی
پردے لٹک رہے تھے۔ لکڑی سے بنی مسندیں
ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔
واسکو ڈی گاما نے ملاقات میں ایک
بہت ہی خوبصورت سرخی مائل کپڑے
کا تھان، زرد ساٹن کا ایک ٹکڑا، پچاس لال
ٹوپیاں، پچاس صدریوں کے سنے چمڑے
جن میں ہاتھی دانت کے دستے تھے اور جو
حلٹ کے میاروں یاں تھے۔ شیلا، پیتل کا برتن
ری کے خوبصورت تاروں سے کڑھی ہوئی ایک کرسی
اور ایسی ہی آٹھ دس معمولی دام کی چمک
دار چیزیں دی تھیں، جو پرتگالی شہنشاہ کی
شان و شوکت سے مطابقت رکھتی تھیں اور
جموریں کے روم، وینس، ہیمبرگ، اور مصر
یہاں تک کہ چین سے آئے ہوئے بیش قیمت
تحفوں سے خزانہ بھرا تھا
ڈگاما جب مجلس میں داخل ہوا تو جموریں
اسی کرسی پر بیٹھا تھا جو اس نے نذر میں
ارسال کی تھی۔ اندر داخل ہو کر ڈگاما نے اسکا
پھر ایک ہاتھ اٹھا کر گویا خدا کا شکر ادا کیا
راجہ نے اشارے سے واسکو ڈی گاما کو بلا کر
ملا کر مسند پر بٹھایا
واسکو ڈی گاما نے اسے شہنشاہ پرتگال



...ط جمورین کو دیا جس میں دوستی اور تجارت ...کے بارے میں معاہدے کی تحریر تھی۔ جمورین ...ے نعل میں کھڑے خادم کے ہاتھ میں پکڑے ...اگالدان میں تھوک کر دوسرے خادم سے ...ایک پان لیا اور پھر اپنے کوتوال کو پُر متانت ...ہجے میں حکم دیا "نہ صرف ان کو ہر قسم کی ...مداد دو۔ بلکہ غیر ملکی مسلمانوں کی رقابت کی آگ ...سے بھی ان کی حفاظت کرو۔"

شہر میں پرتگالیوں کا بہت احترام اور عزت ہونے لگی۔ لوگ اپنے گھروں ...ں ان کو قیام کا موقع دینے لگے۔ بچے ان ...ے جہاز دیکھنے کے لئے گئے۔ تجارت میں ادائیگی ...وصولی کا ذریعہ خصوصاً سونا اور چاندی تھا ...پرتگالیوں کے پاس اس کی کمی تھی انہوں ...جہ کو تحریر کیا کہ ان کو تبادلۂ اشیاء کے ...مال لینے دیا جائے۔ یہ بات جمورین کو بہت ناگوار گزری کہ یہ فرنگی ان کو سوداگر سمجھ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کچھ سخت رویہ اختیار کیا لیکن یہ خبر پاکر کہ مؤثر تاجروں کے زیرِ اثر ان کے کچھ افسروں نے پرتگالیوں کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ جمورین نے فرنگیوں کو اطمینان دلانے کی غرض سے ان کے سیکھے ہوئے پرتگالی ضامن کو آزاد کر جہاز پر واپس بھیج دیا۔ خود واسکوڈی گاما کے لئے بیش قیمت تحفہ جات ارسال کئے۔

اُس نے راجہ کے پُرخلوص طرزِ عمل کا جواب بہت بدتمیزی سے دیا۔ جس کے دل میں بذاتِ خود بدنیتی ہو، وہ ہر کسی کو بد دیانت سمجھنے لگتا ہے۔ اُس کی حفاظت کی خاطر جمورین کی طرف سے تعینات کوتوال کے عملے کا ان کے ساتھ رہنے کو اُس نے اپنی آزادانہ سرگرمیوں میں دخل اندازی تصوّر کر لیا۔ اس نے کالی کٹ کے ضامن کو رہا نہیں کیا اور بوقتِ روانگی یہ دھمکی دے گیا کہ جب واپس آؤں گا تو ایک ایک کو اس بدسلوکی کے لئے مزہ چکھاؤں گا۔ ہم سُوئی کی طرح میٹھے ہیں اور ہتھوڑا بن کر سکتے ہیں اور یہ ہتھوڑا اب مسلمان تاجروں کی عقل درست کرے گا۔

پر دیر کوڈی گاما نے ملا کر ایک سَند لکھ دی کہ کوئی بھی پرتگالی مستقل میں آئے گا تو یہ سند دیکھ کر اس سے دوستانہ سلوک کرے گا۔

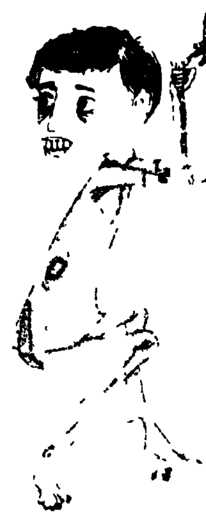
مگر سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ۷۰ دن کے بعد جب جہاز نے لنگر اُٹھایا تو فاطمہ کو پھسلا کر لانے میں نیونس کامیاب ہوچکا تھا اور اپنے بہی خواہ دوست یہودیز کی بے حد حسین بیوی کو اپنے جہاز کے ملاحوں کو پیش کر چکا تھا۔ ●

مقالہ

بھنور مل سنگھی

چوری کا پھندا

جس میں ایک بار پھنس جانے کے بعد باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا پھر ایماندار اور دیانت دار بننے کا دعویٰ کون کر



[illegible] کی [illegible] گی [illegible] کا جال

سماجی معاملات [illegible] ملک [illegible] دوسرے [illegible] [illegible] کلیوں تو بھی

گویا [illegible] کھلیاں میں [illegible] کے [illegible] جاتے تھے۔ مگر [illegible] کلے ہارا [illegible] ہوئے [illegible] گیا ہوں [illegible] ہوں [illegible] [illegible] اس میں کھلے والے [illegible] میں [illegible] [illegible] مری وقات اور [illegible] لے [illegible] چوری کی پھول کھلیاں میں ہی [illegible] پھول کھلیاں [illegible] کلیوں میں آنکھیں کھول کر میں [illegible] میں ہی کیسا سارا ملک پیکر لگا رہا ہے۔ [illegible] لوگ [illegible] دوسرا یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر سانس لینے والا آدمی چور ہے اور کھول کھلوں میں پھنسا ہوا ہے [illegible] ہم وطن سے [illegible] چوری کی پھول کلیاں سے باہر رہ سکتا ہے اس حالت میں چوری کا جال ہر جگہ موجود ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کی پرستش کے بغیر زندگی کا جامہ پہننا ممکن نہیں ہے۔

چوری کرتا ہوں۔ یہی آج زندگی کی راہ اور منزل ہے۔ [illegible] میں کیوں [illegible] اور کوئی بھی کیوں کرے [illegible] ہے۔ [illegible] چوری [illegible] کون ایک پیسے میں سو ہو لوں گا [illegible] [illegible] مجھے

پکڑے گا تو خود گرفت میں آجائے گا۔ تم اپنا کام کرتے چلو مجھے اپنا کام کرنے دو۔ یہ بھی تو سمجھو کہ آخر چوری تو چوری ہی رہے گی میں تو نہیں کروں گا، تم تو نہیں کروگے تو کوئی اور کرے گا۔ جب کوئی نہ کوئی کرے گا تو میں ہی کیوں نہ کروں چوری کر کے زندگی کا جو مطلب حاصل ہو وہ بغیر چوری کے کیسے حاصل کروں گا؟ زندگی کا جو مطلب ہے وہ اگر حاصل نہ ہوگا تو زندہ رہ کر بھی کیا ہوگا؟ میں نے چوری کی ہے تو سب سے آگے ہوں، تم چوری کرو تم سب سے آگے ہوگے۔

[illegible] نے مکھن کی چوری کی تھی۔ مجھے بھی مکھن چاہیے [illegible] نہیں مکھن چاہیے، [illegible] کیسے چلے گا بغیر چوری کیے؟ زندگی کا مکھن تو پوشیدہ ہے چوری میں۔ چوری سے باہر دیکھتے ہو تو [illegible] [illegible] مال [illegible] [illegible] [illegible] گا کہ [illegible] [illegible] ہڈیاں۔ [illegible] گوشت اور [illegible] ہوں۔ [illegible] ان ہڈیوں کے اوپر سے چور معاشرے [illegible] [illegible] لیا ہے۔ تم اگر اس حلقے سے باہر نکل کر [illegible] ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی رہ جاؤ گے وہ بھی [illegible]

کسی دن ایندھن بن کر ختم ہو جائے۔ ہونا یہی ہے۔ سچ کے حرف
بن کر شاید کتابوں میں پڑے رہو۔ مگر کتابیں بھی کون شائع
کرے گا۔ کون رکھ پائے گا! چور کے علاوہ کیا کوئی اور؟ تب
مجھے دیکھو! زندگی کی کتاب نہیں، کتاب کا ناشر ہوں۔ میری
جانب آؤ۔ ساتھ چلو۔ چوری کی چابی سے زندگی کا دروازہ
کھولنے کا گر بتاؤں گا۔

بڑی لمبی چوڑی باتیں کرتے ہو، بھائی، مگر بتاؤ کہ کون نہیں ہے چور؟ سمجھ لو کہ میں نے تو کالا بازار بھی کیا اور حکومت کو بھی فریب دیا۔ مگر آج جو حکومت میں بیٹھے ہیں وہ؟ چور کو پکڑ رہے ہیں۔ جو سزا دے رہے ہیں۔ ہمارے کردار اور طرز عمل کی نکتہ چینی کر رہے ہیں، بندر بانٹ کر رہے ہیں، وہ کیا ہم سے دور ہیں۔ علیحدہ ہیں؟ بتاؤ تو ذرا۔

جیل کے پھاٹک کے اندر چور ہیں، جو سزا بھگت رہے ہیں جن کے ہاتھ پیروں میں بیڑیاں ہتھکڑیاں ہیں اور جو باہر ہیں، ان کو چوری کی سزا ابھی نہیں ملی ہے۔ اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ سزا بھگتنے کے لئے جو جا رہا ہے وہ تو چور ثابت ہو گیا۔ جو سزا تجویز کر رہا ہے وہ؟ مجھے کالا بازار کرتے ہوئے پکڑ کر جو سزا تجویز کرتا ہے وہ کیا کالا بازار سے محفوظ ہے؟ گرفتار ہو جانے پر جو میری طرف سے وکالت کر رہا ہے، وہ خود کیا کر رہا ہے؟ وہ جو روپے لے رہا ہے مجھ سے، اس میں کتنے کالے ہیں اور کتنے سفید ہیں۔ جانے تو ابھی سے کالے اور سفید کے فرق کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کا حال کچھ مختلف ہے؟ میرے کالے بازار کو وہ کوس رہا ہے۔ مگر اسے بھی تو میں ہی چلا رہا ہوں۔ میرا کالا بازار ہی تو اس کے پیٹ اور وقار میں گھسا بیٹھا ہے۔ وہ چاہے فراموش کر دے مگر میرا کالا بازار یہ نہیں بھول پاتا کہ لاکھوں روپے میں نے ان کو انتخابات میں کامیاب کرانے کے لئے دئیے تھے ان کا حساب کبھی لکھا یا پوچھا؟

پیچ کی فتح برانڈ کے جن کاغذوں پر انہوں نے انتخابات کے اخراجات کا گوشوارہ پیش کیا ان میں کالا بازار نہیں تھا؟ اگر آج کسی کے روپوں سے انتخابات کے دنگل جیت کر آئے ہوئے اپنے اقتدار کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو جس کے روپے لگے ہیں، چوری کر کے جس نے ان برسر اقتدار حضرات کو نوازا ہے خود چوری کا گناہ کر کے ان کو بے لوث اور خادم وطن و قوم ہونے کا موقع مہیا کرایا ہے، وہ کیوں نہیں اپنے لئے بھی کچھ چاہے؟ میرے اعمال و کردار کو گناہ کہا جاتا ہے اور میرے اعمال و کردار کے ذریعے عمل میں آئے گناہ کو خدمت گزاری اور ریاضت!

درحقیقت، چور کون ہے؟ یہ بات بتا سکنا آج شاید زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ کون چور نہیں ہے۔ جب کوئی کہتا ہے کہ وہ چور نہیں ہے تو کسی کو یقین نہیں آتا۔ یہ یقین آنے کی بات بھی نہیں ہے۔ سارا معاشرہ ہی جب چوری کی بنیادوں پر کھڑا ہے تو چوری سے باہر کون ہے؟ زندگی کا نام ہی چوری ہو گیا ہے۔ چور سے چور کا عشق ہے، چور سے چور کی رقابت ہے۔ جب ناشر مصنف کو فریب دیتا ہے اور مصنف اپنے ٹھگے جانے کی شکایت کرتا ہے تو ناشر کو یہ بتاتے دیر نہیں لگتی کہ مصنف نے جو کچھ قلمبند کیا ہے اس میں کتنا چوری کا ہے اور کتنا اس کا اپنا!

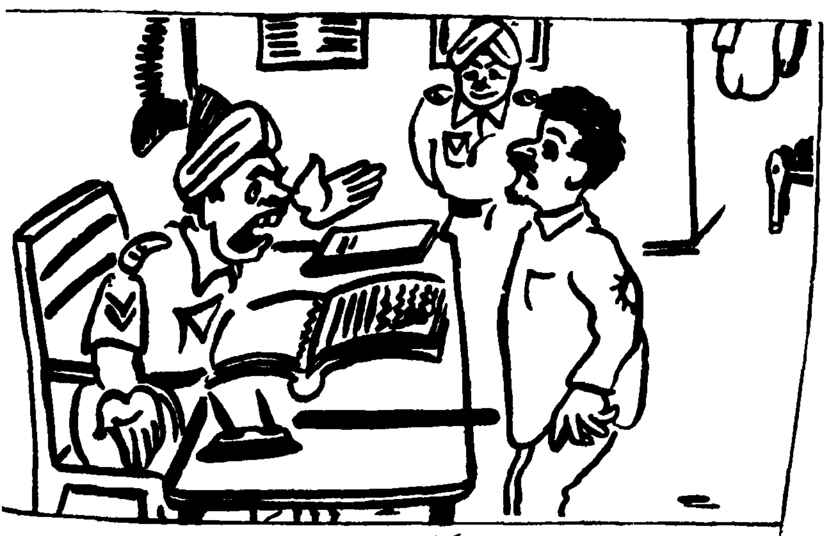
ڈاکٹر کو فیس ادا کرتے ہوئے مریض کسمساتا ہے اور اس کے منہ سے شکایت کے دو لفظ نکلتے ہیں تو ڈاکٹر مریض کی طرف سے کی جانے والی چوریوں اور دھوکہ بازیوں کی لمبی فہرست پیش کر دیتا ہے۔ دفتر کا ملازم اور کارخانے کا مزدور کام چور ہے، یہ شکایت کس مالک کے منہ پر نہیں ہے۔ مگر کون سا مالک ہوگا جو یہ نہ جانتا ہو کہ وہ کتنا بڑا پیٹ چور ہے! جو سرکاری افسر چوروں سے سماج کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہیں چوری کرنے والوں کو سزا دیتے ہیں، وہ اصل

چور کو کیا کبھی پکڑتے ہیں یا پکڑنا چاہتے ہیں۔ اور در اصل کیا وہ خود سماج کے ساتھ کی جانے والی چوری کے حصہ دار نہیں ہیں؟

گھی میں یا دودھ میں یا کھانے کی دیگر چیزوں میں ملاوٹ کرنے کے خلاف شکایت کرنے والا کیا خود اپنے کام میں چوری نہیں کرتا؟ کس کا نام لیں اور کس کا چھوڑیں؟ میں اور تم، تم اور میں، اور وہ، میں اور تم! جس کا نام آگیا اور جس کا نام چھوٹ گیا، دونوں برابر ہیں۔ سارے کا سارا چوری کا ہی ناپ تول چل رہا ہے۔ اس ناپ تول میں۔ آتا ہے سماج، نہ آتا ہے ملک اور نہ آتا ہے مذہب۔ اس میں آتا ہے صرف میں اور... اور جو جہاں بیٹھا ہے۔ وہاں اپنی عقل لڑا رہا ہے اور تو اور، جو صداقت اور مذہب کا درس دینے کے لئے بیٹھے ہیں وہ بھی اس دوڑ میں شامل ہیں۔ مندروں میں، مٹھوں میں، درسگاہوں میں، اداروں میں بھی چوری کی بھرمار ہے۔ اخلاق اور انسانیت کے مقدس اقوال کی کتابیں چوری کے ناپاک سرمائے سے شائع ہو رہی ہیں۔ نیک اور پاک زندگی کا دعوے کرنے والے ادارے چوری کے پیسے سے چل رہے ہیں۔ بدعنوانیوں سے فیضیاب ہونے والوں کی اصلاحی تنظیمیں چل رہی ہیں۔ مذہب کا خدا گناہ سے حاصل روزی پر گزر کر رہا ہے۔ جس کی چوری بتایئے وہی کہہ دیتا ہے "ارے، ہماری بات کرتے ہو! تم کب کر رہے ہو؟ وہ کیا کر رہا ہے؟" یقین جانئے ہر کسی کی زبان بند ہے۔

میں چور ہوں لیکن خدمت گار بھی تو ہوں

اور خدمت و سخاوت کے امتزاج سے وجود میں آیا عظیم انسان بھی تو ہوں۔ چوری میں بڑی طاقت ہے، اسے اگر میں ترک کر دوں یا تم ترک کر دو تو معاشرہ کمزور ہو جائے گا اور تعمیری کام بند ہو جائے گا۔ تب تم سچ مچ چوری کرتے چلو اور درمیان میں کوئی زبان کھولے تو اس کو بھی چوری کی لذت سے آشنا کراؤ۔ ایک بار چوری کی بھول بھلیاں میں پھنس جائے پر وہ خاموش ہو جائے گا۔ مجھ سے حسد کرتے ہو تو بولتے ہو۔ میری طرح بھول بھلیاں میں پھنس کر دکان کھولو گے تو بولنا بند ہو جائے گا۔



"چور کا اتا پتہ اور حلیہ کچھ معلوم نہیں تو ہم پکڑیں گے کیا خاک"

دو پروفیسر

کہانی

گوپال شیبھرن

ابھی آسمان میں تارے نہیں نکلے تھے درختوں کی شاخوں کے درمیان چمکنے والی بتیاں چمکیلے زیوروں کی طرح تھرتھرا رہی تھیں۔

یونیورسٹی کے لمبے چوڑے پارک کی گھاس ابھی تک گرم تھی۔ کچھ دیر پہلے ایک غبار مغرب سے اٹھا تھا جو اُس وقت بھی آسمان پر چھایا ہوا تھا۔

دو پروفیسر، جن کی عمر شکل و صورت سے پچاس سے اوپر معلوم ہوتی تھی، گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے اخبار کو پنکھے کی طرح ہلا رہے تھے۔ ایک پروفیسر نے پسینہ پونچھ کر رومال جیب میں رکھتے ہوئے کہا " اُف اُے حد گرمی ہے۔ ہوا بھی جھلسا رہی ہے۔ لیکن ابھی ابھی جو ہوا کا خوشبو سے بھرا جھونکا آیا، مجھے محسوس ہوا جیسے کسی عورت کے جسم میں لگی ہوئی مہک چلی آرہی ہے۔"

"ہاں وشوناتھ، وہ دیکھو، یہ مہک سامنے کی جھاڑیوں کے پیچھے سے آرہی ہے۔"

وشوناتھ نے دیکھا، سامنے والی جھاڑی کی آڑ میں ایک دوشیزہ اپنے عاشق کو دھیرے دھیرے رومال سے ہوا جھل رہی ہے۔ دور سے وہ دھندلی پرچھائیوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ نوجوان پرکشش شخصیت کا مالک تھا، لیکن لڑکی نہایت کالی کلوٹی تھی۔ اس کا قد بھی اتنا چھوٹا تھا کہ وہ نوجوان کے کندھوں تک بھی نہیں آتی تھی۔

دیناناتھ اور وشوناتھ دونوں کی آنکھیں لڑکی پر لگی ہوئی تھیں ادھر درختوں کی شاخوں میں سے چھنتی ہوئی روشنی دونوں پر پڑ رہی تھی۔

دیناناتھ گھاس پر لیٹ گیا اور بولا

"وشوناتھ، تم تو جانتے ہو یہ جگہ پریمیوں کی ملاقات کے لئے کتنی مشہور ہے۔ ایک سال پہلے یہاں دو پریمیوں نے ایک ساتھ خودکشی کرلی تھی۔ کتنا بھیانک منظر تھا وہ۔ اس کے بعد مہینوں تک ہم نے یہاں کسی جوڑے کو ایک ساتھ اس حالت میں نہیں دیکھا۔ خاص طور پر شام ہونے کے بعد تو کبھی نہیں!"

اس حادثے کو یاد کرکے وشوناتھ نے مشکوک نظروں سے ہلتی ہوئی درختوں کی شاخوں کو دیکھا۔ ہوا کا جھونکا ان دونوں کے کانوں میں اس حادثے کی کہانی دوہراتا ہوا چلا گیا۔ درخت سے دو سوکھے پتے ان کے نزدیک آگرے۔ آس پاس چڑیوں کی چوں چوں کانوں میں گونجنے لگی۔ سامنے بیٹھے ہوئے وہ دونوں پریمی دو تابوتوں کی طرح دکھائی دینے لگے۔ وشوناتھ نے کچھ ساعت کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کچھ سوچنے لگا۔

دیناناتھ اس پر اپنے اخبار سے ہوا کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وشوناتھ نے کہا "تمہارے ہاتھوں سے ہوا کتنی اچھی لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہوا میرے کانوں میں محبت کا پیغام سنا رہی ہو۔ کروڑوں انسان محبت کرتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں بہت کم محبت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ محبت اس لئے کرتے ہیں کہ دوسرے بھی محبت کرتے ہیں۔ اب ان دونوں پریمیوں کو ہی لو۔ کتنا الھڑ اور اُجڈ پیار ہے ان کا ان کے لئے محبت کی حد یہ ہے کہ گھر سے چوری چوری بھاگ آنا، یہاں بیٹھ کر ایک ہو جانا، اگر ضرورت ہی ہو تو ایک دوسرے کے لئے خودکشی کرلینا۔

جن کے لئے فلسفۂ محبت ایک عقدۂ لاینحل تھا

"یہ محبت کتنی غلط ہے۔ دراصل یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ میرے خیال میں حقیقی محبت اسے کہتے ہیں جس میں جذبات کم اور جسمانی کشش زیادہ ہو۔ اب ان دونوں کو ہی لیں۔ لڑکی میں کیا کشش و جاذبیت ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ایک لڑکی ہے۔ اس کا قد کتنا چھوٹا ہے۔ اس کا منہ کتنا بے ڈھنگا ہے۔ اس کے خدوخال کتنے غیر متناسب ہیں۔ حسن اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اس کے برعکس لڑکے کا ڈیل ڈول دیکھ کر طبیعت خوش ہوجاتی ہے۔ کتنا لمبا تڑنگا جوان ہے جی چاہتا ہے، اس کی طرف دیکھتا ہی جاؤں۔

"ان دونوں کی محبت کس طرح پائدار ہوسکتی ہے۔ دونوں کی محبت ختم کرنے کے لئے تو ایک جھونکا کافی ہے۔ مجھے تو یہ لڑکا نرا بے وقوف لگ رہا ہے۔ کیا اسے کوئی اور لڑکی نہیں ملی جو اس کباڑخانے کے چکر میں پھنس گیا۔"

دینا ناتھ نے ان دونوں محبت کرنے والوں کی طرف دیکھا پھر دشونا تھ کی باتوں سے متفق ہوتے ہوئے کہا "میرے خیال میں محبت کے لئے جسمانی کشش ضروری نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ دونوں کی شخصیت مکمل ہو۔ دراصل کوئی بھی انسان اس دنیا میں مکمل نہیں ہے کوئی نہ کوئی کمی ہر ایک میں ہوتی ہے۔ جس مثالی محبت کی تم بات کر رہے ہو، وہ بہت کم ہی ملتی ہے۔ میرے خیال میں محبت کے لئے جسمانی کشش سے زیادہ خیرخواہی، ہمدردی اور قربت بہت ضروری ہیں جو محبت جسمانی کشش کو ذہن میں رکھتے ہوئے کی جاتی ہے، وہ پائدار کبھی نہیں ہوسکتی۔ محبت کو ہمیشہ پہلی نظر میں محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دراصل وہ محبت ہوتی ہی نہیں، بلکہ صرف حسن کو محسوس کرنا ہوتا ہے۔ فرض کرو ہم راہ چلتے کسی خوبصورت حسینہ کو دیکھتے ہیں اور ٹھٹک کر اسے دیکھتے رہ جاتے ہیں، تم کہوگے یہ کشش محبت کا محرک ہے اور یہی محبت کو مستحکم بناتی ہے اور تم اپنے پریمی کی طرف ہر وقت دیکھتے رہنا چاہتے ہو۔

"لیکن اصل میں یہ محبت نہیں ہے بلکہ حسن کی تعریف کا ایک جذبہ ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم کسی خوبصورت مقام کو دیکھ کر اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"تو تم میرا مقصد سمجھ گئے" دشونا تھ بول اٹھا "کشش ہمیشہ خوبصورت چیز میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک خوبصورت مقام کو دیکھ کر اس میں رہنے کے لئے دل بے چین ہوجاتا ہے ویسے ہی کسی حسین لڑکی کی

کیا حقیقی محبت یہی ہے کہ ہر وقت ہر محبت کے علاوہ دوسرا کوئی کام ہی نہ کرے ایک صحت مند اور مکمل اِنسان سے

طرف دیکھ کر اسے حاصل کرنے کے لئے کوشش کی ہے۔ اسی حاصل کرنے کے ردِعمل کو محبت کا اظہار کہتے ہیں۔"

"اگر تمہاری بات مان لی جائے تو محبت کا حق خوبصورت انسانوں کو ہی ہے" دینا ناتھ بولا "بالکل لوگ کو جو ڈیل ڈول اور شکل و صورت سے فلمی اداکاروں طرح ہوں۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک کالی کلوٹی اور چپٹی لڑکی سے محبت نہیں کی جاسکتی؟"

"نہیں، میں نے یہ کب کہا کہ ایسی لڑکی محبت قابل نہیں ہوسکتی۔ مگر میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس طرح محبت ہمیشہ یک طرفہ ہوتی ہے ایک طرف تو ایسی ہوتی ہے کہ خود بھی جل جائے اور دوسرے کو بھی جلا دے دوسری طرف صرف ابال ہوتا ہے جو سمندر کی لہروں طرح آتا ہے اور فوراً چلا جاتا ہے۔"

"اچھا، اب سمجھا۔ تم حقیقی محبت اسے کہتے جو ہر وقت، ہر موسم میں اور ہر جگہ ایک ہی جیسی رہے۔ تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ اس دنیا میں اس محبت کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہ کرے اور اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا رہے۔



وسم ہر جگہ ایک ہی جیسی رہے۔ انسان تمام دن اپنی محبوبہ کے پاس بیٹھا رہے اور
م شاید یہ نہیں جانتے کہ محبت سے صرف جسمانی لذّت حاصل ہوتی ہے۔ یہ لذّت صرف
ریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ آرائشِ حسن والی چیزیں اس لذّت میں اضافہ کرتی ہیں۔

"تم شاید یہ نہیں جانتے کہ محبت سے صرف
سمانی لذّت حاصل ہوتی ہے۔ یہ لذّت صرف صحت مند
مکمل انسان کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی
یزیں جو حسن کو نکھارنے میں معاون ہوتی ہیں، اس
ت میں اضافہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم ایک
ی لڑکی کو دیکھتے ہو جس کی چال میں تھرک ہو، اس
ا ہر عضو گٹھا ہوا اور بھرا ہوا ہو، اسے دیکھ کر ہر شخص
ٹھہر جائے گا، اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کانپیں
ے، آنکھیں نہ جانے کیا کیا اشارے کریں گی۔ اس کا
م زماں پر بس جائے گا۔ اگر وہ لڑکی تمہیں ملے تو تم
س کے عکس سے محبت کرنے لگو گے اور دن رات
س کے خواب دیکھنے لگو گے۔

"اس کے برعکس ایک ایسی لڑکی کو دیکھو جس کے
م پر نعمت برس رہی ہو، سر کہیں جا رہا ہو، پاؤں کہیں
سے بھلے دانت باہر نکل رہے ہوں، منہ پر طرح طرح
ی کھیاں ہوں۔ ایسی لڑکی کو دیکھ کر یا تو تم اپنا منہ
لو گے، یا ایک چھینک مارو گے یا ایک بھدی ڈکار
لو گے۔ ایسی لڑکی سے محبت کرنے کی بجائے تم
سنیاس لینا بہتر سمجھو گے۔"

"تم جس خوبصورتی کی بات کر رہے ہو وہ ظاہری
خوبصورتی ہے۔ میں نے کئی ایسی عورتیں اور باعزت مرد
دیکھے ہیں جنہیں یہ تمیز ہی نہیں ہوتی کہ نا آشناؤں
سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔ کپڑے چاہے وہ اچھے
سے اچھے پہنیں، آرائشِ حسن کی ہر چیز کے نام سنائیں،
مٹک مٹک کر چلتے ہوئے چاہے وہ رقص کریں جب
تک وہ ایسا کرتی رہیں گی، وہ دنیا کی انوکھی اور عجیب و
غریب عورتیں نظر آتی رہیں گی۔ مگر جب ان سے بات
ہوگی تو معلوم ہوگا کہ وہ اخلاق سے کوسوں دور ہیں۔ وہ
انسانی محبت اور برابری کے اصولوں سے قطعی ناواقف
ہیں۔ وہ صرف ایک ہی شے پر ناز کرتی ہیں ــــ اپنی
شخصیت اور حسن پر۔ یہی حال اچھے ڈیل ڈول والے
ان مردوں کا ہے جو دولت، شراب اور عورت کے
نشے میں مست رہتے ہیں۔

"میرے خیال میں حقیقی حسن، حقیقی محبت وہیں
پلتی ہے اور مستقل طور پر رہتی ہے جہاں ظاہری حسن
سے زیادہ باطنی حسن اور خلوص زیادہ رہتا ہے۔"

"یہ باطنی حسن والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی
کیا تمہارا مقصد روحانی حسن سے ہے۔ میں روحانی حسن

کو بالکل خیالی سمجھتا ہوں۔ درحقیقت روحانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ جو بھی چیز دکھائی دیتی ہے، حسن اسی میں ہوتا ہے۔ غیر مرئی چیز کا کیا حسن۔ محبت کا تعلق تو انسانی صورت سے ہے نہ کہ روح سے۔ اگر محبت روحانی ہوتی تو وہ ہر فرد کے لئے ہوتی، کیوں کہ روح ہر انسان میں ہوتی ہے ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جب محبت سرد پڑجاتی ہے۔ پھر روح تو ہمیشہ جوان رہتی ہے لیکن محبت اگر انسانی شکل کے بجائے روح سے ہو تو مرد مرد سے محبت کیوں نہیں کرتا، عورت سے ہی کیوں کرتا ہے!"

"تم میری بات کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو وشونائھ، روحانی حسن پر مجھے پورا یقین ہے۔ باطنی حسن سے میرا مطلب انسانی خوبیوں سے ہے جو جسمانی نہیں کہی جاسکتیں۔ میرا خیال ہے کہ مستحکم محبت وہی ہے جہاں انسانی خوبیوں کا احترام کیا جائے۔ خواہ وہ خوبیاں دنیا کے سب سے بدصورت انسان میں ہوں، خواہ سب سے خوبصورت انسان میں۔ جب انسانی جذبات، رجحانات اور صفات کا تبادلہ دو انسانوں میں ہوتا ہے تو فطری طور پر ایک مقدس آگ روشن ہوجاتی ہے۔ ایک مقدس سنگم بننے لگتا ہے۔

"تمہاری باتوں میں حقیقت بہت کم ہے۔ اس وقت تم جذبات کی رو میں بہہ رہے ہو۔ درحقیقت محبت کے راز کو صرف وہی شخص جان سکتا ہے، جس نے سچے دل سے محبت کی دھڑکنوں کو سنا ہو۔ محبت کوئی ایسا جذبہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ محبت ایک مقدس جذبہ ہے۔ انسان کی شخصیت تم پر حاوی ہوجاتی ہے

"ایک انسان کے قریب آکر تمہیں خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور اس سے دور ہوکر تم اس کے پاس جانے کے لئے بے چین ہوجاتے ہو۔ ایک انسان کا خیال تمہیں سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ستایا کرتا ہے۔ اس سے مل کر تمہیں بے انتہا خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بس یہی تو محبت ہے محبت میں صرف ایک بات بہت اہم ہے، وہ یہ کہ دونوں کی شخصیت ایک جیسی ہے یا نہیں۔ اگر کسی مخالف جنس کی شخصیت



"کچھ کام نہیں کرتا تو کیا ہوا۔ ہر پانچویں سال آپ کو ووٹ تو دے دیتا ہوں!"

زیادہ پرکشش ہے تو ان کی محبت کبھی بھی یکساں نہیں ہوسکتی۔

"فرض کرو، تم ایک ایسے شخص سے محبت کرتے ہو جس کی شخصیت میں کوئی جاذبیت نہیں، ایسی محبت عارضی ہوتی ہے۔ کیوں کہ جب ایک زیادہ خوبصورت عورت تمہاری قربت میں آتی ہے تو اس کی شخصیت زیادہ پراثر معلوم ہوتی ہے۔ تم اپنی پہلی محبوبہ کو بھول کر اس سے محبت کرنے لگتے ہو۔ اس کے بعد ایک سی عورت تمہاری صحبت میں آتی ہے جس کا حسن تمہاری محبوبہ کے سامنے پھیکا ہے۔ ایسی عورت تم پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ تم اپنی پہلی محبوبہ میں ہی محو رہتے ہو۔

"اب رہی انسانی خوبیوں کی بات، یہ بات بھی مجھے تسلیم نہیں۔ ایک یونیورسٹی کی ایڈورڈیٹ طالبہ کو لو، حسن میں سب کچھ ہے۔ دوسری طرف ایک ماہرفن اور ادب کے دل دادہ ایک ڈھائی فٹ کے ٹھگنے شخص کو لو کیا دونوں میں محبت ہونا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ چاہے اس ٹھگنے شخص میں کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں۔ اس کی طرف ایڈورڈیٹ لڑکی مائل ہو ہی نہیں سکتی۔ ان میں کتنا ہی تعلق کیوں نہ ہو، لیکن وہ دونوں کبھی قریب نہیں آسکے ان میں اگر محبت جاگے گی بھی تو وہ یقیناً یک طرفہ ہوگی۔"

"تم میری بات اچھی طرح نہیں سمجھے دینا ناتھ۔ یہ میں جانتا ہوں کہ جسمانی، سماجی، معاشی نابرابری محبت کی تکمیل میں محرک ہوتی ہیں۔ لیکن تم نہ بھی جان لو کہ انسان جذبے کے ساتھ مطلق میں کبھی یقین رکھتا ہے۔ اس میں جنسی محبت کے علاوہ انسانی محبت بھی ہوتی ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ صرف دو جسموں کے ملنے کا نام محبت ہے۔ اگر تمہاری بات مان لی جائے تو رنڈی۔ طوائف کے پاس جانے والا شخص ہی عاشق صادق ہے۔ لیکن ہم اسے ایک عاشق اور پریمی نہ کہہ کر آپ بدچلن انسان کہتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ جسم کے ساتھ جسم کا مل جانا کبھی محبت نہیں کہلا سکتا۔ یہی حال ان عورتوں کا بھی ہے جن کی شادی محبت کے بندھن میں پڑے بغیر ہوجاتی ہے، ان کی صحبت کو کبھی محبت نہیں کہا جا سکتا۔ محبت تو آہستہ آہستہ پیدا ہونے والے اس جذبے کا نام ہے جو بہت دیر بعد مستقل شکل اختیار کرتا ہے۔ جب انسان کے جسم نہیں، دل آپس میں مل جاتے ہیں، تب جو ہلچل اور دھڑکن پیدا ہوتی ہے اسے ہم محبت کا نام دیتے ہیں۔ جسموں کے ملنے میں بہت کم وقت لگتا ہے لیکن دلوں کے ملنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ جب دو دل آپس میں ملتے ہیں تو وہ یہ کبھی نہیں دیکھتے کہ دوسرا انسان بیمار ہے یا فربہ و صحت مند۔ اس وقت خوبصورتی و بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں رہتا۔ رات کے اندھیرے میں جیسی گوری چمڑی ویسی کالی چمڑی محبت کے لئے دل بہتر ہونا چاہئے نہ کہ جسم۔"

"دیکھو وشوناتھ، میں یہ نہیں کہتا کہ ایک ساتھ رہنے کا محبت میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ سچی محبت کے لئے جسمانی کشش ہی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک ساتھ رہنا بعد کی چیز ہے۔ پہلے محبت تو ہو۔ جب کوئی انسان دوسرے کی شخصیت سے متاثر ہوکر اسے پسند کرلیتا ہے۔ تب ہی ایک ساتھ رہنے کی نوبت آتی ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں تو ایک ساتھ رہنا تو الگ وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرنا بھی پسند نہیں کریں گے ایک لمبا تندرست مرد ایک لمبی و صحت مند عورت کو ہی پسند کرتا ہے۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہے کہ ایک مکمل عورت ایک بے ڈھنگے مرد کو پسند کرے۔ افرض کرو وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے کا ناٹک کھیلتے بھی ہیں تو کیا وہ مطمئن رہ سکتے ہیں؟ ڈرامہ ڈرامہ ہے، سچی محبت صرف محبت ہی ہوتی ہے۔ کئی لوگ تو اسی وجہ سے طلاق لے لیتے ہیں، لیکن جو طلاق نہیں لیتے وہ ساری عمر پچھتاتے اور کڑھتے رہتے ہیں۔"

"اب ایک مثال میری بھی سن لو۔ ایک شخص ہمارے پڑوس میں ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ وہ دن رات اسی کے خواب دیکھتا ہے اسی کے خیالوں میں مست رہتا ہے

"فرض کرو ایسا پریمی کسی وجہ سے اپنی محبوبہ سے الگ ہو جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کی قربت میں نہیں آ پاتا۔ تب کیا ہوگا! وہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے بے قرار ہوگا، تڑپے گا اس کے دل میں ہر لمحہ ایک میٹھا میٹھا درد ہوتا رہے گا۔ وہ تڑپ تڑپ کر رہ جائے گا۔ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کی جدائی میں آنسو بہائے گا۔ وہ اس جدائی کا زہر گھونٹ گھونٹ کر پیے گا۔ اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا اس کے ذہن پر ایک پاگل پن اور فتور سوار ہو جائے گا وہ اپنے آپ کو اپنی محبوبہ کے لئے مٹا دے گا۔ تم اس سے کیا نتیجہ نکالو گے۔

"محبت جدائی میں [illegible] بڑھتی ہے کہ ایک ساتھ رہنے سے؟ جدائی میں محبت کیوں بڑھ جاتی ہے اب تم مان جاؤ کہ محبت کی آگ روشن کرنے میں ایک ساتھ رہنا زیادہ اثر نہیں ڈالتا۔ صرف جسمانی کشش جس کا رد عمل جدائی میں ظاہر ہوتا ہے محبت کے احساس میں مددگار ہوتا ہے؟"

"تم [illegible] اگر [illegible] بیٹھ کے ہو [illegible]

تمہاری باتوں سے صرف اس محبت کی تائید ہوتی ہے جو حقیقی محبت نہ ہو کر ذہن کا خلل ہے۔ یہ سچی محبت نہ ہو کر صرف جذباتی محبت ہے۔ تم نے اپنی محبوبہ سے ٹھیک طرح بات ہی نہیں کی۔ اس سے محبت کا اظہار ہی نہیں کیا۔ اس محبوبہ کو کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ تم بھی اس کے چاہنے والوں میں سے ایک ہو۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس سے، اس کی گلیوں سے، اس کے گھر سے، اس کے گھر کی گرد ہی سے۔ اس کی پرچھائیں سے، اس کے کپڑوں سے، اس کی کتابوں سے یہاں تک کہ اس کے کتے سے بھی محبت کرنے لگے ہو۔ تمہیں اپنا ہوش ہی نہیں۔ اسی محبت کو میں محبت ہی نہیں مانتا۔ محبت کوئی بے جان چیز نہیں، یہ محبت میں پوری جان ہوتی ہے۔

"محبت کوئی [illegible] نہیں، [illegible] نہیں کوئی [illegible] نہیں کوئی [illegible] نہیں جیسے تم ہمارے بھرو [illegible] ایک بے حد [illegible] ہو کر ایک سیدھا سادا جذبہ ہے۔ محبت [illegible] اسی وقت کہلا سکتے ہو جب تم اس

بچوں کے منہ سے

ایک دن ڈیڈی کے سر میں درد ہو رہا تھا اس لئے وہ اپنے سر میں آیوڈیکس مل رہے تھے۔ پپو جو قریب ہی کھڑا دیکھ رہا تھا پوچھنے لگا "ڈیڈی آیوڈیکس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے درد کم ہوتا ہے" ڈیڈی نے جواب دیا۔

کچھ دنوں بعد میرے چھوٹے بھائی کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا اس نے امی سے کہا "امی میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے" پپو یہ سنتے ہی بول اٹھا "آیوڈیکس لگا لیجئے بھائی جان" — [illegible] قمر، اورنگ آباد

•

پچھلے دنوں الیکشن ٹائم میں پڑوس کے گھر کے سبھی لوگ ووٹ ڈالنے جا رہے تھے۔ صاحبِ خانہ کا چھوٹا بچہ بھی ضد کر رہا تھا کہ وہ ووٹ ڈالے گا۔

اس کے گھر والے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ نابالغ ووٹ نہیں ڈالتے۔ لڑکا فوراً بول اٹھا تو کیا ہمارے ڈیڈی بھی نابالغ ہیں؟ اتفاق سے ان کا نام لسٹ میں چڑھنے سے رہ گیا تھا۔ اور وہ اس سال ووٹر نہ تھے۔ — سعید احمد انصاری، اعظم گڈھ

•

میں نے منے کے کان اینٹھتے ہوئے کہا "تم سکول سے غیر حاضر کیوں تھے؟"

منے نے جواب دیا

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ بڑوں کی پیروی کیا کرو۔ ماسٹر صاحب بھی سکول سے غیر حاضر تھے"

— عبدالغفار [illegible]

اس فیچر کے لئے اپنے اور اپنے بچوں کے تجربے بھیجئے۔ ہر ایک پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

محبوبہ کو حاصل کرکے اس کی قربت حاصل کرو۔ تم اس پر دل و جان سے فدا ہو، وہ تم پیر نچھاور ہو۔ محبت ایک ایسا سبق ہے، جسے صرف تمہاری محبوبہ ہی تمہیں پڑھا سکتی ہے۔ محبت ایک ایسی میٹھی ملاقات کا ڈرامہ ہے جو ایک دوسرے میں کھو کر ہی کھیلا جا سکتا ہے ....."

دیناناتھ آگے بھی کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ہوا کا ایک بھاری جھونکا آیا۔ مغرب سے زبردست آندھی آنے کے آثار نظر آئے۔ اندھیرا چاروں طرف چھانے لگا۔ چڑیاں اور کوّے درختوں سے اُڑ کر چوں چوں اور کائیں کائیں کرنے لگے۔ گھاس کی گرمی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ اب اس پر لیٹنا بہت ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ بتیاں جل چکی تھیں۔

یکایک وہ دونوں پریمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں پروفیسر بھی آندھی کو قریب آتے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اسی بات چیت میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ دونوں پریمیوں کو اسی طرف آتے دیکھ کر وہ وہیں ٹھہر گئے۔

جب وہ ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے پروفیسر کو سلام کیا۔ دونوں پروفیسر انہیں اچھی طرح پہچان چکے تھے۔ لڑکا جیک گڈمین آسٹریلیا کا طالب علم تھا اور لڑکی ایک حسین طالبہ تھی۔ انہیں پہچان کر دونوں پروفیسر خوش ہو گئے۔ دیناناتھ سے نہ رہا گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جیک سے پوچھا "گڈمین، ایک بات بتاؤ گے؟"

"ضرور پروفیسر صاحب، فرمائیے۔"

"کیا تم ایک دوسرے سے سچ مچ محبت کرتے ہو؟"

دیناناتھ نے پوچھا

"جی ہاں، ہمارے تعلقات تقریباً چھ مہینے سے ہیں اور دن بدن مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔"

دیناناتھ نے دیکھا کہ لڑکی نے جیک کی بات پر اپنا سر جھکا لیا تھا۔

انہوں نے پھر سوال کیا "تو تمہاری یہ محبت شادی کی شکل لے رہی ہے یا ایسا نہیں ہے؟"

"ہم اپنی اپنی تعلیم مکمل کرکے آپس میں شادی کر لیں گے" جیک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم دونوں کی محبت کا کیا راز ہے؟"

"جنابِ عالی محبت کے لئے جو سب سے ضروری بات ہے، وہ ہے دونوں پریمیوں کا نوجوان ہونا۔ نوجوان پریمی کسی بات کی پروا نہیں کرتے، نہ سماج کی نہ حالات کی۔"

پروفیسر نے پھر پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری محبت مستحکم ہوگی؟"

"جی ہاں، ہم نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا ہے۔"

دونوں پروفیسر جیک کا جواب سن کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر پروفیسر نے صاف الفاظ میں سوال کر ہی ڈالا۔ سمجھا "جیک میں بہت خوش ہوں لیکن میں ایک بات پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہیں میری بات اچھی نہ لگے تو مجھے معاف کر دینا مگر میری اس بات کا جواب ضرور دینا۔

"بات یہ ہے کہ پروفیسر دینا ناتھ کو ہماری بات پر شبہ ہے۔ تم آسٹریلیائی ہو اور یہ افریقی۔ تم دونوں کی شخصیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمیں شک ہے کہ تم دونوں کی شخصیت میں ملک، ذات وغیرہ کی کوئی دیوار نہ پڑ جائے۔ امید ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہوگے۔"

سوال سن کر واقعی جیک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اسی بات میں ذرا سختی پیدا کرتے ہوئے کہا "پروفیسر صاحب، آپ اس لئے ایسی بات پوچھ رہے ہیں کیوں کہ آپ کے ملک میں ابھی آزادی کا طریقہ پوری طرح رائج نہیں ہوا۔ ہم آپ کو ایک بات ایک آدرش پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو یہ کہنا چاہیے کہ ملک، مذہب، ذات، سماج، روپ، رنگ، اونچ نیچ کی جانے جتنی دیواریں آپ کھڑی کر لیں، مگر انسانی فطرت ہر جگہ فتح یاب ہوگی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے ملک کے لوگ بھی ان دیواروں کو منہدم کر دیں۔ نئی قدروں کو ہمیں لبیک کہنا چاہئے۔"

دونوں پروفیسر جیک کی بات سن کر حیران رہ گئے اور اسے ایک نیا پیغام دینے والا پاکر گھر کی طرف چل پڑے۔ ●



طنز

سُشیل کپور

سپاس نامے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

نام پیدا کرنے اور شہرت حاصل کرنے کی ہوس آدمی میں پیدائشی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مشہور ہونے کے لئے بدنام ہونا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر صاحب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تو ان سے پوچھا گیا حضرت کیا آپ بدنامی سے نہیں ڈرتے؟ انھوں نے بڑی ادا سے فرمایا:

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں نام سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا'

آپ تو چونک رہے ہیں۔ ہمیں آپ کی بدنامی مقصود نہیں جب نیک نامی اور عزت سے نام کمانے کے ذرائع موجود ہیں تو بدنام ہونے کی کیا ضرورت؟ اگر آپ کے پاس چار پیسے ہیں تو بس کام بنا بنایا سمجھئے۔

اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالئے! آپ کو اپنے نام کی تعریف کے پُل باندھنے والے سینکڑوں لوگ مل جائیں گے۔ انھیں آپ ذرا سا لفٹ دیں پھر دیکھئے آپ کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ اگر آپ دوستوں میں بیٹھ کر کہیں کہ آپ نے پچھلے برس ایک ۳۲ فٹ لمبا چیتا مارا تھا تو وہ آپ کے منہ کی بات چھینتے ہوئے بولیں گے "ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ وہ چیتا ۴۶ فٹ تھا۔ ہم تو چشم دید گواہ ہیں"۔

ان قصیدہ خوانوں کو پرانے زمانے میں جی حضورئے کہا جاتا تھا۔ آج کل یہ لوگ کئی ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک ماڈرن نام ہے — چمچہ۔ ان چمچوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ کا معیار بہت پست ہوتا ہے جو آپ کی تھوڑی بہت چاپلوسی کر کے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں ایسے لوگوں کو

لگانے سے خاص فائدہ نہیں ہے۔ جب کوئی کام کرنا ہی ہو تو ذرا سلیقے سے کرنا چاہیئے۔ دوستوں کے دائرے میں مشہور ہونے سے آپ کو کیا ملے گا، مزا تو جب ہے کہ پُوری دُنیا آپ کا لوہا مان جائے۔

ماڈرن جی حضوریوں نے پُوری دُنیا میں اپنے آقاؤں کا نام پھیلانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے — سپاس نامے۔ دراصل یہ گُر بہت ہی کارگر ثابت ہوا ہے۔ آپ اپنے بجٹ کے مطابق اپنی عزّت افزائی کرا سکتے ہیں۔ کسی ٹی ہاؤس میں چائے پکوڑوں کی دعوت سے بھی اور شہر کے کسی عالیشان ہوٹل میں پُرتکلّف دعوت دے کر بھی آپ اپنی تعریف کرا سکتے ہیں بجٹ سے زیادہ گنجائش نکل آئے تو ایک سپاس نامہ بھی شائع کرا لیجئے۔ پھر دیکھئے، سرکار اور عوام آپ کو کتنا ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور آپ کو عجیب عجیب خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ آپ سیاست داں ہوں یا ادیب سوشل ورکر ہوں یا ڈگری یافتہ، آپ اپنے میدان میں یک دم بلندی پر پہنچ جائیں گے بالفرض آپ کُو سی نہیں ہیں تو بھی فکر مت کیجئے۔ اپنے ادموں کو ذرا لفٹ دیں، وہ آپ کو چشم زدن ں بہت کچھ بنا دیں گے۔



عزت کرانے کا گُر یہی ہے کہ آپ دوسروں کی عزت کریں

مس اُنھوں نے فحش اور جذباتی ناول لکھنے شروع کر دیئے چوں کہ اس لائن میں مد مقابل کم تھے اور آمدنی لامحدود تھی، اُن کے وارے نیارے ہو گئے۔ مگر اُنھوں نے یہ لائن بھی چھوڑ دی کیوں کہ اس سے نام نہیں ملتا تھا اور جب کبھی کوئی پُوچھتا "قبلہ آج کل کیا شغل ہے؟" تو انھیں آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دینا پڑتا تھا۔ اب اُنھیں ایک بہت بڑھیا دھندہ مل گیا ہے — سپاس نامے لکھنے کا۔ اس میں پیسے بھی اچھے ملتے ہیں اور نام بھی کافی ہوتا ہے۔

اگر آپ کو سپاس نامے لکھنے کا نُسخہ معلُوم نہیں ہے تو پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ دُنیا میں کوئی بھی اپنا ٹریڈ سیکریٹ نہیں بتایا کرتا۔ مگر ہم بتائے دیتے ہیں۔ اُستادوں کا بتایا ہوا بہت ہی مجرّب نُسخہ ہے۔ سب سے پہلے سپاس نامے کے بجٹ پر غور کیجئے۔

شہرت کے ڈنکے بجوانے کے لئے دی گئی رقم میں سے آدھا حصّہ تو آپ فوراً اپنی جیب کے حوالے کیجئے۔ یہ آپ کا پیدائشی حق ہے۔ باقی رقم سے سپاس نامے کی ضخامت واشاعت اور کوالٹی کا تخمینہ لگائیے بجٹ کے مطابق کاغذ وہائٹ پرنٹ سے

اگر آپ فاقہ مستی کے شکار ہیں اور عزّت افزائی کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تب بھی آپ نا اُمید کیوں ہوتے ہیں۔ اگر عزّت کرا نہیں سکتے تو عزّت کیجئے اور دوسروں کو سپاس نامے پیش کیجئے۔

ہمارے خیال میں تو آپ سپاس نامے لکھ دیجئے اور جی حضوریاں کرنے کا پیشہ کیوں نہ اپنا لیں! آپ کی چاندی ہو جائے میرے ایک واقف کار پہلے ایک جرنلسٹ تھے اُس لائن میں کامیابی نہ ملنے کی صُورت

لے کر آرٹ پیپر تک اور چھپائی ادم بائو کی ۱۹۱۰ کی ٹریڈل سے لے کر ماڈرن پرنٹرز کی آفسیٹ تک پر ہو سکتی ہے۔ ہاں، اگر دینے والا رحم دل ہے تو سپاس نامے کو چورنگی طباعت سے رنگا رنگ کر دیجیے۔

اب رہا مواد، یہ کام تو بہت ہی آسان ہے۔ آدھا حصّہ تو صاحبِ موصوف کے خاندان، حسب و نسب اور تعریفوں کے پُل باندھنے میں ہی لگ جائے گا۔ باقی کے آدھے کے لیے اِدھر اُدھر سے قصّے کہانیاں، لطیفے غزلیں اور نظمیں انتخاب کر لیجیے۔ اس بات کو دماغ سے خارج کر دیجیے کہ آپ کا جمع کردہ مواد صاحبِ موصوف سے کچھ نسبت رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ آپ کا حرفِ مطلب تو اپنے سپاس نامے کو ضخیم تر بنانا ہے۔ یہ سب مضامین لکھنے کا دردِ سر اپنے ذمّے نہ لیجیے کیوں کہ یہ بڑی جانفشانی کا کام ہے اور اگر آپ نے محنت کر کے ہی کچھ کمایا تو کیا خاک کمایا!

آج کل ایسے مضامین لکھنے والے عالم ٹکے سیر ملتے ہیں۔ آپ ایسے چار پانچ حضرات کو سپاس نامے کی عظمت کا خاکہ کھینچ کر کچھ خطوط لکھ دیجیے۔ آناً فاناً مضامین آ جائیں گے اور آپ کو بہت کم داموں میں اچھی تخلیقات دستیاب ہو جائیں گی۔ اگر مزید کمی باقی رہے تو بقایا حصّے کو کچھ مشہور و مرحوم ادیبوں کے اقوالِ زرّیں سے پُر کر دیجیے۔ آپ کے لیے کسی قید و بند کی ضرورت نہیں۔ کہیں سے بھی کوئی چیز چُرا لیجیے۔ ہاں، بیچ بیچ میں کچھ تصویریں دینا نہ بھولیے گا۔ ورنہ سپاس نامے کی ضخامت کا وزن برقرار رکھنے میں دشواری آ جائے گی۔

اس طرح تیار شدہ سپاس نامے میں سے بٹّے بٹانے کے بعد جو بچے اُسے بیچ کر پیسہ جیب میں ڈال لیجیے۔ نہ بکے تو بھی آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ جتنا مل گیا، اُسی پر قناعت کیجیے۔

ویسے سپاس نامے لکھنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے لیکن وہ ذرا ٹیکنیکی ہے۔ اس طریقے کی تکنیک کے مطابق مواد پہلے سے ہی فراہم کر لیا جاتا ہے۔ جیسے ہی کوئی اسامی ملے، ریڈی میڈ مواد میں اُس کا نام جوڑ کر فٹافٹ چھپوا لیا جاتا ہے۔ اِس طرح کے سپاس نامے لکھنے کے لیے سیاست، ادب، پبلک سروس وغیرہ چار پانچ موضوعوں پر مواد فراہم کر لیا جاتا ہے اور بعد میں جو برانڈ جس خوش قسمت پر فِٹ آئے، اُس میں اُس کا نام چسپاں کر کے چھپوا لیا جاتا ہے۔

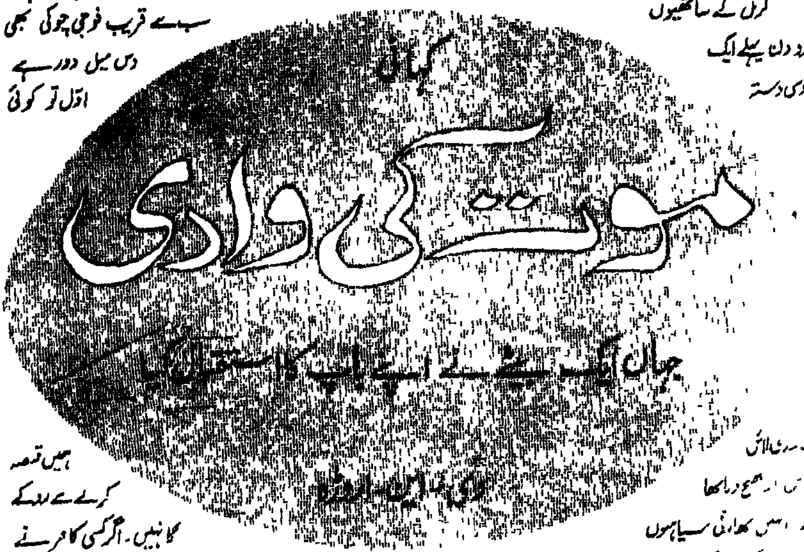
کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سپاس نامے لینے اور پیش کرنے والی کمیٹیوں کے صدر اِس لیے بنے ہوتے ہیں کہ بھلائی کا ثواب کبھی تو ملے گا ہی۔ عجب نہیں کہ ایک دن اُن کی قسمت بھی زور مارے۔ اگر ایسا سُنہری موقع نہ بھی آئے تو کچھ نہ کچھ شہرت تو مِل ہی جائے گی۔ بانٹنے والے کے ہاتھ میں مہندی کا رنگ ضرور لگتا ہے، چاہے تھوڑا ہی سہی۔ اگر آپ کو بھی پیسے کی کوئی طلب نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ایسے لوگوں کے زمرے میں ہی اپنا نام بھی لکھوا لیجیے۔

کوئی بھی ضرورت ہو اور حالات چاہے کیسے ہی ہوں، نام کمانا یا نام کما لینا دنیا قابلِ احترام اور مفید کام ہے۔ نام بغیر دام نہیں مل سکتے۔ کبیر صاحب فرما گئے ہیں — سستا دام کڑوا لگے، میٹھا لاگے دام۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے — سستا نام جینا کڑوا لگتا ہے تو دام چھوڑ دو۔ بھلا نام کے لیے دام لگے [illegible] ہے۔

کرنل آفریدی پے در پے سگریٹ پیئے جا رہے تھے۔ ۵ ر اگست ۱۹۶۵ء کا دن آپہنچا تھا۔ ور اس کے ساتھ ہی ان کے تفکرات بھی آخری منزل پر پہنچ گئے تھے۔ وہ اتنے الجھے الجھے اور کھوئے کھوئے گھوم رہے تھے کہ ان کے ساتھی۔۔۔ میجر جان، کیپٹن اکبر اور صوبے دار گل محمد بھی ان کی پریشانی کو بھانپ گئے تھے۔

کرنل آفریدی کو بار بار یہی خیال ستا رہا تھا کہ انہیں پے سپاہیوں کو جنگ بندی لائن پار کرنے کا حکم دینا ہے۔ ان کے تمام ساتھی اس حقیقت سے واقف تھے لیکن وہ کرنل صاحب کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

کرنل کے ساتھیوں نے دو دن پہلے ایک جاسوسی دستہ



گ ۔۔۔ لائن
۔۔۔ بھیج دیا تھا
۔۔۔ انہیں بھارتی سپاہیوں
۔۔۔ کے بارے میں معلومات
۔۔۔ دستہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔
۔۔۔ بندی لائن سے قریب تین میل کے فاصلے پر
۔۔۔ رجمنٹ کے کیمپ میں زور شور سے تیاریاں
۔۔۔ تھیں۔ جوڑی کی طرح ٹوٹا ہوا چاند پہاڑی کی اوٹ
۔۔۔ جھانک رہا تھا۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔
۔۔۔ کہیں بارہ کا گھنٹہ بجا۔ سگریٹ کو دیا سلائی کی
۔۔۔ ہوئے کرنل آفریدی بڑبڑائے "صوبے دار گل محمد!"
۔۔۔ "گل محمد تن کر کھڑا ہو گیا
۔۔۔ ہمیں یقین ہے کہ تھانو گاؤں کے لوگوں سے

تمہیں پوری مدد مل جائے گی؟ مجھے تو اس میں شبہ ہے۔"

"سر! کل جب میں اقبال اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی رسد اور ہتھیار رکھنے کے لئے اس گاؤں میں گیا تھا تو وہاں کے مجاہدوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ اسلام کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے وہ آج رات ہمارا انتظار کریں گے۔"

"تھانو پر قبضہ کرنے کے لئے تمہیں کتنے آدمیوں کی ضرورت ہے؟"

"سر! گاؤں تو بہت چھوٹا سا ہے مشکل سے ۲۰ گھر ہوں گے۔ ان میں زیادہ تر مسلمان ہیں۔ یہاں سب سے قریب فوجی چوکی بھی دس میل دور ہے اوّل تو کوئی ہمیں قبضہ کرنے سے روکے گا نہیں۔ اگر کسی کا فرنے جواں کی تو اسے جہنم رسید کر دیا جائے گا آپ مجھے فی الحال ۲ آدمی دے دیجئے کل میں تھانو میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

کرنل آفریدی نے صوبے دار کو ٹوکا "فرض کرو کہ تم اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہو پھر کیا کرو گے؟"

"قسم پاک پروردگار کی فتح ہماری ہوگی۔ ہم ان کافروں کے ناپاک پنجوں سے کشمیر کو ضرور آزاد کرائیں گے" صوبے دار جوش میں بولا



نورا بے حس وحرکت کھڑی اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جو
کو مار کر اسے داشتہ بنالیا تھا۔ پچھلے ۱۸ برسوں سے

• صوبے دار گل محمد میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا
ہوں۔ لیکن ۲۰ آدمیوں کی مدد سے تم کشمیر کیسے آزاد کراؤ گے ؟"
• نہیں سر، میں آدمی تو واقعی کم ہیں۔ لیکن... ۲۰ آدمی
کشمیر آزاد کرانے کے لئے کافی رہیں گے۔ میرا خیال ہے کہ
اسی طرح اور دستے بھی دوسرے کیمپوں سے سری نگر کی طرف
روانہ ہوں گے۔"
• تمہارا خیال درست ہے گل محمد" کرنل آفریدی بولے
• لیکن تمہارے ساتھ تو کل ۲۰ آدمی ہوں گے۔ اگر تم ہندوستانی
فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے تو ہم تمہاری کچھ بھی مدد نہ
کرسکیں گے۔ نہ ہی ہم یہ تسلیم کریں گے۔ تم پاکستانی فوج
کے صوبے دار ہو۔"
• انشاء اللہ جیت ہماری ہوگی۔"
• صوبے دار گل محمد، یہ ہیں ان لوگوں کے نام جو تمہارے
ساتھ جائیں گے۔ تم یونی فارم اتار دو اور وہ کپڑے پہن لو جو کل

تمہیں دیئے گئے تھے۔ سفر شروع کرنے سے پہلے تم اپنا نقشہ،
کمپاس اور روپے پیسے وغیرہ اچھی طرح دیکھ لو۔ راستہ وہی
اپنانا جس سے ۱۹۴۷ء میں تم کشمیر میں داخل ہوئے تھے کیپٹن
اکبر کل تمہیں کھانڑ میں ملیں گے۔ آگے کا پروگرام وہی مرتب
کریں گے۔ جاسوسی دستے کے لوٹتے ہی تم تھانو کی طرف
چل دو۔ اچھا خدا حافظ۔"
" خدا حافظ " صوبے دار آہستہ سے بولا اور تن کر کھڑا
ہوگیا۔ کھٹاک کی آواز ہوئی اس کی دونوں ایڑیاں آپس میں
ٹکرائیں اور وہ خیمے سے باہر نکل گیا۔

حالاں کہ دن بھر ایک بھی گولی نہیں چلی تھی مگر تھانو کے
باشندے جانتے تھے کہ حملہ آوروں نے
صرف گاؤں پر ہی قبضہ کرلیا ہے بلکہ انہوں نے آس پاس
سپاہی بھی تعینات کر رکھے تھے کہ کسی گاؤں کا کوئی

آدمی غداری نہ کر سکے ورنہ کامیابی نہیں مل سکتی تھی۔

بظاہر سنفالو میں سکون تھا لیکن لوگ اندر ہی اندر اشتعال کی آگ میں جھلس رہے تھے۔ اقبال اور اس کا بھائی دوسرے گاؤں میں صوبے دار گل محمد اور اس کے آدمیوں کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔

کیپٹن اکبر کے پہنچنے میں ابھی ۱۸ گھنٹے باقی تھے اور صوبے دار گل محمد کو ابھی بہت کام کرنا تھا۔ اقبال کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر جہاں گل محمد نے اپنا عارضی ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا گارے سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی بھی تھی۔ اکثر سنفالو آتے وقت وہ کئی بار اس جھونپڑی کے سامنے سے ہو کر گذرا تھا۔ لیکن اب اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اندر جا کر نورا اور اس کے بیٹے امجد سے ضرور ملے گا۔

"نورا میں تمہیں اپنی بیوی بنانے اور اپنے بیٹے کو لینے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ میں ان گناہوں کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں۔ کشمیر جلدی ہی آزاد ہو جائے گا۔ میں یہیں رہوں گا اور تم سے شادی کروں گا"

نورا بے حس و حرکت کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پتھرائی آنکھوں سے اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جو اس کی زندگی برباد کر گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں گل محمد کوئی سات آٹھ دن تک سنفالو میں رہا تھا اس نے اس کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اسے داشتہ بنا لیا تھا۔ جب کبھی اس نے کوئی بات نہ مانی، گل محمد نے اسے بری طرح زدوکوب کیا تھا۔

پھر جب بھارتی فوجیں آئیں تو گل محمد اسے چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پچھلے ۱۸ برسوں میں نورا نے اس کو بھول جانے کی کافی کوشش کی تھی مگر اس کی یاد سے ہی

> **اس کی زندگی برباد کر گیا تھا۔ اس آدمی نے اس کے شوہر**
> **نورا کا عضو عضو نفرت سے جلنے لگتا تھا۔**

نورا کو بھی پتہ تھا کہ حملہ آوروں نے گاؤں گھیر رکھا ہے وہ پریشان ہو اٹھی۔ ۱۸ برس پہلے اسی طرح حملہ آوروں نے اس کے شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور لوٹتے ہوئے اسے نشانی کے طور پر ایک ناجائز بچہ دے گئے تھے جس کا نام اس نے رکھا تھا امجد۔

گل محمد نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی اور نورا کا نام لے کر پکارا۔ نورا نے دروازہ کھولا تو وہ بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"نورا، تم نے مجھے پہچانا؟"

نورا آواز سے اسے پہچان گئی اور اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔ ی کی دھندلی یادیں اس کی آنکھوں میں ابھر آئیں۔ وہ ہار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اسے لگا جیسے وہ ں کھا کر پڑے گی۔

نورا کا عضو عضو نفرت سے جلنے لگتا۔ اب وہی آدمی اس کے سامنے کھڑا شادی کی پیش کش رکھ رہا تھا

"ماں، یہ کون ہے؟" امجد نے پوچھا۔ اس کی آواز نے نورا کو پھر سے حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ وہ رُندھے ہوئے گلے سے بولی "خدا کے لئے چلے جاؤ گل محمد۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دو۔ مجھے اب شادی کی تمنا نہیں ہے۔"

نورا کی باتوں کی پروا کئے بغیر گل محمد امجد کی طرف مڑا "میرے بیٹے، آؤ میرے پاس آؤ۔ تمہیں اپنے سینے سے لگا لوں۔"

امجد نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی بھی جذبہ نہ پا کر اس نے تعجب سے لمبے چوڑے پٹھان کی طرف دیکھا جو اسے بیٹا کہہ رہا تھا۔ نورا کی خاموشی سے امجد کو پٹھان کی بات پر یقین ہونے لگا۔

حالانکہ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ اس کا باپ ایسا ہوگا۔
"میں ہندوستانی ہوں۔ ایک پاکستانی میرا باپ کیسے ہو سکتا ہے؟" امجد نے دلیل پیش کی۔

گل محمد کی آنکھوں میں چمک آگئی اور وہ نرم لہجے میں بولا "بیٹا پرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ ہمارا رشتہ قوم اور ذات پات کے جھگڑوں سے بلند ہے۔ پھر کشمیر تو اب آزاد ہو رہا ہے۔ اس لئے وقت کے دھارے کے ساتھ بہنے میں ہی عقلمندی ہے۔"

ہماری مدد کرنی ہے۔ ہمیں مشکلوں سے چھٹکارا ملانا ہے۔"
"کیوں نہیں ابا، آپ کا حکم ماننا تو میرا فرض ہے" امجد نے کہا۔

دونوں جھونپڑی سے باہر آگئے۔ نورا نئے نوٹوں کو دیکھنے لگی جو گل محمد نے اسے دئے تھے۔ وہ غریب عورت تھی، اتنا پیسہ اس نے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس نے ایک نوٹ الگ کر لیا اور باقی اپنی جیب میں ٹھونس لئے۔ بڑھیا اور لذیذ کھانے کے تصور نے اس کے تذبذب کو ختم کر دیا تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ

گل محمد نے امجد کو پستول دیا، وہ باپ کے اس تحفے کو پاکر خوشی سے پھولا ہوئے فوجی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اسے بس یہ جلدی تھی کہ وہ کسی

امجد نے کچھ سوچا، پھر گل محمد سے گلے ملنے کے لئے آگے بڑھا۔ جیسے ہی دونوں گلے ملے، گل محمد نے اس کی کمر تھپتھپائی اور پیار سے دعا دی "خدا تیری عمر دراز کرے بیٹا۔"

نورا بُت بنی اس انوکھے ملن کو دیکھ رہی تھی جس کی شروعات بڑے عجیب ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ ویسے اس حادثے کے بعد وہ لوگوں پر ایک بوجھ سی ہوئی تھی۔ دنیا کے لئے وہ ایک ٹھکرائی ہوئی عورت تھی مگر شادی ہوجانے کے بعد سب گناہ دھل سکتے تھے

یہ ٹھیک ہے کہ گل محمد نے اس کے شوہر کو مار دیا تھا لیکن اب وہ اسے سہارا دینے بھی تو آیا تھا۔ حالاں کہ اس عمر میں شادی کی اسے کوئی خاص خواہش نہیں تھی، مگر وقت سے سمجھوتہ کرنا بھی تو ضروری تھا۔ اس کے بعد وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح سر اونچا کرکے زندگی گذار سکتی تھی۔

"نورا" گل محمد نے اس کے خیالات کا تانا بانا توڑا
"یہ لو کچھ روپے ہیں، انہیں اپنے پاس رکھو۔ تمہارے دکھ کے دن ختم ہوئے۔ آج اس خوشی کے موقع پر بڑھیا کھانا بنانا۔ پھر، تمہیں اپنے دوستوں سے ملاؤں۔ تمہیں تو اب

اپنے تمام غم بھول گئی۔ یہ سب کچھ اس کے لئے نیا تھا۔
گل محمد امجد کو اقبال کے گھر لے گیا، جہاں اس نے اسے اپنا بیٹا بتا کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے متعارف کرایا۔ امجد کو خوش کرنے کے لئے گل محمد نے اس موقع پر ایک ریوالور بھی دیا اور اس میں گولیاں بھرنے اور چلانے کا طریقہ بھی اسے بتایا۔ امجد اس تحفے کو پاکر پھولا نہ سمایا۔

کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد امجد نے جنگل میں مویشی چرانے کے لئے دوستوں سے اجازت چاہی۔ وہ مویشیوں کو لے کر جنگل کی طرف گیا جہاں اس کے دوسرے ساتھی اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے مویشیوں کو چرنے چھوڑ دیا اور خود دس میل دور بنے ہوئے فوجی کیمپ کی طرف چل پڑا۔ دو میل تیز تیز چلنے کے بعد وہ بھاگنے لگا۔ راستہ پتھریلا تھا۔ اس کے پیروں سے خون بہنے لگا۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھو رہی تھیں لیکن وہ ڈھلانوں پر چڑھتا پھرتا بھاگتا ہی رہا۔ اس وقت اسے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ پہلا

گو [illegible] وف میں [illegible] مچی ہوئی تھی مگر امجد تھا۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات گھر کئے تھی کہ جلد سے جلد وہ فوجی کیمپ تک پہنچ جائے۔

گیارہ بجے تک وہ کیمپ تک جا پہنچا۔ پہلے وہ اس لیفٹیننٹ کے پاس گیا جو اس کیمپ کا بڑا افسر تھا۔ اس نے سب باتوں کی تفصیل سنادی کہ کس طرح رات سے پاکستانی حملہ آور اس کے گاؤں میں ڈیرا جمائے ہوئے ہیں۔ اس وقت کیمپ میں

سمایا۔ وہ تیزی سے دس میل دور بنے
نہ کسی طرح جلد سے جلد فوجی کیمپ پہنچ جائے

کل چھ آدمی تھے۔ اسی وقت وائرلیس کے ذریعے دوسری چوکیوں کو اطلاع دے دی گئی اور حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ سپاہی بھیجنے کی درخواست بھی کی گئی۔

امجد کو معلوم تھا کہ گاؤں میں جھگڑا ہوگا اور اسی لئے اسے ماں کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ جلدی سے جلدی گاؤں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ زخمی پیروں سے لنگڑاتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ لیکن اس کا دل خوشی سے بلّیوں اچھل رہا تھا۔ اس نے بڑی مصیبت میں بھی اپنے فرض کو خوب اچھی طرح نبھایا تھا

دوپہر کے ایک بجے گل محمد بڑا شاداں و فرحاں نورا کی جھونپڑی میں آیا۔ اندر تیار ہونے والے خوشبودار کھانوں سے اس کی بھوک بڑھ گئی تھی۔

"آج ہم سب لوگ ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ کل میں سری نگر کی طرف کوچ کرنا ہے" گل محمد امجد کی طرف دیکھتا ہوا بولا

"ابا! کیا آپ مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے؟"
"کیوں نہیں بیٹا" گل محمد نے شانِ بے نیازی سے کہا۔
"ابا! اگر ہم پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟"



"بیٹے ہمارا پکڑا جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ہمیں ہر حال میں پناہ دیں گے۔"

امجد گل محمد کی بات سن کر خاموش ہوگیا۔ نورا کھانا لگا رہی تھی۔ گل محمد نے آستینیں چڑھائیں اور بنا کچھ بولے کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

امجد سے ٹھیک طرح سے نہ کھایا گیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ کھانا ختم کرکے وہ گل محمد کے پاس رکھی ہوئی سٹین گن کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔
"بیٹے اسے مت چھیڑو۔ اگر خدانخواستہ چل گئی تو..."
"نہیں ابا، میں تو اسے چلانے کا طریقہ سیکھ رہا ہوں" امجد بولا۔

تبھی گولی چلنے کی آواز آئی۔
"یہ گولی کہاں چلی؟" گل محمد ایک دم کھڑا ہوگیا۔
"کچھ نہیں ابا۔ فوجی چاند ماری کرتے ہیں تو اکثر گولیوں کی آواز یہاں تک سنائی دے جاتی ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے" امجد صاف جھوٹ بول گیا۔
گل محمد پھر کھانے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری

اسپتال میں ایک لاعلاج مریض کے پاس
ر ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "مجھے
ن زیادہ افسوس ہے کہ میں تمہارا علاج نہ کرسکا
تمہاری کوئی آخری خواہش ہو تو مجھے بتاؤ
، وہی پوری کروں گا۔"
مریض نے نحیف آواز میں کہا "اگر ہوسکے تو
ی اچھے ڈاکٹر کو یہاں بھیج دیں۔"

ایک مسافر سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گیا
ر شکایت کرتے ہوئے بولا "جب ریل گاڑیاں
ر لیٹ چلتی ہیں تو ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟"
سٹیشن ماسٹر بھی بہت حاضر جواب تھا اس نے
ا کہا "جناب عالی، اگر ٹائم ٹیبل نہ ہو تو یہ کیسے
چلے کہ گاڑیاں لیٹ چل رہی ہیں؟"

ماں نے اپنے بیٹے سے کہا "جب تم نے
پہ ڈیڈی کو تقریری مقابلے کے انعام پانے کے
ے میں بتایا تو وہ کیا بولے؟"
بیٹے نے بہت فرمانبرداری سے جواب دیا
ںوں نے کہا: تم بھی اب دھیرے دھیرے
ماں کے نقشِ قدم پر چلنے لگے ہو۔"

سگنل نہ ہونے کی وجہ سے مقررہ چلنے والی
ڑی ایک چھوٹے سٹیشن پر کھڑی ہوگئی تو
فر اس میں چڑھ گیا۔ گارڈ نے اس سے
ی میں سوار نہیں ہو سکتے کیوں کہ یہ
۔"
ی نے فوراً کہا "جناب، اگر یہ گاڑی
یہاں نہیں رکی ہے تو میں بھی گاڑی میں نہیں
چڑھا ہوں۔"

سات سالہ لڑکی نے اپنی استانی سے کہا۔
"آپ نے بتایا تھا کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں
مگر یہ بات غلط نکلی ہے۔"
"وہ کیسے؟" استانی نے حیران ہوکر پوچھا۔
"اگر پانی کی دو دو بوندیں آپس میں ملا کر
رکھیں تو چار بوندیں کہاں ہوتی ہیں۔"

استاد نے لڑکوں سے کہا "کیا تمہیں اُس
وقت غصہ نہیں آتا جب کوئی پیچھے بیٹھ کر باتیں
کرے اور تمہیں پریشان کرے۔"
ایک لڑکے نے باادب کھڑے ہوکر کہا
"سر، بہت غصہ آتا ہے، خاص طور پر جب
سینما میں لوگ پیچھے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

سفر کے دوران ایک آدمی ہر سٹیشن پر
اترتا، پلیٹ فارم پر دوڑ لگاتا، بکنگ ونڈو پر جاتا
اور پھر اپنے اسی کمپارٹمنٹ میں آبیٹھتا۔
آخر ایک ہم سفر نے اس عجیب و غریب حرکت
کا سبب معلوم کیا تو اس نے بہت متانت سے
جواب دیا "بھائی صاحب کیا کہوں۔ بیمار ہوں
اور ہر دم موت کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ لہٰذا
ایک سٹیشن سے دوسرے سٹیشن تک کا ٹکٹ
خرید لیتا ہوں، تاکہ سفر ختم ہونے سے پہلے
اگر قضا آگئی تو فضول خرچی سے تو بچ جاؤں
گا۔"

•

جس سماج میں عورت کی قدر و منزلت کم ہو جائے اُس کی بربادی یقینی ہے" جوہی گرجی "ٹوپے صاحب چلئے میں اُن بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہ نمائی کروں" اور وہ تاتیہ ٹوپے کے ساتھ کیمپ سے باہر آگئی۔

پہلے محفل میں کچھ دل چسپ پروگرام مرتب کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ راؤ صاحب میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مخالفت کر سکیں۔ اس لئے انھیں بادلِ ناخواستہ بھنگ نوشی اور رقص و

شکستِ فاش

چاروں طرف دُور دُور تک کالپی کے کھنڈران اور گھنے جنگل کی خوب صورتی دکھائی دیتی تھی۔ اُوپر چاند کی ٹھنڈی کرنوں نے جال سا بُن رکھا تھا۔

گھنگھور سناٹے کی وجہ سے جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا، لیکن رہ رہ کر جنگلی پرندوں اور جانوروں کے شور اور فوجی کیمپ کے گھوڑوں کے ہنہنانے سے ماحول کا سکون درہم برہم ہو جاتا تھا۔

محفل میں بھنگ کا دَور چل رہا تھا۔ باندہ کے نواب، شاہ گڑھ اور بان پور کے راجہ اور راؤ صاحب اس محفل کے مہمانِ خصوصی تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی اور انگریزوں کے خلاف دفاعی منصوبے تیار کئے جا رہے تھے۔ لیکن نواب صاحب کے اصرار پر راؤ صاحب کو صلاح مشورے سے

سرُود کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا تھا۔

محفل میں شامل ہوئے لوگوں کی نگاہ مہارانی لکشمی بائی کے ڈیرے کی طرف ہوئی تھی، کیوں کہ ناچ گانے سے نفرت جوہی بائی مہارانی کی نازبردار تھی اور انہی کے ساتھ رہتی تھی۔

دفعتاً راؤ صاحب نے "بھیّا صاحب آپ کی فرمائش بھی پوری ہو... تاتیہ جوہی کے ساتھ آرہا ہے۔"

سبھی نے دیکھا کہ ایک خوب صورت... اُن کی طرف خراماں خراماں... تھی۔ اُس کے بدن پر کوئی زیور... اُس کا جسم بظاہر تو عورتوں جیسا... اُس کے چہرے پر بہادروں کا سا... جھلکتا تھا۔



تاتیہ نے آکر کہا " لیجئے راؤ صاحب ،
سے آپ کے حکم کی تعمیل کردی ۔ یہ
) بائی ۔"

نواب صاحب نے دیا " آپ سے
یہی اُمید تھی ڈپے صاحب۔تشریف
با بائی جی ، ہم نے آپ کی تعریف
سنی ہے لیکن آج اُس کی تائید
یں ۔ خدا کی قسم کیا لاجواب حُسن
کا جواب نہیں ۔"
ہی ایک زمانے میں رقاصہ تھی
سے مہارانی لکشمی بائی نے
یں آزادی کی شمع روشن کی تھی
، جھانسی کی ہزاروں عورتوں نے
کی نشانی ـــــ چوڑیاں اُتار کر
بہادری کی شان دکھانے والی تلواریں
ہاتھوں میں اُٹھا لی تھیں اور سات سمندر
پار کے اُن گوروں پر ٹوٹ پڑی تھیں جو
اُن کی آزادی ختم کرنے آئے تھے۔
انہی بہادر عورتوں میں سے ایک جوہی
بائی بھی تھی جسے گھنگروؤں کی جھنکار
کی بجائے تلواروں کی جھنجھناہٹ میں
میں لازوال موسیقی سُنائی دیتی تھی۔

جُوہی نواب صاحب کی بات پر
برافروختہ ہوگئی " نواب صاحب گستاخی
معاف ، یہ وقت خوب صورتی پرکھنے کا
نہیں،تلوار کے جوہر آزمانے کا ہے۔ دشمن
سر پر آپہنچا ہے ۔"

جوہی کے اس جواب کی کسی کو
اُمید نہ تھی ۔ سب لوگ سناٹے میں



آگئے۔ لیکن نواب صاحب نے اس عظیم حقیقت کو اپنی بے عزتی پر محمول کیا اور ناراضگی سے بولے " اری چُپ بھی رہ۔ تو جس لائق ہے وہی کام کر۔ مہارانی صاحبہ کے یہاں گڑھ کر بڑوں کے منہ لگنا بھی سیکھ گئی ہے۔"

" میرا نام تلوار مانجنا ہے، نواب صاحب۔ میں مہارانی لکشمی بائی کی کرنیل ہوں۔ اگر حوصلہ ہے تو میدان میں تشریف لے آیئے۔ آپ کو ثبوت مل جائے گا کہ میں کون ہوں۔"

صاحب کا ہاتھ ار خود اپنی تلوار کے قبضے پر جا پڑا۔ ایک بیوا کے مُنہ سے اس طرح کا چیلنج سُن کر وہ آپے سے باہر ہو گئے اور دانت پیس کر بولے، " بے وقوف عورت، تو لڑے گی مجھ سے؟ جانتی ہے باندہ کے نواب نے اب تک ایک سو سے زیادہ شیروں کا شکار کیا ہے۔

" میں تو اُس وقت جانوں جب آپ گورے بھیڑیوں کا شکار کر کے دکھائیں جو کچھ ہی گھنٹوں میں یہاں آکر ہم پر ٹوٹنے والے ہیں۔"

بات بڑھتے دیکھ کر راؤ صاحب اُٹھ کر نواب صاحب کے پاس آئے اور اُنہیں پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولے " نواب صاحب تشریف رکھئے۔ آپ بھی ایک عورت کی بات کا بُرا مان گئے۔ یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ جُوہی بائی تم رانی صاحبہ کی خدمت میں جاؤ۔"

جُوہی بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ وہاں سے نکل گئی، لیکن اُس کے الفاظ اب تک سب کے کانوں میں گونج رہے تھے " یہ وقت تلوار کے جوہر آزمانے کا ہے!"

راؤ صاحب بولے " نواب صاحب، آپ نہیں جانتے، وہ جھانسی کی شیرنی کے ساتھ رہتی ہے اور میں اُس شیرنی کا دینی بھائی ہوں۔ بچپن سے ہی وہ میرے ساتھ کھیلی کودی اور بڑی ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ایک دلیر عورت ہے۔ اُس سے دُشمنی مول لینا اپنی جان کی بازی لگانا ہے۔ کہیں رانی صاحبہ کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ اُن کی معتبر سپہ سالار کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوا ہے تو بس . . ."

شاہ گڑھ کے راجہ نے مداخلت کی اور باتوں کا رُخ موڑتے ہوئے کہا " چھوڑیئے بھی ان بے کار کی باتوں کو۔ جنگ زشی کا تو ہم نے پورا ارادہ کر لیا

تخییل اتر آئی....

... وفاؤں کی تکمیل اتر آئی
تم آئے تو بہکی اجیل اتر آئی

... کے چہرے ہیں، زلفوں کے ... ہیں
دھرتی پہ کئی جنت کی تفصیل اتر آئی

دو ... ، اس مست ... گیا
دامن میں ستاروں کی قندیل اتر آئی

چاندوں کی شفق پھیلی، سیّال ستاروں میں
یا جام میں ساغر کی اک جھیل اتر آئی

ساون کی گھٹا چھائی، یوں پھول کی چلمن ہے
آنکھوں میں ترے رخ کی تمثیل اتر آئی

اے اہلِ چمن کس کو مصلوب کیا تم نے
ہر پھول کے سینے میں اک کیل اتر آئی

نازاں تھا کبھی خالق جس رازِ حقیقت پر
انسان میں ڈھل کر وہ تخییل اتر آئی

— ظفر غوری

پہلے گوالیار فتح کر لیجئے۔ پھر وہاں آپ کی دلی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ اب کل کی لڑائی کے بارے میں بھی کچھ تیاری کر لینی چاہئے۔"

کا آغاز تاتیہ ٹوپے نے کیا" رانی صاحبہ نے تو اپنا خیال آپ پر ظاہر ی کر دیا ہے۔ ہماری فوج بہادری میں گریزوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوتے وئے بھی منظم نہیں ہے اِس لئے اُس ، کمان بندی کا کام کافی مشکل ہے۔ ج میں کافی بدنظمی ہے۔ مختلف ریاستوں ے آئے ہوئے فوجی سپاہی کسی ایک ص سپہ سالار کی سربراہی میں نہیں ہیں۔ ب تک یہ صورتِ حال رہے گی، ہم گریزوں سے نہیں جیت سکیں گے۔"
"اب یہ باتیں چھوڑئیے ٹوپے صاحب"

نواب صاحب گویا ہوئے "اِس وقت سب باتوں کی تکمیل ہونا بہت مشکل ہے۔ ہماری فوج دُشمن کی فوج سے تگنی ہے۔ سپاہی بھی وفادار ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہاں ایک سپہ سالار کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ پھر اس میں بھی کیا دقت ہے۔ راؤ صاحب ہمارے بنے بنائے سپہ سالار ہی ہیں۔ ہم اپنی دفاع کی کُل باگ ڈور اُن کے ہاتھوں سونپ کر بے فکر ہو سکتے ہیں۔"

صاحب کی تجویز پر شاہ گڑھ اور بانی پور کے راجاؤں نے ہاں ہاں کا طومار باندھ دیا۔ مگر تاتیہ دلیری سے بولا "غلطی معاف ہو حضور۔ میں نواب صاحب کی تجویز سے اتفاق نہیں رکھتا سپہ سالاری کے لئے جتنی لائق و مناسب

رانی صاحبہ ہوسکتی ہیں اُتنا اور کوئی نہیں" پھر نواب صاحب کی طرف مُڑ کر بولا "راؤ صاحب کے بہادر ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر وہ بہت رحم دل واقع ہوئے ہیں۔"

صاحب کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولے "مجھے اس میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ رانی صاحبہ میرے لئے قابلِ تعظیم ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو سپہ سالار انہیں بنا دیا جائے۔"

نواب صاحب بولے "عورتوں کی سپہ سالاری کون تسلیم کرے گا؟ ویسے وہ ہماری پوری معاون رہیں گی۔ لیکن قدرت نے اُنہیں جو نسوانی پیکر عطا کیا ہے، اُس کے آگے سپاہی سر جھکائیں — یہ اُنھیں کیسے گوارہ ہوگا۔ کم سے کم میری فوج تو ایسا کبھی نہ کرے گی۔ دُوسروں کی بات میں کہتا نہیں۔"

"نہیں نواب صاحب ہم کوئی ہجڑے ہیں جو عورت کی سربراہی قبول کرلیں۔ آخر ہماری رگوں کا خون جم تو نہیں گیا ہے: دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے "سکھنڈی" (ہجڑے) لے کر لڑنے جائیں۔"

تاتیہ ٹوپے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بان پور کے راجہ بول اُٹھے "بحث کی کیا ضرورت ہے۔ سب کو راؤ صاحب کی سربراہی منظور ہے اور آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ رانی صاحبہ نے سپہ سالار بننے کی کوئی خواہش نہیں ظاہر کی۔"

"خواہش کا اظہار تو اُس وقت ہو جب کوئی اُن کے سامنے ایسی تجویز رکھے ورنہ انہیں کیا ضرورت ہے کہ سربراہی کا بار دُوسروں پر لادتی پھریں۔ وہ اپنی حفاظت خود کرسکتی ہیں۔ اگر آپ لوگ اُن پر ذمہ داری نہیں ڈالنا چاہتے تو اپنی حفاظت آپ کرنے کا بندوبست کیجیے" تاتیہ ٹوپے نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا اب اپنی حفاظت کے لئے ہم عورتوں کے دامن میں اپنا منہ چھپالیں؟" نواب صاحب ہنسنے لگے۔

شاہ گڑھ اور بان پور کے راجہ بھی ہنسے۔ راؤ صاحب چُپ تھے۔ اور تاتیہ دانت پیس رہا تھا۔

دیر خاموشی رہی پھر بان پور کے راجہ نے مہرِ سکوت توڑا "تو پھر کیا فیصلہ ہوا؟ رات کافی بیت چکی ہے کچھ آرام بھی تو کرلینا چاہیئے۔"

"اب کب تک بحث جاری رہے گی؟ ہوگیا فیصلہ۔ راؤ صاحب فوج کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ کیوں؟" کہہ کر نواب صاحب نے چاروں طرف نظر

لندن کی ایک فرم نے ایک ایسا تالہ ایجاد کیا ہے جسے جعلی طریقے سے کھولنا ناممکن ہے۔ اس تالہ کا نام چیک میٹ ہے۔ تالہ کھولنے کا طریقہ یہ ہے کہ پلاسٹک کا ایک کارڈ جس پر کچھ خاص الفاظ یا اعداد درج ہوتے ہیں ایک جھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دروازہ از خود کھل جاتا ہے لیکن اگر اس جھری میں کوئی جعلی کارڈ ڈالا جائے یا اس پر غلط کوڈ لکھے ہوئے ہوں تو خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے اور عمارت کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

ای اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔
سب نے "ہاں ہاں ٹھیک ہے" کی
رثبت کر دی۔ راؤ صاحب کے چہرے
رعونت آشکار ہونے لگی۔ بولے "میں
س لائق تو نہیں تھا مگر آپ سب
کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی میرے لئے
شکل ہے۔"
محفل برخاست ہونے پر سب لوگ
پنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

فوج نے کالپی کے جنگل کا محاصرہ
کر رکھا تھا۔ بھارت کو آزادی
دلانے والی فوج کے پڑاؤ سے تین چار
میل کے فاصلے پر ہی انگریزوں کا پڑاؤ
تھا۔ لیکن دو دن گذر جانے پر بھی
انگریزوں نے کسی حملہ میں پیش قدمی
نہ کی۔ راؤ صاحب حیران تھے کہ انگریز
بے کار کیوں بیٹھے ہیں۔ وہ دشمن کی چال
کو نہ سمجھ سکے۔
اگلی رات پھر محفل جمی جس میں رانی
صاحبہ بھی شامل ہوئیں۔ انہیں پچھلی
رات کی رنگینیوں کا پتہ تھا اور وہ نہیں
چاہتی تھیں کہ پھر ایسی بات رونما ہو۔ یہی
وجہ تھی کہ وہ بادلِ ناخواستہ محفل میں
آگئیں۔
رانی صاحبہ کی آمد پر راؤ صاحب
حیراں رہ گئے۔ وہ اُن سے بہت خوف
کھاتے تھے۔ رانی صاحبہ کی حکم عدولی
کرنا راؤ صاحب کے بوتے کے باہر تھا
اس لئے وہ اُن کے سامنے پڑنے کا
موقع بھی درگذر کر دیا کرتے تھے۔ مگر
اس رات وہ ششدر رہ گئے۔ بولے
"بائی جو آپ!"
"ہاں راؤ، میں۔ جب مرد غلط

یوگوسلاویہ کا ایک باشندہ ڈیکوڈوسک
گذشتہ ۲۹ دن سے اپنے ایک دوست
کے سر کے بالوں کی گنتی کرنے کی تگ و
دو میں لگا ہوا ہے اور اب تک وہ تقریباً
چار لاکھ بالوں کی گنتی کرنے میں کامیاب
ہو گیا ہے اسے سر کے بالوں کی گنتی کا
شوق اُس وقت پیدا ہوا جب اُسے
دوستوں نے بتایا کہ عموماً انسان کے
سر پر ڈیڑھ سے دو لاکھ کی تعداد میں
بال ہوتے ہیں وہ یہ بات ماننے کے
لئے تیار نہ ہوا اور اپنے دوست کے سر
کے بالوں کی گنتی کرنے بیٹھ گیا۔

راستے پر چلنے لگیں تو عورت کو دخل
دینا ہی پڑتا ہے۔
"آیئے، آیئے، تشریف رکھئے" شاہ
گڑھ کے راجہ نے بہت ملائمت سے
کہا "آپ کا استقبال ہے۔ کیوں نواب
صاحب!"
"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ رانی صاحبہ
تو ہماری مددگار ہیں۔ آپ کی یہ کیا کم
مہربانی ہے کہ اپنی فوجی امداد ہمیں دی
ہے۔"

صاحبہ نواب صاحب کے طنز کو
سمجھ گئیں۔ لیکن اپنے ہمدردوں کے
کے طنز کو برداشت کر لینا ان کی عادت
بن گئی تھی۔ وہ چُپ چاپ بیٹھ گئیں۔
راؤ صاحب چُپ نہ رہ سکے "رانی
صاحبہ کو آپ ایسا ویسا نہ سمجھیں۔ مُردوں
کو زندہ کرنے کا کمال ہے ان میں۔ ان
کے جاہ و جلال کو دیکھ کر دشمن کے ہوش

اُڑ جاتے ہیں" کہہ کر راؤ صاحب نواب صاحب کے طنز کا اثر زائل کرنا چا[ہا]

نواب صاحب اُسی لہجے میں بو[لے]
"ہاں ہاں کیوں نہیں، بے شک ــــ لیکن ــــ"

"لیکن کیا نواب صاحب؟"

"کچھ نہیں رانی صاحبہ۔ میرا مطلب .... عورت میں جوش تو ہو سکتا ہے مگر اُس کے مطابق بہادری وہ کہاں سے لا پائے گی؟ وقت کا تقاضہ اُسے بزدل بننے سے روک سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بہادر بن ہی جائے"

[رانی] صاحبہ تب اپنے منہ اپنی برائی سُن کر بھی سنجیدہ رہیں۔ مگر تاتیہ خاموش نہ رہ سکا۔ جوش میں بولا "نواب صاحب، ابھی تو جھانسی کی لڑائی کے شعلے بھی بجھے ہوں گے۔ چار دن پہلے کی ہی تو بات ہے جب گورے کمانڈر کو کہنا پڑا تھا یہ عورت نہیں کوئی فرشتہ ہے۔ را[نی] صاحبہ کو معمولی عورت سمجھنا اُن کی شا[ن] کے خلاف ہے۔"

شاہ گڑھ کے راجہ نے معاملہ رفع دفع کیا "بحث کیوں کرتے ہیں ٹوپے صاحب! نواب صاحب نے تو مذاق میں عورتوں کی بات کہی تھی اور آپ نے اُس کا تبنگڑ بنا دیا۔ چھوڑو ان جھگڑوں کو۔ ایک دوسرے کی بہادری مت جانچو۔ کل کی طرح دلچسپ پروگرام آج بھی ہو جائیں۔ مثلاً وِجے بھوانی دیکھنے کو۔"

رانی صاحبہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے مگر جواب ٹوپے نے دیا "دیکھئے کل میں نے راؤ صاحب کی بات مان کر یہ باب

ایک دِن میں بازار میں ٹہل رہا تھا کہ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو بازار میں گھوم رہی تھی اُس کے پیچھے پیچھے دو من چلے نوجوان آپس میں باتیں کرتے چل رہے تھے۔

مجھے بھی اُس لڑکی اور اُن دونوں لڑکوں سے کچھ دلچسپی ہوئی اور میں بھی اُدھر ہی کو چل پڑا۔

آگے ذرا بھیڑ تھی لڑکی کی رفتار دھیمی ہو گئی اور وہ قریب رُک سی گئی ــــ دونوں لڑکے بھی اُس کے برابر پہنچ گئے۔

اُن میں سے ایک بولا "محترمہ، آپ کا جوتا بھی منہ نکال کر بازار کی رونق دیکھ رہا ہے؟"

لڑکی نے اُن کی طرف دیکھ کر فوراً جواب دیا "جی ہاں یہ آپ کی کارگزاریوں کو دیکھ رہا ہے"

دوسرے لڑکے نے بڑے اطمینان سے کہا "محترمہ، آپ بجا فرماتی ہیں۔ دراصل آج کا زمانہ ہی یہ ہے کہ بہنیں اپنے بھائیوں کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہیں ــــ"

لڑکی اِس خلافِ توقع جواب کو سُن کر ششدر کھڑی رہ گئی۔

اس کے علاوہ اُس بے چاری کے پاس اور چارہ ہی کیا تھا۔ اُس نے اُن لڑکوں کو بدمعاش سمجھا تھا مگر لڑکے بدمعاش نہیں تھے اُن میں شرافت موجود تھی اور اِسی لئے انہوں نے یہ بات کہی۔ شیدالظفر خاں، شاہ جہان پور

اس فیچر کے لئے اپنے دلچسپ تجربات بھیجئے شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ ایڈیٹر

کرنا منظور کرلیا تھا لیکن آج اسے دوہراؤں گا نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے! جواں مردی اور بہادری کی کوئی بات نہیں۔ لڑائی کے منصوبوں کی جگہ ہنسی مذاق؟ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر دشمن کی توپیں گڑگڑا رہی ہیں اور ہم بھنگ کے نشے میں جیسے کان بند کئے ہیں۔ لعنت ہے ہم پر۔ اس وقت تو ہمیں اپنے تحفظ اور فوجی سنگٹھن (تنظیم) کے بارے میں مشورہ کرنا چاہئے۔ ہمارا ایک، ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔"

بان پور کے راجہ تاتیہ ٹوپے کی بات پر ہنسے "ارے ٹوپے صاحب، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے پاس بہت بڑی فوج ہے۔ اس کے سامنے انگریزوں کی بساط ہی کیا ہے! اور پھر وجے بھوانی (بھنگ) کی مستی میں عقل اور طاقت دوگنا کام کرنے لگتے ہیں۔ جلدی کیجئے۔ زیادہ نہیں، ایک ایک پیالی ہی بہت رہے گی۔"

اب رانی صاحبہ سے ضبط نہ ہو سکا "کیا آپ لوگوں کی مرضی ہے کہ میں آپ سے الگ ہو جاؤں؟"

"نہیں نہیں رانی صاحبہ" چاروں طرف سے آواز آئی۔

"تو پھر بھنگ بھوانی کا ذکر چھوڑ دیں۔"

طرف سناٹا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد راؤ صاحب بولے،

"دیکھئے رانی صاحبہ کی عزت افزائی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اگر وہ نہیں چاہتیں تو آج کا پروگرام ملتوی کر دیجئے۔ پہلے گوالیار فتح کر لیجئے۔ پھر آپ کی تمام کسر پوری کر دی جائے گی۔"

ایک روز ہم لوگ اپنے ایک رشتے دار کے یہاں جا رہے تھے۔ اور ہمارے ساتھ ہماری دادی تھیں۔ اچانک سامنے سے میری ایک سہیلی جو پتلون پہنے ہوئے تھی آ گئی اور مجھ سے ہم کلام ہو گئی۔

دادی صاحبہ ٹھٹک کر رک گئیں، پہلے تو میری اور اس کی طرف حیرت سے تکتی رہیں پھر قہرآلود نگاہیں ڈالتی ہوئی جانے کیا کیا بڑبڑاتی آگے بڑھ گئیں۔ میں اور میری سہیلی باتیں کرتے ہوئے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دادی صاحبہ کبھی کبھی غضبناک نگاہوں سے ہمیں پلٹ کر دیکھ لیتیں۔

تھوڑی دیر بعد سہیلی چلی گئی اور میں آگے بڑھ کر سب سے جا ملی۔ مجھے دیکھتے ہی دادی کا پارہ چڑھ گیا "شرم نہیں آتی سڑکوں پر غیر مردوں سے بات چیت کرتے ہوئے۔ اسی لئے تو میں کہتی تھی کہ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دلانا اچھا نہیں۔"

"مگر میں نے کب غیر مردوں سے بات چیت کی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اے لڑکی اب کیا میری آنکھوں میں دھول جھونکے گی۔ ابھی تو تو اس لڑکے سے باتیں کرتی چلی آ رہی تھی کدھر گیا وہ؟" انہوں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا

میری چھوٹی بہن جو اب تک بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کئے تھی بے اختیار ہنس کر کہنے لگی "دادی جان وہ لڑکا نہیں، باجی کی سہیلی ہے۔"

—— انجم طلعت، بنگلور

اس فیچر کے لئے اپنے دلچسپ تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی — ایڈیٹر

اُسی وقت زبردست دھماکے کی
آواز سے تمام جنگل گونج اُٹھا۔ رانی
ایک جھٹکے سے اُٹھیں اور بولیں "لیجیے کسر
پُوری ہو گئی۔ دُشمن کی توپوں نے گڑگڑانا
شروع کر دیا ہے۔ جاؤ تاتیہ اِنھیں بھنگ
بھوانی پلا ہی دو تاکہ اس کے نشے میں
وہ گڑگڑاہٹ اچھی طرح سُنائی دے۔"
"کیوں شرمندہ کرتی ہیں بائی جُو" راؤ
صاحب بولے "ہمیں کیا معلوم تھا کہ دشمن
اس طرح دھوکے سے ہم پر حملہ کر دے
گا۔"

"اس میں دھوکے کی کیا بات
ہے؟ دو دن تک دشمن نے ہمیں موقع
دیا کہ ہم ہی حملہ کریں مگر جب ہم خاموش
بیٹھے رہے تو کیا وہ ہماری طرح بُزدل
بن جاتا!" رانی صاحبہ نے کسی مصلحت
سے ہی بزدل لفظ کا استعمال کیا تھا تاکہ
اُن کے سوئے ہوئے معاونین میں حرارت
پیدا ہو جائے۔

تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ نواب
صاحب بھڑکے "ہم بُزدل ہیں
رانی صاحبہ۔ آپ برائے مہربانی ہمیں
چیلنج نہ دیں ورنہ ——"
"میں نہیں دُشمن چیلنج کر رہا ہے۔
اُسے دکھائیے اپنے جوہر۔"
تھوڑی دیر میں ہی وہ پُرسکون جنگل
خطرناک میدانِ کارزار بن گیا۔ دونوں
طرف سے دیوقامت توپیں گولے اُگل
رہی تھیں۔ لاتعداد گھوڑے اِدھر سے
اُدھر دوڑ رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا
تھا۔ صرف کچھ مشعلوں اور چاند کی روشنی
سے اتنا نظر آتا تھا کہ کون کدھر بھاگ
رہا ہے۔

اس اچانک حملے میں انگریزی فوج
کامیاب رہی۔ بھارتی سپاہی بہت زیادہ
تعداد میں کام آئے۔ اس صورتِ حال
میں رانی صاحبہ کے ایما پر راؤ صاحب
نے بخوشی واپس ہونے کا ارادہ کیا۔

کی عظیم شکست نے راؤ صاحب اور
اُن کے معاونین کو بڑا اچھا سبق
دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح گوالیار
کے موقع پر حالات کے سامنے مجبور ہو کر
ایک عورت کے سامنے سب لوگوں نے
اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ رانی صاحبہ کو
سپہ سالار بنا دیا گیا۔ عورت نے اپنے
فرائض کی تکمیل خوب اچھی طرح کی اور
گوالیار کے قلعہ پر بھارتی سپاہیوں کا
پرچم لہرا اُٹھا۔
انگریز دنگ رہ گئے۔ گوالیار کے
قلعہ سے ہاتھ دھو کر وہ کالپی کی فتح کو
بھی بھول گئے اور دن رات اِسی اُدھیڑ
بُن میں لگ گئے کہ کھوئے ہوئے قلعہ
کس طرح قبضہ کیا جائے۔
بھارتی فوجیوں کو اپنی کامیابی پر
بڑا ناز ہونے لگا وہ خوشی میں جھوم جھوم
اُٹھے۔

صاحب کے اصرار پر راؤ صاحب
نے کالپی میں کیا ہوا اپنا وعدہ
پورا کرنے کا تہیہ کیا۔ وہ گویا ہوئے۔
"نواب صاحب، آپ تو محفل کی فرمائش
کرنے لگے مگر ہم اس سے زیادہ بڑھ
کر ایک ایسی محفل سجائیں گے کہ دشمن
بھی جل بھُن کر خاک ہو جائے۔"
"راؤ" رانی صاحبہ بلند آواز میں
بولیں "تو جشن منا کر آپ پھر وہ

غلطی کریں گے جو کا لپی میں کی تھی۔ دشمن
پنی شکست سے ڈر کر بھاگ نہیں گیا،
لہ لینے کے لئے ہمارے آس پاس
ہی منڈلا رہا ہے۔"

راؤ نے چڑ کر کہا "بائی جو، آپ
تو ہر وقت ڈرتی رہتی ہیں۔ اطمینان
رکھیں ہم لوگ آپ کو جھانسی بھی واپس
دلا دیں گے۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے
ہیں۔"

وہ جشن کی رات تھی۔ گوالیار کی تاریخ میں ایسا جشن کبھی نہ ہوا تھا۔ چوں کہ فتح شان دار تھی اس لئے جشن بھی شان دار منایا گیا۔ لیکن اِس کام کے لئے وقت مناسب نہ تھا۔

رانی صاحبہ اپنے خیمے میں تمام رات جاگتی رہیں۔ راستہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی حفاظت ایک چوکیدار کی طرح کر رہی تھیں۔

رانی صاحبہ کا اندازہ ٹھیک ہی تھا جشن کے دل نواز نغموں میں ہی جنگ کے بگل گونج اٹھے۔ رانی صاحبہ کو اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ قلعہ میں جا کر اپنے غافل ساتھیوں کو ہوشیار کر سکیں۔

وہ اپنے گنے چنے سپاہیوں کو لے کر میدانِ جنگ میں آتر پڑیں اور اپنی تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ ہزاروں گورے فوجی دنگ رہ گئے۔

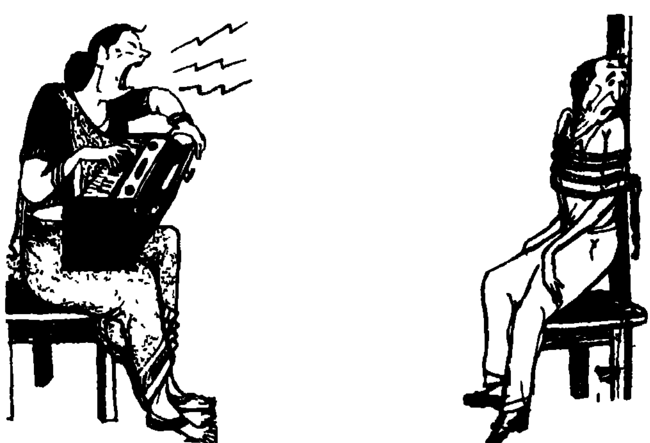
اِس سے پہلے کہ بگل کی آواز قلعہ میں پہنچے، انگریزوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا۔

راؤ صاحب بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔

یہ شکست تھی مردوں کی، مغرور آدمیوں کی، جو اپنے کو سورما کہنے کا دم بھرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے لئے عورت نے اُن کی سربراہی کی باگ ڈور سنبھالی تو گوالیار کی فتح کا ہار انھیں پہنایا لیکن آدمی مغرور ہوا تو اُسے فوراً اس کا بدلہ ملا، شکستِ فاش کی شکل میں۔

یہ عورت کی بے عزتی کا بدلہ تھا۔

رانی صاحبہ نے جنگ آزادی میں اپنی قربانی دے دی اور یہ قربانی اِس بات کا ثبوت ہے کہ عورت کی بے عزتی مرد کی شکستِ فاش ہوتی ہے۔ •



"میرا گانے کا ریاض ہو جائے گا اور تمھارا سننے کا یا

گاندھی دھام کے ایک انگریزی میڈیم سکول میں قانون شکنی کرنے والے طلبا کو فراک پہنا کر کلاس میں بٹھانے کی سزا دی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے سکول میں چند مختلف سائزوں کے فراک رکھے گئے ہیں۔ سزا دہی کے اس طریقے پر یہاں کے باشندوں میں حیرت اور غصے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محکمۂ تعلیم کو اس سلسلے میں تفتیش کر کے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔

—— روزنامہ انقلاب بمبئی
(بھیجنے والے: ایم وائی انصاری، ناسک)

رومانیہ میں داڑھی رکھنے والوں کے لئے لائسنس کی شرط لگادی گئی ہے۔ کمیونسٹ حکومت کو یہ قدم اس لئے اٹھانا پڑا کیوں کہ لوگ فیشن کی تقلید میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگے تھے —— روزنامہ آج، بمبئی
(بھیجنے والے: عبدالمجید انصاری، کلکتہ)

کانپور کے ۷۰ مرکزوں میں ایک سو طلبا نے امتحان دیتے وقت ناجائز طریقوں کا استعمال کیا۔ دو طلبا کو رنگے ہاتھوں پکڑ بھی لیا گیا ہے۔ اس سب کی ذمہ داری ممتحنوں پر آتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر امتحان کے وقت ایک ممتحن صاحب نیم کے سائے میں چارپائی بچھائے سو رہے تھے۔

—— روزنامہ پرتاپ، دلی
(بھیجنے والے: ہربنس لال صوری، دہرہ دون)

بستر ضلع کے گاؤں کھاپڑار میں راشن کی ایک
دکان ۱۹۶۳ سے رجسٹرڈ ہے۔ جب سے ا
اس دکان کے لئے راشن دیا جا رہا ہے۔ مگ
آدمی کو یہاں سے راشن لیتے تو اسی وقت
جاتا جب اس دکان کا وجود سرکاری فائلو
علاوہ کہیں ہوتا۔ —— روزنامہ آزاد
(بھیجنے والے: ایس ایچ شبر، اتر

پچھلے دنوں پنجاب کے ضلع کپورتھا
زبردست سیلاب آگیا۔ انجینئروں کی تحقیقات
مطابق دریائے بیاس کے باندھ میں چوہو
سوراخ کر دیئے تھے۔ جس کی وجہ سے با
کھوکھلا ہوگیا اور دراڑیں پڑجانے کے سبب
سیلاب آگیا۔ —— ہفت روزہ بلٹز
(بھیجنے والے: ایم یوسف، مالیگ

۱۱ نومبر ۱۹۶۶ صبح پونے نو بجے کی ا
خبروں میں نشر کیا گیا کہ سری نگر میں مسلمانوں
میلاد النبی کی تقریب بڑے جوش و خروش سے
اور ہزاروں لوگوں نے درگاہ حضرت بل میں مو
کا دیدار کیا۔ جب کہ فی الواقعہ یہ تقریب وہاں معرا
کے نام پر منائی گئی تھی اور عید میلاد النبی کی تقر
ماہ پہلے منائی گئی تھی۔ —— روزنامہ الجمعیۃ
(بھیجنے والے: زیڈ ایچ اے جادو والا، انا

اس بار کی بہترین کلنگ پر زیڈ ایچ ا
والا، اندور۔ کو پانچ روپے کی کتابوں کے ا
مستحق قرار دیا گیا۔ آپ بھی اپنے کلنگ بھیجئے

کہانی

گُمان سنگھ

بینگنی بُو

روشنی میں اندھیرا، اندھیرے میں روشنی، ٹھنڈ میں گرمی اور گرمی میں ٹھنڈ۔ اس سے نجات ملی تو پھر عجیب وغریب بینگنی رنگ کی بُو!

میں پڑا ہوا جیون سیٹھ اپنی بدنصیبی کے
بارے میں سوچ رہا تھا۔ ے جانے پر
تھی اس سے تو کوئی بھی خاموش طبیعت والا
پاگل ہو اٹھتا پھر جیون سیٹھ تو بہت جلدی پریشان
ہونے والا آدمی تھا۔ جھنجھلاہٹ میں اس نے اپنا ہاتھ
پٹخا۔ ہاتھ اس کے آہنی پلنگ پر جا لگا لیکن
عجب ہوا کہ اس طرح لوہے پر ہاتھ ٹکرانے سے
تکلیف کی بجائے راحت محسوس ہوئی اس بات
پر اور بھی غصہ آیا اور پھر اسے پورا واقعہ دہرانے
لگا۔

دوپہر کو اپنا سٹور بند کرکے وہ کھانا کھانے کے
لیے سکوٹر پر گھر جا رہا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا
کہ ہاضمہ خراب ہونے کی وجہ سے بازار کا کھانا
راس نہیں آتا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس کے لڑکے
کے ہاتھوں پھینکے گئے لوہے کے کچھ ٹکڑوں سے
سکوٹر کا اگلا ٹائر پنکچر ہوگیا

... گھر میں داخل ہوتے ہی ... چلایا ... اس
... نے دم کر دیا ... معافی
... باورچی خانے سے ... آواز آئی

اس نے زور سے ٹھوکر لگا کر باورچی خانے کا دروازہ
کھولا۔ اپل وہاں ایک سر پر کھلائے ہوئے ایک بیٹے کو
دیکھ رہا تھا

"دیکھو تمہاری وجہ سے میرے سکوٹر کا ٹائر پنکچر
ہوگیا" اس نے غصے سے کہا "اس کی مرمت کرانے
کے لیے تیرے جیب خرچ میں سے پیسے کاٹے جائیں گے۔"

"میں اپنی غلطی پر نادم ہوں" لڑکا بولا

"کوئی بات نہیں" نارو نے اپنے اکلوتے لڑکے کی
طرف داری کرتے ہوئے کہا "تمہیں تھوڑا ٹھنڈا ہو کر
کر چلنا چاہیے۔" اپل نے تو کہا تھا کہ وہ کھانے سے فارغ
ہو کر اپنی تمام چیزیں راستے سے ہٹا لے گا۔ اور میں نہیں
کئی بار منع کر چکی ہوں کہ ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا کرو
تم بیکار ہی ناراض ہوتے ہو۔"

"ناراض؟ تو ناراض ہونے والی بات ہی ہے
سکول کے بعد دکان ... آیا کیوں کرے اسے اکھسر ...
ذہن سوار ہے ... اکھسر ... گا، میری مدد کو
نہیں سکا۔"

"... اس کا جی چاہے کرے گا
... کہا ... سیٹھ ... اس کی بیوی کے

درمیان اسی طرح کی گفتگو آئے دن ہوا کرتی تھی۔
"ذرا دھیرے" انل بولا "ورنہ میں کچھ نہیں سمجھ پاؤں گا۔"

کو جب غصہ آتا تھا تو اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اس نے جھپٹ کر نقشہ اٹھایا اور اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔
"ہائے! یہ کیا غضب کر ڈالا آپ نے؟" لڑکا چلایا۔
"اب ہائے ہائے بند کرو۔ میں تمہیں اس طرح بیکار وقت ضائع نہیں کرنے دوں گا۔ تم روز کھانا کھانے کے بعد دکان پر آیا کروگے۔ سمجھے؟"
"نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ یہیں رہے گا، اور پڑھے گا۔ تمہارا دل چاہے تو ابھی لوٹ جاؤ اور کسی ہوٹل میں کھانا کھالو" پاروتی نے چلا کر کہا۔
"تمہیں پتہ ہے وہ کھانا میں نہیں کھا سکتا۔"
"لیکن اب تمہیں وہی کھانا پڑے گا۔ یہاں تو تمہیں اب کھانا ملے گا نہیں۔ کیا میں تمہارے لئے ہر وقت رسوئی گھر میں ہی گھسی رہوں؟"
"میں کیسے جاؤں؟ ٹائر تو پنکچر ہوگیا۔"
مگر اُسے لوٹنا ہی پڑا۔ اپنا سکوٹر پنکچر ہونے کی وجہ سے اسے ٹیکسی لینی پڑی۔ ٹیکسی اور ہوٹل میں پیسے بھی خرچ ہوئے اور لوٹنے میں دیر بھی ہوگئی۔
جب وہ دکان پر پہنچا تو وہاں مسز گلاٹی آگئیں، جن کا آنا کسی مصیبت کے آنے سے کم نہ تھا۔ وہ پچاس برس کی دراز قامت دبلی پتلی عورت تھیں۔
اُنہوں نے کہا "میری کرسی کے ہتھوں پر لگا سلیپ کور خراب ہوگیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا، میں نے وہ کپڑا آپ ہی کے یہاں سے خریدا تھا۔"
"لیکن اس بات کو سات برس ہو چکے ہیں" جیون سیٹھ نے جواب دیا۔
"سات نہیں ساڑھے چھ" مسز گلاٹی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اس کے لئے دام تو زیادہ دیئے گئے تھے۔ اتنی مہنگی چیز کچھ دن تو چلنی چاہیئے تھی۔"
"اس ورائٹی کا کپڑا تو اب ملے گا نہیں۔ مگر اس کی

بجائے یہ ڈیزائن دیکھئے۔ کتنے عمدہ اور نئے ہیں۔"
"جناب، میں پورا سلیپ کور نہیں مانگ رہی ہوں صرف ہتھوں کے لئے ہی دے دیجئے۔ میرا خیال ہے دو گز میں کام چل جائے گا۔"
"دو گز!" جیون سیٹھ قدرے حیران ہوا۔
"ہاں بس اتنا ہی۔"
"وہ چیز تو برسوں سے نہیں آرہی ہے" اس ایک الماری کھول کر کچھ نکالا "اسے آزما کر دیکھئے۔ اس رنگ کے ساتھ یہ رنگ میچ کر جائے گا۔"



"میں تو اسی کوالٹی کا چاہتی ہوں" ... پر ڈٹی رہی۔
"اس کے لئے تو آرڈر دیا ہوگا۔ ... بیوپاری کے پاس وہ مال پڑا ہو۔"



"پہلے اپنے یہاں دیکھ لیجئے۔
آپ کو کیا پتہ کہ آپ کی ان الماریوں میں
کہاں کہاں کیا کیا دبا پڑا ہے۔"

جیون سیٹھ کا غصہ بڑھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور کنپٹیوں پر ہتھوڑے سے چلنے لگے۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ چلا پڑے لیکن اس نے دھیرے سے کہا "ابھی دیکھتا ہوں مسز گلاٹی۔"

مسز گلاٹی اس علاقے کی انجمنِ خواتین کی صدر تھیں اور تمام عورتوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ جیون سیٹھ کو خدشہ ہوا کہ اگر اس نے موصوفہ کی شان میں ذرا بھی گستاخی کی تو کوئی خاتون اس کی دکان پر پھٹکے گی بھی نہیں۔

کے اندر اوپر کی طرف بین اور چھجے بنا کر سامان رکھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے سیڑھی لگی تھی۔ جیون سیٹھ سیڑھی کے ذریعے سب سے اوپر کے حصے پر پہنچا اور وہاں تلاش شروع کر دی۔ لیکن ساڑھے چھ سال پہلے فروخت کئے سامان کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ وہاں کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔

اوپر سے ہی مسز گلاٹی کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کچھ نکالنا چاہا مگر اسی وقت سیڑھی پیچھے سرک گئی۔ اس کا ماتھا چھجے سے ٹکرایا۔ بعد میں جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے" جیون سیٹھ چلا کر بولا "کم از کم بتی جلا دو۔"

"بہت اچھا ڈیئر" اس کی بیوی پاروتی نے بہت سے کہا "گھبراؤ نہیں۔ ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے۔"

جیون سیٹھ کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی۔ اس رحمت آواز میں کہا "مجھے ہو کیا گیا ہے؟ کیا میں اندھا ہو گیا ہوں؟ مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

"یہ کتنی انگلیاں ہیں؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

جیون اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ سے دیکھ رہا تھا

(باقی صفحہ ۱۱۰ پر ملاحظہ کریں)

مسلسل ناول   جان اوہنید

شھنشاہ جہانگیر کی بے پناہ مے نوشی کے تدارک کے لئے ملکہ نورجہاں نے اپنے ایک معتبر منصب دار رستم کو مشہور حکیم شہاب کو بلانے کے لئے بھیجا۔

یہ قاصد ایک قافلے کے ساتھ چلنے والی ایک حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ ایک پڑاؤ پہ اُس کا گھوڑا ایک خون خوار چیتے کو دیکھ کر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ جب رستم کی آنکھ کھلی تو وہ اُسس کی تلاش میں نکلا اور اُسے پہاڑی چشمے کے قریب پالیا۔ وہاں سے واپسی پر اُس نے ایک پہاڑی پر بندیلے ڈاکوؤں کو نقارہ بجاتے دیکھا۔

رستم میرِ کارواں کے پاس آیا اور اپنا شک ظاہر کیا کہ بندیلے ڈاکو برقع پوش حسینہ (جس پر رستم عاشق ہوا تھا) کا اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ میرِ کارواں بہت زیادہ بزدل اور لالچی قسم کا انسان تھا۔ اُس نے بندیلے سردار کے پاس جاکر وعدہ کیا کہ وہ اُس حسینہ کو اُس کے پاس پہنچا دے گا مگر رستم کی بروقت مدد نے سب منصوبوں کو ناکام کر دیا اور لڑکی اور اُس کی ماں کو خطرے سے صاف بچا کر ایک حفاظتی دستے کے ہاتھوں سونپ دیا۔ رستم کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُن عورتوں کا ساتھ نہ چھوڑے مگر اُس کے سامنے ایسا عظیم مقصد تھا جس کے لئے اُسے مجبوراً رخصت ہونا پڑا۔

حکیم شہاب کے پاس ٹھہرنے کے دوران ایک رات رستم نے سامنے کی پہاڑی کی تلہٹی میں ایک جگنو کو اُڑتے ہوئے دیکھا مگر جب اُس نے بغور اُس روشنی کو دیکھا تو وہ کچھ سُرخی مائل تھی۔

شام کے وقت رستم اپنے قیام کی جگہ سے وادی میں جانے والی پگڈنڈی پہ ہو لیا۔ ایک چٹان کے پاس پہنچ کر رستم نے چھ فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا ایک درّہ دیکھا وہ بلا کسی خوف و دہشت کے اُس میں داخل ہو گیا۔ وہاں اُسے ستار کی سُریلی آواز سُنائی دی۔ سامنے ایک وسیع میدان تھا اور اُس میں کچھ مویشی بھی چر رہے تھے۔ وہ سُرنگ میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ اُسے چٹانوں کی اوٹ میں ایک مُسلح پہرے دار کھڑا دکھائی دیا جس کا چہرہ دُوسری طرف تھا۔ وہ واپس ہونا چاہتا ہی تھا کہ اُسے کسی کے قدموں کی آواز اپنے قریب سُنائی دی۔ وہ عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ وہ اپنے کو خطرے میں گھرا محسوس کرنے لگا۔

وہ باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ اسے پکڑ لیا گیا اور پہاڑیوں کے بوڑھے سردار کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اُس نے اپنا تعارف کرایا مگر سردار کو یقین نہ آیا وہ اُس کو کوٹھے مارنا ہی چاہتا تھا کہ راستے میں ملنے والی بوڑھی خاتون اور نوجوان لڑکی نے بہت منت سماجت کر کے اُس کی گلو خلاصی کرائی۔

رستم حکیم شہاب کے پاس سے رخصت ہونے والا تھا کہ پہاڑیوں کے بوڑھے سردار نے اُسے پھر بلایا۔ رستم ا[illegible] دعوت نامے کو پاکر بہت محظوظ ہوا مگر جب وہ سرنگ میں پہنچا تو نوجوان لڑکی نے اُسے وہاں سے بھاگ جانے کی تاکید کی۔ رستم حیران رہ گیا۔ تھوڑی سی ہی دیر میں رستم بوڑھے سے محوِ گفتگو تھا جو بہت اخلاق سے اُس سے باتیں کر

[illegible]

... میں اُن کی ... رہ جاتے اور ... سے ...
... کا فائدہ اُٹھا لیں۔

... بالا سے ایک اور خبر یہ بھی کہ اُن کی ... ایک ... کی حراست میں رہیں۔ ... چند ... [illegible]

... خدمت کی بے حیائی کا اندازہ کر لو کہ! میری بیٹی ــــ ایک ... جس ... سے کسی بھی طرح کا تعلق نہیں تھا اور ... میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اُسے وہ بے حیا سردار ... اصل بات یہ تھی کہ کچھ عرصہ پہلے اُس نے زبیدہ کو ... خدمت کے لئے نہیں بلکہ اپنے حرم میں داخل کرنے ... تھا۔

... کہ میں کیوں شہنشاہ جہانگیر اور اُن کے ...

... حالات میں ایک بات ...

[illegible]

"ہاں سُنی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اُسے بجا کر انصاف حاصل کرنے کی جرأت بھی کوئی شاذو نادر ہی کرتا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ عام مظلوم رعایا کے لئے جہانگیر کی انصاف پسندی کوئی معنے نہیں رکھتی۔ بہرحال ہوا یہ کہ وہ سازشی لوگ مغل سپہ سالار کی یہ شرمناک شرط پوری کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ لیکن خوش قسمتی سے اُن کا ایک پیغام رساں افغان سردار کے وفادار سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور اس طرح ان کی سازش کا پردہ چاک ہوگیا۔

"افغان قلعہ دار نے اُسی وقت میرے پاس پیغام بھیجا اور میں نے ایک فوجی دستہ دونوں کو حفاظت سے نکال لانے کے لئے روانہ کر دیا۔ انہیں ہی تم راستے میں ملے۔

"اِس سفر میں اُن پر نئی مُصیبتیں ٹوٹ پڑیں اور میرے دوست، تمہاری بہادری کے سبب ہی وہ خطرات سے بچ کر یہاں پہنچ سکی ہیں۔ اِس طرح جناب، میں بھی کافی پریشانیوں سے دوچار ہوا ہوں۔ چاہے اراولی کی اِن پہاڑیوں کی یہ وادی پُرسکون معلوم ہوتی ہے۔"

اسی لمحے ساتھ کے کمرے سے ستار ٹھیک کرنے کی جھنکار سُنائی دی۔

"ہماری بیٹی تمہاری تفریح کرنا چاہتی ہے، عزیز دوست، لیکن یہاں کے رواج کے مطابق وہ تمہارے سامنے آ کر نہیں گا سکتی" میزبان نے کہا۔

ستار کی جھنکار کے ساتھ سُریلی آواز نے ایک فارسی نغمہ الاپنا شروع کر دیا۔ اِس نغمے میں ایران کے گرد آلود میدانوں، بہتی ہوئی ندیوں اور میوے کے باغوں کی منظر کشی تھی۔ وہاں کی آہو چشم حوروں اور اُن کے معصوم جذبات سے بھرے رقص و سرود کی یاد تھی، جنہیں دیکھ کر تماشائیوں کے دِل مچل جاتے ہیں۔

رُستم ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ اس پردے کی اوٹ میں بیٹھی ساحرہ کے شیریں نغمے کو سُن کر وہ وجد میں آ گیا تھا۔ وہ تصورات کے پروں پر اُڑتا ہوا حسینہ کی باہوں میں باہیں ڈالے چلا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے خوش گوار سُر کے ساتھ نغمہ ختم ہوگیا۔ لیکن رُستم ابھی تک تصورات کی دنیا میں پرواز کر رہا تھا۔

اچانک اُس کا جادو ٹوٹا۔ اُسے احساس ہوا کہ میزبان اپنی کمزور آنکھوں سے اُسے غور سے دیکھ رہا ہے۔

اُس کے چہرے کے جذبات رُستم نہ پڑھ سکا۔ کیا یہ بوڑھا سردار رُستم کے اِس طرح محو ہو جانے کے انداز کو بھانپ گیا تھا کہ اُس حسین مطربہ کے بارے میں اُس کے کیا جذبات ہیں۔ کیا اُس کے جذبات نے اِس راز کو افشا کر دیا ہے اگر اُس نے صحیح اندازہ لگا لیا ہے تو وہ کیا محسوس کر رہا ہوگا؟"

"موسیقی تیز شراب کی مانند ہے" بوڑھے سردار نے کہا "کبھی کبھی یہ دماغ کو بدل دیتی ہے۔ جب تک اِس کا سرور قائم رہتا ہے، یہ بہت اچھی لگتی ہے۔ انسان دکھ درد سب بھول جاتا ہے اور خوابوں کی ایک عجب صورت دنیا میں کھویا رہتا ہے لیکن یہ سرور ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا۔ آخر آدمی کو ٹوٹ کر زمین پر آنا ہی پڑتا ہے

"جناب، میرا خیال ہے کہ یہ تشبیہ ٹھیک نہیں ہے" رستم نے جواب دیا "موسیقی
ے روحانی چیز ہے، جب کہ شراب ایک مادّی شے ہے۔ موسیقی انسان کی روح کو
ے کرتی ہے جب کہ نشہ ایک جذبات بھڑکانے والی اور انسان کی عقل خراب کرنے
، چیز ہے۔ حالاں کہ ظاہری طور پر دونوں یکساں معلوم ہوتی ہیں، جیسے عشق اور ہوس۔"
"میرا خیال ہے کہ تمہیں دونوں کا تجربہ ہوگا، کیوں؟" سوال اتنا اچانک کیا گیا تھا کہ
ان رستم کو جواب تلاش کرنے میں دقت محسوس ہونے لگی۔
"جی، نہیں، مجھے تو دونوں میں سے کسی کا بھی تجربہ نہیں ہے" کچھ دیر سوچ کر
نے جواب دیا "لیکن شاہی دربار میں مجھے دونوں سے اتنا واسطہ ضرور پڑا ہے کہ
ان دونوں میں امتیاز کر سکتا ہوں۔"
اس کا میزبان ہنسا "مجھے یقین ہے کہ ایک سے تمہیں کافی زیادہ واسطہ پڑا
ا۔ میرا مطلب ہے ہوس سے۔ لیکن جہانگیر کے دربار میں تمہیں پاک محبت کہاں نظر
؟ کیا ایک بھی مثال ایسی دے سکتے ہو کہ دربار کے کسی فرد میں اس طرح کی حقیقی
رض الفت ہو؟"
"جی، ہاں، شہنشاہ اور بیگم نورجہاں کی محبت خود اپنی مثال ہے" رستم نے فوراً
جواب دیا۔
"بوڑھا سردار دیوانہ وار ہنسا۔
"یہ بھی خوب رہی" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"واقعی سلیم کو بیگم نورجہاں سے حقیقی عشق ہے، جو کہ اس کی بیسویں یا شائد اکیسویں
بیوی ہے۔ اور ان تین سو کے قریب داشتاؤں کی بات تو جانے ہی دو۔ واقعی نورجہاں
بھی اس سے بے غرض محبت کرتی ہے۔ حالاں کہ وہ بیسویں یا اکیسویں بیوی ملکہ بن
کر سلطنت کی سب سے ممتاز عورت بن گئی۔
"خیر، نوجوان، تم کہیں زیادہ ناراض نہ ہو جاؤ، اس لئے میں اور کچھ نہیں کہنا
چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس حسین عورت کا ذکر آتے ہی تم ضرورت سے زیادہ
حساس ہو جاتے ہو لیکن ہاں، یہ لطیفہ کمال کا تھا۔"
"خیر، اسے جانے دیجئے۔ میں آپ کو اور مثالیں دے سکتا ہوں" رستم بولا "شہزادہ
خرم اور ملکہ کی بھتیجی ارجمند بانو کی مثال ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں
ور سب سے بہتر مثال شہزادہ خسرو اور ان کی بیگم کی ہے "
"ہاں، یہ مثالیں تم نے بالکل صحیح دی ہیں۔ یہ ہے ایک لاجواب مثال، میاں بیوی
کے پاکیزہ پیار۔ محبت کی۔ اور خاص طور پر جہانگیر کے دربار کا ماحول دیکھتے ہوئے، اس
کے باوجود کہ اس کی آنکھیں نکال دی گئیں اور اس کے باپ نے اسے قید میں ڈال
دیا۔ "
وفادار عہدی نے ٹوکا "صرف اس لئے کہ اس نے بغاوت کی۔"
"بلاشک، لیکن اس بات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا
کہ جائز یا ناجائز تمام تکالیف میں اس بدنصیب شہزادے کی بیگم نے ایک غم خوار

اور جاں نثار دوست کی طرح ہمیشہ اُس کا ساتھ دیا ہے۔ اور کبھی اُسے اکیلا نہیں چھوڑا۔

"میں نے سنا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو فوراً جیل سے رہائی حاصل کر سکتا تھا اور ولی عہد بن سکتا تھا۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ وہ نور جہاں کی لاڈلی بیٹی سے شادی کرنے کے لئے رضامند ہو جاتا۔ لیکن اپنی موجودہ اور واحد بیگم سے اُسے وہ کمال کا لگاؤ تھا کہ اُس نے اتنے بڑے لالچ کو ٹھوکر مار دی۔"

"یہ افواہ تو اُڑی تھی، لیکن لاڈلی بیگم کی شادی بعد میں شہزادہ شہریار سے ہو گئی" رُستم نے کہا۔

"مغل سلطنت کی بنیاد ہی سازشوں پر قائم کی گئی ہے — ایک کے بعد دوسری۔ کیا زندگی ہے کہ خسرو، خرّم، شہریار، سب کے سب طاقت کی جدوجہد میں صرف مہروں کی حیثیت رکھتے ہیں! خرّم نہ ہوا تو خسرو ہی سہی۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی اُس سازشی حسینہ کے کام نہ آسکا تو کم سے کم شہریار تو ہے ہی۔ شہریار، ناشدنی! بہرحال میرے نوجوان دوست، اب کافی دیر ہوتی جا رہی ہے" اُس نے کہا۔

واقعی سُورج غروب ہو چکا تھا اور شام تیزی سے رات میں بدلتی جا رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے خیال نہیں تھا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔ آج کی شام بہت لطف آیا۔ اِس ویرانے میں ہمیں شاذ و نادر ہی کسی سے ملاقات کا موقع ملتا ہے۔ میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں، رُستم علی خاں کہ تم نے ہماری دعوت قبول کی اور یہاں آئے۔ کیا میں پُوچھ سکتا ہوں کہ تم اجمیر کب جا رہے ہو؟"

"اُمید ہے کہ پرسوں صبح روانہ ہو جاؤں گا۔"

"کیا یہ ممکن ہو گا میرے دوست کہ تم جاتے ہوئے اِدھر سے گزر کر جاؤ؟ ہم تمہیں زیادہ دیر نہیں روکیں گے۔ بیگم اور میری بیٹی تمہارے جانے سے پہلے ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیں گی۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے تم اُن کے محافظ ہو۔ تم نے سفر کے دَوران اُن کی جو مدد کی ہے، وہ کبھی بُھلائی نہیں جا سکتی۔ نہ کسی طرح اُس کا معاوضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

"اگر حالات بہتر ہوتے تو ہم تمہارے احسان کا بدلہ چُکانے کی کوشش کرتے لیکن اِس مفلسی اور جلا وطنی کی حالت میں مَیں شکریہ کے چند الفاظ کے سوا اور تمہیں کیا دے سکتا ہُوں۔ خیر، اب وعدہ کرو کہ اجمیر جاتے ہُوئے تم مجھ سے مل کر جاؤ گے۔"

رُستم نے وعدہ کیا اور پھر اپنے میزبان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت لی۔ اُسی تاریک رستے سے خدمت گار کمال اُسے واپس چھوڑ آیا۔ رُستم نے تیسرے وادی پار کی اور اپنے مسکن میں آ پہنچا۔

اپنے کمرے کی تنہائی میں رستم پہاڑوں کے اُس بوڑھے آدمی سے اپنی ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا۔ تمام ملاقات بالکل اُس کی توقع کے خلاف ہوئی تھی۔ اُس نے ایک نہایت پُر لطف اور خوشگوار شام گزاری تھی۔ بیشتر صحراؤں کی دوشیزہ کے بارے بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ لیکن اُس کے باپ کے بارے تو اُ...

ں نے اُس کی جادو بھری آواز سُنی تھی۔ اُس کے دل کش، حسین اور معصوم چہرے کو بھی دیکھا تھا۔

لیکن اِس میں کیا راز تھا کہ رُستم کے وہاں پہنچتے ہی وہ اِس قدر گھبرائے ہوئے
ازمیں اُس کے پاس بھاگی آئی اور اُسے وہاں سے فوراً چلے جانے کے لئے کہا۔

"تم کیوں چلے آئے؟ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ ابھی وقت ہے" یہ اُس کے الفاظ تھے۔ لیکن
س خوشنما ڈھنگ سے شام گزری اُسے دیکھتے ہوئے اُس کے الفاظ بے معنی نظر آرہے تھے۔
ے کس بات کا خوف تھا! کیا اُس وقت رُستم کے لئے وہاں کوئی خطرہ موجود تھا
کسی وجہ سے ٹل گیا! کیا اُس بوڑھے سردار نے کوئی سازش کی تھی جسے۔ بعد میں
ہ سوچ کر عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔

سردار نے ہر طرح کی دل چسپ گفتگو سے اُس کا جی بہلانے کی کوشش کی تھی۔
بات بالکل عیاں تھی کہ وہ مغل دربار سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اور کسی
معلوم وجہ سے ناراض ہو کر چلا آیا تھا۔

پہاڑوں کے بوڑھے آدمی کے بارے میں واقعی کوئی راز نظر آتا تھا۔ کیا وہ
مغل دربار کا کوئی پُرانا مصاحب تھا، جواب ملک بدر ہو کر اِس طرح زندگی
گزار رہا تھا۔ کیا وہ کوئی شہزادہ یا درباری تھا جس سے شہنشاہ ناخوش ہو گئے۔ حالات
سے تو یہی معلوم دیتا تھا۔

رُستم سے پھر درخواست کی گئی تھی کہ وہ اجمیر روانہ ہونے سے پہلے ایک بار
اُس سے مل کر جائے۔ رُستم نے دعوت قبول بھی کر لی تھی۔ بوڑھے سردار کی بیگم اور بیٹی
رخصت لینے سے پہلے ایک بار پھر اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھیں — بوڑھے سردار
نے یہ وجہ پیش کی تھی۔ تو کیا وہ پھر جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا تھا اور اپنی بیوی
اور بیٹی کا نام اُسے پھنسانے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔

اگر واقعی یہ بات تھی تو کیوں؟ ایک بار پھر اپنی ماند میں بلانے کا اُس کا کیا
مقصد ہو سکتا تھا؟ اُس شام کی ملاقات بہت خوش گوار رہی تھی اور اس کی بیٹی
کی باتیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔

اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سردار اُسے نقصان پہنچانا چاہتا تھا، جس کا علم
اُس کی بیٹی کو تھا، لیکن جو کسی نامعلوم سبب سے اُس ملاقات کے دوران عمل میں
لا جا سکا، اُس حالت میں لازمی طور پر سردار دوبارہ رُستم کو اپنی گرفت میں لانا
چاہے گا۔

لیکن رُستم کو کسی سازش کا شکار بنا کر اُس بوڑھے کو آخر کیا حاصل ہو سکتا
؟ رُستم اُس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ پھر اُس نے سردار کی بیگم اور بیٹی کی حفاظت
کی تھی۔ بوڑھا سردار اُسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچانا چاہے گا، اسے کسی اِست
ے سمجھ میں نہیں آیا۔

دن اُس کی حکیم صاحب سے آخری ملاقات ہوئی اُن کی ہدایت پر مراد
ہ بند بوتل لے کر آیا، جس میں سُرخ رنگ کی روئی سی تھی۔

اسے جسے میں نے دینے کا وعدہ کیا تھا" حکیم نے کہا" اِس خط

میں اِس کو استعمال کرنے کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے" اور اُس نے تہہ کیا ہُوا پیلے رنگ کا کاغذ رُستم کی طرف بڑھا دیا۔

"لگاتار استعمال کرنے سے یہ دَوا مریض میں نشہ کی عادت ختم کر دے گی۔ لیکن دوا پُوری طرح کارگر تبھی ہو گی جب مریض خود اپنی خوشی اور رضامندی سے اپنا علاج کرانا چاہتا ہو اور خوراک، ورزش اور دوسری چیزوں کے بارے میں تمام ہدایات پر باقاعدہ عمل کیا جائے۔"

رُستم نے حکیم صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ وہ حکیم صاحب کو اپنے ساتھ اجمیر جانے کے لیے راضی نہ کر سکا۔

"مغل دربار کے حکیموں سے زیادہ کوئی اچھی دوا میرے پاس نہیں ہے۔ شفا کے کام میں کوئی جادُو نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی کہہ چُکا ہوں کہ شہنشاہ کا مرض ایسا ہے جو بہت حد تک خود پر قابو رکھنے سے ہی دُور ہو گا۔ یہ دوا تو صرف مددگار ثابت ہوگی۔ اِس سے زیادہ میں وہاں موجود رہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

رُستم نے ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا اور رُخصت چاہی۔

"خدا حافظ، نوجوان، تم کل جا رہے ہو؟"

"جی ہاں، یہی ارادہ ہے۔"

"اکیلے؟ میں نے سُنا ہے کہ راستہ بہت خطرناک ہے۔"

"یہاں سے دو تین میل کے بعد، اُمید ہے کہ راجپوتوں کا ایک قافلہ مل جائے گا۔ میں اُن کے ساتھ ہو لوں گا۔ مجھے آپ کے خادم سے پتہ چلا ہے کہ وہ رانا امر سنگھ کی فوج میں شامل ہونے جا رہے ہیں اور رانا امر سنگھ نے حال ہی میں شہنشاہ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

"تو مغل دربار نے ایک اور کامیابی حاصل کر لی" حکیم نے مایوسی سے کہا۔ "اگر آج رانا پرتاپ زندہ ہوتے تو اُن کی روح کو اس بات سے کتنا صدمہ پہنچتا۔ بہرحال میں تو اب کافی عرصے سے گوشہ نشینی اختیار کر چکا ہوں۔ اکیلی جان ہے۔ مجھے تو اس وقت صرف ایک ہی دلچسپی ہے کہ مرنے سے پہلے میں اپنی وہ کتاب مکمل کر لوں... اچھا تو نوجوان، ایک بار پھر الوداع، خدا حافظ!"

رُستم نے دوا کی بوتل اُٹھائی جو اُس کے سفر کا حاصل تھی اور حکیم صاحب کو کورنش بجا کر باہر آ گیا۔ مُراد بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔

"حضور، آپ کے نئے احباب نے مجھے ہدایت دی تھی کہ میں آپ کو یاد دلا دُوں کہ آپ کو جانے سے پہلے اُن سے ملنا ہے۔"

رستم نے اجنبی بنتے ہوئے پوچھا "نئے احباب! کون سے نئے احباب؟"

"حضور، مجھ سے کچھ مت چھپائیے۔ میں سب جانتا ہوں۔ آپ پہلے ہی دو[illegible] سے مل چکے ہیں۔"

"وہ کوئی نئے احباب نہیں۔ یہاں ملنے سے پہلے کی میری اُن سے جان پہچان ہے" [illegible] نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"تو یہ بات تھی! خیر، تب تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ خان نے آپ کو دعوت دی ہے۔ کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ غیر لوگوں سے زیادہ ملنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے کہ کسی کو اُن کے یہاں رہنے کا علم ہو۔"

"تمہاری واقفیت اُن سے کیسے ہُوئی؟"

"وہ یہاں حکیم صاحب کے پاس اپنی آنکھوں کا علاج کرانے آتے تھے۔ یہ بات پار برس پہلے کی ہے۔ خان کے پاس تقریباً پچاس سپاہی ہیں۔ سبھی وفادار اور جنگجو۔ وہ اس وادی میں بس گئے اور یہیں کھیتی باڑی شروع کر دی۔ وہاں پہلے کبھی رانا پرتاپ کے آدمی رہتے تھے اور اُن لوگوں نے چٹانیں تراش تراش کر اپنے مکان بنائے تھے۔

"ان لوگوں نے وہاں کچھ عمارتیں اور بنالیں۔ اُس وقت سردار کی بیگم اور بیٹی اس کے ساتھ نہیں تھیں۔

وہ چند روز پہلے ہی آئی ہیں۔ اِس سب میں کوئی گہرا راز معلوم دیتا ہے۔ لیکن مجھے اور حکیم صاحب کو اس سے کیا لینا دینا! میں تو حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا وہاں پہنچا دیتا ہوں اور وہ مجھے کافی انعام دیتے ہیں میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بہت بڑے آدمی ہیں جس پر بُرے دن آئے ہُوئے ہیں۔ میں آپ کو راز کی بات بتاتا ہوں۔ خان کی آنکھ کا مرض قدرتی نہیں ہے۔"

"اپنی بات صاف صاف کہو۔"

"یہ کام انسان کا کیا ہوا ہے، خان کے دشمنوں کا۔ کسی تیز نوکیلی چیز سے اُسے اندھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک آنکھ تو بالکل خراب ہو چکی ہے۔ دُوسری کچھ بہتر ہے۔ لیکن اِس کا اثرات دوسری آنکھ پر بھی ہو رہا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ حکیم صاحب کے علاج نے بچا لیا ورنہ وہ مکمل طور پر اندھا ہو جاتے۔"

"اگر کسی نے خان کی آنکھیں نکالنے کی کوشش کی تو یہ واقعی بہت بڑا ظلم ہے" رُستم بولا۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ شہنشاہ کے حکم سے شہزادہ خسرو کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔

"نفرت اور خود غرضی انسان کو ظالم بنا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ خان نے دُنیا کی نگاہ سے پوشیدہ رہنے کے لئے یہ دُور دراز مقام منتخب کیا ہے۔ لگتا ہے کہ انہیں اپنے کسی دشمن یا دشمنوں سے خوف ہے کہ اگر انہیں خان کی رہائش کا پتہ لگ گیا تو وہ اُن کا پیچھا کریں گے۔

"آپ کو یاد ہوگا۔ میں نے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا تھا، جو یہیں ٹھہرا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اُس کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ دشمنوں کا بھیجا ہوا جاسوس تھا اور یہ پتہ کرنے آیا تھا کہ خان کی پوشیدہ رہائش کہاں ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ خان کے سپاہیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ خان بہت جابر ہے۔"

> ۔ تو اپنی آگ میں خود ہی جلتا رہتا ہے، اُسے اور جلانا بے کار ہے ——— سعدیؔ

جب سے دُنیا قائم ہوئی عورت مرد کی مطیع رہی ہے۔ مذہب اور رسم و رواج نے بھی عورت کو یہی درجہ دیا ہے لیکن میں اِن فرسودہ خیالات کو بدل دینا چاہتا ہوں۔ میں عشق کی وہ مثال قائم کرنا چاہتا ہوں جو جہانگیر اور نور جہاں کے بھی عشق سے بلند ہو . . . "

دوسرے تم پر ظلم کریں تو تم جابر ہونے سے کیسے بچ سکتے ہو۔ کون جانتا ہے کہ اُس [illegible] نے اپنے دشمنوں کے ہاتھوں کیا کیا ظلم سہے ہوں گے شاید اُس کی آنکھوں کی خوابی ہی لے لو۔ جن لوگوں نے بھی اُسے چوٹ پہنچائی ہے، اگر خان کو موقع ملے تو اُن سے [illegible] لینے میں وہ گریز کیوں کرے گا؟

اگلی صبح رُستم جلدی اُٹھا اور اپنے سفر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے حکیم کی دا کو احتیاط سے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ خادم مراد اُسے الوداع کہنے کے لیے آ گیا تھا۔ وہ رُستم کو ایک دوسرے راستے سے لے گیا تاکہ گھوڑا بھی ساتھ [illegible] سکے۔

جب وہ اُس وادی کے پُل تک جا پہنچے تو رُستم نے اشرفیوں سے بھری تھیلی مراد کی [illegible] بڑھا دی۔ مراد اتنا انعام پا کر بہت خوش ہوا۔

"مراد، اب ایک کام تمہیں اور کرنا ہو گا" رُستم نے کہا "میں اپنے محسن کو خدا حافظ کہنے [illegible] رہا ہوں۔ میرا ارادہ وہاں زیادہ ٹھہرنے کا نہیں ہے۔ میں بہت جلدی لوٹ آؤں گا۔ اگر میں [illegible] یا ڈیڑھ گھنٹے تک نہ لوٹا تو سمجھ لینا کہ میں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اُس کے بعد [illegible] تم مناسب سمجھو کرنا۔ سب سے بہتر یہ ہو گا کہ تم میرے غائب ہونے کی خبر حکیم صاحب [illegible] پہنچا دینا اور پھر جیسی ہدایت وہ دیں، اُس کے مطابق کام کرنا۔"

[illegible] سب حالات پر غور کرتے کرتے اُسے یہ تجویز سُوجھی تھی۔

"لیکن جناب، آپ کے محسن کے گھر آپ کو کس بات کا خوف ہے؟" مراد نے [illegible] حیرانی سے پُوچھا۔

"کئی دفعہ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جب ہر چیز ممکن ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بات [illegible] تو میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی ایسی اَن ہونی بات نہیں ہو گی اور میں صحیح سلامت لوٹ آؤں گا۔ پھر بھی تم میری باتوں پر عمل کرنا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک میرا انتظار کرنا۔"

"بہت اچھا حضور، میں یہیں انتظار کروں گا۔ لیکن میری سمجھ میں اب تک نہیں آ رہا کہ [illegible] ماجرا کیا ہے؟ ہاں، اگر آپ خان کے دشمنوں کے جاسوس ہوں تو دوسری بات ہے۔ لیکن آپ جاسوس نظر نہیں آتے۔ خیر، ٹھیک ہے جناب، جب تک آپ لوٹ کر نہیں آتے، [illegible]

پ کا انتظار کرے گا۔ آپ بہت اطمینان وسکون کے ساتھ جائیں اور مطلق فکر نہ کریں۔"

مُراد پُل کے ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ رُستم اپنے گھوڑے کی لگام تھامے پُل پار کر کے وڑے پر سوار ہو گیا۔ اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ سُرنگ کے دروازے پر پہنچ کر وہ رُکا اور وڑے سے اُتر کر اندر داخل ہو گیا۔

پچھلی دفعہ کی طرح اِس بار سُرنگ کے مُنہ پر کوئی اُس کے استقبال کے لئے موجود نہیں ا۔ وہ گھوڑے کی باگ پکڑے تاریک درّے میں سے گزر کر دُوسری طرف جا پہنچا۔ ے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اِس ملاقات کا انجام ایک اہم اور معنی خیز واقعے میں رونما گا۔ اگر خان کے دل میں کوئی فریب ہے تو اب ظاہر ہو جائے گا۔ اگر اُس کا دل صاف ہے ۔ وہ اپنی بیگم اور دُختر کی حفاظت کرنے والے شخص کے تئیں دوستانہ جذبات رکھتا ہے یہ بات بھی صاف ہو جائے گی۔

اُسے اِس بات کی بہت تمنا تھی کہ یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے وہ زبیدہ سے ائی میں دو باتیں ضرور کر لے۔ اُسے یہ اُمید قطعی نہیں تھی کہ زبیدہ یا اُس کے والدین سے پھر ملاقات ہو سکے گی۔

سُرنگ کے دُوسرے سرے پر پہنچنے کے بعد رُستم نے دیکھا کہ وہاں کوئی پہرے دار جود نہیں تھا۔ وہ سردار کے گھر کی طرف چل دیا۔ چبوترے کے پاس پہنچ کر اُس نے اپنا وڑا سیڑھیوں سے باندھ دیا اور اُوپر چڑھ گیا۔

چبوترہ اُس وقت خالی تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف ایک ب ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک دو سقّے سامنے تالاب میں مشکیں بھر رہے تھے۔ رج ابھی طلوع ہی ہو رہا تھا اور یہاں کے رہنے والے شاید ابھی سو ہی رہے تھے۔

سردار کی رہائش گاہ کے سب دروازے بند تھے۔ صرف ایک دروازہ کھُلا ہوا ا۔ رُستم سوچ ہی رہا تھا کہ دستک دوں، تبھی اُسے اندر سے کھانسنے کی آواز سُنائی ی۔ اُس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے ؟" اندر سے کوئی دھیرے سے بڑبڑایا۔ تھوڑی دیر بعد شال لپیٹے سردار وازے پر نمودار ہُوا۔

"اندر آ جاؤ رستم علی خاں۔ ہمیں اُمید نہیں تھی کہ تم اِتنی صبح آ جاؤ گے۔ ہم لوگ جلدی ٹھنے کے عادی نہیں ہیں۔ اندر آؤ۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ تمہیں ملنے کا وعدہ یاد رہا۔ تو اس کا ب یہ ہے کہ تم سفر کے لئے روانہ ہونے والے ہو؟"

"ہاں، جناب، کچھ لوگوں کا ساتھ مل گیا ہے۔ مجھے فوراً اُن کے پاس پہنچنا ہے اس لئے تڑکے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔"

"میں بھی تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ہماری بیٹی اور بیگم تمہارا شکریہ ادا کرنا تی ہیں اور تمہارے حق میں دُعا کرنا چاہتی ہیں کہ تمہارا سفر بخیر و خوبی کٹ جائے۔ اِسی ہیں نے تمہیں آنے کی تکلیف دی۔ اِس وقت وہ پائیں باغ میں ہوں گی۔ تم اِسی ے چلے جاؤ۔"

ہوں نے دروازہ کھولا اور رُستم کو گھر کے پچھواڑے کا راستہ بتایا۔ رُستم نے دیکھا کہ

وہ اِس علاقے کی اُونچی چٹان کی چار دیواری اور سردار کے مکان کے پچھلی طرف کے چھوٹے سے درمیانی خطّے پر کھڑا ہے۔ دائیں اور بائیں اُونچی دیواریں تھیں تاکہ باغ میں ٹہلنے والوں کے لئے پردہ رہے۔ باغیچے میں پھُولوں کی کیاریاں اور پودوں کی قطاروں کے بیچ سیر کے لئے رَوِشیں بنائی ہُوئی تھیں۔ انجیروں کے دس بارہ بُوٹے اردگرد کے پودوں سے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ باغ میں ایک جگہ بیٹھنے کے لئے کرسیاں لگی ہُوئی تھیں۔

لیکن اِس وقت رُستم کے پاس اِس دل کش منظر سے لطف اندوز ہونے کا وقت نہیں تھا۔ اُس کی نظروں نے تیزی سے باغ کا طواف کیا اور جلدی ہی متلاشی شے پر مرکوز ہو گئیں۔

زبیدہ تنہا ایک بینچ پر بے پردہ بیٹھی ہوئی تھی۔ آہٹ سن کر اُس نے نگاہیں اُٹھائیں تو رستم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ حیا کی سُرخی اُس کے رُخساروں پر دوڑ گئی۔ لیکن اُس نے اپنا نقاب نہیں گرایا۔

"مجھے آپ کے والد صاحب نے بتایا تھا کہ آپ اور بیگم صاحبہ یہیں موجود ہیں" اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے رُستم نے جلدی سے کہا "میں اجمیر لَوٹ رہا ہُوں اور آپ سے وداع لینے آیا ہوں۔"

"امّی حضور، ابھی ابھی واپس گئی ہیں" دوشیزہ نے جواب دیا۔

"میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہُوں۔ آپ کی پچھلی باتوں سے میں بے حد پریشان ہو اُٹھا تھا، آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی ملاقات کے دَوران آپ کس طرح گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی تھیں اور مجھے بھاگ جانے کے لئے تنبیہہ کی تھی۔

"میں آپ سے اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔ کیا میرے لئے یہاں خطرہ موجود تھا؟ میں وہاں سے بھاگنے کے بجائے آپ کے والد صاحب سے ملنے کے لئے بدستور بیٹھا رہا لیکن وہاں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہُوئی۔ بعد میں ملحقہ کمرے میں آپ نے نغمہ بھی گایا جس کا سحر آج بھی ذہن پر طاری ہے۔

"میں جس طرح آیا تھا، اُسی طرح بخیروعافیت واپس لَوٹ گیا۔ پھر آپ کی تنبیہہ کا کیا مقصد تھا؟ حالات کو دیکھتے ہوئے وہ غیر ضروری معلوم ہو رہی تھی۔ آپ کے الفاظ اب تک میرے لئے معمہ بنے ہوئے ہیں۔"

زبیدہ نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی "ایسا لگتا ہے کہ وہ میری حماقت رہی تھی۔ بعد میں مجھے محسوس ہُوا کہ میرا خدشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ میرے لئے اِس کی وجہ بیان کرنا شاید مشکل ہوگا۔ شاید اِس کی وجہ یہ تھی کہ ابّا جان نے آپ کو دعوت دی تھی اِس سے اُن کے اِرادوں پر مجھے کچھ شک گزرا تھا لیکن جیسا کہ بعد کے حالات نے ظاہر کر دیا، میرا شبہ سراسر بے بنیاد ثابت ہوا۔

"اچانک کسی کے اتنا قریب آجانا ابّا جان کی عادت نہیں۔ اجنبی آدمیوں سے وہ اتنی جلدی گھُلتے ملتے نہیں۔ وہ ہر ایک اجنبی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

"انہوں نے زمانے سے بہت فریب کھائے ہیں جس کے سبب وہ شکی انسان بن گئے ہیں۔ انہوں نے دوسروں کے ہاتھوں اتنی زبردست تکلیفیں برداشت کی ہیں

وہ ہر آدمی سے بدلہ لینے کے فراق میں رہتے ہیں اور ہر ایک کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں

"میں نے ایسے ایسے مناظر دیکھے ہیں جب ابا جان کے حکم سے کسی شخص کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا یا اُن کے پالتو چیتے کی نذر کر دیا گیا۔ وہ عادتاً بے رحم نہیں ہیں۔ محض بے جا تکلیف اُٹھانے کے سبب اُن کی طبیعت ایسی ہو گئی ہے۔

"میں چونکہ ابا جان کی طبیعت سے بخوبی واقف ہوں اِس لئے جب مجھے پتہ چلا کہ آپ اُن کی دعوت پر دوبارہ یہاں آئے ہیں تو مجھے بے حد تشویش ہوئی۔ مجھے محسوس ہو کہ وہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ ایک آدمی، جسے وہ پہلے دن کوڑوں کی سزا دے رہے تھے، اگلے دن اُن کا دوست بن جائے گا، مجھے ابا جان سے اِس بات کی قطعی توقع نہ تھی۔

"لازمی طور پر میرے دِل میں یہ شک گھر کر گیا کہ آپ کو دعوت دینے میں اُن کا کوئی خطرناک مقصد ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے اُنہوں نے ایک دو بار قہقہہ لگایا۔ میں نے اُنہیں اِسی طرح ہنستے ہوئے اکثر اُس وقت دیکھا ہے جب کوئی خوفناک سازش اُن کے دماغ میں پل رہی ہو۔ اس سے میرے اندر خوف پیدا ہو گیا تھا۔

"لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ آپ کے لئے اُن کے دل میں واقعی خلوص اور دوستانہ جذبات تھے۔ آپ نے سفر میں ہماری حفاظت کی تھی۔ شاید اُسی کے سبب وہ ممنون تھے۔ گو آج بھی اُن کے مزاج میں تبدیلی نہیں آئی لیکن ایک خاوند اور والد کی حیثیت سے وہ بہت مہربان انسان ہیں۔"

"مجھے یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی ہے" رُستم نے کہا "آپ کے والد کے ساتھ میرے اچھے تعلقات قائم نہ ہونے کی کوئی ایسی وجہ نہیں۔ میرے پاس وقت کم ہے کیونکہ مجھے فوراً اجمیر کے لئے روانہ ہونا ہے۔ اس طرح خوشگوار تعلقات کا آغاز ہوتے ہی فوراً رخصت لینے میں مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے، لیکن جس بات کا علاج نہ ہو اُس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل ؟"

کچھ دیر دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر اچانک رُستم کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔

زبیدہ کے لئے اُس کے دل میں محبت پیدا ہو چکی تھی اور وہ اُس کے حُسن کا پرستار بن چکا تھا۔ اُس کے ساتھ یہ شاید آخری ملاقات تھی۔ وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا تھا۔ یہ اُس کے لئے پہلا اور آخری موقع تھا۔ اگر زبیدہ نے اُسے ٹھکرا بھی دیا تو بھی وہ اُسے اپنی بدنصیبی سمجھ کر برداشت کر لے گا۔ بہرحال جو بھی قسمت کو منظور ہو، اُسے حوصلے سے کام لینا ہی پڑے گا۔

"زبیدہ ..." اُس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "زبیدہ نے پریشان نظروں سے اُس کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ جانتی تھی کہ رُستم کیا کہنے والا ہے۔

"زبیدہ، شاید تم مجھے دیوانہ سمجھو گی۔ میں واقعی دیوانہ بن چکا ہوں۔ ہماری ملاقات کچھ دن پہلے ہی ہوئی ہے۔ خدا گواہ ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ میری رُوح کی آواز

۔ زبیدہ، ناراض مت ہونا۔ ممکن ہے کہ تم پہلے ہی جانتی ہو گی۔ ہاں، زبیدہ، یہ ایک
ت ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے تم سے لافانی محبت ہے۔

" زبیدہ، میں نے اپنا دِل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اجمیر کے راستے میں جب
بار میری نظروں سے تمہارا دیدار کیا تھا، اسی لمحے میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ ۹
ں سفر میں خوفناک اور ریاکار لوگوں کے خطروں میں ہم ساتھ ساتھ بچ نکلنے میں
یاب ہوئے ہیں۔ اُس وقت میں تمہاری حفاظت کے لئے اپنی جان بخوشی قربان
نے کے لئے تیار تھا۔ اور پھر جب تم مجھ سے الگ ہو گئیں تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ
۔ دوبارہ پھر کبھی تمہارے نورانی حُسن کا دیدار مجھے نصیب نہ ہو گا۔ لیکن قدرت کو تو کچھ
ہی منظور تھا۔

" بالکل غیر متوقع حالات میں ہم دوبارہ آ ملے۔ تمہارے والد صاحب کے آدمیوں نے ۱
گرفتار کر لیا تو تم اور تمہاری امّی جان نے اچانک آ کر میری جان بچائی۔ اور اس طرح تمہاری
مت کرنے کا مجھے جو شرف حاصل ہوا تھا اُس کا بدلہ تم نے پوری طرح چکا دیا اور حساب
ب برابر ہو گیا۔

" لیکن میں حساب کتاب برابر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تمہارا قرض دار رہنا چاہتا تھا اور
ا ہوں کہ تم پر ہمیشہ میرا حق رہے۔ ایک ایسا حق جو تمام عُمر قائم رہے۔ میں ہمیشہ کے لئے تمہارا
ہنا چاہتا ہُوں۔ میری خواہش ہے کہ ہمیشہ کے لئے تم میرے دل کی ملکہ میرے تصوّر اور
ں کا فرشتہ، میری ہم سفر اور راہبر بنو۔

" جب سے دُنیا قائم ہوئی ہے عورت مرد کی مطیع رہی ہے۔ مذہب اور رسم و رواج
بھی عورت کو یہی درجہ دیا ہے لیکن میں ان فرسودہ خیالات کو بدل دینا چاہتا ہوں۔
عشق کی وہ مثال قائم کرنا چاہتا ہوں جو جہانگیر اور نور جہاں کے عشق سے بلند ہو۔ بادشاہ
تو صرف دو سو کنیزوں اور باندیوں میں ممتاز ہیں لیکن زبیدہ تم میرے دِل کی واحد ملکہ
رگی ۔۔ آج بھی اور ہمیشہ ...."

" اُف! رُک جایئے! رُک جایئے!" زبیدہ نے کسی طرح اُس کے الفاظ کی روانی
روکتے ہوئے کہا " میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کی
ں کا کیا جواب دوں؟ اِسی لئے اب تک خاموش تھی۔

" آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے سوال کے جواب میں ہاں یا نا کچھ بھی نہیں کہہ سکتی
، خود مختار نہیں ہُوں۔ حوّا کی تمام بیٹیوں کی طرح رسوم کی قیود میں جکڑی ہوئی ہوں۔ شرع
، بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی بیٹی اپنے آپ کو اپنی مرضی سے کسی مرد کی خدمت
، پیش کر سکے۔ اب میں آپ سے کیسے کہوں کہ...."

اُس کی آواز بھرّا اُٹھی اور وہ خاموش ہو گئی۔

" زبیدہ، خُدا کے لئے خاموشی اختیار نہ کرو۔ تم جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو، خُدارا کہہ
دو۔ اگر آج تم میری اُمیدوں کا گلا بھی گھونٹ دو تو بھی میں سب کچھ خاموشی سے برداشت
کروں گا۔ میں جوانمرد سپاہی ہُوں۔ یقین کرو کہ میں دل شکستہ ہو کر خودکشی کا راستہ اختیار نہیں
کروں گا۔ میں ہر چوٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کروں گا۔ جو کچھ بھی تمہیں کہنا ہے بے

عورت کہہ ڈالو۔ میں تمہارے بغیر ایک پل کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتا، زبیدہ"

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے نصیب کی باگ ڈور جن کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہے میری قسمت کا فیصلہ کریں لیکن تمہارے احسانات کی یاد ہمیشہ میرے دل میں تازہ رہے گی۔ دو بے کس اجنبی عورتوں کی حفاظت کر کے تم نے جس جوانمردی اور دلیری کا ثبوت دیا ہے، اُسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔"

اُس نے رُستم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ رُستم کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور ایک تیز خواہش اُس کے دل میں کروٹیں لینے لگی کہ اسے اپنے سینے سے لگا کر اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ لیکن پھر موقع کی نزاکت دیکھ کر رُک گیا۔ وہ گھر کے پاس ہی باتیں کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ اِس وقت کوئی چوری چھپے اُنہیں دیکھ بھی رہا ہو۔

اگر سنگ دل باپ کو یہ معلوم ہو کہ وہ اُس کی بیٹی سے بغلگیر ہو رہا ہے تو نہ جانے وہ کس قدر غضبناک ہو اُٹھے۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مکان کی پچھلی طرف دو دروازے کھلے تھے۔

اُس نے دیکھا کہ ایک دروازے سے بیگم نکل کر اُن کی طرف آ رہی ہے۔ بوڑھے سردار کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ رُستم کو یقین ہونے لگا کہ زبیدہ کی والدہ بھی اُس کا ساتھ دے گی۔ بیگم نے پاس آکر بڑے پیار سے رُستم کو دُعا دی۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ ابھی ٹھیک طرح سے واقفیت بھی نہیں ہو پائی تھی اور اتنی جلدی تمہیں الوداع کہنا پڑ رہا ہے۔ ہماری دعائیں اور نیک خواہشات ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ سفر کے دوران اپنی جان پر کھیل کر جو احسان تم نے ہم پر کیا ہے اُسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ زبیدہ، اپنے محسن کا شکریہ ادا کرو۔ اُسے خدا حافظ کہو" اُس نے اپنی صاحبزادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شاید اب اس سے ہماری آخری ملاقات ہو"

"امی جان، میں اِن کا شکریہ پہلے ہی ادا کر چکی ہوں" زبیدہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی "رُستم علی خان، میری نیک خواہشات اور ...." اس کے اندر کا رُکا ہوا سیلاب اُمڈ آیا۔

"زبیدہ، کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اُس کی ماں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ اور اپنی بیٹی کا چہرہ اوپر اُٹھایا "زبیدہ تم رو رہی ہو؟"

جواب میں زبیدہ اپنی ماں سے لپٹ گئی اور اُس کی چھاتی میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔ بوڑھی عورت فوراً ہی معاملے کی تہہ تک جا پہونچی اور اُس نے رُستم کی طرف اِس انداز سے دیکھا گویا اپنی بیٹی کی پریشانی کے لئے وہ اُسے قصوروار ٹھہرا رہی ہو۔

"والدہ محترمہ، سارا قصور میرا ہی ہے" رُستم بولا "آپ کی صاحبزادی کے دل کو میرے الفاظ نے ہی اذیت پہنچائی ہے۔ میں نے وہ الفاظ کہے ہیں جنہیں زبان پر لانے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ آپ کی نوازشوں کے صدقے میں نے زبیدہ سے یہ کہنے کی جرأت کی کہ میں اپنی رُوح کی گہرائیوں سے اُسے چاہتا ہوں۔

"میں جوش میں خود کو بھول گیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں نے کیا کچھ کہہ دیا۔ میں جذبات کی رَو میں بہہ گیا تھا جو میرے لئے قطعی مناسب نہیں تھا۔ میں اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوں۔

پ چاہیں تو مجھے ذلیل کر کے یہاں سے نکلوا سکتی ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔"

"رستم، تم باتیں بہت کرتے ہو" بیگم نے کہا "میں تم پر زیادہ سختی نہیں برتوں گی۔ اِس وقت اپنے آپ میں نہیں ہو اور نہ ہی یہ بے وقوف لڑکی ہے۔ تمہیں پہلے مجھ سے بات کرنی چاہیئے تھی۔ مجھے تم ہمیشہ خیر خواہ سمجھنا۔ میرے ساتھ تم اُسی آزادی سے گفتگو کر سکتے ہو جیسے کہ اپنی والدہ سے۔"

"اماں جان، میں بھی اپنے دِل کا حال آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ مجھے آپ کی صاحبزادی سے دیوانہ وار عشق ہے۔ جس لمحے میری نگاہوں نے پہلی دفعہ اُس کے فردوسی حُسن کو دیکھا تھا، اُسی وقت سے میں دل و جان سے اُس پر فدا ہوگیا تھا۔ مجھے اگر سو بار بھی پیدا ہونا پڑے، تب بھی زبیدہ کے لئے میری محبت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو، تم پھر اُول جلُول باتیں کرنے لگے۔ تسلی سے معاملے پر غور کرنے دو۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں، تمہاری تمام کسیدہ گوئی کا مطلب یہ ہے کہ تم میری بیٹی کو پسند کرتے ہو اور اُس سے نکاح کے خواہش مند ہو۔ کیا محض یہی بات نہیں؟"

"محض یہی۔ محض یہی میرے لئے میری تمام زندگی ہے۔ لیکن امی جان، جس لاپرواہی سے آپ نے یہ بات کہی ہے اُس سے میرے دل کی کیفیت کا قطعی اظہار نہیں ہوتا۔"

"بھئی، جیسے بھی تم کہہ لو، بات دراصل یہی ہے۔ زبیدہ، اِس نوجوان کی پیش کش کے بارے میں تمہیں کیا کہنا ہے؟ وہ تمہیں چاہتا ہے اور تمہارے ساتھ شادی کا خواہش مند ہے۔ تمہارا جواب کیا ہے؟"

ایک ایسے نازک مسئلے پر اِس طرح اچانک کئے گئے سوال پر زبیدہ ہڑبڑا اُٹھی۔ اُس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی اور اُس کی نظریں، حیا سے نیچے جھک گئیں۔

"ہم اب کیا کر سکتے ہیں؟" بوڑھی بیگم نے کہا "جب ایک طرف تو بالکل خاموشی ہے اور دوسری طرف ضرورت سے زیادہ بول رہا ہے۔ اِس مسئلے کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میرے عزیز، فی الحال یہی بہتر ہوگا کہ اِس معاملے کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ شاید حالات بہتر ہونے پر پھر ہماری ملاقات ہو۔ اِس وقت ہمارے حالات اچھے نہیں ہیں، اِس کا تو تمہیں بھی احساس ہوگیا ہوگا۔

"ہم یہاں ایک طرح سے ملک بدر ہو کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اِس لئے اب اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ حالات کے سدھرنے تک انتظار کیا جائے۔

"اِس طرح میری بیٹی سے اِس موضوع پر بات کرنے کے لئے میں تمہارے لئے یہی بات تجویز کرتی ہوں کہ صحیح وقت کا انتظار کرو۔ اُس وقت تک اگر تم اپنی دُھن کے پکے نکلے اور تمہارے دل میں زبیدہ کے لئے یہی جگہ رہی تو ہم تمہارے سوال کا مناسب جواب دیں گے۔ اِس معاملے میں تم مجھے اپنا خیر اندیش سمجھنا۔"

رستم نے جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا "بیگم صاحبہ میں آپ کی بات کو خوشی سے قبول کرتا ہوں۔ ایک عرصے کے لئے آپ مجھے خود سے دُور کر رہی ہیں۔ دوبارہ ملنے کی اُمید ہے۔ میں اپنے عزم کے لئے سب کچھ برداشت کروں گا۔ اچھا، اب دیر ہو

ہے۔ میں چلتا ہوں، خدا حافظ۔ خدا میری مدد کرے اور مجھے من چاہی مراد جلدی ہی مل جائے۔"

"جاؤ، رستم! ایک ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ مستقبل ہمارے لئے جو بھی سلے کرے، ایک بات کا یقین رکھنا کہ تمہارا احسان ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ آخری بار پھر الوداع! خدا تمہارا نگہبان ہو۔"

وہ جدا ہوئے۔ رستم پلٹ کر تیزی سے بوڑھے سردار کی رہائش گاہ کا رُخ کیا جہاں سردار اب تک اُسی کمرے میں بیٹھا تھا۔

"کیوں، اُن سے ملاقات ہو گئی؟" اُس نے پوچھا۔

"جی، میں اُن سے مل آیا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ ایک دفعہ پھر اُن سے ملاقات کا موقع مجھے نصیب ہوا۔"

اب رستم کے دل میں ایک راز تھا جسے وہ اپنے میزبان سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس بات کو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اِس سخت مزاج آدمی کے سامنے بھی اُسی طرح اپنا دِل کھول دے جیسا اُس نے اُس کی بیگم کے سامنے کیا تھا۔

"اب مجھے سفر کے لئے روانہ ہو جانا چاہیئے" رستم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے یہاں سے دو میل دور ایک ٹولی سے ملنا ہے۔ آپ کی مہمان نوازی اور بے پناہ خلوص کے لئے میں آپ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔"

"تم سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم نے میری بیگم اور میری بیٹی کی جو مدد کی تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ اب پھر یہاں آنا کب ہوگا؟"

"میں کہہ نہیں سکتا۔ اگر شہنشاہ یا ملکہ بیگم نے دوبارہ حکیم صاحب سے مشورہ کرنا چاہا تو شاید مجھے پھر آنا پڑے۔ نہیں تو مجھے بہت اُمید ہے کہ جلدی ہی ملاقات کرنے کا موقع مل سکے گا۔ ہاں، اگر آپ اِس زندگی کو خیر باد کہہ کر دربار میں آنا چاہیں تو دوسری بات ہے۔"

"میں اور جہانگیر کے دربار میں جاؤں!" بوڑھے نے طنز سے ہنستے ہوئے کہا "بہرحال تمہیں جلدی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ زیادہ دیر روک کر تمہارا وقت خراب کروں۔ میرا خیال ہے کہ باہر کا راستہ تو تم تلاش کر ہی لوگے۔ اِتنی تیز دھوپ میں باہر نکلنا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میری آنکھوں پر اِس کا بہت اثر پڑتا ہے اچھا، خدا حافظ۔"

رستم نے جھک کر آداب کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُس کا گھوڑا وہیں موجود تھا جہاں وہ باندھ کر گیا تھا۔ گھوڑے کی باگ پکڑے ۔۔ درے کے دُوسری طرف جا پہنچا۔ وہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ نیچے ڈھلان تک آ گیا جہاں مراد اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ رستم نے بغیر پگڈنڈی پر بڑھتا ہی گیا۔

بوڑھا سردار اُسی طرح اپنے کمرے میں بیٹھا خود بخود ہنس رہا تھا۔ اُس کی بیگم اور بیٹی جو رستم کے لَوٹ جانے کے بعد ابھی کمرے میں واپس آئی تھیں سردار کی عادتوں سے خوب واقف تھیں۔ اِس لئے وہ فوراً تاڑ گئیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اُنہوں نے دیکھا وہ مسند پر بیٹھا مُسکرا رہا تھا اور بار بار اپنے گھٹنے تھپتھپا رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"مجھے معلوم تھا کہ وہ اُس لالچ میں آجائے گا۔ وہ ایک بے وقوف جذباتی نوجوان ہے اُس جاہل اِنسان کی سادہ دلی اور خود فریبی سے فائدہ نہ اُٹھانا بڑی بے وقوفی ہوتی۔ وہ اس طرح کے نوجوانوں میں سے ہے جنہیں یہ غلط فہمی ہے کہ دُنیا کی تمام لڑکیاں اُن کی خوبصورتی کے سبب اُن سے عشق کرتی ہیں۔"

"بے وقوف! جاہل" وہ خوشی سے بڑبڑا رہا تھا۔

"آج تو آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟" بیگم نے پُوچھا۔

جواب میں اُس نے ایک تیز قہقہہ لگایا اور پھر وہی الفاظ دہرائے "بے وقوف جاہل!"

"کسے کہہ رہے ہیں بے وقوف!"

"ارے اور کسے، اُسی بے وقوف نوجوان کو جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گیا ہے۔"

بیگم نے کچھ اور پُوچھنے کے بجائے زبیدہ کی طرف منہ کر کے کہا "زبیدہ ذرا جا کر دیکھنا کہ ملازم برتن صاف کرنے سے پہلے صحن سے کوڑا کرکٹ اچھی طرح صاف کرلیں۔"

لڑکی کو اس بہانے کمرے کے باہر بھیج کر وہ پھر اپنے خاوند کی طرف مُڑی۔

"یہ تم نے ٹھیک کیا ممتاز" سردار نے کہا "ایسی باتوں کے وقت اُسے یہاں موجود نہ ہونا چاہیئے۔ میری آنکھوں کی روشنی اگرچہ بہت کم ہو گئی ہے لیکن پھر بھی اتنی زیادہ نہ کہ یہ بھی نہ جان سکوں کہ اُس بے وقوف لڑکی کے دل میں اُس نوجوان کے ہمدردی ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ وہ اُس لالچ میں آجائے گا۔ وہ ایک بے وقوف جذباتی نوجوان ہے۔ اُس جاہل انسان کی سادہ دِلی اور خود فریبی سے فائدہ نہ اُٹھانا بہت بے وقوفی کی بات ہوتی۔ وہ اِس طرح کے نوجوانوں میں سے ہے جنہیں غلط فہمی ہے کہ دنیا کی تمام لڑکیاں اُن کی خوب صورتی کے سبب اُس سے عشق کرتی ہیں۔ جب میں نے اُسے باغ کی طرف بھیجا کہ بیگمات سے مل لو تو کسی طرح دیوانہ وار باغ کی طرف چل دیا۔ بے وقوف کو یہ کہاں پتہ تھا کہ وہ ایک جال میں پھنس رہا ہے۔"

"کیسا جال؟"

"وہ جال، جو میں نے بڑی محنت سے پچھلے تین مہینوں میں تیار کیا تھا۔ بیگم، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں نے اُس نامعقول نوجوان کو اِس لئے یہاں آنے کی دعوت دی تھی کہ مجھے بے ہودہ شکلیں دیکھنے کا شوق ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ جہانگیر کے دربار سے آیا تھا۔ وہ اُس مہرالنسا یا نورجہاں ۔۔ جیسا کہ آجکل کہا جاتا ہے، کا خاص مصاحب ہے۔



مقالہ کنول

نوجوان لڑکے لڑکیوں کی پارٹیاں

کھانے پینے کی چیزوں اور جگہ کا مناسب انتظام کر کے انھیں آزاد چھوڑ دینا ہی بہتر رہے گا۔

گذشتہ اتوار کو چھوٹے بھائی بنٹو کی سالگرہ ماں نے کتنی دھوم دھام سے منائی [illegible] آج بڑے بھائی رمیش کا بی۔ اے کا نتیجہ نکلا [illegible] سے پاس ہونے کی خوشی میں اپنے دوستوں [illegible] دی ہے۔ اِن دنوں گھر میں خوب چہل پہل [illegible] کسی بھی فرد نے اُن دو اداس [illegible] بھری آنکھوں کا سوال پڑھنے کی کوشش [illegible] آنکھیں تھیں منجھلے ۱۲ سالہ لڑکے کی، جو [illegible] آٹھویں جماعت میں کامیاب ہوا ہے اور جس [illegible] سالگرہ ایک ماہ پہلے بغیر کسی تقریب کے [illegible] سے نکل گئی تھی۔

دونوں موقعوں کی چہل پہل میں شامل ہونے کے باوجود بھی وہ سب سے الگ اور کھویا کھویا سا رہا اس کی آنکھوں کی گہرائی میں کئی سوال کروٹیں لیتے رہے۔ کیوں میری سالگرہ نہیں منائی جاتی، کیوں میرے پاس ہونے کی کسی کو خوشی نہیں ہے؟ [illegible] کیوں آخر کیوں؟ لیکن سوال ہمیشہ سوال ہی رہے اُن کے جواب دینے کی کسی کو فرصت نہ تھی بلکہ سب کو [illegible] بھی نہیں کیوں [illegible] بنٹو کی سالگرہ کی پارٹی کے بعد شام کو اس نے بلاوجہ بنٹو کو پیٹ دیا تھا اور رمیش نے بھی اسے اپنے دوستوں کے سامنے اودھم مچانے پر ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیا تھا

[illegible] ہے۔ ممی پاپا میٹنگوں میں جانے میں لگے رہتے ہیں،



شاپنگ کے علاوہ سینما بھی جاتے ہیں۔ بڑی بہن رما
بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی جاتی ہے
[illegible] اپنے [illegible] کے ساتھ گھومتے
[illegible]
اپنی سہیلیوں کے ساتھ جانے [illegible]
ہے تو ماں ڈانٹ دیتی ہے [illegible] بڑی ہو گئی، اب بھی
میرے ساتھ جائے گی۔ بہن سے کہتی ہے تو وہ
جھڑک دیتی ہے [illegible] بڑی لڑکیوں کے ساتھ چھوٹی [illegible]
نہیں جایا کرتیں [illegible] اور بھائی؟ اس سے تو کچھ کہنا [illegible]
بے کار ہے وہ بھلا کیوں ہمراہ لے جائے گا۔ جب
بہن ہی نہیں لے جاتی؟ اپنی سہیلیوں کے ساتھ جانے
کو کہتی ہے تو بھی سب منع کر دیتے ہیں " تو اکیلی
جائے گی؟ نہیں، ابھی تجھے کیا سمجھ ہے!"
وہ آخر کیا کرے؟ اسے کہیں جانے کی اجازت
نہیں ملتی اور گھر میں اس کی سہیلیاں آتی ہیں تو کوئی
پرواہ نہیں کرتا۔ بڑی بہن کی سہیلیوں کی آخر کیوں اتنی

خاطر ہوتی ہے؟ بھائی کے دوستوں کو کیوں پوچھا جاتا ہے،
صرف اسی کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے؟
یہ مسئلہ [illegible] یا تبسم یا ساجدہ کا ہی نہیں ہے۔
اس عمر کے [illegible] لڑکے لڑکیاں اس سے دوچار [illegible]
[illegible] یہ عمر [illegible] بڑوں میں شمار ہوتا ہے [illegible]
بچوں میں۔ اگر وہ [illegible] کوئی بھی بات یا ضد کر بیٹھیں
تو ڈانٹ کھاتے ہیں اور [illegible] جیسی [illegible] بات کریں تو
[illegible] کا انتا [illegible] جھوٹوں کی طرح پیار [illegible]
حاصل ہوتی [illegible] بڑوں کی طرح عزت۔ نتیجہ [illegible]
[illegible] تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس [illegible]
[illegible] جسمانی [illegible] جذباتی تبدیلیوں [illegible]
وہ پہلے ہی حیران، فکرمند اور ذہنی طور پر الجھے [illegible]
[illegible] سکیں [illegible] اٹھک
[illegible] سمجھے جا[illegible]
کی ضرورت ہے [illegible] ایک ایسا ذہنی صدمہ
ہے جس کے [illegible] آگے [illegible] اچھے [illegible]
شخصیت کی [illegible] اس [illegible] اس [illegible]
رویّہ کے [illegible] ان کی [illegible]
پڑ سکتا ہے

نازک

[illegible] نازک تقاضے اور نخست [illegible]
[illegible] باتوں کو دیکھنے کی [illegible]
اسے سمجھنے کی [illegible] کا فقدان۔ [illegible]
الجھے اور انھیں کبھی نہ سلجھانے [illegible] ان لوگوں
کا [illegible] سہارا ان کے دوست اور سہیلیاں ہی [illegible]
[illegible] وہ جی کھول کر باتیں کر کے اپنے جذبات
کو تسکین پہنچا سکیں۔ اگر ان سے بھی آزادانہ [illegible]
اور ملاقات کی آزادی [illegible] جائے تو پھر دل کا [illegible]
کیسے ہلکا کریں؟ پھر ان کی عجیب و غریب [illegible]
لئے ان کو موردِ الزام کیوں ٹھہرایا جائے؟
آپ بچوں کے جنم دن، سالگرہ وغیرہ [illegible]
مناتے ہیں۔ اپنے دوستوں کی پارٹیاں [illegible]
ترقی کی خوشی میں مٹھائی بانٹتے ہیں۔ [illegible]
کی امتحان میں کامیابی پر یا انعام وغیرہ جیتنے پر [illegible]

تقریب مناتے ہیں تو پھر اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کو ہی نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟ وہ تو پہلے سے ہی گھر میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور خود سے اُلجھے رہتے ہیں۔ آپ کا یہ رویہ ان کو کہیں اور نہ اُلجھا دے، سرکش یا ڈھیٹ نہ بنا دے۔ آپ نے کبھی سوچا ہے؟

ٹھیک ہے کہ اس عمر کے بچوں کو آپ اپنے ساتھ ہر جگہ نہیں لے جا سکتے۔ لیکن کیا انھیں ان کے دوستوں کے ساتھ مل کر لطف اندوز ہونے کا بھی کبھی آپ موقع نہیں دے سکتے؟ گھر آنے پر ان کے دوستوں کو عزت نہیں دے سکتے؟ انھیں آزادانہ اپنی سالگرہ یا پاس ہونے یا انعام جیتنے کی خوشی منانے کا حق نہیں دے سکتے؟ ان کے لئے کچھ شوق کی چیزیں نہیں مہیا کر سکتے؟ اگر ان کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے تو آپ کو بے رحم اور غیر ذمہ دار کیوں نہ کہا جائے؟ جس عمر کے بچوں پر سب سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے ان کو ہی نظر انداز کرنا ایک نسل کا ایسا نقصان کرنا ہے جس کے لئے آپ کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔

نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بھی اپنی سالگرہ منانے کا حق ہے۔ پاس ہونے، انعام جیتنے یا کوئی اچھا کام کرنے پر اپنی خوشی کے اظہار کے لئے تقریب منائیں۔ اس بہانے انھیں اپنے دوستوں یا سہیلیوں کے درمیان آزادی سے ہنسی مذاق کا لطف اٹھانے دیجئے تاکہ وہ خود کو اکیلا اور نظر انداز نہ سمجھیں۔ اپنا دل بڑا رکھئے۔ رہیں اور آپ کو بھی اپنے فطری جذبات کی تسکین کرنی ہے۔ ٹھیک ہے تو کہوں گی کہ آپ اپنے بچے بچوں کی تقریب منائیں یا نہ منائیں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کو ضرور خوش رکھیں۔ یہ ان کے اندر پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

آیئے، اب دیکھیں کہ ان کی پارٹیوں کی شکل درست کیا ہو؟

اس عمر کے بچے کھانے کے زیادہ شوقین نہیں ہوتے انھیں تو بس غپ شپ اور تفریح کے لئے دوست



اور آزادی چاہئے۔ ایسی آزادی کہ بڑے ان کی باتیں نہ سن سکیں اور ان کی تقریب میں دخل اندازی نہ ہو۔ انتظام کامیاب، بندوبست سب ہی میں وہ خود ہی حصہ لینا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کی تقریب میں کھیلوں وغیرہ کے لئے چند انعامات رکھے جا سکتے ہیں مگر ان کا فیصلہ کرنے والوں میں بڑوں کو نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کو نہ ہدایت دینے کی ضرورت ہے نہ ہاتھ بٹانے کی۔ آپ کا نوجوان لڑکا یا لڑکی خود سوچ لے گا کہ آپ کھانے پینے کی چیزیں فراہم کر دیں۔ وہ سب خاص اور انھیں میز پر لگانے کی ذمہ داری بھی ان پر چھوڑ دیں گے تو ان کی پارٹی یا تقریب کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔

غیر ملکوں میں

غیر ملکوں میں ۱۲ سے ۱۵ سال تک کے بچوں کے لئے سلیپنگ پارٹی ... ہے۔ شام کو لڑکے لڑکیاں ... دعوت دی جاتی ہے اور سونے کے لئے الگ ... جس میں رات کو دیر تک انھیں ریکارڈ بجانے، گانے، غپ شپ کرنے کی مکمل آزادی دی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ جتنے لڑکے یا لڑکیاں ہوں اتنے پلنگوں یا بستروں کا انتظام کیا جائے ... کر دیتے ہیں ... گھر سے لائے ... اس بارہ بچوں کے لئے چار پلنگ بچھا دیے جاتے ہیں۔

نیچے دری قالین پر ہی بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ پینے کے لئے چائے یا شربت کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور تفریح کے لئے گراموفون اور کھیل وغیرہ کا بھی۔ پھر انھیں آزادانہ طور پر رات کو دیر تک کھیل، ناچ گانے یا قصے کہانیوں کا لطف اٹھانے دیا جاتا ہے۔

بھارت میں اگر ہم ایسی سلیپر پارٹیوں کا اہتمام کرسکیں تو کم سے کم اس کے مقصد کو عملی جامہ تو پہنا سکتے ہیں کہ بچے آزادی سے اپنی تہذیب میں اپنے دوستوں کی صحبت کا لطف اٹھائیں جی بھر کر قہقہے لگائیں اور کھیلیں۔ ایک دن کے لئے تھوڑا شور و غل مچالیں تو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا کہرا چھٹ جائے اور وہ جماعتوں، گلیوں میں یا گھروں میں ہڑدنگ نہ مچائیں۔

اس طرح گو بے لگام کھیل کا لطف اٹھا لینے سے انہیں جو تازگی حاصل ہوگی اس کا اثر ان کی تعلیم پر بھی اچھا پڑے گا اور ذہن سے احساس کمتری اور جذبہ تشنگی دور ہو کر ان کی شخصیت کی اچھی طرح نشوونما ہو سکے گی۔ ان میں باہمی خلوص بھی بڑھے گا۔ وہ کنبے اور معاشرے کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بن سکیں گے۔

آپ ان کو نظر انداز نہیں کریں گے تو وہ بھی آپ اور آپ کے بیچ میں دیوار نہیں کھینچیں گے۔ آپ ان کو ... بخشیں گے تو وہ آپ کو۔ اس اصول کا اطلاق انسانی ... معاشرتی نظام دونوں پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ ⊙

یہ  شوہر

ہماری دور کی رشتے دار ہیں جن کو ہم شمی دیدی کہتے ہیں۔ جب شادی کے کافی عرصہ بعد تک وہ میکے نہ آئیں تو ان کے گھر والوں کو بہت تشویش ہوئی۔ کافی خط بھیجنے کے بعد شمی دیدی میکے آئیں۔

اتنے دنوں تک میکے نہ آنے کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ اشوک (شمی دیدی کے شوہر) ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اس لئے جب بھی وہ میکے آنے کے لئے کہتیں وہ جواب دیتے "کہ ابھی کیا جلدی ہے پھر کبھی چلی جانا"۔ جب شمی دیدی کو میکے آئے ہوئے کافی دن ہوگئے تو ان کے شوہر نے اپنی محبت کا ثبوت اس خط سے دیا۔

شریمتی شمی جی آداب

تمہارا خط موصول ہوا جس میں تم نے لکھا تھا کہ تم آرہی ہو۔ تو اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے اپنی اسسٹنٹ مادھوری دیوان سے شادی کرلی ہے اور اب تمہارے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مادھوری ہر طرح تم سے لائق ہے۔ ایشور کرے تم کوئی شوہر تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکو۔

تمہارا سابق شوہر ——— اشوک رامیا

خط کے پڑھتے ہی شمی دیدی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ آن ... میں وہ اپنے گھر آگئیں۔ اُن کے ... میں اُن کے پتا جی بھی تھے مگر ... اُن لوگوں کو حقیقت کا پتہ چلا تو ... بے اختیار ہنسے۔

——— خالد ملک ... !

"یہ شوہر" اور "یہ بیویاں" فیچروں ... اپنے دوستوں کے دل چسپ ... پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں ...

میٹھے بول

مقالہ • نیرجا



جن سے آپ کی بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی

ایک ہی بات کو کئی طرح سے کہا جاسکتا ہے، رد کھے پن سے، طعنے سے یا نرمی سے، ، جو کام آپ میٹھا بول کر لے سکتی ہیں وہ کڑوا بول کر نعمہ دے کر نہیں۔ ازدواجی زندگی میں تو اس کا ص خیال رکھنا چاہئے کہ میاں بیوی میں اگر کسی بات اختلاف ہو بھی جائے تو بھی اشتعال میں نہ آیا ۔ کیوں کہ بات اس سے اور زیادہ بڑھتی ہے۔ ت میں سے بات نکلتی ہے، اینٹ کا جواب پتھر سے ا جاتا ہے ۔۔۔ اور جھگڑا زیادہ طول پکڑتا ہے۔ لیکن ں بیوی میں سے اگر ایک اس بات پر آمادہ ہو جائے کڑوی بات نہ ہو گی اور دوسرا اس کا جواب شیریں مالی سے بنا دے، تو آج نہیں تو کل کڑوی بات لے والا اور ترش کلامی سے کام لینے والا لازمی طور ی عادت بدلنے کی کوشش کرے گا

مثال کے طور پر یہاں کچھ جملے دئے گئے ہیں یک ہی بات کو کڑوا اور میٹھا کیسے بنایا جاتا ہے

—— صابن ختم ہو گیا ہے۔ فوراً آنا چاہئے۔

—— مجھے کیا اپنا نوکر سمجھ رکھا ہے جو روز بازار کا چکر لگاتا رہوں؟ سب سامان ایک بار ہی کیوں نہیں منگایا جاسکتا، بار بار بازار جانا اچھا نہیں لگتا۔

—— بھئی، اگر ایک ہی دفعہ سب چیزیں منگا لیا کرو تو مجھے بڑی آسانی ہو جائے گی۔

بچے نے گلاس توڑ دیا۔ بیوی نے اسے پیٹ ڈالا۔

—— تم ماں ہو، دشمن ہو بچے کی؟ اس کی ہڈی پسلی ایک کر کے چین آئے گا تمہیں۔

—— ارے بھئی، بچے کو پیار سے سمجھا دو ابھی چھوٹا ہی تو ہے۔ مارنے سے بچہ ضدی ہو جاتا ہے۔

شوہر کے دیر سے گھر لوٹنے پر بیوی کی شکایت کا جواب۔

—— تم کون ہوتی ہو میرا حساب طلب کرنے والی، میں کوئی آوارہ گردی تو نہیں کر رہا تھا، دفتر میں کام ہی کر رہا تھا

—— بھئی کیا بتاؤں، آج دفتر میں کام بہت تھا جلدی کرتے کرتے بھی اتنی دیر ہو گئی

شوہر کو دفتر جانے کی جلدی ہے۔ بیوی نے ابھی تک کھانا نہیں لگایا ہے۔ شوہر قدرے غصے میں آکر کھانا مانگتا ہے۔

—— تم نے آسمان سر پر اٹھا لیا ذرا سی

دیر ہوگئی تو لگے چیخنے! آخر مجھے کیا سمجھا ہے؟

—— تم میز پر بیٹھو تو —— میں بس ابھی لائی۔ کیا بتاؤں جلدی کرتے کرتے بھی آج دیر ہوگئی۔

بچّے کے کپڑے گندے ہیں۔ شوہر بیوی پر بگڑتا ہے

—— تمہیں نظر نہیں آتا، کتنے میلے کپڑے پہنے ہوئے ہے، جیسے خود پھوہڑ سی رہتی ہو، ویسے ہی اس بچّے کو۔ ۔ ۔

—— مجھے تو بس یہی ایک کام ہے۔ ۔ ۔ چوبیس گھنٹے اس موئے کے کپڑے بدلتی رہوں تمہیں بچّے پالنے پڑیں تو پتہ چلے!

—— ابھی تو بدلے تھے، پھر دھول میں کھیل کر میلے کر لایا۔ چلو پھر بدلے دیتی ہوں۔

شوہر کی نکٹائی نہیں مل رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے۔

—— میری نکٹائی کہاں رکھ دی؟ یہاں ہے جو کوئی چیز ٹھیک ٹھکانے پر مل جائے؟

—— میں نے تو کھونٹی پر لٹکا دی تھی تم نے ہی کہیں اِدھر اُدھر ڈال دی ہوگی۔ میں کہاں تک تمہاری چیزوں کی دیکھ بھال کروں؟

—— میں ابھی ڈھونڈ دیتی ہوں۔

سبزی میں نمک تیز ہوگیا۔ شوہر بگڑ کر کہتا ہے "تمہاری ماں نے کیا کھانا بنانا نہیں سکھایا؟ کیسی پھوہڑ سے واسطہ پڑا ہے!"

—— میری ماں کو گالی دی تو ابھی مائکے چلی جاؤں گی۔ نمک زیادہ ہوگیا تو میں کیا کروں۔ کوئی میں نے جان بوجھ کر تو زیادہ ڈالا نہیں ہے؟

—— آج اندازہ غلط ہوگیا، کل سے دھیان رکھوں گی۔

اس طرح ہر روز گھر میں کئی باتیں ہوتی ہیں۔ جن کو میٹھا بول کر آگے بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے گانٹھ باندھنے کی بات یہی ہے کہ اپنی غلطی ماننے میں تو کوئی ہچکچاہٹ ہونی ہی نہیں چاہیئے۔ دوسرے کی غلطی اس سے زبردستی نہیں منوانی چاہیئے۔ اپنی غلطی اسی وقت مان لینے پر دوسرا آدمی بالکل لاجواب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ آخر کہے گا بھی کیا، ایک دو بات کہہ کر اُسے چپ ہونا ہی پڑے گا

اب دیکھئے کہ جھگڑا کس طرح بڑھتا ہے۔

شوہر: دفتر سے آئے گھنٹہ بھر ہوگیا ابھی تک تم نے مجھے کھانا ہی نہیں دیا۔

بیوی: اتنی دیر سے تو چولھے میں سر کھپا رہی ہوں، خالی تو نہیں بیٹھی ہوں۔

شوہر: بڑبڑانا بہت آگیا ہے، اپنا قصور تو مانو گی نہیں!

بیوی: یہ خوب کہی! پھانسی پر لٹکا دو!

شوہر: ارے، پھانسی کا پھندا تو اسی دن میرے گلے میں پڑ گیا جس دن تمہیں بیاہ کر لایا تھا۔

بیوی: اتنے تنگ آگئے ہو مجھ سے تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ میں کل ہی یہاں سے اپنے مائکے چلی جاؤں گی۔

شوہر: میری بلا سے، کل کو جاتی ہو تو آج چلی جاؤ

اور اس کے بعد بیوی زار زار رونے لگتی ہے اور شوہر غصے سے پیر پٹختا اور بڑبڑاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے، بیوی مائکے جائے یا نہ جائے، مگر کئی دن گھر میں کھانا نہیں پکے گا۔ دونوں کی بول چال بند رہے گی اور دونوں پریشان رہیں گے لیکن اگر شروع میں ہی بیوی کہہ دے کہ آج ذرا دیر ہوگئی، لو ابھی لاتی ہوں، کل سے خیال رکھوں گی ۔ ۔ ۔ تو کیا ہے کہ بات آگے بڑھے!

روز مرّہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں سخت کلامی سے پیش آنے سے ایک برا اثر بھی پڑتا ہے کہ بچّے بھی وہی لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں جو والدین یا سرپرستوں کا ہے۔ علاوہ ازیں لڑائی جھگڑوں سے زندگی بھی اجیرن ہو جاتی ہے

کامیاب زندگی گذارنا بھی ایک فن ہے جسے ہر کوئی نہیں جانتا۔



...ذر گیا بنا کہے

آج سانجھ روز سے آدھک اداس تھی
کیوں کہ آج دن گذر گیا بنا کہے

ج بانسری نہ بجی بانجھ ہو گئی
ہ تکی سورج کی سانجھ ہو گئی
، ہار کے ہزار روپ چھٹ گئے
ندگی کے چار چاند لٹ گئے

آج اداسی کے بادلوں میں ہوڑ تھی
کیوں کہ کل ہمارے بیچ نہیں بچے

آنسوؤں کے گیت کون لو سکا
موں کو ہجوم پیار گیت ہو سکا
تو آج تو ہزار گیت رو دیے
میتوں نے آپ ہوش کھو دیے
ج ندگی کا کارواں بھٹک گیا
ن شو ہی نہ آسکا دوار پر
س بیٹھی پیار کا آنگن نہار کر
ن کی گلی نہ آج روشنی جلی
ہ گیت کی نہ یوں برات ہی چلی

آج گیت میں بھرا ادھار پیار تھا
کیوں کہ درد تو ملا مگر سہا سہے
سانس ٹٹ چلی ویران دیکھتے رہے
کیوں کہ آج دن گذر گیا بنا کہے

—— سورج کمار جین ——

کیا آپ کو اپنی

دیکھئے چونکئے گا نہیں، نہ ہی بلا سوچے سمجھے کہئے گا کہ بھلا بیوی سے شوہر کو محبت نہ ہوگی تو پھر کس کو ہوگی؟

ذرا سنجیدگی سے اپنے دل کو ٹٹولئے، پھر آپ سب میں سے کتنے شوہر صاحبان ایسے ہیں جنھیں سچ مچ ہی اپنی بیویوں سے ہمدردی اور سچا پیار ہوتا ہے۔

ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے اکثر وبار عورتوں پر ہی ڈالا جاتا ہے، ساری نصیحتیں اور قاعدے اُسی کو سُناتے سکھاتے جاتے ہیں۔ وہ عمل بھی کرتی ہے، مگر نتیجہ اکثر ایک طرفہ ہی نکلتا ہے اُس کی خدمت اور قربانی سے جہاں شوہر اور بچے مطمئن اور خوش نظر آتے ہیں وہاں وہ خود پریشان اور آزردہ نظر آتی ہے جس کی وجہ شوہر کی بے توجہی، خود غرضی اور کاہلی ہوتی ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ جو ہم کماتے ہیں سب بیوی کے ہاتھ پر ہی تو لاکر رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق گھر چلاتی ہے، اپنے اور ہمارے کپڑے، جوتے اور ضرورت کی دوسری چیزیں اپنی ہی پسند سے خریدتی ہے۔ کبھی بیمار ہو جاتے ہیں تو فیملی ڈاکٹر سے خود مشورہ کرکے دوا لے آتی ہے۔ بلا روک ٹوک سہیلیوں سے ملتی ملاتی ہے حسب خواہش سنگار کرتی ہے ہم کبھی اُس کے کسی کام یا بات میں مخل نہیں ہوتے پھر یہ بے وجہ دُکھی کیوں ہے۔

یہیں پر آپ غلطی کر جاتے ہیں۔ کیا اُسے آپ کی، آپ کے مشوروں، آپ کی توجہ، ہمدردی اور آپ کے پیار کی ضرورت نہیں؟

جب آپ کو گھر میں ہر قدم پر اُس کی اور اُس کی توجہ اور پیار کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، تو کیا وہ آپ کی طرح انسان نہیں؟ اُس کا دل نہیں؟ دل میں ارمان نہیں؟ یہ آپ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ اپنی بے لوث خدمت اور پیار کے بدلے صرف آپ کی ہمدردی اور پیار چاہتی ہے جس کا آپ کو قطعاً احساس نہیں۔

ہمارے ملک میں ابھی طلاق کا رواج عام نہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے ملک کے شادی شدہ لوگ ایک دوسرے سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ یہاں بھی بہت سے گھروں میں میاں بیوی میں کشیدگی نظر آتی ہے۔ بے اطمینانی کا شکار زیادہ تر عورتیں

جب آپ کی بیوی آپ کے سُکھ دُکھ کے لئے اپنے جذبات کی قربانی خوشی سے دے سکتی ہے تو پھر مرد ہو کر آپ اپنی ذمہ داریوں سے کیوں بھاگتے ہیں؟

ہی پائی جاتی ہیں۔ اب اگر وہ بھی اپنی مغربی بہنوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلاق کا مطالبہ کرنے لگیں تو ہمارا سماج انھیں کبھی عزّت سے جینے نہ دے گا۔ کیوں کہ معاشرے میں مرد تو کئی کئی شادیاں کرسکتا ہے مگر عورت کی دوسری شادی بیحد معیوب سمجھی جاتی ہے اِس خوف سے بھی عورت شوہر کے مظالم اور بُرے سلوک کو برداشت کرجاتی ہے۔

ہمارے مردوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ بیوی کو زندگی بھر کے لئے ساتھی بنا کر اُن کے دُکھ درد میں برابر کے شریک ہونے کا وعدہ کرکے یوں آنکھیں بدل لیں۔ جب آپ کی بیوی آپ کے سُکھ اور خوشی کے لئے اپنے آرام و خوشی یہاں تک کہ اپنے جذبات کی قربانی بھی خوشی دے ڈالے تو اُسے قربانی ہی نہ سمجھے تو آپ مرد ہوکر کیوں پیچھے ہیں!

یاد رکھئے یہاں برتری کا سوال نہیں اُٹھتا۔ آپ جس چیز کو برتری سمجھ رہے وہ دراصل آپ کی خودغرضی، کم عقلی اور جھوٹا احساسِ برتری ہے جو آپ کو اُس کی ہمدردی اور محبّت سے باز رکھتے ہیں۔ آپ کو اپنی بیوی سے محبّت ہے، آیئے آپ کے اس دعوے کا امتحان بھی ہوجائے۔

رات کو جب آپ کا بچّہ دودھ کے لئے بیدار ہوکر رونے لگتا ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟ بیوی کے ساتھ خود بھی بیدار رہ کر اُس کے دودھ وغیرہ تیار کرکے لانے تک بچّے کو سنبھالتے ہیں یا "اُونہہ سارا دِن دکان اور آفس میں جھک مار کر آتے ہیں" کہہ کر کروٹ لے کر سو جاتے ہیں۔ یاد رکھئے، صرف آپ ہی سارا دِن جھک نہیں مارتے، عورت بھی آپ سے کہیں بڑھ کر جھک مارتی ہے۔ بیوی بیمار ہو، سر درد سے پریشان ہو تو کیا آپ اس کی بیماری سے بے چین ہوکر



اُس کا سر دبا دیا کرتے ہیں، اُسے تسلی دے کر خود ڈاکٹر کے پاس لے جانے یا خود دوائی لا دیتے ہیں یا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کے پاس جا کر دوائی لے آؤ" کہہ کر باہر اپنے کام یا دوستوں سے ملنے چلے جاتے ہیں؟

•

وہ آپ کے لئے ارمان سے نت نئے پکوان بناتی ہے، مکان نئے نئے زاویوں سے سجاتی ہے خود طرح طرح کا سنگار کرتی ہے تو کیا آپ اُسی سے پوری دلچسپی کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں؟ اُس کے پکوان کی تعریف کر کے، اُس کے سلیقے کی داد دے کر اُس کے سنگار کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ کر کیا آپ اُس کا حوصلہ بڑھاتے اور دل خوش کرتے ہیں! یا خاموشی سے دستر خوان سے اُٹھ جاتے ہیں نہیں اور سمجھا دیتے ہیں کہ کھانا بھی انسان سے زندہ رہتے ہیں؟

یا آپ بھی اُسے خوش کرنے کے لئے موسم کے مطابق حسین تحفے اور پھول وغیرہ لانے میں یا ہماری شادی ہوئے مدّت ہو گئی اب اِن چونچلوں کی ضرورت نہیں، سمجھ کر اِن جھگڑوں میں نہیں پڑتے؟

کبھی سینما یا دوسری تفریح کے لئے خوشی سے خود ہی وعدہ دیتے ہیں یا اُس کے لاکھ بار کہنے پر بھی کام کی زیادتی کے بہانے یا پھر کبھی کہہ کر ٹال دیتے ہیں،

جب وہ کبھی کبھی آپ کے قریب آکر اداؤں سے اپنی محبت کا اظہار کرے تو آپ اُس کی محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں یا بیزاری کا اظہار کر کے اُس کے محبت بھرے دِل میں نشتر چبھو کر اُسے خون کے آنسو رُلاتے ہیں؟

جب وہ آپ کی بے تحاشا سگریٹ اور چائے نوشی پر دِلی ہمدردی اور پیار سے ڈانٹتی یا الجھتی کرتی ہے تو کیا آپ اُس کی محبت کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنی بُری عادتوں میں کمی یا ترک کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں یا اُسے جھڑک کر آپ کے معاملات میں دخل نہ دینے کی تاکید کر دیتے ہیں؟

یہ  بیویاں

میں اتوار کے دن اپنے ایک دوست کے یہاں گیا تو دیکھا کہ ان کی بیوی بلّی کے مرہم لگا رہی تھیں ساتھ ہی ساتھ شوہر کو جلی کٹی سنا رہی تھیں اور شوہر صاحب آرام کرسی پر چُپ چاپ پڑے ایک رسالہ پڑھ رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر وہ بولے۔

"ارے بھئی کیا بتاؤں یہ بلّی نقصان بہت کرنے لگی تھی۔ تمہاری بھابی کے کہنے پر میں اس کو کئی بار تھیلی میں ڈال کر بہت دور دور چھوڑ کر آیا مگر یہ ہر بار واپس آگئی۔

"آج جب کہ ہم لوگ پکچر جانے والے تھے اور چائے کے لئے پانی کھول رہا تھا، میں نے دودھ لاکر رکھا کہ چائے پی کر ہم لوگ سینما جائیں گے، اتنے میں بلّی نے دودھ میں مُنہ ڈال دیا۔ میں نے غصّہ میں کھولتا ہوا پانی بلّی پر ڈال دیا۔ جب سے یہ مجھے جلی کٹی سنا رہی ہیں۔ ٹکٹ بھی پھاڑ کر پھینک دیے ہیں اور بلّی کی تیمار داری میں لگی ہیں۔"

ان کی بیگم صاحبہ بولیں "جلی کٹی تو میں اور زیادہ سناؤں گی۔ اس معصوم بے زبان جانور پر آپ کو ذرا رحم نہ آیا۔ آخر ہوتا مرد ذات، بے رحم، سخت دِل۔"

ان کی بیوی کے تیور دیکھ کر میں وہاں سے یہ سوچتا ہوا آیا کہ یہ بیویاں بھی عجیب ہوتی ہیں غصّے میں آئیں تو شوہر کو جلا کر راکھ کر دیں، رحم دِلی پر آئیں تو بلّی کو مرہم لگائیں۔

—— محمد فاروق کنتوری، بمبئی

نوکرانی نہیں آتی یا ہے ہی نہیں۔ سارا کام اُسی کو کرنا ہو تو کیا آپ چھوٹی موٹی مدد خود بھی کرتے ہیں اور اگر بچے ہوں تو اُن سے بھی کراتے ہیں یا گھر کی حالت سے بے تعلق اپنی برتری کا اظہار کرتے ہیں؟

اگر اُس سے کبھی چھوٹی موٹی غلطیاں سرزد ہو جائیں تو آپ اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں یا غصّے میں اُبل پڑتے ہیں؟

کیا شام کے وقت اپنی بیوی کے ساتھ سیر و تفریح، خوش گپیوں، کوئی دلچسپ کھیل، مباحثہ یا دوست گزاری کرتے ہیں یا صرف اپنے کام میں یا بٹ کر یا اخبار بینی میں کھو جاتے ہیں؟

کیا غصّہ آنے پر آپ فوراً خود پر قابو پا لیتے ہیں یا اپنے غصّے سے گھر والوں کو خون کے آنسو رُلاتے ہیں؟

اگر آپ اپنی بیوی میں کوئی نئی خوبی دیکھیں تو اس میں دلچسپی کا اظہار کر کے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں یا اُس کی ناقدری کر کے اُس کا حوصلہ پست کر دیتے ہیں؟

کیا آپ اُس کے میکے والوں کی عزّت اور گھر آنے پر خاطر تواضع کرتے ہیں یا وقتاً فوقتاً سسرال والوں سے مطالبے کر کے اُن کی ہنسی اُڑا کر اپنے گھر میں ان سے کھنچے کھنچے رہ کر اُس کا دل دُکھاتے ہیں؟

کیا آپ اپنی بیوی کو گھر میں چلانے اور خود اس کے اپنے جیب خرچ کے لئے اپنی حیثیت کے مطابق مناسب رقم دیا کرتے ہیں یا اُسے پائی پائی کے لئے ترسایا کرتے ہیں۔

کیا آپ اُس کی ضرورتوں کا خود خیال رکھتے ہیں یا اُس کے کہنے پر فوراً پورا کر دیا کرتے ہیں یا بار بار کہنے پر بھی ٹال مٹول یا جھڑک دیتے ہیں؟

اب اگر آپ کا دل ہر پہلے سوال کے جواب میں ہاں کہتا ہو تو آپ کو آپ کی بیوی سے پوری ہمدردی اور سچا پیار ہے اور آپ مثالی شوہر کہلانے کے مستحق ہیں۔ اگر بدقسمتی سے آپ آخر کے سوالوں کے جواب میں ہاں کہنے والوں میں سے ہوں تو یاد رکھئے آپ بالکل خود غرض، کاہل، اور جاہل ہیں اور اپنی بیویوں کے تئیں مجرم ہیں۔ کیونکہ اپنی رفیقِ زندگی کے دُکھ اور سُکھ سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ اُس کی خوشی اور سُکھ کے لئے آپ اپنا ذرا سا آرام بھی قربان نہیں کر سکتے پھر آپ کی بیوی کیوں نہ خود کو بدقسمت سمجھے۔

یاد رکھئے جس گھر کی عورت خوش نہیں اُس گھر میں سچی خوشی کا گزر ممکن ہی نہیں۔ آپ بھی قربانی دینا، خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچانا سیکھئے۔ دونوں کی قربانیوں ہی سے ازدواجی زندگی کا چمن سدا بہار رہتا ہے۔

کچھ ایسے معمّر جوڑے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو ہماری عمروں کی زیادتی کے باوجود آپس کے پیار، محبت اور زندہ دلی کی وجہ سے بہت سے دُکھی نوجوان جوڑوں سے زیادہ خوش، مطمئن اور جوان نظر آتے ہیں۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ سچی مسرت ہی انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے خوشی، تندرستی کی جان ہے اور تندرستی جوانی کا ضامن

آپ کی شادی کو چاہے کتنا ہی عرصہ ہوا ہو کبھی بھول کر بھی یہ نہ سوچئے کہ اب ہم جوان نہیں رہے۔ پیار و محبت کی باتیں تو صرف شادی کے شروع ایّام میں ہی زیب دیتی ہیں یہ بہت بڑی بھول ہے۔ پیار و محبت کی چاشنی ساری زندگی برقرار رکھنی چاہئے اس سے جو سرور ملتا ہے وہ انمول ہے۔ ورنہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ دو سچے رفیق کی بجائے آقا اور کنیز ہو کر رہ جائیں گے جن میں کبھی کبھار جسمی تعلق کے سوا پیار اور ہمدردی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ یہیں سے عورت کے دُکھ شروع ہوتے ہیں۔ آپ ایسا وقت ہرگز نہ آنے دیں، بلکہ دونوں ساتھی ایک دوسرے کے ہمراز ہو کر زندگی کی تلخیوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہوں۔ دراصل دونوں کے باہمی پیار اور ہمدردی ہی میں ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ●

شاباش

مدراس میں ایک جھونپڑے میں آگ لگ رہی تھی۔ یہ جھونپڑا آگ بجھانے والے کسی ملازم کا تھا جو خود کسی جگہ آگ بجھانے گیا ہوا تھا۔ اس کا ایک بچّہ جھونپڑی میں ہی رہ گیا تھا مگر جلتی ہوئی آگ میں کس کی ہمّت تھی کہ اندر جاکر بچّے کو نکال لاتا۔ آخر مدراس کارپوریشن کے میئر سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا۔ وہ دیوانہ وار جھونپڑے میں داخل ہو گئے اور آنِ واحد میں بچّے کو باہر نکال لائے۔

—— روزنامہ الجمیعت، دِلّی

(بھیجنے والے: خالد ملک، چاندپور)

★

ایسٹرن ریلوے پر چھپرہ کے نزدیک کھیرالہ چتری ریلوے سٹیشن کے درمیان ایک فش پلیٹ کھلی ہوئی تھی۔ ایک طالب علم نے یہ منظر دیکھا۔ ساتھ ہی اس نے ۲۳۸ ایکسپریس ڈاؤن کے انجن کا دھواں نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ اس نے فوراً اپنی قمیض اتاری اور اسے ہوا میں اڑاتا ہوا پٹری کے درمیان ٹرین کی طرف دوڑا۔ مسافروں نے اسے دیکھ کر زنجیر کھینچ لی اور ٹرین رک گئی۔

—— بمبئی کرائم، بمبئی

(بھیجنے والے: محمد اسلم، بمبئی)

★

جنگ پورہ کے سرکاری سکول میں ایک ایسے طالب علم نے امتحان دیا ہے جو اپنے پیروں سے قلم پکڑ کر لکھتا ہے۔ اس کے مضامین میں حساب اور ڈرائنگ جیسے سبجیکٹس بھی ہیں۔

—— روزنامہ نیا ئے (انصاف) اجمیر

(بھیجنے والے: عبدالعلیم، جے پور)

حیدرآباد کی آر ٹی سی بس میں ایک مسافر بیگ رہ گیا۔ کنڈکٹر نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں دس ہزار روپے موجود تھے۔ وہ فوراً بیگ لے کر ڈپو منیجر کے پاس گیا اور بیگ اسے سونپ دیا۔

—— روزنامہ ملاپ، دلّی

(بھیجنے والی: مسز ایچ ایس لال، سکندرآباد

★

گجرات کے موٹا سولکا گاؤں میں بچوّں اور بڑوں کی ایمانداری کے امتحان کے لئے وہاں پوسٹ آفس میں کچھ پوسٹ کارڈ رکھے گئے ہیں برابر میں ایک بکس ہے جس میں لوگ کارڈ لے کر پیسے ڈالتے ہیں۔

بچوّں کے امتحان کے لئے مقامی سکول ریفریشمنٹ روم میں مختلف قسم کے کھانے پلیٹوں میں سجادئے گئے ہیں۔ ہر پلیٹ کے ساتھ پرچی لگی ہوئی ہے۔ بچّے اپنی من پسند چیز کی قیمت وہیں رکھ دیتے ہیں۔

ان تجربوں کو تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اور اب تک کسی قسم کی بے ایمانی دھوکے بازی کی خبر نہیں ملی ہے۔

—— روزنامہ ہندوستان

(بھیجنے والے: احمد ...

اس فیچر کے لئے اخباروں کی کٹنگ شائع ہونے پر پانچ روپے کی رقم انعام میں دی جائیں گی۔

مقالہ ★ انیسہ

شوہر کا کام : [illegible]

ہنسی خوشی سے یا بادلِ ناخواستہ



آپ اپنے حلقۂ احباب میں کسی نہ کسی ایسی سہیلی سے ضرور واقف ہوں گی جس نے اپنے شوہر کو کوئی ایسا کام چھوڑنے کے لئے مجبور کیا ہو جو شوہر کے لئے تو ٹھیک تھا مگر اس سے وہ مطمئن نہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہ شوہر کوئی صحافی، اخبار نویس، موسیقار یا اداکار رہا ہو۔ بیوی کو اس کا اکثر دن رات خاص طور سے رات کو کام کرنا پسند نہ ہو۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان دنوں شوہر کو اپنا کام بہت دلچسپ لگتا ہو، ممکن ہے اب بیوی کی خواہش کے لئے جو کام شروع کیا گیا ہے وہ شوہر کے ذوق کے برعکس یا ناپسندیدہ ہونے کے علاوہ گھر کی آمدنی میں بھی تخفیف کا باعث بنا ہو۔ اس طرح جہاں پہلے صرف بیوی ناخوش تھی وہاں اب میاں بیوی دونوں ہی ناخوش ہیں ــ شوہر اپنے دل پسند کام اور خدمت سے محروم ہونے کے سبب اور بیوی اس کے لئے کم پیسے ملنے کے سبب۔

اس طرح کی تمام مصیبتوں کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ کتنی ہی بیویاں اپنے شوہر کے صحیح اور مناسب کام کی نوعیت ــ رات کا کام، دورے پر رہنا، گھر پر بھی کام وغیرہ ــ کے ساتھ نباہ نہیں کر پاتیں۔ ایسے مردوں کو، جن کے کام کی اس قسم کی نوعیت ہو، یقیناً بڑی سمجھدار اور خود کو حالات کے مطابق ڈھال سکنے والی بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے سب لوگوں کی بیویاں اگر فقط اپنی سہولت کے لئے ضد پر آمادہ ہو جائیں تو اکثر حالتوں میں جہاں شوہر کے لئے کام بدلنا ممکن نہ ہو، ان کی ازدواجی زندگی ہی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹری، صحافت، ریڈیو یا تھیئٹر سینما میں کام کرنے والے کتنے ہی کامیاب اور مشہور لوگوں کو صرف اس لئے اپنا کیریئر یا ازدواجی زندگی دونوں میں سے ایک کو قربان کر دینا پڑا کیونکہ ان کی بیویاں ان شعبوں میں ان کی کامیابی کی تمام شرطوں کو قبول کرنے کے لئے راضی نہیں تھیں۔

جن بیویوں کو اپنے شوہر کے کام کی نوعیت سے قدرے دقت محسوس ہوتی ہے ان کے لئے سب سے مفید مشورہ یہی ہے کہ آپ کے دونوں ہاتھوں میں لڈو نہیں ہو سکتے۔ اگر ان کو اپنے شوہر کی ترقی

اور کامیابی مطلوب ہے جس کا مطلب ہے خود ان کے اور خانداں کے لئے خوشحالی، تو انھیں حالات کا سیدھی طرح سامنا کرنا ہوگا انھیں یہ قبول کرنا ہوگا اور اپنی زندگی انہی حدود کے اندر خوشی گذارنی ہوگی۔ جو ان کے شوہر کے کام کا لازمی جزو بن چکی ہیں۔

اس معاملے میں یہ ایک عجیب اور دل چسپ بات ہے کہ ہمارے ملک میں اب بھی بہت سی نوجوان لڑکیاں ایسے مردوں سے بیاہ رچانے کے لئے بے قرار رہتی ہیں جو ترک بھڑک والی دنیا میں کچھ نام اور شہرت کے مالک ہیں۔ اس زمرے میں فلمی اداکار، موسیقار، مقبول شاعر وغیرہ آتے ہیں۔ لیکن ان نوجوان لڑکیوں میں سے شاید ہی کسی کے دماغ میں یہ بات آتی ہو کہ اس دنیا میں کسی کی بیوی بنے اور اس حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی چند نسوانی ضرورتوں اور سہولتوں کی کتنی قربانی دینی پڑتی ہے۔

لہٰذا اگر اس وقت بھی آپ کے شوہر کا کام ایسا ہے جس کے سبب آپ کو دشواری یا پریشانی ہوتی ہے تو آپ کو اپنے ذہنی سکون کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔

مگر درپیش صورتِ حال صرف عارضی ہے تو آپ اسے ہنسی خوشی برداشت کرلیں۔ تھوڑی دیر کے لئے تو پہاڑ بھی اٹھایا جا سکتا ہے

اگر صورتِ حال کم یا زیادہ مستقل ہے تو اسے قبول کرلیں اور شوہر کے غیر معمولی کام میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دیں۔ مثلاً اگر شوہر موسیقار یا اداکار ہے تو کبھی کبھار رات کے وقت اس کے ساتھ سٹوڈیو، تھیٹر یا دفتر اور پریس کا چکر لگالیں۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ بھی ہوگا اور طبیعت بھی بہلے گی۔

اپنے آپ کو ہمیشہ یاد دلاتی رہیں کہ آپ کے شوہر کی کامیابی آپ کی اپنی کامیابی ہے۔ جب پہلے شدہ ہے کہ وہ جو کام کرتے ہیں وہی ان کے لئے مناسب اور ٹھیک کام ہے اور اگر ان کو کامیاب ہونا ہے تو اسی کام میں ہو سکتے ہیں تو پھر آپ کا کام صرف یہ سمجھ جانا ہے کہ اس کام میں کامیابی کی شرطیں ہیں انھیں تسلیم کریں۔

اطلاع کے لئے یہاں یہ بتا دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ کسی بیوی کے لئے صرف اس وجہ سے اپنے خاوند کو چھوڑنا کہ اس کے کام یا کاروبار کی نوعیت اسے پسند نہیں، قانون کی نظر سے بھاگ جانا کہلاتا ہے۔ جس کی سزا مل سکتی ہے لیکن اس قانونی پہلو کے علاوہ جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے۔ ایسا کرنا ایک بے قصور شوہر سے بے وفائی کرنا ہے

یاد رکھیں کہ دنیا میں کوئی بھی حالت نہ کبھی پوری طرح کسی کی پسند کی رہی ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ہوگی۔ پھولوں کے ساتھ کچھ کانٹے بھی ضرور ہوتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں کچھ آرام اور سہولتیں ہوتی ہیں۔ جو لوگ صرف دولتوں کا ہی رونا روتے ہیں وہ سہولتوں اور آرام سے بھی مطمئن نہیں ہو سکتے

اب تو بات ایسے شوہروں کی جن کو کام گھر پر ہی کرنا پڑتا ہے۔ ان میں وکیل، سیاست داں، ادیب، دانشور وغیرہ آتے ہیں۔ کتنی ہی بیویوں کو شکایت رہتی ہے کہ دن یا رات کے دوران سات آٹھ گھنٹے کسی بھی سٹوڈیو یا دفتر میں گذارنے والے شوہر کے ساتھ تو پھر بھی نباہ ہو جاتا ہے لیکن اس شوہر کا کیا علاج جو سامنے رہتا دکھائی دیتا ہے مگر رات بھر بیٹھا گھنٹوں لکھتا رہتا ہے اور گھنٹوں کتابوں، کاغذوں اور کتابوں میں [illegible] الجھا رہتا ہے۔

ایسے شوہروں کے علاج کے لئے یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی بیویوں کی بہتری کے لئے نیچے کچھ طریقے دئے جارہے ہیں۔ جن پر چلنے سے ان کے شوہروں کا کام بھی ہلکا اور بہتر ہوگا اور ان کو بھی زیادہ سہولت رہے گی۔

شوہر کو ایک الگ کمرے (ایسے شوہروں کا ایک علیحدہ کمرہ ہونا ہی ہے) میں آرام سے بٹھادیں، ان کی متوقع ضرورتوں کی سب چیزیں (جیسے پانی وغیرہ) پاس رکھ دیں اور پھر انھیں بالکل بھول کر اپنے کام میں لگ جائیں۔ جب تک وہ خود ہی بلانے کی گھنٹی نہ بجائیں یا آواز نہ لگائیں تب تک یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کریں کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ ... کام ٹھیک طرح سے کرنے ... نہیں ... فکر رہتی، ایسا آدمی اپنے کام کے دوران ... میں بالکل نہیں سوچ ... ہوگا۔ کبھی ... کی مصروفیت میں دخل نہ دیں۔ کوئی ... کسی ... بلائے ملاقاتی کو ان ... نہ دیں، نہ کوئی غیر ضروری ٹیلیفون ... دیں، نہ کسی بچے کو ہی ان کے پاس ... مطلب یہ کہ آپ اس دوران یہ محسوس کریں گویا وہ گھر پر ہیں ہی نہیں۔ ہاں اگر مکان کو آگ ہی لگ جائے تو بات دوسری ہے۔

آپ خود پریشان نہ ہوں۔ ایسے مصروف آدمی کا کام جب ٹھیک سے نہ ہو رہا ہو تو وہ کافی پریشان ہو اٹھتا ہے اور کچھ جھنجھلاہٹ بھی ظاہر کرنے لگتا ہے ایسی حالت میں آپ خود تحمل و برداشت سے کام لیکر ان کی کافی مدد کرسکتی ہیں یہی آپ کا فرض بھی ہے۔

اپنے پروگرام کو شوہر کی سہولت کو مدِّ نظر رکھ کر بنائیں۔ اگر آپ کا مکان اتنا بڑا ہو کہ آپ کے شوہر مکان کے بڑے حصے سے بالکل الگ تھلگ ہوسکیں تو آپ اپنی سہیلیوں وغیرہ کو اس وقت تک نہ بلوائیں جب آپ کے شوہر مصروف ہوں۔

ان باتوں پر عمل پیرا ہو کر آپ یقیناً کامیاب ہوں گی ●



... چاہے کیسے ہی الزامات مجھ پر لگائیں میں وزارت کی ذمہ داری سے بھاگنے والا نہیں ہوں!!



دل

آج

جیسے انسان کے دل میں نفرت کے لئے کوئی

برجو ... علاقے میں ایک طرح کا اکیلا اور ... ظلم کے خلاف ... کرتے تھا ... اپنا ... بات کا ... سے ... بہت ... دیکھے ... کا مطلق اثر ... کا ... لا تقیر کی طرح وہ ... رہتا ہے اور جہاں ناانصافی دیکھتا ہے ... ہے۔

... زندگی میں بہت سی قربانیاں کی ہیں اور ... نہیں چاہا خدمت قوم کے ... کے ... لوگوں کے ... ابھی ... کے دونوں ... جب ... تو اس سے ... میں درد ... لگتا ہے۔ اس تکلیف کے لئے اس نے ... ڈاکٹر ... مشورہ ... میں

لیا اور نہ کبھی اُس کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ ... کا ... عادات میں اپنا نام دے کر خود کو عظیم خادم قوم کہے۔ ہاں اس میں ایک عادت ہے، ... کو وہ ... کوشش کے باوجود نہیں چھوڑ پاتا ہے۔ یہ عادت اس کی فطرت ثانیہ ہو گئی ہے۔

... ابھی اگر ... ظلم اور ناانصافی دیکھتا ہے تو اس کو ... آ جاتا ہے اور اس حالت ... اس کا ... بس چلتا تو ایک ... میں ... کے ... ٹھہرا ... لگے ... آدمی کو ... اور اس کے ... دیکھ ... وہ دانت کٹکٹاتا ہے۔

... وہ ... گویا ... طرف ...



گنگا پرشاد پانڈے

جگہ نہیں ہوگی۔

ہتا ہے سماج کی برائیوں کو دیکھ کر ان دلوں
کار کا اتنا مخالف ہو گیا ہے کہ اس کے
نے سہ کا۔ کی تعریف کر دیا ایک خطرہ مول
ہے اور اس حالت میں وہ بسا اوقات
گالیوں سے لے کر ہاتھا پائی تک اتر آتا ہے

ہ ا کے پور کے مگدھر چودھری کی چوپال
کی بات ہے۔ ایک دن علی الصبح کافی لوگ
ت ۔ کھیتی باڑی کا ذکر چل رہا تھا ناگہاں
تو ھلت وہاں آپہنچا۔ بات کیسی بھی چل رہی ہو
سا میں دخل اندازی کر دینا اس کا پیدائشی
ماست موضوع کچھ بھی ہو، وہ دخل ضرور دیتا ہے
اس طور پر منفرد دلیلیں بھی پیش کرتا ہے
۔ ۔ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ سیاست سے
ے بھی کوئی گندگی ہے۔ اس کے پیچھے ہے

قبل ہی کھیتی باڑی سے شروع ہوئی گفتگو سیاست
تک پہنچ گئی
"سنتے ہو، سنا ہے، دلّی میں کسی نے قسم
کھائی ہے"
"کیسی قسم؟" پرسو بھگت نے پوچھا۔
جواب دینے والے نے تو قدرے آہستگی
سے کہا مگر بھگت کو اس پر جوش آگیا۔
"ارے حا، حا، بڑا بھرشٹاچار مٹانے والا آیا
ہے۔ چاروں طرف سے تو لوٹ مچا رکھی ہے
جو جنتا کی رگ رگ میں سما گئی ہے جو آج
کے انسان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی ہے، اسی
کو مٹانے کی بات۔ اگر مہاتما گاندھی خود بھی
چل کر آ دیں تو بھی اس کھوری بامیں۔ ٹ سکت
پھر چودھری مگدھر کی طرف رخ کر کے بولا،
"ٹھیک ہے نہ چودھری! ہر کھوٹے میں ملا ہیں

بھی ہے ـــ منہ میں رام بغل میں چھری"

"ہاں، تم بھگت ٹھیک کہتے ہو"

چودھری جگدھر بھی ایک ہی دلچسپ آدمی تھا۔ وہ بھگت کی بات بڑے مزے سے سنتا۔

بھگت بھرشٹا چار کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنی کچہری کا تجربہ بیان کرنے لگا "بھیا چودھری، ایک دن کچہری گیا تو وہاں کا رویہ دیکھ کر میری تو آنکھیں نکل آئیں ایک غریب آدمی سے پیش کار بولا ـــ دس روپے پڑتی ہیں ـــ بے چارہ غریب آدمی کانپنے لگا۔ بولا ـــ مالک ہم بہت غریب ہیں۔ پیش کار بھی خرانٹ تھا [illegible] ـــ تو لو لو درگاہ [illegible] ہے اس [illegible] ہے۔ کچہری اہتیاں تو رویہ کا [illegible] سے [illegible] سے پھینکا [illegible] [illegible] آدمی [illegible] ظلم [illegible] خراب خانہ ہیں [illegible] آدمی [illegible] بولا ـــ یہ لو [illegible] ـــ وہ دیکھو اوپر کا بھی [illegible] وہاں کا اصول [illegible] پانچ دیو ـــ یہ پنچ [illegible]

[illegible] بے چارا [illegible] اس کا منہ دیکھتا رہا [illegible] بولا ـــ [illegible] وہاں [illegible] لینے ہی والا تھا کہ پیش کار [illegible] بولا ـــ روپیہ ایک دم نکالو۔ بات [illegible]

بے چارے کی جیب میں کل پانچ ہی روپے تھے جو انصاف بیچنے والوں نے چھین لئے کچہری سے نکلنے کے بعد اُس کے پاس سودا خریدنے تک کو پیسے نہیں بچے تھے۔ اب تاؤ بھلا یہ کاروبار بھرشٹا چار مٹائے گی"

لوگ چودھری کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہے تھے کہ گاؤں میں واویلا مچ گیا ـــ

"بچاؤ، بچاؤ، قصائی ہمیں مارے ڈال رہا ہے دوڑو بھائی دوڑو"

بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ لوگ اسی طرف دوڑ پڑے۔ وہاں پہنچنے پر دیکھا کہ جگدین کرمی کا لڑکا مگت لہولہان پڑا ہے۔ جگدین ماتھے پر ہاتھ رکھے زار و قطار رو رہا ہے۔ بڑھیا چلا رہی ہے گاؤں کے سرپنچ کی شہ پاکر رنگناتھ، دودھ ناتھ وغیرہ لاٹھیاں لئے اس لڑکے کو مار ڈالنے پر آمادہ ہیں۔ ان کا ظلم دیکھ کر لوگوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ [illegible] دیکھ [illegible] رہا تھا کہ کمزور اور [illegible] ہونا کتنی بڑی بدنصیبی ہے۔ آٹھ دس آدمیوں کو صرف دو آدمی للکار رہے تھے۔

[illegible] سب دیکھ کر [illegible] ـــ [illegible] نے آنے والوں کو للکارا "خبردار [illegible] کا دودھ پیا ہے تو آؤ۔ [illegible] ـــ [illegible] انسان کی زندگی ظلم کے خلاف [illegible] اور [illegible] بھی لڑوں گا"

[illegible] کی دہاڑ سن کر دونوں دور ہی [illegible] اس گئے۔ [illegible] پاس ہی سے بانس کا ڈنڈا اٹھا لیا اس وقت اس [illegible] ہاتھوں میں پتہ نہیں کہاں سے آ [illegible] تھی۔ وہ لوگوں کو للکار رہے تھے [illegible] بزدل ہو تم لوگ۔ [illegible] تو [illegible] گھاگرے پہن کر گھر میں کیوں نہیں [illegible] لوگ! ناانصافی، ظلم کے آگے چھاتی تان [illegible] کھڑا نہ ہو سکے۔ اسے چلو بھر پانی میں [illegible] مرنا چاہئے۔ تم سب ان شیطانوں [illegible] کی ڈھول بننے کے لئے نہیں پیدا [illegible] تھے بلکہ تم سب کے کرموں کا [illegible] شیطان انھیں للکاریں، تمہارے [illegible] ڈالیں اور تم کھڑے [illegible]

بھی کیا مرد ہونا ہی تو بجڑہ ہو جاتا ہے۔"

اس کے خوف ناک تیور دیکھ وہ دونوں سرپنچ کی چوپال میں واپس چلے گئے۔ اس کے بعد بھگت نے جگدین سے پوچھا "آخر کیا ہوا جگئی؟"

جگدین نے بتایا "بات کچھ نہیں تھی۔ دادا سرپنچ کے کرب کے کھیت میں میری بچھیا گھس گئی تھی۔ اسی پر سرپنچ بابو کے لڑکے نے میرے لڑکے کو تابڑ توڑ مارنا شروع کر دیا۔ اگر میں نہ آتا تو یہ ظالم تو اس کو جان سے ہی مار ڈالتے۔ دراصل بات یہ ہے کہ سرپنچ نے زبردستی بیگھہ بھر کا چک میرے دروازے پر لیا ہے اور وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ دروازے کی آمد و رفت بند ہو جائے۔ کبھی نہ کبھی انہیں مجھ کو پریشان کرنے کا موقع ملے گا ہی۔

قانوناً تو وہ مجھ کو ہی ملنا چاہئے تھا۔ اور بات کی سرپنچ صاحب سے چلتی تھی۔ ابھی ... نے زبردستی چک اپنے نام کرا لیا۔ آخر کسانوں کے ڈھور ڈنگر ہوتے ہی ہیں ... بھول سے کسی کے کھیت میں چلے ... تو اتنا بڑا ظلم تو ہوا میں نعرہ بادہ

سے زیادہ اپنے کرب کا ہرجانہ لے سکتے۔ جانور تو جانور ہی ہیں — یہ میں نے آج اپنی آنکھ سے دیکھ لیا بھگت۔ کوئی بھی اس کے انصاف میں نہ آیا۔ گاؤں کا سرپنچ ہے۔ نیائے بانٹنے والا ٹھہرا۔ گاندھی بابا کا چیلا سا پھرتا ہے۔ گاڑھا پہنتا ہے اور رام ٹھپا کا لگاتا ہے آخر کسی غریب کو ستانے سے کیا ملے گا؟"

اس کے بعد جگدین نے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا "بھیو یہ سہن نہیں ہو گا کہ دس بیگھے کھیت کے پیچھے ہمارے بیٹوں کا خون بہے۔ ہمارا کہنا اگر اچھا لگے تو تم پنچ نیائے کرو۔ نہیں تو سرپنچ صاحب کے نام کنواں تالاب لے لوں گا۔ اس کے علاوہ ایک کسان کے پاس چارہ ہی کیا ہو سکتا ہے!"

... مولادی بھگت بیٹھ کر اندر ہی اندر سلگنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور اس نے ... گاندھی جی کی تصویر ناپنے لگی۔ ان کے ... راج کا خاکہ ... اور رنگین سائز ... کو لوٹتی جا رہی ... گاندھی جی کے ...

اُرد کی دال کے بڑے

ڈیڑھ پاؤ اُرد کی دال بھگو دیں۔ پھر چھلکا اُتار کر باریک پیس لیں۔ اب اسے ہتھیلی سے ایک برتن میں پھینٹ لیں۔ پھینٹے جانے کی پہچان یہ ہے کہ جب اسے پانی میں ڈالا جائے گا تو دال اوپر تیرے گی۔ اس میں تھوڑا تھوڑا ہرا دھنیا، ہری مرچ، ادرک کتر کر ملا دیں۔ پیاز لہسن کھاتی ہوں تو ایک پیاز اور تین چار جوا لہسن بھی پیس کر اس میں ملالیں۔ آٹھ دس کالی مرچ، نمک اور تھوڑی لال مرچ بھی اس مرکب میں ملا دیں۔

کڑھائی میں گھی یا تیل چڑھا کر گول بڑے بنا کر تل لیں۔ ہتھیلی پر ہی پھیلا کر بڑے بنا سکتی ہیں۔ چاہیں تو چکلے پر ایک مہین کپڑا پانی میں بھگو کر اس پر چھوٹی چھوٹی لوئیاں رکھ کر ہاتھ سے گول پھیلا کر بڑے بنالیں اور کپڑے کے سہارے ہاتھ پر اُٹھا کر کڑھائی میں سُرخ کر کڑے کر لیں۔

ہوتے تو اپنی آنکھوں اپنے رام راج کا حشر دیکھ ہی لیتے۔ انہیں بھی پتہ چل جاتا کہ کیسے مٹی چرانے والے چور کو موت کی سزا دے دی جاتی ہے اور قاتلوں کو پوجا جاتا ہے۔"——

اس کے بعد یکایک اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں جیسے ان میں خون اتر آیا ہو۔ وہ زور زور سے کہنے لگا "اور تم سب ہیجڑوں کی طرح دیکھتے رہو رام نام کی مالا جپو۔ ایسے ہوتے تو اتنا کیوں گھبراتے۔ سوچا ہو گا۔ کوں اپنے لڑکے کو چوٹ لگی ہے [illegible] نہ جانے تم لوگوں کی آنکھیں کب کھلیں گی اور کب تک تمہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جائے گا۔۔

پھر وہ جگدین کی طرف بڑھا "تمہارے منہ پر [illegible] نے کیا جگدین۔ جو اس سرپنچ کے بیٹے نے ہاتھ تک [illegible] ایسی مردانگی [illegible] آج اسے [illegible] اور [illegible] ایسے ہی مریں گے۔

اسی وقت پتہ لگانے کی غرض سے کانگریس کمیٹی کا ایک جلوس نکل آیا۔ جھنکو ساہ نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر جا کر اس نے سرپنچ کے کان بھرے۔

لوگ بات کو دبا دینا چاہتے تھے کہ جو ہوا سو ہو گیا۔ برجو بھگت کو بھی سمجھا بجھا کر خاموش کر دیا گیا تھا لیکن اچانک شام کو گاؤں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سرپنچ کے دروازے پر تھانے دار صاحب، چھوٹے منشی اور چار سپاہی بیٹھے ہوئے تھے تھوڑی ہی دیر میں گاؤں میں شور مچ گیا۔

جگدین ہانپتا ہوا برجو بھگت کے پاس پہنچا اور بولا "او بھگت اب کیا ہو گا؟"

"کیوں، کیا ہوا؟" بھگت نے اطمینان

سے پوچھا "کیا دکھ تکلیف ہے تمہیں؟"

"تھانے دار صاحب آئے ہیں" وہ روتا ہوا بولا۔

"تو کون سی توپ چھوٹ گئی جو مہریا کی طرح رونے لگے!" بھگت نے گرج کر کہا "جاؤ کھاؤ پیو اور کوئی دوارے آئے تو کہہ دو کہ کھا پی کر ہم سب لوگ خود آئیں گے۔ کوئی چوری ڈاکہ تو ڈالا نہیں ہے۔"

"مگر بھیا، ان سپاہیوں کو کیا سمجھاؤں"

"تمہارا مسئلہ ہے کیا؟ دو میں سے ایک فیصلہ کر لو۔ یا تو زور ظلم کے خلاف لڑو اور نہیں تو مار کھاتے رہو۔ بہت آرام چاہتے ہو تو گھر میں جو دو چار زیورات ہوں، انہیں بیچ کر تھانے دار صاحب کی پوجا کرو۔" کہتے کہتے بھگت اٹھ کھڑا ہوا۔

گاؤں والوں میں اس بار بڑا جوش آ گیا تھا۔ یہ سب برجو بھگت کی وجہ سے ہوا تھا۔

تھانیدار بڑھیا پلنگ پر لیٹا تھا۔ ساتھ میں آئے ہوئے چاروں سپاہی دور بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ تھانے دار نے کڑک کر پوچھا "جگنی کون ہے؟"

"جی حضور!" جگدین سامنے آ گیا۔

"کیوں بے سالے بڑی مردانگی آ گئی ہے!"

"مالک!"

"کیا بکتا ہے حرام زادے کمینے، سؤر کے بچے آخر تجھے سرپنچ صاحب سے چودھراہٹ کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"حضور [illegible] تو چودھری ہیں"

"پھر جھوٹ بکا۔ الّو کے دیدے" تھانے دار کی آنکھیں چڑھنے لگیں۔

اب برجو بھگت سے نہیں رہا گیا۔ سا

آکر بولا "حضور، آپ اسی بات کی تحقیقات کیجئے، گالی دینے کا تو کوئی قانون نہیں ہے"

تھانے دار جیں بہ جبیں ہو اگر آنکھیں دکھا کر بولا "معلوم ہوتا ہے یہی ان سالوں کا سردار ہے بڑا آیا قانون بتانے والا"

"جی حضور، دس سال سے کسی کی گاؤں میں زبان نہیں کھلتی تھی، لیکن اسی نے لوگوں کو بھڑکا کر سر چڑھا دیا ہے،" سرپنچ نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔

"مگر حضور، آپ کا کام یہ تو نہیں۔ آپ تو جنتا کی سکھ شانتی کے لئے ہیں۔ حضور، میرا کوئی قصور نہیں،" جگدین ہاتھ جوڑ کر بولا۔

اس وقت تھانے دار کا غصے میں برا حال تھا مگر سرجو کو اس کی مطلق پرواہ نہیں تھی۔ فوراً بولا "کس کی بات کرتا ہے ٹھگی، سکھ شانتی لانے والا ۱۹۴۸ میں ہی مرگیا۔ جس دن سکھ شانتی آئے گی یاں کون کھلانے گا..."

تھانے دار تلملا اٹھا۔ سبھی سپاہی ایک ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک سپاہی نے ملا کر تھانے دار بولا "کاٹ دیں، یہ دیکھتا ہے۔ سالا بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے لگا ہے چار بھر، پھر اپنے آپ عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

تھانے دار آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کی ایسی توہین اب تک کسی نے نہ کی تھی۔

"ہاں ہاں کاٹ دیں، آگے آؤ، مار ڈالو اس بوڑھے کو، حضور کی ترقی ہو جائے گی، انعام ملے گا اور سرپنچ کے ماتھے پر کانگریس ٹکٹ بندھ جائے گا۔ سب کا انت ہوگا تھانے دار، پر کسانوں اور مزدوروں کے دکھوں کا انت کبھی نہیں ہوگا۔ انگریز تھے زور ظلم کرتے تھے تب بھی یہ آگے بڑھ کر پیٹھ پر بینتیں کھاتے تھے اور اب بھی کھا رہے ہیں شاید اسی دن کے لئے گاندھی بابا کا ساتھ دیا تھا، ہڈی پسلی تڑوائی تھی نیائے دھرم تو دنیا سے اٹھ گیا ہے نا! نہیں تو آج اس کے لڑکے کی پٹائی کرانے والے سرپنچ کے دروازے پر آپ پان نہ چباتے۔ سرپنچ کے پاس اگر پیسے کا زور نہ ہوتا تو تم ان کے پاس پھٹکتے بھی نہیں۔ کوئی ہزار کوس نہیں وہ جگہ، جہاں واردات ہوئی ہے۔ کیوں ہوئی، کیسے ہوئی، موقع کی تحقیقات کر کے دیکھتے تو سہی۔ پھر جو کچھ پھانسی سمجھتے دیتے مگر یہاں تو کنویں میں بھانگ پڑی ہے۔

تھانے دار معاملہ سوچ چکا تھا۔ اس نے حالات کا رخ دیکھ لیا اس لئے کافی نرم پڑ گیا لوگوں کی کانا پھوسی سے اسے پتہ چل گیا کہ آگے بات بڑھانا ٹھیک نہیں۔ وہ فوراً سرجو بھگت کو ایک طرف لے جاکر نرمی سے بولا "دادا، تم تو ناراض ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو طرح طرح کے آدمیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ٹیڑھا نہ ہوں تو کیسے کام چلے! تم تو ناحق ناراض ہو گئے۔"

سرجو تھانے دار کی بات سنتا رہا۔ تھانے دار پھر بولا "دیکھو بابا میرا کوئی قصور نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بے چارا بے قصور ہے۔ زیادتی سرپنچ نے ہی کی ہے مگر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ان سے دشمنی مول لے کر میں ایک دن بھی یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ سرکار نے لین دین کا ایسا جال بچھا رکھا ہے کہ اگر پھونک پھونک کر قدم نہ رکھیں تو نہ جانے پاؤں کہاں پھنس جائے۔" اس کے بعد چاروں طرف

دیکھ کر بولا "تم خود ہی سوچو، دو لیں تو اس ڈیڑھ سو روپلی میں اپنا کیا بنتا ہے! سو روپیہ مہینہ تو صرف سالی وہ جڈن بائی لیتی ہے۔"

برجو بھگت یہ سب سن کر اندر ہی اندر جل بھن رہا تھا اور جب نہ سن سکا تو بولا "پھر ایسا کرم ہی کیوں کرتے ہو؟"

"کروں نہ تو جاؤں کہاں، بابا! یہ آدم خور افسر، نیتاؤں کے چیلے بنے رہنے کہاں رہنے دیتے ہیں! قتل کرنے والوں کو پکڑتے ہیں تو کسی نیتا کی رشوت آتی ہے۔ ڈاکو کو گرفتار کریں ایم ایل اے صاحب ڈالی بھیجتے ہیں۔ پھر تم سوچو، ہم کیا کر سکتے ہیں! نہ کریں تو کل کو ٹکے ٹکے کو محتاج ہو جائیں۔ آپ تو خود سمجھ دار ہیں سوچ سکتے ہیں ہم لوگوں کی کوئی کھیتی باڑی تو ہے نہیں۔ گاؤں گاؤں میں شانتی ہی ہو جائے تو ہم لوگ پھر کہاں جائیں! جگدین سے کہہ دو پچاس کا انتظام کر دے، سب رفع دفع کر دیں گے۔ زیادہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

یہ سن کر تو برجو کے بدن میں جیسے آگ ہی لگ گئی "کیا کہا تم نے، جگدین پچاس روپے دے تو تم رفع دفع کر دو گے اور نہیں تو؟"

"ارے دھیرے، دھیرے بولو نا بابا!"

"اب بھی دھیرے دھیرے کہوں، اچھا ہو مگئی کو کڑھاؤ میں بھون ڈالو اور اس کے ماس کو ڈکار لو۔ اچھا نیائے ہے تمہارا۔"

"اچھا بابا، نہ دو تو چپ تو رہو۔"

تھانے دار پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور بولا "سب جاؤ مگر دھیان رکھو گاؤں میں پھر کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے نہیں تو خیر نہیں۔"

سب لوگ چلے گئے۔ تھانے دار رات بھر سرپنچ کے گھر رہا۔ سویرے سرپنچ نے اس کے لئے تالاب سے مچھلیاں منگوائیں تب جا کر وہ روانہ ہوا۔ اس کے جانے کے بعد گاؤں میں کئی وارداتیں ہوئیں۔ بڑکو کے بیل کھول لئے گئے، جھنکو کی حویلی پھونک دی گئی جگدین کی بھینس غائب ہو گئی اور چودہری کے اوپر گاؤں سماج نے مقدمہ چلا دیا۔

برجو بھگت اس دن بہت خاموش تھا ایک دم فقیروں کی طرح کہنے لگا "میں آنے والے کل کا سپنا دیکھ رہا ہوں، چودہری، جب انسان جاگ اٹھے گا۔ بہت دن کا سویا پڑا جوالا مکھی دھڑک اٹھے گا۔"

"وہ دن ابھی نہیں آئے گا بھگت" چودہری نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"پرا سے آنا ہی چاہئے، چودہری۔ اور اگر نہ آیا تو سمجھو لاکھوں کروڑوں کا شہید ہونا بیکار گیا۔ میں اس آکاش کی طرف دیکھ رہا ہوں جو ظالموں کی اندھیر نگری پر بجلیاں گرانے کے لئے چمک رہا ہے" کہتا ہوا برجو ایک طرف کو نکل گیا اور چودہری آسمان کی طرف دیکھتا رہا جہاں زمین کے بے بس انسانوں کی آوازوں کا شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔

غم سے مفر کہاں

ذوقِ لطیف و چشمِ حقیقت نگر کہاں — حسنِ ازل تو عام ہے، حسنِ نظر کہاں
تیرے حضور وسعتِ قلب و نظر کہاں — جو تجھ میں کھو گیا اسے اپنی خبر کہاں
غم روحِ زندگی ہے تو غم سے مفر کہاں — جائے گا زندگی سے کوئی روٹھ کر کہاں
ہے مصلحت گذار نہ عالم شباب کا — اے وقتِ ناشناس! یہ دن عمر بھر کہاں

— شکیل بدایونی



مقالہ

دانت

صاف کیجئے اور اپنی شخصیت کو پُرکشش بنائیے

ڈاکٹر کیول دھیر

تندرست رہنے کے لئے علاج کی بہ نسبت پرہیز زیادہ بہتر ہے۔

یہ کہاوت سَو فی صدی صحیح ہے۔ صحت مند رہنے کی تمنّا اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک صحت کے اصولوں پر مناسب طور سے عمل نہیں کیا جاتا۔ اصولوں کی پابندی نہ کرنا ہی بیماریوں کو دعوت دینا ہے۔

اگرچہ یہ بات عام جسمانی صحت کو قائم رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے، مگر دانتوں کی حفاظت کے لئے اس کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی مریض جب اپنی کسی بیماری کے سلسلے میں ڈاکٹر سے مشورہ لیتا ہے تو ڈاکٹر اس کا جسمانی معائنہ کرتے وقت دانتوں پر خاص طور سے توجّہ دیتا ہے۔ یہی نہیں، مریض سے وہ دانتوں کے بارے میں کئی قسم

کے سوال بھی پوچھتا ہے۔ لیکن مریض کے لئے یہ عجیب بات ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اسے شکایت تو جوڑوں کے درد کی ہے، معدے کی ہے۔ اس کے مرض کا تعلق دانتوں سے نہیں ہے۔ پھر اس نے دانتوں کے بارے میں کیوں پوچھا۔

لیکن جب ڈاکٹر ایسی صلاح دیتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں سنجیدہ ہوتا ہے یہ درست ہے کہ کتنے ہی ایسے امراض ہوتے ہیں، جن کا بظاہر تعلق دانتوں سے نہیں ہوتا مگر حقیقت میں وہ دانتوں ہی کی کسی نہ کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر دانتوں کو صاف اور ٹھیک رکھا جائے تو کئی دوسری بیماریوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی موتیوں جیسے چمکتے دانتوں کی دلکشی کے ذریعے اپنی شخصیت کو بھی پرکشش بنایا جا سکتا ہے۔

اگر جسم کو ایک مکان کہا جائے تو منہ کو اس میں داخل ہونے کا دروازہ کہا جائے گا۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے جن ضروری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب ہم منہ کے ہی راستے جسم میں پہنچاتے ہیں ان سب کا ہضم ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے اور قوتِ ہاضمہ کا یہ عمل اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب کوئی بھی چیز ہم نگلتے ہیں۔ غذا کو ہاضمے کے قابل بنانے میں دانتوں کی خاص اہمیت ہے۔ دانت غذا کو نہ صرف باریک پیستے ہیں بلکہ چبانے وقت منہ کی رگوں کا ایک خاص رس سلائیوا بھی ساتھ مل جاتا ہے اور اس سے ہاضمہ کا عمل آسان ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ کہ ہاضمہ کے عمل کا آغاز منہ اور دانتوں سے ہی ہو جاتا ہے، لہٰذا ہم ان کی صفائی اور مضبوطی کا جتنا زیادہ خیال رکھیں گے اتنا ہی زیادہ فائدہ معدے کو ہاضمے کے معاملے میں پہنچے گا۔

اس کے برعکس اگر ہم اپنے منہ اور اپنے دانتوں کی صفائی وغیرہ کے بارے میں لاپرواہ رہتے ہیں تو قدرتی بات ہی ہے کہ دانت مضبوط نہیں ہوں گے منہ کی صفائی نہیں ہوگی تو آگے چل کر یہی سب باتیں دانتوں کی مختلف امراض (پائیوریا، پیپ وغیرہ) کو پیدا کرنے کا باعث ہوں گی اور اس طرح جس غذا کو استعمال کیا جائے گا، اس کے ساتھ ہم یہی گندگی، بدبو، پیپ وغیرہ معدے میں پہنچائیں گے۔ اس سب کا جو نتیجہ ہوگا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ خراب غذا معدے میں جا کر ٹھیک طرح سے ہضم نہیں ہوگی اور بدہضمی کے ساتھ ساتھ کئی دیگر شکایتیں پیدا کر دے گی اور آخر میں معدہ اپنا کام کرنا بند کر دے گا

ایسے لوگ جو دانتوں کا کام آنتوں سے لیتے ہیں، ان کا معدہ عموماً خراب ہی رہتا ہے — اور جب معدہ خراب ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ تندرستی بھی بگڑنے لگتی ہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ دانتوں، مسوڑوں، وغیرہ کی صفائی اور مضبوطی پر پوری توجہ دی جائے۔

قدرت کا یہ عجیب دستور ہے کہ جب بچہ اپنی ماں کے بطن میں ہی ہوتا ہے تو اس کے مسوڑوں کے نیچے، جبڑوں کی سطح پر دانتوں کے نشان بننے شروع ہو جاتے ہیں اور پیدائش کے وقت تک یہ نشان اور واضح ہو جاتے ہیں۔ بچہ جب بڑا ہونے لگتا ہے تو پہلے اس کے عارضی دانت نکلتے ہیں اور پھر مستقل دانت بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اگرچہ اس کے دانت نہیں نکلتے، لیکن اسی وقت سے خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہر ایک ماں کو چاہئے کہ وہ بچے کو کوئی بھی دوسرا دودھ پلانے کی بجائے اپنا دودھ پلائے کیوں کہ اس سے بچے کو خاص فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک تو بچہ جب پستان چوستا ہے تو اس سے اس کے مسوڑوں وغیرہ کو کام کرنا پڑتا ہے اور ان کی کسرت ہو جاتی ہے

دوسرے پستان چوسنے سے بچے کے منہ کی رگیں زیادہ سیال (سلائیوا) چھوڑتی ہیں اور اپنے آپ ہی منہ کی صفائی ہو جاتی ہے۔ اس سب کے علاوہ ماں کے دودھ میں وہ سب ہی ضروری اجزاء کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں، جن کے ذریعے بچے کی جسمانی نشوونما ہوتی ہے۔

جب بچے کے دانت نکلنے شروع ہوں تو

کو چاہئے کہ وہ دن میں کم سے کم دو بار اس کے دانت صاف کرے۔ دانت صاف کرنے کے لئے صاف جراثیم کش روئی یا ململ کا نرم ٹکڑا انگلی پر لپیٹیں اور اسے پانچ فی صد نمک یا بورک ایسڈ کے لوشن میں بھگو کر بچے کے دانتوں اور مسوڑوں پر دھیرے دھیرے پھیریں۔ اس طریقے سے اس وقت تک دانت صاف کرنے چاہئیں جب تک بچے کے سارے دانت نہ نکل آئیں۔

جب دانت نکل آئیں تو بچے کو ایسی مختلف چیزیں (سیب وغیرہ) بھی دینا شروع کریں، جن کو وہ چبا سکے۔ اس سے دانتوں کی ورزش ہوگی۔

اگر کوئی دانت مشکل سے نکل رہا ہو اور اس جگہ پر سوزش وغیرہ آ جائے تو دانتوں کے ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔ وہ اس جگہ پر ایک معمولی سا چیرا دے کر دوائی لگا دے گا۔

جب بچے کے عارضی یعنی دودھ کے دانت نکل آئیں تو اسے صحیح طریقے سے بتائیں کہ ہر روز داتون کرنی چاہئے۔ کسی کھانے کی چیز کے استعمال کے بعد دانتوں کو انگلی کے ذریعے صاف کرنا چاہئے اور ساتھ ہی اسے دانت صاف کرنے کے طریقے بھی سکھائے جانے چاہئیں۔ بچپن میں ہی اگر بچہ دانتوں کی صفائی کے بارے میں سب ہی باتیں سمجھ اور سیکھ لیتا ہے تو بڑا ہو کر وہ اسے



"کل چھٹی ہے نا! اسی لئے کوئی بھی آدمی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔"

عادت بنالے گا، ورنہ وہ اس جانب توجہ نہیں دے سکے گا۔ اگر بچے کے دودھیا (عارضی) دانت مضبوط اور توانا ہیں تو ان کی جگہ پر پیدا ہونے والے مستقل دانت بھی مضبوط اور صحت مند ہوں گے۔ ●

بچے کی عمر کے مطابق اسے ایسی غذا دیں جس کو وہ چبا سکے، کیوں کہ اس سے دانتوں کی ورزش ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایسی سخت بھی نہ ہو کہ اُسے چبانے کی کوشش میں اس کے دانت کمزور ہو جائیں۔

جب ہم کسی غذا کا استعمال کرتے ہیں تو اس کے بہت باریک ٹکڑے دانتوں کے ارد گرد جم جاتے ہیں۔ اگر دانتوں کی ٹھیک طرح سے صفائی نہیں کی جائے تو یہی ٹکڑے گلنے سڑنے لگتے ہیں۔ اس حالت میں مرض کے جراثیم کو پیدا ہونے کا ایک اچھا موقع ہاتھ لگ جاتا ہے اور دہاں تیزابی عناصر پیدا ہو جاتے ہیں یہ تیزابی عناصر دانتوں کے اینمل (مسوڑوں سے اوپر نکلے دانت پر چمک دار سفید پالش) کو برباد کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ جب اینمل برباد ہو جاتا ہے تو اس کے نیچے ڈینٹین کے حصے پر جراثیم حملہ کر دیتے ہیں اور یہ انتہائی سخت حصہ بھی نرم پڑ جاتا ہے۔

سرد، گرم اور درد وغیرہ کا احساس بھی ڈینٹین کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ جراثیم دیگر قسم کے احساس کو ختم کر کے شدت کی تکلیف پیدا کرتے ہیں۔

جب یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو ڈینٹین کے نیچے پائی جانے والی پلپ پر اثر پڑتا ہے پلپ دانت کا جان دار گوشت کا حصہ ہوتا ہے اور اس میں سے ہو کر خون کی نسیں منہ میں چاروں طرف پھیلتی ہیں اور دماغ تک بھی پہنچتی ہیں۔ اس حصہ پر اثر ہونے سے سارے جبڑے، منہ اور سر میں بھی شدید درد ہوتا ہے، مسوڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے خون بہنے لگتا ہے اور اسی قسم کے دیگر امراض بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ مرض کے جراثیم پلپ کے ذریعے سانس کی نالیوں سے ہو کر پھیپھڑوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے تپ دق تک ہونے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔

اس سب کے علاوہ مرض کے جراثیم اور منہ کی گندگی معدے میں پہنچ کر بھی کئی طرح کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان کے جسم کی صحت کے ساتھ دانتوں کا کیا تعلق ہے اور دانتوں کی صفائی کیوں لازمی ہے!

دانتوں کی صفائی اور مضبوطی کے لئے انھیں ہر روز صبح سو کر اُٹھنے کے بعد اور رات کو بستر پر جانے سے پہلے صاف کریں۔ اس مقصد کے لئے ٹوتھ برش، داتون، منجن وغیرہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دن میں جب بھی کوئی کھانے کی چیز استعمال کریں، اس کے بعد منہ کو پانی سے اچھی طرح صاف کریں اور دانتوں کو اُنگلی کے ذریعے صاف کریں۔ اگر کسی گرم چیز کا استعمال کیا گیا ہو تو گرم پانی استعمال کریں اور اس کے برعکس تازہ پانی سے دانتوں کو گرم سرد نہ ہونے دیں۔

وقتاً فوقتاً اپنے اور بچوں کے دانتوں کا معائنہ کسی تجربہ کار دندان ساز سے کراتے رہنا چاہئے۔

بازار میں مختلف قسموں کے ٹوتھ برش ملتے ہیں جب اپنے لئے آپ برش خریدیں تو دیکھ لیں کہ یہ آپ کے دانتوں کی ساخت سے ملتا جلتا ہو چھوٹے بچوں کے لئے نرم اور بڑوں کے لئے میڈیم برش مفید ہوتا ہے۔ برش کو ہر روز گرم پانی میں جراثیم کش لوشن ملا کر صاف کرنا چاہئے اور استعمال کے بعد احتیاط سے اس کو برش کیس میں رکھ دینا چاہئے۔ کسی دوسرے شخص کا برش کبھی استعمال میں نہ لانا چاہئے۔ دانتوں پر برش کرتے وقت ہمیشہ اسے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی سمت پھیرنا چاہئے۔ برش کا استعمال دھیرے دھیرے کرنا چاہئے تاکہ مسوڑوں پر رگڑ نہ لگے

تازہ داتون کا استعمال سب سے اچھا مانا گیا ہے کیوں کہ یہ نہ صرف جراثیم سے عاری ہوتی ہے بلکہ ا



خراب مانگا...

میں نے کب دردِ محبت کا مداوا مانگا
درد مانگا ہے ابھی اور زیادہ مانگا
مانگنے والوں نے مانگی ہے جہاں کی دولت
میں نے تجھ سے تو فقط پیار کا صدقہ مانگا

زندگی سے جو کبھی مانگی ہے میں نے کچھ شے
نام پر تیرے محبت کا سلیقہ مانگا
جان کر تجھ کو سخی میرے سوا کبھی مجھ سے
مانگنے والوں نے حال اپنا سنایا مانگا

مانگنا یوں تو برا لگتا تھا تجھ سے لیکن
تو نے جب اپنا کہا ہے تو جو چاہا مانگا
دل اکیلا تو اس کے وحشت مانگی
سر میں اس ذہن رسا کیلئے سودا مانگا

مانگنے کی نہیں عادت پہ کسی کی خاطر
تجھ سے اے دل مرے، جینے کا سہارا مانگا
مانگنا جس سے تھا اس سے تو نہ مانگا تھا
غیر سے مانگ کے خود اپنا خرابہ مانگا

— رحمان جامی

میں جراثیم کو ختم کرنے کی قوت بھی ہوتی ہے۔ کیکر، نیم، مولسری اور تیج پھل کی داتون اچھی سمجھی جاتی ہے۔ داتون کے استعمال سے منہ اور دانتوں کی صفائی تو ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی ان کی ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ داتون کو پہلے دانتوں سے خوب چبا لینا چاہیئے۔

جب چبایا جانے والا حصہ نرم برش جیسا بن جائے تو اسے دانتوں پر آہستہ آہستہ پھیریں۔ کئی لوگ گھنٹوں داتون کرتے رہتے ہیں لیکن یہ عادت بھی ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ اس سے ایک تو دانتوں کا اینیمل خراب ہو سکتا ہے اور دوسرے مسوڑوں پر زیادہ رگڑ لگنے سے وہاں زخم بھی ہو سکتے ہیں۔

دانت صاف کرنے کے لئے منجن کا استعمال بھی کیا جاتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس میں چاک پاؤڈر نہ ہو اور نہ ہی یہ موٹا ہو۔ ایسا ہونے پر اس کے ذرے دانتوں کے ارد گرد یا دانتوں کے درمیان پھنسے رہ جاتے ہیں اور ان سے بھی دانتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ●



(بقیہ پر دیکھیں صفحہ ۶۵)

اُسے پردے کے سامنے ایک دھند دکھائی دیا۔

"کیسی انگلیاں؟" اس نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں ڈاکٹر روشن ہوں، مسٹر جیون۔ آپ بہت اونچائی سے گر پڑے تھے اس سے ہڈی کی ایک کرچ آپ کے دماغ میں پیوست ہو گئی تھی۔ اسے نکالنے کے لئے مجھے آپریشن کرنا پڑا۔"

"آپ نے شاید کوئی غلط نس کاٹ دی ہے۔ دیکھئے میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے" جیون نے کہا۔

ڈاکٹر نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا "آنکھوں میں تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی تاہم میں جانچ کئے لیتا ہوں۔"

"تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے ڈیئر" پاروتی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ اسے خود اپنی بات پر ہی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگا۔

"ہاں، سناجی، آپ ضرور ٹھیک ہو جائیں گے" انیل بولا

"یہ لڑکا کبھی کیا ہے؟" جیون بولا "اسی کی وجہ سے تو یہ سب کچھ ہوا۔"

"فکر کی کیا بات ہے جیون سیٹھ" ڈاکٹر نے اسے تسلی دی "حادثے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

اسی دم ڈاکٹر نے کھڑکیوں پر لگے کالے پردے گرا دئے۔ جیون کو محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کسی نے بجلی کا بٹن دبا دیا ہو۔ روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

اس نے کہا "میں اب سمجھا۔ اس وقت رات تھی اور آپ لوگ بجلی کا خرچ کرنے کی خاطر اندھیرا کئے ہوئے تھے۔"



"نہیں ڈیئر" پاروتی بولی "اب تو دن ہے۔ ڈاکٹر روشن نے تو پردے گرائے ہیں۔"

"ٹھہریئے" ڈاکٹر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "مجھے بتانے دیجئے۔"

ڈاکٹر فوراً جیون کے پاس آیا۔ اس نے اس کی آنکھوں پر تیز روشنی ڈالی۔ جیون کو از سر نو کالا دکھائی دینے لگا۔

"پھر اندھیرا ہو گیا۔"

"اندھیرا؟" ڈاکٹر کی پریشانی بڑھی "کیا آپ کو تیز روشنی کا احساس نہیں ہوا؟"

"میں درست کہہ رہا ہوں۔ سب اندھیرا ہے" جیون نے اپنی بات پر زور دیا۔ "اور یہ آپ نے مجھے کانٹے دار بستر پر کیوں لٹا رکھا ہے؟"

"یہ تو بہت نرم و نازک اور ملائم بستر ہے۔"

"نہیں، یہ تو بہت تکلیف دہ ہے اور تکیہ تو جیسے بالکل پتھر کا ہے۔"

"آپ کو اور کیا تکلیف ہے؟" ڈاکٹر نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بہت سردی لگ رہی ہے" جیون کے دانت بجنے لگے "میں تو گرمی کے دنوں میں گرا تھا۔ کیا تب سے اب تک میں بے ہوش ہی پڑا رہا؟"

"نہیں پتا جی" انل بولا "یہ تو کل ہی ....."

"مجھے دیکھنے دیجئے مسز جیون" ڈاکٹر بولا "آپ کو اور آپ کے لڑکے کو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا پڑے گا۔ میں آپ کے شوہر کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا یہ ٹھیک ہو جائیں گے؟" ریتا پاروتی نے پوچھا۔

"ضرور ضرور" ڈاکٹر نے مریض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "انہیں کچھ نہیں، بس ذرا سا صدمہ پہنچا ہے۔"

"پتا جی" انل نے کہا "مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے اپنا سب سامان صاف کر دیا ہے۔"

"اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے" پاروتی بولی "تو ہم دونوں سٹوروں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔"

"ہرگز نہیں" جیون چلایا "ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم لوگ تو مجھے چوپٹ کر دوگے۔"

ڈاکٹر نے دونوں کو کمرے سے باہر کیا اور مریض کے پاس آیا۔ جیون کمبل کس کر لپیٹے ہوئے پڑا تھا۔ اسے بہت سردی لگ رہی تھی۔

"آپ میرے اوپر کچھ کمبل اور ڈال دیں" وہ بولا "ورنہ سردی سے میرا ڈھیر ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر روشن نے کھڑکی سے کالا پردہ ہٹا دیا اور پوچھا "اب کیسا لگ رہا ہے؟"

"اندھیرا، جیسے رات ہو" جیون آہستگی سے بولا "پردہ ہٹانے سے بلب کیوں بجھ جاتے ہیں؟"

ڈاکٹر نے پردہ پھر ڈال دیا اور مریض کے پاس بیٹھ گیا۔ نرس کو بلانے کے لئے اس نے گھنٹی بجائی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے وہ پسینہ پسینہ ہوا جا رہا تھا۔ گھنٹی سن کر

نرس اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دھیرے دھیرے اس کے پاس آئی۔

"آپ نے روشنی کیوں گل کر رکھی ہے؟"

"ارے" جیون بولا "روشنی تو ہو رہی ہے۔"

"نرس، میں ڈاکٹر روشن ہوں۔ جا کر ذرا سا ریگ مال، روئی، برف اور جیون سیٹھ کا کھانا لے آؤ۔"

"کیا ان کے لئے پرہیزی کھانا آئے گا؟"

"اسی بات کا پتہ لگانا ہے" ڈاکٹر بولا "ذرا جلدی کرو۔"

"کمبل بھی منگوا لیجئے" جیون نے کانپتے ہوئے کہا۔

"کمبل؟" متحیر ہو کر نرس بولی "ڈاکٹر صاحب؟ کمبل؟"

"ہاں کم از کم چھ کمبل۔"

دس منٹ میں نرس تمام سامان لے کر آ موجود ہوئی۔

یکے بعد دیگرے ساتوں کمبل جیون سیٹھ کو اوڑھا دیئے گئے مگر اس کی سردی پھر بھی کم نہ ہوئی۔

"تھوڑی سی کافی دے دیجئے" جیون نے تجویز پیش کی "شاید سردی کچھ کم ہو سکے۔"

ڈاکٹر کے اشارے پر نرس نے پیالے میں کافی انڈیلی۔ مریض سے معلوم کر کے اس نے ڈیڑھ چمچے چینی ملائی۔ سیٹھ نے چسکی لیتے ہی تھو تھو کرنا شروع کر دیا۔

"بالکل ٹھنڈی ہے" وہ چلایا "اور اس میں اتنا نمک کیوں بھر دیا ہے؟"

"نمک؟" نرس استعجاب سے بولی "یہاں اتنا اندھیرا ہے کہ . . . ."

"اچھا، تم جاؤ" ڈاکٹر نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا "میں دوسری کافی بنائے دیتا ہوں۔"

نرس دھیرے دھیرے باہر چلی گئی۔

ڈاکٹر نے دوسرا کپ بنا کر دیتے ہوئے کہا "اسے تو پی کر دیکھئے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے" جیون نے چسکی لیتے ہوئے کہا "یہ کیا مذاق سوجھا؟ نرس نے مجھے نمک ڈال کر ٹھنڈی کافی دے دی۔"

"معاف کیجئے" ڈاکٹر بولا "آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ . . میں آپ کی تھوڑی جانچ اور کروں گا۔"

جیون سیٹھ کو یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا تاہم وہ راضی ہو گیا۔

معائنہ ختم کر کے ڈاکٹر روشن پریشان ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر پسینہ بری طرح جھلک رہا تھا۔ اسے اتنا بدحواس دیکھ کر جیون چونکا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر؟ کیا مجھے . . . ."

"نہیں نہیں" ڈاکٹر بولا "خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"پتہ نہیں! کیا میں بیمار ہوں؟"

"دیکھئے" ڈاکٹر نے کرسی آگے کھسکاتے ہوئے کہا "اس وقت دوپہر ہے۔ پھر بھی جب تک اندھیرا نہ کیا جائے آپ دیکھ نہیں سکتے۔ جو کافی آپ کو پہلے دی گئی تھی وہ بہت گرم اور میٹھی تھی مگر آپ کو ٹھنڈی اور نمکین لگی۔ جب میں نے آپ کو برف ملا کر نمکین کافی دی تو وہ ٹھیک لگی۔ آج زبردست گرمی ہے پھر بھی آپ کو بے انتہا سردی لگ رہی ہے۔ ریگ مال آپ کو چکنا لگ رہا تھا جب کہ روئی کا لمس لیتے ہی آپ نے کانٹے چبھونے کی شکایت کی تھی۔ میں نے کمرے میں کئی طرح کے رنگ اور روشنیاں کر کے آپ کا معائنہ کیا مگر آپ کو پیلے رنگ کی جگہ سنگنی، لال کی بجائے ہرا اور نیلے رنگ کی نسبت گلابی رنگ نظر آیا۔ اب شاید آپ سمجھ سکیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا" جیون بولا "مجھے ہوا کیا ہے؟"

"سمجھا تو میں بھی کچھ نہیں" ڈاکٹر نے کہا "میرا خیال ہے، آپ کا آپریشن کرتے وقت ہڈی کی کرچ نکالتے ہوئے شاید کچھ نسیں غلط طور پر جُڑ گئی ہیں۔"

"پھر؟" جیون سیٹھ چونکتے ہوئے بولا۔

"اس طرح آپ کے حواس خمسہ کا کام الٹا ہو گیا ہے۔ آپ کو گرمی کی بجائے ٹھنڈ، کھردرے کی بجائے چکنے کی نسبت نمکین محسوس ہونے لگا ہے۔ رنگ بھی آپ کو برعکس ہی دکھائی دینے لگے ہیں۔"

جیون ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا!

"بدمعاش، تو نے آخر مجھے کہیں کا نہیں ..."

ڈاکٹر فوراً مریض کو بے ہوش کرنے وا

دینے کے لئے اٹھا۔ مگر اسی لمحے اس نے سکون بخش دوا دینے کی بجائے اشتعال انگیز دوا دینے کی بابت سوچا۔ مطلوبہ دوا دینے پر اس کا نتیجہ بہت زود اثر رہا۔ جیون کو قرار آگیا اور وہ دھیرے دھیرے سو گیا۔

سیٹھ نے اپنے وکیل مسٹر کھنہ کو بلالیا تھا۔

جیون وہ ڈاکٹر پر مقدمہ چلانا چاہتا تھا۔ اس کی بات سن کر وکیل ڈاکٹر روشن کو اس کے پاس لے آیا۔

"وکیل صاحب" ڈاکٹر نے کہا "میں آپ سے حلفیہ کہتا ہوں کہ میری نظروں کے سامنے آج تک کوئی ایسا کیس نہیں آیا۔ یہ اپنی نوعیت کا عجیب وغریب کیس ہے۔ شاید کچھ دن بعد یہ اپنے آپ ہی ٹھیک ہوجائیں۔"

"اس سے تو وہی اچھا تھا" جیون بڑبڑایا۔

"لیکن ڈاکٹر کا فرض ہے" مسٹر کھنہ نے وکالت کی "کہ وہ مریض کو موت کے منہ میں جانے سے روکے۔ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس نے اپنا فرض ادا کیا۔"

"مسٹر کھنہ کا خیال درست ہے ڈیئر" اس وقت پاروتی بھی وہاں آموجود ہوئی۔

"تم چپ رہو" جیون سیٹھ بولا۔

"دوسری بات یہ ہے" کھنہ نے آگے کہا "آپریشن کے دوران ڈاکٹر کو بالکل یہ احساس نہ تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔"

ڈاکٹر خوش ہوتے ہوئے بولا "جی ہاں، پھر آپریشن میں خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔"

"خطرہ مول لینا پڑتا ہے" جیون سیٹھ بھنا کر بولا "خیر کھنہ! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم مقدمہ ہار جائیں گے" وکیل نے اپنی رائے ظاہر کی۔

جیون چپ ہوگیا مگر تھوڑی دیر بعد ہی بولا "تو ہار جانے دو۔ بدنامی تو اس کی ہی ہوگی۔ میں مقدمہ ضرور دائر کروں گا۔"

"لیکن کیوں ڈیئر" پاروتی نے ٹوکا "بیکار پیسہ ضائع کرنے سے کیا حاصل؟"

"ارے بابا، تم چپ رہو۔ پیسہ بیکار نہیں جائے گا۔ بدنامی کے ڈر سے ڈاکٹر مجھے ٹھیک کرنے کی کوشش کرے گا اور میں اسے ایک پیسہ بھی فالتو نہیں دوں گا۔"

ڈاکٹر فوراً ہڑبڑا گیا "میں تو پہلے ہی ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہو"

مُرغی کے انڈے

ایک دن بادشاہ اکبر قبل از وقت ہی دربار میں آئے اور اپنے ساتھ مُرغی کے بہت سے انڈے بھی لائے۔ جیوں جیوں وزیر اور منصب دار آتے گئے بادشاہ انہیں ایک ایک انڈا دیتے رہے اور تاکید کرتے رہے کہ جب حکم ہو سب ایک ایک کر کے محل کے پاس والے تالاب میں غوطہ لگائیں۔ غوطہ لگاتے وقت انڈے اپنے پاس ہی رکھیں اور جب تالاب سے باہر آئیں تو انڈا دکھادیں۔

جب بیربل دربار میں آئے تو بادشاہ بولے "رات میں نے خواب میں دیکھا کہ جو آدمی تالاب میں سے انڈا نکال لائے گا وہ قول کا پورا ہوگا جو خالی ہاتھ آئے گا وہ دروغ گو ہوگا۔"

بادشاہ کا اشارہ پاکر سب لوگ تالاب میں کودے اور اوپر آئے پر ایک ایک انڈا دکھاتے گئے۔ بادشاہ نے بیربل سے کہا کہ وہ بھی اپنی صداقت کا ثبوت دیں۔

جب بیربل باہر آئے تو بادشاہ نے پوچھا "انڈا کہاں ہے؟"

بیربل نے زور سے ککڑوں کوں کی اور کہا "بادشاہ سلامت انڈے دینا تو مرغیوں کا کام ہے بندہ تو مرغا ہے۔"

بادشاہ لاجواب ہوگئے۔

" کیا مطلب ؟" سیٹھ نے حیرانی سے پوچھا" تب تک میں کیا کروں۔ گرمیوں میں گرم کوٹ اور سردیوں میں کھلی قمیض پہن کر چلتے ہوئے دیکھ کر لوگ مجھے دیوانہ کہیں گے۔ دن میں میں اپنی دکان بند رکھوں گا تو رات کو کون خریدار میرے پاس آئے گا۔ رنگ بھی مجھے اُلٹے دکھائی دیتے ہیں تو میں بزنس کیا خاک چلاؤں گا۔ کھانے کے وقت میں نمک کی جگہ چینی اور مٹھاس کے بدلے نمکین چیزیں استعمال کروں گا۔"

" کیوں ڈاکٹر صاحب " کھنہ نے پوچھا " آپ کا کیا خیال ہے ؟"

" اپنا خیال یہ کیا ظاہر کرے گا !" جیون چیخا " میں اس کے خلاف مقدمہ درج کرائے بغیر نہ رہوں گا۔ اس نے مجھے بالکل ہی اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اتنی سی بات پر تو میں اس سے معاوضے کے لاکھوں روپے لے سکتا ہوں۔"

" میں لکھ پتی نہیں ہوں مسٹر جیون۔"

" اسپتال تو ہے۔ میں اسپتال پر معاوضے کا دعویٰ کروں گا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وکیل بولا " سیٹھ جی، میرا خیال ہے کہ مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ آپ کی جان کو خطرہ لاحق تھا اس لئے ڈاکٹر نے فوراً آپریشن کیا۔ اس کی جگہ اگر دوسرا کوئی ڈاکٹر ہوتا تو وہ بھی یہی قدم اُٹھاتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا ڈاکٹر ؟"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا " سر کی ہڈی سے ایک نوکیلا ٹکڑا ٹوٹ کر دماغ میں پیوست ہو گیا تھا۔ اگر اُسے فوراً نہ نکالا جاتا تو مریض کو لقوہ ہو جاتا یا وہ مر جاتا۔"

" اگر میں دوبارہ آپریشن کروں تو دیکھ سکتا ہوں کہ کون سی نسیں غلط جڑ گئی ہیں۔ دعویٰ تو نہیں کرتا مگر کوشش کر کے انہیں پھر سے ٹھیک طرح جوڑ سکتا ہوں، حالاں کہ ہڈی کی کرچ کئی تہوں کے نیچے تک چلی گئی تھی۔ پھر بھی ...."

وکیل نے رُکتے ہوئے پوچھا " تو کیا آپ انہیں ٹھیک کرنے کے لئے دوبارہ آپریشن کریں گے ؟"

" کیوں نہیں ! میں پوری کوشش کروں گا لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب کیس ہے۔"

وکیل نے جیون سیٹھ اور پاروتی کو سمجھاتے ہوئے کہا " دیکھئے، مقدمہ ویسے تو چلایا نہیں جا سکتا۔ کیا آپ ڈاکٹر کو آپریشن کرنے کے لئے ایک موقع اور دے سکیں گے ؟"

" یقیناً " پاروتی خوشی سے چہکی۔

جیون کچھ دیر جھلاتا رہا۔ پھر بولا " اچھا، ٹھیک ہے۔"

" اچھا، ڈاکٹر صاحب " کھنہ نے کہا " اب سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

ڈاکٹر روشن اسی وقت نرس کو بُلانے کے لئے لپکے " میں ابھی آپریشن کا بندوبست کرتا ہوں۔"

" شاید اب کی بار ٹھیک ہو جائے " جیون نے اپنی انگلیاں گرمانے کے لئے مٹھی میں برف دباتے ہوئے کچھ پریشانی میں کہا۔

جیون سیٹھ کو رفتہ رفتہ ہوش آ رہا تھا۔ اسس پلکیں جھپکنے لگی تھیں جیسے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پلنگ کے دونوں طرف اسے چار آدمیو کے سائے سے دکھائی دیئے

" پاپا " انل نے اپنی ماں کی طرف مخاطب ہو کر کہا " دیکھئے اس کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔"

" ادھر دیکھو ڈیئر " پاروتی خوشی سے بولی

" اب یہ کیسے ہیں ڈاکٹر ؟" کھنہ نے پوچھا۔

" بالکل ٹھیک " ڈاکٹر خوش ہوتے ہوئے " دیکھئے یہ دھڑ اُٹھے ہوئے ہیں اور انھیں اندازہ نہیں معلوم ہو رہا۔ نہ انھیں حادثہ ہی لگ رہا ہے۔"

ڈاکٹر مریض کے پلنگ پر جھکا "۔ آپ کا کیا حال ہے مسٹر جیون ؟"

جیون سیٹھ کو بولنے میں دو ایک منٹ۔ اسے اپنی زبان ورم آلود لگی۔ اس نے دو ایک نتھنے پھُلا کر، منہ اوپر اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا پھر نفرت سے منہ سکوڑتا ہوا بولا " یہ بھنگی رنگ بو کہاں سے آ رہی ہے ؟"



جناب، مجھے کون نہیں جانتا! ایک آپ ہی ایسے ہیں جو مجھے نہیں پہچانتے . . .

ببیتا

گورا مکھڑا، تیکھے نین نقش، چھریرا بدن ـــــ انہی کا دوسرا نام ہے ببیتا



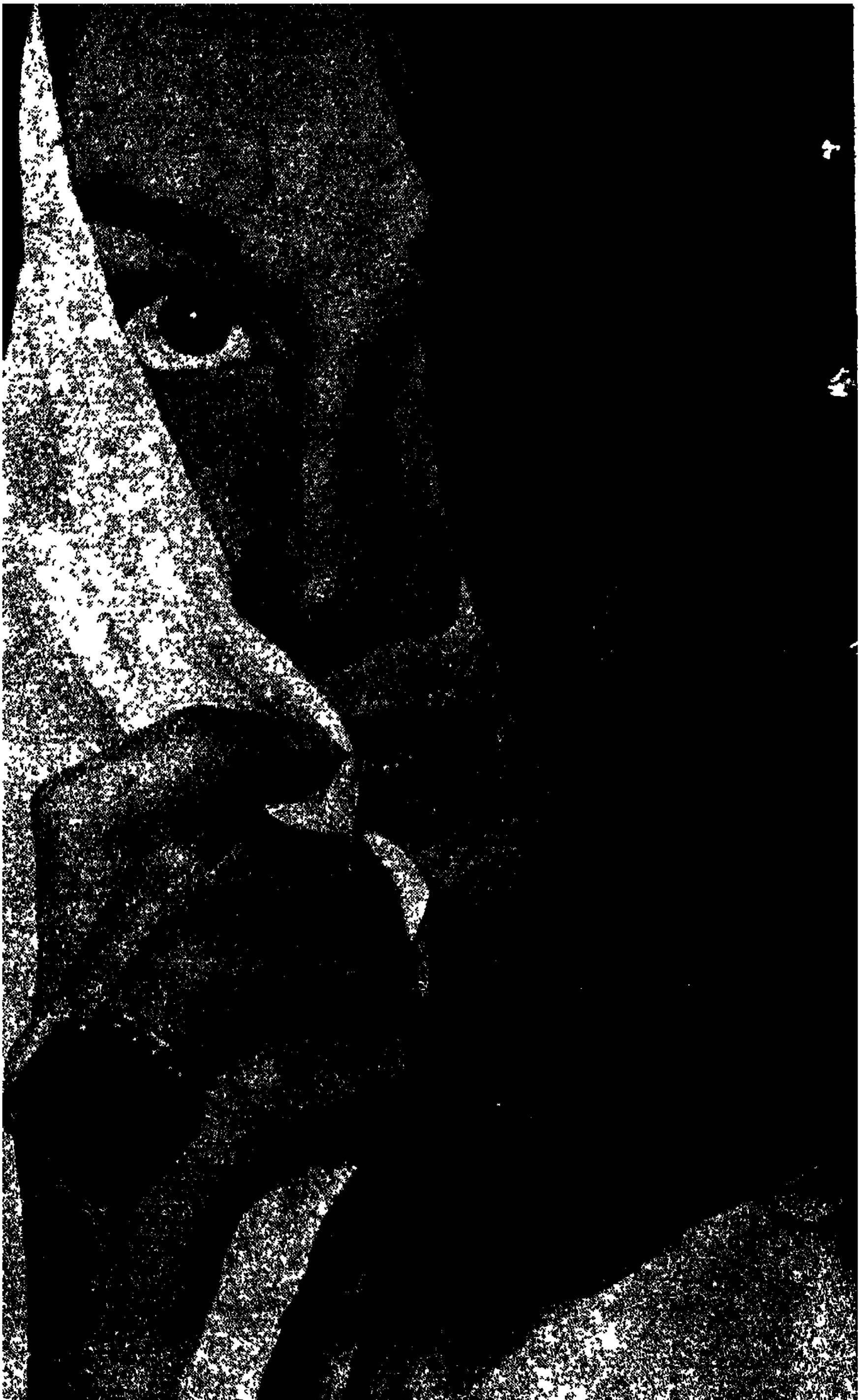
کمال ہے آپ کو یاد نہیں آ رہا ہے !

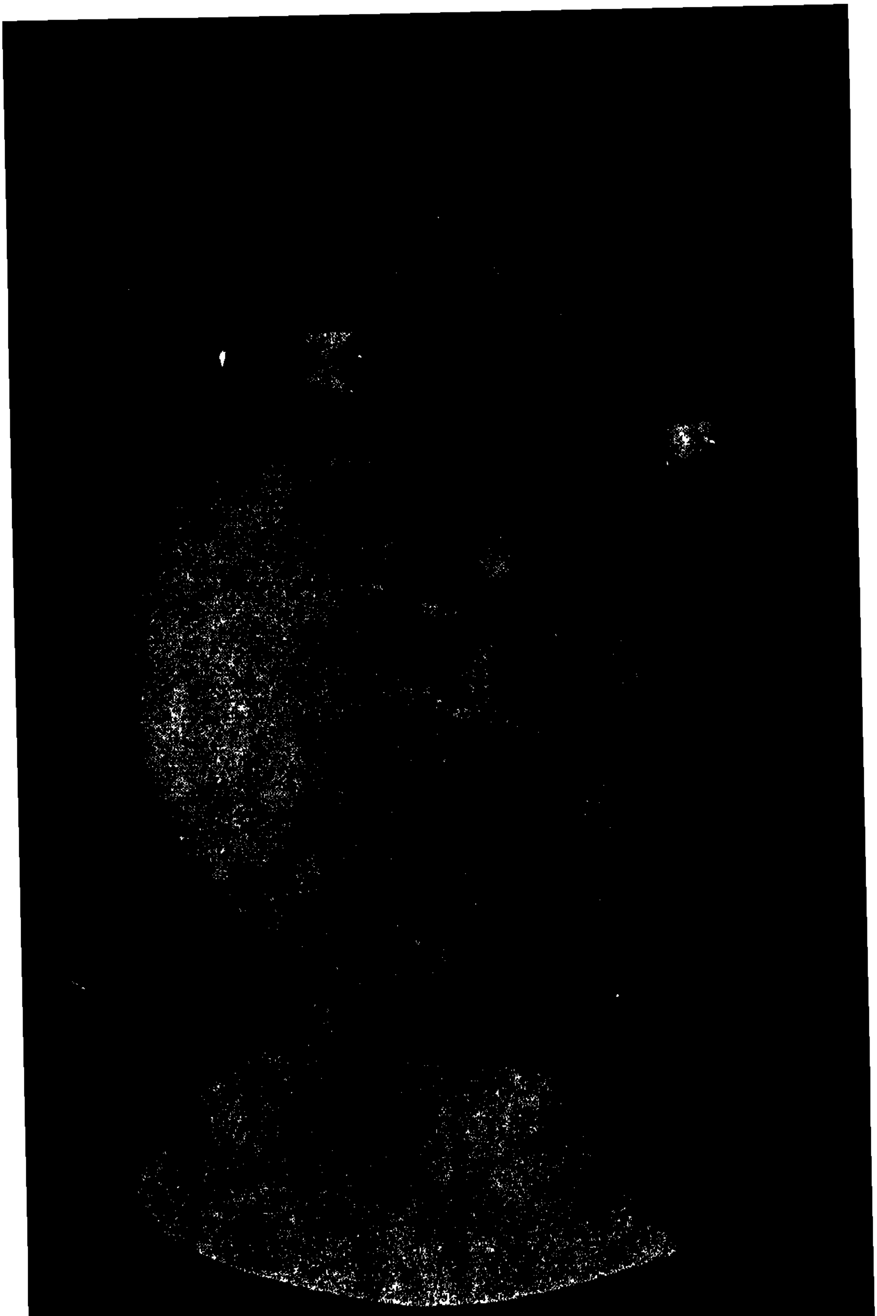


کیا کہا ؟ کہیں دیکھا ہے ؟ کہاں ؟



اچھا میں آپ کی مدد کر رہی ہوں، میں ہوں ببیتا، کیا سمجھے ؟



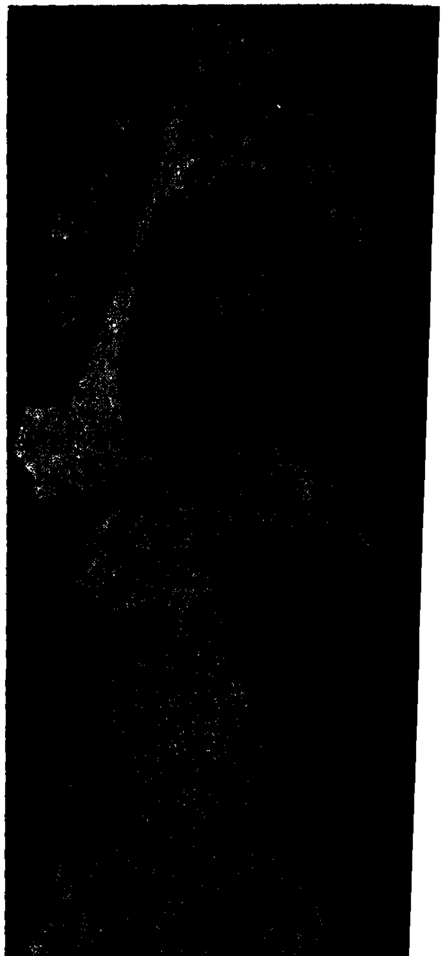


کون سی ببیتا ؟ کیا واقعی ببیتا کو نہیں جانتے ؟

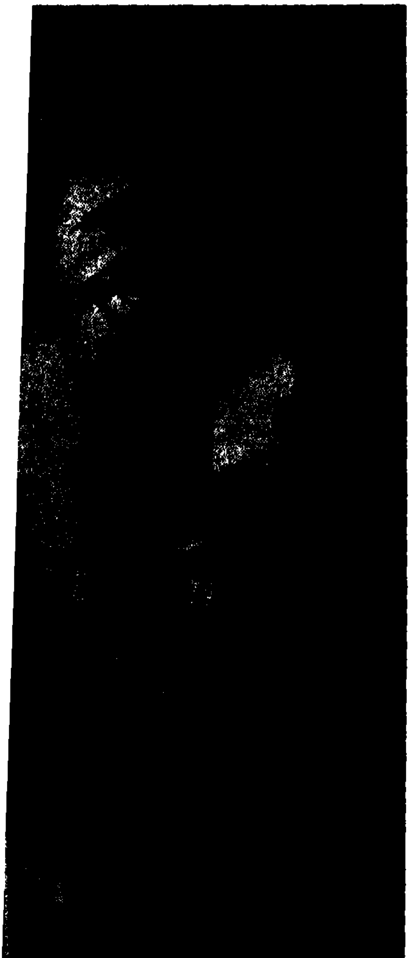
ببیتا

ببیتا ان ہی چند اداکاراؤں میں سے ہے جنھوں نے اپنا فلمی کیریئر ہیروئن کے روپ میں شروع کیا۔ وہ سب سے پہلے فلم 'راز' میں آئی۔ اس فلم میں اس نے اپنی اداکاری بہت ہوشیاری سے نبھائی۔

'راز' کے بعد 'دس لاکھ' اس



میں ہوں فلم ایکٹرس...



اپنے بارے میں مجھے غلط فہمی تھی

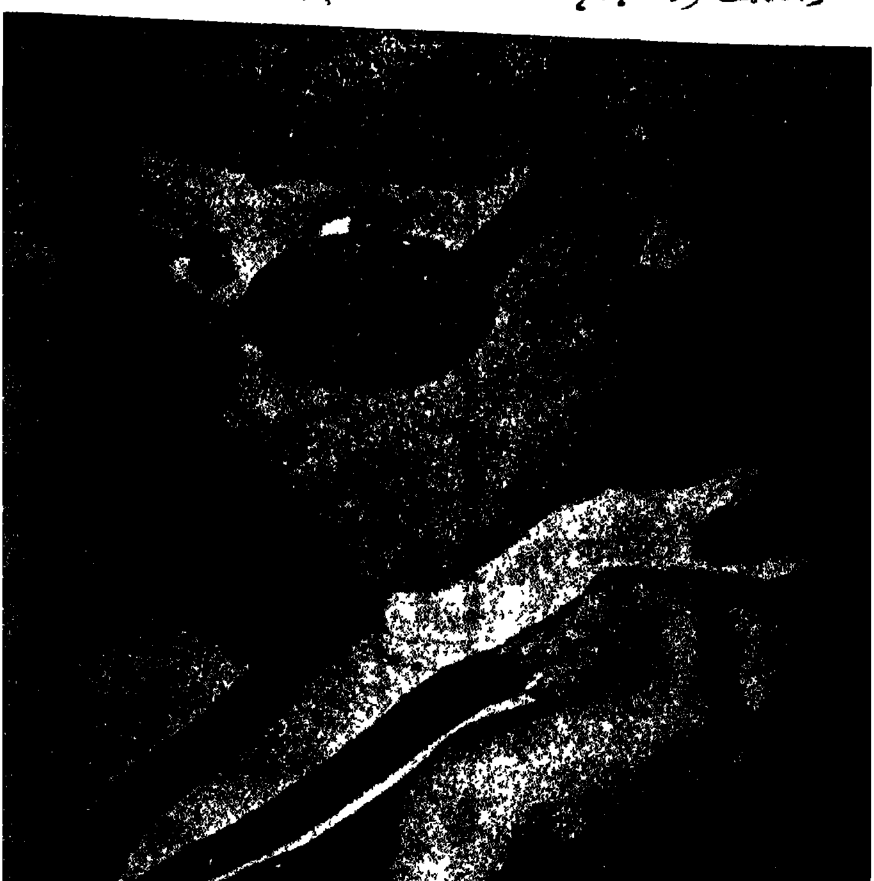
کی دوسری فلم منظرِ عام پر آئی جو باکس آفس پر کافی کامیاب رہی۔ "دس لاکھ" کی کامیابی نے اُس کی مانگ کو چار چاند لگا دیئے ...

اب وہ بھی مشہور و معروف اداکاراؤں کی طرح نخرے کیا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں کام کرنے کی صلاحیت ہے ساتھ ہی گلیمر بھی کچھ کم نہیں۔ اُس کا گورا نکھرا، تیکھے نقش و نگار، چھریرا بدن اور پرکشش و دل فریب ادائیں فوراً تماشائیوں کا دل موہ لیتی ہیں۔ اس وقت وہ چھ سات فلموں میں کام کر رہی ہے۔



تو ایک شرارت ہو رہی تھی

یُو نائٹ ہوائے!





** انوپما

فلم ساز : ایل بی لچھمن
ہدایت کار : برشی کیش مکھرجی
ستارے . شرمیلا ٹیگور ، دھرمیندر، ششی کلا،
دیوین ورما ، ڈیوڈ ، ترون بوس

موجودہ فلم میں فلم ساز و ہدایت کار نے پیار محبت، اقرار انکار، دِل فریب ناچ گانوں اور جھنگے سیٹوں کے بازاری ہتھکنڈوں کی نقل نہیں کی تاہم واقعات کی روانی میں ندی کا بہاؤ ہے جو یقیناً قابلِ تحسین ہے۔

کہانی میں شرمیلا ٹیگور کا کردار بہت نمایاں ہے۔ اُس کی پیدائش کے فوراً بعد اُس کی ماں کا انتقال ہوجاتا ہے اور اُس کا باپ ترون بوس نوزائیدہ بچی کو منحوس سمجھنے لگتا ہے۔ باپ کی بے توجہی سے اُسے ذہنی کوفت ہوتی ہے اور وہ گم صُم رہتی ہے، کِسی سے بات چیت نہیں کرتی۔ قلم کار دھرمیندر اُس کی تاریک زندگی میں محبت کی شمع روشن کرتا ہے جس سے اُس کے دِل میں محبت کے ساتھ ساتھ بغاوت کا جذبہ بھی عود کر آتا ہے۔ دھرمیندر اُس کی زندگی سے متاثر ہوکر ایک ناول "انوپما" کی تخلیق کرتا ہے۔ جب شرمیلا ٹیگور اُس ناول کو پڑھتی ہے تو اپنے پریمی سے ملنے کے لئے بے قرار ہوکر سماج کی دقیانوسی رسموں کا گھیرا توڑ دیتی ہے۔

باپ بیٹی کی کردار نگاری تک تو کہانی کا رجحان طرح ہے یعنی یہ اکثر ہوتا ہے کہ باپ اپنی اُس اولاد منحوس سمجھتا ہے جس کی پیدائش پر ماں مرجائے لیکن لڑکی کا ایک قلم کار سے رابطہ — یہ آدرش وادی انداز پیش کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ فلم میں وہ روانی یہاں نہیں آپاتی۔ انجام بہت عُمدہ ہے — باپ بیٹی کی شادی کی تیاری کر کے بھی اُس کو اُس کے عاشق کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت دیتا ہے اور پوشیدہ طور سے اُسے سٹیشن تک چھوڑنے بھی جاتا ہے۔ اِس طرح فلم کے دو حصّے بہت اثر انگیز ہیں — پہلا، جب ترون بوس اپنی نئی بیوی سے محبت کرتا ہے اور دوسرا آخر میں جب وہ اپنی لڑکی کو اُس کے عاشق کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

اداکاری کے نقطۂ نظر سے فلم معیاری ہے۔ شرمیلا ٹیگور نے بغیر بولے آنکھوں ہی آنکھوں میں — دِلی جذبات و رجحانات پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوسکی۔ ششی کلا نے عہدِ حاضر کی لڑکیوں کی نمائندگی اچھی طرح کی ہے اور اُس کی یہی اداکاری اُس کو فلمی زندگی میں نمایاں مقام دِلانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

قلم کار کے روپ میں دھرمیندر کی کارگزاری ہندی قلم کاروں جیسی ہے جس میں حقیقت کم اور تصنع زیادہ ہوتا ہے۔ دیوین ورما کا کام بھی اُس کے کردار کے مطابق فطری بن پایا ہے۔ ڈیوڈ نے تماشائیوں کو ہنسانے کی باگ ڈور اچھی طرح سنبھالی ہے۔ ترون بوس کی اداکاری شروع میں اثر ہے مگر آخر میں اُس میں کوئی جاذبیت نہیں رہ پاتی۔

مکالمے چُست ہیں گیت تُلے چُنے۔ موسیقی اوسط درجے کی مگر پہلے گانے 'کوئی آیا ہے' کی ادائیگی اچھی ہے۔

پہلی اور آخری بار اپنے باپ کے سامنے ہیروئن

خاموشی ٹوٹنے کا منظر کچھ عجیب عجیب لگتا ہے گو نفسیاتی طور پر وہ موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اور فطری ہے کیوں کہ کم سخن یا خاموش آدمی جب بولنے لگتا ہے تو پھر اس کے منہ کو کوئی لگام نہیں لگتی اور وہ بنا رُکے بولتا جاتا ہے۔

●

★ مِلن

فلم ساز: ایل۔وی پرساد
ہدایت کار: اے سُبّا راؤ
ستارے: نوتن، سنیل دت، جمنا، دیوین ورما، مُکری، لیلا مشرا، سُریندر، شیاما، پران

آرزوئیں ناکام رہتی ہیں تو دوبارہ جنم ہوتا ہے۔ اس بے کار موضوع پر ایک خیالی محبت بھری کہانی 'مِلن'، کی تعمیر کی گئی ہے۔

ملاح سُنیل دت زمیندار سُریندر کی بیٹی نوتن کو گنگا پار کراتا تھا وہ دل ہی دل میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اُسے روزانہ گلاب کا ایک پھول پیش کرتا تھا لیکن نوتن کی شادی دیوین ورما کے ساتھ ہو جاتی ہے جس کا کچھ دنوں بعد ہی انتقال ہو جاتا ہے۔

بیاہی حسینہ جمنا سُنیل دت سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مگر سُنیل دت کے خیالوں میں تو نوتن جلوہ گر رہتی ہے شکست خوردہ جمنا اس بارے میں افواہیں پھیلاتی ہے۔ آخر کار بدنامی اور سماجی غلط فہمیوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے نوتن اور سُنیل دت گنگا میں ڈوب کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

فلم اگر اسی جگہ ختم ہو جاتی تو بھی غنیمت تھا لیکن سُنیل دت اور نوتن کا دوسرا جنم بھی دکھایا گیا ہے اور اُن کی ناکام محبت کو جیسے تیسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر شادی کی صورت میں پورا کرا دیا جاتا ہے۔

پلاٹ کے شروع اور آخر کے مناظر بالکل بے ہودہ ہیں اوّل تو بنیادی طور پر موضوع ہی بیکار ہے۔

ملاح کے روپ میں سُنیل دت کا کام اچھا ہے۔ جمنا کے کام میں ('ہمراہی' کے مقابلے) کافی سُدھار آگیا ہے۔ پست قد مُکری نے فلم بینوں کو کہیں کہیں کافی ہنسایا۔ لیلا مشرا، سُریندر اور شیاما کے کردار اُکھڑے اُکھڑے ہیں۔ دیوین ورما و پران کو مناسب رول نہ ملنے کی وجہ سے اُن کی اداکاری میں کوئی جاذبیت نہیں آئی۔

تماشائیوں کو یاد ہوگا کہ فلم 'خاندان'، میں نوتن نے سُنیل دت کو لوری دی تھی تو اِس فلم میں سُنیل دت نے نوتن کو لوری دے کر خاصہ بور کیا ہے۔ کاش یہ لوریاں ننھے منّے بچّوں کو دی جاتیں۔ ویسے دوسرے گیت ہلکے پھلکے ہیں رنگین فوٹوگرافی قابلِ دید ہے لیکن سیٹ ڈرامے والے اور لباس اداکاری کے شایانِ شان نہیں پیش کرنے کا انداز سُست اور ہدایت کاری اوسط درجے کی ہے۔

پچھلے بارہ مہینوں میں

★★★★ گائیڈ

★★★ ممتا، آسرا

★★ نیتا جی سبھاش چندر بوس، وقت، آرزو، شہید، بھیگی رات، خزانہ، آئے دن بہار کے، نئی عمر کی نئی فصل

★ ہمالیہ کی گود میں، خاندان، دو دل، بے خبر، نیلا آکاش، سار اور آواز، سورج، دو بدن، دل لگی، تصویر، پیار محبت، پتی پتنی، راز، نیا قانون

○ بدتمیز، سگائی، دل نے پھر یاد کیا، علی بابا چالیس چور، وہاں کے لوگ

○ چندن کا پلنا

فلم ساز : آرزو فلمز
ہدایت کار : اسمٰعیل مینن
ستارے : میناکماری، دھرمیندر، ممتاز، ابھی بھٹاچاریہ، نذیر حسین، درگا کھوٹے، محمود

"—— اب تو یہی ایک خواہش باقی ہے کہ ایک بار اپنے ہاتھوں اجیت کے بیٹے کو چندن کے پلنے میں جھلا دوں "

اجیت (دھرمیندر) کی بیوہ ماں رادھا (درگا کھوٹے) کی اسی خواہش کے اردگرد کہانی چکر لگاتی ہے۔ کہانی میں غیر فطری پن اور زبردستی کی توڑ مروڑ والے واقعات کی فراوانی کے سوا کوئی نئی بات نہیں ہے۔

رادھا کرشن کنھیا کی پرستش اپنی مطلب براری کے نظریئے سے کرتی ہے۔ اِسی بیچ اجیت کے دوست کا لڑکا مہیش (محمود) اپنا گھر چھوڑ دیتا ہے اور اسے تلاش کرنے کا کام رادھا اجیت کو سونپتی ہے۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد کہانی جب غیر فطری ہونے لگتی ہے اسکرین پر اجیت اور شوبھا (میناکماری) ایک دوسرے سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں (خیریت ہے کہ محبت کے لئے کوئی سانحہ نہیں کرایا جاتا)۔

پھر وہی عام فلموں والی بات! اجیت شوبھا کی شادی، تین سال تک شوبھا کی گود خالی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب دو سال مزید انتظار وغیرہ بیچ بیچ میں فلم ساز کی محمود کی کھچڑی زبان سے تماشائیوں کو ہنسانے کی ایک فضول کوشش ہے (اگر محمود کو فلم سے نکال دیا جائے تو ہال میں بیٹھنا ہی دوبھر ہو جاتے)۔

رادھا شوبھا کے بارے میں مندر کے گرودیو سے ڈاکٹر تک کی صلاح لیتی ہے۔ آخر کار شوبھا کو بانجھ بتا دیا جاتا ہے۔ اس پر شوبھا کے رویے میں زبردست تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ گرودیو کی رضامندی سے ایسی حرکتیں کرتی ہے جن سے اُس کا شوہر نفرت کرنے لگے اور دوسری شادی کرلے۔ شوبھا کامیاب ہوجاتی ہے۔ وہ اجیت کے لئے اپنی خوشیوں کی خاموش قربانی دیتی ہے اور خود کو سماج کی نظروں میں گرا دیتی ہے۔ اجیت کی محبت کو قصداً ٹھکرانا اور پھر تنہائی میں گھٹ گھٹ کر تڑپنا اور رونا اُس کی کی زندگی کا ایک معمول ہو جاتا ہے۔ جن خوبصورت زلفوں کی چھاؤں میں اجیت اپنی زندگی گزارنا چاہتا تھا، اُنہی کو شوبھا نے ایسے وقت کٹوا دیا جب وہ اُس کو ایک کنگھی پیش کرتا ہے۔

مال کاٹنے والی یہ بات امریکی فلم کار اوہنری کی مشہور کہانی "گفٹ آف دی میگی" کی یاد دلاتی ہے۔

موسیقی کی ٹوٹی ہوئی دھنوں کے بیچ سے کہانی طلاق کی حد سے تجاوز کرجاتی ہے جہاں سے اجیت کی زندگی کا ایک نیا پہلو شروع ہوتا ہے۔ اُس کی شادی ہوتی ہے۔ ایک بچہ بھی ہوتا ہے اور بیوی مرجاتی ہے۔ فلم ساز نے ظاہرا طور پر تمام محنت اسی لئے کی ہے۔

دوسری طرف تنہائی میں شوبھا اپنی زندگی کے بقایا دن گنگا میا کی پرستش میں بتاتی ہے اور روئے جلاتی ہے۔ شوبھا بدکردار لڑکی نہیں ایک دیوی ہے۔ اس اعلان سے گرودیو سب لوگوں کو محو حیرت کر دیتے ہیں۔ سب لوگ شوبھا کو واپس لینے جاتے ہیں اور شوبھا ہی بچے کو چندن کے پلنے میں جھلاتی ہے اور یہیں فلم ساز کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

دھرمیندر اداکاری کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ اُس کی تصنع ابھرتی ہے۔ دورِ جدید کے ملبوس میں میناکماری کی اداکاری میں تو نہیں موٹاپے اور بھدے پن میں ضرور نکھار آگیا ہے۔ کیا اچھا ہوا اگر میناکماری ماں کے کردار ادا کیا کرے۔ گانے غیر معیاری ہیں اور ہدایت کاری نہایت نچلے درجے کی ہے۔ ●



عالمِ انتظار کیا کہئے

آہٹیں اُن کے آنے جانے کی
دھڑکنوں کو بڑھا گئیں کچھ اور
دل کے سپنے ہنسی ہوئے کچھ اور
زُلف نے جھک کے ہونٹ چوم لئے
جھوم اٹھا آسماں پر اَبر کا دور
اس نظر کا خمار کیا کہئے

وقت رخصت عجب تھا عالم
جس طرح گنگ ہوگئی ہو زباں
گھٹ کے سینے میں رہ گئے ارماں
آنکھ نے دور تک تجھے ڈھونڈھا
تیرے قدموں کے مل سکے نہ نشاں
دل ہے اب بے قرار، کیا کہئے

— راج کماری پوری —

بھارتی فلمیں بنام فلمی میلے

کافی دنوں سے یہ دکھائی دے رہا ہے کہ بھارتی فلمیں بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ بھارت کی فلم صنعت امریکہ کے بعد دوسرے نمبر ہے۔ ملک میں ستاروں، فلم سازوں، ہدایت کاروں ور تماشائیوں کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔

لیکن جب ہماری فلمیں بین الاقوامی فلم مقابلوں یں پٹ جاتی ہیں اور ہمارے فلم ساز غیر ملکیوں سے ذاق اڑوا کر لوٹتے ہیں تو ہماری فلمی صنعت کی اس نام نہاد ترقی کی ساری پول کھل جاتی ہے۔ شاید بھی ہم تیار شدہ فلموں کی تعداد میں فراوانی ہونے کو ہی ترقی سمجھ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یا ہمارے فلم ساز فلموں کا معیار اونچا اٹھانے کی وشش نہ کرتے؟

دوسرے ملکوں میں فلم کو فن اور اظہار رائے ا ایک زبردست ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ وہاں لوگ اس فن کو سنجیدہ طور پر لیتے ہیں اور دلچسپی کے علاوہ اس کے طرح طرح کے مقاصد و فوائد کے مارے میں برابر تحقیقات کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں فلمی میلے لگائے جاتے ہیں تاکہ فلم سے متعلق معلومات کا تبادلہ کیا جا سکے۔

یہ فلمی میلے صرف دکھاوے اور فلم ستاروں کی چمک دمک کے لئے نہیں لگائے جاتے، ان سے بین الاقوامی فلمی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ملتا ہے، تکنیک و فلم سازی سے متعلق دیگر باریکیوں پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے، دنیا سے ثقافتی، ادبی اور سیاسی تعلقات استوار کرنے کا



۱۹۶۵ کے فلمی میلے میں پہلا انعام پانے والی سیلوں کی فلم 'گام پیرالیا' کا ایک دلکش منظر



پولینڈ کی فلم (انٹو سینٹ سورسرس) کا ایک منظر
جو بھارتی فلموں میں کہیں بھی نہیں ملتا

بھی موقع ملتا ہے۔ دنیا کے بہت سے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انہی فلم اجتماعوں کی بدولت انگمے یار برگ مین اور ستیہ جیت رے جیسے فلم ساز سامنے آئے۔

تجارتی نقطۂ نظر سے بھی ان میلوں کی کم اہمیت نہیں ہے۔ یہاں فلموں کی خرید و فروخت اور تبادلہ ہوتا ہے جس سے اچھی فلموں کی ترویج ہوتی ہے اور ساتھ ہی فلم ساز کو اچھے پیسے ملنے سے اُس کا حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔ فلموں کی تیاری اور تقسیم سے متعلق نئے نئے مسائل اور ان کے حل بھی یہیں زیر بحث آتے ہیں۔

ہمارے ملک میں غیر ملکی کرنسی کا مسئلہ بڑا مشکل ہے۔ فلم سازی کا بہت سا سامان بیرونی ممالک سے آتا ہے اور سرکار فلموں پر زیادہ غیر ملکی کرنسی خرچ کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے فلمی صنعت میں بہت بڑا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ لیکن اس خطرے کا سبب بھی ہماری فلموں کا پست معیار ہی ہے۔ اگر ہماری فلموں کا معیار اچھا ہوتا تو صنعت اپنی ضرورت کی غیر ملکی کرنسی خود ہی کما سکتی تھی۔

دوسرے ملکوں کی فلمی صنعتیں جہاں سرکار کو غیر ملکی کرنسی کما کر دیتی ہیں وہاں ہماری صنعت سرکار سے غیر ملکی کرنسی طلب کرتی ہے۔ اگر فلمی میلوں کو بڑھاوا دیا جائے تو ہمارے فلم سازوں کو سمجھنے کا موقع ملے گا کہ آخر دوسرے ملکوں کی فلموں میں کیا خوبی ہے جو بیرونی مارکیٹ میں ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں اور ہماری فلموں میں کیا کمی ہے جس کی وجہ سے انھیں کوئی پوچھتا تک نہیں ہے۔

آج پوری دنیا میں تقریباً ۲۰۰ فلمی میلے منعقد ہوتے ہیں۔ وینس کا فلمی میلہ ۱۹۴۲ میں شروع ہوا تھا۔ یہ دنیا کا سب سے پرانا فلمی میلہ ہے۔

اس کے علاوہ کان (فرانس)، برلن، کالووی ویری وغیرہ کے بھی مشہور عالم فلمی میلے ہیں۔ فیچر فلموں کے میلوں کے علاوہ کئی جگہ تعلیم، کوہ پیمائی،

سائنسی کہانی، کھیل، آثار قدیمہ، تمدن، اور بچوں کی فلموں کے بھی الگ الگ میلے لگتے ہیں۔

پچھلے دنوں کان (فرانس) کے فلمی میلے کی بیسویں سالگرہ منائی گئی تھی۔ اس موقع پر دنیا بھر میں اچھی اچھی فلموں کی نمائش کی گئی تھی۔ لیکن پچھلے سال کی طرح ہمارے ملک نے اس سال بھی اس میلے میں حصّہ نہیں لیا۔ شاید ہمارے فلم سازوں کو ناکامی اور بے عزّتی کا خدشہ تھا۔

ہمارے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو شاید عقل اور اپنی دل پسندی پر یقین ہی نہیں ہے۔ اٹلی، فرانس، چیکوسلوواکیہ اور پولینڈ کا نام جہاں بین الاقوامی انعام یافتگان کی شکل میں سامنے آتا ہے وہاں بھارت کا نام (ایک دو جگہوں کو چھوڑ کر) کہیں سنائی دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں دوسرے ملکوں کی طرح فلمی میدان میں بھی نئے نئے تجربات و ایجادات کرنے کی بجائے فرسودہ روش پر چلنے اور کوئی طبع زاد بات پیدا کرنے کی جگہ دوسروں کی اندھی تقلید کرنے کو ہی فن سمجھا جاتا ہے۔ شاید ہی کوئی بھارتی فلم ایسی ہوگی جس میں کسی نہ کسی غیر ملکی فلم کا کوئی نہ کوئی خیال نہ چرایا گیا ہو۔

آج دنیا بھر کی فلمی صنعتوں کے پاس کوئی نہ کوئی متعین نقطۂ نظر یا پیغام ہے جسے سامنے رکھ کر وہ فلمیں تیار کرتے ہیں۔ روسی فلمی جگت کے پاس سماج وادی حقیقت ہے، اٹلی کے پاس حقیقت پسندی ہے، فرانس کے پاس تنوع اور رنگارنگی ہے اور امریکہ کے پاس بائبل و تاریخ کی تفسیر ہے۔ لیکن بھارت کے پاس کیا ہے؟

کنوئیں کے مینڈک بن کر ہم اپنی تعریف خود چاہے کرلیں مگر بیرونی ممالک میں ہمارا کیا مقام ہے۔ یا تو ہمیں غیر ممالک میں بھارتی فلموں کے کامیاب ہونے کا خیال چھوڑ دینا چاہئے یا پھر کچھ ایسی طبع زاد چیزیں پیش کرنی چاہئیں



مغربی جرمنی میں ۱۹۶۵ کے دوران منظرِ عام پر آئی فلم 'دی وزٹ' کی ہیروئن

ہمارے ملک میں بہت کم فلمی میلے ہوتے ہیں۔ دراصل اب تک ہمارے یہاں جو فلمی میلے ہوئے ہیں ان میں جنوری ۱۹۶۵ کے میلے کو ہی صحیح معنوں میں فلمی میلہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کے میلوں میں نہ تو کوئی مقابلہ تھا اور نہ کوئی خیال۔ جنوری ۱۹۶۵ کے میلے میں ۱۹ فیچر فلموں اور ۲۵ چھوٹی فلموں نے مقابلے میں حصّہ لیا تھا۔ مقابلے کے علاوہ اس میلے میں ۲۲ فیچر اور ۱۲ غیر ملکی فلمیں پیش کی گئیں۔

ایسی حالت میں جب کہ سرکار اور صنعت دونوں ہی ترقی کرنا نہیں چاہتے، بھارتی فلموں کے مستقبل کے بارے میں کیا کہا جائے۔ دراصل اس صنعت کے لئے ترقی کا راستہ اسی وقت کھل سکتا ہے جب یا تو فلمی صنعت پر قبضہ جما کر پیسہ بٹورنے کی پالیسی والے فلم سازوں کی جگہ کچھ بلند حوصلہ اور فن کے دلدادہ فلم ساز آئیں یا پھر ہر معاملے میں ناقص نظریہ رکھنے والی ہماری سرکار میں کوئی تبدیلی ہو جائے۔ ●

فلم کی یہ سیاسیات

بمبئی کی فلمی دنیا میں دو گلیمر گرلز کا ان دنوں بہت چرچا ہے۔ ان میں سے ایک ہے اداکارہ شرمیلا ٹیگور اور دوسری ہے اداکارہ سادھنا۔

شرمیلا جو ٹیگور خاندان کی ایک ممتاز رکن ہے۔ اس نے مذہب اسلام قبول کرکے اپنا نام عائشہ سلطان رکھ لیا۔ اس بات سے شرمیلا کے قریبی دوست احباب کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوگیا کہ اس نے اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا۔ شرمیلا ٹیگور نے اس کا جواب دیا "یہ سب کچھ میں نے کرکٹ ستارہ



شرمیلا ٹیگور عرف عائشہ سلطان
اپنی شہرت کی معراج پر

نواب آف پٹودی کی خوشنودی کے لئے کیا۔"

یکم مارچ ۱۹۶۷ء کو شرمیلا ٹیگور عرف عائشہ سلطان کی نسبت دلی میں نواب کے ساتھ قرار پائی تقریب سعید میں وزیراعظم اندرا گاندھی اور نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے خیال کیا جاتا ہے کہ ایک سال بعد دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ شادی میں یہ توقف اس لئے کرنا پڑا کہ شرمیلا شادی کرنے سے ابھی معذور ہے، کیوں کہ اس کے کئی کنٹریکٹ ہو رہے ہیں اور وہ روپیہ کمانے اور فنڈ جمع کرنے کے چکر میں الجھی ہوئی ہے تاکہ اسے جہیز وغیرہ کے معاملے میں دشواری نہ ہو۔

اپنی منگنی سے دو روز پیشتر اس نے گولڈ میڈل کی تقریب میں شرکت کی اور خاص منگنی والے روز اس نے ایک فلم کے معاہدے پر دستخط کئے اسی موقع پر اس نے یہ بھی کہا کہ وہ دو یا تین اور نئے معاہدے کرے گی تاکہ اسے فی پکچر ۴ ہزار روپیہ با آسانی حاصل ہو جائے۔

گلیمر اداکارہ سادھنا اپنی فلمی مصروفیات کے باعث نظر زبان زد خاص و عام ہوئی۔ مارچ ۱۹۶۷ میں اس نے دو فلموں میں اپنی اداکاری پیش کی۔ یہ دونوں فلمیں بمبئی کی فلمی دنیا کے لئے بالکل نئی ہیں۔

ایک فلم ہے ستیہ جیت پال کی 'امانت' جس میں سادھنا، منوج کمار، بل راج ساہنی، ششی کلا، رحمان، اچلا سچدیو، اور محمود کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ امانت کی ہدایت کاری ٹی پرکاش راؤ اور کہانی عظیم قلم کا۔ راجندر سنگھ بیدی کی ہے۔ گیت کار ساحر لدھیانوی

گئے ہیں اور موسیقی کا بار روی نے سنبھالا ہے۔

دھرم چوپڑہ جس نے فلم 'وقت' میں سادھنا کے فوٹو لئے تھے موجودہ فلم میں بھی اس نے ہی ذمّے داری قبول کی ہے، سنت سنگھ نے آرٹ ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

۱۱ر مارچ ۱۹۶۷ کو سادھنا کی دوسری فلم بھی پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اسیت سین جنہوں نے اپنی پہلی ہندی فلم 'ممتا' کے ذریعے لوگوں کے دل و دماغ پر سحرکاری کی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار ہیں۔ سادھنا کے ساتھ راج کمار بھی جلوہ گر ہے۔ سچین دیو برمن جو آج کل بہت زیادہ مصروفیت اور عدیم الفرصتی کے سبب نئے کنٹرکٹ نہیں لے رہے ہیں، انھوں نے فلم میں اپنی موسیقی دی ہے۔ کے کے ماتھر فلم کے آرٹ ڈائرکٹر ہیں۔ سب سے عجیب اور دلچسپ یہ ہے کہ زیرِ تبصرہ فلم کا ابھی کوئی نام ہی تجویز نہیں ہوسکا۔

راج شری بھی ان دنوں کسی سے اپنے کو کم نہیں پاتی۔ یہ بات فلمی دنیا میں بہت زور شور سے گشت کر رہی ہے کہ اس کا منگیتر گریگری چیمبیں اس سال اگست تک بھارت آجائے گا اور ۱۹۶۸ میں دونوں رشتہ ازدواج میں یقیناً منسلک ہو جائیں گے۔ کیوں کہ جب تک راج شری کو بھی فرصت ہو جائے گی۔

ویسے آج کل اگر اسے دم مارنے کی فرصت ہوتی تو وہ وی شانتارام کی نئی فلم 'بوند جو بن گئی موتی' کے لئے اپنے آپ کو ضرور پیش کرتی۔

بھارت کی فلم انڈسٹری کے لئے آئندہ کچھ سال بہت صبر آزما ہیں۔ اس عرصے میں یا تو فلم انڈسٹری اپنے بام عروج پر ہی پہونچ جائے گی۔ یا ہمیشہ کے لیے بے آواز ہو کر رہ جائے گی۔

فلم انڈسٹری کا مستقبل انڈین نیشنل کانگریس کی بلندی و پستی سے متعلق ہے۔ اگر کانگریس کا ستارہ بلندی پر جاتا ہے تو انڈسٹری بھی چمک جائے گی اور اگر خدانخواستہ معاملہ اس کے برعکس ہوا تو نتیجہ ظاہر ہے۔



راج شری ڈریس ریہرسل میں

حالیہ انتخابات کے دوران ملک میں صوبائی تعصب کی جو لہر اٹھی اس نے قوم کا شیرازہ منتشر کرکے رکھ دیا۔ اس تعصب کا شکار خاص طور پر ہندی فلمیں ہوئیں۔

مدراس (جنوبی بھارت) میں مشہور و معروف

... ہائیڈر آف مدراس گورنمنٹ مدراس کے ... ہیں۔ ان کی پارٹی ڈی ایم کے زدراونڈ ... جو ہندی فلموں کے لئے پہلے سے ہی ... تھی، اب اسی کے نظریے میں ایم جی رام چندرن کی آمد سے اور بھی رنگ آمیزی ... ہے۔

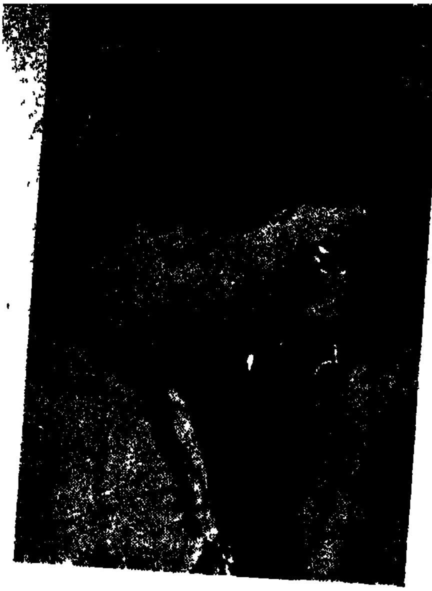
... رتنا پدمنی جو مدراس کی رہنے والی اداکارہ ہے، جس نے بہت سی ہندی فلموں میں اپنا فن پیش کیا اور مدراس میں کانگریس کی کامیابی کے لئے کوشاں رہی اس کو خدشہ ہے کہ ڈی ایم کے پارٹی ہندی اور ہندی فلموں کی توسیع میں کہیں رکاوٹ نہ بن جائے۔

راجیندرن جو ایک اور مدراسی اداکار ہے اور ہندی مخالف ایجی ٹیشن میں پچھلے دنوں گرفتار بھی ہوا تھا۔ وہ مدراس اسمبلی میں ڈی ایم کے پارٹی کا ایک ممتاز رکن ہے۔

لوک سبھا میں بھی کچھ فلم شخصیتیں منظر عام پر آگئی ہیں۔ راجستھان کا باڑمیر جو ملک کا بہت ہی پسماندہ علاقہ ہے، وہاں سے فلم ساز بی کے آدرش کے چھوٹے بھائی مسٹر امرت ناہٹا کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے ہیں۔

ایک فلمی جریدے میں اظہار خیال کرتے ہوئے امرت ناہٹا نے موجودہ ہندی فلموں کے خلاف بہت زہرافشانیاں کی ہیں۔ یاد رہے کہ ناہٹا صاحب نے ایک کامیاب ہندی فلم ... گیانیفوز اپنی سیاسی زندگی شروع کرنے سے قبل تیار کی تھی۔ بر سبیل تذکرہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آدرش صاحب اپنی بیوی ... جو فلم 'سپائی ان روم' (روم کا جاسوس) میں آرہی ہے کے جسم کی نمائش کر رہے ہیں۔

فلم کے ممتاز اشخاص جو لوک سبھا میں وارد ہوئے ان میں فلمی جریدے 'مدر انڈیا' کے مدیر مسٹر بابو راؤ پٹیل بھی ہیں۔ جنھوں



گلیمر اداکارہ سادھنا
جو آج کل زبان زد خاص و عام ہو رہی ہے

نے کئی ہندی فلمیں تیار کیں جو باکس آفس کامیابی حاصل نہ کرسکیں۔ اس سے بابوراؤ پٹیل میں یاس پسندی آگئی ہے ان حالات میں ان سے ہندی فلموں کی توسیع کے لئے کچھ امیدیں نہیں وابستہ کی جاسکیں۔

شاید بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب ڈی پی مشرا بھی ایک فلمی شخصیت رہ چکے ہیں۔ آدرش چترا کی فلم 'دھواں دھار' (جس میں اداکارہ لیلا چٹنس نے اچھی اداکاری پیش کی) میں سکرین پلے اور مکالمے مشرا صاحب کے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ 'آدرش پتنی' کی کہانی بھی انہی کی لکھی ہوئی ہے۔ موجودہ دو فلمیں سیٹھ گووند داس ممبر پارلیمنٹ نے تیار کی تھیں۔

ان لوگوں سے اب تک تو ملک کی فلم صنعت کو نقصان ہی ہوا ہے۔ آگے خدا مالک ہے۔

مقالہ

کھیل کھیلو

بسنت چٹرجی

مگر قسمت کو بالائے طاق رکھ کر

تقریباً سبھی لوگ اپنے بیشتر کاموں کا آغاز
غلط طریقے سے کرتے ہیں۔ ہم
ں سے اکثر جب ۱۸ سے ۲۵ سال کی عمر
کے درمیان پہلے پہل کام پر جاتے ہیں تو
یعت میں کھیل کود کا رجحان عروج پر ہوتا
ہے۔ تب کام میں ہمارا دل نہیں لگتا۔ ہمیں یہ
وس ہوتا ہے کہ ہمارے کھیل کود کے
ن اچانک ختم ہو گئے اور اب تمام عمر چکی
ا ہمارے نصیب میں رہ گیا ہے۔ یہ خیال
ے بڑی بھاری غلطی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو کام بھی
۔گی کا ایک کھیل ہی ہے، اسے بھی کھیل
طرح دلچسپ اور حوصلہ افزا بنایا جا سکتا
ہے۔ جس طرح پہلوان اپنے کام کو کھیل
نکل دیتا ہے، بالکل اسی طرح ہم بھی
نے کام کو کھیل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔
ں اپنے کام سے اسی طرح لطف اندوز
ا چاہیئے جیسے ہم کھیل سے ہوتے ہیں۔

کام اور کھیل میں کئی طرح سے یکسانیت
کی جا سکتی ہے۔ جس طرح کھیل میں
تانہ مقابلے بازی ہوتی ہے۔ اسی طرح
اور کاروبار میں بھی لگاتار مقابلہ رہتا
۔۔ آپ کھیل میں مقابلہ کرتے ہیں، ساتھ
اون بھی دیتے ہیں۔ کبھی آپ اکیلے
. ہیں اور کبھی مل کر۔ ٹھیک اسی طرح آپ
ے کام میں دوسروں کا مقابلہ بھی کرتے
ور اپنے ساتھیوں کو تعاون بھی دیتے
کھیل میں آپ کا مقصد جیتنا ہوتا ہے

کام میں بھی آپ کا مقصد پہلا انعام حاصل کرنا اور اپنے افسروں کا منظور نظر بننا ہونا چاہیئے نہ کہ بے دل، کم ہمت اور کام چور۔

ہر صبح پہلی کِک کے ساتھ کام شروع ہو جانا چاہیئے اور شام کو گول گن لئے جائیں۔ آپ ہر روز اپنے پائنٹ یا گول گن لیجئے اور دیکھئے کہ آپ کا کام کیسا رہا؟ کھیل کے برعکس کام سے متعلق کھیل میں آپ جب چاہیں اپنا گروپ یا ٹیم بنا سکتے ہیں۔ کھیل میں آپ کی ٹیم ہار رہی ہو تو بھی آپ کو اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ لیکن کام کے کھیل میں آپ ہمیشہ جیتنے والی ٹیم یا گروپ کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے ہوئے ہمیشہ جیتنے والے گروپ یا ٹیم پر نگاہ رکھیں، خاص طور پر اس فرد پر جو بلندی پر پہنچ رہا ہو، جو کامیابی کا انعامی کپ حاصل کرنے والا ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ قابل تقلید ہوتا ہے۔ آپ خود بھی اچھے کھلاڑی بنئے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیجئے

یہ درست ہے کہ سب ہی کام ایک جیسے دلچسپ نہیں ہوتے۔ لیکن عام حالتوں میں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کام کے دلچسپ نہ ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ملازم کو کام کے سبھی معاملوں اور پہلوؤں سے واقفیت نہیں ہوتی، یا وہ نا تجربہ کار ہوتا ہے۔

جب کوئی انسان اپنے کام کو بہتر طور پر انجام نہ دے پا رہا ہو تو اس صورت

"زندگی خود میں ایک کھیل ہے۔ ہمیں اُسے اسی نظریئے کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے اور زندگی کو بڑی دانشمندی اور فراخدلی سے گزارنا چاہیئے"

میں وہ کام اسے دلچسپ نہیں لگتا ہے۔ لہٰذا کام سے لطف اٹھانے کے لئے اس میں مناسب مہارت لازمی ہے۔ یہی بات کھیل پر بھی صادق آتی ہے آخر یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ کھیل سے لطف حاصل کرنے کے لئے کھیل کی واقفیت ہونا ضروری ہے جس کھیل کی سمجھ ہی نہ ہو، اس میں کیا مزہ؟

بہت سے لوگ کام کے ہمیشہ ایک ہی طرح کے ہونے کی شکایت کرتے ہیں اور ہر سال کام بدلنے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ چند ایک حالتوں میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن درحقیقت کوئی کام سدا ایک جیسا نہیں ہوتا، اس میں کئی پہلو ہوتے ہیں، نشیب و فراز اور تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آخر کھیل بھی تو سدا ایک جیسا نہیں چلتا مثال کے طور پر ہاکی یا فٹ بال میں لگاتار وہی سرگرمی اور وہی بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی کھلاڑی کبھی اکتاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ وجہ یہی ہے کہ کھیل میں ایک متعین نشانہ ہوتا ہے۔ جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ ساری بھاگ دوڑ اور تگ و دو کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کام میں بھی ایک منزل مقصود سامنے رہے تو اس کا بظاہر یک رنگ ہونا کبھی بارِ گراں یا بیزاری کا باعث ثابت نہیں ہو سکتا۔

تاہم اگر آپ کو ہر روز بار بار ایک ہی قسم کا کام کرنا پڑتا ہو تو آپ اس کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے غور کریں۔ آپ سوچیں کہ پچھلے ہفتے آپ سے کتنی غلطیاں ہوئیں یا پھر کون کون سی خاص کامیابیاں آپ کو حاصل نہیں ہو پائیں۔ اس انداز سے غور کرنے پر کام کے کئی پوشیدہ پہلو آپ کے سامنے آئیں گے۔

اور آپ یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ اُوپر سے خشک اور غیر دلچسپ نظر آنے والا ہر ایک کام بھی اپنے اندر کتنی دلچسپیاں لئے ہوئے ہے۔ اگر آپ اپنے کام میں تھوڑا سا بھی سدھار کر سکیں تو اس سے آپ کو اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی کہ ہاکی یا فٹ بال میں گول کرنے سے ہوتی ہے۔ گول کرنا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے، جس سے مراد ہے اپنی منزلِ مقصود یا نصب العین کو حاصل کرنا۔

زندگی خود میں ایک کھیل ہے۔ ہمیں اسے اسی نظریئے کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے اور زندگی کو بڑی دانشمندی اور فراخ دلی سے گزارنا چاہیئے۔ ہمیں اسے شروع سے آخر تک کھیلتے رہنا چاہیئے اور اس کے جو اصول ہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی منزل مقصود پر نگاہ رکھنی چاہیئے اور اس کے دوران ہونے والی کامیابیوں یا ناکامیوں کو زیادہ اہمیت یا وقعت نہیں دینی چاہیئے۔

کسی انگریز شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔
آپ کے بعد لوگ یہ نہیں دیکھیں گے کہ آپ نے زندگی کے کھیل میں کیا جیتا اور کیا ہارا بلکہ وہ یہ دیکھیں گے کہ آپ نے یہ کھیل کس طرح کھیلا!



لب و رخسار کا رنگ

کبھی اقرار کی جھلکی کبھی انکار کا رنگ
آج تک میں نہ سمجھ پایا ترے پیار کا رنگ

سر پر نہ پھرا کیجئے گلیوں گلیوں ،
اس کڑی دھوپ میں جل جائے گا رخسار کا رنگ

شاخ در شاخ مہکتے ہوئے گلہائے طرب
زندگی جھوم اٹھی دیکھ کے گلزار کا رنگ

نہ کہیں خون کے چھینٹے نہ تو آہوں کا ہجوم
اب کے کچھ اور ہی دیکھا رسن و دار کا رنگ

جب بھی پڑ جاتا ہے شوخی پہ حیا کا سایہ
اور کھل جاتا ہے ان کے لب و رخسار کا رنگ

منہ کہاں جا کے چھپائے میری تیرہ بختی
دل کے ہر گوشے میں پھیلا ہے ترے پیار کا رنگ

کتنی خودداریاں بکتے ہوئے دیکھیں میں نے
وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے کردار کا رنگ

نعرۂ حق ہی نکلتا ہے سر دار و رسن
تم نے دیکھا ہی نہیں جرأت و اظہار کا رنگ

ٹوٹے پڑتے ہیں خریدار جنوں کے اختر
آپ بھی دیکھ لیں چل کر ذرا بازار کا رنگ

—— سلطان اختر سہرامی

آپ کے مسائل

کیا 'بیوٹی کلینک' میں چیچک کے داغوں کا علاج بھی ہوتا ہے؟

— کُسم گپتا، میرٹھ

● بیوٹی کلینک میں صرف معمولی داغوں کا ہی علاج ممکن ہے گہرے داغ نہیں مٹائے جا سکتے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے — پلاسٹک سرجری۔ چیچک کے داغوں کی سرجری میں کئی چھوٹے چھوٹے آپریشن کرانے ہوتے ہیں اور یہ علاج کچھ تکلیف دہ اور خرچیلا ہے۔ کسی بھی سرجن سے آپ کو اِس بارے میں پوری معلومات مل سکتی ہیں۔

●

میں بارہویں کلاس کا طالب علم ہوں اور ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں کا رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ اگرچہ ابھی کوئی باقاعدہ رسم نہیں ہوئی۔

ہم دونوں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں جس کے لئے مجھے آٹھ سال کی مدّت درکار ہے۔

میری محبوبہ اس وقت دسویں جماعت میں ہے۔ لڑکی کے والدین جلدی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کے لئے بھی تیار ہیں کہ کسی دوسری جگہ اپنی لڑکی کی شادی کر دیں۔ مگر میری والدہ جلدی شادی کر دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ پہلے مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہیں بعد میں دولہا۔ بتائیے میں کیا کروں؟

— ا۔ ب۔ ج، بھیل واڑہ

● گھبرائیں نہیں۔ اپنی محبوبہ سے مشورہ کریں۔ اگر وہ آٹھ سال تک آپ کا انتظار کر سکے تو اس کے والدین بھی مجبور نہیں کریں گے۔ مگر یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اس لڑکی کو بھی آپ سے محبّت ہو۔

●

میں ۲۸ برس کا شادی شدہ جوان ہوں۔ شادی سے پہلے میرا پھلوں کا روبار تھا۔ سسر صاحب نے ٹائروں کی دُکان کھول دینے کا وعدہ کیا تھا جو انہوں نے پورا نہیں کیا۔ اب میں پانچ چھ روپے یومیہ آمدنی والے پھلوں کے کاروبار کو چھوڑ کر دو روپے والا میکینک کا کام کرنے پر مجبور ہوں کیوں کہ سسر صاحب کے حکم پر اپنا پہلا کاروبار ختم کر چکا ہوں۔

— کلیان، بمبئی

● آپ کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ آپ نے شادی کے لئے اپنے سسر صاحب سے کاروباری سودا کیا اور دوسری یہ کہ ٹائروں کی دُکان حاصل کئے بغیر آپ نے اپنا جما ہوا کام چھوڑ دیا۔ اب آپ کو چاہئے کہ نہ تو سسر صاحب کے پیسے پر نگاہ رکھیں اور نہ ان کی صلاح پر ہی دھیان دیں بلکہ کوشش کر کے اپنا پہلا کاروبار جمانے کی کوشش کریں۔ یہی آپ کے لئے بہتر حالات کا پیش خیمہ ہوگا۔ اس سے آپ کی خودداری کو بھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔

جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ لگا اور پتہ لکھا لفافہ ضرور بھیجئے — ایڈیٹر

سید شہنشاہ حسین

پنچھی ایک ڈال کے

سارے برگد پر سناٹا چھا گیا، ایک ایک کر کے سب چڑیاں وہاں سے کھسک گئیں۔ صرف کالا منہ کئے سیانا سر جھکائے وہاں بیٹھا رہا، اکیلا، تنہا۔ آج سب نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

ایک تھا کوا۔ سب اس کو 'سیانا' کہتے تھے۔ وہ بڑا چالاک تھا۔ اس لئے کبھی بھوکا نہیں رہتا تھا۔ اگر اسے اتفاق سے کسی دن کچھ نہ ملتا تو کسی چڑیا کے انڈے یا بچے چھپ کر کھا جاتا اور کسی کو اِس کا پتہ بھی نہ چلتا۔ بے چاری چڑیا رو پیٹ کر بیٹھ رہتی۔

ایک دن سیانے نے ایک طوطے کے انڈے کھا لئے۔ طوطے نے ٹائیں ٹائیں کر کے ایسا ہلڑ مچایا کہ بہت سی چڑیاں اکٹھی ہو گئیں۔ سیانا بھی اپنی چونچ صاف کر کے کائیں کائیں کرتا ہوا آپہنچا اور بھولا بن کر پوچھنے لگا "کون تھا، کون تھا؟ اگر میرے ہاتھ لگ جائے تو اسے کچا چبا جاؤں۔"

طوطا گردن ٹیڑھی کئے ایک آنکھ سے سیانے اور دوسری آنکھ سے چڑیوں کی طرف دیکھ کر بولا، "تم سب اگر میرا کہنا مانو تو اس طرح کی چوریاں بند ہو جائیں۔"

مینا بیگم بولیں "فرمائیے۔ فرمائیے۔ بھائی طوطا رام، کیا رائے ہے آپ کی اس میں؟"

طوطے نے کہا "میں ابھی کچھ نہ کہوں گا۔ نہیں تو ہم میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ جنگل کی سب چڑیاں اکٹھا ہوں، تب سب کے سامنے دل کی بات رکھوں گا۔"

بگلا بھگت، جو ایک ٹانگ پر کھڑا تھا، کہنے لگا "یہ مورکھ گوریا بہت بکتی ہے۔ کتنی بار چوں چوں کر کے اس نے میری تپسیا بھنگ کی ہے۔ اپنی پھرتی پر اِسے بڑا گھمنڈ ہے۔ اسی کو چپراسی بنایا جائے۔"

'بیری'، جس کا چیل سے ناتا ہے، اور کبوتر سے بیر، کہنے لگا "یہ کام کبوتر اچھا کرے گا۔" مگر بہت سی چڑیوں نے بگلا بھگت کی رائے مانی اور یہ طے پایا کہ جنگل کی سب چھوٹی بڑی چڑیوں کو گوریا جا کر کل سامنے والے برگد کے پیڑ پر اکٹھا ہونے کی اطلاع دے۔ ضرور ضرور سب چڑیاں آجائیں۔"

برگد کے پیڑ پر جنگل کی سب چڑیاں جمع ہوئیں اور بڑی سنجیدگی سے یہ معاملہ زیرِ بحث آیا کہ سب مِل کر اپنا ایک راجہ چُن لیں تاکہ سب کے گھونسلوں کی حفاظت کا مناسب انتظام ہو جائے۔

دوسرے دن سورج ڈوبنے سے پہلے ہی دور دور کی چڑیاں آنا شروع ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد طوطا بھی آ پہنچا اور بولا۔

"بھائیو اور بہنو! آپ سب کو آج اس لئے تکلیف دی ہے کہ کوئی مورکھ سیے بیر گھات لگا کر ہمارے گھونسلوں کو اُجاڑ دیتا ہے۔ ہم سب ایسے سیدھے ہیں کہ کوئی کھوج نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ جیسے چوپاؤں کا راجہ شیر ہے، ہم پنچھیوں کا کوئی راجہ نہیں۔ ہم میں ایکا بھی نہیں۔ سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ میں نے مہا پنچایت اس لئے بلائی ہے کہ ہم سب مل کر اپنا ایک راجہ چُن لیں۔ وہ ہمارے گھونسلوں کی دیکھ بھال کا کوئی نہ کوئی انتظام ضرور کر دے گا۔"

بہت سی چڑیوں نے اپنے پَروں کو پھڑپھڑا کر تالیاں بجائیں اور پھر سب چڑیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب سے پہلے گوریا پھُدک پھُدک کر کئی چڑیوں کے پاس کچھ کہنے گئی۔ مگر کسی نے اس کی بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بگلے نے تو اپنی لمبی چونچ سے اس کے ایک ٹھونگ بھی ماردی۔ وہ سب سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے رانی بنا دو۔ آج کل چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ اور عورتیں کیا راج نہیں کرتیں؟ میں تو آدمیوں تک سے نہیں ڈرتی۔ اُن کے گھروں میں بے دھڑک رہتی ہوں۔ اُن کے مکانوں کی چھتیں کھود کر اپنا گھونسلا بنا لیتی ہوں۔ آنکھ بچی اور ان کی چیزیں کھا گئی۔ میں اتنی تیز ہوں کہ وہ مجھ سے عاجز ہیں، مگر میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

مینا بیگم نے چپکے سے طوطے کے کان میں کہا "بھائی طوطا رام میں سمجھتی ہوں، آپ سے بہتر کوئی راجہ نہ ہوگا۔ آپ تو آدمیوں کی بولی مجھ سے اچھی بول سکتے ہیں۔ آپ کسی کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ میں آپ کو راجہ بنانے کے لئے کہتی ہوں۔ مگر یہ وعدہ کیجئے کہ مجھے اپنا وزیرِ اعلیٰ بنا لیجئے گا۔ آج کل تو عورتیں بھی منتری ہوتی ہیں۔"

طوطے نے جواب دیا "خوب، مینا بیگم۔ مجھے تم سے یہی آشا تھی۔ سب پنچھیوں سے فوراً مل کر میرے راجہ بننے کے لئے کوشش کرو۔"

سیانا اچکتا ہوا چیل کے پاس پہنچا اور کہنے لگا "چیل بیگم، معاف کرنا میں اس روز آپ کا شکار آپ سے چھین لے گیا تھا۔ وہ تو میں نے دل لگی میں اپنی پھُرتی دکھائی تھی۔ اور پھر حکومت کرنے میں دوستی دشمنی کیسی؟ ہم سمجھ دار لیڈر تو جیسا موقع ہوتا ہے ویسی بات کرتے ہیں۔ آیئے میل کریں۔ آپ مجھے راجہ بنانے کی سفارش کیجئے۔ طوطا رام کی طرح اپنے منہ کیا میاں مٹھو بنوں۔"

چیل جل کر بولی "دور ہو۔ موئے لفنگے۔ تو کالا کلوٹا کیا حکومت کرے گا۔ میں خود کیوں نہ اپنے لئے کوشش کروں۔ میں چڑیوں میں بڑی ہوں۔ دیکھ میری آنکھیں کتنی تیز ہیں۔ کتنی دور سے آسمان پر اُڑتے اُڑتے ایک چوہیا تک کو گھاس میں رینگتے دیکھ سکتی ہوں۔ میرے مضبوط پنجوں کو دیکھ۔ مجھ سے اچھا کون چور پکڑنے والا ہو سکتا ہے؟"

سیانا بولا "اچھا یوں ہی سہی۔ آج کل تو سب کچھ ہو سکتا ہے، اگر کہیں آپ رانی بنا دی جائیں تو مجھے نہ بھولئے گا۔ مجھے کم سے کم کوتوال تو آپ بنا ہی دیں گی میں اُسی نوکری میں اپنا پیٹ پال کر بڑی شان سے رہوں گا۔ عقل ہونی چاہیے۔ عقل!"



زیادہ بکنے والوں کی طرح اس کے منہ سے یہ بھی نکل گیا "میں نے کچھ بڈھے آدمیوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ چور اگر کوتوال ہو جائے تو شہر بھر میں پھر چوری نہیں ہو سکتی۔"

چیل نے پلٹ کر سیانے کی طرف دیکھا اور بولی "کہیں تو ہی دغا باز تو انڈے نہیں چُراتا ہے؟"

سیانے نے خوشامد کرتے ہوئے کہا "یہ نہ کہئے چیل بیگم۔ میں اور چور، ایسی بات کسی سے کہئے گا بھی نہیں۔ آپ کو سب اُلّو بنائیں گے۔"

اُلّو میاں نے اپنا نام سن کر اور یہ سمجھ کر کہ چیل اور سیانا اس کو راجہ بنانے کی سوچ رہے ہیں، ایک قہقہہ لگایا اور بولا "مجھے یقین تھا کہ تم لوگ میرا خیال ضرور کرو گے۔ پھر ہم میں اور تم میں جھگڑا بھی کیسا؟ میں تو رات کو شکار کرتا ہوں اور تم لوگ دن کو۔ میں اندھیرے میں دور تک دیکھ سکتا ہوں اور آج کل جنگل میں کیا اندھیر مچا ہے؟ میں اور چڑیوں کی طرح کسی کو ایک آنکھ سے نہیں دیکھتا۔ میری تو یہ آنکھیں، آدمیوں کی آنکھوں کی طرح منہ کے سامنے ہی ہیں نہ کہ اور چڑیوں کی طرح سر کے اِدھر اُدھر، پہلو میں۔ مجھے خود کہنا نہ چاہئے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میری شکل بہت سے آدمیوں سے ملتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ کچھ آدمیوں کو بھی کہتے سُنا ہے کہ فلاں فلاں حکومت کرنے والا بڑا اُلّو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بھائی چمگادڑ سنگھ، اُلٹی کھوپڑی کے ہوتے ہوئے بھی مجھے ضرور ووٹ دیں گے۔"

چمگادڑ بولا "واہ اُلّو بھائی، ہمیشہ اپنی ہی سوچتے ہو۔ کبھی کچھ ہماری بھی سوچی؟ میں خود راجہ کیوں نہ بنوں؟

میرے تو منہ میں دانت بھی ہیں۔ کتنی چڑیوں کے منہ میں دانت ہوتے ہیں جو میرا مقابلہ کریں گی؟ میرے بچے، آدمیوں کے بچوں کی طرح بغیر انڈے کے پیدا ہوتے ہیں اور اپنی ماں کا دودھ بھی پیتے ہیں۔ میری آنکھیں کمزور سہی، پھر بھی میں کسی چیز سے نہیں ٹکراتا۔ میں تو اتنا چپکے چپکے اُڑتا ہوں کہ چور کو پتہ ہی نہ چلے اور میں اُسے پکڑ لوں گا۔"

اور پھر محفل اگلی شام تک ملتوی ہو گئی۔

سب چڑیاں جلدی جلدی اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑنے لگیں۔

صبح پَو پھٹنے سے پہلے ہی اُلّو اپنے درخت پر آ بیٹھا اور پچھلے دن کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد چمگادڑ بھی آ کر، پاس ہی کی ایک شاخ سے لٹک گیا۔

اُلّو نے کہا "چمگادڑ سنگھ، ابھی تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی ہے۔ تم ابھی سے سو جاؤ گے؟ تم نے میری کل کی باتوں پر بھی کچھ غور کیا؟ میں تو جتنا سوچتا ہوں، مجھے اپنے سے اچھا کوئی بھی حکومت کرنے والا نہیں دکھائی پڑتا۔"

"بھائی اُلّو میاں، میں تمہاری مدد ہی کیا کر سکتا ہوں؟ مجھے کتنی چڑیاں جانتی ہیں؟ اور رات کی چڑیاں ہیں کتنی جو ہمارا ساتھ دیں گی؟"

"سنو چمگادڑ سنگھ۔ تمہیں تو میرا ساتھ دینا ہی ہوگا۔ ہم سب جب ایک ہی جنگل میں رہتے ہیں تو یہ رات کی چڑیاں اور دن کی چڑیاں کیا معنی؟ جنگل کے ٹکڑے تو کئے جا نہیں سکتے۔ میرا خیال ہے کہ جو سب سے مناسب ہو اُسی کو چُنا جائے۔ میں اپنی تعریف بار بار نہیں کرتا۔ کل بتا ہی چکا ہوں۔ مجھ سے مناسب اور کون ہو سکتا ہے؟"

"میں کیا جانوں کون مناسب ہے کون نہیں۔ دیکھو میاں اُلّو، لالچ نہ کرو۔ جو سب کی رائے ہوگی وہی ہوگا۔ مجھے اب سونے دو۔ آج دن بھر میری طبیعت بگڑی بگڑی رہی ہے۔"

ابھی جنگل میں ٹھیک سے روشنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ مُرغے میاں نے اذان دینا شروع کر دی، جس کو سن کر تیتر نے "سبحان تیری قدرت" کے نعرے لگائے۔ پھر دونوں کچھ چُر چُگ کر، دوڑتے ہوئے مور کے پاس گئے۔ مُرغ بولا "ہم دونوں آپ کی خدمت میں یہ کہنے آئے ہیں کہ ہم تینوں اُن چڑیوں میں ہیں جو زیادہ دور تک اُڑ نہیں سکتیں۔ ہم میں پھوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ یوں تو شتر مُرغ اس طرح کی اور سب سے بڑی چڑیا ہے۔ مگر وہ بدلیشو ہے۔ اس کو کیوں چُنا جائے۔ کچھ بے وقوف چڑیوں کا خیال ہے کہ اس کو بلایا جائے۔ وہ ہم سے اچھا راج کرے گا۔ مگر یہ غلط ہے۔ وہ تو جہاں کسی چیز کا ڈر ہوا، اپنا منہ ریت میں چھپا کر سمجھتا ہے کہ جس خطرے کو نہ دیکھیں وہ ہے ہی نہیں۔ یہ کیا دور اندیشی ہوئی؟

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ اُڑنے والی چڑیوں ہی میں سے کوئی راجہ چُنا جائے گا کیوں کہ ان کی تعداد سے زیادہ ہے۔ مگر ہم میں سے کسی کو منتری ضرور ہو جانا چاہئے۔ اب یہ سوال ہے، کون ہو؟"

مور نے بات کاٹ کر کہا "مجھ سے اچھا کون ہو سکتا ہے؟ دیکھتے نہیں ہو میرے رنگ برنگے پنکھ۔ ایسی شان دار اور کون چڑیا ہے؟ اور ہے بھلا کوئی جو میری طرح ناچ سکے؟ اور میری بہادری دیکھو، سانپ تک سے نہیں ڈرتا۔"

مرغے میاں بولے "میں تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ آپ پوری طرح سے میری مدد کریں گے۔ آپ ناچ رنگ میں پڑے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنی لمبی دُم ہی سنبھالنے سے کب فرصت ہوگی جو راج کے کام سنبھالئے گا؟"

مور جھلّا کر بولا "اذان دینا کیا آ گیا کہ بڑے قابل فاضل بن گئے۔ تم منتری ہو کر کیا کام کرو گے؟ تم اپنے عزیزوں سے ہر وقت دو دو چونچیں لڑانے سے کب فرصت؟"

یہ سُن کر مُرغے میاں کو بھی غصّہ آ گیا اور وہ بولا

"میرے پَردادا کو اُن کے پَردادا نے بتایا تھا کہ اِسی
یش کے کم سے کم دو بادشاہوں نے ناچ رنگ میں
پڑ کر اپنی سلطنت گنوادی ۔ رہا تمہارا یہ رنگین لباس،
اُس کی قدر آج کل کہاں ؟ اب تو جتنا سادہ لباس
ہو اُتنا ہی اچھا ۔ بلکہ میلا کچیلا بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔"
تیتر نے مُرغے میاں کی رنگین دُم پر نظر جما کر کہا
"ب تو آپ دوسروں کی بجائے میں خود ہی کیوں نا ...؟"
مُرغ نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ کر کہا
"او بیٹا ۔ گھبرا نہیں اگر میں منتری ہو گیا تو تجھے اپنا
ڑا منشی بناؤں گا اور کچھ داؤں بھی ایسے سکھادوں گا
ہ تو اپنے سے ڈیوڑھے پر بھی بھاری پڑے گا ۔
نا باشی ۔ لگا تو ذرا دو چار لاتیں اِس گھمنڈی کے
ٹلین پٹھے پر ۔"

سیدھے سادے تیتر نے مُرغے میاں کے
ہنے میں آکر اُچک کر مور کے لات مار ہی تو دی مگر اُس
اثر مور پر کچھ نہ ہوا ۔ مُرغے میاں نے بھی گردن
ھلا کر مور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور لڑنے
تیار ہو گیا ۔ مور نے ایک ہی ٹھونگ رسید کی تھی کہ
غے میاں دُم دبا کر بھاگے ۔

سویرے ہی سیانا عقاب کے گھونسلے کی
ت روانہ ہو گیا ۔ وہاں پہنچ کر ادب سے دور بیٹھ
اور سلام کر کے بولا "سرکار، آپ نے تو اتنی اونچی
ی پر اپنا گھونسلا بنایا ہے کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے
ہری تو پھیپھڑی پھول گئی ۔"
عقاب تیوریاں چڑھا کر بولا "بیکار کی بکواس
کر ۔ جو کہنے آیا ہے جلدی سے کہہ ۔ مجھے شکار
نا ہے ۔ دیر ہو گئی اور دھوپ چڑھ گئی تو سب
ستی چڑ چُک کر چھپ جائیں گے ۔ پھر میں
کھاؤں گا ۔ تجھے ؟ اور سُن ۔ مجھ سے کوئی
ٹ بات کہی تو تیری خیریت نہیں ۔"
سیانا کانپتے ہوئے بولا "سرکار، میری
ہے کہ آپ سے جھوٹ بولوں ۔ میں تو آپ
کہنے آیا تھا کہ کل سب چڑیوں نے ایک
ایت کی تھی اور یہ سوچا جا رہا ہے کہ گھونسلوں
کی حفاظت کرنے کے لئے کس چڑیا کو راجہ چنا جائے۔"
"پھر کون چُنا گیا ؟" عقاب نے گرج کر پوچھا
"ابھی کوئی بھی نہیں ۔ سرکار ۔ شاید آج چُن لیا
جائے ۔ میں تو چپکا بیٹھا رہا ۔ گوریا، طوطا رام، چیل بیگم،
اُلّو میاں اور چمگادڑ سنگھ کا خیال تو کل ہی سب کو
معلوم ہو گیا ۔ اُن میں سے ہر ایک خود راج کرنا چاہتا
ہے ۔ آج جب میں حضور کے پاس آرہا تھا تو
مُرغے میاں اور مور میں اِسی بات پر لڑائی ہو رہی تھی
اور سرکار جب میں بڑا دریا پار کر رہا تھا تو مچھلیاں
کھانے والی چڑیاں پنچایت کر رہی تھیں ۔ نہ جانے
وہ اپنی ٹولی کی کس چڑیا کو چُنیں ۔ میں بھاگتا ہوا سرکار
سے سب حال کہنے چلا آیا ۔"
"تو یہ کہو ۔ راج کے لالچ میں تمہارے جنگل
میں پھوٹ پڑ گئی ہے ؟ ابھی کیا ہے ۔ اگر یہی حالت
رہی تو گانے والی چڑیاں، کیڑے کھانے والی چڑیاں،
گوشت کھانے والی چڑیاں، اناج کھانے والی اور
طرح طرح کی سب ہی چڑیاں اسی لالچ میں آکر اپنی
ٹولی سے راجہ بنوانے کی کوشش کریں گی اور آپس
کی پھوٹ سے تمہارا جنگل تباہ ہو جائے گا ۔"

سیانے نے اپنی چونچ زمین پر رگڑ کر کہا
"سرکار، آپ کے ہوتے ہوئے
کون راجہ ہو سکتا ہے ۔ کون چڑیا آپ سے زیادہ
طاقت ور ہے ۔ آپ کی نظر کتنی دور تک جاتی ہے ۔
آپ اپنے بڑے بڑے پر پھیلائے اور اپنی خوفناک
چونچ کھول کر، اپنے لوہے کے ایسے سخت پنجے
دکھاتے ہوئے اگر کسی چھوٹے موٹے چرپائے کیا،
کسی آدمی تک پر جھپٹیں تو وہ ڈر کر بھاگے ۔ سرکار،
میں پنجے جوڑ کر آپ سے کہتا ہوں، جنگل کا راج سنبھال
لیجئے ۔ اور ہاں سرکار، تب مجھ غریب کو نہ بھولئے گا ۔"
"اب کہی کم بخت تو نے اپنے دل کی بات ۔
اپنے تھوڑے سے فائدے کے لئے تو چاہتا ہے کہ
تیرے جنگل میں دوسرے کا راج ہو جائے ۔ تو بڑا
خود غرض ہے ۔ تجھ میں کچھ بھی غیرت نہیں ۔ تیسرا

گوشت اتنا خراب نہ ہوتا تو تجھے ابھی کھا جاتا۔ دیکھ، اس پہاڑی پر سے جتنا بھی دور تو دیکھ سکتا ہے، اس سے کہیں دور تک میں اُڑتا رہتا ہوں۔ اور اتنا اونچا کہ تو کیا، کوئی چڑیا بھی نہیں اُڑ سکتی۔ میں آزاد ہوں۔ نہ میری قوم نے کسی کی غلامی کی اور نہ میں کسی کو غلام بنانا چاہتا ہوں۔ تیرے جنگل میں رہ کر مجھے راج کرنے کا ذرا بھی لالچ نہیں۔

"غور سے سن۔ تیرے جنگل کی آپس کی لڑائی اگر بڑھی تو مجھے مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ پھر سب پچھتائیں گے۔ جا، ابھی جا، اور ایک ایک چڑیا کو بتا دے کہ راج کرنے کے دن گئے۔ جنگل سب کا ہے۔ سب آپس میں مل کر رہیں۔ گھونسلوں کی حفاظت کے لئے ایک ٹولی بنائی جا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو کس کی مجال کہ کسی کا گھر لوٹے۔"

سیانا ڈر سے کانپ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اوپر لعنت ملامت کر رہا تھا کہ یہ بلا اپنے ہاتھوں کیوں مول لی۔ عقاب نے جیسے ہی بات ختم کی سیانے نے اُڑنے کے لئے پر تولے شروع کئے۔ اتنے میں عقاب نے ڈانٹ کر کہا۔

"ٹھہر ذرا۔ تیری بات پر یقین کون کرے گا۔ پھر بھی سب چڑیوں تک میرا پیغام پہنچا دے۔ اور چیل، گدھ، بیری، شکرا یا اور جو کوئی بھی شکاری چڑیا ملے، سب کو میرے پاس بھیج دے۔ میں ان کو حکم دے دوں گا کہ وہ میری رائے پر عمل کرائیں اور جو چڑیا نہ مانے وہ مجھ سے نمٹنے کو تیار ہو جائے۔ چلا کہاں، یہ بھی سُن، کہ میرا حکم سب کو سنا کر تو جنگل سے فوراً نکل جا، اور پھر تیری صورت وہاں نہ دکھائی دے۔ تیری دغا بازی کی یہی سزا ہے۔ اگر تو نے میرا حکم نہیں مانا تو میں گدھ کو حکم دوں گا کہ تیری بوٹی بوٹی نوچ ڈالے۔ جا، دفع ہو۔ تیرا منہ کالا۔"

شام کو سب چڑیاں پرانے برگد پر جمع ہوئیں۔ ایک ایک چڑیا حیرت سے سیانے کا منہ تک رہی تھی۔ کوئی تعجب کرتی تھی، کوئی ہنستی تھی مگر اس کا منہ کالا ہو جانے سے سب ہی تو خوش۔ وہ بڑے غصّے میں ایک الگ شاخ پر پھولا بیٹھا۔ اس نے عقاب کا پیغام سب چڑیوں کو سنا دیا۔ کچھ چڑیوں نے کہا کہ "عقاب صاحب کون ہوتے ہیں جو ہمارے گھریلو معاملے میں دخل دیں۔" تو شکاری چڑیوں نے کہا "سیانا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم کو حکم ملا ہے کہ یہ دیکھیں کہ عقاب صاحب کی رائے پر ٹھیک سے عمل ہو۔ ورنہ آپ جانیں اور وہ۔"

پھر تو سارے برگد پر سناٹا چھا گیا۔ ایک ایک کر کے سب چڑیاں وہاں سے چپکے چپکے کھسکنے لگیں۔ جب صرف سیانا اور شکاری چڑیاں رہ گئیں تو سیانے نے گڑگڑا کر ان سے کہا۔

"میرا منہ تو کالا ہو چکا۔ کیا یہ سزا کافی نہیں؟"

گدھ نے کہا "ہم کچھ نہیں جانتے۔ تم آدھ گھنٹے کے اندر اس جنگل سے نکل جاؤ نہیں تو میں ابھی کھا جاؤں گا۔ میں بھوکا بھی ہوں۔ ایک موٹا مرا پڑا ہے۔ مجھے جلدی جانا ہے نہیں تو رات ہی گیدڑ اور لکڑ بگھے اسے صاف کر جائیں گے۔"

سیانے نے گدھ کو رشوت میں ہڈیوں کا ڈھیر دینے کو کہا جو اس نے چھپا کر رکھا تھا۔ گدھ نے کہا "تو ہی سوکھی ہڈیاں کھا۔ مجھے جب بڑھیا گوشت مل رہا ہے تو سوکھی ہڈیاں کیا کروں گا" ڈانٹ کر کہا "اب جاتا ہے کہ بھونک دوں میں چونچ تیرے پیٹ میں؟"

سیانا آہستہ آہستہ اُڑتا ہوا بڑی دور ایک پہاڑی جنگل میں پہنچا اور وہیں رہنے لگا۔ سیانے کی اولاد جو کوّے ہیں ان کا منہ ابھی تک کالا ہوتا ہے۔

ہاں، یہ تو لکھنا رہ ہی گیا کہ سیانے کے نکل جانے کے بعد اس جنگل کی کسی چڑیا کے انڈے نہیں چوری ہوئے اور سب چڑیاں ہنسی خوشی رہنے لگیں۔

[redacted]

نکتے کی بات

مسرت کی بات یہ ہے کہ اب ہمارے کھلاڑیوں
میں اتنی بالیدگی آگئی ہے کہ انھوں نے
س بات کا پتہ لگالیا کہ ملک ان سے کیا کیا امیدیں
البتہ کئے ہوئے ہے۔ کھلاڑیوں نے جو کارنمایاں
نجام دئے، اس کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی
منے آتی ہے کہ اگر انھیں مناسب مواقع دئے
جاتے تو وہ کچھ اور بھی ترقی کر دکھاتے۔ مگر
مخالفین جو انھیں ترقی کرتے نہیں دیکھنا چاہتے ان
کی ہمت شکنی کے لئے نئی نئی پریشانیاں اور الجھنیں
پیدا کررہے ہیں۔ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں
ہوگئی ہے کہ کھلاڑیوں میں تو ملک و قوم کا نام
اونچا کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن منتظمین
کھلاڑیوں کے تئیں اپنے نازیبا رویّے سے ان
کی ہمّت پست کرتے ہیں۔

کھلاڑیوں کے ساتھ انتظامیہ کا سلوک
بہت نازیبا ہے۔ قدم قدم پر انھیں ذلّت و
حقارت اور احساس کمتری کا شکار ہونا پڑا
مگر کھلاڑیوں کے ماتھے پر کبھی شکن تک نہ آئی۔



۲۶ سالہ پنجابی دیال سنگھ نے ۸۰۰ میٹر کی لمبی دوڑ میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا

بنکاک ایشیائی کھیلوں کی مثال ہمارے
دماغ سے نکل نہیں پارہی ہے۔ بھارتی دستہ
روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اس وقت کے وزیر
خزانہ جناب شچین چودھری نے ایک مشکل کھڑی
کردی۔ یعنی انھوں نے غیرملکی زرمبادلہ دینا
نامنظور کردیا۔ اگرچہ بعد میں جان توڑ کوشش کرکے
مطلوبہ چیز حاصل ہوئی مگر کھلاڑیوں کے توحوصلے
پہلے ہی پست ہوچکے تھے اور نتیجہ ظاہر ہے
کیا ہوا۔

اپنی نوعیت کا یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں
ہے۔ بلکہ کھیل کے میدان میں ایسی بہت سی
مثالیں مل جائیں گی۔ جب بھی کسی ٹیم کے باہر
جانے کا سوال اٹھتا ہے تو انتظامیہ کی طرف
سے خودساختہ پابندیاں اور مشکلات عائد
کردی جاتی ہیں۔

کھیل کی اس بدنظمی کو دور کرنے کے
لئے ابھی حال ہی میں بمبئی میں کچھ کوششیں ہوئیں
آل انڈیا کاؤنسل آف سپورٹس نے متفقہ طور پر
فیصلہ کیا ہے کہ کھلاڑیوں کے ۵۰ فیصد سفر خرچ
کی ذمہ داری سرکار کو مختلف قسم کے فنڈوں سے
پوری کرنی چاہیئے۔

یہ ۵۰ فیصدی کا فارمولا بہت سی کھیل
ایسوسی ایشنوں کے لئے مضر ہوسکتا ہے پھر بھی
اس کا ایک تابناک پہلو یہ بھی سامنے آیا ہے
کہ پہلی مرتبہ سپورٹس کاؤنسل نے براہِ راست
اپنا مطالبہ پیش کیا ہے۔ فارمولا قابلِ عمل رہےگا
یا نہیں اس کا فیصلہ تو بعد میں ہی ہوگا اب تو
سب کی توجہ ۱۹۶۸ میں ہونے والے المپک
کھیلوں پر مرکوز ہے۔

انڈین المپک ایسوسی ایشن نے اپنی تجویز
میں کہا ہے کہ کھیلوں کا معیار پہلے سے بہت
اونچا کردیا جائے تاکہ قابل، ذہین اور پختہ کار
کھلاڑی ہی بھارتی دستوں میں شامل ہوں۔
تجویز تو بہت معقول ہے کیوں کہ کھیل کے

میدان میں ہماری پلاننگ بہت کمزور
اور اسی کی وجہ سے ہمیں بسا اوقات
کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

سپورٹس کاؤنسل جس کا مطمعِ نظر
سوچیہ بناتا ہے وہ سرکار کی صلاح کار
ایسا کچھ نہیں ہے۔ اصل میں کاؤنسل وزارت
کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ ایک تنظیم یا ا
کو کتنے خرچ کی ضرورت ہے اور ٹیم
کے باہر بھیجنے میں کتنے کھلاڑی بھیجے
کام چل جائے گا۔ وزارت تعلیم بھی اس
تصفیہ نہیں کرسکتی اور معاملہ وزیر خزانہ
سونپ دیا جاتا ہے جو آخر وقت میں
کہہ کر جانے والے دستے کی آرزوؤں کو
کردیتا ہے۔

سپورٹس کاؤنسل کو حق خود اختیاری
سے کام نہیں چلے گا۔ کھلاڑیوں کی تند
و فنی استعداد و لیاقت کا اندازہ لگا لینے
بھی کام نہیں چل سکتا بلکہ ضرورت اس بات
ہے کہ جو ایجنسیاں کھیل کے میدان میں ا
کار گزاریاں پیش کرنے کے ڈھونگ رچا
ہیں ان کی اصلیت و ماہیت جانی جائے۔

سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ پور
ملک میں ایک تنظیم یا ادارے پر تمام ذمہ
ڈالی جائے، تاکہ جب کبھی کوئی غلط پہلو سا
آئے تو اس سے جواب طلبی تو کی جاسکے۔ با
تو بظاہر بہت برجستہ ہے مگر اس کو عملی شکل
میں لانا ذرا مشکل سا دکھائی دیتا ہے۔

کھیل ملک و قوم کا نام اونچا کرنے کا ایک
بہت عمدہ ذریعہ ہے۔ سرکار کو چاہیئے کہ و
اس طرف اپنی توجہ منعطف کرے ورنہ کھلاڑیو
کی فنی استعداد کا خاتمہ بالخیر ہوجائے گا۔ چمن
میں پھول کھلیں گے تو ان کی خوشبو سے سب
لوگ لطف اندوز ہوں گے۔ روشنی کو بند رکھنے
کیا ہوگا وہ تو تاریکی میں گھٹ کر ہی رہ جائے گی۔

دیال سنگھ

ملکھا سنگھ کے بعد کہا جانے لگا تھا کہ اب ...لیٹ کھلاڑیوں میں کوئی کھلاڑی اس قابل نہیں ہے ... بھارت کی نمائندگی کر سکے۔ مگر دیال سنگھ ...نے اس خیال کو چیلنج کیا۔ بنکاک میں ہوئے ...شیائی کھیلوں میں اس نے اپنے نام کی دھوم ...یا دی۔ دیال سنگھ ۲۶ سالہ ایک پنجابی جوان ہے ...س نے ۸۰۰ میٹر کی دوڑ جیت کر لوگوں کو ...ت بدنداں کر دیا۔ فوج کا یہ کھلاڑی ملک ...کر اندر بھی خراج تحسین پا رہا ہے۔

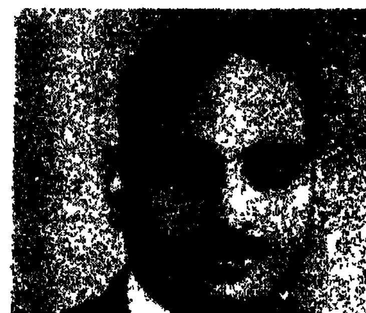
اشوک ملک

آج کل بھارت میں گولف کھیلنے کا رواج کافی ...م ہو رہا ہے اور جگہ جگہ اس کے مقابلے ہو رہے ...ں۔ رائل کلکتہ گولف کلب کی طرف سے جو حالیہ ...لف میچ ہوا اس کے تماشائیوں کی لیسٹ دیکھ کر ...ازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کھیل کتنا مقبول عام ...ا ہے۔ پیٹر تھامسن کے ساتھ ساتھ بھارتی ...لف کھلاڑی اشوک ملک نے بھی لوگوں پر ...ا سکہ جما دیا۔ اشوک ملک میں فنی استعداد ہے اس کے کھیل میں بالیدگی اور پختہ شعوری ہے۔ اس کے جسم میں غضب کی پھرتی۔ اس کی دیرینہ صلاحیتوں کے سبب ہی کچھ دن پیشتر اسے ارجن ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا جا چکا ہے۔

ٹھاکر کشن سنگھ

پولو کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ صرف راجاؤں، نوابوں تک ہی زندہ رہا مگر میجر ٹھاکر کشن سنگھ نے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر دکھایا ہے۔ میجر کشن سنگھ کو ۱۹۶۳ میں ارجن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور اب ان کا شمار ملک کے بہترین پولو کھلاڑیوں میں ہونے لگا ہے۔

پولو اگرچہ بہت خرچیلا اور شاہی کھیل ہے۔ ٹھاکر کشن سنگھ نے اسے از سر نو زندہ کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کھیل میں بھی دوسرے نوآزمودہ کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ان کی طرف دھیان دینے میں ملک کا مفاد مضمر ہے۔



ٹھاکر کشن سنگھ



اشوک ملک

سریتا

مضمون نگاروں کے لئے اطلاع

۱. سریتا میں کہانیاں، مضامین، ایک ایکٹ کے ڈرامے اور نظمیں وغیرہ ہر قسم کا مواد شائع کیا جاتا ہے۔

۲. کہانیاں نیا نقطۂ نظر لئے ہوئے، تعمیری، قوم، سماج، گھر اور ہر ایک فرد کی ترقی و سیرت کی تشکیل میں معاون ثابت ہونی چاہئیں۔ یاس پسندانہ سستے عشق معاشقے کی کہانیاں منظور نہیں کی جائینگی۔

۳. مضامین تعمیری پس منظر کے ہونے چاہیں۔ سب موضوعات میں نئے نظریئے کا استقبال کیا جائیگا لیکن ادبی بحث و مباحثہ کے مضامین کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔

۴. افسانے اور مضامین ۳۰۰۰ الفاظ سے زیادہ طویل نہ ہونے چاہئیں۔

۵. مضامین کاغذ کے ایک طرف حاشیہ چھوڑ کر لکھے ہونے چاہئیں۔ مضامین کے صاف ستھرے اور خوشخط نہ ہونے کی صورت میں ان پر غور نہیں کیا جائے گا۔ مضمون کے پہلے اور آخری صفحے پر مصنف کا پورا نام اور پتہ صاف لکھا ہونا چاہیئے۔

۶. ہر ایک مضمون کے ساتھ واپسی کے لئے ٹکٹ لگا اور پتہ لکھا لفافہ آنا چاہیئے۔ نہیں تو مضمون واپس نہیں کئے جائیں گے۔

۷. مصنفین جو بھی مضمون بھیجیں، اس کی نقل اپنے پاس رکھ لیں۔ اگرچہ مضامین کی پوری طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ پھر بھی ادارہ سریتا کسی مضمون کے گم ہونے یا کسی طرح نقصان پہنچنے کی صورت میں ذمہ دار نہ ہوگا۔

۸. ہر ایک منظور شدہ مضمون پر قدر و قیمت کے مطابق معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جو مضمون منظور ہوتے ہی بھیجدیا جاتا ہے

۹. ہر ایک منظور شدہ مضمون پر ادارہ سریتا کا پورا کاپی رائٹ ہوگا۔ مگر مصنفین کو اپنے مجموعے میں سریتا کا حوالہ دے کر شائع کرنے کی اجازت مل سکے گی۔

۱۰. ہر ایک مضمون کے ساتھ مصنف کا اپنا بیان آنا ضروری ہے کہ مضمون مصنف کا اپنا ہے، طبع زاد ہے اور پہلے کہیں کسی بھی صورت میں شائع نہیں ہوا

آپ کے خطوط

سرتیا کی شکل میں آپ ہر ماہ ایک زندگی بخش سوغات ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچا دیتے ہیں۔ کتنا بڑا کام ہے یہ۔ اب یہ حساب کون لگائے کہ سرتیا کی بدولت کتنوں نے اپنی کتنی کمیاں پوری کیں اور کتنی زیادتیوں کو تیاگا۔ اور اس طرح اپنی شخصیت کو پُرکشش بنایا۔ پرچہ مجموعی طور پر بہت اچھا لگا۔

— محمد یونس، پٹنہ۔

★

میری دلی خواہش ہے کہ بے خوفی اور سچائی کا علم بردار اور زندگی کے ہر پہلو کی سچی عکاسی کرنے والا سرتیا دن دونی رات چوگنی ترقی کے ساتھ ہمارے الجھے مسائل بہت خوبی سے سلجھا رہا ہے۔

— بیگم فہیم موسیٰ خاں، مدراس

★

سرتیا کے ذریعے آپ اردو کی جو خدمت کر رہے ہیں یہ آپ ہی کا کام ہے۔ سرتیا کا معیار ہمیشہ اصلاحی اور ادبی رہا ہے جس کے لئے آپ مبارکباد کے حق دار ہیں۔ آج کل ایک تو اردو رسالوں کی حالت خراب ہے اور بعض اگر چل نکلے تو ان میں محض فلمی یا نیم ادبی مواد شائع ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سرتیا نے اپنے اصلاحی ادب کا معیار ہمیشہ قائم رکھا۔

مجھے اُمید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ آئندہ بھی اس میں نئی نئی دلچسپیاں بڑھتی ہی رہیں گی۔

— تزئین نزہت، غازی پور

اپریل ۱۹۶۷ کا سرتیا نظر سے گزرا۔ اس بار سیاسی مقالے اور طنزیہ مضامین زیادہ تھے سرتیا کو سیاسیات سے دور رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ کیوں کہ ادب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ادبی رجحان والے سیاست سے دور رہتے ہیں۔

غزلیں اور نظمیں بھی پھیکی پھیکی رہیں۔ خدارا سرتیا کو سیاست کا اکھاڑا نہ بننے دیجئے۔ اور ادبی خدمت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کیجئے۔ سرتیا اردو ادب کا ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کے معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کیجئے تاکہ نئی نسلیں اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ — دل دار علی ہاشمی، بھاگلپور

طنز اپنے اندر اصلاح کی ایک بہت بڑی قوت رکھتا ہے۔ معاشرے میں جو خرابیاں اور برائیاں پیدا ہو رہی ہیں یا ہوتی رہی ہیں سرتیا نے ہمیشہ ان کے خلاف آواز بلند کی ہے ہم اپنے یقین کے مطابق ادب کی ہی خدمت کر رہے ہیں اور اس معاملے میں آپ کی ہر تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔ لیکن بہتر ہو اگر آپ کچھ زیادہ تخصیص کے ساتھ ہماری مدد فرمائیں۔ مثلاً آپ کو کون کون سے سیاسی و طنزیہ مضامین قابل اعتراض نظر آئے؟ — مدیر

★

سرتیا کی خدمات اور خلوص دل سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک و قوم اور زندگی و ادب کی صحت مند اور صالح اقدار کی بقا اور ترقی کے

سلہ آپ سریتا کے ذریعے بیش بہا خدمات سرانجام دیں گے۔

—— اکرام جاوید، حیدرآباد

★

مارچ کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اب تک میری نظر میں سریتا کی حیثیت ایک ہلکے پھلکے اور غیر معیاری رسالے سے زیادہ نہ تھی، مگر جنوری ۱۹۶۷ سے نہ جانے کیوں مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی اور حالیہ شمارے نے تو یہ ثابت کردکھایا ہے کہ سریتا کو اپنی انفرادیت میں جو خاص مقام حاصل ہے وہ دورِ حاضرہ کے شاید ہی کسی پرچے کو حاصل ہو۔

زیرِ نظر شمارے کے تمام مقالے معیاری ہیں۔ کہانیوں میں دو کناروں کے بیچ (ششی شنکر) تائی بشیرن (واجی اقبال) خاص طور پر بہت پسند آئیں۔ حصۂ نظم بھی کافی زور دار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سریتا نے اپنا معیار اسی طرح قائم رکھا تو یقیناً بہت جلد ادب میں اپنی مقبولیت کا واحد رسالہ ثابت ہوگا، اور اس سے تمام دنیا کے لوگ مستفید ہوں گے —— اطہر عزیز، ملک

★

مارچ ۱۹۶۷ کے سریتا میں ششی شنکر کی کہانی 'دو کناروں کے بیچ' کے ذریعے شاید آپ بھارتی مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انھیں اس ملک میں رہنا ہے تو پیش کردہ فارمولے کو قبول کرنا ہوگا۔ قلم کار اپنی تخلیق کے ذریعے عوام کے جذبات سے کھیلنا چاہتا ہے۔ اسے شاید یہ معلوم نہیں کہ اپنی مخلوط شادیوں کی ہونے والی اولاد کو ہندو، مسلمان، سکھ اور دوسرے مذہب کے لوگ بھی قبول کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔

—— اے ایم شکیل، شاہ آباد

★

مئی ۱۹۶۷ کا سریتا نظر نواز ہوا۔ اوشا راج، آر۔ کے بھورتی، وشوناتھ پربھاکر اور ڈی۔ سی گھوش کی کہانیاں —— طوفان بھرے ارمان، بہتی گنگا، نوری

اور سفر کے ساتھی بہت زیادہ پسند آئیں۔

قمر کاظمی نے اپنے فکر انگیز مقالے میں ایوب صاحب و پاکستان کا جو تجزیہ کیا ہے پڑھتے وقت چبھتا ضرور ہے مگر مجموعی طور پر ایک عمدہ تاثر پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی متوازن و منصفانہ تجزیہ ہے۔

آشا رانی ووہرہ کا ناری نکیتن مسلمان خواتین کے لئے اگرچہ ایک نئی چیز ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ یقیناً بارآور ثابت ہوا ہوگا۔ اس طرح کے مقالوں سے عورت جو احساسِ کمزوری کا شکار ہے، وہ معاشرے میں اپنا نمایاں مقام حاصل کرلے گی۔

مہدی پرتاپ گڑھی کی نظم 'زخموں کے چراغ' نے سماں باندھ دیا۔

—— خاموش فاروقی، بریلی

★

سریتا مئی اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سشیل کمار، ریتا چندر شیکھر اور وشوناتھ پربھاکر کی کہانیاں —— موتیوں کا بادشاہ، آسمانی پیامبر اور نوری پسند آئیں۔

آشارانی ووہرہ، زرینہ ثانی، برجیش کل شریشٹھ اور رادھا کرشن راجانی کے مقالے —— ناری نکیتن، پڑوس سے رشتے ناطے، بھولی بسری تاریخ کا ایک صفحہ اور آپ ہکلاتے ہیں، خاص طور پر پسند آئے۔

ہکلاہٹ والا مقالہ پڑھ کر تو میرے پڑوس میں رہنے والے ایک صاحب بہت خوش و مسرور نظر آتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے کی نسبت اب ان کی ہکلاہٹ بھی کم ہوگئی ہے۔ حصۂ نظم میں کافی ترقی ہوئی ہے۔

—— نجمہ پروین، اورنگ آباد

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟
ہمیں اپنی رائے لکھئے —— ایڈیٹر





اب میں اپنی سہیلیوں سے زیادہ اچھی نظر آتی ہوں
صافی کا شکریہ
SAFI
THE BLOOD PURIFIER
ہمدرد

ماہنامہ

سریتا

سماجی تعمیرِ نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر
وشوناتھ

● مالکان دِلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دلی کے لئے دِلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ اور دِلی پریس، نئی دِلی سے وشوناتھ نے طبع اور شائع کرایا۔

● مقام ادارت اور اشاعت: دِلی پریس، جھنڈے والاں سٹیٹ، رانی جھانسی روڈ، نئی دِلی ۵۵

قیمت

فی پرچہ	..	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ایک سال	..	۱۲ روپے
دو سال	..	۲۲ روپے
تاعمر	..	۱۵۰ روپے

غیر ممالک کے لئے

ایک سال	..	۱۶ روپے
دو سال	..	۳۰ روپے

۹۸ واں شمارہ — جولائی ۱۹۶۷

کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچر

اِمداد کے لئے

اب

زیادہ عطیے دیجئے

"یہ کوئی مقامی مسئلہ نہیں۔ یہ دکھ سبھی ہندوستانیوں کا ہے۔ میں آپ سے اپیل کرتی ہوں کہ اس مشکل وقت میں تن من دھن سے امداد دیں۔

جو لوگ پہلے عطیات دے چکے ہیں ان سے میری اپیل ہے کہ وہ اور امداد دیں۔ اور جنہوں نے اس سے پہلے مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا، انہیں چاہیئے کہ وہ کھلے دل سے کام لیں اور عطیے دیں۔ میں آپ سب سے فوری امداد کی اپیل کرتی ہوں۔"

پردھان منتری کا قوم کے نام نشری پیغام

پردھان منتری کے خشک سالی اِمدادی فنڈ میں دل کھول کر عطیے دیجئے

اس فنڈ میں بھیجی جانے والی رقموں پر منی آرڈر کمیشن اور دوسرے عطیات پر ڈاک محصول اور رجسٹری فیس نہیں دینی پڑتی۔ دوائیں کپڑے اور ڈبہ بند کھانوں جیسے عطیات ہوائی جہاز سے مفت بھیجے جا سکتے ہیں۔ ڈاک محصول ہوائی جہاز اور ریل کے بھاڑے آمدنی ٹیکس، ایکسائز اور کسٹم محصول میں بھی پہلے کی طرح رعایتیں دی جا رہی ہیں۔

پرائم منسٹرز ڈراؤٹ ریلیف فنڈ

کیبنٹ سیکرٹریٹ ، راشٹرپتی بھون ، نئی دہلی

سریتا اپنے احباب تک پہنچائیے

جی ہاں، آپ کے رشتے داروں اور جان کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے 'سریتا' آج تک نہ دیکھا ہے نہ پڑھا ہے۔ کیا آپ اُن کا اپنے محبوب رسالے سے تعارف کرانا پسند نہ کریں گے۔ آپ صرف نیچے دیا گیا کوپن بھر کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ہم اُن صاحب کی خدمت میں 'سریتا' کی ایک کاپی بطور نمونہ روانہ کر دیں گے۔

نمونے کی کاپی کا کوپن

کوپن بھیجنے والے کا نام ________________

پتہ ________________

نمونے کی کاپی پانے والے کا نام ________________

پتہ ________________

سریتا کا ہر پرچہ پوری جانچ پڑتال کے بعد ڈاک کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اِس لئے پرچہ گم ہو جانے کی صورت میں ادارے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے پر اگر پرچہ سٹاک میں موجود ہوا تو دوبارہ بھیج دیا جائے گا۔

اپنی رہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریداری نمبر کے ساتھ ہمیں فوراً دیجئے تاکہ سریتا آپ کو وقت پر مل سکے۔

مضمون نگاروں سے

"سریتا" میں لکھنے والے کرم فرماؤں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مسودہ بھیجتے وقت ٹکٹ لگا اور پتہ لکھا لفافہ بھیجنا نہ بھولیں یہاں کی عدم موجودگی میں مسودہ واپس نہیں بھیجا جائے گا اور نہ ادارہ "سریتا" پر مسودہ تلف ہونے کی کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

—— ایڈیٹر



ماں کا پیار بھرا تحفہ ...
یہ کھانا پکانے کے بہترین وسیلے
کوٹوجم وناسپتی سے تیار کیا گیا ہے۔
وٹامن
اے اور ڈی سے
بھرپور
MODI VANASPATI MFG. COMPANY MODINAGAR (U.P.

موجِ سرِیتا

صدرِ جمہوریہ ذاکر حسین نے بہار کے قحط زدہ علاقوں کا دَورہ کرتے ہوئے ایک جلسے میں کہا کہ قحط اور خشک سالی کی یہ مصیبتیں خدا کی طرف سے سزائیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن لوگ اگر چاہیں تو اپنی کوششوں سے اِنہیں نعمت بھی بنا سکتے ہیں۔

مصیبت کو صبر و استقلال کی آزمائش سمجھ کر اِس میں پورا اُترنے کی کوشش کرنا تو عین مناسب ہے لیکن مصیبتیں خدا کی طرف سے سزائیں ہوتی ہیں یہ بات کوئی دقیانوسی خیالات کا آدمی ہی کہہ سکتا ہے، ملک کے صدر خاص کر ذاکر حسین جیسے ترقی پسند عالم فاضل کے منہ سے ایسی بات زیب نہیں دیتی۔

اگر یہ مصیبتیں واقعی کسی قصور یا گناہ کی سزائیں ہیں تو یہ سزا اصلی قصورواروں اور گناہ گاروں کو ملنی چاہئیں، نہ کہ دیہات کے سیدھے سادے اور غریب عوام کو۔ بہار میں جو قحط پڑا، اُس کی ذمہ داری وہاں کی نالائق کانگریسی سرکار پر تھی جس نے مناسب وقت پر سینچائی کے منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ اِس لئے قصوروار سرکار ہوئی نہ کہ غریب عوام۔

یہ سرکار ٹوٹ گئی، اُس کے لئے صرف اتنی ہی سزا کافی نہیں۔ اس کے وزیروں کو انہی جھونپڑیوں میں کئی کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا جانا چاہئے تھا، جن میں اُن کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہزاروں لوگوں نے تڑپ تڑپ کر جانیں دی تھیں۔ تب کہیں جا کر ذاکر حسین صاحب کی اِس بات میں کچھ وزن ہوتا کہ یہ مصیبتیں خدا کی طرف سے سزائیں ہوتی ہیں۔ لیکن بہار کے وہ کانگریسی سابق وزیر صاحبان تو آج بھی پٹنہ اور رانچی کے ہوٹلوں میں مرغِ مسلّم اڑا رہے ہیں اور وِہسکی کے جام نوش فرما رہے ہیں۔ پھر سزا کیسی؟

معلوم ہوتا ہے جن سنگھ ابھی تک ذاکر صاحب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا اور شاید اُسی کو خوش کرنے کے لئے وہ بات بات میں خدا و مذہب اور دھرم کرم کو گھسیٹ رہے ہیں۔

ہندوستان میں آج کل جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ دراصل انگریزوں کی دین ہے۔ انہیں حکومت کا انتظام چلانے کے لئے انگریزی پڑھے لکھے بابوؤں کی جو ضرورت تھی وہ اِس نظام سے پوری ہوتی تھی۔

انگریزوں کی نظر میں ان کی نوکری کے قابل صرف وہی لوگ ہو سکتے تھے جو ڈرپوک، دبّو اور حکم کے غلام ہوں۔ چناں چہ انہوں نے اس نظامِ تعلیم میں وہ تمام باتیں شامل کر دیں جو اِس شرط کو پورا کرنے کے لئے ضروری تھیں۔

تعلیم کے اِس سسٹم میں طالب علم کی شخصیت کو ترقی دینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بلکہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی شخصیت اُبھرنے ہی نہ پائے۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز حکومت اِس کوشش میں پوری طرح

سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ آخر ہمارے اس وقت کے نوجوانوں کے دماغ پر جدید سائنس کا کچھ ترقی پسندانہ اثر تو پڑنا ہی تھا۔ لیکن اپنی طرف سے اس نے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔

اِسی پسِ منظر میں دلّی میں ہائر سیکنڈری سطح پر زبانی امتحان کا جو ٹریننگ کیمپ چلایا گیا وہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ زبانی امتحان شخصیت کی پرکھ کا سب سے عمدہ طریقہ ہے۔ اگر ہائر سیکنڈری سطح پر ایک زبانی امتحان بھی شروع کر دیا جائے تو اِس سے ٹیچروں اور طالب علموں کا دھیان اس اہم پہلو کی طرف جائے گا جس سے آج تک غفلت برتی گئی ہے۔ یعنی شخصیت کی نشو و نما کی طرف۔

سچ تو یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد ہی شخصیت کو فروغ دینا ہے۔ اور اِس کے لئے زبانی امتحان سے بڑھ کر اور کوئی سِسٹم نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ کئی ٹیکنیکل مضمونوں میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ پھر لکھ کر خیالات کا اظہار کرنے کی اہلیت اور زبان کے علم کا ایک علیحدہ امتحان بھی ہونا چاہئے۔ پھر بھی دوسرے کئی مضمونوں میں جن کا تعلق صرف معلومات سے ہوتا ہے۔ جیسے جغرافیہ، تاریخ وغیرہ اِن میں تحریری امتحان لینے کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایسے سبھی مضمونوں میں صرف عام نوعیت کے زبانی سوال کئے جائیں اور اُن کے زبانی جواب سُنے جائیں۔

اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ پہلا: اِس سے یہ پتہ چلے گا کہ طالب علم کو اپنے مضمون کی کچھ حقیقی واقفیت بھی ہے یا اُس نے صرف چند سوالوں کے جوابات رٹ رکھے ہیں۔ دوسرے وہ اپنے طور پر بھی کچھ سوچ سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ وہ کہاں تک جدّت پیدا کر سکتا ہے اور اپنے خیالات کو کس طریقے سے پیش کرتا ہے۔ تیسرے اُس کی شخصیت اور کردار کی پرکھ ہو جاتی ہے اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس سمت میں آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

آخر تعلیم کا مقصد تو صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی عملی زندگی میں کچھ کامیابی حاصل کر سکے۔

بھارت سرکار کے وزیرِ سیاحت ڈاکٹر کرن سنگھ نے پچھلے دنوں ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج ہمیں مہارانا پرتاپ کے آدرش پر چلنا چاہئے۔

مہارانا پرتاپ کے آدرش کیا تھے — یہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے شہنشاہ اکبر کی بالادستی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کیا اور اپنی آبائی ریاست میواڑ کو آزاد بنائے رکھنے کے لئے جدّ وجہد کی۔

اِس تاریخی نکتے پر کئی طرح سے غور کیا جا سکتا ہے اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اُس دَور میں جب اکثر ریاستوں کے حکمراں شہنشاہ اکبر کی اطاعت قبول کر کے ایک ملک گیر سلطنت میں شامل ہو گئے تھے تو میواڑ جیسی کسی چھوٹی ریاست کا اس کے خلاف بغاوت کرنا ملک دشمنی تھی! اِس نظریے سے مہارانا کا کردار قابلِ تقلید نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

لیکن اگر یہ مانا جائے کہ اکبر کی سلطنت ایک غیر ملکی حکومت تھی اور اِس وجہ سے اُس وقت کے ہندوستان کی ہر ریاست کو اُس کے خلاف بغاوت کرنے اور آزاد ہونے کا پورا حق حاصل تھا تو پھر ہمارے موجودہ کانگریسی حاکموں کو کئی اور باتیں بھی ماننی ہوں گی۔

ان میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بھارت کی غلامی کا دَور پھر صرف انگریزی دَورِ حکومت تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ تب یہ ماننا ہوگا کہ غلامی کا یہ سلسلہ سکندر کے وقت سے شروع ہوا اور اگرچہ بیچ میں کئی بار ہم حملہ آوروں کو بھگانے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ ہر بار واپس آتے رہے اور آخر میں جیت اُنھی کی ہوئی۔

اس لئے ۱۹۴۷ میں جب بھارت آزاد

ہوا تو یہ آزادی صرف ۱۹۰ سال کے انگریزی دورِ حکومت سے نہیں بلکہ ۲۰۰۰ ہزار سال کے غیر ملکی حملوں اور تقریباً ایک ہزار سال کی لگاتار غلامی کے بعد ملی۔

ان حقائق کو پیش نظر رکھ کر اگر مہارانا پرتاپ کے آدرشوں پر چلنے کی بات کوئی ہندو راشٹروادی کہتا تو کچھ بات بھی تھی کیوں کہ اس کا ایمان داری کے ساتھ یہ عقیدہ ہے کہ بھارت درحقیقت ایک ہزار سال کی غلامی مسلسل جدوجہد کے بعد آزاد ہوا لیکن ایک کانگریسی وزیر کے منہ سے جو نام نہاد سیکولرزم میں یقین رکھنے کا دعویدار ہے یہ بات کچھ جچی نہیں۔

اب ڈاکٹر کرن سنگھ خود ہی بتائیں کہ مہارانا پرتاپ کے آدرشوں سے اُن کا کیا مطلب ہے۔

مہاراشٹر سرکار نے مرکزی سرکار سے سفارش کی ہے کہ فیملی پلاننگ کے ایک کامیاب طریقے کے طور پر نس بندی اور نالی بندی کے آپریشنوں کو مذہب اور فرقے کا امتیاز کئے بغیر تمام لوگوں کے لئے لازمی قرار دینے کی آئینی اور قانونی کاروائی کی جائے۔

سفارش میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی شہری کو کُل کتنے بچّوں کے بعد اپنا یا اپنی بیوی کا لازمی آپریشن کرانا ہوگا، اِس کا فیصلہ اِس امر کا خیال کئے بغیر کیا جانا چاہیئے کہ اُس کی کل کتنی بیویاں ہیں یعنی بیویاں چاہے کتنی ہی ہوں، بچّوں کی تعداد ہر کنبے میں برابر رکھی جانی چاہیئے اور تعداد پوری ہو جانے پر آپریشن لازمی سمجھا جانا چاہیئے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ بھارت میں کسی سرکار نے کھلم کھلا اس بات کی حمایت کی ہے کہ بچّوں کی ایک معیّن تعداد کے بعد آپریشن لازمی قرار دیا جانا چاہیئے اور ایسی حمایت کرنے کا سہرا چوں کہ مہاراشٹر سرکار کے سر بندھتا ہے اِس لئے یہ سرکار قابلِ تحسین ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ فیملی پلاننگ کے میدان میں جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ جبر کرنا ہی ہوگا ورنہ اِس سمت میں بڑی سے بڑی کوششیں بھی رائیگاں چلی جائیں گی۔ بلاشبہ اِس کے لئے ابھی اتنی جلدی نہ آپریشن کو جبری قرار دیا جا سکے گا اور نہ اتنے وسیع پیمانے پر آپریشنوں کا مکمل انتظام ہی کیا جا سکے گا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بچّوں کی ایک مقررہ تعداد (دو یا تین) کے بعد اور زیادہ بچّے پیدا ہونے کی صورت میں کچھ سزا دینے کا طریقہ تو عمل میں لانا ہی ہوگا۔ اور حد سے زیادہ حمل نہ قرار پا سکیں، نیز بچّے پیدا نہ ہوں ــــ اس کے لئے کافی بڑے پیمانے پر امداد بھی دینی ہوگی۔

اس لئے سرکار کو پہلا قدم یہی اٹھانا چاہیئے کہ دو یا تین بچّوں کے ہوتے ہوئے زیادہ بچّوں کی پیدائش کو غیر قانونی قرار دے اور ایسے فالتو بچّوں کی پیدائش کو روکنے کا قانونی انتظام کرے۔

جبری آپریشن کے سلسلے میں وسائل کی کمی کے علاوہ ایک دقّت یہ بھی ہے کہ بچّوں کے حادثاً مر جانے پر اگر پھر سے اولاد پیدا کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایسی کوئی گارنٹی ابھی تک نہیں دی جا سکی ہے کہ آپریشن کا اثر زائل کیا جا سکے گا۔ اس لئے زیادہ مؤثر طریقہ انسدادِ حمل کا ہی ہے جب کہ آپریشن کو اختیاری رہنے دیا جا سکتا ہے۔

الٰہ آباد کی ایک نام نہاد سماج وادی نوجوان سبھا نے اُتر پردیش کے کمیونسٹ وزیرِ خوراک شری جھارکھنڈے رائے سے اپیل کی ہے کہ آنند بھون کو سبھا کے نام الاٹ کر دیا جائے تاکہ وہ اِس میں ایک ہوٹل کھول سکیں آنند بھون وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کے بزرگوں کی جائے رہائش رہا ہے اور اِس وقت اندرا جی کی واحد موروثی ملکیت ہے۔ مجوزہ

ان سماج کا خیال ہے کہ یہ مکان ۲۰ برس
خالی پڑا ہے اس لئے کسی کام آنا چاہیئے۔
خالی مکان کسی کام آئے، یہ بات یوں تو
مناسب ہے لیکن آنند بھون کے بارے
ایک بات تو یہ ہے کہ یہ مکان قومی اہمیت
ایک تبرکہ ستھان ہے اور اندرون و بیرون
بہت سے لوگ اِسے دیکھنے کے لئے
تے ہیں۔ دوسرے یہ گذشتہ ۲ برس سے
معنوں میں خالی اور بند بھی نہیں ہے، اس
ہت سے نوکر چاکر دیکھ بھال کے لئے رہتے
اور نہرو خاندان کے عزیز و اقارب بھی اکثر
میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ اپنے وقت میں خود
ان جہانی جواہر لال نہرو اور اب خود اندرا گاندھی
اُن کے دونوں جوان بیٹے اکثر اس مکان میں آتے
اے رہتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ مکان خود
ندرا گاندھی کے لئے آخری وقت سر چھپانے
واحد جگہ ہے۔

ایسی صورت میں یہ دیکھنا ضروری ہو جاتا
ہے کہ اگر یہ مکان آج کسی سماجی ادارے کو
ے دیا جائے اور کل اندرا جی وزیر اعظم نہ
میں اور نہ سیاست میں رہنا چاہیں بلکہ ریٹائر
ہو کر اپنے گھر میں رہنا چاہیں تو کیا وہ اپنا مکان
خالی کرانے کے لئے مقدمے بازی کرتی پھریں گی؟
اپنے کسی عزیز یا رشتے دار کے دروازے
پڑی رہیں گی؟ آخر اندرا جی کے پاس کوئی جگہ
تو ایسی رہنی چاہیئے جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ اگر
سماج واد کا مطلب یہی ہے کہ لوگوں کو اُن کے
گھروں سے نکال دیا جائے تو پھر اسے سماج واد
نہیں بلکہ 'اُجاڑ واد' کہنا چاہیئے۔ اب اندرا جی
خود ہی سوچ لیں کہ وہ 'اُجاڑ وادی' بنی رہیں گی
اپنا گھر سلامت رکھیں گی!

کانگریس

ورکنگ کمیٹی نے عام بیمہ کو بھی قومی ملکیت قرار دینے کی ایک تجویز پاس کی تھی۔ اگر سرکار اُسے مان لے تو جو صورتِ حال آج زندگی بیمہ میں چل رہی ہے وہی عام بیمہ میں بھی پیدا ہو جائے گی۔

پچھلے کئی سال سے یہ بات مشاہدے میں آ رہی ہے کہ زندگی بیمہ میں صرف ایک ہی سرکاری کارپوریشن پورے ملک کے لئے قائم ہونے اور تجارتی مقابلہ ختم ہونے سے اس سلسلے میں لوگوں کو حد درجہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور کوئی بھی ایک بار زندگی بیمہ کارپوریشن کے جنگل میں پھنس کر ایک دم بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کارپوریشن کسی شخص کا بیمہ نہ کرنا چاہے تو دھاندلی کی صورت میں بھی اُس شخص کے لئے فریاد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پہلے ایک کمپنی بیمہ نہیں کرتی تھی تو دوسری اس کے لئے تیار ہو جاتی تھی مگر اب یہ سب سہولتیں ختم ہو گئی ہیں۔

اب اگر عام بیمہ کو بھی قومی ملکیت قرار دے کر پورے ملک کے لئے صرف ایک کارپوریشن قائم کر دی گئی تو اس شعبے میں بھی اجارہ داری کی تمام خرابیاں آ جائیں گی۔ سب لوگوں کو یا تو اُس ایک کارپوریشن کی شرطوں پر اپنے مکان، دکان، مال، گاڑی وغیرہ کا بیمہ کرانا ہوگا یا خود ہی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔ اس طرح لوگ اس طرح کے بیموں میں مایوس ہوں گے اور نتیجے کے طور پر یہ سارا بزنس ٹھپ ہو جائے گا۔

پھر اس وقت بھی اس کاروبار میں چالو سرمائے کے علاوہ کوئی ایسی کثیر رقم نہیں ہے جس کو سرکاری ملکیت میں لے کر سرکار خود اپنا خزانہ بھر سکے۔ ایسی حالت میں اس طرح کے اقدامات کر کے گناہ بے لذّت سے کیا فائدہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار کو اب اپنے سوشلزم کے نعرے کو زندہ رکھنے کے لئے اس کے سوائے اور کچھ نہیں سوجھ رہا ہے کہ آئے دن کسی نہ کسی چلتے کاروبار کو قومی ملکیت بنا دینے کے ارادے کا اعلان کرتی رہے●

قمر کاشف

ڈاکٹر ذاکر حسین

جن کی کامیابی نہ تو کانگریس کی فتح ہے اور نہ ہی وزیرِاعظم اندرا گاندھی کی بلکہ یہ بنیادی طور پر ڈاکٹر صاحب کی اپنی، نجی اور ذاتی فتح ہے۔

ہندوستان کا چوتھا صدارتی چناؤ کئی اعتبار سے تاریخی تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مرکز کی حکمران جماعت کانگریس کے سرکاری امیدوار کے مقابلے پر تمام مخالف جماعتوں نے اپنا متفقہ امیدوار کھڑا کیا۔ اس سے پہلے صرف حکمران جماعت کا امیدوار ہی جیتنے کی پوزیشن میں ہوتا تھا۔ اس لئے ان انتخابات کو کوئی قابلِ ذکر اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن اس دفعہ دونوں بڑے حریفوں کی ہار جیت کے امکانات تقریباً برابر تھے۔ اسی لئے اس چناؤ کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ مستقبل کے لئے بھی ایک قابلِ تقلید مثال بن گیا ہے۔

کانگریس کے امیدوار تھے سابق نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور مخالف جماعتوں کے امیدوار تھے سپریم کورٹ کے چیف جج مسٹر کے۔ سبّا راؤ۔ انتخاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی فتح ہوئی اور انہوں نے صدر جمہوریہ کے عہدے کا چارج سنبھالا۔ اب اس نتیجے کو ہمیں ہندوستان کے اگلے کچھ سالوں کی سیاست کے معنوں میں کس نظر سے دیکھنا چاہیے؟

نئے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صرف کانگر[ی]س کی طرف سے کھڑے کئے گئے ایک عا[م] جماعتی امیدوار ہی نہیں تھے بلکہ وہ مرکز[ی] کانگریسی حکومت کی سربراہ وزیرِاعظم شر[یمتی] اندرا گاندھی کے ذاتی امیدوار بھی تھے۔ ا[س] لئے ان کی کامیابی کو خود اندرا سرکار کی آئ[ندہ] پالیسیوں اور کارروائیوں کے معنوں میں ک[س] نظر سے دیکھنا چاہیے؟

اس مہم کے دوران دو یا تین قسم کے رجحا[ن] ظاہر ہوئے۔ کانگریس اور اس کے کچھ حمایتیو[ں] کی طرف سے یہ دلیل دی گئی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی فتح اس ملک میں سیکولر جمہوریت کی جیت ہوگی کیوں کہ ڈاکٹر صاحب اقلیتی مسلم فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ مخالف جماعتوں کی طرف سے ایک آواز تو یہ اٹھی کہ ایک مسلمان کو کسی صورت میں بھی بھارت کا صدر نہیں چُنا جانا چاہیے اور دوسری یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں ایک بڑی دلیل ہی صرف یہ ہے کہ وہ صدارت کے الیکشن میں کھڑے ہوئے

ے پہلے مسلمان امیدوار ہیں۔ اس طرح دونوں
ریقوں نے، کیا حمائتی اور کیا مخالف، سب
ریادہ زور اسی ایک بات پر دیا کہ ڈاکٹر صاحب
ن ہیں۔ اس رجحان کا ڈاکٹر ذاکر حسین کی
ت میں کیا ہاتھ رہا ہے اِس پر ہم ابھی غور
یں گے۔

ارت کا صدارتی انتخاب پارلیمنٹ کے
دونوں ایوانوں (لوک سبھا اور
سبھا) اور کل سٹیٹوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے
ب نمائندوں کے ذریعہ ہوتا ہے (الیکشن کے
سٹم کی تفصیل 'سریتا'، جون ۱۹۶۷ میں شائع
"صدر جمہوریہ" میں دی گئی ہے — مدیر)
سسٹم کے مطابق اس بار کے مقابلے میں
ڈاکٹر ذاکر حسین کو کل ۴۷۱۲۴۴ ووٹ ملے۔
مسٹر سبا راؤ کو ۳۶۳۹۱۷ یعنی ڈاکٹر صاحب
فتح ۱۰۷۲۷۳ ووٹوں کی اکثریت سے حاصل ہوئی۔
مخالف جماعتوں کی نظر میں ان کے امیدوار
اتنے زیادہ ووٹ حاصل کرنا بھی ایک نمایاں
میابی تھی۔ اس طرح وہ کانگریس کے مقابلے
ی کل ہند طاقت کا اچھا مظاہرہ کر سکے، ایسے
ن کا انہوں نے اظہار کیا۔ جب کہ کانگریس نے
کٹر صاحب کو ملی اکثریت کو اپنی توقعات سے
یں زیادہ بتا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ
کامیابی دراصل ملک میں مجموعی طور پر کانگریسی
یسیوں کی منظوری کا ثبوت ہے۔ دیکھا جائے کہ
دعویٰ کہاں تک صحیح ہے؟
ممبروں کے ذریعہ ووٹنگ کا جو نقشہ سامنے
یا اس سے پتہ چلتا ہے کہ پارلیمنٹ اور عموماً
سٹیٹ کی قانون ساز اسمبلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین
اس تعداد سے کچھ زیادہ ہی ووٹ ملے جو
نگریس انہیں اپنے بل بوتے پر دلا سکتی تھی۔
زائد ووٹ کہاں سے آئے؟ یقیناً ہر جگہ
ا پوزیشن رہی ہوگی کہ جتنے کانگریسیوں نے

ڈاکٹر صاحب کو ووٹ نہیں دیا اتنے ہی یا اُن سے کچھ زیادہ مخالفوں نے اُن کی حمائت کی۔ دوسرے الفاظ میں جتنے کانگریسی کانگریس سے ٹوٹے، ان کے مقابلے میں مخالف کیمپ سے ٹوٹنے والے ممبروں کی تعداد لگ بھگ ہر جگہ کچھ زیادہ رہی۔

ہار جیت کے نقطۂ نظر سے جو دوسرا پہلو سامنے آیا اس کے مطابق ڈاکٹر صاحب کو پارلیمنٹ کے علاوہ تمام کانگریسی سٹیٹوں اور پنجاب، بنگال اور اتر پردیش ان تین غیر کانگریسی صوبوں میں اکثریت ملی۔ جب کہ مسٹر سبا راؤ کو صرف کیرل، مدراس، اڑیسہ، بہار اور ہریانہ ان پانچ غیر کانگریسی سٹیٹوں میں اکثریت حاصل ہوئی۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کو مرکز سمیت ملک کی ۱۷ میں سے ۱۲ سٹیٹوں میں فتح حاصل ہوئی وہاں مسٹر سبا راؤ کو صرف پانچ سٹیٹوں میں کامیابی حاصل ہوئی۔

لیکن کیا اس بنیاد پر کانگریس کا یہ دعویٰ قابلِ قبول ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی فتح مجموعی طور پر ہندوستان میں کانگریس کی پالیسیوں کی جیت ہے؟ نہیں۔ کسی بھی نقطۂ نگاہ سے کانگریس کا یہ دعویٰ قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، ڈاکٹر موصوف کو صرف کانگریسیوں نے ہی منتخب نہیں کیا بلکہ اس فتح میں غیر کانگریسیوں کی بھاری تعداد کا بھی ہاتھ رہا۔ اور یہ تعداد عموماً سبھی جگہ ان کانگریسیوں سے زیادہ رہی جنہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی حمائت نہیں کی۔

کیا کوئی سمجھ دار شخص یہ دلیل دے سکتا ہے کہ جن غیر کانگریسیوں نے ڈاکٹر صاحب کی حمائت کی وہ سب کانگریس کی پالیسیوں کی بھی حمائت کرتے ہیں؟ ممکن ہے ان غیر کانگریسیوں کے سامنے بھی صرف اتنی ہی بات رہی ہو جتنی کہ ڈاکٹر صاحب

کو ووٹ دینے یا نہ دینے والے کانگریسیوں کے سامنے یعنی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک مسلمان ہیں۔

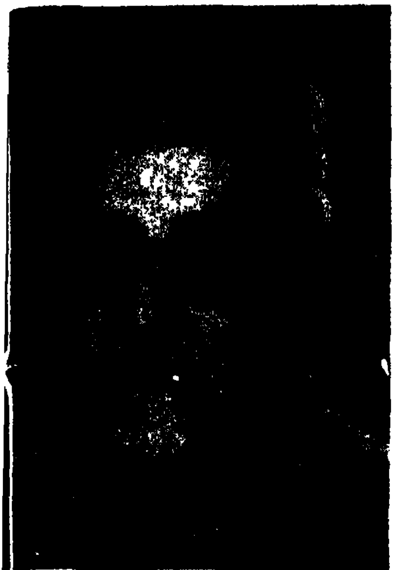
اس بات کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی جگہ کانگریس یا وزیرِ اعظم کی طرف سے کوئی دوسرا غیر مسلم امیدوار کھڑا کیا جاتا تو شاید وہ مسٹر سبا راؤ کے مقابلے کامیاب نہ ہوتا!

اِس نظریہ سے ڈاکٹر موصوف کی فتح نہ تو کانگریس کی فتح ہے اور نہ ہی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی۔ بلکہ یہ بنیادی طور پر ڈاکٹر صاحب کی اپنی، نجی اور ذاتی فتح ہے اور اس کی بنیاد صرف اتنی ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

بلا شک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پچھلے ۴۰ سالوں سے ایک وفادار کانگریسی رہے ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ایک آزمودہ دانش مگت ہیں۔ وہ ایک بڑے ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقتصادیات، زبان داں، مصنف اور عوامی خادم ہیں۔

لیکن یہ سب خوبیاں ایسی ہیں، جو بھارت کے دوسرے کتنے ہی لوگوں میں یکساں مل سکتی ہیں۔ اسی الیکشن میں ڈاکٹر صاحب کے حریف مسٹر سبا راؤ ان میں سے کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔ کچھ دوسرے امیدواروں میں بھی ایسی ہی خوبیاں ہوں گی۔ لیکن ایک خوبی ضرور ایسی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا اور وہ خوبی ہے ڈاکٹر موصوف کا مسلمان ہونا۔

اس پس منظر میں کانگریس اور کچھ دوسرے لوگوں کا یہ دعویٰ کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی جیت اس ملک میں سیکولرزم کی جیت ہے۔ سیکولرزم کی یہ انوکھی ہی تعریف ہے کہ ایک آدمی کو پہلے تو صرف اس کے مذہب کی بنیاد پر منتخب کیا جائے اور پھر یہ ڈھنڈورہ پیٹا جائے کہ سیکولرزم کی فتح ہے۔



آزمودہ عوامی خادم ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین

یہ سیکولرزم کی فتح ہے یا خالص فرقہ پرستی یہ تو سراسر مذہب پرستی ہے۔

لیکن اس معاملے میں ہماری جمہوریت شاید ابھی لاچار ہی ہے، کیوں کہ ابھی تک ہمارے سماج میں مذہب ایک زبردست طاقت کی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے ہمارا نام نہاد سیکولرزم عمل میں صرف ایک ہی شکل اختیار کر جاتا ہے اور وہ ہے تمام مذاہب کی حوصلہ افزائی کرنے کا۔ یعنی بجائے اس کے کہ حکومت کا کسی بھی مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو (جو سیکولرزم کی صحیح تعریف ہے) اس کا سبھی مذاہب سے یکساں تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ یہ پوزیشن بجائے خود مذاہب کو زندہ رکھنے کی ایک بڑی وجہ ہے اور اسی لئے ہمارا نام نہاد سیکولرزم اصل سیکولرزم کے راستہ میں ایک بڑی زبردست رکاوٹ ہے۔

بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ اب دیکھنا صرف:



ـالف پارٹیوں کے امیدوار ـــــ مسٹر کے۔ ستاراؤ

ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے یا کیا ہونا چاہئے ـــ
ب بات ملے ہے کہ جن بنیادوں پر اور جس
رح کے مذہبی پروپیگنڈے کے ساتھ ڈاکٹر
احب کا انتخاب ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں
می فوری طور پر اس ملک میں فرقہ پرستی اور
ہب پرستی کو تقویت ملے گی۔

کہا جا رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے صدر
جانے پر شریمتی اندرا گاندھی کی پوزیشن
تاً مضبوط ہو گئی ہے۔ اب نہ صرف مرکزی
ارت ہی ان کی جیب میں ہے بلکہ صدر بھی
کی کٹھ پتلی ہے۔ ہاں اس لحاظ سے یہ انتخاب
راگاندھی کی فتح ضرور ہے لیکن پارلیمنٹ میں
کی جماعت کی موجودہ پوزیشن میں کوئی فرق
ں پڑا ہے۔ اگر ۲۵ کانگریسی ممبر مخالف
پ میں چلے جائیں تو اندرا جی کا تخت ہل اُٹھے
صدر جمہوریہ کے انتخاب سے کانگریس کی
رونی پھوٹ میں کوئی کمی نمایاں نہیں ہوتی ہے
کسی وقت بھی معاملہ پلٹ سکتا ہے۔

سری بات یہ ہے کہ خود صدر جمہوریہ
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی، اگر
ا اور کوشش کریں تو اپنی موجودہ حیثیت
جو انہیں ملی ہے یعنی بھارت کے پہلے
ن صدر ہونے کی، اپنا ایک خاص اور کافی

اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ یہ رول ہے بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ان کی ذہنی وسماجی قیود سے باہر لاکر ملک کی عام قومی سرگرمی میں شریک کرنا۔

صدر ڈاکٹر صاحب خود اپنے خیال و عمل کے ذریعہ بھارتی مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرا سکتے ہیں کہ انہیں اب ہمیشہ کے لئے نہ صرف اسی ملک میں رہنا ہے بلکہ اِسے بنانے سنوارنے میں بھی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ حصّہ لینا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا ہندو فرقہ پرستوں کے ساتھ ٹکر لینا تو ناگزیر ہے۔ ساتھ ہی انہیں اپنے ہم مذہب مسلمان فرقہ پرستوں سے بھی ٹکر لینی ہوگی۔ بحیثیت صدر جمہوریہ ہند انہیں بہت کچھ ایسا کہنا، کرنا اور سوچنا پڑے گا جو جنونی مولویوں کی نظر میں کفر ہوگا۔ ایسے گمراہ لوگوں کو سیدھے راستہ پر لانا اور ملک کے کروڑوں عقیدہ پرست عوام کو زمانۂ جدید کے تقاضوں سے روشناس کرانا ڈاکٹر موصوف کی خاص ذمّہ داری ہوگی۔ جس حد تک وہ اس ذمّہ داری کو پورا کر سکیں گے، اسی پر اُن کی کامیابی کا دارومدار ہوگا۔

ان سب باتوں کا آخری نتیجہ کیا ہوگا یہ تو صرف وقت ہی بتائے گا۔ لیکن یہ توقع ضرور کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے عہد میں بھارت کے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس اور غیر یقینی ماحول کا اندھیرا کچھ چھٹے گا۔ اور وہ ایک نئی روشنی میں ملک کے مسائل کو دیکھنے اور حل کرنے کی کوششوں میں حصّہ لینے کے قابل بنیں گے۔

آخری بات یہ کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے صدر چُنے جانے پر ساری دنیا اور خاص طور پر مسلم ممالک میں بھارت کا سر ضرور اونچا ہوا ہے۔ اور حقیقت میں یہی اس انتخاب کا نمایاں اور قابلِ قدر فائدہ ہے۔

ویسے ڈاکٹر صاحب سے خود اپنی حکومت، مرکزیا سٹیٹوں کے تعلقات میں اُلجھن کی توقع نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنے جلیل القدر عہدے پر بنے رہیں۔ ●

کہانی • شاہد عظیم

کنکری

صبیحہ نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ مسکرائے گی نہیں۔ اپنی اس محبت کا گلا گھونٹ دے گی۔ وہ بھول جائے گی کہ کبھی اُس نے اسلم کو چاہا تھا۔ چُپ چاپ اُسے اپنے من میں بسایا تھا اور انجان پُوجتی رہی تھی۔۔۔



وہ اُسے چُھپ چُھپ کر چلمن اور کواڑوں کی اوٹ سے دیکھا کرتی۔ دراز قد، چھریرا جسم، بکھرے ہوئے بال، چہرے پر ایک عجیب سا بھولا پن، جب وہ بات کرتا تو بالکل بچوں کی سی معصومیت چہرے پر چھا جاتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ چلمن سے اسلم کو دیکھ رہی ہوتی کہ یکایک کسی کے آنے کی آہٹ سُنائی دیتی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا اور وہ پسینہ پسینہ ہو جاتی۔ اگر امّی دیکھ لیں گی تو کیا کہیں گی؟ اور وہ اپنے کمرے میں آ کر دم لیتی۔ توبہ، ایک لڑکی کے لئے اس سے زیادہ کیا بے شرمی ہو سکتی ہے۔ وہ قسم کھاتی کہ پھر کبھی تاک جھانک نہیں کرے گی۔ بھلا اس میں ہے ہی کیا،

اسلم کسی دفتر میں کلرک تھا۔ تنخواہ کم تھی اس لئے اس نے دو تین جگہ چھوٹے چھوٹے کام سنبھال رکھے تھے۔ وہ سویرے گھر سے چلا جاتا اور رات دیر گئے گھر لوٹتا۔ اسلم دونوں وقت صبیحہ کے گھر کے سامنے سے گذرتا۔ کندھے پر کوٹ ڈالے، ہولے ہولے سیٹیاں بجاتا، اپنے خیالوں میں کھویا ہوا۔ اسلم کے قدموں کی چاپ سے اس کے کان اس قدر مانوس ہو گئے تھے۔ وہ دور ہی سے پہچان لیتی۔

صبیحہ اس وقت اگر کوئی کام کر رہی ہوتی تو کام روک دیتی۔ پھر ہر آہٹ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا اور وہ گھبرا کر سمٹ جاتی۔ وہ یوں پسینہ پسینہ ہو جاتی جیسے اسلم انجانے طور پر اس

ے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہو اور بات کرنا چاہتا ہو۔
اسے گرمیوں کی وہ سنسان دوپہر اب
ں یاد ہے، جب پہلی بار دونوں کی نظریں ٹکرائی
یں۔ چلچلاتی دھوپ پھیل کر برآمدے تک
ئی تھی۔ گرم جلتا ہوا سورج نیم کے اوپر بڑی
دت سے چمک رہا تھا۔ صبیحہ کو پیاس لگی۔
مرادنچی خالی پڑی تھی۔ ابھی کل ہی تو ممی نے
مڑا پھوڑا تھا جس پر خوب پٹائی ہوئی تھی اس
ں۔ صبیحہ نے باورچی خانہ کا رُخ کیا۔ کونے میں
راحی مل گئی، جس کے پیندے میں تھوڑا سا پانی
ں کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ صراحی کو
ر سے زمین پر پٹک دے۔

آنگن میں چلی آئی۔ یکایک نہ جانے کیسے
اس کی نظریں پڑوس کی طرف اٹھ گئیں۔
یوار کے اس پار کوئی اسے پُرشوق نگاہوں سے
یکھ رہا تھا۔ صبیحہ کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ
ئے۔ مارے شرم کے اس کے پاؤں من من
ر کے ہو گئے تھے۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا تو جلدی
دی رسی پر پڑے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی۔
اتھ ساتھ وہ کنکھیوں سے اسلم کی طرف دیکھتی جاتی۔
اسلم نے ایک پل کے لئے بھی آنکھیں
یں جھپکائی تھیں۔ وہ اسے عجیب والہانہ انداز
ں دیکھے جا رہا تھا۔ صبیحہ نے اپنا جائزہ لیا تو
ں کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بے خیالی
ں بغیر دوپٹہ اوڑھے چلی آئی تھی۔ ہائے اللہ،
ں تو مر گئی ـــــ لمحہ بھر میں وہ اپنے کمرے میں
ی۔ اس نے دروازہ بند کر کے اطمینان کی ایک
انس لی۔

سرِشام ہی کمرے میں سیونگ مشین کی
ڑگھڑ سنائی دے رہی تھی۔ دو دن بعد عید
ی۔ صبیحہ کے پیر اور ہاتھ تیزی سے چل رہے
تھے اتنے میں گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ
بھری۔ اس نے سلائی روک دی۔ اسلم گلی سے
گذر رہا تھا۔ یہ اسلم بھی کتنی رات گئے گھر لوٹتا
ہے۔ اسے اپنی بوڑھی ماں کا ذرا بھی خیال نہیں۔
وہ سوچنے لگی۔

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک
بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ آنکھیں بند ہوتے
ہی اسلم کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے آجاتا
اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ ہر دم، ہر وقت
اسلم کا تصوّر۔ اگر کچھ دن اور یہی حال رہا تو میں
خود پاگل ہو جاؤں گی۔ اسلم میرا کون لگتا ہے جو
میں اُسے روز دیکھتی ہوں۔ پھر وہ اپنی اِن بے نام
الجھنوں پر ہنس پڑتی۔

اسلم کی عادتیں، اسلم کا پسندیدہ کھانا، بچپن
سے لے کر جوانی تک کے اَن گنت واقعات،
کتنی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو صبیحہ کو یاد تھیں۔
صبیحہ کبھی اسلم کی ماں (جسے وہ خالہ کہتی تھی) کے
سامنے اسلم کے بچپن کا کوئی واقعہ یا پسند کا تذکرہ
چھیڑ دیتی تو وہ حیران رہ جاتیں۔ اُسے خود یاد نہیں
تھا کہ یہ تمام باتیں اُسے کیسے یاد رہ گئیں۔ اکثر
تنہائی میں وہ ان تمام واقعات کی کڑیاں جوڑتی۔
ایسا کرنے میں اسے یک گونہ سکون ملتا۔

ماں چولھا جلانے بیٹھی، دیکھا ماچس نہیں ہے۔
"امی، ماچس خالہ بی سے مانگ لاؤں" صبیحہ بولی۔
"ہاں بیٹیا، جلدی سے آنا۔"

پہلے اُس نے سوچا کہ دیوار پر چڑھ کر ماچس
مانگ لے۔ شاید خالہ بی باورچی خانہ میں
ہوں، انہیں تکلیف ہوگی۔ اُس نے پہلے دروازہ
کھول کر گلی میں اِدھر اُدھر جھانکا۔ ساری گلی سنسان
پڑی تھی۔ وہ تیزی سے خالہ بی کے گھر میں گھس
گئی۔ سامنے اسلم کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود
وہ خود کو کمرے میں جھانکنے سے باز نہ رکھ سکی۔ کمرہ
میں کسی کو نہ پا کر اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔
وہ پلٹ پڑی اور اپنے قریب اسلم کو پا کر گھبرا گئی۔
جو دبے پاؤں اُس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ اب بھاگ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ اسلم راستہ روکے جو کھڑا تھا۔

اُس نے اسلم پر نگاہ ڈالی، ڈر اور خوف سے سہمی ہوئی۔ کسے پتہ تھا وہ یوں اچانک ہی سیڑھیوں پر پہنچ جائے گا، ورنہ وہ فوراً لوٹ جاتی۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے سلونے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اسلم نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھا۔

"صبو، میرے دل کی ملکہ، تمہیں دیکھنے کو میری آنکھیں ترس گئی ہیں۔"

اسلم نے اُسے اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لیا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔ اچانک وہ خواب ٹوٹ گیا۔ وہ تڑپی اور کسمسا کر اسلم کی باہوں سے نکل گئی۔ وہ حیران کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ یہ سب کچھ لمحہ بھر میں ہوگیا تھا۔ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔ صبیحہ سیدھے اپنے پلنگ پر جا گری۔ اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ کمرے میں بہت دیر تک سسکیاں رہ رہ کر اُبھرتی رہیں۔

ساری رات گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی رہی۔ اُس نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند جیسے آنکھوں سے اُڑ گئی تھی۔ متوسط طبقے کی لڑکیاں جلد باز ہوتی ہیں۔ جہاں کوئی لڑکا پسند آیا اُسے دل دے بیٹھیں۔ آگے سوچا نہ پیچھے۔ بھلا یہ بھی کوئی محبت ہوئی۔ اُدھر سے جواب ملا نہیں، بس منٹوں میں محبت نفرت میں بدل گئی۔ تم سمجھتی ہو کہ جسے تم نے محبت بھری نظروں سے دیکھا وہ تمہیں ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا۔ تم کیا جانو شمع کیوں جل جاتی ہے۔ بہت دن پہلے یہ جملے صبیحہ نے اپنی ایک سہیلی سے سنے تھے جو تمام سہیلیوں میں عاشق مزاج مشہور تھی۔

اپنی بے بسی اور لاچاری پر وہ خوب روئی
وہ محبت کا پُر جوش انداز۔ اسلم اُسے اپنے خوابوں کا شہزادہ لگا۔ اُف، اسے اپنے ہونٹ جلتے ہوئے معلوم ہوئے۔ وہ تصور ہی اُس کی روح کو تڑپا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ رات بھر اُس لگائی آگ میں جھلستی رہی۔

دوسرے دن جب وہ کھڑکی کے نزدیک کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اسلم کھڑکی کے قریب سے گذرا۔ ایک پل کے لئے صبیحہ کا ہاتھ جیسے رُک گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر آپ ہی آپ جھک گئیں۔ صبیحہ کو اپنی طرف متوجہ پاکر اسلم کے خشک بے جان ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ میں دعوت تھی، اپنا پن تھا، چاہت تھی۔ صبیحہ کو وہ مسکراہٹ جیسے زہر لگی۔ اُسے یوں بے باکی سے مسکراتے دیکھ کر اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

تم محبت نہیں کر سکتیں۔ تم محبت نہیں کر سکتیں کبھی بھی نہیں۔ صبیحہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ مسکرائے گی نہیں۔ اپنی اس محبت کا گلا گھونٹ دے گی۔

اور وہ بھول جائے گی کہ کبھی اُس نے اس کے بارے میں سوچا تھا۔ چُپ چاپ اُسے اپنے من میں بسایا تھا اور انجان پوجتی رہی تھی۔ وہ خیالات جو اُس کی روح کو بے چین کئے ہوئے۔ اُس سے چھٹکارا پالے گی۔ ناکام محروم زندگی ایک نئے باب کا مزید اضافہ کرے گی۔ اس۔ بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔

ایک چھوٹی سی کنکری کھڑکی کی راہ سے اندر آگئی۔

پھر اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اسلم تنا چھیڑنے پر آمادہ تھا۔

"غنڈہ کہیں کا۔ ماں بہن جیسے ہے ہی نہیں" ساتھ ہی اُس نے جھلا کر کھڑکی بند کر دی

ذرا ایک منٹ

طنز • اوم دت وتس



کیوں صاحب کیا آپ بھی کبھی اس کے چکّر میں پھنسے ہیں؟

کتنا چھوٹا ہوتا ہے ایک منٹ، یعنی ایک گھنٹے کا ساٹھواں حصّہ۔ ویسے تو اس بے چارے کی اوقات ہی کیا ہے۔ اس سے کسی کا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ مگر بات ایسی نہیں ہے۔ یہ اتنا کمزور نہیں ہے جتنا عام طور سے دکھائی دیتا ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو سبھی اس کے چکّر میں پھنسے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ راستہ میں پڑا ہوا ایک پتھر ہے جس سے ہر ایک کو ٹھوکر لگتی ہے۔ یہ ایک کانٹا ہے جو سبھی کے دامن میں الجھتا ہے۔ یہ ایک کڑوی گولی ہے جسے سبھی کو نگلنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہوتا جا رہا ہے جس کا علاج شاید بیسویں صدی میں تو مشکل نظر آتا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو آپ بھی "ذرا ایک منٹ" کا چکر دیکھ لیجئے۔

سردی کا موسم ہے۔ آپ مکان کی نچلی منزل میں غسل کرنے کے لئے نل کھولتے ہی ہیں کہ اوپر کی منزل سے آواز آتی ہے "ذرا ایک منٹ نل تو بند کر دیجئے"۔ آپ ایک مہذّب انسان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے فوراً نل بند کر دیتے ہیں اور اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے ان کے دوسرے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ کافی دیر تک جواب نہ ملنے کی صورت میں جب آپ نل کو پھر سے گھماتے ہیں تو فوراً آواز آتی ہے "نہانے تو دیجیے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے"۔ اُدھر جلدی نہیں ہے اور آپ ہیں کہ سردی کے مارے ٹھٹھر رہے ہیں مگر شرافت کے مارے "ذرا ایک منٹ" کے چکّر میں پھنس گئے ہیں۔

آپ صبح ہی صبح بازار جا رہے ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں اخبار ہے۔ تمام سُرخیاں دیکھ لینے کے بعد آپ پان والے کی دُکان سے سگریٹ خریدنے لگے ہیں، تبھی ایک صاحب جو للچائی ہوئی نظروں سے

اپ کے اخبار کی طرف گھور رہے ہیں۔ آپ کے کان کے قریب آکر کہتے ہیں "بابو جی ذرا ایک منٹ کے لئے خبار دیکھ سکتا ہوں" اور آپ کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اخبار آپ کے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر یہ بھول جاتے ہیں کہ اخبار اُن کا پنا نہیں بلکہ کسی دوسرے آدمی کا ہے۔ اُن کی سادھی بھی ٹوٹتی ہے جب آپ اخبار مانگتے ہیں۔ وہ اخبار لوٹاتے وقت بہ ظاہر شاید آپ کا شکریہ ادا کریں گے مگر دل میں نئی جلدی اخبار واپس مانگنے کے لئے آپ کو کوس رہے ہونگے۔

آپ کو اپنے کسی کام سے کسی دفتر سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ بار بار دفتر کے چکر لگا کر اور دھکے کھانے کے بعد جب چھوٹے صاحب یعنی کلرک سے پنا کام کرانے میں کامیاب ہو جائیں تب یقیناً آپ کو محکمہ کے بڑے افسر کے دروازے پر سجدہ کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔ وہاں صاحب سے ملاقات کرنے سے پہلے آپ کو کمرے کے باہر بیٹھے صاحب کے اردلی یا چپراسی سے ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے آپ پر مہربان ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ پھر تو وہ "ذرا ایک منٹ رُک جائیے۔ ابھی ملاقات کراتا ہوں" کہہ کر کافی عرصے تک 'جو مزا انتظار میں ہے وہ وصلِ یار میں کہاں' کے مصداق آپ کو خون کے گھونٹ پلاتا رہے گا۔

آپ کے محلے یا گلی میں کوئی حادثہ ہو جاتا ہے اور کسی بچے یا آدمی کو شدید چوٹ آجاتی ہے۔ آپ اپنی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہیں اور فوراً ہی کسی قریبی دُکان سے نزدیکی ڈاکٹر کو فون کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تسلی بخش جواب "ذرا ایک منٹ رُکئے۔ ابھی آیا" جب آپ کے کانوں میں پڑتا ہے تو آپ اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں بڑے خوش ہوتے ہیں کافی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب تو آجاتے ہیں مگر چوٹ کو شدید بتا کر زخمی کو اسپتال لے جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ اگر سمجھدار ہیں تو ایمبولینس کی گاڑی کے لئے فون کر کے "ذرا ایک منٹ انتظار کیجئے" کے لارے لپے میں نہیں آئیں گے کیوں کہ جب تک اُن کی گاڑی آئے گی خدانہ کرے زخمی آدمی کی گاڑی زندگی کے سٹیشن سے چل دے۔

آپ گھر میں بڑے آرام سے بیٹھے ہیں تبھی آپ کے ایک عزیز دوست آتے ہیں اور آپ کے کان کے نزدیک منہ لگا کر کہتے ہیں "ذرا ایک منٹ باہر چلئے۔ ایک نہایت ہی ضروری کام ہے" آپ بھی گھبرا جاتے ہیں اور خیریت پوچھتے ہوئے ان کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں جا کر آپ کے دوست آپ کو سنیما شو کے دو ٹکٹ دکھاتے ہیں اور بڑے ڈرامائی انداز میں آپ کو گھسیٹ کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کو ان کے اس رویّہ پر ضرور بہ ضرور حیرانی ہوگی اور ہو سکتا ہے کچھ غصّہ بھی آئے۔ مگر اس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دوستی جو ٹھہری۔ واپسی پر گھر میں جواب طلبی ہو سکتی ہے۔ لڑائی ہو سکتی ہے صرف "ایک منٹ کے اوپر"

آپ کسی دفتر میں ذمّہ دار افسر ہیں یا دُکان کے مالک ہیں۔ آپ کے پاس اگر ٹیلی فون بھی ہے تو پھر آپ مصیبت کو دعوت دے سکتے ہیں۔ ابھی آپ کے دوست آتے ہیں۔ کرسی پر اوپر سے ہی جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر گرتے ہوئے اپنی ضرورت آپ کے کانوں تک پہنچا دیتے ہیں "بھئی ذرا ایک منٹ ٹیلی فون کرنا ہے"

آپ انکار تو کر ہی نہیں سکتے اور اثبات میں سر ہلا دیتے ہیں۔ بس پھر کیا ہے جب تک ان صاحب کے دماغ میں اُلجھے ہوئے اور ڈائری میں نوٹ کئے ہوئے ٹیلیفون کے نمبروں کی فہرست ختم نہیں ہو جاتی تب تک وہ آپ اور آپ کے کام کے لئے وبال بن کر اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔

آپ کا پڑوسی آپ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے "بھائی صاحب ذرا ایک منٹ کے لئے اپنا سائیکل تو دیں۔ ذرا اسٹیشن تک جانا ہے" آپ انکار بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ سائیکل ہی تو ہے۔ آپ سائیکل دے دیتے ہیں اور جلدی ہی بھول بھی جاتے ہیں کہ کوئی صاحب آپ کا سائیکل مانگ کر لے گئے ہیں۔ آپ کی نیند اس وقت کھُلتی ہے جب تقریباً

دو گھنٹے بعد آپ کے پڑوسی سائیکل پر سوار ہونے کی بجائے پیدل ہی سائیکل کو گھسیٹتے لئے چلے آ رہے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں وہ پہلے ہی مایوسی اور التجا بھری آواز میں کہنے لگتے ہیں کہ جناب معاف کرنا، سائیکل پنکچر ہو گیا، اس لئے دیر ہو گئی۔

آپ ڈی۔ ٹی۔ یو کی بس میں سفر کر رہے ہیں اور بڑے آرام سے سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ تبھی اگلے بس سٹاپ سے دوسری سواریوں کے ساتھ ایک عورت ہاتھ میں اٹیچی، بیگ وغیرہ لئے داخل ہوتی ہے۔ بیٹھنے کی جگہ نہ ملنے اور دھکم دھکا کے ڈر سے اپنا سامان آپ کے گھٹنوں پر رکھ دیتی ہے اور بغیر منظوری لئے سامان رکھنے کی غلطی کی تلافی کرنے کے لئے کہتی ہے "معاف کرنا صاحب۔ ذرا ایک منٹ رکھ لیں" یہ تو وہ بھی جانتی ہے کہ یہ ایک منٹ تو تبھی پورا ہوگا جب اسے بیٹھنے کی جگہ مل جائے یا اس کا سفر مکمل ہو جائے۔

غرضیکہ آپ کو اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز اور معمولی سے معمولی بات کے لئے "ذرا ایک منٹ" کی بے تکلفی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ آپ کے پاس آپ کا اپنا قلم ہے۔ آپ ڈاک خانہ، کچہری یا کسی دوسرے پبلک سے متعلقہ دفتر میں جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی صاحب ضرور آپ کے قلم کو "ذرا ایک منٹ" کے لئے مانگ لیں گے اور پھر اپنی ملکیت سمجھ کر اس وقت تک اسے استعمال کریں گے جب تک ان کا کام ختم نہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اَن پڑھ آدمی اپنا خط لکھوانے یا پتہ لکھوانے کے لئے بھی انہی لفظوں میں آپ سے درخواست کرے۔

تو جناب! یہ تھے "ذرا ایک منٹ" کے چکر کے کچھ نمونے۔ آپ اگر اس مرض سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں تو اسے اس کی اس شکل میں ہی دیکھنے کی کوشش کریں اور کبھی موقع نہ دیں کہ یہ اپنے بازو پھیلا سکے اور ہماری زندگی کی تلخیوں میں اضافہ کر سکے۔ ورنہ یہ زندگی وبال جان ہو جائے گی ●

پانسہ پلٹ گیا

ہمارے علاقے کے ایک کانگریسی امیدوار اپنی کامیابی اور وزارت میں شامل کر لئے جانے کے بعد نہ کبھی ہمارے محلے میں آئے اور نہ محلے کے لوگوں کی فلاح و بہبودی کے لئے گذشتہ پانچ سال میں انہوں نے کچھ کیا۔ اس بے رُخی اور کوتاہی کی وجہ سے محلے والے اُن سے ناخوش تھے۔

ایک سابق امیدوار حالیہ الیکشن کی کنویسنگ کے لئے محلے میں آئے۔ ان کے آنے کی خبر سُن کر محلے کے لوگ ایک کھلی جگہ میں اکٹھے ہوئے۔ انہوں نے حاضرین سے بیٹھ جانے کی درخواست کی اور خود بھی ایک کُرسی پر بیٹھ گئے۔ سبھی کے بیٹھ جانے پر ان کی نگاہ ایک گندی نالی اور کوڑے کرکٹ پر پڑی۔ ہمدردی جتانے کے لئے انہوں نے سامنے کے لوگوں سے پوچھا۔

"محلہ بہت گندہ دکھائی دے رہا ہے ادھر مہتر آتا ہے یا نہیں؟"

تبھی ایک بوڑھے شخص نے اٹھ کر برجستہ کہا "حضور آتا تو ہے مگر پانچ سال میں صرف ایک بار"

اتنا سُننا تھا کہ لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور امیدوار صاحب شرمندہ ہو گئے۔

— احمد علی خاں۔ پٹنہ

اس فیچر کے لئے اپنے دوستوں کے تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ — ایڈیٹر

کہانی • ظہیر نیازی

چاند مسکرا اُٹھا

چاند ملن کے حسین موقع پر پیارے پیارے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا، مگر یہ کیا؟ اُس نے جو دوبارہ رات کے آخری پہر میں حجلۂ عروسی میں جھانک کر دیکھا تو رحمٰن صاحب کہہ رہے تھے "شاداں اب تو تم مجھ سے طلاق ہی لے لو"

رحمٰن منزل چاندنی کے نور میں نہا رہی تھی!

اور مسٹر رحمٰن اپنی عالیشان کوٹھی کی بالکونی میں کھڑے چاند کے چہرے پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کمرے میں بستر علالت پر پڑی ہوئی شاداں کے لئے کیا یہ چاند اتنا ہی حسین ہے، جتنا پوری کائنات کے لئے؟ ان کے ذہن کے دریچوں میں ایک سوال پھڑ پھڑا اُٹھا۔ یقیناً نہیں۔ ان کے دل کے نرم گوشوں سے ایک انتہائی محبت بھرا، درد میں ڈوبا ہوا جواب پھوٹ پڑا 'یقیناً نہیں!!'

ہاں یہ جو ڈھلی ڈھلی سی دودھیا روشنی والی چاندنی ہے نا، یہ صرف اُن لوگوں کے لئے بقعۂ نور ہوسکتی ہے جن کے قدموں کو زندگی کی ساری خوشیاں چومتی ہیں، جن کے لئے دنیا کی ہر عشرت رقص کرتی ہے اور زندگی خود جنہیں سجدے کرتی ہے۔ مگر شاداں کے لئے تو چاندنی کے نور کی کھیتی کوئلے کے کالے کالے دھوئیں کے برابر ہے۔

اُف یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ میں اس ٹریجڈی کی آگ میں سلگتے ہوئے معصوم سی گائے جیسی بے زبان شاداں کو کب سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ اب میری آنکھوں میں وہ تاب نہیں۔ اب میں شاداں کو اپنے دل کی چھپی چھپی سی آگ میں اور جلتے دیکھ نہیں سکتا۔

اور پھر رحمٰن صاحب نے چاندنی کے پُرشباب چہرے سے نظریں پھیر لیں۔ اندر کمرے میں داخل ہو شاداں کے سرہانے بیٹھ، اس کی نیلی جھیل کی سی گہری آنکھوں میں دیر تک ڈوبے نہ جانے کیا تلاش کرتے رہے۔

پھر بڑے شفیق لہجے میں بولے۔



"شاداں"

"جی!" شاداں کے لہجے میں بھی شفقت ومحبت
ی بھرپور گرمی تھی۔

"آج خدا کا شکر ہے، تمہاری طبیعت اچھی
ہے۔ چلو تھوڑی دیر کے لئے بالکونی میں چاندنی کالطف
لیں!"

شاداں چُپ رہی۔

"کیوں، ٹھیک ہے نا ڈارلنگ؟"

شاداں چُپ رہنا چاہتی تھی، مگر رحمٰن صاحب
نے جب اس کی پیشانی اور رخسار پر گر آئے بالوں کو
ٹانے کے بہانے اس کا چہرہ اپنی طرف کرنا چاہا تو اس
نے خود سے نگاہیں اوپر اُٹھا دیں۔ کچھ دیر تک اپنے
وب شوہر کو ایک ٹک دیکھتی رہی پھر نظریں جھکاتی
ی دھیرے سے بولی۔

"جی نہیں چاہتا!"

"شاداں!!" رحمٰن صاحب نے پھر سرگوشی کی۔

"جی!"

"اب تم مجھ سے طلاق لے ہی لو۔"

اور جواب میں شاداں تڑپ اُٹھی۔ اُس نے اُن
کے منہ پر ہتھیلی رکھ دی۔

رحمٰن صاحب کا جی چاہتا کہ وہ شاداں کی اس
ادا پر مرمٹیں مگر وہ سوچتے۔

'شاداں ہر بار ایسا کیوں کرتی ہے؟ وہ کیوں
آج سے تو سو برس پہلے کی عورت بن جاتی ہے؟'

شاداں سوچتی 'ہائے اللہ' یہ بار بار طلاق کی
رٹ کیوں لگائے رہتے ہیں۔ نہ جانے کتنی بار کہہ چکے
ہیں کہ شاداں طلاق لے لو، طلاق لے لو۔ مگر وہ کیوں نہیں
سوچتے کہ کیا کبھی شاداں کے خاندان میں کسی نے کسی سے

طلاق لی ہے یا خود بیرسٹر صاحب کے خاندان ہی میں کسی شخص نے کسی کو طلاق دی ہے ؟ میں جانتی ہوں کہ وہ صرف میری ہی زندگی کی مسرتوں کو میرے قدموں پر نچھاور کرنے کے لئے ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چند روزہ زندگی کی زوال پذیر خوشیوں کے لئے کیا خاندانی وقار کو قربان کر دیا جائے ؟

کبھی کبھی اُسے خیال آتا کیا اس کی زندگی میں گھٹن نہیں ہے ؟ کیا اس کی جوانی کی رنگین اور قیمتی راتیں ترس ترس کر نہیں بیتی ہیں ؟ بیرسٹر صاحب شب خوابی کا لبادہ اوڑھے خرّاٹے بھرتے سوتے رہے ہیں اور وہ ساری رات پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہی ہے ——— کیا یہ سچ نہیں ہے ؟ پھر اگر یہ سچ ہے تو یہ سسکیاں کیوں؟ یہ گھٹن کیوں ؟

آج سے صرف ایک سال پہلے بیرسٹر رحمٰن اپنے آبائی گاؤں گئے تو ہری بھری پہاڑیوں کی وادی میں بسے گاؤں کی حسین فضا کا حُسن لوٹنے نکل پڑے اور وہیں اُن کی ملاقات شاداں سے ہوئی۔

شاداں کیا تھی، سورگ کی کوئی اپسرا تھی جو دھرتی پر اُتر آئی تھی۔ ایسا پاکیزہ حُسن بھلا تمام شہر کی قسمت میں کہاں ؟ وہ شاداں پر ایک ہی نظر میں مر مٹے !

رحمٰن صاحب نے شاداں کے لئے اپنا پیغام بھجوا دیا۔ شاداں کے والدین غریب تھے۔ بیرسٹر صاحب کے مقابلے میں پاسنگ کے برابر بھی نہ تھے۔

ان کے دماغ پر ایک بہت بڑا سوال پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا، بھلا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کیوں کر لگ سکتا ہے ؟ اور اس بڑے سوال کا پہاڑ تب تک نہ ٹلا جب تک بیرسٹر رحمٰن ان کے دروازے پر بارات لے کر پہنچ نہ گئے۔

گاؤں والوں کی نظر میں بیرسٹر رحمٰن ایک فرشتہ، ایک دیوتا بن چکے تھے۔ لاکھوں کی جائداد کے مالک اور ایک عظیم عالم فاضل، دانشور اور شہرت یافتہ بیرسٹر ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ایک انتہائی غریب اور معمولی پڑھی لکھی لڑکی کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

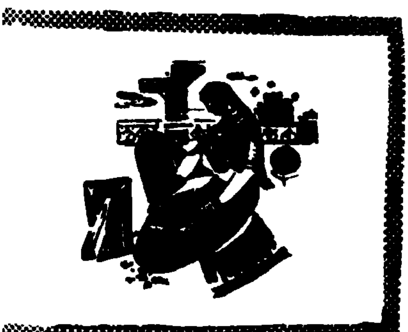
شاداں جب دولہن کے روپ میں رحمٰن منزل پہنچی، تو یہ عظیم الشان منزل اس کے استقبال کے لئے جھک گئی۔ ہر طرف سے نوکر چاکر، ہرکارے اہالی موالی ٹوٹ پڑے اور ان سب کے مشترکہ سواگت نے شاداں کو مسرّتوں کے عمیق سمندر میں ڈبو دیا۔

شب عروسی آئی تو اپنے ساتھ ہزاروں نکہت و نور لائی۔ ہر طرف فانوس و برقی ننھے رنگ برنگے قمقمے جگمگ جگمگ کرتے ٹیوب لائٹوں کی دودھیا روشنی نے سجائی آراستہ سی کوٹھی ایک ہوش رُبا دولہن بنی ہوئی تھی وہ آئے ! ایک چھوئی موئی سی دولہن انہیں گٹھری بنی ہوئی ملی۔

چاند اس ملن کے عین موقع پر پیارے پیارے بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔ مگر یہ کیا ؟ اس نے جو دوبارہ رات کے آخری پہر میں اس حجلۂ عروسی میں جھانک کر دیکھا تو رحمٰن صاحب خرّاٹے بھر رہے تھے اور شاداں کروٹیں بدل رہی تھی !

شادی کے بعد تین رات گذارنے کے بعد بھی جب بیرسٹر رحمٰن کو "ناکامی" کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ ڈاکٹری معائنہ کرا چکے تو انہوں نے اپنے آپ کو سو فی صدی مجرم قرار دیا۔ یہ معائنہ انہوں نے شادی سے پہلے کیوں نہ کرایا ؟ یہ غم انہیں دل ہی دل کھائے جا رہا تھا کہ اگر وہ اپنے بارے میں پہلے ہی سے آگاہ ہوتے تو شاداں کو سہاگ کی سیج پر پھولوں کی جگہ کانٹوں کا احساس لئے کیوں تڑپنا پڑتا ؟

جو ہو چکا تھا اس پر پچھتانا اور اس کے غم میں گھل گھل کر زندگی کو اجیرن بنا لینے میں بھی دانشمندی



ہ تھی اسی لئے وہ اس فکر و کوشش میں رہنے لگے کہ شاداں کو زندگی کی سچی مسرّتیں دینے کے لئے وہ کیا کریں۔ کیا شاداں کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے استانی کی جگہ کسی اسمارٹ سے نوجوان مرد ماسٹر کو رکھ لیں جو شاداں کا دل بہلا سکے اور ان کی کمی پوری کر سکے۔ نہیں نہیں، یہ تو خود ایک سماجی اور اخلاقی جرم ہوگا، ایک جرم سے بچنے کے لئے دوسرا جرم کیوں کیا جائے؟

وہ سن سنتا، تو شالنی رائے کی گلیوں کے پھیرے نہ کاٹ!"

"کیوں رے جگتا؟"

"کیوں کہ اس کا مرد بانکا سجیلا ہے!"

"پھر؟"

"تو پرمیلا سنہا کے دروازے کی طرف بڑھ!"

"کیا کھلا ملے گا؟"

"ہاں! کیوں کہ سنہا صاحب کے منہ کے دانت نقلی ہیں!"

ایسی گفتگو رحمٰن صاحب نے نوکروں کے کواٹروں کے قریب سے گذرتے ہوئے کچھ ہی دنوں پہلے سنی تھی۔ فرصت کے اوقات اکٹھے بیٹھے نوکر آپس میں تبادلۂ خیالات فرما رہے تھے۔ رحمٰن صاحب کے کانوں میں تو جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا۔ گھر آکر سب سے پہلے انہوں نے اپنے نوکر جمن کو جواب دے دیا۔ جمن دیکھنے میں بڑا معصوم اور بھولا بھالا تھا۔ اس کی سرطرفی کم سے کم شاداں کی تو سمجھ میں آئی۔ اب وہ شاداں کو کیا بتاتے، ایک جمن کو نوکری سے ہٹا دینے سے بھی کیا ہوگا۔ ایک گیا، دوسرا آجائے گا!

انہوں نے سوچا —— سڑا ہوا ایک سنترہ اپنے ساتھ کے دوسرے سنتروں کو بھی سڑا ڈالتا ہے۔

ان کے جی میں آیا کہ سارے نوکروں ہی کو ہٹا دیں۔ کمبخت، سارے آوے کا آوا ہی خراب ہے! مگر اس میں سو فی صدی قصور نوکروں ہی کا کیوں کہا جائے۔ ان کا کیوں نہیں جو مرد بانکے سجیلے نہیں؟ سنتا اور جگتا کی گفتگو سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ کمزور مردوں کی بیویوں کی طرف ہی لوگ بڑھتے ہیں یا بیویاں لوگوں کی طرف بڑھتی ہیں۔

رحمٰن صاحب نے خود اپنے بارے میں سوچا کہ کیا وہ خود بانکے سجیلے ہیں؟ ہیں تو ظاہراً ضرور، ایک حسین پرکشش اور بارعب شخصیت کے مالک، مگر اندر سے؟ اور اندرونی کمزوری کے خیال ہی سے ان کا سر چکرانے لگتا۔ ایک مرد کی اس سے بڑی شکست اور کیا ہوگی کہ وہ اپنی بیوی سے جنسی طور پر کمزور ہو۔

"شاداں!"

"جی!"

"ڈیٹنگ جانتی ہو؟"

"کسے کہتے ہیں؟" شاداں سے ایک بار رحمٰن صاحب نے ڈیٹنگ پر گفتگو کی تو اس نے رحمٰن صاحب کے سوال کے جواب میں خود سوال کھڑا کر دیا۔ پھر انہوں نے اس موضوع پر تفصیل سے باتیں کیں۔ انہوں نے کہا "اگر شادی سے پہلے ہم دونوں آپس میں .. تو.."

ان کی بات کا مطلب سمجھ لینے کے بعد شاداں نے ان کی ڈیٹنگ سے متعلق اس رائے سے

نہیں دیکھتے کسی کی طرف

کھا ہوا ہے جو رونا میرے مقدر میں
خیال تک نہیں جاتا کبھی ہنسی کی طرف

تمہارا سایہ بھی جو لوگ دیکھ لیتے ہیں
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے پری کی طرف

...تا ہے پھنستا ہے دل مفت جان جاتی ہے
خدا کسی کو نہ لے جائے اس گلی کی طرف

کبھی جو ہوتی ہے تکرار غیر سے ہم سے
تو دل سے ہوتے ہو در پردہ تم اسی کی طرف

...د پڑتی ہے اُن پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

—— اکبر الہ آبادی

اتفاق نہیں کیا۔ وہ بولی "اگر شادی سے پہلے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لینے کے علاوہ اپنی اپنی کمزوریوں کے بارے میں بھی ایک دوسرے کو واقف کرانا ہے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کو پوری ایمان داری سے بتا دیا جائے۔"

"شاباش! تم تو مجھ سے بھی ذہین نکلیں!" رحمٰن صاحب شاداں کی ذہانت پر خوشی سے کھِل اُٹھے "تمہارا مطلب یہ کہ شادی سے قبل ایک دوسرے کو جنسی تعلقات کے بغیر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔ باہم جنسی تعلقات سے ایک خدشہ یہ ہے کہ اگر اس کا چلن عام ہوجائے تو کوئی بے ایمان لڑکا کسی دوشیزہ کی عصمت سے کھیلنے کے بعد کہیں اور کسی اور دوشیزہ سے بھی یہی عمل دہرانے کے لئے اسے اپنے لئے بے جوڑ قرار دے سکتا ہے یا کوئی عیش پسند لڑکی بھی ٹھیک یہی رویّہ اپنا کر کئی کئی لڑکوں کو ٹیسٹ کر لینے کے بعد ان فِٹ قرار دے سکتی ہے۔ اس سے تو ایک پورے معاشرے کو ایک گھناؤنی غلاظت کے لپیٹ میں چلے جانے کا خطرہ ہے۔"

پھر باتوں ہی باتوں میں وہ بولے "شادی سے پہلے مصروف ترین زندگی میں جنسیات کی طرف میرا دھیان بھی نہ جا سکا۔ پھر کبھی جب میں نے تمہیں دیکھتے ہی اپنی زندگی کے لئے چُن لینے کا فیصلہ کیا تھا تو مجھے چاہیئے تھا کہ اپنا ڈاکٹری معائنہ کرا لیتا۔ اور اب تمہاری زندگی کے ساتھ جُرم کرنے کا احساس مجھے اس وقت تک چین نہ لینے دے گا جب تک تمہیں نئی زندگی نہ مل جائے۔"

"شاداں!" یکایک وہ بولے جیسے انہیں کچھ یاد آگیا ہو۔

"شاداں، ڈاکٹر ریاض جو تمہارے معالج بھی ہیں اور میرے بھائی بھی، ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

شاداں، شوہر کی بات نہ سمجھی۔ چپ رہی۔ رحمٰن صاحب پھر بولے۔

"اگر تم ریاض سے شادی کر لو تو۔۔!" شاداں ایک دم سے لرز اُٹھی۔ مگر نہ جانے کیوں وہ کچھ بول نہ سکی۔ دھیرے سے اپنی ہتھیلی ان کے منہ پر رکھی۔ پھر ان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

ڈاکٹر ریاض، بیرسٹر رحمٰن کے دور کے رشتے کے بھائی تھے۔ یہ بھی اسی شہر میں رہتے تھے۔ پہلے کبھی کبھار بیرسٹر صاحب کے گھر آتے تھے آج کل شاداں کی نفسیاتی بیماری کے علاج کے بہانے اکثر و بیشتر وقت ان کا رحمٰن منزل ہی کی یا شاداں کی نذر ہو رہا تھا۔ ادھر رحمٰن صاحب محسوس کرنے لگے تھے کہ ڈاکٹر ریاض جو اُن کی جنسی کمزوری کا راز جانتے ہیں، شاداں کے کچھ فطری طور پر قریب ہوتے جا رہے ہیں اور اس احساس کے بعد ہی سے رحمٰن صاحب کو اپنی شاداں کے لئے امید کی ایک نئی کرن، ایک زندگی بخش کرن دکھائی دینے لگی۔

مگر وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیا شاداں بھی ڈاکٹر ریاض کو پیار کرنے لگی ہے؟ ایک دن انہیں یہ موقع بھی مل گیا۔ وہ گھر سے باہر تھے اور ڈاکٹر ریاض شاداں کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ شام ڈھل چکی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ رحمٰن صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ شاداں کے کمرے کی طرف بڑھے۔ وہاں پہنچ کر رُک گئے۔ اندر داخل نہ ہو سکے۔ بس دیوار سے لگے ایک چور کی طرح ڈاکٹر اور شاداں کی باتیں سننے لگے۔

"شاداں بھابی، پتہ نہیں میرا جی یہ کیوں چاہتا ہے کہ تمہیں بھابی نہ کہوں۔ مگر پھر بیرسٹر بھیا کا خیال آتا ہے جنہیں میں پوجنے کی حد تک چاہتا ہوں۔ تم بھی انہیں بے حد چاہتی ہونا؟"

"ان کی چاہت کا اقرار کیسے کروں؟ کہاں سے زبان لاؤں۔ میں بیمار رہی اور وہ کئی کئی رات میری تیمارداری میں بھاگتے رہے۔ اتنے بڑے انسان ہو کر بھی مجھے کیچڑ سے نکال کر اپنے دل کے تخت پر بٹھایا۔ میرے لئے کیا کیا نہ کیا، مگر ڈاکٹر مجھے آج کل نہ جانے یہ کیوں محسوس ہونے لگا ہے کہ میرے دل میں کوئی چور دروازہ بن گیا ہے اور اس چور دروازے پر دھیرے

ہے کوئی دستک دے رہا ہے۔"
"کون ہو سکتا ہے وہ خوش نصیب؟" ڈاکٹر نے
پا۔ شاداں چپ رہی۔ اس کی اس چپ پر رحمٰن صاحب
قرار ہو اُٹھے۔ انہوں نے چاہا کہ دوڑ کر شاداں سے
ہیں "کون ہے وہ؟" مگر وہ صرف جھانک کر ہی
گئے۔ انہوں نے ایک جھلک ہی میں شاداں کی جھکی
پلکوں میں ڈاکٹر ریاض کے لئے اور خود اپنے لئے
جواب پڑھ لیا۔

"اچھا لو یہ دوا کی آخری خوراک پی لو۔ کل تم
لِ صحت کروگی۔ دیکھنا ہے کہ تمہاری صحت یابی
خوشی میں تمہیں سب سے قیمتی تحفہ کون دیتا ہے؟"

"سب سے قیمتی تحفہ یقیناً میرے سرتاج میرے
کا ہوگا" ڈاکٹر کے پیار بھرے ہاتھ سے دوا کا آخری
گھونٹ پیتے پیتے شاداں بولی اور اسی وقت بیرسٹر رحمٰن
کا دل نہ جانے کیوں رو پڑا۔

دوسری شام جب شاداں کے غسلِ صحت کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو رحمٰن صاحب اس کے پاس آئے اور اس کی پشت کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھیں بند کرتے ہوئے بولے۔

"بتاؤ تو میں کون ہوں؟"

شاداں بھی بچوں ہی کی طرح کھل کھلا پڑی۔ چپ رہ کر نہ بتا کر انہیں ذرا پریشان کرنا چاہتی تھی۔

"اللہ چھوڑیئے نا، بتاتی ہوں۔" اور جب انہوں نے چھوڑ دیا تو وہ ان کی گرفت سے نکل کر ذرا دور کھڑی ہوگئی اور شوخی بھری اداؤں سے بولی "جائیے، نہیں بتاتی واہ واہ۔"

اب ہنسنے کی باری ہے

"مجھے یہ کتا پسند ہے اور میں اِسے خریدوں گی۔ لیکن اس کی ٹانگیں بہت چھوٹی ہیں" لڑکی نے کہا۔

"میڈم اس کی چاروں ٹانگیں زمین تک پہنچتی ہیں" سیلزمین کا مختصر جواب تھا۔

•

ایک نامہ نگار اپنے ایڈیٹر کے پاس گیا اور بولا "مجھے ایک بہت عمدہ خبر ملی ہے۔"

"میں جانتا ہوں" ایڈیٹر نے جواب دیا "آدمی نے کتے کو کاٹا ہے۔"

"نہیں" رپورٹر نے کہا "بیل نے کانگریس کو۔"

•

ایک پادری صاحب ایک امیر کسان سے چرچ کے لئے ہر سال زیادہ سے زیادہ عطیہ دینے کے لئے کہتے۔ ایک سال انہوں نے کسان سے بہت زیادہ عطیہ کی مانگ کرتے ہوئے کہا "تمہارے کھیت بہت اچھے ہیں۔ خدا کی تم پر مہر ہے۔ اس دھرتی پر خدا کا بھی حصہ ہے۔ اس لئے تم خدا کے ساتھ حصے دار ہوئے۔ اور تمہیں اس کا حصہ اسے دینا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے" کسان نے کہا ——

"لیکن اتنا بڑا حصہ کیوں؟ کیا آپ نے اس زمین کو کبھی اس وقت دیکھا تھا جب وہ خود اس کی دیکھ بھال کرتا تھا؟"

•

ایک دکاندار اپنی قرضے کی رقموں کو وصول کرتا پھر رہا تھا۔ ایک جگہ پر ناامید ہو کر اس نے اپنی ایک اسامی کو مشورہ دیا "تم اپنی بیوی کو اتنا روپیہ کیوں دیتے ہو جب کہ تم اپنے پرانے بلوں کا حساب صاف نہیں کر سکتے؟"

شوہر نے جواب دیا "شاید میں اس کی بجائے آپ کو زیادہ اچھی طرح سمجھا سکتا ہوں۔ مگر یہ سوچ لیجئے کہ اس میں آپ کو بہت زبردست نقصان اٹھانا پڑے گا اور ایسا میں نہیں چاہتا۔"

•

ان کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا اور پھر وہ ڈوب گیا۔ شاداں کا یہ چنچل روپ ان کی یادوں کے دریچے میں پر پھڑپھڑاتے ہوئے انہیں وہاں لے گیا جہاں آج سے صرف ایک سال پہلے شاداں سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں اس یاد کے ساتھ ہی نمی اتر آئی پھر جیسے آنکھیں جل تھل ہونے لگیں۔

"آپ کی آنکھوں میں آنسو؟" شاداں ایک دم سے تڑپ اٹھی۔

"ہاں، تمہاری صحت یابی کی خوشی میں" وہ جیسے بہت دور، کوسوں دور سے واپس لوٹتے ہوئے بولے۔ پھر انہوں نے اپنے آنسو خود ہی جلدی جلدی پونچھ ڈالے اور ایک دم سے لہجہ بدلتے ہوئے، خوشی میں ڈوبی ہوئی پیار و شفقت میں رچی بسی ہوئی آواز میں بولے "شاداں، تم جلدی سے غسل کرکے میرے کمرے میں آجاؤ۔ وہاں میرا تحفہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

شاداں غسل کرکے مخملیں گاؤن میں لپٹی ہوئی جیسے ہی اپنے کمرے سے ہوتی ہوئی شوہر کے کمرے میں پہنچی اسی وقت ڈاکٹر ریاض بھی آپہنچے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی تحفہ تھا شاداں کے لئے۔ مگر شاداں نے ان کی طرف دھیان نہ دے کر رحمٰن صاحب کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کہاں چلے گئے؟ شاید لائبریری میں؟ مگر لائبریری سے ان کی کوئی کھنک نہ ملی۔ پھر بھی وہ نہ جانے کیوں دوڑ گئی لائبریری کی جانب جو رحمٰن صاحب کے کمرے سے ہی ملی ہوئی تھی۔

وہاں بھی نہ تھے۔ شاید کوئی ضرورت پڑ گئی، ابھی آجائیں گے، کہیں گئے ہوں گے۔ ارے انہوں نے تحفہ تو میز پر ہی سجا رکھا ہے۔ دیکھوں تو کیا ہے؟ اور وہ میز پر آجھکی ___ مگر یہ دو لفافے کیسے؟ اس نے رنگین لفافوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس پر لکھے نام پڑھے۔ ایک پہ اس کا اپنا نام لکھا تھا، دوسرے پر ڈاکٹر ریاض کا۔ اس کے اپنے نام کے علاوہ "شاداں ریاض" کیوں لکھا ہے؟ آج وہ بہت خوش رہے ہیں۔ اسی خوشی میں شرارت کر بیٹھے ہیں یہ ناموں کی بھی ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے خوشی میں گم ایک لفافہ خود لے لیا اور دوسرا ڈاکٹر ریاض کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ کی عنایتوں نے مجھے صحت بخشی ہے نا۔ اسی خوشی میں انہوں نے آپ کو بھی کوئی تحفہ دیا ہوگا۔ کھولئے نا!"

اور جب لفافے کھلے تو ان میں لکھا تھا:

"شاداں! غسلِ صحت کی مبارکبادی کے لئے ایک سرخ گلاب کا پھول ہے اس لفافے میں! سرخ گلاب تمہیں بہت پسند ہے نا۔ یہ زندگی کی زندہ دلی کی علامت ہے۔ لو، اب اس زندگی سے ہم آغوش بھی ہو جاؤ۔ جو میں تمہیں نہ دے سکا وہ ریاض دے گا! ہاں شاداں، اور میں تم سے دور اسی لئے جا رہا ہوں کہ تمہارے قریب رہنے سے، ریاض کے ساتھ تمہاری نئی زندگی میں کبھی کوئی خلل نہ پہنچے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تمہاری ہی زندگی کی خاطر تمہیں طلاق دے دی ہے۔ بعد عدت گذارنے کے تم ریاض سے ضرور شادی کر لینا۔ میری فکر نہ کرنا۔ میں بزدل نہیں ہوں، خودکشی نہ کروں گا، جہاں رہوں گا، اچھا رہوں گا مگر نادانستگی میں تم جس طرح میری زندگی میں قید ہو چکی تھیں، اب کوئی لڑکی قید نہ ہوگی! خدا تمہیں نئی زندگی مبارک کرے۔"

"ریاض میرے بھائی! لفافے پر "شاداں ریاض" بھی لکھا ہوا ہے۔ اب اس نام کی لاج تا زندگی تمہارے ہاتھ ہے۔ میرے راز سے تم واقف ہو۔ عمر میں تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ شاید میں تم سے اسی لئے شاداں کے سلسلے میں باتیں کرتے ہوئے ہچکچاتا سا تھا۔ اور اب جب کہ مجھے یہ یقین بھی ہو چکا ہے کہ تم دونوں صحیح روپ میں زندگی گذار سکو گے تو تم لوگوں سے دور جا رہا ہوں۔ میری شہر والی کوٹھی اور بینک کی ایک بڑی رقم شاداں کے نام ہے۔ تم خود بھی ایک امیر ڈاکٹر ہو۔ میں شاداں کے والدین کے علاوہ بھی بہت سے مفلس اور نادار لوگوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔ جہاں بھی رہوں گا، انہیں کسی اور ذرائع سے مدد دیتا رہوں گا۔ مگر میری خواہش ہے کہ شاداں کے والدین کو میری شہر والی کوٹھی میں مستقل طور پہ بلا لو تاکہ مجھے یہ بھی احساس رہے کہ میرے والدین ہی شاداں کے والدین کے روپ میں میری کوٹھی میں رونق افروز ہیں۔ مجھے ڈھونڈنا نہیں، اور شاداں کے ساتھ خوش رہنا۔"

پاکستان

جو کبھی ہندوستان کا ہی ایک حصہ تھا

مقالہ

رامیشور ٹانٹیا

میں رہتے ہوئے وطن کی کشش کا اندازہ
ن نہیں ہوتا۔ لیکن غیر ملکوں میں زیادہ
یے تک رہنے کے بعد وطن کے تئیں کتنا
، کتنا لگاؤ ہوتا ہے، اس کا احساس تو
ں تجربے سے ہی ہو سکتا ہے۔
اِس بار کی غیر ملکی سیاحت میں گھر
یاد ذرا جلدی ہی ستانے لگی۔ ہم دُور
ں میں جاپان سے امریکہ گئے اور پھر یورپ
، ترکی ہوتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ میں لبنان
راجدھانی بیروت پہنچے۔ اب تک کی سیاحت
ں دلچسپ رہی تھی۔ سفر کے ساتھی
ممبر پارلیمنٹ جناب پربھو
ں ہمت سنگھکا
ناب
ار
الکا صاحب۔
دُنیا کا چکر لگانے میں
دن گئے۔ لیکن اب ۵۱ واں دن نہ
اچھا لگا اور نہ میرے
یوں کو۔

سے پروگرام میں ابھی پاکستان کی سیاحت
، تھی لیکن میرے دونوں ساتھی کلکتہ کی طرف
، گئے۔ میں اپنے پروگرام میں ردّ و بدل نہیں
تا چاہتا تھا۔ اس لئے ۳۰ اگست ۱۹۶۴ کو رات
ا بجے میں کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔
بیروت سے کراچی بمشکل ڈھائی گھنٹے کی
وار ہے۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، دُور
رسے میں بیروت کی روشنیاں جھلملاتی ہوئی
ں سے غائب ہو گئیں۔ اکتاہٹ محسوس ہو رہی
ں۔ سوچا۔ قریب بیٹھے ہمسفر سے کچھ باتیں کروں۔
ما تو اونگھ رہے تھے۔ ہوسٹس نے مجھے کچھ
ان دیکھ کر شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ

پوچھا "چائے یا کافی؟ اپنی پسند بتائیے۔"
"کچھ نہیں، شکریہ" میں نے جواب دیا
اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے
لگا۔
جیٹ ہوائی جہاز کی رفتار تیز تھی مگر میرا
دماغ اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ
رہا تھا — ہندوستان اور پاکستان ... دلّی اور
راولپنڈی ... ہندو اور مسلمان ... انگلینڈ اور ہندوستان
... ستیاگرہ ... خلافت ... سامراجی جبر و ستم اور
لوٹ کھسوٹ کی آندھیاں ... گاندھی جی ... جناح
صاحب ... دنگے فساد ... چیخ اور
پکار ....
"ہم کراچی
پہنچ
رہے ہیں۔ کمر بند
کس لیں" ہدایت
سنائی دی۔ محویت ٹوٹی — چند
ہی لمحوں میں جہاز کے پہئے زمین کو چھو
گئے۔ گھڑی دیکھی رات کا
ڈیڑھ بجا تھا۔

اوپر سے دیکھنے پر زمین بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔
کراچی کے ہوائی اڈّے پر ہندوستان ہائی
کمیشن کے اوّل سکریٹری اور ایک دُوسرا افسر
مجھے لینے کے لئے آئے تھے۔ اُن کی مدد سے
کراچی کسٹم کی جانچ پڑتال سے چھٹی پائی اور سیدھا
ہوٹل ایئر فرانس کی طرف روانہ ہو گیا۔ جن
ملکوں سے میں ہو کر آ رہا تھا، وہاں کے ہوٹلوں
کے مقابلے پر اس ہوٹل کو کمتر درجہ کا پایا۔ تاہم
یہاں انتظام اچھا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند
میں کھو گیا۔
صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ اگست کا مہینہ تھا۔
دھوپ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ سرد

ملکوں کی سیاحت سے لوٹ رہا تھا اس لئے یہاں گرمی کچھ زیادہ محسوس ہوئی۔ تیار ہونے کے بعد ناشتہ کیا اور دس بجے ہندوستانی ہائی کمیشن کے دفتر پہنچ گیا۔ دلی سے وزارت خارجہ نے میرے پروگرام کی اطلاع پہلے سے ان لوگوں کے پاس بھیج دی تھی اور ضروری ہدایات بھی دے دی تھیں — غرض میرے لئے پروگرام پہلے سے طے تھا۔

کچھ وقت باقی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کا مقبرہ ہی دیکھ لوں۔ زیادہ تر غیر ملکی مہمان ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی راج گھاٹ پر گاندھی جی کی سمادھی پر لوگ عقیدت و محبت کے پھول چڑھاتے ہیں — قائداعظم کا مزار کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ کسی پیر کے مقبرے جیسا ماحول تھا۔ قریب ہی وزیراعظم جناب لیاقت علی خاں مرحوم کا مقبرہ بھی تھا۔

ہمارے ہائی کمیشن نے مجھے پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ پاکستان میں پابندیاں کافی ہیں خاص طور پر ہندوستانیوں کے لئے — اس لئے جو اچھا لگے اسی کا ذکر کریں اور جو اچھا نہ لگے اس پر خاموشی اختیار کریں۔

کراچی شہر کے جس حصے سے میں گذر رہا تھا، اس میں کوئی نیاپن نہیں تھا۔ یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کلکتہ کے سرکس ایونیو یا بیگ بگان سے گزر رہا ہوں — غیر ملکوں میں لوگ ہندوستانی شکل دیکھ کر نظریں اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم شکل ہونے کی وجہ سے ایسی کوئی بات نہ تھی۔

لنچ کے لئے ہوٹل پہنچا — بہت دن بعد ہندوستانی کھانے کا ذائقہ نصیب ہوا۔ ویسے تو غیر ملکوں میں بھی کبھی کبھی اپنے سفارت خانوں میں ایسا موقع ملتا رہا تھا تاہم وہاں اس طرح کا خالص ہندوستانی کھانا نہیں بن پاتا تھا۔ کھانے کے دوران پاکستانی مہمانوں کے ساتھ صرف رسمی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ کیونکہ ہمارے ہائی کمیشن نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ سیاسی بات چیت کو یہاں کی حکومت پسند نہیں کرتی۔ تھوڑی ہی دیر میں فضا کچھ گھٹی گھٹی سی معلوم ہونے لگی۔

یہاں سے میں پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کے چیرمین سے ملنے گیا۔ دراصل ہماری اس ساری سیاحت کا مقصد ہی یہ تھا کہ مختلف ملکوں کی اقتصادی صورت حال نیز تنظیم اور ترقی کا مطالعہ کریں۔ یہاں کا ماحول کچھ مختلف پایا۔ منصوبہ بندی کمیشن کے چیرمین علی صاحب نے پاکستان کے اقتصادی منصوبوں، ترقی اور کامیابیوں سے متعلق معلومات مہیا کیں۔ ان صاحب کی شرافت اور گرمجوشی سے دل کا سارا غبار صاف ہو گیا۔ ہماری بات چیت کے دوران وہاں دوسرے کئی محکموں کے افسر بھی موجود تھے اور سب گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ بات چیت کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ قریب قریب یہ سبھی افسر غیر منقسم ہندوستان میں مختلف سرکاری عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ اور اب بھی ان کے رشتہ دار ہندوستان میں ہیں۔

پاکستان میں اقتصادی ترقی ابھی زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے امریکہ اور عالمی بینک نے زیادہ فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ سیٹو سینٹو وغیرہ فوجی معاہدوں کا رکن ہونے کی وجہ سے اربوں روپے کے اچھے قسم کے ہتھیار (ٹینک - طیارے وغیرہ) پاکستان کے حکمرانوں کو کمیونسٹوں کا مقابلہ کرنے کے نام پر امریکے مفت ملے جب کہ ہندوستان کو اپنی ضرورت کا ہر ہتھیار نقد خریدنا پڑا۔ تقسیم کے وقت پاکستان کے پاس ایک بھی جوٹ مل نہیں تھا، لیکن غیر ملکی زر مبادلہ کی بدولت پاکستان نے جوٹ



تانا شاہی کی تاریک پرچھائیوں سے گھری ہوئی پاکستان کی کچھ عورتیں۔۔

، صنعت میں اچھی ترقی کرلی۔ کپاس بھی مغربی
ستان میں اچھی قسم کی ہوتی ہے۔ اس بات
ر مدِنظر رکھتے ہوئے پاکستان میں کپڑے کی
ں بھی قائم کرلی گئی ہیں۔ بڑی بڑی نئی صنعتوں
ں کاغذ اور سیمنٹ کے کارخانے شامل ہیں۔

س میں شک نہیں کہ پاکستان نے اپنے
ا مغربی خطے میں تو صنعتی ترقی اور زراعت
ترقی پر توجہ دی ہے لیکن مشرقی پاکستان
لحاظ سے غفلت کا شکار رہا ہے۔ مجھے ایسا
کہ غذائی اجناس کے معاملے میں ہماری
پاکستان کو بھی غیر ملکی امداد پر انحصار کرنا
ہا ہے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کی قلت ہماری
پاکستان میں بھی ہے۔ لیکن روزمرہ کے
تعمال کی چیزوں کے کارخانوں کی تو وہاں
ت کمی ہے۔ اِس لئے غیر ملکوں سے درآمد
ہاں کی حکومت نے کڑی پابندیاں لگا رکھی
۔ بہرحال ہم نے یہ محسوس کیا کہ پاکستان
نی ترقی کے منصوبوں میں کوئی خاص کامیابی

نہیں ہوئی ہے اور نہ وہاں خوش حالی ہی ہے۔
بات چیت کے دَوران اُن افسروں نے
ہمیں شہر کی کچھ نئی عمارتیں دکھائیں۔ اِن میں
پاکستان ریزرو بینک کی عمارت بہت بڑی
اور شاندار تھی۔ بلاشبہ حکومت پاکستان نے اس
عمارت کی تعمیر میں ایک قابلِ دید مقام کی ضرورت
کو مدِنظر رکھا ہے اور غیر ملکوں کی طرف سے آنے
والے سرکردہ سیاحوں کو یہ عمارت ضرور دکھائی
جاتی ہے۔ اس عمارت کی لائبریری میں میں
نے دیکھا کہ ہندوستان کے بہت سے اخبارات
ورسائل موجود ہیں۔ اس بنک کے ملازموں میں
سے اکثر کسی وقت ہندوستان میں کام کرچکے
تھے۔ ایک بزرگ تو میرے ضلع سیکر کے ہی
ملے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ کراچی آکر بس
گئے تھے۔ ذرا تنہائی میں انہوں نے مجھ سے
دبی زبان میں درخواست کی "جناب کو تھوڑی
سی تکلیف دے سکتا ہوں؟"
"شوق سے" میں نے کہا۔
جھٹ ۲۰ روپے میرے ہاتھ میں دبا

کر کہنے لگے "فلاں گاؤں میں میری لڑکی اور نواسا ہے" اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کہنے لگے "زمانہ ہوگیا انہیں دیکھے۔ نواسے کی تو صرف تصویر ہی دیکھی ہے۔ آپ کو جب بھی اس طرف جانے کا موقع ملے۔ ایک بے کس باپ اور مجبور ناناکی طرف سے اِن روپوں کے پھل اور مٹھائی انہیں دے دینے کی گزارش ہے۔"

ان کا گلا بھر آیا۔ میں نے روپے لئے نہیں لے بھی کیسے سکتا تھا! وعدہ کر لیا کہ امتحان پہنچ کر ان کی سوغات تو پہنچا ہی دوں گا۔ اور اگر موقع ملا تو ان کی لڑکی اور نواسے سے بھی مل آؤں گا۔

دِل میں ایک تجسس تھا کہ دیکھوں یہاں ہندوؤں کا کیا حال ہے۔ راہ چلتے یا سرکاری دفتروں میں کہیں بھی کوئی ہندو دکھائی نہیں دیا تھا۔ پتہ چلا کہ شہر کراچی میں کچھ ہندو اب بھی رہتے ہیں۔ ان کا ایک الگ محلہ ہے۔ ہمارے ہائی کمیشن نے ایک ڈرائیور کو کار دے کر میرے ساتھ کر دیا۔ ہائی کمیشن کے افسر اس محلے میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ حکومت پاکستان کو ان کا وہاں جانا پسند نہیں تھا۔ خیر، میں ہندوؤں کے محلے میں گیا۔ وہاں کے بزرگ سندھی شری ہیرا چندے ملا۔ بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ ان کے تمام رشتہ دار اپنے گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے ہیں۔ میں نے پوچھا "اتنا خطرہ اور تکلیف برداشت کر کے آپ ہی یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟"

کہنے لگے "ان کی بوڑھی ماتا جی ان کے خاندان کے قائم کئے گئے شری کرشن مندر کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ اِس لئے وہ یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔"

محلے کے کچھ دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے پر پتہ چلا کہ وہاں ہندوؤں پر بہت ہی سخت نگرانی رہتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں اور عام شہری سہولتوں سے وہ محروم ہیں۔ تیسرے درجے کے شہریوں کا درجہ بھی انہیں حاصل نہیں۔ محلے کے لوگ غروب آفتاب کے بعد عام طور سے اپنے دائرے میں ہی رہتے ہیں۔ رات کو کہیں باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتے۔

دِل افسردہ ہوگیا تھا۔ سوچا، کراچی کے بازاروں میں ذرا گھوم آؤں۔ دکانوں میں کلکتہ دِلی جیسی رونق نہ ملی۔ غیر ملکی چیزیں ہی زیادہ آئیں۔ کراچی ابھی کچھ زمانہ پہلے تک پاکستان کی راجدھانی تھی لیکن اب صدر ایوب خاں نے اسلام آباد (راولپنڈی) کو یہ شرف بخشا ہے۔ کراچی ایک اچھی بندرگاہ اور تجارت کا مرکز



مغربی پاکستان کے خیبر درے والے پٹھان



کراچی کی مشہور بندرگاہ

...ہے پاکستان کا بڑا شہر ہے بلکہ یوں کہا
...تا ہے کہ اس کی اہمیت ہمارے کلکتہ اور
...جیسی ہے۔

ہائی کمشنر اس وقت کراچی میں نہیں رہے تھے۔ اس سے لیکن راست کے کھانے
...نظام ہائی کمیشن کے اوّل سکریٹری کی رہائش
پر تھا۔ کچھ پاکستانی ہندو شہری بھی مدعو تھے۔
...ہم مذہب لوگوں کے درمیان بات چیت
...یادہ آزادانہ رہی۔ پاکستان کی سیاسیات اور
...حکومت پر بات چل نکلی۔ مہمانوں نے بتایا
...نا شاہی اور فوجی حکومت طاقت اور زبردستی
...بل بوتے پر ہی ٹکی رہ سکتی ہے۔ اور حکومتِ
...تان نے اِس سمت میں ڈھیل نہیں آنے
...ہے۔ کشمیر کے سوال کو زندہ رکھنا پاکستان
...حکمرانوں کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ
...سے وہاں کے مسلم عوام کے فرقہ وارانہ
...ت کو اُبھار کر جہاں ایک طرف انہیں شہری
...کے مطالبے سے باز رکھنے میں آسانی ہوتی
... وہاں دُوسری طرف اکثر اسلامی ممالک میں
...دستان کے خلاف ناراضگی بھی پھیلائی جا سکتی
...ہے۔

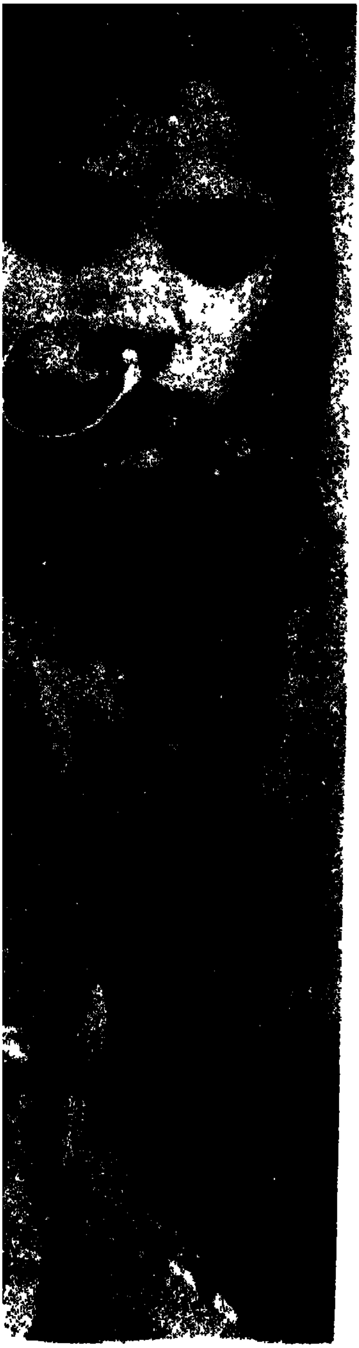
اب میری سمجھ میں آیا کہ حکومتِ پاکستان
...لوگوں کو سیاحت کے لئے ویزا دینے میں پس
...پیش کیوں کرتی ہے۔ بیروت میں ہندوستانی
...ت خانے کی سخت کوشش کے باوجود
...صرف کراچی میں قیام کا ویزا ہی مل سکا
...یہاں کراچی میں جب لاہور کے لئے اجازت
... تو صاف انکار کر دیا گیا۔ لیکن میرا دل نہیں
...نا تھا لاہور کی شان و شوکت تقسیم سے
... دیکھ چکا تھا اور اب اِتنے لمبے عرصے کے
...موجودہ لاہور کو پھر سے دیکھنے کے لئے
...مچل رہا تھا۔ آخر سر توڑ کوشش کرنے کے بعد
...سے ہائی کمیشن کو میرے لئے صرف ایک

دن کا ویزا مل سکا۔ میں اُسی دن چل پڑا۔

ہوائی جہاز میں بیٹھا اُڑا جا رہا تھا۔ نیچے ہریالی ندی اور نالے دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل ہمارے ملک کا سا منظر تھا جیسے فطرت اِس ایک ملک کو ہندوستان اور پاکستان میں بانٹنے کے لئے تیار نہ ہو۔ ہرے بھرے کھیت، باغ باغیچے۔ یہ سب ہی تو ان ہی ندیوں کی بدولت ہیں، جو آج کے ہندوستان کی سرزمین سے بہتی ہوئی آتی ہیں۔ پاکستان چاہے اپنے لئے عربی اور ایرانی تمدّن کو زیادہ باعثِ فخر سمجھے لیکن اس کی اپنی بنیاد تو اسی قدیم ہندوستانی تہذیب پر ہے، جس کا آغاز سندھ کی وادی سے ہوا۔ افغانستان مُسلم ملک ہے لیکن وہ بھی آج قدیم آریائی تہذیب و تمدّن کو ہی اپنی اساس مانتا ہے۔ پھر کیا صرف پاکستان ہی اپنے تمدّن کے اصل سرچشمے سے خود کو جُدا کر سکے گا؟ شاید نہیں۔

سفر لمبا نہیں تھا۔ لگ بھگ سوا گھنٹے میں لاہور پہنچا۔ ہوائی اڈّے سے پاکستان انٹرنیشنل ایئرویز کے شہری دفتر میں گیا۔ یہاں انڈین ایئر کارپوریشن کے مقامی انچارج مسٹر جوزف کو کراسی وقت کراچی سے ہمارے ہائی کمیشن کا فون میرے بارے میں پہنچ گیا تھا۔ اُنھوں نے ہر طرح سے میری مدد کی اور میرے لئے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام کر دیا۔ لاہور میں تقسیم سے پہلے کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ اِس شہر کی تو نرالی ہی شان رہی ہے۔ پہلے یہ ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا۔ [illegible] نئے فیشنوں کی [illegible] یہیں سے [illegible] تھی۔ [illegible] اس کے [illegible] کو چار چاند لگاتے تھے۔ تجارت، صنعت و حرفت اور تعلیم [illegible] اہم مرکز تھا۔

صرف ایک دن کا ویزا ملا تھا۔ جو کسی بھی بڑے شہر کے لئے ناکافی تھا۔ پھر لاہور



کے لئے تو بہت ہی ناکافی۔ کیونکہ اس شہر کے ساتھ ہماری تاریخ کی کتنی ہی تہیں لپٹی ہوئی ہیں۔ سوچا۔ کار کی بجائے بس میں ہی شہر گھوم آؤں تاکہ لوگوں کی بات چیت سُننے کو ملے۔

•

بس لاہور کی سڑکوں سے گذر رہی تھی۔ لوگوں کا چڑھنا اُترنا، بات چیت کا لب و لہجہ سب اپنے ہاں جیسا تھا۔ بسوں میں بھیڑ بھاڑ تو ہماری دلّی اور کلکتہ جیسی ہی تھی مگر بسیں ہمارے ہاں سے کچھ زیادہ ہی گئی گذری حالت میں تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک دیکھا۔ دو صاحبان بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کب بس میں آکر بیٹھے۔ نظریں ملتے ہی قریب آئے اور سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ "کب آئے؟ کہاں جائیں گے؟ شہر میں کس کس سے ملے؟" وغیرہ۔

کچھ کوفت سی ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ مختلف ملکوں کے اقتصادی حالات کا مطالعہ کرتا ہوا کراچی سے یہاں آیا ہُوں اور کل ہی دلّی جاؤں گا۔

ایک ساتھ دونوں کی آواز گونجی "پاسپورٹ؟ ۔۔ ویزا؟" کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں سرکاری جاسوس تھے۔

پاسپورٹ اور ویزا ساتھ لے کر نہیں چلا تھا۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ وہیں چل کر پاسپورٹ اور ویزا دکھا دوں گا۔ واپسی کا وقت بھی بتا دیا۔ مگر سب بے سُود۔ دونوں ساتھ ہی چپکے رہے۔

بس دوڑتی جا رہی تھی۔ لیکن مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔ بے دِلی سے کھڑکی کے باہر بھاگتے ہوئے مکانوں اور دُکانوں کو دیکھ رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج کے منار کی وہی پُرانی گھڑی۔ جامع مسجد کا وہی عالیشان گنبد۔ گول باغ، گورو ارجن دیو کی سمادھی اور لاہور کا قلعہ .... سبھی کچھ تو وہی ہے

آنگن کے پھول

—— ایم کوشیادی رابچے

ری حسین رفاقت تری حسین خلوت
ر نہ یاد کبھی آئے تو شبِ ہجراں
عائیں موت کی مانگا کرے دلِ ویراں
ستارے رقص میں ہیں ماہتاب ہے سرشار
یہ خشک شاخِ تمنا، یہ آنسوؤں کی پھوار
تمام فصلِ خزاں بن گئی ہے فصلِ بہار

ا یہ پیکرِ سیمیں ترے یہ عارض و لب
زور قیر کے بس میں ہیں پھر بھی میرے ہیں
بے اُٹھ کے بند کواڑوں کو کھول آیا تھا
ہی سے صحن کے مرجھائے پھول مہکے ہیں
رات آتے ہی تو پھر بہار پر آئی ہے
رے کھلے ہوئے آنکھوں کے خواب چومے ہیں
جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا
خوشی پاکے مجھے، تیرے ہونٹ پھڑکے ہیں!

ی حسین حسین آنکھیں بڑی بڑی آنکھیں
ہی مہکتی ہوئی شب اور کھلی کھلی آنکھیں
رہی گرا گرا آنچل وہی گداز بدن
ہی حجابِ مسلسل، جھکی جھکی آنکھیں
تری حسین رفاقت، تری حسین خلوت
اگر نہ یاد کبھی آئے تو شبِ ہجراں
دعائیں موت کی مانگا کرے دلِ ویراں

پھر بدلا کیا! پورا کا پورا ماحول پہلے جیسا ہے۔

بس کچہری روڈ پر ایک تانگے کے پیچھے ذرا دھیمی چال سے چل رہی تھی۔ دیانند اینگلو کالج کا پھاٹک آیا۔ پہلے دیوناگری خط میں کالج کا نام عمارت کی محراب پر ہوا کرتا تھا۔ مگر اب انگریزی اور اردو میں "اسلامیہ کالج" لکھا ہوا تھا اسی طرح کئی مکانوں اور مندروں کی حالت دیکھنے میں آئی۔ پرانے دفتروں کے کتنے ہی مشہور اداروں اسپتالوں اور ٹرسٹوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا ہے۔ حکومتِ پاکستان تاریخ کو ہی مٹانے پر کمربستہ بیٹھی ہے۔ لیکن کیا وہ کبھی اس میں کامیاب ہو گی؟

کہتے ہیں کہ شری رام چندر کے بیٹے لَو نے لوکوٹ یعنی لاہور بسایا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ فتح کے لئے میں پورس کند۔ کوا سی شہر کے قریب راوی کے کنارے ایک آریہ رشی کی صاف تیس گزنی سن کر لوٹ جانا پڑا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی یادگار اور ویر حقیقت سنگھ کی قربانی کیا لاہور کے ذرے ذرے سے کبھی مٹ سکے گی؟

شام ہو چلی تھی۔ میں اپنے ہوٹل لوٹا۔ دونوں سی آئی ڈی سائے کی طرح ساتھ تھے میں نے انہیں اپنا پاسپورٹ اور ویزا دکھایا اور ساتھ ہی یہ کہنے سے بھی نہ چوکا کہ آپ اگر کبھی ہندوستان تشریف لائیں گے تو آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ وہاں کبھی نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں تو آج بھی کروڑوں مسلمان امن چین سے رہتے ہیں اور انہیں وہی حقوق حاصل ہیں جو وہاں کے ہندوؤں کو ہیں۔

اُن میں سے ایک ذرا شرمسار سا ہو کر کہنے لگا "جناب، ڈیوٹی کا سوال ہے۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ہماری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی مگر چارہ کیا ہے؟"

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سوچا کہ ابھی رات کا وقت باقی ہیں ہے۔ ۱۹۴۰ میں لاہور کی شام

سے بعد کی رونق دیکھی تھی، دیکھوں اب کیسا لگتا ہے۔ کھانا کھا کر انارکلی بازار چلا گیا۔ وہی دکانیں وہی سڑک۔ سب کچھ وہی۔ مگر نہ تو وہاں پہلے کی سی چہل پہل تھی اور نہ وہ مشہور و مشہور پرانے سائن بورڈ — ایسا لگا جیسے انارکلی زبانِ حال سے کہہ رہی ہو:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

بہت دیکھنے بھالنے پر بھی بازار میں نہ تو کوئی ہندو نظر آیا نہ سکھ۔ سُنا ہے کہ شہر میں ایک گوردوارہ ابھی تک بچا ہوا ہے۔ وہاں ایک گرنتھی رہتا ہے۔ لیکن اسے باہر والوں سے ملنے جلنے کی ممانعت ہے۔

دِلی میں پاکستانی ہائی کمیشن پاکستان کے ہندو سکھوں کے بارے میں جو بھی پروپیگنڈا کرتا ہے۔ وہ سب بالکل جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔

عجیب سی ذہنی حالت میں رات کو دس بجے ہوٹل لوٹا۔ بے چینی اور تھکاوٹ سے نڈھال بستر پر لیٹ گیا۔ اس رات نیند بڑی مشکل سے صرف دو گھنٹے کے لئے آئی لیکن اس مختصر وقفے کی نیند میں یہی دیکھتا رہا کہ پولیس کے سپاہی پکڑنے آ رہے ہیں۔

لاہور میں ہوٹل کے ایک ملازم نے چلتے وقت چپکے سے کہا تھا کہ اس کی بہن دلی میں رہتی ہے۔ اُسے ٹیلی فون پر کہہ دوں کہ اس کے بھائی نے سلام کہا ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے۔

دوسرے دن صبح انڈین ایئر لائنز کے مقامی منیجر مسٹر جوزف آئے۔ انہیں پچھلے دن کے اپنے تجربے سنائے۔ انہوں نے کہا "اسی خیال سے میں کل دن میں دو مرتبہ آپ سے ملنے آیا تھا۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کا یہاں اکیلے گھومنا ذاتی حفاظت کے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں تھا۔"

اگرچہ مسٹر جوزف اینگلو انڈین ہیں پھر بھی انہیں کئی طرح کی دقتیں یہاں اُٹھانی پڑ رہی تھیں۔ ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے پہلے الوداع کہتے وقت انہوں نے بڑی ہی عاجزی کے ساتھ کہا تھا "اگر آپ ہندوستان میں کہیں بھی میرا تبادلہ کرا سکیں تو میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا۔"

جہاز میں بیٹھا خیالات کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ کئی اسلامی ممالک سے ہو کر آیا ہوں ترکی، مصر، لبنان، مگر کہیں بھی ہندوستانیوں کے لئے اس طرح کی دشمنی اور شک و شبہ کا ماحول نہیں دیکھا۔ پھر اس ملک میں ہی کیوں؟ جو کل ہندوستان ہی تھا کیا اسلام کے نام پر بھولے بھالے لوگوں کو گمراہ کر کے اور اپنی تانا شاہی حکومت قائم کر کے بھی اس کے موجودہ حکمرانوں کی ہوس پوری نہیں ہوئی؟

دہ رات قطب مینار دکھائی دیتے ہی دل نے کہا۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ پاکستان زمانے کی ایک کروٹ ہی تو ہے۔ کون جانے زمانہ ایک کروٹ اور لے اور یہ بھی بدل جائے!

ایک راہ گذر پر

— فیض احمد فیض

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں — وہ حُسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں
ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں — ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں
شباب جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں — وقار جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزشِ پا پہ قیامتیں قرباں — بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

کہانی

دولت رام جوہری

ایک نئی زندگی

پربھا کو ذرا بھی یقین نہیں آیا کہ کوئی اُسے اب بھی اپنا سکتا ہے۔

مکان بہت بڑا نہ تھا۔ اسے بھی دو حصّوں میں بانٹ کر ایک کی جگہ دو مکان بنائے گئے تھے۔ اکثر لوگ اسے باہر سے ہی دیکھ کر اس کی طرف سے منہ موڑ لیتے تھے۔

میں تین برس سے اس کے ایک حصّے میں رہ رہا تھا۔ دوسرے حصّے نے ان تین برسوں میں کسی کرائے دار کا منہ نہ دیکھا تھا۔ میرے چاروں طرف سکون تھا اور شاید میں اس سے مطمئن تھا، کیوں کہ رادھا کی موت نے جو زخم میرے دل پر چھوڑا تھا، اس سے میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد مجھے اس کونے میں سکون ملا۔ یہاں میری کسک کو ابھارنے والا کوئی نہ تھا۔

آج عرصۂ دراز کے بعد میں نے اس دوسرے حصّے میں انسانی آواز سُنی۔ آج اس کی صفائی ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، دنیا میں کیا مجھ جیسا اور بھی آدمی ہے جو سب طرف سے مایوس ہو کر راہ فرار کی تلاش میں ہو؟

نوکروں چاکروں کا شور ختم ہو گیا۔ میرے پڑوس میں پہلے ہی جیسی خاموشی رہنے لگی اور میں بھول گیا کہ مکان کے دوسرے حصّے میں صفائی بھی ہوئی تھی۔ ہفتے گذر گئے، مگر اس مکان کے کرائے دار کا منہ نہ دیکھا۔ میں بہت زیادہ حیران و متعجب تھا۔

میری بے مقصد راتیں ہی میری دولت تھیں۔ میں انہیں ان یادوں سے سنوارتا رہتا جو ہماری (میری اور رادھا کی) دو سال کی زندگی میں مجھے حاصل ہوئی تھیں۔ میں جاگ رہا تھا — اپنے حسین ماضی میں کھویا ہوا۔ قریب کے کمرے سے اچانک گھٹی ہوئی سسکیاں سنائی دیں۔ یہ ہلکی سسکیاں تھیں جیسے کوئی بہت جھگڑے، بہت اذیتیں برداشت کر کے انہیں دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کبھی کبھی دل کو چیر جانے والی آہ بھی سنائی دے جاتی تھی۔

صبح ہو گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ دوسرے حصّے میں کوئی کرائے دار آ گیا ہے۔ بڑے خاموش تھے وہ لوگ۔ کیوں کہ دن میں بھی مشکل سے ہی کوئی بات وہاں سنائی دیتی۔ رات ہوتے ہوتے جو تھوڑی بہت آواز کبھی کبھار پیدا ہو جاتی تھی وہ بھی ختم ہو کر سناٹا چھا گیا۔ مگر آدھی رات ہوتے ہوتے پھر وہی الفاظ اور گھٹی سسکیاں شروع ہو گئیں جو سویرے تک چلتی رہیں۔

ایک ہفتہ، دس دن گذر گئے۔ لیکن اس معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان سسکیوں کی کسک مجھے بے چین کرتی رہی۔ میرا دل اس تکلیف کو بانٹنے کے لئے تڑپنے لگا۔ آخر میں اپنے آپ کو زیادہ نہ روک سکا۔

ایک دن یہ جاننے کے لئے کہ کون اِس مکان میں رہتا ہے، میں دروازے سے باہر آیا ہی تھا کہ دوسرے حصّے کے دروازے سے ایک نوکرانی نکلی۔
"نئے کرائے دار کے یہاں کام کرتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا "میں مکان کے اس حصّے میں رہتا ہوں۔ گھر کے مرد کیا گھر پر ہی ہیں؟"
نوکرانی مطمئن ہوگئی۔ اُس نے جواب دیا "بابو تو رات کو ملیں گے۔"
میں نے پھر پوچھا "اکیلے ہیں؟"
"ایک بیٹی ہے" اس نے جواب دیا۔
"تو شام کو ہی مل لوں گا" میں بولا اور اپنے کمرے میں آگیا۔
بیٹی! کیسی بدقسمت ہوگی وہ، جس کی درد بھری سسکیاں دل کو تڑپا دیتی ہیں۔ میں اُلٹے پاؤں لوٹ پڑا۔ اس غم زدہ کو دیکھنے کا یہی موقع تھا۔
نوکرانی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دستک دی۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھلا۔ میلی سی ساری میں ایک مرجھایا سا چہرہ میرے سامنے تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔
میں نے فوراً کہا "میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ سوچا، آج آپ لوگوں سے ملاقات کرلوں۔ ورنہ آپ سوچیں کہ کوئی عجیب آدمی پڑوس میں رہتا ہے۔ کیا کوئی مرد گھر پر نہیں ہے؟"
اس نے جواب دیا "پتا جی شام کو آئیں گے" اور چپ ہوگئی۔
"تو پھر کبھی آؤں گا" کہہ کر میں الٹے پاؤں واپس آگیا۔ میں نے صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی، لیکن اس کا پژمردہ چہرہ، سوجی ہوئی آنکھیں اور میلی ساری سب راز افشاں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھا۔
موقع پا کر میں اس کے والد صاحب سے بھی ملا۔ وہ کسی خاص کام کے تحت یہاں کچھ دن کے لئے قیام پذیر ہوئے تھے۔ اکیلی لڑکی ہونے کی وجہ سے اسے بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔ اس کے علاوہ نہ مجھے کچھ معلوم کرنے کی ہمت ہوئی اور نہ کچھ ان سے معلوم کرنے کی کوئی امید بندھی۔
کچھ دن اور بیتے۔ سسکیاں چلتی رہیں، حالانکہ ان میں اب کچھ تبدیلی آگئی تھی، لیکن ان کی تکلیف او گھٹن میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ میری بے چینی دن بد بڑھتی جارہی تھی۔ آخر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ اگلے د نوکرانی کے چلے جانے کے بعد ایک پرچہ لکھ کر ا کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا اور وہ میرے سامنے تھی۔
میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا "مجھے آپ سے کہنا ہے۔ کیا آپ مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیں گی؟"
وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
میں نے ایک پرچہ اسے دیا "آپ جس زبردست تکلیف کو برداشت کر رہی ہیں، آپ کی سسکیاں ا کا راز افشا کر دیتی ہیں اور میں پریشان ہو اٹھتا ہوں۔ میرا کوئی کام، میری مدد اس پر مرہم بن سکتا ہے؟ م روح اس کو دور کئے بغیر سکون نہیں پا سکتی۔"
"کیا میں کسی کام نہیں آسکتا؟" میں نے اس سے پوچھا۔
"انساں بے بس ہے۔ تکلیف بانٹی نہیں جاسکتی" اور وہ کچھ بے قابو سی نظر آنے لگی۔
میں پلٹتے ہوئے بولا "آپ دو چار لفظوں میں مجھے کچھ بتانے کی کوشش کریں۔ میں کل اسی وقت آکر آپ کی تحریر لے جاؤں گا۔"

دوسرے دن جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ اس کے باپ نے کھولا۔ انہیں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اسی ثانیے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے درشت لہجہ میں کہا "اندر آجاؤ۔"
میں ایک مشین کی طرح ان کے پیچھے پیچھے



ہی گیا۔ خود ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے مجھے قریب
لمی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے بیٹھ جانے کو کہا۔
م دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ یک لخت انہوں نے کہا
سا میں آپ کو ایک شریف آدمی سمجھوں؟"

میں ان کے اس سوال پر ان کا منہ دیکھتا رہ گیا، کچھ
دیچ کر جواب دیا "ضرور!"

میرا پچھلے دن کا پرچہ میرے سامنے کرتے ہوئے
بولے "یہ آپ کا پرچہ ہے۔ کیا یہ ایک شریف آدمی
کا کام ہے؟"

میں کچھ مشتعل ہو گیا، جواب دیا "یہ ایک شریف
دمی کی روح کی پکار ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے "کیا تم میری لڑکی
سے شادی کر سکتے ہو؟"

عجیب سا تھا یہ سوال، جس نے میرے وجود کو
مبہوت کر کر رکھ دیا۔ رادھا کی تصویر ایک لمحہ کے لئے میری
آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میں نے کہا "اگر اس تکلیف
کا یہی مداوا ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں، لیکن مجھے اس کا
یقین ہونا چاہیئے۔"

ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ وہاں آموجود

ہوئی۔ باپ کو مخاطب کرکے بولی "آپ اپنی آبرو کی
بہت زیادہ قیمت مانگ رہے ہیں۔ کیا دو جانیں آپ
کی انا کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟"

باپ نے گرج کر کہا۔
"بکواس بند کر لڑکی!"

میں نے انہیں خاموش کرتے ہوئے کہا "کیا
میں آپ کی بیٹی سے دو چار سوال پوچھ سکتا ہوں؟"
وہ اٹھ گئے "میں پندرہ منٹ میں واپس آؤں گا۔"

آج اس کے چہرے پر ایک عزم تھا۔ اس کا وہ
درد شاید دور ہو چکا تھا۔ میں نے اسے سر سے
پاؤں تک دیکھا وہ ایک بے جان پہاڑ کی طرح اٹل تھی
میں نے ہمت کر کے کہا "کیا ان پندرہ منٹوں میں
آپ مجھے میرے فرض سے آگاہ کریں گی؟"
وہ میری طرف دیکھتی رہی "انسان کے دل میں
اشتیاق کا غلبہ ہے جو ذرا سی آہٹ پر اس کا سبب
جاننے کے لئے اکساتا رہتا ہے۔ اس کے دب جانے
پر اس سے کچھ تعلق نہیں رہتا، لیکن اس اشتیاق کا
دب جانا انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں کیسے اُسے اپنا دل چیر کر دکھا سکتا تھا۔ کرب میرے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا، جسے دیکھ کر اس نے کہا "چاہے یہ آپ کی خواہش ہی ہو لیکن بات اس حد تک پہنچ چکی ہے جہاں سے واپس آنا ناممکن ہے۔ میں آپ کو صرف یہ بتا سکتی ہوں کہ میں گناہ آلودہ ہوں اور میرے پتا جی اس سے باعزت طور پر چھٹکارا پانا چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ انہیں کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"تو کیا اس سے آپ کی تکلیف رفع ہو جائے گی؟" میں نے معلوم کیا

"دنیا کو زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے گا" اس نے بلند حوصلگی سے کہا "میری تکلیف کا مداوا میرے پاس ہے ـــــ موت، جو مجھے ناامید نہ کرے گی۔"

"یہ ناامیدی کی انتہائی منزل ہے۔ کاش آپ مجھے تھوڑا سا موقع دیں،" میں پگھل کر بولا۔

لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا "اچھا تو سنئے۔ کچھ عرصہ پہلے یعنی قریب ایک سال تک میں خوش تھی۔ زندگی سُکھ اور خوشی کا ایک آشیانہ دکھائی دیتا تھا۔ میں کالج میں زیر تعلیم تھی۔ سہیلیاں، پکنک، پارٹی بازیاں، زندگی کے مختلف نام تھے۔ وقت آندھی کی سی تیزی کے ساتھ گذر رہا تھا۔ ایک سہانی شام کو ہمارا ایک پکنک کا پروگرام بن گیا۔" اس نے سرد آہ بھری

"دوسرے دن آٹھ بجتے بجتے ہم لوگ تقریباً ایک درجن لڑکے لڑکیاں پکنک کے لئے نکل پڑے۔ ایک خوبصورت چھوٹی سی جھیل، جسے چاروں طرف سے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے گھیر رکھا تھا، ہمارا محبوب مقام تھا۔ ہر طرف گھنے پیڑوں کی چھاؤں تھی۔ آسمان پر بادلوں نے ماحول کو اور بھی دل فریب بنا دیا تھا۔ ہم نے ایک اچھی صاف سی جگہ دیکھ کر اپنا اڈا جما دیا سب آگ جلانے کے لئے ٹوٹی لکڑیاں جمع کرنے لگے۔ حس کا مدھر منہ اٹھا چل دیا۔ اس جھیل میں دو چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ پانی کچھ دور تک چلا گیا تھا اسی کے ذریعے برسات کا پانی ایک چھوٹی سی ندی بن کر اس جھیل میں آتا ہوگا۔ میں اس پانی کے کنارے کنارے، کچھ آگے بڑھ کر دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"میں اپنی دھن میں اس طرح کھوئی تھی کہ آس پاس کا بھی احساس نہ رہا۔ ایک جگہ پہاڑی بالکل پانی کے کنارے سے آ ملی تھی۔ اُسے دیکھ، جیسے ہی میں نے پلٹنا چاہا کسی نے مجھے اپنی باہوں میں کس لیا۔ میری چیخ نکلنے سے پہلے ہی میرا منہ ایک چٹان جیسے سخت ہاتھ کے نیچے تھا۔ میں بہت چھٹپٹائی لیکن اس جانور سے رہائی نہ مل سکی۔ اس نے میرے سنہرے سپنے، میرے ارمان اپنے بھاری سخت جسم سے چور چور کر ڈالے۔ میں ایک لٹا ہوا مسافر تھی جو اپنا سب کچھ کھو چکی تھی۔ میں جب سب سہیلیوں کے پاس آئی تو میری حالت قابلِ رحم تھی۔ مجھے دیکھ کر

"پربھا میں تم پر رحم نہیں کرتا، تم بغیر اب میں زندگی کا تصوّر بھی نہیں

دو تین ساتھی ایک دم چلا اُٹھے "پربھا تو کسی سے کشتی لڑ کر آئی ہے" میں نے پہاڑی سے پھسل جانے کا بہانہ کیا اور اپنا زخم دبائے واپس آ گئی۔

"اس تباہی کے لئے میرے پاس سوا آنسو بہانے کے اور کیا چارہ تھا؟ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے تباہ کرنے کے لئے اس نے ایک اور طریقہ نکالا۔ میرے حمل کے آثار ظاہر ہونے لگے اور میں فاحشہ مشتہر کر دی گئی۔ اپنی آبرو کے تحفظ کے لئے پتا جی مجھے اس غیر معروف مقام پر لے آئے یہاں میں ایک بچّے کی ماں بن گئی اور ہم فوراً ہی ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ کے لئے مر گئے۔ اب میں بدچلن بدکردار اور ایسے بچّے کی ماں ہوں جو اپنی عزت، قدر، پیار اور وہ بے قصور بچّہ، سب کچھ کھو چکی ہوں۔" پربھا کی کہانی پوری ہو گئی۔

"کسی کو تم سے یہ چیز چھیننے کا اختیار نہیں ہے

تمہیں سب واپس مل جائے گا۔ اَبلا میں کمزوری کوئی جُرم نہیں ہے۔ خودداری کمزوری کو جُرم مان کر اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے" میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔

پربھا کے چہرے پر افسردگی طاری ہو چکی تھی۔

میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی "پربھا" میرے منہ سے نکلا۔

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر جھلملا رہے تھے۔

"آپ کا اشتیاق پورا ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔

اشتیاق! کیسا طنز تھا اس لفظ میں۔ کیا پربھا کو یہ یقین نہیں کہ میں اُسے اس گڑھے سے نکال کر پھر

سے درخواست کرتا ہوں۔ تمہارے

کرسکتا۔ مجھے تم سے پیار ہے پربھا"

ایک بار وہ زندگی دینے کی کوشش کروں گا جس کی وہ حق دار ہے۔ ممتا کہاں نعمت ہو گی اور کہاں لعنت، یہ انسان کا خودساختہ معیار ہے۔ کمزور ظلم کا شکار رہے یہ سراسر ناانصافی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ ہی اس کے لئے جدوجہد چلتی رہی ہے۔ پربھا خوبصورت ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ کسی اچھے خاندان میں جگہ پانے کی جائز حق دار ہے۔

"پربھا.... میں .... میں تمہیں قربان گاہ پہ چڑھنے دوں گا۔ مجھے تمہارے باپ کی تجویز سے اتفاق ہے" میں نے کہا۔

اُس کے پژمردہ ہونٹوں پہ ہنسی کی ایک لکیر نمودار ہوئی "انسان خیالات کی رَو میں بسا اوقات وہ کام کر گزرتا ہے جس کے لئے اُسے تاحیات پچھتانا پڑتا ہے۔ انسانی زندگی جوار بھاٹا سے بھرا ہوا ایک بڑا سمندر ہے۔ اس میں سب کسی غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر اِدھر اُدھر تیرتے رہتے ہیں۔

"آپ کی مہربانی کے لئے میں شکرگزار ہوں۔ میں ایک ایسا بوجھ ہوں جس سے چھٹکارا پانے کی تمنا ہر آدمی کو ہو سکتی ہے۔ میرے لئے ایک ہی راستہ ہے...."

"پربھا، مصیبت انسان کی عقل پر ایک آہنی پردہ ڈال دیتی ہے جس سے وہ اس سے مستفید نہیں ہو پاتا۔ میں بھی تمہاری طرح وقت کے ہاتھوں پٹا ہوا بے کس انسان ہوں، جو کل تک زندگی کو ایک بوجھ کے روپ میں ڈھو رہا تھا، جس کی زندگی سے امید، ولولہ سب رخصت ہو چکے تھے، لیکن تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تم پر رحم نہیں کرتا، تم سے اس کی درخواست کرتا ہوں، میری خشک زندگی میں امید کی کرنیں چمکا کر اس بے رحمی سے اُسے نہ ٹھکراؤ۔ میں تمہارے بغیر اب زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ مجھے تم سے پیار ہے پربھا"

"آپ بھول رہے ہیں۔ میں ایک بچے کی ماں ہوں"

"اس میں تمہارا کیا قصور ہے! یہ تو وقت کا گہرا مذاق ہے۔ اس کے لئے تم کو موردِ الزام ٹھہرانا ایک جُرم ہے۔ انسان اپنے اچھے بُرے کاموں کا پھل حاصل کرتا ہے۔ جو کام دوسرے کا ہے اس کا پھل تمہیں اپنے اوپر لادنا فضول ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی کی تلخی دور کر کے ایک نئی زندگی کی تعمیر کریں گے"

میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی "اپنی ایک 'ہاں' سے یہ نیا سنسار نہ بساؤ گی میرا؟"

پربھا پھپھک پڑی "میرا بچہ....."

کافی کوششوں سے دبائی ہوئی آواز ہچکیاں بن کر پھوٹ پڑی۔ میں نے اس کے دل کی بھڑاس نکل جانے دی۔ میرا ہاتھ اس کی پیٹھ پر تھا۔

"وہ ہمارا بچہ ہوگا پربھا" میں نے دھیرے سے کہا

اس نے اپنا آنسوؤں سے بھرا منہ میری طرف کیا۔ دو بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔

"پربھا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ایک پل اس نے میری طرف دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ دروازے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ●

آزاد

مقالہ

آزاد محبت، جسے انگریزی میں "فری لو" کہتے ہیں ہماری ہندوستانی تہذیب کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ یہاں ہی کیا، دنیا کی کسی بھی مہذب قوم میں بیسویں صدی سے پہلے اس کا چرچا نہیں تھا۔ یہ تو موجودہ دنیا کو روس اور کمیونزم کی دین ہے۔

جب ۱۹۱۷ء میں روس میں کمیونسٹ انقلابیوں نے روس میں زارشاہی کو ختم کر کے اپنا قبضہ جما لیا تو فتح کی خوشی میں انہوں نے سب پُرانے رسم رواج کو بھی ختم کر دینا چاہا۔ وہ سامراجیت کا نام و نشان مٹا دینا چاہتے تھے اور اس کی جگہ مارکسی اُصولوں کے مطابق ایک نئے سماج کی تشکیل چاہتے تھے۔ مارکسزم یا کمیونسٹ عقیدہ کے مطابق ملک کی سب جائیداد پر ملک کے تمام شہریوں کا ایک جیسا حق ہے۔ اب تک عورت بھی جائیداد ہی مانی گئی تھی، شادی سے پہلے والد کی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کی۔ چناں چہ عورت بھی اسی نئے اصول کی لپیٹ میں آ گئی۔

ایک عورت کا ایک ہی مرد کی بیوی ہو کر رہنا کمیونسٹوں کی نظروں میں پُرانے دقیانوسی سماج کی سخت گیری کی علامت تھا۔ اسی لئے وہ شادی کو نظر انداز کر کے آزاد محبت کا پرچار کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی بھی عورت کسی بھی مرد سے جنسی تعلقات رکھ سکتی ہے۔

تب اس پر سوال یہ پیدا ہوا کہ ایسے تعلقات سے پیدا ہوئے بچوں کا کیا کیا جائے؟ اُن کی پرورش و تربیت کی ذمہ داری کس پر ہو؟ یہ ذمہ داری انہوں نے سرکار کو سونپ دی۔

دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ انقلاب چاہے نہ ہوا ہو لیکن اس کے اصولوں کا اثر ضرور پڑا۔ یہ نئی آزادی کی لہر سب طرف دوڑ گئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ بہت سے ملک ابھی تک عہد وسطیٰ کے شہنشاہی سماج کی غلامی کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ ان ملکوں میں عوام طبقوں میں تقسیم تھے اور آپس میں ملنے ملانے کے اصول بہت سخت تھے یہ سختی نوجوان لڑکے لڑکیوں کے باہمی میل جول میں بھی پائی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر انگلینڈ ہی کو لیجئے۔ وکٹوریہ عہد تک لڑکے لڑکیاں آپس میں کھلے عام نہیں مِل جُل سکتے تھے۔ گھر کا کوئی نہ کوئی بڑا شخص ہمیشہ اُن پر نظر رکھتا تھا۔ یہ سختی ان کو اکھرتی تھی لیکن اس کی مخالفت کرنے کی کسی میں ہمت بھی نہ تھی۔ یہ ہمت کچھ تو دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں سے پیدا ہوئی اور کچھ روس کے انقلاب سے، باقی رہی سہی کسر پہلی جنگِ عظیم نے پوری کر دی۔ عورتوں کو گھر سے باہر نکل کر مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنا پڑا۔ اس میں نہ صرف آپس کی جھجک مٹ گئی بلکہ وہ آگ جو اب تک اندر ہی اندر سلگ رہی تھی بھڑک اُٹھی۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں نے سماج کے سب اصولوں کی خلاف ورزی کر کے ایک آزاد سماج قائم کرنا چاہا۔ آزاد محبت بھی اسی کا ایک پہلو تھا۔

آپ نے امریکہ اور یورپ کے آزاد جنسی تعلقات کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا۔ مانا

کیا شادی کے بغیر مرد عورت کا مل کر زندگی گذارنا آج کل فیشن ہو گیا ہے؟

ت سے واقعات بڑھا چڑھا کر سنائے جاتے
ں لیکن پچھلے دنوں وہاں کے مشہور و معروف
کٹر کنسے نے ایک کتاب لکھی ہے جو امریکہ کی موجودہ
ورتِ حال پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب
وں نے تقریباً ۱۲۰۰ افراد سے ملاقات کرکے
ں کے جنسی تعلقات کی صحیح طور سے معلومات
کے اور ان سے مختلف قسم کے ذاتی سوالات
یافت کرنے کے بعد لکھی ہے۔

ڈاکٹر کنسے کہتے ہیں کہ جن لوگوں سے انہوں نے ملاقات کی اُن میں چھوٹے بڑے، مرد عورت، امیر غریب سب ہی تھے اور جو سوال اُن سے پوچھے وہ بیشتر جنسیات سے ہی متعلق تھے۔ جیسے آپ کو جنسی واقفیت کب ہوئی؟ عورتوں سے دوستی کب اور کس طرح کی؟ یہ دوستی کتنی گہری تھی؟

جو جوابات ملے اُن کو پیشِ نظر رکھ کر ڈاکٹر کنسے نے جو اعداد و شمار دیئے ہیں اُن سے یہ واضح ہے کہ امریکہ میں بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو شادی سے پہلے ہی جنسی تجربہ نہیں کر لیتے۔ تقریباً ۷۰ فی صد افراد تو سولہ سے بیس سال کی عمر میں ہی جنسی تجربہ رکھنے لگتے ہیں۔ انگلینڈ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ روس کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں پیش کیا جا سکتا کیوں کہ اس بارے میں وہاں کے

محبت

وِملا



اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے لیکن وہاں بھی اس سے مختلف حالات کا امکان نہیں۔

جو کچھ بھی ہو ایک بات تو ظاہر ہے۔ جس سماج کی حالت ایسی ہو وہاں کئی طرح کے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں، جنہیں سلجھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ سب سے سنجیدہ مسئلہ تو ناجائز تعلقات سے پیدا ہونے والے بچوں کا ہے۔ ان کی پرورش کیسے ہو؟ انہیں سماج میں کیا مقام دیا جائے؟ ان کے لئے سرکار کی کیا ذمہ داری ہے وغیرہ۔

دوسرا مسئلہ شوہر بیوی کے آپسی تعلقات کا ہے۔ جہاں آزاد محبت کے زیر اثر وہ شادی سے پہلے ہی شوہر بیوی کا رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ وہاں شادی ایک طرح سے تو بے کار ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد بھی ان میں ایک دوسرے کے لئے وہ عزت اور محبت نہیں ہوتی جو پُرسکون اور مستقل ازدواجی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ ان کا دل مستقل طور پر شک و شبہ اور حسد کی آگ سے جھلستا رہتا ہے لیکن ایک 'مہذب اور ترقی یافتہ سماج' کے فرد ہونے کے باعث وہ اس بات کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

بہت سے گھروں میں تو شادی کے بعد بھی ناجائز جنسی تعلقات اور ازدواجی بے وفائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجلانا اور ذرا ذرا سی بات پر لڑنا تو ان کے لئے معمولی بات ہے۔ دھیرے دھیرے یہ معمولی نہ رہ کر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور طلاق کی نوبت آ جاتی ہے۔

امریکہ ہی میں دیکھ لیجئے طلاق کا رواج کتنا عام ہے، خصوصاً بچے کے طبقے کے لوگوں میں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ایک سے ناطہ توڑا، پھر دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے سے۔

بچوں کے منہ سے

ممی نے کسی بات پر منی کو ڈانٹ دیا منی رونے لگی۔ ڈیڈی نے اسے سمجھایا پاس بلایا اور چپ ہو جانے کے لئے کہا "اچھے بچے روتے نہیں چلو اب چپ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں ایک اچھا ساگڈ لا دیں گے۔" منی چپ ہو گئی۔

چند دن بعد بڑی دیدی کی شادی ہوئی وداعی کے وقت چھوٹی دیدی رونے لگیں۔ کچھ دیر تک تو منی نے بھی ساتھ دیا۔ پھر یکایک وہ چپ ہو گئیں اور دیدی سے کہا "ہم تمہیں بھی ایک گڈا دلا دیں گے۔ اب چپ بھی ہو جاؤ۔"

—— اظہر پرواز، نظام آباد

•

میرے دوست ہارمونیم کے بہت دلدادہ ہیں اکثر کافی رات تک ریاض کرتے ہیں۔ چونکہ مکان مختصر ہے اس لئے بچے اسی کمرے میں سوتے ہیں

جوانی کے زمانے میں تو یہ روزانہ کی شادی اور طلاق ایسی بڑی نہیں معلوم ہوتی، خصوصاً ان عورتوں کو جنہیں اولاد کا کوئی بندھن نہ ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے اور کشش کی قوت ڈھلتی جاتی ہے۔ ہر عورت کے دل میں یہ خواہش جاگتی ہے کہ وہ کسی ایسے مرد کا قرب پا سکے جو اسے ایک مستقل اور پرسکون کنبہ کی مالکن بنا کر رکھے۔

مغربی ملکوں میں بہت سی لڑکیاں ایسی ہیں جو جوانی کے اُمنڈتے ہوئے جذبے کے ساتھ بہہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے سکھ کے لئے اپنا سارا مستقبل نچھاور کر دیا۔ مطمئن گھر کی مالکن بن کر رہنے کے اچھے موقعوں کو آزاد محبت کے نظریئے پر قربان کر دیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب دنیا کی نظر سے چھپ کر

ایک رات ان کے چھوٹے بچے کی نیند ٹوٹی تو کہنے لگا "ابا جان آپ دن میں ہارمونیم کیوں نہیں بجاتے؟"
"آفس ہونے کی وجہ سے اسی وقت فرصت ملتی ہے۔"
یہ سن کر منا کہنے لگا "تو آپ رات میں آفس چلے جائیے اور دن میں ہارمونیم بجائیے۔"

—— احمد انور کمال، حیدر آباد

•

میں جب کالج سے لوٹا تو میری نظر اپنے چھ سالہ بھتیجے پر پڑی جو گھر سے نکل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک پاؤں اٹھاتا اور پھونک کر رکھ دیتا۔ پھر دوسرا پاؤں اٹھاتا اور پھونک کر رکھ دیتا۔ پھر پہلا پاؤں اٹھاتا اور پھونک کر رکھ دیتا۔

میں اس کی اس حرکت پر سخت متعجب ہوا اور قریب جا کر کہا "حمید، یہ کیا حرکت ہے؟"
اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "چچا جان، کل رات نانی اماں نے کہا تھا کہ بیٹا ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔"

—— سمیع اللہ خاں، مشیر آباد

•

ہم لوگ کچھ مذہبی باتیں کرتے جاتے تھے اور آپس میں باتیں بھی کرتے تھے۔ منی میری چھوٹی بہن بیچ بیچ میں اکثر بول پڑتی تھی۔ آخر بات خدا اور رسول کی آ گئی میں نے کہا "اچھا کلمۂ توحید کے معنی بتاؤ۔"
وہ بولے "نہیں کوئی معبود ہے سوائے اللہ کے اور حضرت ......"
"حضرت گنج میں رہتے ہیں" منی نے فوراً جواب دیا اور سب لوگ ہنس پڑے۔

—— شفیق احمد لکھنوی، بمبئی

اس فیچر کے لئے اپنے دلچسپ تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی —— ایڈیٹر

لونے میں پڑی زندگی کی مصیبتیں جھیل رہی ہیں۔ کلبوں میں جاتی ہیں، ناچتی گاتی ہیں اور مختلف طریقوں سے اپنے کو خوش رکھ کر اپنا غم غلط کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن اتنا سب کچھ کرنے پر بھی ان کی زندگی میں مایوسی چھا جاتی ہے۔

آسودگی

اور خوشی اسی نوجوان عورت کو مل سکتی ہے جس کے من میں آسودگی ہو، جس کو اپنے شوہر پر اعتماد ہو اور جو عمر اور حالات کے مطابق اپنی زندگی میں نئی کشش پیدا کر سکے۔

ہمارے ملک میں اب جب کہ نوجوان عورتیں معاشی اور سماجی آزادی حاصل کر رہی ہیں انہیں بھی ان باتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی یورپی اور امریکن بہنوں کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں اور کامیابی حاصل کریں۔

مرد فطرتاً رسیا ہوتے ہیں۔ انہیں لڑکیوں سے دوستی اور رومانی تعلقات رکھنا اچھا لگتا ہے۔ لیکن شادی کا سوال اٹھتے ہی وہ پیچھے ہٹنے لگتے ہیں کیوں کہ شادی تو ان کے لئے بندھن ہو جاتا ہے۔ بہت کم لڑکے ایسے ملیں گے جو صرف اپنی پسندیدہ بیوی چننے کے خیال سے لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں۔ زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ جن سے دوستی کرتے ہیں ان سے شادی نہیں کرتے۔ انہیں اس لڑکی کی پاک دامنی اور محبت پر شک ہونے لگتا ہے۔ انہیں شک ہوتا ہے کہ وہ ایک گھر والی بن سکے گی یا نہیں۔ اور یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ مرد کا اپنا دامن چاہے کتنا ہی داغ دار ہو، وہ اپنی بیوی کا کسی غیر مرد کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

اگر کسی مرد کو آپ سے حقیقتاً اتنی محبت

ہو جائے کہ وہ آپ کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرے تو اس کے دل میں آپ کے لئے عزّت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور وہ کبھی بھی کوئی ایسا کام نہ کرے گا جس سے آپ کی طرف کوئی انگلی بھی اُٹھا سکے۔ ایسے آدمی سے ملنے میں آپ کو جھجک نہیں ہوتی۔ خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ایسے مرد بہت کم ہیں جنھوں نے اپنا کردار اتنا پاک اور پختہ بنا لیا ہو۔

اس موجودہ وقت میں جب آپ آزاد ملک کی دہلیز پر کھڑی ہیں آپ کو یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیں۔ آزادی کے ساتھ ساتھ ایک اہم ذمّہ داری بھی آپ پر ہے، جو لڑکی اس ذمّہ داری کو نہیں سنبھال سکتی وہ آزادی کے لئے ابھی تیار نہیں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرے خیالات سے اتفاق نہ ہو۔ اگر یہ اختلاف رائے کچھ آپ بیتے کچھ جگ بیتے واقعات کے باعث ہو تو ہمیں ضرور لکھیے گا۔ ایسے واقعات نہ صرف قارئین ہی کے لئے دل چسپ ہوں گے بلکہ وہ ہمارا آپ کا تعاون برقرار رکھنے میں بھی بہت مفید ثابت ہوں گے۔

اس سلسلے میں میرے پاس ایک خط میرٹھ سے آیا ہے۔ رانی بہن اپنی ایک سہیلی کا قصّہ سناتی ہیں۔ جس کی شادی ہوئے تھوڑے دن ہوئے ہیں لیکن اچھا گھر اور خاوند پا لینے پر بھی سکھی نہیں رہتی۔ اسے رہ رہ کر اس بڑے واقعہ کی یاد آجاتی ہے جب ایک جوان نے، جس میں اس نے کچھ دل چسپی دکھائی تھی، ایک دن اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اسے چوم لیا تھا۔ اس پر اس نے جوان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

نوجوان نے معافی مانگی۔ اتنا سب ہونے پر بھی اس بڑے واقعہ کی یاد اس کے دل میں ایک طوفان سا پیدا کر دیتی ہے اور وہ بے چین ہو اٹھتی ہے۔ اپنے سر لعنت بھیجتی ہے، خود کو ذلیل اور کمینہ کہتی ہے اور جیسے بھی ہو اس داغ کو دھو ڈالنا چاہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا اپنے خاوند کو، جس سے اُسے سچّا پیار ہے، یہ راز بتا دینے سے اس کی آتما کو شانتی ملے گی؟

میں تو سمجھتی ہوں کہ اسے اپنے شوہر سے یہ بات ہرگز نہ کہنی چاہئے۔ جب وہ خود ہی پچھتاوے کے آنسو بہا رہی ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے اور وہ آئندہ ہوشیار رہے گی۔ ہاں اس نوجوان سے تعلقات بالکل توڑ دینے ہوں گے۔ شوہر سے ذکر کرنا رائی کا پہاڑ بنانا ہوگا۔ اسے شک ہونے لگے گا کہ بات اس سے بھی آگے بڑھی ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ طیش میں آکر کچھ بھلا بُرا کر بیٹھے جس سے بات کا بتنگڑ ہی بن جائے۔

اس واقعہ کو بھلا دینا ہی سب سے بہتر ہے کیوں کہ ازدواجی زندگی کی شروعات میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جس سے علاحدگی یا شکر رنجی ہو۔ جب وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننے پہچاننے لگیں تو باتوں ہی باتوں میں اس کا ذکر ہو بھی جائے تو نقصان کا کم امکان ہے ●

زبان بندی

مرکزی فرانس کے معدنیاتی علاقوں میں ایک حکم نافذ کیا گیا ہے کہ مُرغوں کی بانگ سے سوئے ہوئے شہریوں کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔ اب مرغ نے بانگ دی تو اس کے خلاف قانونی اقدام کیا جائے گا۔



لیکن آج میں بہت خوش تھا۔ آج ہم لوگوں نے بدلہ لے لیا تھا اور جواب میں تین لاشیں لٹکا پر پڑی تھیں۔
میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے



کہانی • مشتاق صدیق مونس

گری ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے والا انسان

ہندو مسلم فسادات کا زمانہ تھا۔ ہر چیز مہنگی تھی، سگریٹ سے لے کر روٹی تک۔
یٹ، جو تنہائی کی ساتھی ہے اور روٹی
ں کا منبع ہے۔ اور سستا تھا تو انسانی خون
نسانی جان۔ انسان مر مر کے گر رہے تھے،
کے گھر تباہ ہو رہے تھے، نسلیں برباد ہو رہی
، اور موت ——— تاریک غار میں رہنے
چڑیل ایک طرف بیٹھی انسانی خون چٹخارے
لے کر پی رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر
، بھیانک مسکراہٹ تھی۔
حالاں کہ کوئی تہوار تھا مگر لوگ گھر سے نکلتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ مبادا کوئی
چھرا مل جائے، مذہب پوچھے اور غیر مذہب
کر نیفے میں سے اُسترا نکال لے اور پھر
ذ لہو تو تہواروں کا خاص جزو ہے۔ لہو نہ
ہے تو تہوار چپ چاپ گذر جائیں۔

دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے؟ اور پھر کرفیو بھی ہے۔ کہیں کوئی خطرہ تو نہیں۔ پہلے میں نے دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا اور اطمینان کرنے کے بعد دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک اجنبی تھا۔ شکل سے نہ تو وہ مجھے ہندو نظر آیا اور نہ مسلمان۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آنکھوں میں عجیب قسم کی آسودگی تھی۔ اس کے ہونٹ اتنے سُرخ تھے کہ چیل تازہ گوشت کے دھوکے میں جھپٹ سکتی تھی۔ مجھے دیکھ کر جب وہ مسکرایا تو اس کے سفید سفید دانت دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔

"کیا چاہئے تمہیں؟ کون ہو تم؟" میں نے اپنے خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا

"میرا نام ڈاگی ہے۔ میں اس وقت بھوکا ہوں" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز میں ریگستانوں کی سی ویرانی کا سنّاٹا تھا۔

"اس دور میں انسان ہی بھوکے رہتے ہیں
میں تمہارے لئے کیا کروں ؟" میں نے جواب دیا۔
"جی مجھے بہت زیادہ بھوک لگی ہے۔"
"بھوک لگی ہے تو باہر نل سے ٹھنڈا پانی
پیئو اور سو جاؤ ــــ میرے پاس کیا لینے آئے ہو ؟"
"لیکن صاحب ، میری بھوک اور ٹھنڈا
پانی ۔ ... ذرا سوچئے ۔"
"اچھا تو یہ لو ،" میں نے ایک سوکھی روٹی
اس کی طرف اچھال دی ۔
"لیکن .... میری بھوک اور صرف ایک
سوکھی روٹی !"
"تم آخر اور چاہتے کیا ہو ؟"
"جی ، مجھے بھوک لگی ہے اور صرف انسانی
گوشت میری پیاس بجھا سکتا ہے ۔"
"انسانی گوشت !" میں چلا اٹھا "تم انسان
ہو کر انسان کا گوشت کھاتے ہو ــــ کتے ، آدم خور ۔
انسان ہو کر انسان کا گوشت ایک انسان سے مانگتے
ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی ۔"
"کیا کروں صاحب ، مجبوری ہے ۔ میں
بھی تمہاری طرح ایک انسان تھا ۔ میرا بھی ایک گھر
تھا ، بیوی تھی اور بچے تھے ۔ مگر فساد کے زمانے
میں کچھ انسانوں نے اتنی بے دردی سے اُن کو
موت کے گھاٹ اتارا کہ صرف میں بچا ہوں اور
سوچتا ہوں کہ جب انسان دین دھرم کی آڑ میں اتنا
خون خرابہ کرتا ہے تو ضرور اس کے پیچھے کوئی مقصد
ہوگا ــــ لوگ جب انسانوں کو مارتے ہیں تو
یقیناً ان کا گوشت بھی کھاتے ہوں گے اور اسی
لئے میں ..... لیکن خیر چھوڑو ــــ ہاں ، تم بھی
کبھی کھا کر دیکھو نا انسانی گوشت میں کتنا مزہ ہوتا ہے ۔"
"ہم انسان ہیں ، اشرف المخلوقات ہیں ،
مہذب ہیں ۔ بھلا ہم ..... ارے ، ہم اتنے وحشی
کہاں ہیں" میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا
"آہا ہا ہا ، کیا پارسا بنتے ہو ۔ تم انسان ہو ، مہذب
ہو ، تو پھر وہ کون ہیں جو انسانوں کو جنگ کی بھٹی اور

چھرا لگتے ہی وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا ۔ اس
یہ لاشیں تمہارے بھائیوں کی ہیں ۔ جب یہ

فساد کی آگ میں جھونک دیتے ہیں ؟"
"تم میرے پاس کس لئے آئے ہو ؟ جاؤ
باہر جاؤ ۔ فساد اور جنگ کا زمانہ ہے ۔ باہر بہت سی
لاشیں ملیں گی ، یہاں کیا لینے آئے ہو ؟" میں نے
جل کر کہا ۔
"جی نہیں ، جی نہیں ، ایسی بات نہیں ہے ۔ مجھے معلوم
ہوا ہے کہ اس محلے میں آج دو تین آدمی موت کے



سم ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ برابر گونج رہے تھے "ہوں!
تھے اور ان کا مذہب الگ تھا تو یہ تمہارے دشمن تھے اور آج تمہارے بھائی بن گئے۔

ی اتارے گئے ہیں۔ میں نے سوچا کر آج ان
ہ گوشت۔۔۔۔۔"
"تم آخر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے
کہا۔
"دراصل اس جگہ کا راستہ مجھے معلوم
۔ اور تم اس محلّے کے چودھری ہو۔ یہاں
ے ہی اشارے پر سب کچھ ہوتا ہے۔ تم
رہو گے تو کوئی بھی مجھے کچھ نہ کہے گا"
ڈاگی نے مجھے سمجھایا۔
"اور اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے
ردوں تو؟"
"تو پھر میں تمہارا خون پی جاؤں گا" وہ کھڑا
اس کی آنکھیں پتھر کی سی ہو گئیں اور بدن کی
نیموں کے طنابوں کی طرح تن گئیں۔ اس
وہ واقعی آدم خور نظر آ رہا تھا۔
مجبوراً میں نے اپنا چھرا اٹھالیا اور اس کے

ساتھ ہولیا۔ ڈاگی بہت ہوشیار تھا وہ میرے پیچھے
پیچھے آ رہا تھا اور اس کے بدن سے عجیب سی بو آ رہی
تھی، جیسے سڑے ہوئے خون کی سڑاند۔ باہر رات زخمی
ناگن کی طرح دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی ——
بستیوں میں اُلّو بول رہے تھے۔ کہیں کہیں انسانی
لاشوں کو بھوکے کتّے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے
"دیکھو، یہ جانور بھی سوچتے ہوں گے کہ پہلے
کی دعوت میں جوان مردوں کا سخت گوشت ملتا تھا
مگر اس دعوت میں عورتوں اور بچّوں کے باقاعدہ
کٹے ہوئے ٹکڑے ملے ہیں" ڈاگی طنز سے بڑبڑایا۔
"بس بس، بند کرو اپنی بکواس۔ وہ دیکھو،
وہاں لاشیں پڑی ہیں" میں مڑنے لگا

مگر میں واپس کیسے جا سکتا تھا۔ دراصل میں یہ
دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ انسانی گوشت کس طرح
کھاتا ہے۔ اور اسی لئے کچھ دور جا کر میں پلٹ پڑا



دھندلی روشنی میں وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ چھوٹ گیا جب میں نے دیکھا کہ وہ واقعی انسان کا گوشت کھا رہا ہے۔ مجھے اُبکائی آ رہی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا حالانکہ ان لاشوں میں سے ایک کا پیٹ خود میں نے چاک کیا تھا مگر میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی ان کا گوشت کھائے۔

اس سے پہلے کہ میں اگلا قدم اٹھاتا، میری نظر سامنے اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا، مسجد، گوردوارے اور مندر سے تین سائے نمودار ہونے لگے۔ اب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ کیوں کہ تینوں سائے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

"اے کیا کر رہے ہو تم؟" پہلا سایہ بولا

"میں ایک انسان ہوں اور انسان کا گوشت کھا رہا ہوں" ڈاگی نے جواب دیا

"ارے، چل بھاگ یہاں سے، بند کر اپنی یہ ذلیل حرکت۔ شرم نہیں آتی تجھے انسان کا گوشت کھاتے ہوئے" دوسرے سائے کی آواز آئی۔

"اچھا تو یہی ہے وہ آدمی جو آدم خوروں کی طرح گری ہوئی لاشوں کا گوشت کھاتا ہے۔ مگر یہ تو یہ ہماری ہی طرح ایک انسان شاید پاگل ہو گیا ہے" تیسرے سائے نے کہا۔

"ارے یار، منہ کیا دیکھتے ہو۔ مار دو کرپان۔ ارے ہم آپس میں دشمن ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے تو یہ دوسری بات ہے مگر ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی ہمارے ہی بھائیوں کا گوشت کھائے" ایک نے صلاح دی۔

"ہاں، یہ لاشیں تمہارے بھائیوں کی ہیں" ڈاگی تڑپ کر کھڑا ہو گیا "جب یہ زندہ تھے اور ان کا مذہب الگ تھا تو یہ تمہارے دشمن تھے اور جب تم نے انہیں مار ڈالا اور اب ان میں زندگی کی ہلکی سی بھی رمق باقی نہیں رہی تو تمہارے بھائی ہو گئے ...... ہا ہا ہا"

ڈاگی کا قہقہہ ایک فوارے کی طرح بلند ہو گیا جواب میں ایک سائے نے کرپان اٹھا اور ڈاگی کی کمر میں بھونک دی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں دوڑ پڑا، تب تک دوسرے سا کا چاقو اپنا کام کر چکا تھا۔

"دیکھو، دیکھو، ان لوگوں نے مجھے مار دیا" مجھے دیکھتے ہی ڈاگی نے لڑکھڑاتے ہوئے میرا سہارا لیا "انہیں سمجھاؤ، ان لاشوں کی جان میں نے نہیں لی ہے۔ تم ہی میں سے کسی نے انہیں مارا ہے اور اب ان میں جان نہیں ہے تو ان کا گوشت کھانے میں کیا ہرج ہے؟" ڈاگی مجھ سے پوچھ رہا تھا اور ایک بچے کی طرح ہچکیاں لے کر رو رہا تھا

"کون ہے یہ؟ کیا رشتہ ہے اس سے تم بتاؤ؟ ورنہ ...." تینوں نے ایک ساتھ کہا ان تیور خطرناک تھے۔

"میرا اس سے کچھ بھی تو رشتہ نہیں" میں نے اس سے الگ ہٹتے ہوئے کہا۔ ڈاگی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنا چھرا اس کے سینے میں پیوست کر دیا اس کے لب کچھ کہنے کے لئے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ وہ لڑکھڑایا اور گر پڑا

"ایسے درندوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے کیوں؟" تینوں نے مجھ سے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا؟"

کہنے کو میں نے کہہ دیا مگر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اپنا وجود مجھے ایک بار معلوم ہوا۔ ان تینوں کی حالت بھی مجھ جیسی ہی تھی پھر تینوں واپس مڑ گئے۔ اب کوئی مندر کی طرف نہیں جا رہا تھا کسی کا رُخ مسجد کی طرف نہیں تھا اور گوردوارے کی راہ بھی سونی تھی تینوں ایک ہی راستے پر جا رہے تھے اور دور کے جھنڈ کے عقب سے صبح کاذب کا نور پھیل رہا تھا اور وہ تینوں اندھیرے سے روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے۔



کشمیر کی پہلی مسجد

ویں صدی کا آغاز تھا دلی زوال پذیر ہوگئی تھی اور وہاں ترکی سلطنت کے پیر مضبوطی م چکے تھے شمالی ہندوستان کو جیت لینے پر ر ابھی محفوظ تھا شاید ترکی سلطانوں کو محمود ، کی دو بار کی شکست ابھی بھولی نہیں تھی انھوں میرکی سردی کے بارے میں بہت کچھ سن ھا اب تک اس علاقے پر قبضہ کرنے کی ، ہمت پیدا نہ ہوسکی تھی مگر اب کشمیر میں اس روال آچکا تھا کہ اسے صرف ایک دھکّے کی ن تھی۔

اس وقت کشمیر پر راجہ سوہ دیو کی حکومت ہت نااہل حکمراں ثابت ہوا۔ اس نے طاقت ، وتے پر سلطنت پر کچھ عرصہ تک حکومت رعایا پر بھاری ٹیکس لگا کر اپنا خزانہ بھر لیا ے لوگوں میں انتشار پھیلا اور وہ ملک کی حفاظت بان سے نہ کرسکے۔

لاجہ سوہ دیو لالچی اور بزدل تو تھا ہی، اُس یر کو بدیسی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے لی قدم نہیں اٹھایا۔ درّے یوں ہی کھلے اور ظر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیٹروں کو موقع ل گیا۔ جب ان کا دل چاہتا چپکے سے آجاتے اور لوٹ مار کرکے چلتے بنتے۔ قلعوں کی مرمّت کرانے اور فوج کو منظّم کرنے کی بجائے وہ دولت جمع کرنے میں مصروف تھا۔

کشمیر اس وقت سماجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ بدحالی کا شکار تھا۔ دھوکے بازی، مکرو فریب، بدکرداریت وغیرہ کا بول بالا تھا۔ ہزاروں برس سے پشت در پشت ترقی کرتا ہوا ہندو راج اپنی ہی برائیوں کی وجہ سے کھوکھلا ہوگیا تھا۔ اسی وقت اسے ایک ضرب لگی جس سے وہ ریت کی دیوار کی طرح مسمار ہوگیا۔ یہ تھا زلجو کا حملہ جو مارچ ۱۳۲۰ میں کشمیر پر ہوا۔

زلجو ایک منگول سردار تھا جو ترکستان سے آیا تھا۔ اس کی فوج میں ترک اور منگول دونوں ہی تھے۔

وادیٔ جہلم کی طرف سے وہ لوٹ مار اور قتل وغارت مچاتا ہوا کشمیر پر چڑھتا چلا آرہا تھا۔ راجہ نے اپنے سورما، وزیر، تعلقہ دار اور درباری اکٹھے کئے۔ اس کا سپہ سالار رام چندر ایک بہادر اور نڈر آدمی تھا۔ راجہ نے سب لوگوں کے

سامنے اپنی پریشانی رکھتے ہوئے کہا" منگول بڑی تعداد میں یہاں آر ہے ہیں۔ کیا کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں مہاراج" سپہ سالار رام چندر نے جوش سے جواب دیا" میں آگے بڑھ کر ان سے مورچہ لینے کے لئے بیتاب ہوں"۔

"مگر" راجہ نے گھبراہٹ میں کہا" وہ بہت ظالم اور خطرناک لوگ ہیں۔ کیا تم اپنی تھوڑی سی فوج کے ساتھ ان سے مقابلہ کر لوگے؟"

"مہاراج۔ میرا نام رام چندر ہے۔ راکھشسوں کو ٹھکانے لگانا میرا کام ہے"۔

سپہ سالار کی جوشیلی باتوں سے راجہ کی ڈھارس بندھی مگر کچھ کمزور دل وزیروں نے اسے ڈرایا" مہاراج ماہرین سیاسیات نے ایسے موقعوں پر ایک اور طریقہ اپنانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"کیا؟" راجہ نے پوچھا۔

اپنانا راجہ اور وزیروں کا کام ہے۔ خادم کا کام تو اپنے مالک کی شان دوبالا کرنا ہے۔ آپ کی تھوڑی سی بھی عنایت ہو جائے تو میں ان منگو کو کشمیر کی پاک سرزمین سے پرے دھکیل دوں"

"ہمیں تمہاری بہادری پر پورا پورا بھروسہ ہے سپہ سالار" راجہ نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا" لیکن ہم تمہاری اور فوج کی بیش قیمت زندگی کو یوں ہی ضائع نہیں کرنا چاہتے ہم ایک حکمت سے منگولوں کو کشمیر سے بھگا دیں گے"۔

راجہ کا یہی قدم بہت بزدلانہ تھا۔ اسے فوج سے بھی زیادہ اپنے خزانے پر بھروسہ تھا اس نے سپہ سالار کے خلاف اور رعایا کی نار سے وزیروں کے ذریعے زلجو کو کافی دولت کی پیش کش کی۔ وہ بے شمار دولت کے سہارے منگولوں کے خطرے کو ٹالنا چاہتا تھا مگر منگولوں زلجو نے دولت لے کر پیچھے ہٹنے سے صاف انکا

منگولوں کی شیطانی طاقت کے آگے جب ایران جیسے بڑے بڑے ملک سرنگوں ہو گئے تو چھوٹے سے کشمیر کی تو بساط ہی کیا تھی۔ قتل و غارت کرتے ہوئے منگولوں سے ڈر کر راجہ بھاگ گیا اور منگول سرینگر پر قابض ہو گئے

"مہاراج جس طرح پانی کے تیز بہاؤ کے آگے بید کی لچک دار شاخ پوری طرح جھک جاتی ہے اور بہاؤ کم ہو جانے پر پھر تن کر کھڑی ہو جاتی ہے اسی طرح دشمن کے حملے کے آگے جھک جانا اور اس کی پیٹھ پھرتے ہی پھر سر اٹھا کر کھڑے ہو جانا بھی شاطرانہ سیاست کی ایک چال ہے"۔

"طریقہ تو برا نہیں ہے" راجہ خوش ہو گیا "کیا خیال ہے سپہ سالار؟"

رام چندر نے کہا" مہاراج پالیسیاں اور طریقے

کر دیا کیوں کہ اسے لوٹ مار کر کے بے شما دولت حاصل ہونے کی امید تھی۔

اب تو سوہ دیو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جلدی مقابلہ کرنے کی تیاری بھی کیے جا سکتی تھی؟ منگولوں کو اس وقت دَرّوں کے روکنا مشکل نہ تھا مگر اب تو وہ ٹڈی دل کی طرح میں داخل ہو گئے تھے راجہ سوہ دیو اور سپہ سالا چندر نے اس دوران بڑھتی ہوئی فوج کو رو کوشش کی مگر ناکام رہے منگولوں کی شیطانی طا



سپہ سالار رام چندر نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا

ے آگے جب ایران جیسے بڑے بڑے ملک سرنگوں
گئے تو چھوٹے سے کشمیر کی تو بساط ہی کیا تھی نتیجہ
ہوا کہ پہلی ہی ٹکر میں کشمیری فوج کے پیر اکھڑ گئے
. راجہ اپنی جان بچا کر کشتواڑ کے علاقے میں جا
ا۔

اپنے راجہ کے اس طرح بھاگنے سے رعایا کا
صلہ پست ہوگیا اور فوج کے سپاہی بھی ادھر ادھر
ک کھڑے ہوئے۔ قرب و جوار کے علاقوں کو
مدتے، لوٹتے، آگ لگاتے منگول کشمیر
راج دھانی کی طرف بڑھے اور انھوں نے
شری نگر پر اپنا تسلط جمالیا۔ تب وہاں عجیب عالم تھا۔

چاروں طرف قیامت برپا تھی اس سے گھبرا
کر رعایا پہاڑوں کی طرف بھاگ گئی۔ مگر پھر بھی کئی
ہزار مرد و زن، بچے، بوڑھے اور جوان منگولوں کے
ہاتھ لگ گئے اور انھوں نے ان سب کو غلام بنالیا۔

سپہ سالار رام چندر نے پہلے تو منگولوں کا
مقابلہ کیا مگر جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو
باقی ماندہ فوجیوں سمیت وہ لہر ضلع کی طرف چلا گیا
تاکہ وہاں کے مضبوط قلعے میں محفوظ ہو کر وہ منگول
حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے۔



مسلسل آٹھ مہینے تک منگول وادیٔ کشمیر میں آگ برساتے رہے قتل، لوٹ مار، عصمت دری اور آگ زنی کے واقعات تو ان کے لئے بہت معمولی تھے۔ اسی دوران جاڑے کا موسم آگیا۔ اشیائے خورد و نوش کی قلت ہوگئی علاوہ ازیں کشمیر میں لوٹنے کے لئے اب کچھ باقی بھی نہ رہا تھا۔

اپنی فتح کے زعم میں انھوں نے کھیتی بھی اجاڑ ڈالی تھی۔ کسان اور زراعت پیشہ لوگ جان بچا کر پہاڑوں میں بھاگ گئے اناج کے قحط اور بہت زیادہ ٹھنڈ نے کشمیر سے منگولوں کے پاؤں اکھاڑ دیے۔

اگر وہ چاہتے تو جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس بھی جا سکتے تھے لیکن زلجو اور اس کے منگول ساتھیوں کے منہ خون لگ چکا تھا۔ زلجو سوچنے لگا، جب کشمیر جیسے چھوٹے علاقے سے اتنی دولت مل سکتی ہے تو پھر ہندوستان جیسے بڑے ملک سے کتنی زیادہ دولت ہاتھ لگے گی۔ شاید اتنی زیادہ کہ بٹوری بھی نہ جا سکے۔ جب اس نے یہ تجویز اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھی تو لوگ خوشی سے چیخ پڑے "واہ کتنی اچھی تجویز ہے دولت کے ساتھ ہی ساتھ وہاں غلام بھی کتنے ملیں گے۔ ہاہاہا...‘‘

ایک عمر رسیدہ سپہ سالار بولا "ہندوستان پر اس وقت تغلق خاندان کی حکومت ہے اس سے کچھ ہی سال پہلے خلجی سلطان علاؤ الدین نے چھ بار منگول فوج کو پسپا کر دیا۔ میں نے اس کی تلوار کی طاقت دیکھی ہے۔ اس نے کئی ہزار منگولی مرد و زن کو اپنی راج دھانی دلّی میں لے جا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"کیا؟" زلجو غصے سے دہاڑا اور تن کر کھڑا ہوگیا "ہم اپنے خون کا بدلہ لیں گے۔ میں دلّی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ اس وقت خلجی خاندان کا زوال ہو رہا ہے اور تغلق خاندان برسر اقتدار

آنے کے لئے برسرپیکار ہے۔ میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں ہندوستان میں اپنی فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ کر ہی اپنے ملک واپس جاؤں گا ہزاروں من سونا اور ہیرے جواہرات کیا میں یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

بوڑھے سپہ سالار نے کہا "ہندوستان تمام ہیرے جواہرات اور سونا چاندی تو محمود غزنوی اور محمد غوری اڑا لے گئے۔ اب وہاں کیا ہاتھ آئے گا؟ رہی غلاموں کی بات۔ وہ بھی ایک خواب ہے۔ کیوں کہ تغلقوں کے پیر جم چکے ہیں۔ ان کا سلطان غیاث الدین تغلق، علاؤ الدین خلجی سے کسی طرح کم ثابت نہیں ہوگا پھر جب ہماری فوج کے پاس ہی کھانے کو کچھ نہیں تو لاکھوں غلاموں کو کیا کھلا کر زندہ رکھ پائیں گے؟"

"تم بوڑھے ہو اور بزدل ہو" زلجو نے غصے میں آکر کہا "ہندوستان میں سونے کی کمی ہے؟ میں نے اکثر لوگوں کے منہ سے

ہے کہ وہاں کے لوگ زراعت پیشہ ہیں اور
ین سونا اُگلتی ہے۔ تغلقوں سے ہمیں کوئی خدشہ
یں ہے۔ ہماری خوراک کا مسئلہ ہندوستان میں
، حل ہو سکے گا۔ یہاں کشمیر کے پہاڑ، جھیل، جھرنوں
ے تو کچھ ملنے سے رہا۔"

"اناج کے کھیت میرے منع کرنے کے
وجود بھی آپ کی فوج نے جلا دیئے ورنہ خوراک
ی تنگی نہ ہوتی۔ خیر اب بھی ہم بارا مولا، پالکی سے
ہلم کی وادی میں ہو کر پنجاب جا سکتے ہیں۔ وہاں
مارتی لوگوں سے ہمیں کافی اناج مل جائے گا۔

قیدی تھر تھرا اٹھے۔ اب تک ان سے
بد سلوکی نہیں ہوئی تھی ان کے گلوں میں کتوں کی
طرح زنجیریں اور رسیاں پڑی تھیں۔ ایک ایک سی
اور زنجیر سے کئی کئی قیدی بندھے ہوئے تھے۔
تمام دن کی محنت کے بعد شام کے وقت انہیں
گندا اور بچا ہوا کھانا دیا جاتا تھا۔

ان قیدیوں میں ہر ذات اور فرقے کے
لوگ موجود تھے۔ اپنے دَور کے جیّد عالم بھی
کم نہ تھے۔ مگر منگولوں کو ان کی قابلیت سے کم
اور جسم سے زیادہ سروکار تھا۔ بدن فربہ ہو تو

**ال و دولت کے علاوہ جس چیز نے زبجو کی دل چسپی برقرار رکھی وہ تھے کشمیری قیدی۔
ن کے گلوں میں کتوں کی طرح زنجیریں اور رسیاں پڑی تھیں۔ بدن فربہ ہو تو ایک
لام کے ۵۰ دینار کھرے اور کشمیر کی حسینائیں تو ۱۰۰ دیناروں سے کم میں نہیں جاتی تھیں۔**

سردی شدت کی ہے اب گھر لوٹنا ہی اچھا
لگتا ہے" سپہ سالار ہنستے ہوئے بولا۔

بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا "اب سمجھا، تمہیں گھر
جانے کی فکر ہے۔ چچا جان اگر گھر اور بچوں
کا ایسا ہی خیال تھا تو لوٹ مار کے لالچ میں ہمارے
ساتھ کیوں آ گئے؟ اب فوراً ہم تمہیں ہندوستان
لے ہی جائیں گے۔"

بوڑھے نے سر جھکا لیا۔ اب سوال درپیش
تھا کہ بھارت پہنچا کیسے جائے؟ زبجو نے اپنے ترک
سپاہیوں سے کہا "کیا تم میں سے کوئی ہندوستان
جانے کا راستہ جانتا ہے؟"

ترکی سپاہیوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ زبجو نے
م سنائے ہوئے کشمیری قیدیوں کو بلایا اور کڑک
دار آواز میں کہا "ہمیں ہندوستان جانا ہے۔ ٹھیک
ٹھیک راستہ بتاؤ ورنہ کوڑے مار مار کر تمہاری کھال
ادھیڑ دی جائے گی۔"

ایک غلام کے ۵۰ دینار کھرے۔ اور کشمیر کی
خوبصورت حسینائیں تو سو دیناروں سے کم میں ا
جاتی نہیں تھیں۔

"ہندوستان کا سب سے چھوٹا اور آسان راستہ
میں جانتا ہوں" ایک جوان برہچاری بولا "میری پیدائش
وہیں ہوئی ہے۔ یہاں کشمیر میں تعلیم حاصل کرنے
آیا تھا۔"

زبجو خوشی سے چلایا "ہم تمہیں غلام نہیں بنائیں
گے اور انعام سے بھی مالا مال کریں گے ہمیں ہندوستان
لے چلو۔"

عیسوی کے ماہ نومبر کا تیسرا ہفتہ تھا۔ ندی،
نالے پہاڑ، چوٹیاں سب ہی برف سے
ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ جوان برہچاری منگولوں کی
وحشی فوج کو لے کر بھارت کی طرف چل پڑا۔ اس
نے بڑا عجیب راستہ چنا۔ وہاں پہاڑ اور گنجان جنگل

(بقایا صفحہ نمبر ۱۱۵ پر ملاحظہ کیجئے)

انسان کا کوئی بھی شوق جب ایک مخصوص حد
بڑھ جاتا ہے، تو وہ دیوانگی کی منزل
پہنچ جاتا ہے۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے وہ
جان کو بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کرتا
آنکھیں ہوتے ہوئے بھی اس وقت بالکل اندھا ہو
جاتا ہے۔

کہانی

شکھ بیر



ٹھاکر شودیال سنگھ کی بھی بالکل یہی حالت
تھی۔ ان کا بگ شکنگ کا شوق انہیں گھسیٹ کر
اس گھنے اور غیر مانوس جنگل میں لے آیا تھا، جو
ہونا اُن کی ملکیت تھا، مگر جس پر ان کا جانی دشمن
سردار پیارا سنگھ جبراً قبضہ کئے ہوئے تھا۔ وہ یہ
بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ پیارا سنگھ انہیں قتل
کر دینے کے لئے کوشاں ہے اور موقع کی تاک میں
ہے، مگر ان کے شوق نے انہیں بالکل اندھا کر دیا
تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر خود کو موت کے منہ
میں ڈال دیا تھا۔

وہ جنگل اور اس کے آس پاس کی ساری
زمین انہیں اپنے ماموں کی طرف سے وراثت میں
ملی تھی، مگر سردار پیارا سنگھ اس پر قبضہ جمائے



ہوئے تھا اور اپنے اثر اور طاقت کے بل بوتے
عدالت دیوانی کے کئی فیصلوں اور پیمائش تو وہ بندی
کی تجویزوں کو ٹھکرا چکا تھا۔ پولیس بھی مدد سے
قاصر تھی اور سرکاری قانون کا نفاذ نہ کرا سکتی تھی۔
پیارا سنگھ جتھہ بند شرپسند اور قاتل قسم کا آدمی تھا۔
اس کا بے حد شوقین اور باتنا نیڈر اور دلیر کہ خلاف
ان بلا لائسنس ہتھیاروں سے دن دہاڑے کھیلتا پھرتا
۔ دور دور تک اس کے خلاف کوئی شہادت یا
ثبوت نہ مل سکتا تھا۔ اس علاقے میں اس کی مرضی
کے خلاف ایسے ویسے سرکاری حاکم کے بھی پڑتے
ہوئے پر جلتے تھے۔ اور ستم تو یہ تھا کہ جواب دہی اور
سرداری کے لئے شاذو نادر ہی عدالت آتا تھا۔

کئی مرتبہ ٹھاکر صاحب کے مرحوم ماموں کو
عدالت دیوانی سے باضابطہ دخل ملے مگر قبضہ نہ کر سکے

پھر نالش کی اور نتیجہ ایک ہی رہا کہ بارہ سال سے زائد
عرصہ ہوگیا اور اب سردار پیارا سنگھ کو قبضہ مخالفانہ
کے حق میں ٹیک مل گئی۔

ٹھاکر صاحب کو بھی تین چار سال کی مقدمہ بازی
میں کچھ ہاتھ نہ لگا اب وہ آخری بار عدالت کے
فیصلے اور اس کے نفاذ کے منتظر تھے۔ اس کے بعد
انہوں نے بھی قانون کا سہارا چھوڑ کر طاقت اور ہمت
کے بل بوتے پر قبضہ حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔

جنگل میں صبح سے بھاگتے بھاگتے انہیں دوپہر ہوگئی۔
گاؤں کے جو کچھ آدمی ہانکے کے لئے ساتھ لئے
تھے، وہ بھی بھاؤ اور ناگ پھنی کے اس گھنے جنگل
میں کہیں گم ہو گئے۔ موسم بہار کی دھوپ میں خاصی

جانی دشمن

حدت اور تمازت پیدا ہوگئی تھی۔ ان کے گھوڑے
پرنس کے پاؤں بھی بھاری بھاری سے اٹھ رہے
تھے۔ صبح سے انہیں کئی اچھے چانس ملے، مگر سب
خالی گئے۔

اس گرمی میں ٹھاکر صاحب کا پیاس کے
مارے برا حال تھا۔ وہ دور دور تک نظروں کی
کمندیں پھینک رہے تھے کہ ساتھیوں کا پتہ چلے
تو قریب کے راستے کا سراغ ملے۔ ان کی عقل صحیح
راستہ کی تمیز سے قاصر تھی لہٰذا انہوں نے پرنس
کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی تھی۔ اطمینان تھا کہ پرنس
چھوٹے سے چھوٹے راستے پر چل کر انہیں جنگل سے
باہر نکال لے جائے گا۔

اب انہیں اپنی تنہائی اور اس غیر مانوس
ماحول میں وحشت سی محسوس ہونے لگی تھی، اور وہ بری



طرح پچھتا رہے تھے جب ان کے دل میں اس جنگل میں شکار کھیلنے کا خیال آیا تھا۔ پگ جلنگ کا بھوت اب ان کے دماغ سے پوری طرح اُتر چکا تھا۔ یہ خیال کہ سردار پیارا سنگھ ان کی جان کے درپے ہے، رہ رہ کر انہیں پریشان کر رہا تھا۔

وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیارا سنگھ اس علاقے کا شیر ہے۔ وہ اسے نہیں پہچانتے تھے کیونکہ وہ اپنا حلیہ اکثر بدلتا رہتا تھا۔ کبھی کیس



اور داڑھی رکھ لیتا اور کبھی کٹوا دیتا۔ پیارا سنگھ کے تصور سے ہی ان کے سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا برچھا خود بخود تن جاتا اور بایاں ہاتھ شکاری کوٹ کی جیب میں پہنچ جاتا، جس میں نو گولیاں بھرا پستول پڑا تھا۔ مگر پھر خیال آتا کہ اس کے پاس تو بندوق ہوگی اور برچھے اور پستول سے بندوق کا مقابلہ بڑی ہی ٹیڑھی کھیر تھی۔ وہ سوچتے اور کانپ کانپ اُٹھتے۔

خیالات کے جوار بھاٹے میں تھپیڑے کھاتے وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ یکایک پرنس زور سے ہنہنا کر کنوتیاں بدلنے لگا اور دور دور ایک

سمت میں نگاہیں پھینکنے لگا۔ انھوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دور ایک سوؤر بڑے مز کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

انھوں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ اکیلا جو دوسرے سؤروں کی نسبت زیادہ خطرنا ہوتا ہے۔ ایسا سؤر ساتھیوں سے لڑنے اور سب کا حصّہ چٹ کرنے کا عادی ہو

ٹھاکر صاحب نے خود کو سنبھالا، رشتہ اور آہستہ سے پرنس کو پُچکارا تو بڑی سرکشی ہوں' میں جواب دیا۔ پھر جب انھوں نے ذرا مضبوطی سے پکڑ کر سیدھا کیا تو پرنس نا

سے اچھلا اور دوڑنے کے لئے چل اٹھا ٹھاکر صاحب کا برچھا ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

اُن سے زیادہ پرنس کی تھکاوٹ چستی میں بدل گئی۔ اس کا رُواں رُواں پھڑک اٹھا، مگر فاصلہ ابھی زیادہ تھا اور سؤر کو خطرے کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس لئے ٹھاکر صاحب نے لگام روک لی اور پرنس کو پیہم چستی سے بڑھنے دیا۔ سؤر ان کی مخالف سمت میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور آخر میں ان کے بائیں ہاتھ سے تقریباً پانچ سو گز کی دوری سے نکل گیا۔

انھوں نے پرنس کو موڑا۔ سؤر کے سامنے ہوتے ہی پرنس بجلی کی سی تیزی سے اچھلا اور ادھا دھند سرپٹ دوڑنے لگا۔ سؤر نے بھی بھاگنا شروع کیا، مگر پرنس نے اپنی رفتار میں سؤر کی دوڑ اور درمیان کے فاصلے کو منٹ بھر میں ختم کر دیا اور سؤر کے سر پر سوار ہو گیا۔

جھٹکے کا ٹھیک توازن نہ کر سکا، جس کی وجہ سے سؤر پر برچھے کا وار اوچھا پڑا تھا۔

وہ ابھی اچھی طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ اس نے سؤر کو اپنے اوپر حملہ کرتے پایا۔ اپنی جبلت کے بالکل برعکس سؤر پلٹ پڑا اور توپ کے گولے کی طرح پٹ سی الگتا ہوا پرنس پر جھپٹا لیکن پرنس بڑی صفائی سے وار بچا گیا۔ سؤر نے دو فٹ اور اِدھر بڑھ کر اس کے پچھواڑے پر وار کیا اور پیٹ پر تارپیڈو مارا، لیکن پرنس یہ وار بھی بچا گیا۔ اور اگلی ٹانگوں پر ٹیک کردہ زور کی دُلتی جھاڑی کہ سؤر دو گز کے فاصلے پر جا گرا۔

سؤر اور پرنس کی اس پینترہ بازی کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے ٹھاکر صاحب پرنس کی پیٹھ پر سے نیچے آگرے۔ مگر انھوں نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور ایک کر سور پر برچھے کا

ٹھاکر صاحب نیچے آگرے۔ انھوں نے سؤر پر برچھے کا جو وار کیا وہ اوچھا رہا اور خون خوار سؤر تھوڑا سا زخم اور ایک پٹخنی کھا کر بھاگ کھڑا ہوا!

پگ شٹنگ کے گھوڑے شکار کے وقت شکاری سے بھی زیادہ خونخوار ہو جاتے ہیں شکاری تو ان کا ہتھیار سا ہوتا ہے۔ در اصل شکاری وہ ہی ہوتے ہیں۔ ٹریننگ کے مطابق شکار سے کچھ فاصلہ پر اُچھل کر وہ ایک لمحہ رک کر حملے کا انجام دیکھتے ہیں اور اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا حملہ کرتے ہیں۔

بدقسمتی سے سؤر پر وار اوچھا پڑا اور سوا تین من کی بھوری چٹان برچھے کی نوک سے اُچھل کر پرنس کے سامنے چار پانچ گز کے فاصلے پر جا گری۔ شاید ٹھاکر صاحب نے اشارہ غلط پائنٹ پر دے دیا تھا اور پرنس اپنی رفتار اور

وار کیا سؤر پر یہ وار بھی اوچھا ہی پڑا اور سؤر تھوڑا سا زخم اور ایک پٹخنی کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ٹھاکر صاحب سنبھلے اور برچھا پکڑ کر پرنس کی جانب لپکے پرنس بھی ان کی طرف دوڑا۔ سامنے تقریباً نصف میل کے فاصلہ پر سؤر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ بغیر رکاب میں پاؤں ڈالے بال پکڑ کر ایک ہی جست میں لنگور کی طرح پرنس کی پیٹھ پر جا بیٹھے اور تقریباً دو منٹ کی دوڑ میں پرنس نے دوبارہ سؤر کو جا لیا۔

ٹھاکر صاحب کوئی ایک فرلانگ برچھا جائے، سؤر کو پرنس کے آگے آگے بمشکل کھدیڑ

ـئے ہوگئے اور برچھے کی نوک اور سؤر کے
ندھے سے صحیح زاویہ بناکر پرنس کو اشارہ دینے
ی والے تھے کہ سؤر پھر پلٹ پڑا اور حملہ کر
دیا۔ لیکن اس مرتبہ پرنس شاید پہلے سے ہی
تاط تھا اس نے بڑے فنکارانہ انداز سے اپنی
فتار کو جست میں بدل دیا اور ایک ماہر پٹے
از کی طرح پینترہ سا بدل کر سؤر کے پیچھے جاگرا،
گویا شکاری کو مناسب جگہ پر پہنچا کر دوبارہ
شکار کا خیال باندھا ہو۔ مگر گر کر سنبھلنے بھی نہ
پایا تھا کہ سؤر اس کے ساتھ ہی سیدھا ہوگیا
اس نے پھر اسی داؤ پر سؤر کے حملے کو ناکارہ
کر دیا۔

ممکن ہے کہ دوسرے تیسرے حملے تک
ٹھاکر صاحب کا شکاری جوش اور جذبہ ان میں
موجود رہا اور وہ ہر لمحہ اس تاک میں رہے کہ
سؤر کے بھاگتے ہی بھرپور برچھا جما دیں۔ لیکن
بدقسمتی سے ایسا موقعہ دوبارہ نہ ملا۔ حملے اور بچاؤ
میں ان کے شکاری جذبات جلد ہی بچاؤ کی شکل
اختیار کرنے لگے۔ پرنس نیولے اور سانپ کے
انداز میں کھیل رہا تھا اور سؤر کے
ہر حملے کو بڑے خوبصورت پینترے سے ناکارہ
بنا رہا تھا۔

مگر سؤر کے حملوں کی رفتار بڑھتی ہی گئی۔ پرنس
ایک ماہر پینترے باز کی طرح دائیں بائیں
پیچھے گرتا رہا اور اپنے دس بارہ من کے
وجود کو ہنٹر کی مانند لہرا کر اِدھر سے اُدھر
پھینکتا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی پرنس محض بچاؤ کرنے پر
اتر آیا۔ شکار بھول سا گیا اور اس کے ساتھ
ہی ٹھاکر صاحب کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ وہ سمجھ گئے
کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ تین ہی چار منٹ میں انہیں
محسوس ہوا، گویا صدیاں بیت گئی ہیں اور وہ
زندگی اور موت کے درمیان قلابازیاں کھا رہے ہیں۔

سؤر کے حملوں کی شدت بڑھتی ہی چلی گئی
اور ہر حملے میں پرنس بال بال بچتا رہا۔

دو تین منٹ اور گزر گئے اور ہر منٹ میں
دو مرتبہ موت ان کے سامنے آئی۔ اور اب تو
پرنس زمین پر اچھی طرح آنے بھی نہیں پاتا تھا
کہ سؤر پھر سیدھا ہو جاتا تھا۔ پھر وہاں زمین
بھی ریتلی تھی۔ سؤر کے ہر حملے اور پرنس کے ہر
پینترے پر ریت کا بگولہ سا اٹھتا۔

اب پرنس کا بھی جی چھوٹ گیا تھا۔ وہ عاجز
سا ہوگیا تھا اور ایک دو بار میں تو وہ غریب
بالکل ختم ہی ہو گیا ہوتا۔

نظر ہٹانے کا موقع نہ تھا، لیکن کسی آواز
پر ٹھاکر صاحب کی نظر لمحہ بھر کے لئے ایک طرف
کو اٹھی اور کچھ دور ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے
پاس انہیں ایک آدمی دکھائی دیا، جس نے آنکھوں
کے علاوہ اپنے سر اور سارے چہرے کو کپڑے
میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک حوصلہ افزا
آواز بھی ان کے کان میں پڑی۔ کوئی بڑے زور
سے دوڑا اور انہوں نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا
آدمی نیزا تانے ان کے درمیان کود پڑا اور بڑے
جوش کے ساتھ سؤر پر جھپٹا۔

اس کی للکار سے پرنس کی ہمت بندھی اور
ٹھاکر صاحب کی ہمت بھی بندھی۔ سؤر نے اس آدمی
پر بڑے زور سے حملہ کیا، جسے اس آدمی نے
بہت ہی مختصر سا پینترا کاٹ کر ناکارہ بنا دیا۔ اب
وہ مقابلے میں برابر کی ٹکر پر تھا۔ اس نے دو
ایک بار للکار کر انہیں کچھ ہدایت دی۔ وہ انہیں
پہچانتا تھا۔ شور زیادہ مچا رہا تھا اور پیہم سؤر کو
للکار رہا تھا۔

پھر یکایک انہوں نے دیکھا کہ اس کے
کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی ہے۔ مگر ایسے نازک
موقع پر ان کے پستول کی طرح رائفل بھی بیکار تھی۔
اسی دوران سؤر نے اچھل کر ان پر حملہ کیا اور

بھی لپکا اور سؤر پر برچھے کا بھرپور وار کیا مگر بد قسمتی سے برچھا سؤر کے پچھلے حصّے پر پڑا اور سؤر صرف زخمی ہو کر رہ گیا۔

زخمی ہو کر سؤر شعلے کی طرح لپکنے لگا، مگر اس کی ہمّت اور استقلال میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ وہ بار بار جنگل کی طرف بہ بلند آواز پکارتا تھا۔ کسی کو بلا رہا تھا اور بدستور سؤر سے لوہا لے رہا تھا۔

چند لمحے بعد دفعتاً دور زمین پر کتوں کی ایک پوری ٹیم نظر آئی، جو دیکھتے ہی دیکھتے ان کے نزدیک پہنچ کر تیر کی طرح سؤر پر جھپٹی۔ اس نے بڑی جوشیلی آواز میں باڑھ دی "وہ مارا اُستاد"

چشم زدن میں ایک گرینڈیل کتا، بجلی کی طرح سؤر پر جھپٹا، مگر سؤر نے اسے اپنی تھوتھنی پر رکھ کر اچھال دیا اور آنتیں بکھیر دیں تاہم گرم خون اور جوش میں آنتیں گھسیٹتے ہوئے استاد نے سؤر کی گردن دبوچ ہی لی اور استاد کے منہ ڈالتے ہی سارے کتے چھیڑی ہوئی بھڑوں کی طرح سؤر کی نس نس پر جھپٹ پڑے۔ وہ آدمی ہر ایک کتے کا نام لے کر بڑے جوشیلے انداز میں شہ دیتا رہا اور پانچ ہی منٹ میں چٹان سا سؤر پندرہ کتوں میں روئی کی طرح دھنک کر رہ گیا۔

سارے ماحول پر موت کا سا سکوت اور سناٹا چھا گیا تھا۔ کچھ اور آدمی بھی آ گئے تھے اور ایک گھوڑا بھی۔ چند لمحے بعد ماحول میں جیسے جان سی پڑی۔ ٹھاکر صاحب ایڑی سے چوٹی تک پسینے میں شرابور تھے پرنس کے مَسَوں میں بھی پسینہ بہہ رہا تھا اور استاد کی روح تو شاید سؤر کی پہلی ہی ٹکر میں ہوا میں پرواز کر گئی تھی، خونخوار شکاری جسم اب بھی جہاں کا تہاں سؤر کی گردن پر دانت گاڑے چمٹا رہ گیا تھا۔

ٹھاکر صاحب نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور کچھ دور کھڑے اپنے محسن اور [illegible] کی طرف تشکّر آمیز نظروں سے دیکھا، جو ان کی طرف کوئی توجہ نہ دیکر استاد کی لاش کو دیکھ دیکھ کر رو رہا تھا۔ وہ برچھا پھینک کر بے اختیار اس کی طرف بڑھے، وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا اور ان کی طرف دیکھ کر ترچھا ہو کر تن گیا۔ پھر دفعتاً اس نے اپنا برچھا سنبھالا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں غصّہ اور نفرت سے شعلے سے لپکنے لگے۔ جب ٹھاکر صاحب اس کے کچھ اور قریب پہنچ گئے وہ ڈھیلا سا پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ کا برچھا لٹک گیا۔ اور جب انہوں نے خاص شکاری انداز سے اس کے مثالی شکاری جذبے اور دلیری کی تعریف میں لفظ منہ سے نکالا تو وہ مڑ گیا اور نفرت سے منہ پھیر کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

"ٹھہرو بھائی!" ٹھاکر صاحب نے بے پناہ خلوص اور اپنائیت سے اسے آواز دی، مگر جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور اپنا گھوڑا بڑھا دیا۔

اس بات کو دیکھ کر ٹھاکر صاحب انگشت بدنداں سے رہ گئے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا، مگر اس کا گھوڑا بڑھتا ہی گیا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پلٹے اور ان آدمیوں کے نزدیک آئے، جو سؤر کے چیتھڑوں کو سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے ان آدمیوں سے پوچھا "کون تھا وہ دلیر انسان؟"

"ایں!.... آپ نہیں جانتے؟" ان میں سے ایک آدمی نے حیرت سے کہا "وہ تو آپ کی آواز سن کر آئے تھے ... سردار جی تھے!"

"کون سردار جی؟"

"سردار پیارا سنگھ!"

"ایں سردار پیارا سنگھ؟" فرطِ حیرت سے ان کے منہ سے نکلا اور انہیں محسوس ہوا گویا گھومتی ہوئی زمین یک بیک ٹھہر گئی ہو اور وہ زمین اور آسمان کے درمیان خلا میں لٹک گئے۔

●







[redacted]

کا کوئی بھی مشہور ڈاکٹر باقی نہیں رہ گیا تھا جس سے راجہ سبودھن لال نے مشورہ نہ لیا ہو لیکن اُن کی بیماری ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ سارا دِن بِستر پر پڑے رہتے۔ اس حالت میں وہ کھا پی سکتے تھے، پُکار سکتے تھے، ہنس بول سکتے تھے اور خدمت کرنے والے کی مدد سے کروٹیں بھی بدل سکتے تھے لیکن اُٹھنا بیٹھنا اُن کی ہمت سے باہر تھا۔ چلنا پھرنا تو اُن کے لئے خواب سا بن گیا تھا۔

جب سب ترکیبیں بیکار ہوگئیں تو اُن کے دِل میں یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ اُن کی موت کب واقع ہوگی؟ اُن کا خیال تھا کہ مرنے کی گھڑی معلوم ہوجائے تو وہ اطمینان سے مرسکیں گے۔ راجہ صاحب کو اُن کی موت کا دِن بتانے کے لئے دِن رات جیوتشی آنے لگے۔ لیکن کوئی بھی صحیح تاریخ نہیں بتا سکا۔ سب یہی کہہ کر چلے گئے کہ راجہ صاحب کی عُمر ابھی بہت لمبی ہے۔

ایک دِن اُن کے محل کے سامنے ایک جیوتشی نے راجہ سبودھن لال کو دیکھے بغیر ہی یہ اعلان کردیا کہ وہ چھ مہینے کے اندر مرجائیں گ

وہ جیوتشی راجہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تو وہاں بھی اُس نے یہی بات دُہرائی۔

جیوتشی کی اِس پیشین گوئی سے راجہ صاحب مطمئن ہونے کی بجائے اور بھی فکر مند ہو گئے ان کی کروڑوں کی دولت بنکوں میں جمع تھی لیک اس کا استعمال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ راجہ صاح نے دوستوں کی یہ تجویز بھی ٹھکرادی کہ مرنے سے پہلے اپنی ذات میں سے کسی لڑکے کو گ لے لیں، اُنہوں نے کہا "مرنے سے پہلے ہ میں اپنی ساری دولت اپنا دل بہلانے کے لۓ خرچ کردوں گا۔"

اسی وقت انہوں نے اعلان کیا کہ تندرست ہونے کی میری ایک چھوٹی سی خواہش پوری ہوسکی، اس لئے میں انسان کے اُس دُکھ کو :

ں کی خواہش پوری نہ ہوسکنے سے ہوتا ہے
پنی طرح محسوس کرسکتا ہوں۔ اسی لئے میں یہ
علان کر رہا ہوں کہ "آج کی تاریخ سے لے کر
ہ مہینے تک جب تک میں زندہ ہوں اگر کوئی
ی آدمی اپنی خواہش مجھ سے کہے گا تو میں اسی
نت اُسے پوری کردوں گا۔ ہاں، شرط یہ ہے
۔ جتنی دولت میرے پاس ہے، اس سے زیادہ
یہ نہ مانگا جائے۔"

جیسا کہ نرگڑھ حکومت کا قاعدہ تھا، راجہ
احب کے اعلان کی منادی گاؤں گاؤں اور گلی
گلی میں کرادی گئی۔ دُکھی اِنسان اپنا دُکھ دُور کرنے
کی غرض سے عرضیاں لے کر ان کے پاس پہنچ
گئے۔ جب عرضیوں کی بھرمار ہونے لگی تو راجہ
صاحب نے لوہے کا ایک بڑا صندوق محل کے
سامنے رکھوادیا اور حکم دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی
عرضیاں اس میں ڈال دیں اس کے تیسرے روز
بعد کوئی عرضی نہیں لی جائے گی اور اس کے بعد
اُن پر غور ہوگا۔

تین دِن بعد محل کے سامنے ایک بہت بڑا
شامیانہ لگایا گیا اور شامیانے کے اندر وہ سب

کہانی • شری ناتھ سنگھ

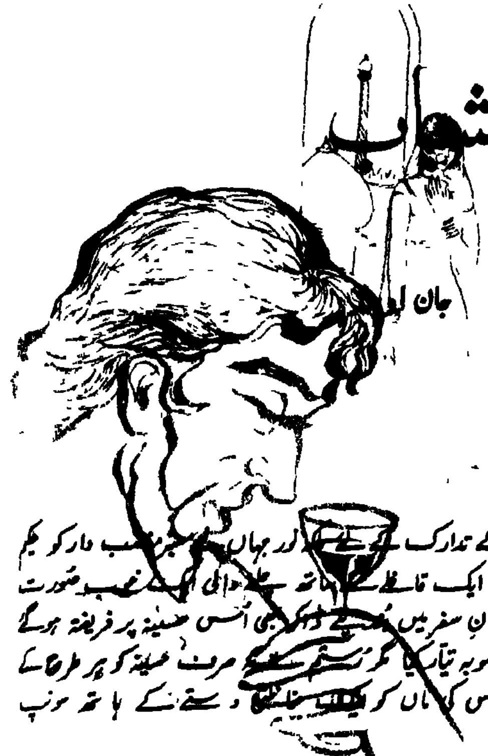
کا

بھیڑیا



(بقایا صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ کیجئے)

شراب اور شباب



مسلسل ناول • جان ل...

شہنشاہ جہاں گیر کی مے نوشی کے تدارک ... اور جہاں ... منصب دار کو حکیم شہاب کو بلانے کے لئے روانہ کیا وہ ایک قافلے کے ساتھ ... والی ایک ... صورت حسینہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا۔ دورانِ سفر میں ... بھی اُس حسینہ پر فریفتہ ہوگئے اور انہوں نے اس کا اغوا کرنے کا منصوبہ تیار کیا مگر رستم ... صرف حسینہ کو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رکھا بلکہ اُسے اور اس کی ماں کو ... کے ہاتھ سونپ دیا۔

رستم نے ہر چند کوشش کی کہ حکیم شہاب ... خود جہاں گیر کے علاج کے لئے عازم سفر ہو مگر حکیم صاحب نہ مانے اور انہوں نے رستم کو اپنے ساتھ ٹھہرالیا تاکہ دو چار دن میں ایک مجرب دوا تیار کرلیں۔

حکیم شہاب کے پاس ٹھہرنے کے دوران رستم کو عجیب حالات کا شکار ہونا پڑا۔ وہ ایک سُرنگ میں پہنچ گیا جہاں وہ قید کر لیا گیا، وہیں اُس کی ملاقات خوب صورت حسینہ سے ہوئی۔ اُسے سخت تعجب ہوا کہ وہ حسینہ سرنگ میں رہنے والے بوڑھے سردار کی بیٹی تھی۔

رستم حکیم شہاب سے دوا لے کر رخصت ہونے ہی والا تھا کہ سُرنگ والے بوڑھے سردار نے اُسے اپنے یہاں بُلایا۔ جب رستم وہاں پہنچا تو جوان حسینہ نے اُس کو وہاں سے بھاگ جانے کی سخت تاکید کی۔ رستم حسینہ کا مطلب نہ سمجھ پایا اور ابھی اُس نے کوئی فیصلہ نہ کیا تھا کہ سردار نے اُسے اپنے پاس بُلالیا اور اُس سے بہت اخلاق سے پیش آیا۔ اگلی ملاقات میں وہ حسینہ کی ماں سے بھی ملا اور اُس نے اپنے دل کی کیفیت اُس بوڑھی عورت پر آشکار کردی۔ بوڑھی عورت نے اُس کو مطمئن کیا کہ اُس کی مُراد پوری ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

رستم دل برداشتہ ہوکر اپنی منزل کی طرف واپس روانہ ہوا۔

"کیا میرا دشمن ہونے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ؟ پھر پہلی بار جس خفیہ طریقے سے
ہ چھپتا چھپاتا یہاں آیا تھا، اُس سے اُس کا جرم اور بھی سنگین ہوجاتا ہے۔ میں نے
اُس کی کھال اُدھڑوادی ہوتی لیکن تم بیچ میں آگئیں۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ اُس نے واقعی تمہاری خدمت کی تھی اور میں احسان فراموش
یں ہوں۔ اِسی لئے میں نے اُسے معاف کردیا اور یہاں سے اُسے جانے دیا۔ یہ شاید
ری اُس سے آخری ملاقات ہوتی لیکن کچھ اور باتیں تھیں جو میں نے خود تک ہی محدود
ھیں۔ مغل دربار نے حکیم سے مشورہ لینے کے لئے اُسے بھیجا تھا۔ اِس سے ہی بہت سی
یں حل ہوجاتی ہیں۔"

"کیا باتیں حل ہوجاتی ہیں ؟"

"یہی کہ مجھے اپنے جانی دشمن سے بدلہ لینے کا اچھا موقع مل جائے گا۔ تمہیں وہ بدقسمت دن یاد
گا ممتاز، جب میرے بہادر بھائی کو دھوکے سے قتل کیا گیا تھا۔ تم تو وہاں موجود نہ تھیں،
ں تھا۔ اُس وقت کے تمام واقعات، ہتھیاروں کا ایک ایک وار میرے دماغ پر اس
ح نقش ہے جیسے کسی گرم لوہے سے داغ دیا گیا ہو۔

"میں بھیس بدلے ہوئے خادم کی پوشاک میں وہیں تھا۔ مجھے اس بات کا شبہ تھا
کوئی فریب کھیلا جانے والا ہے۔ لیکن میرے دلیر بھائی شیر افگن کے دل میں کوئی کھٹک
ں تھا۔ وہ بہت فراخ دِل شخص تھا۔ اِسی لئے اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات
تھی کہ کوئی اتنی گری ہوئی حرکت کرے گا۔ وہ اِس بات کو ماننے کے لئے قطعی تیار نہ
ا کہ اُس غدّار قطب الدین سے ملاقات کے لئے میں بھی اُس کے ساتھ چلوں۔

"وہ اپنے ساتھ صرف دو خواجہ سراؤں کے علاوہ اور کوئی محافظ نہ لے کر گیا۔ لیکن میں
ے اُس کے ساتھ جانے کا تہیّہ کئے ہوئے تھا۔ اِسی لئے میں خواجہ سرا کا بھیس بنا
اُس کے ساتھ ہولیا۔

"لیکن افسوس کہ اِس قدر اُس کے نزدیک رہ کر بھی میں اُسے بچا نہ سکا۔ اِس طرح
نک دھوکے سے قطب الدین کے آدمیوں نے حملہ کیا کہ میں پیچھے رہ گیا۔ تب بھی اتنے
یوں میں ہر طرف سے گھرا ہوا وہ کتنی بہادری سے آخر تک لڑتا رہا۔ مرنے سے پہلے
س نے کئی حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے ساتھ ساتھ سب سے چالاک دو غدّاروں ــــ
ب الدین اور ان کے مصاحب عبا خان کو زمین کی دھول چٹا دی۔

"میں نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح محاصرہ توڑ کر اُس تک جا پہنچوں لیکن میری
ئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ آخر جب وہ میری آنکھوں کے سامنے لڑتے لڑتے
ل ہوکر گر گیا تو میرا حوصلہ بھی پست ہوگیا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ دوسرا خواجہ
اُن کے ہاتھ پڑ گیا اور اُس سے اُنہیں پتہ چلا کہ میں شیر افگن کا بھائی تھا۔

"میرے پیچھے آدمی چھوڑ دیئے گئے۔ تمہیں وہ رات یاد ہے ممتاز، جب میں کسی
، خون اور دھول سے بھرا ہوا تمہارے پاس پہنچا تھا اور کس طرح میں نے
ا اور زبیدہ کو فوراً ہی ایک پالکی میں بٹھا کر سالی گھاٹ کے قلعے میں
دیا تھا۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے، جیسے کل کی بات ہو۔ آدھی رات کا وہ سفر، ننھی زبیدہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے اور پھر بار بار باہر جھانک کر دیکھتی تھی کہ آپ ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔ بھلا اُس خوفناک رات کو میں کیسے بھول سکتی ہوں" بیگم نے کہا۔

"تمہیں سال گھاٹ پہنچا کر اور وہاں کے سردار کے حوالے کر کے میں نے بردوان کا راستہ چُنا تھا، جہاں میرے بھائی کے بیوی بچے تھے، مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُنہیں پہلے ہی قیدی بنا کر آگرہ میں جہانگیر کے دربار میں بھیج دیا گیا تھا۔

"میرے بھائی کے گھر میں قطب الدین کے آدمی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ کیوں کہ اُنہیں معلوم تھا کہ میں ضرور وہاں پہنچوں گا۔ میں بالکل ہی انجان میں اُن کے جال میں پھنس گیا اور قیدی بنا لیا گیا۔ وہاں اُنھوں نے مجھے بدمعاش قطب الدین کی موت کے عوض میں لوہے کی سلاخوں سے اندھا کر دیا۔

"وہ مجھے ایک تہہ خانے میں پھینکنے والے تھے کہ میرے بچے کچھے وفادار ساتھیوں نے اچانک حملہ کر کے مجھے اُن کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ لیکن وہ میری آنکھوں کی روشنی نہ بچا سکے۔ ایک آنکھ تو بالکل ختم ہو گئی اور دُوسری کو کافی نقصان پہنچا۔

"پھر چار سال میں اپنے دشمنوں سے چھپتا چھپاتا اپنا بدلہ لینے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ اِس دوران کبھی کبھی تمہیں بھی ملتا رہا۔ پھر میں یہاں آیا اور اِس ویران گھر میں آباد ہو گیا۔

"مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آخر کار میں نے اپنے دشمنوں سے پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن یہاں بھی اُن کا ایک جاسُوس آ پہنچا۔ میں نے اُسے پکڑ لیا اور مار مار کر سچ اُگلوانے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا۔ یہ ایک برس پہلے کی بات ہے...."

"میں نے حضور سے یہ سب باتیں پہلے بھی سُن رکھی ہیں" اُس کی بیگم نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اب آپ اِن پُرانے قصّوں کو کیوں دُہرا رہے ہیں؟"

"سوتے جاگتے یہ باتیں ہمیشہ میرے دل میں چُبھتی رہتی ہیں۔ پچھلے آٹھ برسوں میں جب سے ظالم جہانگیر نے بہادر شیر افگن کو اُس کی بیوی کے لئے قتل کرایا ہے، میں ہمیشہ اس سے بدلہ لینے کی ترکیبیں سوچتا رہا ہوں۔

"وہ بہت طاقت ور ہے اور مجھ جیسا آدمی اُس سے ٹکر نہیں لے سکتا۔ لیکن آج میں نے اُس سے بدلہ لے لیا ہے۔ میرے جانی دشمن کو، جو اپنے دربار کے عیش و آرام میں غرق ہے، اب جلدی ہی پتہ چل جائے گا کہ جس بہادر شیر افگن کو اُس کے سپاہیوں نے دھوکے سے ہلاک کیا تھا، اُس کا ایک بھائی حسن قلی استجلو ابھی زندہ ہے جو چوٹ کھا کر کبھی نہیں بھولتا اور انتقام لینا جانتا ہے۔"

"آپ کیسی انتقام کی بات کر رہے ہیں؟ آپ اِس وقت اِتنی دُور اراولی کے ویرانے میں بیٹھے ہیں۔ آپ جہانگیر سے کیسے انتقام لے سکتے ہیں جو اپنے پورے جاہ و جلال سے اجمیر میں بیٹھا ہوا ہے؟"

حسن قلی دیر تک زیرِ لب مسکراتا رہا۔

"وہ بے وقوف نوجوان — وہ میری طرف سے انتقام لے گا" وہ بولا۔

" یا خدا، آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ نے رستم سے تمام باتیں واضح کر دی ہیں؟"

" نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ بے وقوف ضرور ہے لیکن اتنا نہیں۔ میں نے
ں سے کوئی بات طے نہیں کی ہے کہ جا کر جہانگیر کو ہلاک کر دے۔ لیکن پھر بھی میں اسی
ے ذریعے اپنا بدلہ لوں گا۔"

" حضور پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔"

" اچھا، بھئی، میں صاف صاف بتا دوں۔ جب وہ پائیں باغ میں تم لوگوں کی
بت کا لطف اُٹھا رہا تھا تو مجھے موقع مل گیا۔ تمام کام میری ترکیب کے مطابق ہُوا
ے معلوم تھا کہ وہ بے وقوف نوجوان اُس پُرلطف صحبت سے لوٹنے میں جلدی نہیں
ے گا۔ میں باہر نکل کر اُس کے گھوڑے کے پاس پہنچا اور وہ بوتل گھوڑے کی زین
ے ساتھ لٹکے تھیلے میں سے نکال لی جس میں حکیم صاحب نے جہاں گیر کے لئے دوا بھیجی تھی
دیکھو، یہ رہی وہ بوتل۔"

سردار نے اپنی شال میں سے بوتل نکال کر بیگم کے سامنے رکھ دی۔

" تو یہ آپ کا انتقام تھا۔ اپنے دشمن کی دوا آپ نے چرا لی۔ بس اتنی سی بات؟"

سردار نے پھر اپنے خاص انداز میں قہقہہ لگایا۔

" نہیں، اتنی سی بات نہیں۔ بلکہ اِس بوتل کی جگہ میں نے اتنی بڑی اور اسی طرح
ی دوسری مہربند بوتل رکھ دی۔ اُس بے وقوف نوجوان کے آنے سے پہلے میں نے
بوتل تیار کر کے رکھی ہوئی تھی۔

" میں نے حکیم کے خادم مرادے اُس بوتل کے بارے میں چالاکی سے ساری باتیں
پوچھ لی تھیں۔ بلکہ میں نے پانی کو رنگ بھی وہی دیا جو کہ دوا کا تھا۔ اب وہ دوا جو نوجوان
نگیر کے لئے لے جا رہا ہے۔ حکیم کی دی ہوئی دوا نہیں بلکہ زہر ہے۔"

"اللہ خیر! آپ نے یہ کیا کیا؟" بیگم نے پریشانی سے پوچھا۔

" بالکل وہی جو میں چاہتا تھا" حسن قلی نے فاتحانہ مسکراہٹ سے جواب دیا "کیا
س عیاش جہاں گیر کے زہر پی کر مر جانے سے تمہیں اتنی پریشانی ہے؟"

" میں جہاں گیر کے بارے میں قطعی پریشان نہیں ہوں۔ مجھے ایسی کوئی خواہش
یں ہو سکتی کہ اُس کی عمر دراز ہو۔ میں تو آپ کے بارے میں پریشان ہوں۔ آپ اپنے اُوپر
ناہوں کا بوجھ کیوں لادتے جا رہے ہیں؟"

حسن قلی نے قہقہہ لگایا "گناہ! تم کہتی ہو؟ یہ گناہ نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ
یا وہ حفاظت کے لئے کیا ہے یا اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی خاطر۔

" تم بہت معصوم ہو، ممتاز۔ تمہاری نگاہیں اس دُنیا کو نہیں پہچان سکتیں جو مرد کے
ی کی طرح مکار اور فریبی ہیں۔ اِس میں جنگ، ظلم اور قتل و غارت سبھی کچھ ہے۔ یہاں
رورت اِس بات کی ہے کہ تم اپنے دُشمن سے بچے رہو، اُس سے ایک قدم آگے رہو۔
ر اگر موقع ملے تو اُسے فوراً نیست نابود کر ڈالو تاکہ وہ تمہیں ختم نہ کر سکے۔

" جہاں گیر اور اُس کے زر خریدوں کے ہاتھوں آج تک میں نے صرف نقصان
اُٹھایا ہے۔ اب میرا موقع آیا ہے کہ میں اُس سے کچھ انتقام لے سکوں۔ یہ بالکل

جائز بات ہے - میرے ساتھ ظلم ہوا ہے اور میں اس ظلم کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہوں گا!"

بیگم نے ناراضگی سے کہا " یہ جائز ہے کہ آپ نے اُس بے گناہ نوجوان کو پھنسا دیا ہے! کیا آپ نے ایک لمحے کے لئے بھی اِس بات پر غور کیا ہے کہ اگر اِس زہر سے جہانگیر کی موت ہوگئی تو اُس نوجوان کا کیا حشر ہوگا جس نے ہم پر اِتنا بڑا احسان کیا تھا؟ اُس پر شہنشاہ کو زہر دینے کا الزام لگے گا - ممکن ہے کہ حکیم صاحب پر بھی شک کیا جائے جو کہ فقیر آدمی ہیں اور آج تک جنہوں نے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا۔"

" یہ خیال مجھے آیا تھا " حسن علی بولا " لیکن جب اچانک جہانگیر کی موت ہو گی تو فوراً ہی محل میں ایک انقلاب بپا ہوگا اور اُس وقت کسی کی دل چسپی نہیں ہو گی کہ مجرموں کو گرفتار کیا جائے - بادشاہ بیگم سے لے کر کنیزوں تک ہر ایک اِس کوشش میں ہوگا کہ نئے حالات میں کس طرح اپنا مقام بنایا جائے -

"سازشوں ، گھاتوں ، جنگ اور قتل و خون کے اُس ماحول میں جو کہ لازمی طور پر جہانگیر کی موت کے بعد پیدا ہوگا ، کسے اِتنی فرصت ہوگی کہ یہ دیکھے کہ کس نے زہر دیا!

"جب اکبر مرا تھا تب بھی یہی شک کیا گیا تھا کہ اُسے زہر دیا گیا ہے - کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اُس کے ولی عہد گدی نشین نے ہی اُسے زہر دیا تھا - لیکن اِس معاملے کی تہہ میں پہنچنے کی مغز پچی کسی نے نہیں کی -

" جہانگیر کے مرنے پر بھی یہی ہوگا - اِس لئے ، میری پیاری ممتاز ، اُس بے وقوف نوجوان کے بارے میں اِتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں - اُس افراتفری میں بچ کر نکل جانے کا اُسے کافی موقع ملے گا - اُس نے تمہاری خدمت کی ہے یہ میں جانتا ہوں ، لیکن اِس وجہ سے میں یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے سب سے بڑے دشمن کو سزا نہ دوں -"

وہاں ٹھہر کر زیادہ جرح نہ کرنا بیگم نے مناسب سمجھا - وہ جانتی تھی کہ اب اِس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا - جو ہو چکا ، وہ ہو چکا - اُن کا نوجوان محسن انجانے میں زہر لئے شاہی دربار کی طرف دوڑا جا رہا ہے - زہر لے جانے کے سبب اُس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹے گا اُس کی بے گناہی اُسے بالکل نہ بچا سکے گی - سردار نے محل میں جس گڑبڑ کا خدشہ ظاہر کیا تھا وہ ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی - کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا حالات پیدا ہوں گے -

دروازے سے باہر نکلتے ہی بیگم کو بیٹی وہاں کھڑی ہوئی ملی - زبیدہ کے چہرے پر موت کی سفیدی چھائی ہوئی تھی -

"بیٹی ، تم نے سُن لیا ؟"

"ایک ایک لفظ ، امّی جان - اب ہم کیا کریں ؟ مجھے ہمیشہ یہی خوف رہا کہ ابّا جان کی اِس دوستی کے پیچھے کوئی خوفناک راز ہے - امّی جان ، اب ہم کیا کریں ؟"

ماں بیٹی دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں - ابھی مُرسّم کو گئے ہوئے مشکل سے گھنٹہ ہی ہوا ہوگا - ایک تیز شہ سوار اُسے پکڑ سکتا تھا - لیکن یہ سب خفیہ طور پر ہی کیا جا سکتا تھا تاکہ سردار کو اس کا بالکل پتہ نہ چلے -

بغیر وقت ضائع کئے دونوں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار ہوگئیں۔ ممتاز نے ایک خط لکھا اور پھر یہ اطمینان کرکے کہ سردار ابھی تک اپنے کمرے میں ہے، اُس نے ایک خدمت گار کو طلب کیا جسے کہ وہ بھروسے کے قابل سمجھتی تھی۔ اُس خدمت گار کو اُس نے خط دیا اور کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔

خدمت گار نے کورنش بجائی اور چلا گیا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے شترنگ میں داخل ہو کر غائب ہوگیا۔

"زبیدہ، ہم اِس وقت اور کچھ نہیں کرسکتے" ممتاز نے اپنی بیٹی سے کہا "اگر خدمت گار تیز رفتاری سے گیا تو جلدی ہی رستم تک جا پہنچے گا۔ میں نے اُسے انعام بھی دیا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ واپسی پر اور دوں گی۔ میں نے خدمت گار کو آقا کی سخت ہدایات کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ اِس لئے وہ اور بھی چوکنا رہے گا۔"

لیکن دونوں کو یہ علم قطعی نہیں تھا کہ تمام خدمت گاروں کو حسن قلی نے پہلے ہی سخت ہدایات دے دی تھیں کہ اگر بیگم صاحبہ یا اُن کی صاحبزادی اُنہیں کسی کام کے لئے بھیجیں تو سب سے پہلے اِس کا پتہ اُنہیں مصاحبِ اعلیٰ کو دینا ہوگا۔ اِس لئے وہ خط اب سردار کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا جو اپنے کمرے میں بیٹھا اُسے پڑھ کر مُسکرا رہا تھا۔

"اُس خدمت گار سے کہو کہ اب وہ اِس کے بجائے میرے کام پر جائے گا اور کچھ دوسرے پیغام لے جائے گا" سردار نے مصاحبِ اعلیٰ سے کہا۔

حسن قلی نے خط پہلے سے ہی تیار کئے ہوئے تھے۔ کُل پانچ چھ خط تھے۔ یہ خط مغل دربار کے اُن امیروں کے نام تھے جن کے بارے میں اُسے معلوم تھا وہ موجودہ حکومت سے نالاں ہیں۔

سب خطوط کا مضمون ایک ہی تھا۔ یعنی سب میں یہی لکھا گیا تھا کہ اُسے صحیح طور پر یہ اطلاع ملی ہے کہ شہنشاہ کی موت لازمی ہے اور جب یہ واقع ہو تو نور جہاں کی طاقت کو پوری طرح کچلنے کے لئے حالات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تیار رہنا چاہئے

اِسی دَوران رُستم گھوڑا دَوڑاتا ہُوا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ملنے والی جگہ پر جا پہنچا تھا۔ جسمانی طور پر چاہے وہ اِتنا فاصلہ طے کر آیا تھا لیکن اُس کا دماغ ابھی تک سردار کے باغ میں ہی بھٹک رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس نے اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس کی تجویز پر نہ انکار کیا گیا تھا نہ اقرار۔ آخر میں اُس لڑکی کی ماں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ بہتر وقت کا اِنتظار کرے۔

اِس طرح اپنے دل میں حسین خوابوں کو سموئے اور تھیلے میں شہنشاہ کے لئے زہر سے بھری بوتل لئے وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں اُسے راجپوتوں کی ٹولی کے ساتھ ملنا تھا۔ اِس ٹولی میں تقریباً تیس شہ سوار تھے جو رانا امرسنگھ کی چھاؤنی میں شامل ہونے جا رہے تھے۔ رانا امرسنگھ کو اُنہیں ساتھ لے کر، اگلے دن شہزادہ خُرّم سے ملاقات کرنی تھی اور مغل سلطنت کی اطاعت قبول کرتے ہُوئے خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔

سب لوگ خاموشی سے سفر طے کر رہے تھے۔ نصف صدی کی شاندار جنگِ آزادی کے بعد وہ ایک افسوس ناک کام کرنے جا رہے تھے، جب کہ اس عظیم جنگ

کا خاتمہ کچھ اور طرح کا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن اب حالات ایسے تھے کہ اور کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

یہ بات صاف تھی کہ اِس ٹولی کے ہر آدمی کے دِل پر اِس بات کا گہرا احساس ہے۔ وہ سب سنجیدگی سے سر جُھکائے چپ چاپ چلے جا رہے تھے۔ اُن کے درمیان ایسے پُرانے سپاہی بھی موجود تھے جن کے جسم پر زخموں کے نشانات اُن لڑائیوں کی یاد دلاتے تھے، جو اُنہوں نے رانا پرتاپ کے جھنڈے تلے لڑی تھیں۔ لیکن اب وہ مجبور اور بے بس تھے اور اُن کے بجھے ہوئے چہروں پر ایک بے کسی چھائی ہوئی تھی۔

رُستم اس ٹولی کے ساتھ مِل کر خاموشی سے چلتا رہا۔ اِس بجھی بجھی سی فضا میں اُسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی کیوں کہ یہ ماحول اُس کے دِل و دماغ پر چھائی ہوئی مسرت کے بالکل برعکس تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اُن کے ساتھ ایک بوڑھا سپاہی بھی چل رہا تھا جس کا گھوڑا بھی اُس کی طرح عمر رسیدہ تھا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح ہتھیاروں سے لیس تھا لیکن اُس نے اتنے زیادہ ہتھیار نہیں باندھ رکھے تھے۔

رُستم نے دیکھا کہ اُس کی زین کے ساتھ ایک لمبی سی چیز نیام میں بند لٹک رہی تھی غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ ستار جیسا کوئی باجا ہے۔ رُستم اُس بوڑھے کے قریب پہنچ اور بولا " میرا خیال ہے کہ آپ ہتھیاروں کے ساتھ موسیقی کا شوق بھی رکھتے ہیں؟ "

بوڑھا جیسے سوتے میں چونک پڑا۔ ایک سرد آہ بھر کر بولا " تمہارا خیال درست ہے جوان۔ میں اِس ٹولی کا بھاٹ ہوں۔ میں اکثر رانا جی کو گیت سنایا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ دِن گزر چکے ہیں۔ اب وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ میرے دن بھی اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں اور میرے اندر کی تمام موسیقی ختم ہو چکی ہے " اور اُس نے اپنا سر نیچے جُھکا لیا۔

" لیکن اِکتارہ تو اب بھی آپ اپنے ساتھ رکھتے ہیں؟ " رُستم نے پُوچھا۔

" یہ تو پچھلے ساٹھ سال سے میرے ساتھ ہے " بوڑھے بھاٹ نے جواب دیا " میرے دُکھ سُکھ کا ساتھی ہے۔ اچھے وقتوں میں خوشی کے نغمے اور بُرے وقت میں میرا ہمراز۔ صبر اور برداشت کا درس دینے والا۔

" اب تو میں اِسے عادتاً اپنے ساتھ رکھتا ہوں، اپنے اُن شان دار دنوں کی یادگار کے طور پر، جو اب نہیں رہے۔ جو اب بالکل نہیں رہے۔ ہمارا سُورج ڈوب چُکا ہے اور پھر کبھی نہیں چمکے گا، کبھی نہیں۔ "

" دادا جی، کبھی نہیں، مت کہو " ایک اور شہ سوار جو آگے جا رہا تھا، بوڑھے کی دُکھ بھری بات سُن کر بولا " ہم پر بُرے دن آ گئے ہیں۔ اپنے بُرے دنوں کے سبب ہمیں اب دُشمن کے سامنے سر جھکانا پڑ رہا ہے۔ لیکن ہمارا ستارہ پھر چمکے گا۔ ایک دن ہمارا جھنڈا پھر ہندوستان پر لہرائے گا ... "

" تم آسانی سے یہ سب کہہ سکتے ہو " بوڑھے بھاٹ نے جواب دیا " تمہاری رگوں میں جوان لہو ہے۔ تم اچھے دنوں کی اُمید کر سکتے ہو۔ لیکن راجستھان کی قسمت کا ستارہ ڈوب چکا ہے۔ اب وہ کبھی نہیں چمکے گا " اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا

ان دونوں کی باتوں میں دوسرے شہ سوار بھی شامل ہو گئے۔ کبھی اپنے شان دار پرانے
ن کو یاد کر کے اُداسی میں ڈوبے ہوئے تھے اور اِس بات پر کفِ افسوس مَل
ہے تھے کہ انہیں اپنے دشمنوں کے سامنے جھکنا پڑ رہا ہے۔ اُن کی باتوں سے کچھ گھبراہٹ
وس ہو رہی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ سب اپنی باتوں میں اِس قدر اُلجھے ہوئے
تھے کہ رستم کی طرف اُن کا دھیان ہی نہیں گیا۔

رات ہوتے ہوتے یہ ٹولی رانا امر سنگھ کے پڑاؤ پر جا پہنچی۔ پڑاؤ کھلے میدان میں تھا۔
رادہ خرم کا ڈیرہ کچھ میل دُور تھا۔ رانا اور شہزادے کے بیچ اگلے دن صبح ملاقات طے
ئی تھی۔ سب باتوں پر فیصلہ کیا جا چکا تھا اور صلح کی تمام شرائط طے ہو چکی تھیں۔

جہانگیر نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنے دشمنوں کے سامنے کافی نرم شرائط رکھی
ہیں۔ اطاعت صرف برائے نام تھی۔ امر سنگھ کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک
وم کی طرح مغل دربار میں حاضری دے۔ اُس کی جگہ کنور رانا کرن سنگھ اجمیر
رہے تھے۔

کھانے کے بعد رانا کے شامیانے میں اُن تمام سرداروں کی نشست منعقد ہوئی۔ یہ
ے تاریخی لمحہ تھا لیکن ایک ایسا غمگین لمحہ جس کی مثال شاید راجستھان کی کُشت و خون سے بھری
یخ میں کہیں نہیں ملے گی۔ وہاں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو برسوں رانا کے دُکھ
لھ میں شریک رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اُن کے عظیم والد رانا پرتاپ کے
نڈے کے نیچے لڑ چکے تھے۔ اب وہ سب یہاں اکٹھے ہوئے تھے کہ اپنے رانا کے
یے مغلوں کی اطاعت کا مشورہ سنیں اور رسمی منظوری دے دیں۔

مصیبتیں جھیلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اپنی آزادی کے لئے جو کچھ وہ برداشت
ر چکے تھے اتنا شاید ہی کوئی دوسرا برداشت کر سکتا، بلکہ خود رانا پرتاپ بھی شاید اِس
سے زیادہ برداشت نہ کر پاتے۔ حملہ آور فوجوں نے راجستھان کو ایک سِرے سے تباہ کر کے
الکل ایک ویرانہ بنا دیا تھا۔

بہت سے راجپوت راجہ پہلے ہی مغل حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے تھے۔ رانا اور
س کے سردار اگر اب بھی لڑتے رہتے تو بھی بربادی کے سوائے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں
لتا۔ اتنے بڑے مقابلے میں بڑی سے بڑی وطن پرستی بھی کیا کام دے سکتی تھی؟ اچھے یا
رے، جیسے بھی حالات ہوں اُن سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتی تھیں۔

اِس نشست میں کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں ہوئی۔ رانا نے صلح کی شرطیں سُنا
یں اور سب لوگوں نے خاموشی سے سُن لیں۔ یہ شرط سُن کر لوگوں کو کچھ خوشی ہوئی کہ
توڑ کو بحال کر دیا جائے گا۔ لیکن جب اِس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی سُنی کہ وہاں دوبارہ
لعہ مضبوط نہیں کیا جائے گا اور نہ کوئی مرمت کی جائے گی تو اُن کی خوشی پھیکی پڑ گئی۔ اِس
بجلس میں فضا بوجھل تھی۔ کسی نے کوئی تجویز نہ رکھی۔ کسی نے کوئی مخالفت نہ کی۔ سب
نے خاموشی سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور نشست کی کارروائی ختم ہو گئی۔

یہ ناخوشگوار کام ختم ہوا تو ماحول میں زندگی کی لہر دوڑی۔ رانا نے اپنے خادموں
کو بلایا اور اُنھوں نے مہمانوں کی خدمت میں عطر پان پیش کئے۔ یہ کوئی خوشی کا موقع

نہ تھا اِس لئے کبھی بھی طرح کی رنگینی اِس وقت مناسب نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اِس بجھے ہُوئے ماحول کو کچھ ہلکا کرنے کے لئے پان تقسیم کئے گئے تھے۔

آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔ وہ لوگ ہر طرح کی باتیں کر رہے تھے لیکن صرف ایک بات تھی جو کوئی زبان پر نہیں لایا مگر جو ابھی تک سب کے دِلوں میں مایوسی پیدا کئے ہُوئے تھی۔ بہرحال اِس وقت وہ سب اِس بات کو بھول جانا چاہتے تھے۔



ظلم و ستم

— وفا میرٹھی

دین اور دھرم کو سونے سے پرکھنے والو
تم بتا سکتے ہو ایمان کی قیمت کیا ہے

اب تو مُردوں کو کفن بھی نہیں ہوتا ہے نصیب
ایسے ماحول میں انسان کی قیمت کیا ہے

ایک روٹی کے لئے بکتی ہے اب عصمتِ نَو
چند سِکّوں پہ بِکھر کتے ہیں جوانی کے قدم

دھرم کی آڑ میں کُٹتی ہیں ہزاروں کلیاں
بُت کدوں میں بھی تڑپ جاتے ہیں پتھر کے صنم

آج انسان پہ وحشت کا جنوں طاری ہے
آج ہر دل سے رقابت کی صدا آتی ہے

نوعِ انسان سے اخلاص کی قیمت لے کر
ظلم کی شمع محبت کو جلا جاتی ہے

خون پیتے ہیں وطن والوں کا تو اہلِ شعور
ایسے لوگوں کو ہی غدّار کہا جاتا ہے

کر رہے ہیں جو ہمالہ کے جگر کے ٹکڑے
اُن درندوں کو ہی اغیار کہا جاتا ہے

قوم کی آہنی دیوار گری جاتی ہے
موت سے کون دلا سکتا ہے اب اس کو نجات

چیختی پھرتی ہے راہوں پہ ہوس بن کے وفا
پاپ نے بھر دیا اب رہزنوں کا جامِ حیات

"تم اس خاک سے پیدا ہوئے ہو، جو راجاؤں کی زمین کہلاتی ہے۔ اُٹھو اور کیسر میں رنگا ہوا جھنڈا ہاتھ میں لے لو۔ موت کا خوف بُزدلی ہے۔ اسے نکال پھینکو۔ اپنی تلواریں نکال لو۔ اپنے نیزوں کی نوکیں ہواؤں میں لہراؤ۔ اپنے گھوڑوں پر چڑھو اور ایڑ لگا کر چل دو۔ فتح یا موت کا عزم لے کر آگے بڑھے چلو۔ فتح یا موت بہادروں کے لئے۔ فتح یا موت۔"

اِن سرگوشیوں کے درمیان ایک تارے کی جھنکار اُبھری۔ بات چیت رُک گئی اور سبھی کان لگا کر سُننے لگے۔ اپنی گدّی پر بیٹھے ہوئے رانا نے گردن اُٹھائی کہ یہ کون ہے، جس نے لوگوں میں دل چسپی کی لہر دوڑا دی ہے۔

"ارے، یہ تو دادا دیو چند جی ہیں" اُس نے بوڑھے بھاٹ کو دیکھتے ہوئے کہا، جو ایک کونے میں بیٹھا اِکتارہ بجا رہا تھا "دادا جی، ایک گیت سنا دو۔ وقت کٹ جائے گا۔"

اِس طرح رانا کے بلانے پر بوڑھا بھاٹ اُٹھا اور محفل کے بیچ میں آ بیٹھا۔ کچھ دیر تک اُس نے اِکتارے پر اپنی اُنگلیاں چلائیں اور پھر گانے لگا۔

وہ میواڑ اور باپا راول کے عظیم سسودیا خاندان کے گُن گا رہا تھا۔ باپا جی نے چتوڑ میں راجدھانی بسائی۔ عربوں اور ترکوں سے جنگ کی جو پنجاب اور سندھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ پھر امر سنگھ کی کہانی جو مہاراجہ پرتھوی راج کا سامنت تھا اور جو تراوڑی کے میدان میں مسلمان سلطان سے لڑتے ہوئے شہید ہُوا تھا۔

سبھی لوگ بہت دھیان سے اپنے بزرگوں کے کارنامے سُن رہے تھے۔ اُن کی سوئی ہُوئی روحیں جاگ رہی تھیں اور سینے جوش سے تنے ہوئے تھے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی آج کے حالات بھی اُن کے دماغ پر چھائے ہُوئے تھے۔ گانا ختم ہوتے ہی لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔

بوڑھا بھاٹ خوش ہوا اور اُس نے ایک اور داستان شروع کر دی: "تمہاری عزت یا تمہاری زندگی' چتوڑ کے قیدی راجہ سے مغرور سلطان بولا 'اپنی رانی پدمنی کو میرے حرم میں بھیج دو۔ میں تمہیں آزاد کر دوں گا' علاؤ الدین خلجی نے کہا۔

"جب چتوڑ میں رانی پدمنی نے یہ بات سُنی تب اُس نے جواب بھجوا دیا 'دیوی ماں کی سوگندھ۔ اُسے رانا جی کی رانی ملے گی۔ ساتھ میں سیکڑوں اور بھی۔ اُس کے حرم میں اتنی جگہ بھی نہ ہوگی۔'

"پھر سلطان کے حرم جانے کے لئے رانی اور داسیوں کی خاطر پالکیاں سج گئیں۔ خوبصورت پدمنی کو سبھی نے پالکی میں بیٹھتے دیکھا، لیکن داسیوں کو کسی نے نہ دیکھا۔

"پالکیاں بہت بھاری تھیں، لیکن کہار بھی مضبوط تھے۔ رُکے نہیں۔ وہ بغیر تھکے سلطان کے حرم میں جا پہنچے۔

"غرور میں اندھا سلطان ہنسا اور رانی پدمنی کے استقبال کے لئے آگے آیا 'یہ میرے حرم کا بیش قیمت ہیرا ہو گی' اُس نے کہا 'تم جیسے ہیرے کا مالک صرف دلّی کا سلطان ہی ہو سکتا ہے'۔

"رانی پدمنی نے جھک کر سلام کیا اور بولی 'سلطان جی، میں تو صرف ایک ہیرا ہوں اور وہ بھی چھوٹا سا۔ لیکن جو ہیروں کا خزانہ میں ساتھ لے کر آئی ہوں اُس میں مجھ سے بھی قیمتی اور انمول رتن ہیں۔ ان پالکیوں کے ہیروں کو دیکھو۔ یہ سارے اگر آپ کے گلے کی زینت بن گئے تو بوجھ سے آپ کی گردن ٹوٹ جائے گی'۔

"اپنی نئی رانی کا مذاق سن کر سلطان زور سے ہنسا 'میری رانی تم جتنی حسین ہو اُتنی ہی عقلمند بھی ہو' وہ بولا۔

"نہیں، سلطان جی، ابھی نہیں' رانی پدمنی نے کہا 'ابھی میں تمہاری رانی نہیں۔ ایک بار مجھے اپنے پہلے شوہر کے درشن کر لینے دو۔ سلطان جی، یہ میری پہلی اور آخری درخواست ہے۔ پھر میں کبھی تم سے کچھ نہیں مانگوں گی'۔

"طاقت کے نشے میں چُور سلطان اُس کی بات مان گیا۔ قیدی رانا کی رانی کے لئے جیل کے دروازے کھول دئے گئے تو اچانک ہی بند پالکیوں سے ہزاروں راجپوت سُور نکل آئے۔

"دھوکا، زبردست دھوکا' سلطان چلّایا اور اُس نے پہرے داروں کو آواز د' لیکن پہرے داروں کے آنے سے پہلے ہی رانا اور رانی پدمنی بہت دُور نکل چکے۔

'مغرور سلطان، جس نے رانا سے کہا تھا کہ عزت دے دو یا زندگی، اب اپنے ہا ملتا رہ گیا۔ رانی کی دانشوری اور راجپوت بہادروں کی دلیری سے رانا جی کی زندگی اور میواڑ عزت دونوں بچ گئی تھیں۔"

بُڑھے بھاٹ نے داستان ختم کی تو چاروں طرف واہ واہ کے نعرے لگنے لگے۔ اُس خاموشی سے گردن جھکا کر داد قبول کی اور پھر داستان کا دُوسرا حصّہ شروع کیا۔

"گڑھ چتوڑ کے آنگن میں یہ دہکتی ہوئی آگ کس لئے ہے؟ یہ اُداس اور خاموش راجپوت بہادر عورتوں کا جلوس کہاں جا رہا ہے۔ گڑھ کے باہر مسلمانوں کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور گڑھ کی فصیل کے اندر کیسریں رنگے کپڑے پہنے راجپوت لڑ کے جنگ کی آگ میں کُود کر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

"باہر جنگ شروع ہوئی اور گڑھ کے اندر شعلے بھڑک اُٹھے۔ اُدھر سُورما نے آخری چلایا اور اِدھر اُس کی بہادر بیوی نے آگ میں چھلانگ لگائی۔ ایک ایک کر کے سب جامِ شہادت پی گئے۔ ایک ایک کر کے اُن کی بیویاں جوہر کی نذر ہو گئیں۔

"چتوڑ کی جوانمردی خُون میں ڈُوب گئی اور اُس کا پاک حُسن آگ میں سو گیا۔ ۔ کے ساتھ رانا مٹ گئے اور راجپوتانیوں کے ساتھ رانی پدمنی نہ رہی۔ زندگی گئی، لیکن رہ گئی۔"

بھاٹ ذرا رُک گیا لیکن اِس بار کوئی واہ، واہ نہ ہُوئی۔ چاروں طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ خاموش بیٹھے راجپوت سامنتوں میں سے بہت سے چہروں کے

نسوؤں سے تر تھے۔ رانا بھی کافی سنجیدہ ہو گیا۔ داستان آگے بھی چلتی گئی۔

"زندگی گئی لیکن عزت رہ گئی" اِن الفاظ کو دہرا کر اُس نے ایک آہ بھری اور گردن
ی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ آگے چل کر کبھی بھاٹ اگر اُس کی داستان گائیں گے تو کہا
گے "عزت چلی گئی اور سب کچھ چلا گیا لیکن زندگی رہ گئی"۔

رانا اور پرانے سامنتوں پر اپنے گیت کا اثر دیکھ کر بوڑھے سردار نے ایک بار پھر
ارہ اُٹھایا۔

"کیا سُورماؤں کی رگوں میں بہنے والا لہو کبھی پانی ہُوا ہے؟ کیا بوڑھا ہو کر شیر بھی بُزدل ہوا
نہیں! تو پھر وہ باپا، امرسنگھ، کنبھا اور سانگا کی جوانمردی کیا ہُوئی؟ کیا راجستھان سے رانا
پ کی بے مثال بہادری ختم ہو گئی؟

"کیا تم اُنہی سُورماؤں کی اولاد ہو؟ کیا تم اُن کی اولاد کہلانے کے قابل ہو؟ کیا تمہیں
پنے جسم سے اتنا موہ ہو گیا ہے؟ کیا تمہیں اپنی عزت سے بھی زیادہ اپنی زندگی کی تمنا
؟ کیا تم راجپوت نہیں ہو؟ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ تمہارے غلام بھیل تم سے زیادہ
ہیں؟

"بہادروں کے بُزدل بیٹو، کچھ تو شرم کرو۔ کچھ تو اپنی عظمت کو یاد کرو۔ یاد کرو کہ تم
ا خُون ہو! راجپوتوں کے نام پر داغ مت لگاؤ۔ اپنے بزرگوں کے نام پر خاک مت اُچھالو۔
ے کے غلام بن کر آنے والی نسلوں کی پیشانیوں کو داغدار مت کرو۔

"تم اُس خاک سے پیدا ہُوئے ہو، جو راجاؤں کی زمین کہلاتی ہے۔ اُٹھو اور کیسریں رنگا
نڈا ہاتھ میں لے لو۔ موت کا خوف بُزدلی ہے۔ اُسے نکال پھینکو۔ اپنی تلواریں نکال لو۔ اپنے
ی کی نوکیں ہوا میں لہراؤ۔ اپنے گھوڑوں پر چڑھو اور ایڑ لگا کر چل دو۔ فتح یا موت کا عزم
آگے بڑھے چلو۔ فتح یا موت بہادروں کے لئے۔ فتح یا موت۔"

جیسے جیسے بھاٹ کے گیت کی لَے تیز ہوتی گئی، سُننے والوں کے دِلوں کی دھڑکنیں بھی
رتی گئیں۔ اُن کے اندر وطن کا سویا ہُوا پیار کروٹیں بدلنے لگا۔ اُن کے چہرے تمتمانے لگے
ازو پھڑکنے لگے۔

گیت ختم ہوتے ہی لوگ جوش میں ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہو گئے اور اپنی تلواریں
کر ہَوا میں لہراتے ہُوئے بھاٹ کے ساتھ آواز ملا کر چلّا اُٹھے "فتح یا موت!"
رانا بھی خود پر ضبط نہ کر سکا، لیکن ابھی تک اُس کے دماغ میں ایک اُلجھن تھی۔ وہ فیصلہ
کر پا رہا تھا کہ موجودہ حالت میں اُس کا فرض کیا ہے۔ اُسے جوش میں بھرے ہُوئے
تیوں کو خاموش کرنا چاہیئے یا خود بھی تلوار کھینچ کر بھاٹ کے ساتھ آواز ملا کر چلّانا
ئے 'فتح یا موت!'

نعروں کے شور کی آواز شامیانے کے باہر تک گُونج رہی تھی۔ رستم اِس وقت گھوڑے
تب ڈال رہا تھا۔ شور سُن کر اُسے تعجب ہُوا کہ کیا معاملہ ہے۔ شامیانے کے اندر اور
راجپوتوں کے ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ گُونج رہا تھا "فتح یا موت!"

رستم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اِس پڑاؤ میں صرف وہی ایک مغل تھا۔ وہ
پتہ لگا کہ جوش کے جنون میں اندھے یہ لوگ کہیں کچھ میل دُور شہزادہ خرّم کی فوج پر

حملہ نہ کر دیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجپوتوں کے جذبات اچانک کیسے مشتعل ہو گئے جب کہ وہ لوگ مغل شہزادے کو خراج پیش کرنے کے ارادے سے یہاں آئے تھے۔

"فتح یا موت!" جنگ کا نعرہ گونجا۔ رُستم خاموشی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ ایک وفادار مغل ہونے کے ناطے اُس کا فرض تھا کہ وہ شہزادہ خُرّم کو اس خطرے سے آگاہ کر دے گا۔ خوش قسمتی سے اُسے کسی نے جاتے ہوئے نہیں دیکھا ورنہ راجپوت اُس کی تکا بوٹی کر دیتے۔

مغل پڑاؤ کے پاس پہنچتے ہی پہرے داروں نے اُسے روک لیا۔ رُستم نے اُنہیں اپنا نام اور عہدہ بتایا اور اُن سے کہا کہ اُسے فوراً شہزادہ خُرّم کے سامنے پیش کر دیں، کیوں کہ وہ بہت ضروری خبر لے کر آیا ہے۔

گشتی دستے کے افسر کو ساتھ لے کر رُستم خیموں کی دُور تک پھیلی ہُوئی قطاروں کو پار کرتا ہُوا شہزادے کے شامیانے میں پہنچ گیا۔ اُس کا اندازہ تھا کہ چھاؤنی کئی میل کے رقبے میں ہو گی اُس کے مقابلے میں رانا کا پڑاؤ بہت معمولی تھا۔ اُس کی اِتنی معمولی فوجی طاقت مُغل سلطنت کی فوجوں سے اِتنے دن کس طرح لوہا لیتی رہی ہے، یہ بات نوجوان رُستم کی سمجھ میں نہ آئی۔

آخر اُسے شہزادہ خُرّم کے سامنے پیش کیا گیا، جو جہانگیر کا سب سے قابل بیٹا تھا۔ ابھی تک اُس کی عمر ۲۵ برس سے کم تھی۔ لیکن اُس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک سمجھ دار سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ شہزادہ ایک نیچی گُلی گدّے دار مسند پر بیٹھا تھا۔ اُس کے خوب صورت چہرے پر مردانگی اور فراخ دِلی جھلک رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک فولادی سختی اور بے رحمی کی چمک بھی موجود تھی۔ نوجوان عہدی نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو اُس نے نظر اُٹھائی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم سیدھے رانا امر سنگھ کے پڑاؤ سے آرہے ہو۔ کیا خبر دینا چاہتے ہو؟"

جواب میں رُستم نے سارا قصّہ بیان کر دیا جو اُس نے رانا کے پڑاؤ میں دیکھا تھا جب اُس نے بتایا کہ راجپوت تلواریں لہراتے ہوئے 'فتح یا موت' کا نعرہ لگا رہے ہیں تو اُس کی آنکھوں میں نفرت اُبھر آئی اور وہ طنز سے مسکرایا۔

"تو نوجوان، تمہارا خیال ہے کہ وہ ہم پر اچانک حملہ کر دیں گے؟"

"اُن کا جوش و جنون دیکھ کر یہ نا ممکن نہیں لگتا" رُستم نے جواب دیا۔

شہزادے کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مجھے اُمید نہیں ہے کہ کوئی ایسی بات ہو گی۔ وہ ہر طرح سے شکست کھا چکے ہیں۔ اب اگر ہماری مضبوط حالت میں وہ حملہ کریں گے تو سوائے تباہی اور بربادی کے اُن کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ رانا امر سنگھ یہ بات بخوبی جانتا ہے۔

"یہ اچانک اُبھرا ہُوا جوش دیوانگی کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ بہر حال نوجوان تم نے اپنا فرض پُورا کیا۔

"اپنے خط میں مَیں شہنشاہ سے تمہارا ذکر کروں گا۔ تم دربار میں کام کرنے والے عہدی ہو؟"

"جی، ہاں، عالم پناہ۔"

"تو تم رانا کے پڑاؤ میں کیسے پہنچ گئے؟"

رُستم نے مختصراً اپنا قصّہ اُنہیں سنایا۔ اُس وقت شہزادہ خُرّم کا نُور جہاں کے گھرے
یتوں میں شمار ہوتا تھا۔ اُس نے ملکہ بیگم کے بھائی آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو بیگم سے
ی کی تھی جو بعد میں ممتاز محل کے نام سے مشہور ہوئی۔

بعد میں جاکر وہ اِس گٹ بندی سے علیحدہ ہُوا تھا اور اُس کے ساتھ اُس کی دُشمنی
ی تھی۔

لیکن تاریخ کا وہ باب ابھی وقت کے سینے میں دفن تھا۔ اِس لئے رُستم نے حکیم
ب کے پاس جانے کا اپنا خفیہ مقصد شہزادے کو بتانے میں حرج نہ سمجھا۔

"تو تم ہماری خوب صُورت خالہ کے قابلِ اعتماد ایلچی ہو؟ بہت خُوب۔ اگر تُم
ر تو ہماری چھاؤنی میں قیام کر سکتے ہو اور ہمارے ساتھ ہی اجمیر چل سکتے ہو۔"

شہزادہ خُرّم کو اپنی فوجی طاقت پر پُورا بھروسہ تھا۔ پھر بھی اُس نے عہدی کی دی ہوئی
ع کو نظرانداز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رانا کے پڑاؤ کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے اُس نے
جاسوس بھیج دیئے۔ جاسوسوں نے آکر خبر دی کہ رانا کے پڑاؤ میں کچھ دیر تک بہت جوش
لیکن بعد میں عقلمندی سے کام لے کر وہ خاموش ہو گئے اور اُن کے اندر وطن پرستی کی
ہوئی آگ ٹھوس حقائق کے سامنے سرد پڑ گئی۔ اُن کے پڑاؤ سے اچانک حملے کا کوئی
ہیں ہے۔

اِس طرح اگلے دن رانا اور شہزادے کے درمیان طے شدہ ملاقات ہُوئی۔ تحفے دیئے
ور لئے گئے۔ شہزادہ نے اپنے بہادر دُشمن کو مناسب عزّت اور احترام دیا تاکہ مغلیہ سلطنت
امنے سر جھکانے میں اُس جانباز راجپوت کی غیرت کو ٹھیس نہ پہنچے۔

رانا اور اُس کا عملہ لَوٹ گیا۔ اُس کے بعد کنور راجکمار کرن سنگھ آیا۔ کرن سنگھ کو مغل
میں اپنے پِتا رانا کی طرف سے پیش ہونا تھا۔ اگلے دن شہزادہ اور کنور اجمیر کی طرف
ہو گئے۔

رُستم بھی شہزادہ خُرّم کے خیمے میں شامل تھا۔ وہ تھوڑا تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہوئے کچھ
بعد اجمیر جا پہنچے۔ اُن کے اجمیر پہنچتے ہی شہنشاہ نے شکار پر جانے کا انتظام کیا۔ شکاریوں کو
ں شاہی جنگلات میں بھیج دیا گیا تھا۔ دربار کے امیر اور اہلکار میدان کے ایک طرف
تھے۔ اعلیٰ طبقہ ہاتھیوں پر سوار تھا اور باقی لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ بادشاہ کو پیغام
گیا کہ گھیرا مکمل ہو چکا ہے اور اب اُن کی آمد کا انتظار ہے۔

تقریباً تیسرے پہر شہنشاہ تشریف لائے۔ وہ ایک جنگی ہاتھی کی پیٹھ پر ہَودے میں سوار
ان کے پیچھے ایک اور ہاتھی تھا جس پر ملکہ سوار تھیں۔

مسلار کرنے کا حکم دیا گیا۔ شکاریوں اور اُن کے عملے نے جھاڑیاں پیٹنا شروع کیں۔ پرندوں
اڑنے لگے۔ کچھ جنگلی بکرے اور چھ سات خرگوش نکل کر بھاگے۔ شکاریوں نے اُنھیں
کے بیچ کھدیڑ دیا۔ شہنشاہ اور ملکہ بیگم کے گرد موجود شکاریوں نے اُنہیں فوراً مار دیا ہنگامہ

جاری رہا اور جنگل کے جانور زیادہ سے زیادہ تعداد میں باہر آتے رہے اور مرتے رہے۔

شہنشاہ اور ملکہ بیگم کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ اُن کے سامنے جو بھی جانور آتا، اُسی پر وہ اپنا نشانہ آزماتے۔ دونوں اچوک نشانے باز تھے اور تھوڑی دیر میں ہی اُنہوں نے کئی شکار مار لئے، لیکن یہ سب چھوٹا شکار تھا۔ شیر یا چیتا یا کوئی دُوسرا خوف ناک جانور سامنے نہیں آیا تھا۔ شکاریوں میں شکار کی طلب پُوری نہ ہُوئی تھی اور وہ بڑے شکار کے انتظار میں تھے۔

اچانک جنگل میں شور مچنے لگا۔ شکاریوں کی ایک قطار کسی جانور کو کھدیڑ کر گھیرے کے بیچ میں بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک ایک خوف ناک چیتا چھلانگ لگا کر پاس کھڑے شکاری پر جھپٹا۔ اِس اچانک حملے سے شکاری زمین پر آ رہا۔ چیتے نے اپنے تیز نوکیلے پنجے گرے ہُوئے آدمی کی گردن میں گاڑ دیئے۔

چیتے کے قابو میں آئے ہُوئے آدمی نے اپنے ٹوٹے ہُوئے نیزے کی مدد سے خود کو بچانے کی بے کار سی کوشش کی اور ساتھ ہی ایک درد ناک چیخ اُس کے منہ سے نکلی۔

شکاری کو چیتے کی خوراک بنتا دیکھ کر اُس کے باقی ساتھی اُس کی طرف بھاگے اور نیزوں کے وار سے اُسے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ نیزوں کی مار سے گھبرا کر چیتا پلٹا اور اپنی طرف آتے ایک ہاتھی کی سُونڈ سے لپٹ گیا۔

ہاتھی پر ہَودے میں خود شہنشاہ اپنے محافظ اہلکار کے ساتھ سوار تھے۔ مہاوت نے چیتے پر انکس کا وار کیا، لیکن چیتے پر اِس کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ ہاتھی نے زور سے اپنی سُونڈ کو جھٹکا دیا، جس سے چیتا نیچے جا گرا۔ اُس سے نجات ملتے ہی ہاتھی نے اپنے بڑے بڑے دانتوں سے چیتے پر حملہ کر دیا اور ایک ہی وار میں اُسے پھاڑ ڈالا ہوتا لیکن چیتا کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی اُچھل کر ہاتھی کے دانتوں سے بچ نکلا اور کنی کاٹ کر پہلو سے ہاتھی پر جھپٹا۔

ہَودے میں بیٹھے ہوئے محافظ نے چیتے پر تیر چھوڑا جس سے وہ زخمی ہو کر اور خونخوار ہو اُٹھا۔ نیچے پھسلتے ہُوئے اُس نے ہاتھی کی کھال کو اپنے پنجوں سے اُدھیڑ دیا۔

چیتا دوبارہ ہاتھی پر چھلانگ لگانے والا ہی تھا کہ شہنشاہ نے اپنی بندوق کا نشانہ باندھا۔ لیکن اُن کے لبلبی دبانے سے پہلے ہی ایک دھماکہ ہُوا اور چیتا ہوا میں اُچھل کر زمیں پر آ گرا۔ شہنشاہ نے مُڑ کر دیکھا تو اُس کے پیچھے نُورجہاں کا ہاتھی تھا اور گولی ملکہ نے چلائی تھی۔

مَرا ہوا چیتا زمین پر پڑا ہُوا تھا۔ یہ عام چیتوں سے کافی بڑا تھا۔ ایک شکاری نے اُسے کھوپڑی سے دُم تک ناپا تو اُس کی لمبائی آٹھ فٹ نکلی۔ مرے ہُوئے چیتے کے گلے میں ایک لوہے کا پٹہ بندھا ہُوا تھا۔ اِس سے ظاہر تھا کہ یہ کسی کا پالتو چیتا تھا۔

ملکہ نے حکم دیا کہ پٹہ اُتار کر اُس کے پاس پہنچایا جائے۔ پٹہ لچک دار فولاد کا تھا۔ شکاریوں نے اُسے آسانی سے کھول دیا اور ملکہ کے سامنے پیش کیا۔ پٹہ بالکل صاف تھا۔ اُس پر کہیں بھی زنگ نہیں لگا ہُوا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی اپنے مالک کے پاس سے بھاگا ہے۔ پٹے کے اندر کی طرف کچھ الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ جو اب تقریباً مٹ چکے تھے۔ پھر بھی ایک لفظ صاف پڑھا جا رہا تھا 'اتحاد'۔

'اِستجلو' ملکہ نے پڑھا اور اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ علی قلی 'اِستجلو' اُس کے پہلے خاوند شیر افگن کا خطاب ملنے سے پہلے کا نام تھا۔ یہ کیا ماجرا تھا کہ شکار کئے ہوئے چیتے کے گلے میں اُس کے پہلے خاوند کے نام کا پٹہ پڑا ہوا تھا۔

ملکہ نے اپنا پیش قبض نکال کر پٹے کے اندر جمی ہوئی کثافت کو کھرچا تو پورا نام صاف چمکنے لگا۔ علی قلی استجلو۔ بڑی مشکل سے ملکہ نے دل میں اُٹھتے ہوئے طوفان کو روکا۔ ظاہرا طور پر بےپرواہی سے اُس نے پٹے کو ہودے کے اندر پھینک دیا۔ وہ اِس راز پر بعدازاں غور کرنا چاہتی تھی۔

تبھی ایک قاصد پیغام لئے ہوئے آیا۔ شہزادہ خرّم کا پیغام تھا۔ اُس نے شہنشاہِ عالم جہانگیر سے گزارش کی تھی کہ وہ میواڑ کے ولی عہد کنور کرن سنگھ کے ساتھ تین میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور اِس بات کی اُمید کرتا ہے کہ شہنشاہ سلامت کنور سنگھ کو اپنے والد رانا کی طرف سے خراج پیش کرنے کا موقع عطا فرمائیں گے۔

اپنے محل میں واپس لوٹ کر نورجہاں چیتے کی گردن سے اُترے اُس پٹے کے بارے میں سوچنے لگی۔ پٹے پر کھدے ہوئے نام سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چیتا اُس کے پہلے خاوند شیر افگن کا تھا۔

شیر افگن کو چیتے کے بچے پالنے کا شوق تھا۔ یہ اُنہی میں سے ایک ہوگا۔ لیکن یہ اِتنی دُور اجمیر کیسے آپہنچا، یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ بھولا ہوا ماضی پھر اُس کی آنکھوں میں زندہ ہو رہا تھا۔ اور وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔

ماضی کی ہر یاد خوشگوار نہ تھی۔ بنگال کے صوبے دار قطب الدین اور اُس کے سپاہیوں کے ہاتھوں اپنے خاوند شیر افگن کے قتل کا واقعہ یاد کرتے ہوئے اُس کا دل بھر آیا۔ اُس کے قتل کے پیچھے کِس کی سازش تھی، اِس بات کا پتہ اُسے نہیں چلا تھا لیکن وہ اِس بات سے واقف تھی کہ بہت سے لوگوں کا یہ یقین ہے کہ شیر افگن کا اصلی قاتل جہانگیر تھا اور قطب الدین تو صرف ایک مہرہ تھا۔

شیر افگن کے مرتے ہی فوراً نورجہاں اور اُس کی لڑکی کو شہنشاہ کے حکم سے آگرہ پہنچا دیا گیا تھا۔ اِس لئے نورجہاں کو اِس بات کا علم نہیں تھا کہ شیر افگن کے ذاتی عملے کا کیا حشر ہوا۔

زیادہ امکانات یہی تھے کہ شیر افگن کا قتل ہوتے ہی سب خادم اور نوکر افراتفری میں بھاگ نکلے ہوں گے اور اُس میں چیتا بھی بھاگ نکلا ہوگا۔ لیکن جہاں تک اُسے یاد تھا، اُس وقت اُن کے پاس کوئی پالتو چیتا نہیں تھا۔ کچھ برس پہلے اُن کے پاس چیتوں کی ایک جوڑی تھی۔ لیکن شیر افگن نے وہ اپنے دوستوں کو دے دئے تھے۔

اچانک اُسے یاد آگیا۔ ایک پالتو چیتا اُس نے اپنے اِکلوتے بھائی حسن قلی کو اپنی موت سے کچھ مہینے پہلے دیا تھا۔ یہ چیتا کافی بڑا تھا۔ تقریباً اِتنی ہی اُس کی لمبائی تھی جتنا بڑا چیتا شکار میں مارا گیا تھا۔ تو کیا یہ وہی چیتا تھا؟ ہاں، ضرور وہی ہوگا۔

تو اُس چیتے کا مالک حسن قلی بھی کہیں نہ کہیں اجمیر کے پاس ہی ہوگا۔ چار سال پہلے نورجہاں کو اُس کا آخری خط ملا تھا، جس میں حسن قلی نے اُسے اپنے خاوند کے قاتل کے ساتھ

شادی کرنے پر لعنت ملامت کی تھی کیوں کہ حسن قلی جہانگیر کو ہی شیر افگن کا قاتل تصور کرتا تھا۔

نور جہاں نے یہ خط سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اِس خط کے بعد نورجہاں کو حسن قلی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور اب اچانک ہی اُس کے ہاتھوں میں پتہ آگیا تھا جس پر اُس کے پہلے خاوند کا نام کُھدا ہوا تھا۔ حسن قلی اِستجلو ضرور یہیں کہیں آس پاس موجود ہو گا۔

آخر اُس نے سوچنا بند کر کے اپنے محل کے ایک اہل کار کو طلب کیا اور اُسے کچھ ہدایتیں دے کر بھیج دیا۔ جلدی ہی نورجہاں کی ہدایات کے مطابق کئی قاصد ایک آدمی کی تلاش میں چاروں طرف نکل پڑے۔ لیکن نور جہاں نے قاصدوں کو جو حلیہ بتایا تھا وہ آٹھ برس پہلے کے حسن قلی کا تھا جب کہ اِس وقت اُس کی شکل وصورت اور جسم میں بہت فرق آگیا تھا۔

اجمیر کے مضافات میں آنا ساگر جھیل کے دو تین میل مغرب کی طرف پچھلے دنوں سے دس بارہ خیموں کا ایک چھوٹا سا پڑاؤ پڑا ہوا تھا۔ یہ لوگ مغرب کی سمت سے آئے تھے۔ اِس قافلے میں لگ بھگ پچاس آدمی اور کچھ عورتیں تھیں اور سفر کے لئے گھوڑے، خچر اور اُونٹ تھے۔

اِن لوگوں نے پڑاؤ کے لئے شاہراہ سے کچھ ہٹ کر جگہ منتخب کی تھی۔ شاہراہ کے ساتھ گھنے جنگل میں اُنہوں نے ایک چھوٹا سا میدان صاف کر کے اپنے خیمے اِس طرح نصب کئے تھے کہ شاہراہ پر گزرنے والوں کی نگاہ سے پُوری طرح چھپے رہیں۔

ظاہر تھا کہ وہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ رات کے اندھیرے میں یہاں پہنچے تھے اور اگلے دِن اپنے خیموں سے باہر نہ نکلے تھے۔ شام کے وقت سردار نے اپنے بھروسے کے آدمی باہر بھیجے۔ یہ آدمی چھپتے چھپاتے باہر آئے اور شاہی محل کی طرف چل دئے شاہی محل سے دو گھنٹے بعد لوٹ کر اُنہوں نے سردار کو سارا حال بتایا۔

"اچھا، تو جہانگیر سلامت ہے اور کل شکار کے لئے جا رہا ہے" حسن قلی نے اپنے جاسوسوں کی بات سُن کر کہا "اِس کا مطلب ہے کہ یا تو وہ بے وقوف نوجوان ابھی تک وہاں پہنچا نہیں یا پھر اگر آچکا ہے تو وہ دَوا ابھی جہانگیر کو نہیں دی گئی ہے۔"

سردار کی بیگم اُس کے پاس کھڑی سب باتیں سُن رہی تھی۔

"مجھے پُوری اُمید تھی کہ یہاں پہنچتے ہی مجھے جہانگیر کی موت کی اطلاع ملے گی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ میں اپنا انتقام تو لے ہی لوں گا۔ یہ درست ہے کہ اِس میں کافی دیر لگے گی لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ اُس دو ٹکے پر میرا قہر ضرور گرے گا اور میں جہلان کی پہاڑیوں کے دامن میں اپنے پیدائشی گاؤں کے لئے روانہ ہونے سے پہلے ہی اُس کا خاتمہ دیکھ لُوں گا۔

"ایک بار اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لے لوں اور اُس 'عورت'، مہرالنساء کو، جو اِس سازش کی اصلی جڑ تھی، ایک بار ذلیل کر لوں تو پھر میرے لئے ہندوستان میں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ ہندوستان کی زمین مجھے اور میرے خاندان والوں کو مطلق راس نہیں آئی۔ (باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

ایسٹروجین

مقالہ • ڈاکٹر اندر سین ورما

رمیش نے اپنے دوست سے کہا" —— ۔
ز جانے آج کل میری بیوی کو کیا ہو گیا ہے، ہر دم منہ لٹکائے رہتی ہے۔ میں ذرا کچھ کہوں، بس رونے لگتی ہے۔ پہلے تو بڑی ہنس مکھ، متحمل مزاج اور زندہ دل تھی، مگر کچھ مہینوں سے ایسی چڑچڑی ہو گئی ہے کہ میں پریشان ہو گیا ہوں۔"

موہن نے اپنے دوست کی پیٹھ پر ایک تھپکی لگاتے ہوئے کہا "بیس سال تمہاری شادی کو ہو گئے مگر تم عورت کی فطرت اور اس کے جسمانی نظام کو نہیں سمجھے۔ چالیس سال کی مر پار کرنے پر عموماً سب عورتوں میں چند ایسی ذہنی اور جسمانی تبدیلیاں ہوتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں ہارمون کی بیداوار کم ہونے لگتی ہے، کیوں کہ ن کے اووری غدود یک خاص قسم کا سیال مادّہ پیدا کرنے بں سست پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ل عورت کی ماہواری بے قاعدہ ہو جاتی ہے دراس کا حسن ماند پڑنے لگتا ہے۔ میں تو اس مدیلی کو اپنی بیوی میں پہلے ہی بھانپ گیا تھا درمیں نے اسے ایک اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھا کر ،رآ علاج کرایا۔ اس سے ہماری ازدواجی زندگی زسرِ نو خوش گوار ہو گئی۔"

کاش، موہن کی طرح تمام مرد اتنے سمجھ دار وتے کہ وہ عورت کی ان جسمانی تبدیلیوں کو سمجھ ر اس سے پہلو تہی کرنے کی بجائے اس کے لئے کچھ کرتے۔ ادھیڑ عمر عورت کی طبیعت اور ن وشباب میں جو تبدیلی آتی ہے، اس کی چند طبی وجوہات ہیں، مگر عام لوگ تبدیلی کی جانب خاص توجہ نہیں دیتے۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اب چار پانچ بچوں کی ماں ہو کر شباب کی تازگی اس میں کہاں تک بحال رہے گی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہیں گے کہ پہلے زمانے میں ہماری ماں، نانی، دادی تو اس قسم کے چڑچڑے مزاج کی نہ تھی۔ پچاس پچپن کی عمر میں بھی ان کے بال کالے تھے، جسم صحت مند نظر آتا تھا، مگر آج کل کی عورتیں اتنے سامانِ آرام و آرائش ہوتے ہوئے بھی اپنی شگفتگی کیوں برقرار نہیں رکھتیں؟ ان میں گویا جینے یا کچھ کرنے کی امنگ اور ولولہ ہی نہیں رہتا۔ وہ ہر دم تھکی تھکی سی اور زندگی سے بے زار نظر آتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے! تب ہی تو مرد کا دل رومان کی تلاش میں باہر بھٹکتا ہے۔ چالیس پینتالیس سال کی بیوی اپنے پژمردہ ارمانوں کے باعث رومان پرور جذبات کو آسودگی نہیں بخش پاتی۔

ہماری ماں، نانی، دادی وغیرہ کے زمانے میں خاندانی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ ان کو اچھی غذا حاصل تھی، کنبے میں برکت تھی، پیسے کی قیمت تھی۔ وہ محنت و مشقت کرتی تھیں، اس سے ان کی صحت اچھی رہتی تھی۔ ان میں آٹھ دس بچے پیدا کرنے کی طاقت تھی اور بچوں کے لئے خوراک کی کمی نہیں تھی۔

جب تک عورت کے بچے ہوتے رہتے ہیں، اس کی اووری حرکت میں رہتی ہے، اس سے اس پر کم عمری میں بڑھاپا نہیں آپاتا۔

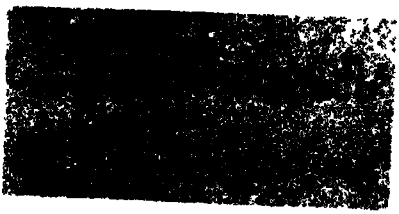
جو عورت کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے جذبات اور حُسن کا توازن قائم رکھتا ہے۔



ویسے بھی عورتوں کا خیال تھا کہ گھر میں چھوٹا بچہ رہتا ہے تو والدین کی ذہنی آسودگی قائم رہتی ہے۔ وہ خوش رہتے ہیں۔ دراصل اس مسرت کا سبب ان کے جسم میں ہارمونوں کا حرکت میں رہنا تھا۔ اس حرکت کے باعث ان کے خون کی نالیاں توانا رہتی تھیں، جلد کی تازگی قائم رہتی تھی، ہڈیوں میں لوچ رہتا تھا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر، بے خوابی، تکان اور مایوسی سے محفوظ رہتی تھیں۔ ان میں قوتِ برداشت بھی زیادہ رہتی تھی۔

معاشرتی اور اقتصادی صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے آج کل کثرتِ اولاد تو حماقت ہوگی، مگر ہاں، چند ایسے طریقوں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے جن سے عورتوں کے جسم میں ہارمونوں کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ جس طرح غدود کی کمی کو پورا کرنے کے لئے باہر سے انسولین جسم میں پہنچانی ضروری ہوتی ہے اسی طرح عورت کے جسم میں ہارمون کی کمی کو پورا کرنے کے لئے ترکیب عمل میں لانی پڑتی ہے۔

عورت کے جسم میں اووری غدود ایک خاص قسم کا سیال مادہ پیدا کرتے ہیں جسے ایسٹروجین کہتے ہیں۔ یہ سیال مادہ عورت کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والے جذبات کا توازن رکھنے میں بہت اہم کردار نبھاتا ہے۔ اس رقیق ایسٹروجین کے سبب ہی چہرے کی تازگی، ہڈیوں کی مضبوطی رگ و ریشوں کی بہتر بناوٹ، جھریوں کا نہ پڑنا اور بالوں کی چمک بنی رہتی ہے۔ اس کی کمی سے عورت کے مزاج میں جھنجھلاہٹ، جنسیات کے بارے

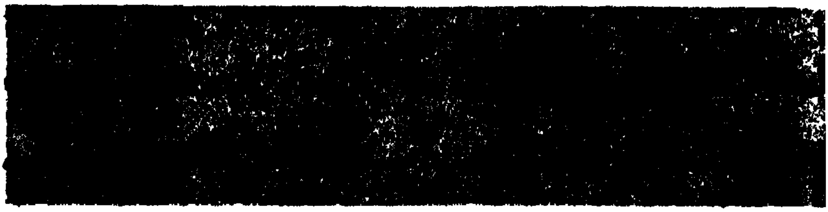


میں بے حسی، حیض میں گڑبڑ وغیرہ شکایات شروع ہو جاتی ہیں۔ پہلے یہ رس خون میں مل کر دماغ کے ایک خاص غدود پیٹیوٹری کو اشتعال دیتا ہے۔ اس سے عورتوں میں قوتِ برداشت، مسرت اور کشش قائم رہتی ہے۔ اسی رس سے ان کی ذہنی اور جسمانی تازگی برقرار رہتی ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے میں ایسٹروجین تھیریپی نے شباب کو قائم رکھنے میں بڑی مدد دی ہے۔

اگر بروقت ایسٹروجین تھیریپی کا سہارا لیا جاسکے تو ازدواجی زندگی کا لطف، ادھیڑ عمر کے بعد بھی قائم رہے گا۔ آج کل جنسیات سے متعلق سائنس کافی ترقی کر گئی ہے اور ازدواجی زندگی — صرف اولاد پیدا کرنے کا ہی ذریعہ نہ رہ کر سکھ کا وسیلہ بھی تصور کیا جانے لگا ہے۔ خواتین اس معاملے میں ادھیڑ عمر میں ہی خاص دل چسپی لیتی ہیں، کیوں کہ جوانی میں وہ بچوں کی پرورش میں مصروف رہتی ہیں۔ وقت کی کمی اور جھجک کے باعث وہ زندگی کا لطف حاصل نہیں کر پاتیں۔ چالیس کے قریب جب میاں بیوی ایک دوسرے کو آپس میں اچھی طرح سمجھنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کرنا انہیں آجاتا ہے، تب اگر بیوی

نی تبدیلی کے باعث پیچھے ہٹنے لگتی ہے تو
، کا یہ طرزِ عمل شوہر کے دل میں کوفت پیدا کرتا ہے۔

شوہر اس بات کو کم پاتے کہ بے چاری
اش بیوی کو کتنا جسمانی آزار برداشت
نا پڑ رہا ہے۔ اپنی کم ہوتی ہوئی طاقت اور
نی انتظار کے باعث وہ کتنی ہراساں ہو رہی



ہے۔ اسے اپنے مرجھائے ہوئے حسن سے پیدا
نے والی مایوسی اور بڑھاپے کا خوف کھائے
رہا ہے۔ اسے زمین گویا اپنے پیروں سے
رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عمر گذرتی جارہی
ہے، بڑھاپے کی گرفت میں آکر چہرے پر
ھتی ہوئی جھرّیاں، بے کشش چہرہ، بے کیف
ندگی، مایوسی اور زندگی کا سُونا پن اس کے
ل و دماغ میں دہشت پیدا کرتا رہتا ہے۔
ں لئے اپنے شوہر کی توجہ اپنی جانب مرکوز
رنے کے لئے اس عمر میں عورتیں گھریلو تفکرات
ور جسمانی کمزوری وغیرہ کی آڑ لے کر رو رو کر
ؤہر کی محبت اور کنبے کی ہمدردی حاصل کرنے
ی کوشش کرتی ہیں۔

موجودہ سائنسی دَور میں جب کہ انسان کی
رطبی ہوگئی ہے، اس بات کے لئے بھی کوشش
ی جانی چاہیئے کہ جوانی کو زیادہ دیر تک قائم
رکھا جاسکے۔ بڑھاپے کی گرفت میں پھنسے رہ
ر خشک زندگی زیادہ دن گذارنا بھلا کسے اچھا
لگتا ہے۔ زیادہ دن جینے کا مزہ تو تب ہی ہے
ب جوانی قائم رہے۔ ذہنی اور جسمانی
زتازگی برقرار رہے۔ اگر مرد اپنی عورت کے

اس تبدیلی کے دَور میں تعاون دے تو ایسٹروجین تھیراپی سے عورت کی جوانی کو قائم رکھا جاسکتا ہے
ماہواری عورت کی صحت کی نشانی ہے۔

اگر ماہواری وقت پر ٹھیک طرح سے آتی رہے تو عورت کا شباب زیادہ عرصے تک قائم رہ سکتا ہے۔ اکثر خواتین کو ۲۸ دن کے بعد ماہواری آتی ہے۔ کئی عورتوں کو ۲۴ یا ۲۱ دن کے بعد آتی ہے۔ چند ایک کو ۴۰ دن کے بعد ہوتی ہے تو کچھ کو سات دن تک خون جاری رہتا ہے۔ یہ تو اپنے اپنے جسم کی خصوصیت ہے۔

بہرحال ماہواری کی پابندی اور اس کے آنے کے ایّام میں ضابطہ قائم رہنا چاہیئے۔ جن عورتوں کی اوورری کی نالیوں میں سوزش ہوتی ہے یا بچّہ دانی کمزور ہوتی ہے یا بچّہ دانی میں ٹیومر ہوتا ہے، ان کی ماہواری بے قاعدہ اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ جسم میں خون کی کمی، طویل بیماری کے بعد کمزوری یا اوورری کے کام ٹھیک نہ کرنے پر بھی ماہواری رُک رُک کر آتی ہے۔ اس کے لئے کسی تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کرانا چاہیئے کہ اوورری کی خرابی ہے یا بچّہ دانی میں کوئی تکلیف ہے۔ اگر اوورری حرکت میں رہے تو اس کا اثر بچّہ دانی پر اچھا پڑتا ہے۔ اس لئے ہارمون معالجہ ماہواری کی خرابی میں بھی کیا جاتا ہے۔ غیر متوازن غذا اور رگ و ریشوں میں کھنچاؤ، بھی حیض میں گڑبڑ پیدا کرسکتی ہے۔ چند خاص قسم کی ورزشیں کرنے سے بھی بچّہ دانی کے نقائص دور ہوجاتے ہیں۔

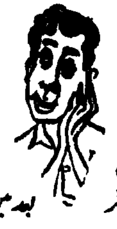
بچّہ دانی درست رہے اور ماہواری باقاعدگی

ے آتی رہے اس بات پر عورت کی صحت کا
ارومدار ہے۔ وہی عورتیں تن درست ،خوبصورت
یشش، بشاش اور خوش مزاج رہتی ہیں جن
ل اوورری صحیح طور پر سے بہتر اور متحرک رہتی
ہے اور کافی مقدار میں ایسٹروجین پیدا کرتی رہتی
ہے۔ عورت کے حقیقی جمال کا انحصار فقط اچھے
نقوش اور رنگ روپ یعنی جسمانی حسن پر ہی نہیں
ہوتا بلکہ خوش مزاجی اور تحمل بھی عورت کے حسن
کے زیور ہیں۔ کسی کی رفیقہ حیات یا محبوبہ بن کر
امور خانہ داری کو چلانا، بچوں کی طرح پرورش
کرنا اس کے لئے ذہنی تنومندی اور بنیادی اوصاف
کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھنے میں قبول صورت
نوجوان لڑکی بھی اگر ان خوبیوں سے مالامال ہے
تو اس کی ازدواجی زندگی آرام و آرائش سے بھرپور ہے۔

خوش خلق ہونے کا انحصار کافی حد تک اوورری کے سیال مادے کے جاری رہنے پر ہے۔ جب اوورری اس سیال مادے کو پیدا کرنا بند کر دیتی ہے، تب ہی عورت میں مختلف اقسام کی ذہنی اور جسمانی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں مگر سائنس نے اس کا سدِباب ہارمون آمیز گولیوں سے کیا ہے۔ یہ گولیاں خون میں ہارمون پہنچا کر پٹیوٹری کو متاثر کرتی رہتی ہیں یہ پٹیوٹری عورت کے جذبات کا توازن بنائے رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا جگر، خون کی نسیں اور آنتیں اپنا کام ٹھیک طرح کرتی ہیں۔

ادھیڑ عمر کے بعد ہارمون کی کمی میں ہی عور
نہ صرف حاملہ ہونے کے نااہل رہ جاتی ہے، بلکہ
اس کے جسم کا تمام نظام بگڑ جاتا ہے۔ یہ ہارمو

یہ شوہر



ایک دن دھوبی آیا۔ مجھے حساب کی کتاب نہ مل سکی۔ میں نے بہت تلاش کیا مگر کتاب اپنی مخصوص جگہ پر موجود نہ تھی۔ اب میرے سامنے مسئلہ درپیش تھا کہ میں دُھلے ہوئے کپڑے کس طرح ملاؤں اور یہ کیسے اندازہ کروں کہ کپڑے سب پورے آگئے یا کوئی دھوبی کے گھر رہ گیا ہے۔

شام کو وہ آئے تو میں نے کہا "دھوبی کپڑے لے آیا۔"

"ملا لیئے" وہ بولے "کوئی کم تو نہیں ہے؟"

میں نے ویسے ہی کہہ دیا "شاید دس تھے۔"

"مجھے کیا پتہ" وہ بولے "کتاب میں کتنے لکھے تھے۔ کہاں ہے کتاب؟"

میں اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

وہ کہتے رہے "تمہیں کتنی بار سمجھایا کہ حساب کتاب کے معاملے میں چوکس رہو۔ پہلے ٹانکو۔ بعد میں کچھ گڑبڑ ہو تو کاغذ سب بتا دے گا۔"

میں اپنی جگہ چپ۔ تھوڑی دیر میں مجھے یاد آیا کہ انہوں نے اسی کتاب میں کرائے کا حساب بھی لکھا تھا اور میں نے یہی بات انہیں بتا دی

اس وقت وہ چپ رہے۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتی ہوں کہ وہ اپنے ہاتھ میں وہی کتاب لئے آ رہے ہیں۔

میں اگر چاہتی تو انہیں آڑے ہاتھوں لے سکتی تھی مگر مصلحتاً خاموش رہی۔

—— نجمہ خانم، میرٹھ

اس فیچر کے لئے اپنے تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر ۵ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

—— ایڈیٹر

یہ  بیویاں

پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے میں اپنے خالو کے یہاں گیا تھا۔ وہاں پر ملیح آباد کے آم کھانے میں بہت مزا آیا۔

ایک روز دوپہر کے وقت ہم لوگ باہری کمرے میں بیٹھے ہوئے تازہ تازہ آموں کا مزا لے رہے تھے کہ اندر سے دو چار عورتوں کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ اندر محلّے کی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خالہ جان ہاتھوں کو گردش دیتے ہوئے ایک سے مخاطب تھیں۔

"منّے کے ابا کو کیا غرض کہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں؟ انہیں تو بس اکیلے گھومنا اچھا لگتا ہے۔ راہ چلتی عورتوں کو گھورنا ہی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ بھلا میرے ساتھ کیوں جانے لگے؟ میری تو زندگی عذاب ہے۔"

دو تین روز بعد کی بات ہے کہ میں خالہ جان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں پڑوس کی ایک عورت آئی اور کہنے لگی "اے بہن تم نے سُنا نہیں۔ ابھی ابھی ریشمی کے ابا دفتر سے آئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ دفتر میں جو لڑکی ٹائپسٹ ہے اس نے آپ کے منّے کے ابا کو کافی بُرا بھلا کہا ہے شاید انہوں نے اسے چھیڑا تھا۔"

بس پھر تو کچھ نہ پوچھئے۔ اتنا سنتے ہی خالہ جان نے اُسے وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ اسے بھاگتے ہی بنی۔ انہوں نے کہا کہ نہ جانے کہاں سے کم بخت سب کے سب بدنام کرنے والے اِسی محلّے میں آ کر بس گئے ہیں۔ زندگی تلخ کر دی ہے۔

—— ابوالکلام اعظمی، اعظم گڑھ

اس فیچر کے لئے اپنے تجربات بھیجئے۔ شائع ہونے پر ۵ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔ —— ایڈیٹر

یعنی ایسٹروجین کا معجزانہ اثر جسم کے سب سیلوں پر پڑتا ہے۔ اس کے باعث جِلد مضبوط اور ملائم بنی رہتی ہے۔ حبن نوجوان لڑکیوں کے بہت زیادہ مہاسے نکلتے ہیں، اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ان کی اووری کافی مقدار میں ایسٹروجین پیدا نہیں کرتی۔ شادی کے بعد ایک دو بچّے پیدا ہو جانے پر جب ان کی اووری حرکت میں آ جاتی ہے تو یہ مہاسے نکلنے بند ہو جاتے ہیں۔

عورتوں کی زندگی میں ایسٹروجین کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اگر چالیس پینتالیس سال کی عمر میں عورتیں ایسٹروجین تھیریپی کا سہارا لیں تو ان کی ادھیڑ عمری میں ٹھہراؤ آ جائے۔

یہ سائنسی دَور ہے۔ غیر ملکوں میں سائنسی ذرائع کی مدد سے عورتوں کے حسن و شباب میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ بڑھاپے کو کافی عرصے کے لئے دور دھکیل دیا گیا ہے۔ اب وہ وقت دور نہیں جب کہ بھارت میں یہ سائنس جلد ترقی کر جائے گی۔ میڈیکل سہولتوں کی کمی ہونے پر بھی چند عام ورزشیں (جن سے بچّہ دانی مضبوط ہو اور بچّہ دانی کو سانس سے اندر کھینچنا اور چھوڑنا) کرتے ہوئے اور اپنی غذا اور معمولات کا خیال رکھتے ہوئے اگر ادھیڑ عمر عورتیں خود کو تندرست بنائے رکھیں اور مالش کریں، پیٹ کی صفائی رکھیں اور زیادہ بچّے پیدا نہ ہونے دیں تو ان کا حسن قبل از وقت نہیں کمھلائے گا۔ کپڑوں کا شوق، کام کرنے کا ولولہ، ملنساری، خوش مزاجی اور قوّتِ برداشت بھی نہایت ضروری ہے ●

پُرکشش بننے کے چند راز

مقالہ



مشہور فلم اداکارہ صوفیہ لارین کو گذشتہ دنوں نیویارک میں پبلسٹی فوٹوگرافروں کے گلڈ نے 'دنیا کی حسین ترین خاتون' کا خطاب دیا ہے۔ اس موقع پر منعقدہ ایک خاص تقریب میں صوفیہ لارین نے نسوانی شخصیت کے پُرکشش بننے سے متعلق چند ایسی باتوں کو آشکار کیا ہے جو کچی اور عجیب وغریب ہیں اور جن کا اطلاق کسی اداکارہ پر ہی نہیں، بلکہ ہر عام لڑکی، بیوی اور محبوبہ پر بھی اُسی انداز سے ہوتا ہے۔

ان مفید مشوروں میں پہلا اور خاص مشورہ یہ ہے کہ عورت اپنی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنائے اور مرد کے آگے اپنے تمام شخصیت سے وابستہ پہلوؤں کو کبھی ایک ساتھ ظاہر نہ کرے۔

کوشش یہ رہنی چاہیے کہ مرد پر آپ کی اصلیت ایک دم واضح نہ ہو پائے۔ وہ اپنے تصور، اپنے اندازے سے بھی آپ سے متعلق واقفیت پانے کی کوشش کرے۔ تصور، اندازہ اور چنداں رازداری میں جو کشش پوشیدہ ہے وہ بے پردگی میں ہرگز نہیں ہے، جب تک مرد آپ کے حسنِ سلوک، عادات اور اوصاف کے بارے میں قیاس لگاتا ہوا آپ کو اپنا ساتھی بنا لینے کے بارے میں سوچتا رہے گا، حقیقی طور پر تب تک وہ آپ کا ساتھی بن کر رہے گا، بعد میں نہیں۔

مردوں کی نفسیات پر مبنی کتنی بڑی حقیقت ہے یہ پُراسرار سچائی! شادی کے چند ہی برسوں کے بعد میاں بیوی میں باہمی کشش کا فقدان،

ایک دوسرے سے بے زاری، خجالت، ناامیدی اور
ایک دوسرے پر الزام تراشی ـــــ یہ تمام برائیاں
اسی راز یا سچائی کو نہ سمجھنے کے باعث ہیں۔ شادی
صنف نازک کی زندگی کی منزل مقصود ہو سکتا ہے،
مردوں کی زندگی کا نہیں۔ مرد بیاہ کے رشتوں میں
بندھتا ہے، اپنی جسمانی، جذباتی اور ذہنی ضرورتوں
کو لے کر۔ ان کو پورا کرنے کے عوض وہ خاندانی
اور اقتصادی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لئے تیار
ہوتا ہے۔ گھر اور بچوں کے ساتھ اس کا ویسا لگاؤ
نہیں ہو سکتا جیسا کہ عورت کا ہوتا ہے، نہ ہی عورت
کی طرح جذباتی تحفظ جیسا ہی کوئی سوال اس کے
سامنے ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مرد عورت سے تب تک ہی بندھا
رہ سکتا ہے جب تک کہ عورت اُسے
ندھ رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے یا اس کی
مانی، ذہنی اور جذباتی طور سے تسکین کر پاتی ہے۔
ری کی شکل میں عورت کے تمام رازوں کو پا لینے
ے بعد مرد کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اگر جسمانی طور
تسکین کے ساتھ ذہنی اور جذباتی تسکین وابستہ
ہو۔ عورت کی رنگارنگ شخصیت اور اس شخصیت
ے متعلق راز ہی اس کی کشش کو سدابہار تازگی
طا کرکے مرد کو تسکین مہیا کر سکتے ہیں۔

مرد کا دل نئے پن کا متلاشی ہوتا ہے اور
ئے پن کی محرومی میں ہی اکتا کر وہ باہر بھٹکتا ہے۔
یہ نیا پن اسے گھر میں ہی حاصل ہو تو بھٹکنے کے
گنجائش نہیں رہتی اور ازدواجی زندگی میں خلوص،
ن و جمال اور اُنس کی بارش ہوتی رہتی ہے جس سے
و چمن کا سبزہ شاداب رہتا ہے۔ اس شادابی
راز رنگارنگ شخصیت میں ہی پنہاں ہے۔ رنگارنگ
تی والی عورت جو ایک ساتھ ماں کی مامتا اور
رپرستی عطا کرے، بیوی کی خدمت گذاری اور
ین کے تقاضے پورے کرے، محبوبہ جیسے عشق
ظہار کرکے مرد کو اپنے دام الفت میں پھنسائے

رکھے اور دوستوں کی طرح ذہنی غذا فراہم کرے اور
غم و مسرت میں شریک حال بنے۔

لیکن رنگارنگ شخصیت کے معنی یہاں ہی
ختم نہیں ہو جاتے۔ کئی بیویاں یہ سب کرتے
ہوئے بھی مرد کو قابو میں نہیں رکھ پاتیں۔ کیوں؟
اس لئے کہ انہوں نے رنگارنگی کے مفہوم کو مختلف
فرائض میں تقسیم تو کر لیا مگر مختلف طرز عمل میں
بانٹ کر اس میں کشش پیدا نہیں کر سکیں۔ یہ
کشش اسی راز میں ہے کہ اپنی حیثیت کو مکمل
طور سے ایک دم ظاہر نہ ہونے دیں۔ باری باری
سب خوبیوں کی جھلک دکھا کر مرد کو خود میں الجھائے
رکھیں۔ اس عمل میں کہیں پر اس کا قیاس غلط ثابت
ہوتا ہو، اس کی امیدوں پر اوس پڑتی نظر آئے
اور وہ ناراضگی کی شکل اختیار کرے تو اس سے
پہلے ہی اپنے دوسرے وصف کا اظہار کر کے
اس کو حیرت زدہ بنا دیں۔ اسے 'سرپرائز' کرنا
کہتے ہیں۔

لیکن سرپرائز کرنے کا مطلب ہمیشہ بناوٹی
طرز عمل ہی نہیں ہے۔ اس کی اہمیت تو اُن
جگنوؤں کی طرح ہے جو اندھیرے میں چمک کر
مایوسی میں امید کو نمایاں کرتے ہیں۔ روزمرہ کی
ہماری زندگی ایک رس اور اکتا دینے والی ہوتی
ہے جس سے مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری بات
ہے سب کچھ جان لینے کے بعد پیدا ہونے والی
مایوسی، جو انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔

اس مایوسی اور ناامیدی کو دور کرنے کا طریقہ
ہے شخصیت کی ہر لحاظ سے جامع نمائش،
طرز عمل اور حسن سلوک میں رنگارنگی، چند اسرار،
اور بسا اوقات 'سرپرائز' کرنا۔ اس سے مرد کو
ایک ہی عورت میں سدابہار تازگی نظر آئے گی۔
خوش حال ازدواجی زندگی کے لئے عورت کو یہ
خاص 'گر' سیکھنا ہی چاہئے۔

سرپرائز دینے یا متحیر کرنے کے کئی طریقے

سرمایۂ حیات



شہر خاموش تھا، ماحول حسیں تھا
دُور تک سکوت کے سِوا کوئی نہیں تھا

چاند چپکا ہوا !
اور ستارے چُپ تھے !!
نشۂ سکوت میں بیخود تھیں فضائیں !!!
آنِ واحد میں خاموش فضائیں چونکیں

چاند گھرایا !
تلملانے لگے انجم تاباں
میں نے جب غور سے دیکھا
تو اُس نے چپکے سے اُلٹ دی تھی نقاب
دفعتاً ذہن میں آیا ایک اچھوتا سا خیال
دِل نے چپکے سے کیا ایک انوکھا سا سوال
جی میں آیا کہ اُسے تھام لوں بانہوں میں
ساز و سنگیت پرو لوں اپنی آہوں میں!
پھر ایک لفظ سوئے ہوئے شہر پہ ڈالی

خاموش تھا ماحول اوڑھ کے سکوت کی ردا
دُور تک تھی یہی بس ایک صدا !
ہر طرف خامشی، سکوت گہرا !!
دفعتاً نرم آنچل کی طرف ہاتھ بڑھا

خوف سے کانپ اٹھا، کانپ اٹھا
اور جب غور سے دیکھا !
تو وہ ایک بے نام سا سایہ تھا جسے
زندگی کہہ کے پکارا !
اور وفا کی دیوی سمجھا !!
وادیٔ وقت میں جھانکا تو وہاں کوئی نہ تھا
خود کو دیکھا مگر آئینہ خانے میں نہاں کوئی نہ تھا

کانپ جاتا ہوں یہی سوچ کہ اب
کہ زندگی بھر جسے پوجا تھا
وہ ایک بے نام سے سائے کے سوا
کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

— آذر جمالی

کیا آپ کینسر خریدنا چاہتے ہیں؟

مقالہ • گووند نارائن شرما

تمباکو نوشی اور اچھی تندرستی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ تمباکو ۱۶ویں صدی کے ابتدائی دور میں سپین سے امریکہ میں گھس پیٹھیوں کی طرح آیا تھا۔ انگریز وہاں سے اُسے بطور سوغات انگلینڈ لے گئے اور آج وہاں سے اٹھتا ہوا زہریلا دھواں دنیا کے تمام چھوٹے بڑے ملکوں کا ماحول گندہ کر رہا ہے۔ بھارت بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ آندھرا پردیش میں گنٹور، گجرات میں چاروتر، میسور، مہاراشٹر میں نپانی، جنوبی مدراس، شمالی بہار، بنگال، اُتر پردیش اور پنجاب وغیرہ صوبوں میں ۴ لاکھ ۲۹ ہزار ۸۰۰ ہیکٹر سے کہیں زیادہ زمین تمباکو پیدا کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے۔ ٹیبل ۱ کو دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ کس طرح ہم لوگوں نے پچھلے دس گیارہ برسوں میں سگریٹ نوشی کے میدان میں دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے۔ ۱۹۵۱ میں تیار شدہ سگریٹوں کی تعداد ۱۹۶۲ میں تقریباً دوگنی ہو گئی۔ ٹیبل ۲ اس بات کا یقین ثبوت ہے کہ ہم لوگ اپنے گھر میں تیار شدہ تمباکو کی مقدار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہماری ضرورت



اب ترقی کی اس معراج تک پہنچ چکی ہے کہ ہمیں غیر ممالک سے بھی تمباکو منگانا پڑتا ہے جو پچھلے کچھ سالوں کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔

ٹیبل ۱

سال	سگریٹوں کی تعداد
۱۹۵۱-۵۲	۲,۱۴۷ کروڑ
۱۹۵۳-۵۴	۲,۰۶۴ "
۱۹۵۵-۵۶	۲,۲۸۳ "
۱۹۵۷-۵۸	۲,۹۸۴ "
۱۹۵۹-۶۰	۳,۶۹۷ "
۱۹۶۰-۶۱	۴,۰۹۵ "

ٹیبل ۲

تمباکو جو غیر ممالک سے برآمد کیا گیا

سال	روپے
۱۹۵۱-۵۲	۱,۹۹,۱۶,۳۲۰
۱۹۵۳-۵۴	۷۶,۴۶,۲۸۸
۱۹۵۵-۵۶	۱,۲۸,۵۵,۹۸۶
۱۹۵۷-۵۸	۱,۳۰,۲۱,۱۳۳
۱۹۵۹-۶۰	۱,۳۷,۶۲,۵۱۶
۱۹۶۱-۶۲	۱۴,۰۳,۶۳,...
۱۹۶۲-۶۳	۱۷,۹۹,۴۸,...

دیہات بھی اس مقابلے میں پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۵۲ میں ۱۱,۴۸,۳۸,... پونڈ تمباکو بیڑی کی شکل میں پیا گیا جو ۱۹۵۶ء میں بڑھ کر ۱۵,۲۳,۰۶,۶۱۱ پونڈ ہو گیا۔

اسی طرح حقہ، سگار، چرٹ اور دوسری منشیات دن بہ دن استعمال میں آنے لگیں۔ (جیسا کہ موجودہ ٹیبل ۳ سے ظاہر ہے)

تمباکو کی شکلیں	۱۹۵۳-۵۴ میں	۱۹۵۵-۵۶ میں
حقہ	۱۱,۷۱,۰۲,۸۴۳	۱۲,۱۳,۹۳,۷۳۶
بیڑی	۱۱,۶۴,۶۰,۲۳۸	۱۵,۲۳,۰۶,۶۱۱
سگار و چرٹ	۲,۸۰,۸۲,۴۷۸	۱۳,۶۰,۷۳,۷۵۲
زردہ اور پان	۱۰,۹۰,۱۷,۹۴۹	۱۱,۸۷,۰۰,۲۶۸
نسوار	۹۶,۷۹,۲۶۲	۸۷,۴۰,۳۶۰

اگر بات صرف تمباکو نوشی اور شوق پورا کرنے تک ہی محدود ہوتی تو شاید مسئلہ اتنا سنجیدہ نہ ہوتا۔ لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ جن بیماریوں کی خطرناک شکلیں سامنے آئی ہیں وہ غیر معمولی ہیں۔ ہمارے ملک کا کروڑوں روپیہ اور وقت صرف ان کے انسداد اور علاج معالجے پر صرف کیا جا رہا ہے اور اس میں بھی امید افزا کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ یہ بڑی ہی نازک صورتِ حال ہے۔

پچھلے کئی برسوں سے مشہور عالم ڈاکٹر، سائنس داں اور ماہر نفسیات اس مسئلے کو حل کرنے میں کوشاں ہیں۔ اگر ہم تمباکو اور اس کے دھوئیں میں موجود اجزاء کا سرسری طور پر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک نہیں بہت سے نقصان دہ اجزاء کی مختلف مقدار ہوگی۔ ان سب کا بادشاہ ہے نکوٹین۔ اس کی مقدار ایک سگریٹ میں ایک سے تین ملی گرام تک ہوتی ہے۔ سگریٹ پینے والا اس مقدار کی ۹۰ فی صد نکوٹین اپنے خون میں جذب کر سکتا ہے۔ اس کا اثر دل، خون کی نلیوں، پیٹ، آنتوں اور گردوں پر خاص طور سے پڑتا ہے۔ دماغ بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہتا۔

نکوٹین کے بعد کارسی نوجینک (کینسر پیدا کرنے والا) کا نمبر ہے۔ لیبوریٹریوں میں سائنس دانوں نے جب اس چیز کے اثر کا جانوروں پہ تجربہ کیا تو ان میں سے کئی جانوروں کو کینسر ہو گیا۔

تیسرے نمبر پہ ایمونیا گیس، کچھ خاص طرح کے تیزاب، فنائل اور دیگر اشیا ہیں۔ یہ سانس کی نلی کی پتلی جھلی کو میوکس نام کی ایک چپچپی چیز زیادہ تعداد میں تیار کرنے کے محرک ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ چیزیں سیلیا نام کے اُن باریک بالوں پہ

اثر کرتے ہیں جو سانس کی نلی کی جھلی پر لگے رہتے ہیں۔ سیلیا کا مناسب طور پر ہلتے رہنا میوکس کو خارج کرنے کے لئے بے انتہا ضروری ہے۔ جب یہ مادّے سیلیا کو بیکار کر دیتے ہیں تب زیادہ مقدار میں تیار شدہ میوکس کا خارج ہونا بند ہو جاتا ہے اور یہیں سے کئی بیماریوں کی شروعات ہوتی ہے۔

یہ میں کاربن مونو آکسائیڈ گیس اور سنکھیا ہے آخر جو اثر کر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کر سکتے۔ سنکھیا جراثیم کش ہے جو تمباکو پیدا کرنے والی زمین میں ملا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک کارسی نوجینک ہے۔ یہ تمام مادّے ایک ایک کر کے انسانی جسم پر خطرناک حملے کرتے ہیں اور آخر میں اسے بیماریوں کا ایک اچھا خاصا عجائب گھر بنا دیتے ہیں۔

تمباکو کے دھوئیں سے پیدا ہونے والی بیماریوں پر درج ذیل کے مطابق غور کیا جا سکتا ہے۔

فروری ۱۹۶۲ میں پٹیل انسٹی ٹیوٹ آف چیسٹ ڈیسیز کی تحقیقات پر غور و فکر کرنے کے لئے نئی دلی میں ۷ ویں بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں دنیا کے ہر حصّے سے قریب ۶۰۰ ماہرین نے حصّہ لیا تھا۔ پھیپھڑوں کا کینسر، بران کائی ٹیز اور دوسری بیماریوں پر بحث چلی تھی۔ انگلینڈ سے آئے ہوئے ڈاکٹر فلیچر کے مطابق وہاں پر ہوئی ۸۰ فی صد اموات کا واحد سبب کینسر، بران کائی ٹیز اور دل کی بیماریاں ہیں جو زیادہ تر تقریباً سگریٹ نوشوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ یہی بات روسی نمائندہ پروفیسر آین شیوکینکوں نے کہی۔ ونس میسوری کے ڈاکٹر ایوارٹس گراہم کے بقول پھیپھڑوں کے کینسر اور کثرت تمباکو نوشی میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اس بات کے بیّن ثبوت موجود ہیں یہاں تک کہ سگریٹ کے دھوئیں سے مختلف نسل کے جانوروں میں بھی لیبورٹریوں میں کینسر پیدا لیا جا چکا ہے۔

آج سے ۴۵ برس قبل پھیپھڑوں کا کینسر نہیں کے برابر تھا۔ ۱۹۲۲ میں مسٹر ایڈکر اس وقت کی تمام رپورٹوں میں سے کل ۳۷۴ کیس جمع کر پائے تھے اور اب یہ حالت ہے کہ امریکن کینسر سوسائٹی یہ صاف طور سے واضح کر چکی ہے کہ اگر جلدی ہی مناسب طریقے اس کے انسداد کے لئے نہ اپنائے گئے تو مستقبلِ قریب میں ہر پندرہواں آدمی پھیپھڑوں کے کینسر کا شکار نظر آئے گا۔

دلبھ بھائی انسٹی ٹیوٹ چترنجن کینسر ہاسپٹل کلکتہ اور ڈیپارٹمنٹ آف اٹامک انرجی کمیشن کے مطابق بھی پچھلے دس بارہ برس میں پھیپھڑوں کے کینسر میں جو زیادتی ہوئی ہے اس کی وجہ بھی تشخیصِ مرض کے جدید آلات کے علاوہ کارخانوں کا دھواں، سگریٹ کا دھواں، بڑھا ہوا آمد و رفت اور موٹر گاڑیوں سے نکلنے والی گیس ہے۔

پھیپھڑوں کی دوسری قابلِ ذکر بیماری بران کائی ٹیز ہے جو معمولی کھانسی سے شروع ہوتی ہے اور اگر ٹھیک طرح اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو دھیرے دھیرے دل کی بیماری کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ آخر میں ہارٹ فیل ہونے سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بیماری بھی نسبتاً سگریٹ نوشوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ سگریٹ کے ساتھ شراب پینے والوں کو تو تپِ دق بھی ہو جاتا ہے۔

اسی ضمن میں نیو یارک کے روزن اور لیوی نے ایک دل چسپ واقعہ قلم بند کیا ہے کہ ان کے پاس لگاتار کئی دن تک ایک عورت اپنے ایک سالہ بچے کو علاج کے لئے اسپتال لائی تھی، جس کی سانس بنا کسی وجہ کے اچانک پھول جاتی تھی اور ہونٹ نیلے پڑ جاتے تھے۔ کئی طرح کی جانچ کرنے کے بعد بھی اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ ایک دن اچانک انہوں نے نوٹ کیا کہ جیسے ہی اس عورت نے پینے کے لئے سگریٹ سلگائی، بچے کی سانس پھولنے لگی۔ بعد میں جب خاتون نے سگریٹ پینا بند کیا تو بچے کی بیماری بھی ٹھیک ہو گئی۔

دل کی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کے لئے

بچے کا نئی چیزوں کے تئیں اشتیاق، گھر کا ماحول، کنبے کے افراد کی عادات اور بچوں کے دماغ میں ہوشیاری وغیرہ یقینی طور پر سگریٹ نوشی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔

سگریٹ نوشی زہر ہے۔ اینجائنا کا سخت درد اور کارونری تھرامبوسس ان میں سے خاص بیماریاں ہیں۔ امریکی ہارٹ ایسوسی ایشن کے ایک بیان کے مطابق اس بات کے کافی ثبوت موجود ہیں کہ سگریٹ نوشی زہر پینے سے کسی حالت میں کم نہیں۔ یہ بیماری کے پیدا ہونے میں بھی مدد دیتا ہے اور اسے بڑھاتا بھی ہے۔ آکسفورڈ کے ڈاکٹر برن دل کی بیماریوں کی تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک یا دو سگریٹوں کا پینا بھی کارونری نسوں (جو دل کو خون پہنچاتی ہیں) کو سکوڑتا ہے اور دل کی خوراک میں کمی کرتا ہے۔

دوسری قابلِ ذکر بیماری برجر ہے۔ یہ ہمیشہ پاؤں پر اثر کرتی ہے۔ پہلے ناقابلِ برداشت درد ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ انگلیاں کالی پڑ جاتی ہیں۔ بعد میں پاؤں اور ٹانگیں اس بیماری کی زد میں آجاتی ہیں۔ اس کا صرف ایک علاج آپریشن ہے جس میں کبھی کبھی پیر تک کاٹنے کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ یہ مرض سگریٹ پینے والوں کو ہوتا ہے۔

دل کا متلانا، قے ہونا، بھوک میں کمی، کھٹی ڈکار آنا آج کل معمول سا بن گیا ہے۔ پیٹ میں پڑے چھالوں (پیپٹک السر) پر بھی یہ الٹا اثر ڈالتے ہیں۔ منہ اور منہ کو پیٹ سے ملانے والی نلی کا کینسر زیادہ تر سگریٹ پینے والوں کو ہوتا ہے۔ نیویارک میں اے۔ بورروٹا اور اس کے ساتھیوں نے ۲۷۹ بوڑھے آدمیوں (عمر ۷۰ سال سے ۸۰ سال تک) جن میں ۱۹۵ آدمی سگریٹ پینے والے اور ۹۴ آدمی پرہیز کرنے والے تھے) کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ کینسر کے شکار سب سے زیادہ وہ لوگ تھے جو سگریٹ نوشی کرتے تھے۔

کچھ بیماریاں، جیسے کہ پیشاب کی تھیلی اور پروسٹیٹ گلینڈ کا کینسر۔ لیور کی بیماری، وٹامن بی ۱۲ کی کمی اور اندھاپن ایسی بیماریاں ہیں جن کا آدمی کم شکار ہوتا ہے لیکن اگر بدقسمتی سے ان کے چنگل میں پھنس جائے تو اس کی حالت ناگن کی طرح ہوتی ہے جس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔ ڈاکٹر ڈبلیو۔ کے۔ کیر نے اپنی تحقیق کے دوران سگریٹ نوشوں کے پیشاب میں کارسی نوجینک نام کا ایک مادہ پایا جو سگریٹ نوشی اور پیشاب کی تھیلی کے کینسر کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا ہے۔ جب سگریٹ نوشی بند کر دی جاتی ہے تو ان مادوں میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ سگریٹ نوشی دوبارہ شروع کرنے پر یہ مادے پیشاب میں پھر پائے جانے لگتے ہیں۔

اگر سگریٹ نوشی اتنی نقصان دہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟ اس میں کیا کشش ہے اور اس کی روک تھام کے لئے سرکار اور سماج کو کون سے قدم اٹھانے چاہئیں؟

کچھ برس پہلے رائل کالج آف فزیشنز لندن کی طرف سے ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی اس میں کچھ نفسیاتی حقائق پر روشنی ڈالی گئی تھی اس کے مطابق بچے کا نئی چیزوں کے تئیں اشتیاق، گھر کا ماحول، کنبے کے افراد کی عادتیں اور بچوں کے دماغ میں ہوشیاری یقینی طور پر بچوں میں سگریٹ نوشی کے رجحان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کچھ ماہر نفسیات اسے دماغی اور ذہنی سکون کا ایک عمدہ وسیلہ بتاتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ اسے بچوں کی عادتوں پر عائد کی گئی کڑی پابندیوں اور شروع سے ہی ماں کے دودھ کا نہ ملنا وغیرہ

... ذہنوں میں پھیلی ہوئی کچھ غلط ... سگریٹ نوشی کو بڑھا دیتی ہیں۔ جیسے کچھ ... کا خیال ہے کہ سگریٹ نوشی سے پیٹ صاف رہتا ہے اور ذہنی توازن بھی برقرار رہتا ہے۔ ... ان خیالات میں کوئی سچائی نہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔

سگریٹ نوشی کی وجوہات اور اس کی روک تھام کے لئے کی گئیں کوششیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں۔

بچوں کے لئے سگریٹ نوشی کا پہلا سکول گھر، استاد اور ماں باپ ہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ سگریٹ نوش ہیں، زیادہ تر دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ بچے بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ میں سے کوئی اکیلا ہی سگریٹ نوش ہے وہاں بچوں میں سگریٹ نوشی کی گنجائش بھی آدھی رہ جاتی ہے۔ کچھ ماں باپ تو سگریٹ نوشی میں بچوں کی حوصلہ افزائی تک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فیلیچر کے نظریئے کے مطابق تو ماں باپ کی سگریٹ نوشی پیدا ہونے والے بچوں تک پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ والدین کو سمجھ لینا چاہئے کہ اپنی اولاد کی اچھی بُری صحت کے لئے وہ خود پورے طور پر ذمّہ دار ہیں۔ جب تک وہ خود اپنی بڑی عادتوں کو نہیں چھوڑیں گے تب تک بچوں سے اچھی عادتوں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آپ کے گھر کا ماحول آپ کے بچوں کے ذہن کا ماحول ہے۔ اب آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ اس قوم کا مستقبل کس سانچے میں ڈھالتے ہیں۔

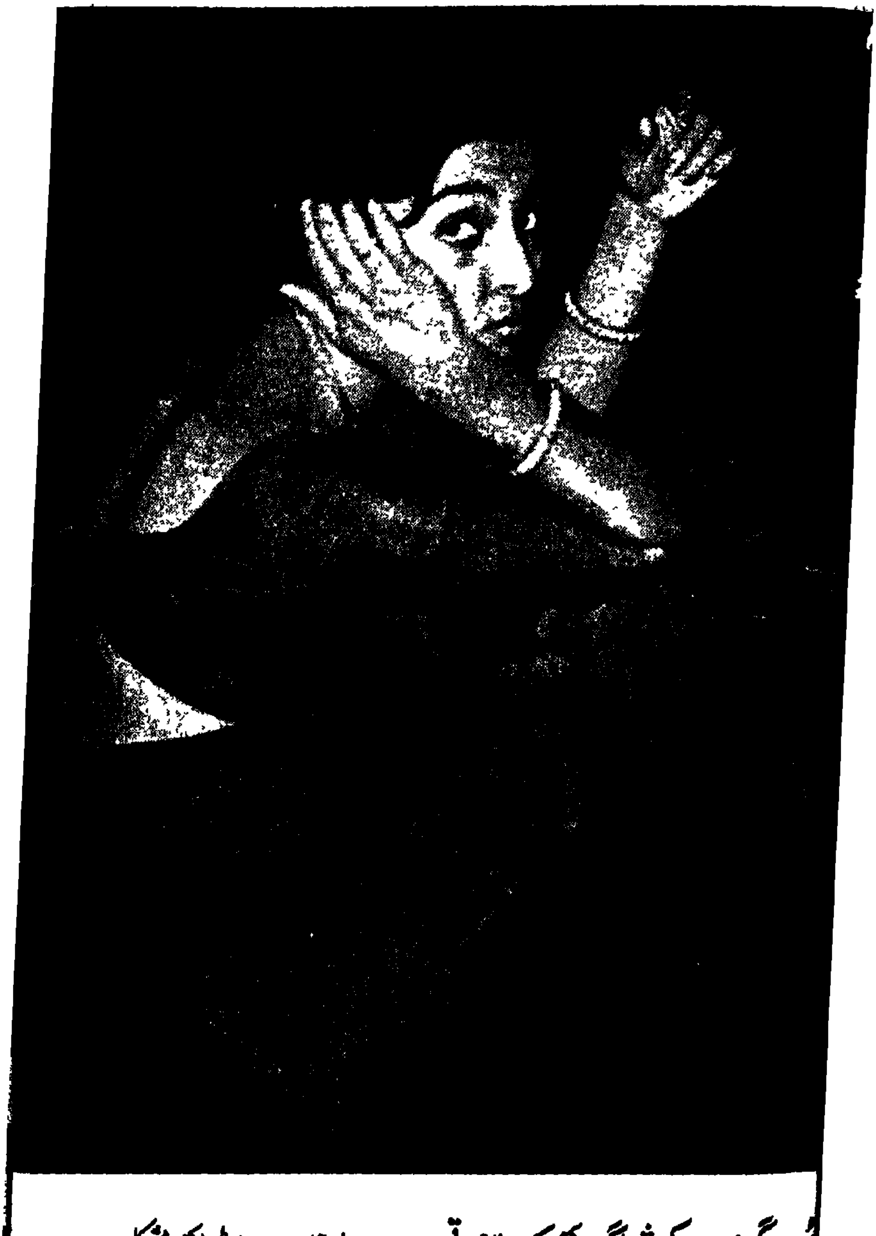
دوستوں کی محفل ایک دوسری یونیورسٹی ہے۔ اگر دوسرے دوست سگریٹ نوشی کریں گے تو آپ کا بچّہ بھی کرے گا۔ اس کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ پتہ لگائیں کہ آپ کے بچّے کے دوست کون سی عادتوں کے شکار ... اسے بدلنے کی ہر ممکن کوشش کریں ... بلکہ یہ بھی اطمینان رہے کہ آپ کا بچّہ کہیں ... اور سگریٹ کے ادھ جلے چھوٹے ٹکڑے ڈبیوں کو اکٹھا کرنے جیسی گندی عادتوں کا شکار نہیں ہے۔

تیسرے اور سب سے زیادہ اہم ادارے ہیں سکول اور کالج۔ یہاں دوستوں کی محفل ... اور پروفیسروں کا برتاؤ، ان کی عادتیں اور ... کا ڈسپلن طالب علموں کے دماغ پر مستقل اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر استاد صاحبان خود سگریٹ نوش ہیں (جیسا کہ ۵۷ فی صدی ہے) تو پھر ان کے طالب علموں سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ سگریٹ نہیں پئیں گے۔ استاد صاحبان کو اپنی ذمّہ داری کا احساس ہونا چاہئے۔ تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی تعلیم و صحت کا پورا انتظام ہونا لازمی ہے۔ وقتاً فوقتاً انہیں اس کے متعلق فلمیں دکھائی جانی چاہئیں۔ تمباکو نوشی کے کیا نقصان ہیں اور کیوں نہیں کی جانی چاہئے! طالب علموں کو یہ سمجھانے کا فرض استادوں کا ہے۔ آج کا طالب علم گولڈ فلیک اور ولز سے لے کر پیلا ہاتھی اور چار مینار تک سبھی سگریٹوں کے نام گِنا دے گا۔ لیکن اگر اس سے یہ سوال کیا جائے کہ بھارت میں کتنے صوبے ہیں تو وہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔ اور ان سب باتوں کے لئے طالب علموں کی نسبت استاد اور پروفیسر ذمّہ دار ہیں۔

سرکار کی طرف سے اور بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کی طرف سے اور ڈاکٹروں کی طرف سے پمفلٹ، بورڈوں اور تقریروں سے تمباکو نوشی کے خلاف ... پُرزور و پُراثر پروپیگنڈہ کیا جانا چاہئے۔ ساتھ ہی جیسا کہ غیر ملکوں میں ہوتا ہے تمباکو والی چیزوں ... اس سے ہونے والے نقصانات کا حوالہ دیا ... تو تمباکو نوشی میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ کارگر ... ٹھوس قدم تو سرکار ہی اٹھا سکتی ہے کیوں کہ ...

اداکارہ ہے جسے اداکاری اپنی
ماں سے ورثہ میں ملی ہے۔

موجہ



اُف، گرمیوں کی شوٹنگ بھی کیا بلا ہوتی ہے! ادھر چین سے بیٹھنا بھی مشکل...



ایک منٹ رکئے۔ ذرا مجھے گیسو تو سنوار لینے دیجئے...



یہ پوز کیا ٹھیک نہیں رہے گا



بچپن میں اس نے چھوٹے چھوٹے رول ادا کئے جن کی بدولت وہ فلم بینوں کی نظروں میں بس گئی۔ 'چاند اور سورج' فلم میں اس کی اداکاری کافی نکھار پر ہے۔

یہ اس کی قدرتی اور زندہ اداکاری ہے جس کی وجہ سے اسے اب بڑے رول ادا کرنے کا بھی موقع ملنے لگا ہے۔

ایک بات تو توجہ کے بارے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اسے آرٹ





اب تھوڑی شرارت کرلی جائے تو کیا حرج ہے؟



اُف، ایک شاٹ کے لئے

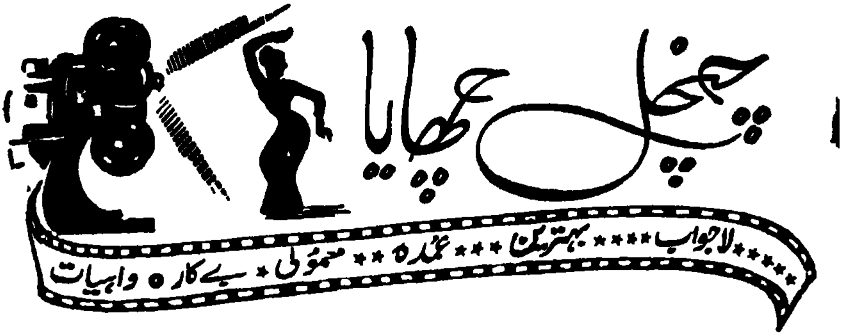
سے والہانہ عشق ہے۔ پھر اس میں ندرت ہے۔ وہ کہیں بھی اداکارہ کی ادائیں نہیں چُراتی۔

وہ اب تک پندرہ سے زیادہ فلموں میں کام کرچکی ہے۔ چھ سات فلموں میں اس نے ہیروئن کا رول بھی ادا کیا ہے۔

اگرچہ کچھ فلموں ۔ 'بھوت بنگلہ'، 'نئی عمر کی نئی فصل'، وغیرہ ۔ میں تنوجہ ابھر نہیں سکی لیکن گورودت کی فلم 'بہاریں پھر بھی آئیں گی'، سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں اداکاری کا شعور ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اسے صحیح ہدایت ملے۔

ابھی حال ہی میں این۔ اے۔ انصاری کی نئی فلم 'وہاں کے لوگ' میں وہ پُراسرار شکل میں دکھائی دی۔ اگر اس فلم سے تنوجہ کو نکال دیا جائے تو فلم بینوں کے لئے باقی کچھ بھی نہیں رہتا۔

اس کی آنے والی فلمیں 'دو دونی چار'، 'اس رات کے بعد'، 'جوانی بیت جائے گی'، 'پریا'، اور 'عزت'، وغیرہ ہیں۔



★ مہربان

فلم ساز : اے۔ وی۔ مایپّن
ہدایت کار : اے۔ بھیم سنگھ
اداکار : اشوک کمار، سنیل دت، نوتن، سلوچنا،
راج مہرہ، مکری، محمود

بھاری تعداد میں اداکاروں کی بھیڑ جمع کرکے مدراسی فارمولے پر تیار کی گئی اس گلیمر رنگین فلم کو دیکھ کر فلم بینوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کوئی ڈرامہ دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلے ہوں۔

یہ ایک یتیم لڑکے (سنیل دت) کی کہانی ہے جس کی پرورش اشوک کمار کرتا ہے۔ سنیل دت کو امیر اشوک کمار کے خاندان سے بے حد اُنس ہوجاتا ہے۔ ور وہ سب سے بے لوث پیار کرتا ہے۔ (اور ہر کام میں خواہ مخواہ دخل بھی دیتا ہے) ایک دن اشوک کمار کے گھر میں ہی ایک بے سہارا لڑکی نوتن کے ساتھ اس ی شادی ہوجاتی ہے۔

اب یہیں پر کہانی میں ڈرامائی انداز سے موڑ آتا ہے شوک کمار سٹّے میں سب کچھ ہار کر قرضدار ہوجاتا ہے اہ سے غریب ہوجانے کی وجہ سے اس کی بیٹی کا رشتہ ی ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے سگے بیٹے تک اُس سے مُنہہ موڑ لیتے ہیں۔ سنیل دت کو بھی معہ بیوی کے ھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ ان صدموں کی تاب نہ لاکر وک کمار چل بستا ہے۔

اس کے بعد روتے پیٹتے غیر قدرتی واقعات کا سلسلہ آخری منزل کی جانب بڑھتا ہے۔ سنیل دت بھگوان کے مندر میں گھنٹہ بجاکر بھگوان کو معجزہ دکھانے پر مجبور کرکے اشوک کمار کے مکان کو نیلام ہونے سے بچاتا ہے۔ اور اس کی بیٹی کا ٹوٹا رشتہ بھی طے ہوجاتا ہے آخر میں سب لوگ مِل جُل کر اکٹھے ہوجاتے ہیں تب کہیں جاکر فلم بینوں کو اکتاہٹ سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

کہانی میں کہیں پوجا پاٹھ، دقیانوسی خیالات، اور پرانے رسم و رواج کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے وہ ہندو سماج کو گراوٹ کے گڑھے میں دھکیلنے والا ہے۔ مرنے کے بعد اشوک کمار کی روح کو چین نصیب ہو، اس کے لئے زیورات بیچ کر برہمنوں کو خیرات وغیرہ دی جاتی ہے۔ اس طریقے سے صدیوں سے چلی آرہی ہندوؤں کی بڑی رسموں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

فلم کو غیر ضروری طور پر کھینچ تان کر ۱۹ ریلوں تک گھسیٹا گیا ہے۔ پس منظر کے گانے جبراً بھرتی اور خاموش فلموں کی نقل معلوم دیتے ہیں۔ مکالمے ضرورت سے زیادہ اور بوجھ محسوس ہوتے ہیں۔ یہ اداکاروں کو پوری اداکاری کا بھی پورا موقع نہیں دیتے۔

اشوک کمار فلم کی روح ہے۔ مرنے کے سین کی اُس کی اداکاری فلم بینوں پر بڑا اثر ڈالتی ہے۔ سنیل دت کا 'مہربان' کا رول بالکل بیہودہ اور غیر قدرتی ہے اداکاری کے نام پر وہ نوٹنکی کے معیار سے اوپر نہیں اٹھا۔ محسوس ہوتا ہے وہ سیدھا پاگل خانے سے آدھے علاج کے بعد رہا ہوکر چلا آرہا ہے۔

نوتن کو اپنے جوہر دکھانے کا پورا موقع نہیں ملا۔ محمود نے بھی سرکس کے جوکروں جیسا ہی کام کیا ہے۔ دوسرے اداکاروں کے بالکل معمولی سے رول ہیں۔ اور ان میں بھی جان نہیں ہے۔ بس مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ سیٹ شاندار ہیں۔ فوٹوگرافی اچھی ہے۔ موسیقی بیکار ہے۔ اڈیٹنگ ڈھیلی ہے اور ہدایت کاری بھیم سنگھ کے لائق بالکل نہیں ہے۔

★★ پالکی

فلم ساز · پردین تلسانیہ
ہدایت کار : ایس۔یو۔سنی
ستارے : وحیدہ رحمان، راجیندر کمار، رحمان، جانی واکر۔

شاعر راجیندر کمار کی وحیدہ رحمان سے شادی ہوتی ہے۔ لیکن سہاگ رات کے موقع پر دلہن کی ایک آن پر دولہا میاں روپیہ کمانے پردیس چلے جاتے ہیں۔ وہاں ایک آتشزنی میں راجیندر کمار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ اطلاع ملنے پر آفت کی ماری وحیدہ رحمان کا نواب مرزا کے ساتھ دھوکے سے نکاح کرادیا جاتا ہے۔

دراصل راجیندر کمار حادثے کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ لوٹ کر گھر آتا ہے۔ لیکن اسے وحیدہ کے مرجانے کی جھوٹی خبر دے کر دیوانہ بنا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف وحیدہ بھی راجیندر کمار کی جدائی میں دیوانی سی بنی رہتی ہے رحمان کے سامنے جب اصلیت ظاہر ہوتی ہے تو وہ وحیدہ کی محبت کا امتحان لیتا ہے جس میں وحیدہ ایکدم پوری اترتی ہے۔ آخر میں راجیندر کمار اور وحیدہ رحمان پھر دولہا دلہن بنتے ہیں اور اس طرح دو بچھڑے ہوئے دلوں کا ملن ہوتا ہے۔

کہانی میں اداکاروں کی کردار نگاری نکھری ہوئی ہے۔ بے لوث محبت اور بے غرض قربانی کی جو جھانکی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ محض آدرش ہے۔ اصلیت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس طرح کی زیادہ تر فلمیں ٹریجڈی ،



"منہ دکھائی! ارے وہ تو میں لانا بھول گیا!"



"مہرو، میں کب تک جذبات کی آگ میں پھنکتا رہوں"

ں ہیں لیکن یہ فلم کامیڈی ہے - اسی لئے پٹی پٹائی
سے کچھ ہٹی ہوئی ہے مکالموں میں لکھنوی نفاست
تک ہے - زبان ثقیل اردو نہ ہو کر عام بول چال کی
ہے -

فوٹوگرافی پرکشش ہے - آتشزنی کا سین بہت
پر اثر ثابت ہوا ہے - سیٹ ضرورت سے زیادہ
بشان ہیں - ایسے محل تو مغل شہنشاہوں کے بھی نہ
ے جیسا ایک نواب کا مکان دکھایا گیا ہے - پھر اتنا
محل آج کل رکھ ہی کون سکتا ہے - بے وقت کی
لی و مشاعرے کے مقابلے بے ڈھنگے اور غیر
رتی ہیں -

فلم میں اداکاری اچھی ہے تو صرف وحیدہ رحمان
اس کا شرمانا اور بولنے کا انداز فلم بینوں کو موہ لیتا
بے شک وہ ہماری فلم انڈسٹری کا ایک مایۂ ناز
ٹ ہے - راجیندر کمار نے اپنا رول محنت سے
نے کی کوشش کی ہے - لیکن اس کی نازک مزاجی
ہا مرانہ اداکاری اوسط درجے کی ہے - آہستہ آہستہ

یہ حضرت بھی ڈرامائی ڈھنگ اور لہجہ اپناتے جارہے
ہیں -

رحمان اداکاری کو کچھ کھینچ لے گیا ہے - لیکن
جانی واکر کو اپنے لئے موزوں رول نہ ملنے کی وجہ سے
لوگوں کو دل بہلانے کا موقع کم ملا ہے - بوڑھی ماں
کے روپ میں پرتیما داس گپتا کی اداکاری جاندار ہے -
منوہن کرشن، مینو ممتاز اور دوسرے اداکاروں کے
چھوٹے چھوٹے کردار عام نوعیت کے ہیں - مینو ممتاز
ضرورت سے زیادہ موٹاپے کی وجہ سے 'صاحب بی بی
اور غلام' والا اداکاری کا معیار قائم نہیں رکھ سکی -

گانوں میں شاعری کے نام پر خاصی تک بندی ہے
ویسے ایک دو گیت پُر درد اور پُر اثر ہیں -

ہدایت کاری کے نقطے سے یہ ایک معیاری فلم
ہے - مہیش کول نے ایس - یو - سنی کی 'پالکی' کو بیچ ڈگر
سے آخری منزل تک بخوبی پہنچا دیا ہے - اگر فلم کی
لمبائی ایک چوتھائی کم کر دی جاتی تو زیادہ خوبصورت
بن جاتی - ●

فلمی عریانی بنام جمالیاتی شعور

مقالہ • رازداں



حقیقت ہے کہ سبھی فلمی اداکارائیں حُسن کی دیوی نہیں ہیں۔ قدرت کے کچھ اپنے قاعدے قانون ہوتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ فلمی اداکارائیں اپنے جسم کے بے ڈول اعضا کو رنگ برنگے اور تڑک بھڑک والے کپڑوں میں چھپالیں جس سے ان کی بدشکل ٹانگوں یا بازوؤں پر لوگوں کی نظر نہ پڑے۔ فلمی اداکارائیں اپنی خاص پوشاکوں میں ہمیشہ خوبصورت، شاندار اور پرکشش نظر آتی رہی ہیں اور کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ ان قیمتی اور خوبصورت پوشاکوں کے نیچے اکثر اتنی خوبصورت نہیں ہوتیں جتنی کہ باہر سے دکھائی دیتی ہیں۔

لیکن ان کئی برسوں میں امریکہ کے ایک دل چسپ مقام نے (جسے ہالی وڈ کہتے ہیں)

ہندوستانی فلم بینوں کے دماغ میں ایک شرانگیز خیال پیدا کر دیا ہے۔ اس نے فلمی اداکاراؤں کو اپنی ٹانگوں کے بارے میں حساس بنادیا ہے۔ انہوں نے اب یہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے کہ عورت کی خوبصورتی کے ساتھ ٹانگوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ٹانگیں صرف اس لئے نہیں ہیں کہ انسان ان پر کھڑا ہوتا ہے اور ان کی نمائش کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اب ٹانگوں کو خوبصورتی کا ایک حصہ مانا جانے لگا ہے۔

اس موضوع پہ ہالی وڈ میں زبردست کشمکش چل رہی ہے۔ ایک طرف وہ فلم ساز ہیں جو خود کو جدت پسند کہتے ہیں اور جن کی فلموں میں نیم عریاں یا تقریباً بالکل برہنہ تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ دوسری طرف وہ فلمی اداکارائیں ہیں جو



لکشمی چھایا "اگر لوگ خوش ہوتے ہیں تو کیوں نہ جسم کی نمائش کی جائے۔"

رت کی پاکیزگی کی بنیاد پر اس قسم کی نمائش کو
بے جا سمجھتی ہیں۔

حال ہی میں مشہور اداکارہ مورین او ہارا
نے فلم بینوں سے اپیل کی کہ وہ ایسی فلموں کا مکمل
بائیکاٹ کر دیں جن میں شہوت کو بھڑکانے والے
منظر ہوں۔ اس نے کہا "اگر عوام ایسی فلموں کا
بائیکاٹ کر دیں تو ایسی فلموں کی نمائش ہی نہیں
ہو سکے گی۔ گذشتہ دنوں میں نے ایسی ایک فلم
میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کے اندر
چند منظروں پر مجھے اعتراض تھا۔"

اس سے بالکل مختلف کیرول بیکر اور جین
مینس فیلڈ جیسی اداکارائیں ہیں۔ کیرول بیکر اداکارہ



ویجنتی مالا "کیا یہی عریانی ہے؟"

جس نے "دی کارپیٹ بیگرز" فلم میں نیم برہنہ اداکاری کی تھی، کہا "اگر کام کرنا ہے تو کرنا ہے۔" اور جین مینس فیلڈ نے، جس کی فلم "پرامیسز پرامیسز" بحث کا موضوع بنی رہی تھی، کہا "میں سوچتی ہوں کہ انسانی جسم ایک شاندار چیز ہے۔ اگر اسے دیکھ کر لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں تو کیوں نہ اس کی نمائش کی جائے۔"

حسن کی یہ نمائش ہمارے فلم بینوں پر بڑا خطرناک اثر ڈال رہی ہے۔ اب وہ لوگ ہندوستانی اداکاراؤں سے بھی ایسی ہی توقع کرنے لگے ہیں اور ایسی نمائش کے خواہاں ہیں۔ حالاں کہ یہاں کی حالت ہالی وڈ سے بالکل مختلف ہے۔

وہاں کی لگ بھگ ہر اداکارہ کو شہرت یافت ہونے کے لئے پہلے کچھ عرصے تک صرف اپنی ٹانگوں کے فوٹو کھنچوانے پڑتے ہیں۔ ایسے فوٹو اس اداکارہ کو ہمیشہ کے لئے عوام میں ہر دل عزیز بنا دیتے ہیں۔ فلم میں سارے بدن پر لباس پہننے والی اداکاراؤں کی شہرت کے اتنے امکان نہیں ہوتے جتنے کہ نیم برہنہ یا بالکل برہنہ اداکاراؤں کے۔ ایسی اداکارہ فلموں میں آنے سے پہلے ہی "ہالی وڈ کی پُرکشش حسینہ" یا "دس لاکھ ڈالر کی ٹانگوں والی لڑکی" کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔ سب سے خوبصورت ٹانگیں فلمی اداکارہ اینگی ڈکنسن کی ہیں جن کا بیمہ لندن کی مشہور بیمہ کمپنی لائڈس نے کیا ہے۔

اینگی ڈکنسن نے "کیپٹن نیومین" فلم میں گریگری پیک کی پسندیدہ نرس کا رول ادا کیا ہے۔ اس کی خوبصورت اور سڈول ٹانگوں کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔ جو کہ پندرہ ہزار ڈالر فی انچ ہوتی ہے اس لئے کوئی بھی اداکارہ تب تک شہرت کی بلندی پر نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ غسل کے لباس میں فوٹو نہ کھنچوائے۔

ہندوستانی اداکارہ کا جسم ساری میں تو بہت جاذب نظر آتا ہے لیکن غسل کے لباس میں بہت ہی بھدا اور بے ڈھنگا لگنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے ہالی وڈ کی اداکاراؤں کی طرح ہندوستانی فلمی اداکاراؤں نے غسل کے لباس میں فوٹو نہیں کھنچوائے۔ ان کے پرستاران کی ٹانگوں کے بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتے۔ یہ بات ابھی حال تک خوش اسلوبی سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن فلم بین اب حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ: فلمی اداکارائیں، جن کے وہ عرصہ دراز سے تعریفوں کے پل باندھتے چلے آ رہے ہیں پاؤں سے لے کر چوٹی تک کتنی خوبصورت ہیں۔



کلپنا (پیار کئے جا) "لباس پہننے سے زیادہ شہرت نہیں ملتی مگر جذبات تو برانگیختہ ہو ہی جاتے ہیں۔"

پرانی اداکاراؤں میں چند ہی ایسی ہوں
دلبے عرصہ تک بھوکی رہ کر جسم کو پتلا بنانے
پہلے کپڑے اتار کر کیمرے کے سامنے آنے
رأت کریں۔ موٹے بے ڈول اور بھدے کولہوں
رومان پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی فلمی اداکارہ غسل
باس میں اپنے جسم کے موٹاپے کی نمائش
ے تو عام عاشق بھی اس سے عشق کرنا چھوڑ
گا۔ کچھ دلیر اور جذبات کی زد میں نہ بہنے
داکاراؤں نے کیمرے کے سامنے آنے کی
ـ کی ہے۔ ان میں ببیٹ رسا ئرہ بانو اور شرمیلا
ٹیگور وغیرہ اسی وجہ سے رسالوں کے سرورقوں پر
جلوہ گر ہو رہی ہیں۔

ہندوستانی فلموں میں ناچ کے دوران فلمی
اداکارائیں دوسرے لباس کے نیچے چوڑی دار
پاجامہ پہنتی ہیں جسے عام ہندوستانی تماشائی نے
اب ناپسند کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ ان کی
ہر ادا اور ہر لچک کا پورا مزہ لینا چاہتا ہے۔ بھارتی
فلم بیں روز بروز زیادہ جرأت مند ہوتا جا رہا ہے۔
وہ اس نئے قاعدے کو پسند کرتا ہے "اگر کوئی فلم
باکس آفس پر ہٹ ہو جائے تو وہ اچھی فلم ہے۔" •

شرمیلا ٹیگور ——— شاید اسی پوز نے کرکٹ کھلاڑی کو گرویدہ بنالیا تھا!



۲۴ر اپریل کو، جس دن لتا منگیشکر نے اپنے مرحوم والد اور موسیقی کے عظیم استاد ماسٹر دینا ناتھ کا یومِ وفات منایا اسی دن اپنے خوش گلو ماضی کے ۲۵ برس بھی مکمل کر لئے۔ اس روز بمبئی کے عوام نے ایک خاص تقریب کا اہتمام کر کے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لتا کی عزّت افزائی کی۔

فلموں سے نفرت کرنے والے پُرانی تہذیب کے حامی لوگ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ لتا منگیشکر زمانۂ حال میں ہی نہیں بلکہ اس صدی میں سنگیت کی سب سے عظیم ہستی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عظیم سنگیت کار تان سین کے بعد آج تک کی کئی صدیوں میں عوام کے دلوں میں کسی خوش گلو شخصیت نے ایسا جادو بھرا اثر نہیں چھوڑا جیسا کہ لتا کی آواز نے۔

تان سین شاہی دربار کا فن کار تھا۔ اکبر کے نورتنوں میں اُس کا شمار ہوتا تھا۔ اُس کا فن عوام کے لئے نہ تھا۔ اُس سے صرف اکبر اور اُس کے درباری ہی لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن لتا منگیشکر صحیح معنوں میں کروڑوں عوام کے ذہن پر جادو کرنے والی ملکۂ موسیقی ہے۔ اُس کے گائے گانے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر طبقہ کے عوام کی زبان پر تیرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان سے باہر غیر ممالک میں بھی ان کا اثر کم نہیں ہے۔

آج عظیم فن کار مرحوم سہگل گانے کے معیار، خوش گلوئی اور سُروں کے اُتار چڑھاؤ میں لتا کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کا سنگیت کار بن کر رہ گیا ہے۔

ہندوستان میں لتا ہی واحد فن کار ہے جو ہر قسم کے گانے ایک ہی صلاحیت سے گا سکتی ہے۔ وہ شاندار رومانی نغمے گا کر سماں باندھ دیتی ہے لیکن جب درد بھرے پُرسوز گانے گاتی ہے تو پتھر دل بھی موم ہو جاتے ہیں۔ انتہائی ماڈرن جاز اور نہایت مشکل کلاسیکل سنگیت پر اسے عبور حاصل ہے۔ سنگیت کے مختلف راگوں اور راگنیوں سے وہ مکمل طور پر واقف ہے۔

لتا میں سُننے والوں کے دلوں کو ہلا دینے کی ایک عظیم لاثانی صلاحیت ہے۔ ۱۹۶۳ء میں انڈین ڈیفنس فنڈ کی منعقدہ تقریب میں اس نے دلّی میں "اے میرے وطن کے لوگو" نغمہ گایا تو پنڈت نہرو جیسے سیاست داں کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر آئے۔

ایسا کوئی حساب نہیں ہے کہ لتا کے آج تک کتنے ریکارڈ بھرے گئے۔ یہاں تک کہ

سُریلی آواز کی سِلور جوبلی

خود لتا بھی یہ حساب نہیں لگا سکتی۔ تقریباً ہندوستان کی سبھی زبانوں میں اُس کے گائے گانے ریکارڈ ہو چکے ہیں۔ ایک ریکارڈ سنسکرت کا بھی ہے جس میں لتا نے گیتا کے چند شلوک پیش کئے ہیں۔

ایک غیر سرکاری اندازہ کے مطابق اب تک اس کے ۸۷۶۶۱ ریکارڈ بھرے جا چکے ہیں۔ لیکن اس تعداد میں وہ ریکارڈ شامل نہیں ہیں جو لتا نے مختلف گراموفون کمپنیوں کے لئے علیحدہ سے گائے ہیں یا جو فلموں کے لئے ہیں

گائے۔ لتا میں ایک عظیم صلاحیت یہ بھی ہے کہ وہ ان زبانوں میں بھی بخوبی گا سکتی ہے جنہیں وہ قطعاً نہیں جانتی۔

ہز ماسٹرز وائس گراموفون کمپنی کی ایک اطلاع کے مطابق لتا کا سب سے زیادہ بکنے والا گانا " آئے گا آنے والا " (محل) ہے۔ اِس کے بعد ناگن فلم کے گانے " میرا من ڈولے میرا تن ڈولے " کا نمبر آتا ہے۔ جس کے ۵۰۰۰۷ ریکارڈ اس فلم کی موسیقی کے ریلیز ہونے کے چھ ماہ کے اندر بک گئے تھے۔

موسیقی کے مختلف پروگراموں میں اِس



قدر مشغول رہنے کے باوجود لتا ہندوستان کے کسی بھی حصے میں کھیلے جانے والے کرکٹ کے ٹیسٹ میچ کو دیکھنا نہیں بھولتی۔ لتا کا بیان ہے " میرے مرحوم والد صاحب کے ڈرامہ ٹروپ میں ایک کرکٹ ٹیم بھی تھی۔ بچپن میں ہی اِس کھیل کا میرے ذہن پر ایسا مستقل اثر پڑا کہ کرکٹ میں میری دل چسپی آج بھی کم نہیں ہوئی "۔

سادگی پسند، حلیم، متحمل مزاج، پرہیزگار اور قدرے پرانی تہذیب کی دلدادہ لتا اپنی ذاتی زندگی میں مکمل طور پر دھرم کی پابند ہے۔

سفید سوتی یا ریشمی ساری میں ملبوس (لتا کو نائیلون اور جدید میک اپ وغیرہ سے یہاں تک کہ لپ سٹک سے بھی سخت نفرت ہے) لتا مجسم ہندوستانی تہذیب معلوم ہوتی ہے۔ وہ جب کبھی گھر سے باہر نکلتی ہے تو اپنے بالوں میں سفید پھول یا سفید بنی لگانا کبھی نہیں بھولتی۔

لتا منگیشکر الفانسو آموں کی اس قدر شوقین ہے کہ اس لئے ان آموں کا ایک چھوٹا سا باغ بھی کولہاپور کے نزدیک پہاڑی مقام پنہالہ پر واقع اپنی قیام گاہ پر ذاتی دیکھ بھال میں لگا رکھا ہے۔

عام گانے والوں کی طرح وہ مرچ مصالحے دار کھانوں یا نہایت گرم اور نہایت ٹھنڈی پینے کی چیزوں سے پرہیز نہیں کرتی وہ گرما گرم رسم سے بھی لطف اندوز ہو سکتی ہے اور آئس کریم بھی بڑے مزے سے کھاتی ہے جنہیں عام گانے والے زہر سے کم نہیں سمجھتے۔ لتا کے خاص شوق ہیں: فوٹو گرافی، مختلف زبانیں سیکھنا، ادب کا مطالعہ اور سرت چندر کے بنگالی ناول پڑھنا۔

عام گانے والے اور خاص طور پر پلے بیک سنگر اپنا زیادہ تر وقت عموماً گھر پر ریاض کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ لتا کو ریاض یا مہارت سے سخت نفرت ہے۔

حقیقت میں جو گانے وہ فلموں کے لئے گاتی ہے ان کی ریہرسل کی بھی اُسے ضرورت نہیں پڑتی۔ میوزک ڈائرکٹر کے لئے طرز سنا دینا ہی کافی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ سامنے ہو، طرز ٹیلی فون پر بھی سنائی جا سکتی ہے بس ریکارڈ کرنے کے لئے ریکارڈنگ کے وقت لتا بالکل تیار ملے گی۔ اور۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس طرز میں پچاس فیصدی خوبیاں اور پیدا ہو چکی ہوں گی اور وہ بتائی گئی طرز سے کہیں زیادہ خوبصورت بن چکی ہو گی۔

پیڈار روڈ پر واقع اس کا کشادہ فلیٹ کچھ حد تک لتا کی شخصیت کا صحیح عکس پیش کرتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں اس کی قد آدم تصویر

ٹنگی ہے۔ قریب ہی ہاتھی دانت پہ کھُدا شِواجی کا مجسمہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ لتا کو عظیم مراٹھی تہذیب سے کس قدر محبت ہے۔ اونچی چھت سے نیچے کی طرف ایک فانوس بھی لٹک رہا ہے۔

ٹھہریئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو ایک اسیشین کتے کو یقین دلانا ہوگا کہ آپ نیک اور بھلے مانس مہمان ہیں۔ یہاں لتا اپنی والدہ، اپنے چھوٹے بھائی ہردے ناتھ (جو فلم پروڈیوسر ہیں اور بطور میوزک ڈائرکٹر بھی کام کرنے لگے ہیں) اور چھوٹی بہن آشا منگیشکر (جو خود بھی مشہور سنگر اور پینٹر ہے) کے ساتھ رہتی ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک اس کی چھوٹی بہن مینا بھی یہیں رہتی تھی۔ چند سال ہوئے اُس نے بخوشی شادی کر لی ہے۔ اس سے اگلا نہایت شاندار اور تقریباً لتا جیسا ہی فلیٹ اس کی بہن آشا بھونسلے کا ہے۔ وہ ہندوستان کی مایۂ ناز سنگر ہے۔

لتا نے اپنا گانے کا سلسلہ ۱۹۴۲ میں ۱۱ برس کی عمر میں شروع کیا۔ یہ اس کے والد کی وفات سے دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ تب اس نے سداشوناداکر کی ایک فلم میں گانا گایا تھا اور اُس کا معاوضہ اسے ۳۰ روپے ملا تھا۔

۲۴ راپریل ۱۹۴۲ء کو لتا کے والد صاحب انتقال کر گئے۔ اور ۱۱ برس کی چھوٹی عمر میں ہی سارے کنبے کی پرورش کا بوجھ لتا کے نازک کندھوں پر آ پڑا۔ اس وقت اس کی گھریلو حالت کافی خستہ تھی۔ کنبے میں آشا، مینا، اوشا اور چھوٹا بھائی ہردے ناتھ اور والدہ تھیں۔ بچوں میں لتا سب سے بڑی تھی۔

لتا کی زندگی کی شاندار کہانی اسی وقت شروع ہوتی ہے جب اس نے سماج میں اپنا خاص مقام بنانے کے لئے کڑی جدوجہد کی اور بالآخر کامیابی حاصل کی۔ اس نے ماسٹر وناٹک کے پاس (مرحوم وناٹک اداکارہ نندہ کے والد تھے) ۸۰ روپے ماہوار پر مستقل ملازمت حاصل کی۔ اُس وقت لتا نے چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے سبھی قسم کے رول ماسٹر وناٹک کی فلموں میں ادا کئے۔ ان میں "پہلی منگلاگور" اور "بڑی ماں" بھی شامل ہیں۔

۱۹۴۶ء میں ماسٹر وناٹک وفات پا گئے۔ لتا کو ایک بار پھر جدوجہد کے میدان میں کودنا پڑا۔ اس وقت اس کے سامنے سب سے اہم سوال کنبے کی پرورش کا تھا۔ لہٰذا بے چاری نے ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ تنگ دستی کی وجہ سے لتا سب جگہ پیدل جاتی۔ اگر کبھی چند آنے بچا پاتی تو سائیکل کرایہ پر لے کر ناناچوک میں جیوتی سٹوڈیو سے بلاڈ میں بمبئی ٹاکیز۔ تقریباً ۴۰ میل کا فاصلہ ایک دن میں بھوکی پیاسی طے کرتی۔

لتا منگیشکر نے پہلا پلے بیک گانا وسنت جوگلیکر کی فلم "آپ کی سیوا میں" گایا تھا۔ اس کے میوزک ڈائرکٹر تھے دتہ داوجی کر۔ تبھی ایکسٹرا مہیا کرنے والے ایک پٹھان نے لتا کا تعارف عظیم موسیقار غلام حیدر سے کرایا۔ اس عظیم شخص نے پنچولی کی فلم "خزانچی" کے ذریعہ پنجابی سنگیت ہندوستانی فلموں تک پہنچایا تھا۔ اس فلم میں ہیرو کا رول نارنگ نے ادا کیا تھا۔ جو آج کل پروڈیوسر ایس۔ ڈی۔ نارنگ کے نام سے مشہور ہے۔

لتا کی آواز سے غلام حیدر بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے دوسرے ہی روز لتا کا گایا ہوا ایک گانا ریکارڈ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے فلمستان سٹوڈیوز کے مالکوں نے، جو فلم کے پروڈیوسر تھے، یہ کہہ کر لتا کو ایک دم رد کر دیا کہ اس لڑکی کا فلم لائن میں کوئی مستقبل نہیں ہے کیونکہ اس کی شکل ایک سنگر جیسی نہیں ہے۔

لتا کو رد کرنے والا شخص کوئی اور نہیں ملک مشہور فلم ساز ششی دھر مکرجی ہی تھا جس نے قابل ہستیوں کو رد کرنے اور نالائق لوگوں کا انتخاب

نے کی قابلِ تعریف صلاحیت ہے۔ یہ مُکرجی
احب ہی ہیں جنہوں نے اوم پرکاش،
۔ پی نیّر اور یہاں تک کہ دیو آنند تک کو
ذکر دیا تھا۔

خیر۔ غلام حیدر صاحب نے دل نہیں چھوڑا
رکوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر لتا نے بمبئی ٹاکیز ڈیوڈ
، فلم "مجبور" میں پلے بیک سنگر کے طور پر ایک
انا گایا۔ جس کے بول تھے "اب ڈرنے کی کوئی
ت نہیں انگریزی چھورا چلا گیا" بتانے کی ضرورت
ہیں کہ یہ گانا اتنا مقبول ہوا کہ ملک بھر میں بچے بچے
ں زبان پہ سنا جانے لگا۔

جلد ہی لتا ایک ستارے کی مانند فلمی آسمان
جگمگانے لگی۔ اس نے ایک کے بعد ایک سبھی
شکلات کو پار کر لیا۔ اس نے مراٹھی طرزِ بیان اور
فظ سے بھی نجات حاصل کی جس کی جھلک اس
کے گائے ہندی گانوں میں صاف جھلکتی تھی۔ اور
س کی وجہ سے شروع میں دلیپ کمار نے نوشاد
د منع کر دیا تھا کہ وہ لتا کا گانا اپنی فلموں میں پسند
ہیں کرتا۔

مضبوط ارادے سے لتا نے اُردو اور ہندی
بانوں کو سیکھنا شروع کیا۔ اور آج اُسے اِن
بانوں پر اتنا ہی عبور حاصل ہے جتنا دلیپ کمار کو۔
اس کی شخصیت میں اور چار چاند لگاتا ہے اور
ے مقبولِ عام بنانے میں پیش پیش ہے۔

خود لتا منگیشکر کے ایک بیان کے مطابق
رج ذیل اُس کے دس بہترین گانے ہیں:

۔ اے ری میں، تو پریم دیوانی (نو بہار)
ا او سجنا۔ برکھا بہار آئی (پرکھ)
ا۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل (بیس سال بعد)
۲۔ لگ جا گلے (وہ کون تھی)
۵۔ بیرن نیند نہ آئی (چاچا زندہ باد)
۔ اللہ تیرو نام (ہم دونوں)
۔۔ بے کس پہ کرم کیجئے (مغلِ اعظم)
۸۔ بہاریں پھر بھی آئیں گی (لاہور)
۹۔ جیون ڈور تمہیں سنگ باندھی (سادتری)
۱۰۔ ماولتیا ونکارا (شیواچا مال سُرا)

ان گانوں میں چند نغمے اور بھی شامل کئے
جا سکتے ہیں جنہیں نہایت اعلیٰ پایہ کے اور سُریلے
ہونے کی وجہ سے بے حد مقبولیت ملی، جیسے:

۱۔ یہ زندگی اسی کی ہے (انارکلی)
۲۔ میرا سایہ ساتھ دے گا (میرا سایہ)
۳ تم ہی میری منزل تم ہی میری پوجا (خاندان)
۴۔ جھمکے تیر (دیوتا)
۵۔ محل میں جل اٹھی شمع (اترالا)

اور ایسے ہی کئی دوسرے گانے۔

لتا کو بچپن میں جتنی مشکلات اور دقتوں کا
سامنا کرنا پڑا اور فلم انڈسٹری میں کامیابی حاصل
کرنے کے لئے لتا کو جو جدّ و جہد کرنی پڑی وہ
ابھی تک اسے بھولی نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس
پیشے میں آنے والے ہر نئے امیدوار کا خیر مقدم
کرتی ہے اور اسے پورا تعاون دے کر اس کی
حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ دراصل کلیان جی آنند جی،
سیک اور اومی، اور دوسرے بے شمار موسیقاروں
کو آج فلم انڈسٹری میں جو مقام حاصل ہے اس
کی تہ میں لتا کا بھی خاص ہاتھ رہا ہے۔ اگر لتا نے
ان کو تعاون نہ دیا ہوتا تو آج یہ لوگ کسی گمنام دنیا
کے باشندے ہوتے۔

لتا نے ہزاروں گانے گائے ہیں جن میں
بلامعاوضہ اور مع معاوضہ ہر طرح کے گانے شامل
ہیں۔ اس نے صبح نور کے تڑکے سے لے کر کافی
رات گئے تک گایا ہے۔ بیماری کے چند خاص
موقعوں کو چھوڑ کر اس نے میوزک ڈائرکٹروں اور
پروڈیوسروں سے کئے وعدوں کو ہمیشہ نبھایا ہے۔
حقیقت میں لتا ایک لاثانی خوش گلو گانے والی ہی
نہیں ہے۔ بلکہ ایک ادارۂ موسیقی بھی ہے۔ — شاکھال



پیغامِ بہار

(بسنت رِتو)

جلوہ گر ہیں رہ گزاروں میں بسنتی پیرہن
باعثِ کیفِ مشامِ جاں ہے خوشبوئے بدن

کتنا من موہن سبھی رِتوؤں کا راجا ہے بسنت
مست کر دیتا ہے تن من جس کا البیلا مِلن

یہ ادائیں، یہ اشارے، یہ فسوں یہ بانکپن
گرم ہے دل میں سجیلی خواہشوں کی انجمن

یہ رو پہلی دھوپ، یہ بکھری چمک، نکھری فضا
آج دھرتی ہے چمکتے روپ کے کارن گگن

آج فصلِ گل بداماں ہے میرا رنگیں دلمن
رہنمائے امنِ عالم درس گاہِ فکر و فن

شانتی سکھ اور محبت پریم پیغامِ بہار
اِن کے رنگ و بو فراواں ہوں تو دنیا ہے چمن

مسکراتے پیلے پیلے پھول چاہت کے رسول
لہلہاتے کھیت سرسوں کے، جوانی کی پھبن

جاری و ساری رہے، تابندہ و زندہ رہے
کرشن موہن پریم کا بندھن، محبت کا چلن

— کرشن موہن —

[illegible] بھوتا [illegible] سے
[illegible] ایک [illegible] ہے۔ بس
[illegible] سے [illegible] سہارا [illegible]
[illegible] اتار دیئے جا سکے
[illegible] میں سے تو

[illegible] سر زمین وطن
[illegible] ہزاروں بھائی لقمۂ اجل بن
[illegible] کو تم نے اپنا غلام بنا ڈالا۔
[illegible] میں بھی
[illegible] پہاڑیوں میں
[illegible] تلاش [illegible] سکے۔ یہ [illegible]

[illegible] کے اس [illegible]
[illegible] اور ان
[illegible] وقت ہو گئے۔ ان
[illegible] ہزاروں [illegible]
انھوں نے اپنے [illegible]
ان دنوں جب [illegible]
[illegible] کر رہے تھے تب [illegible]
چندر کے پاس ایک لداخی راج کمار [illegible]
پناہ لی۔ اس کا پورا نام تھا لہاچین گیا [illegible]
لداخ کے راجہ لہاچین گلرس بوم کا بیٹا تھا جس
راجہ نے ۱۲۹۰ سے ۱۳۲۰ تک حکومت کی [illegible]
اور لداخی حکمرانوں میں اکثر بیشتر تضاد [illegible]
تھے۔ ایسا ہی ایک جھگڑا ۱۳۲۰ میں ہوا جس [illegible]
کے راجہ یعنی رینچن کے والد کی وفات ہو گئی [illegible]
کا پلڑا بھاری دیکھ کر راج کمار رینچن [illegible]
جو ژیلا درے سے ہو کر کشمیر میں آگیا اور [illegible]
میں پہنچ کر سپہ سالار رام چندر سے [illegible]
[illegible]

سپہ سالار اس کی کیا مدد کرتا [illegible]
وہ خود مصیبت میں تھا۔ اس کے گھر کشمیر [illegible]
طرح [illegible] رہے تھے۔ سپہ سالار نے [illegible]
مصیبت [illegible] پناہ دیتے ہوئے کہا "مگر [illegible]
[illegible] کے [illegible] ہونے کی [illegible]

[illegible] سنبھالنے کے
[illegible] لداخی جوان نے رام چندر کی بہت زیادہ مدد کی۔ ان دونوں نے مل کر تمام وادی کو پہاڑی ڈاکوؤں سے پاک کر دیا۔ سپہ سالار اس جوان کی قابلیت پر بہت خوش ہوا اور اسے اپنا معتمد خاص بنا لیا۔

ان دنوں کشمیر بالکل یتیم تھا۔ سپہ سالار رام چندر لوگوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ اس دوران رینچن نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ اب تک اس کی پوزیشن کافی مضبوط ہو گئی تھی۔ سپہ سالار نے اسے شاہی ٹیکس کی وصولی کا کام سونپ دیا تھا۔ رینچن نے اس کا بہت تھوڑا حصہ شاہی خزانے میں داخل کیا، باقی اپنے آپ ہڑپ کر گیا۔ لیکن پھر بھی وہ اتنا مضبوط نہ ہوا تھا کہ سپہ سالار کا مقابلہ کر کے شاہی مسند پر قبضہ کرتا۔ اس نے سپہ سالار رام چندر کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔

اس نے لداخ میں اپنے ساتھیوں اور فوجیوں کو پیغام بھیج کر اپنا منصوبہ سمجھا دیا۔ کشمیر کی لداخ سے اون کی تجارت کافی عرصے سے ہوتی آئی ہے اب بھی کشمیری شالوں کے لیے اون لداخ سے ہی آتی ہے رینچن کے لداخی فوجی اون کے تاجروں کے بھیس میں لہر قلعے میں آ آ کر جمع ہونے لگے۔ کچھ دن تو وہ سچ مچ اون کی تجارت کرتے رہے تاکہ کسی کو ان پر شک نہ ہو۔ ایک دن رینچن بھی اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور وہ بھی اون کے تاجر قلعہ [illegible]

اپنے لوگوں کے ساتھ میں [illegible] تھا رینچن اور اس کے ساتھی ان پر ٹوٹ پڑے اور سب قتل کر دیا رام چندر کے مرنے کے بعد رینچن اس کے خاندان کے افراد کو قید کر لیا اور اس طرح دسمبر ۱۳۲۰ عیسوی میں وہ کشمیر کے پایۂ تخت کا مالک بن بیٹھا۔

تخت پر بیٹھتے ہی رینچن کے سامنے ایک بڑا پریشانی درپیش آئی۔ راجہ سوہ دیو جو منگولوں سے ڈر کر کشتواڑ بھاگ گیا تھا، اب پھر لوٹ آیا۔ کچھ فوج بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ تخت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ رینچن نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کشمیری لوگ راجہ سوہ دیو سے پہلے سے ہی بیزار تھے۔ رینچن نے اسے شکست دی اور سوہ دیو کشتواڑ چلا گیا۔

رینچن کو کشمیری عوام نے مطلق مدد نہ دی۔ اس سے بدستور نفرت کرتے رہے۔ ایک تو لداخی ہونے کی وجہ سے بدیسی سمجھا جاتا تھا پھر جس طرح لہر کے قلعے میں سوتے ہوئے سپہ سالار اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا، اس سے بھی اس کے خلاف لوگوں میں جذبہ منافرت کارفرما تھا۔ وہ دن رات یہی سوچتا رہتا کہ انہیں کس طرح خوش کیا جائے۔

رینچن نے اب فراخ دلی کا ثبوت دینا

بچپن کی یاد

ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بچپن میں دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر آزاد بھارت کا صدر تو دور کی بات، کسی قومی تحریک میں معمولی سا رہنما بھی بن سکے گا۔

دس بارہ برس کی عمر تک آپ اپنے ہاتھوں کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ روزانہ رات بنا کھائے ہی سو جاتے۔ نوکر انہیں اٹھاتا، دال چاول اپنے ہاتھ سے تیار کر کے طوطا مینا کی کہانی سنا کر منہ کھلواتا اور جب نوالہ منہ تک پہنچ جاتا تو آپ منہ کھول دیتے تب نوکر اس میں نوالہ رکھ دیتا۔

گیا۔ اس نے رام چندر کے رشتے داروں کو آزاد کر دیا۔ رام چندر کے ایک لڑکا راون چندر اور ایک ...لا، کوٹا تھے۔ دونوں جوان اور بالغ تھے۔ رینچن نے کوٹا کے ساتھ اپنی شادی کی۔ اور اس کے بھائی راون چندر کو ہر ضلع اور لداخ کے صوبہ کا جاگیر دار مقرر کر دیا۔

اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی اس کے دل کو سکون نہیں ملا۔ ہزاروں بے گناہوں کا خون اس کی گردن پر تھا جس کا اسے کفارہ ادا کرنا تھا۔

رینچن پیدائشی بودھ تھا لیکن ۱۴ ویں صدی کا ... لداخی بودھ مت اب بہت، کچھ بگڑ چکا تھا۔ اس ...ں جادو ٹونے، جنتر منتر کی باتیں آگئی تھیں۔ رینچن نے ...دو دھرم اپنانے کی بات سوچی تاکہ اسے سکون ...ب حاصل ہو۔ اس کے لئے اس نے بڑے بڑے ...چاریوں کو بلایا ان سب نے باہم فیصلہ کیا کہ مہاراج ...نا مذہب نہیں تبدیل کر سکتے۔

"کیوں؟" رینچن کو بڑا زبردست دھکا لگا۔

"کیوں کہ مذہب بدلا نہیں جا سکتا۔ انسان کو ...پنے پیدائشی مذہب کے فرمانوں کی ہی تکمیل کرنی چاہیئے۔"

"لیکن میں نے ایران سے آئے بہت سے ...یوں اور مولویوں سے بات کی ہے۔ انہیں میرے ...ہب تبدیل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں۔"

"ان کی باتیں وہی جانیں مہاراج" آچاریوں نے ...، "لیکن مذہب جیسی عظیم چیز کیسے بدلی جا سکتی ہے۔ ...ا طرح وفا شعار بیوی اپنا شوہر نہیں بدل سکتی اسی ...ح بھلے آدمی مذہب نہیں بدل سکتے۔"

پ... لوگوں کے اس کٹرپن نے تو باہر کے لوگوں کے لئے ہندو مذہب کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دئے ہیں۔ اب اس کی ... کیسے ہوگی؟" راجہ پریشان ہو گیا۔

"ہمیں باہر کے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ...اپنے مذہب کے اصولوں پر عمل کریں" یہ کہکر ...ریہ لوگ چلے گئے۔

راجہ کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ کیا وہ اتنا گرا ہوا ہے کہ ہندو اسے قبول نہ کریں اس کا دھیان اسلام کی طرف گیا۔ اب تک ہزاروں عربی، ترکی، ایرانی مسلمان کشمیر میں آباد ہو چکے تھے۔ منگولوں کے حملے سے جان بچانے کے لئے بھی بہت سے لوگ یہاں آ بسے تھے مگر ان سب کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ ان لوگوں میں کئی صوفی اور جیّد عالم بھی تھے۔ راجہ نے ان سے مشورہ کیا تو اُسے کچھ سکون ملا۔

ایک دن صبح سویرے رینچن اپنے محل کی چھت پر کھڑا تھا۔ جہلم کے کنارے ایک مسلمان بزرگ مصلےٰ بچھا کر نماز پڑھ رہے تھے۔ رینچن بغور اسے دیکھنے لگا جب نماز ختم ہوئی تو رینچن نے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان بزرگ کا نام تھا سید شرف الدین۔ آپ بہت برگزیدہ ہستی تھے کشمیری عوام بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ بہت سے لوگ انہیں بُل بُل شاہ کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔

راجہ نے کافی دیر تک ان سے خدا اور مذہب کے بارے میں بات چیت کی۔ اسلام کے بارے میں اتنی معلومات اس نے پہلے کبھی حاصل نہ کی تھی۔ راجہ کافی متاثر ہوا۔ اور اس نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نام رکھا گیا صدرالدین۔

رینچن کے قبول اسلام کے بعد راون چندر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

جب صدر الدین اپنے حرم میں گئے تو اپنی رانی کوٹا دیوی سے کہا "میں نے تو اسلام قبول کر لیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ مہارانی صاحبہ بھی مسلمان ہو جائیں۔"

کوٹا دیوی ایک ہندو سپہ سالار کی قابل اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ سنسکرت پر اسے پورا عبور تھا اور بہت سی مذہبی کتابیں بھی اسے ازبر تھیں۔ اس کے ضمیر نے مذہب تبدیل کرنا پسند نہ کیا۔ اس نے عرض کیا "مہاراج، آپ مسلمان ہو گئے یہ بہت اچھی

بات ہے۔ لیکن مجھے میرے ہی مذہب میں رہنے دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔"

"اسلام مذہب تمہارے دھرم سے بہت اچھا ہے" راجہ نے سمجھایا۔

"مہاراج" مہارانی صاحبہ بولیں "کوئی بھی مذہب اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ ایشور اور اس کے حاصل کرنے کے راستے کا نام دھرم ہے۔ ملک، وقت اور رجحان کے مطابق یہ راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں مگر انہیں اچھا یا برا، اونچا یا نیچا نہیں کہا جا سکتا۔ ہر دھرم میں بنیادی باتیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ لیکن جیوں جیوں وقت گزرتا جاتا ہے کچھ مطلبی، خود غرض، بدمعاش اور بد طینت آدمی اس خاص دھرم میں اپنی گندی نفسیات بھر دیتے ہیں۔ آج ہندو اور بودھ دھرموں کے ختم ہونے کی یہی ایک خاص وجہ ہے۔"

"تمہارے بھائی راون چندر نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔"

"مہاراج، یہ ان کے اپنے دل کی خوشی ہے" رانی نے کہا "لیکن مجھے اپنے ہی دھرم سے سکون ہے۔ اب وہ اچھا ہے یا بُرا ہے تو اپنے ملک کا میں اس مذہب سے کیسے منہ موڑوں جو ہزاروں برس سے زندہ ہے۔ بہر حال جیسا بھی ہے میرے لئے وہی اچھا ہے۔" پھر رانی نے ایک سنسکرت کا شلوک پڑھ کر سنایا جس کا مطلب تھا کہ اپنا دھرم چاہے برا ہی ہو پھر بھی دوسرے مذہب سے عظیم ہوتا ہے۔ اپنے مذہب میں مرنا بھی اچھا ہے مگر دوسرے کا مذہب خطرناک ہوتا ہے۔

راجہ ہنسا "تب ٹھیک ہے۔ تم اپنے مذہب پر ڈٹی رہو۔ میں تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔"

"مہاراج کی بلند نظری کی شکر گزاری ہوں، کتنا اچھا ہو اگر تمام مسلمان بادشاہ بھی آپ کی طرح بلند نظر اور فراخ دل ہوں۔ میں نے قرآن کی کرڈ مذہبی کہانیاں ہی سنی ہیں۔ تلوار کے زور سے انھوں نے اسلام پھیلایا ہے۔ ہندوؤں کا قتل کیا ہے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ اسلام خوب پھیلے مگر کسی کا دل نہ دکھایا جائے۔ ہزار مسجدیں بنیں مگر مندروں کو توڑا نہ جائے۔ تلوار کی بجائے محبت اور پیار سے لوگ اسلام قبول کریں۔"

راجہ نے چھاتی ٹھونک کر کہا "رانی صاحبہ، میں یقین دلاتا ہوں کہ اس سرزمین کشمیر میں کبھی مذہب کے نام پر تلوار نہ اٹھے گی۔ اسے صرف عالموں کی زبان پھیلائے گی، خود غرض اور لالچی سلطان کی تلوار نہیں۔"

۱۳۲۱ میں صدر الدین یا رینچن کے ایک) ہوا جس کا نام حیدر رکھا گیا۔ جب ننھا راج کمار کچھ بڑا ہوا تو اس کی تعلیم و تربیت کے لئے شاہ میر نامی ایک ترک معلّم کی خدمات لی گئیں۔ راجہ نے اپنے استاد بُل بُل شاہ کے لئے جہلم کے کنارے ایک کُٹیا بنوا دی۔ پاس ہی میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کرادی یہی کشمیر میں بنی پہلی مسجد تھی جس کی تعمیر اتنے آسان طریقے سے ہوئی جس کا کبھی خواب میں تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔

قریب آج بھی ہے

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

جگمگاتے ہیں افق پار ستارے، لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلّم جانا
اہلِ دل کے لئے وہ بات عجیب آج بھی ہے

یہ تیری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

—— ساحر لدھیانوی

بوڑھا مرتا بھی نہیں



ایسا سوچنا کہاں تک جائز ہے ؟

مقالہ

پربھات تیاگی

کالج سے جیسے ہی گھر پہنچا بیگم صاحبہ نے فرمان شاہی صادر فرمایا کہ شام کو چھ بجے ان کی سہیلی گیتا کے یہاں چائے کی دعوت ہے. بڑے حیلے بہانے کئے مگر فرار کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ بے دلی سے منو کو گود میں لئے، بیگم صاحبہ کے گھریلو نوکر بن کر، سڑک پر قدم سے قدم ملاتے ہوئے ہم گیتا ورما کے گھر پہنچے۔

دونوں سہیلیاں غپ شپ کرنے اندر چلی گئیں اور ہم آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے رہے۔ کافی وقت گذر گیا مگر ورما جی کی جھلک تک نہ دکھائی دی۔ اُلجھن سی ہونے لگی کہ کس سے بات کریں۔

اچانک بالکل باہر کے کمرے میں کسی کے لگاتار کھانسنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی سخت بیمار ہے۔ جاکر دیکھا، ایک ساٹھ سالہ بزرگ ایک جھلنگا سی چارپائی پڑے زور زور سے کھانس رہے ہیں. قریب ہی ایک معمولی سی میز، گلاس اور صراحی کے علاوہ دوایک دوا کی شیشیاں رکھی ہیں۔

میرے کمرے میں پہنچنے پر بزرگ نے کھانسی کے شدید دَورے میں ہی ہاتھ سے پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ میرے پانی دینے پر وہ آرام سے لیٹ گئے۔ میں نے غور سے پہچاننے کی کوشش کی —— ارے یہ تو نامور وکیل سومنیش ورما، ورما جی کے والد صاحب تھے! یہ تو الٰہ آباد میں تھے، یہاں کب آگئے؟ ورما نے تو کبھی یہ بتایا ہی نہیں! اتنی بڑی کوٹھی کے اصلی مالک ...اپنے وقت کے بہت بڑے نامور وکیل اور موجودہ بڑی فرم ورما اینڈ کمپنی کے روح رواں آج تنہا کمرے میں

کیوں پڑے ہوئے ہیں ؟ مجھے سخت حیرت تھی۔
میں نے پوچھ ہی تو لیا " بابوجی، آپ یہاں آئے ؟ ہمیں تو آپ کے آنے کی خبر ہی نہیں ملی۔ اور آپ کو یہ کیا ہو گیا ؟ آپ کی صحت تو بہت اچھی تھی۔"

جواب میں "وہ بلک بلک کر رونے لگے۔ ابھی میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ کسی کے آنے کی آہٹ آئی۔ بزرگ ورما جی نے فوراً اپنے آنسو پونچھ لئے۔ باہر ورما جی کھڑے تھے۔ آتے ہی بولے۔
" ارے یہاں کہاں بیٹھے ہو ؟ چلو، ڈرائنگ روم میں چلو۔ بابوجی کچھ چاہئے تو نہیں ؟"
اُن کے نفی میں سر ہلا دینے پر مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ورما ڈرائنگ روم میں لے گئے۔
بڑے قیمتی ٹی سیٹ میں خوب صورت میز پر چائے لگائی گئی تھی۔ ناشتے کے نام پر کئی طشتریاں بھری ہوئی تھیں۔ گیتا نئی ساری میں بجی سنوری حاضر ہوئی۔ چائے پیتے ہوئے ورما جی کا سب سے بڑا لڑکا ٹنکو اچانک بولا " ارے، ممی، بابا جی کو بھی تو چائے بھیج دو۔"
منہ بنا کر گیتا بولی " چپ رہو، ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو پی ہے انہوں نے۔ زیادہ چائے زہر کا کام کرتی ہے۔ اور پھر ابھی رات ہونے تک دو تین بار تو پیئں گے ہی۔"
خاموش رہ کر گویا بیوی کی رائے سے ورما جی نے بھی اتفاق کیا۔
راستے بھر سومنیش ورما صاحب کا چہرہ آنکھوں میں گھومتا رہا۔ عمر بھر ٹھاٹ سے رہنے والے اور اپنے بل بوتے پر شاندار کوٹھی اور تجارتی ادارے کے بانی کو اکیلے کمرے میں کیوں ڈال دیا گیا تھا ؟ بیگم صاحبہ نے راستے میں بتایا کہ گیتا نے دو گھنٹے کی بات چیت کے دوران صرف اپنے خُسر کی بدخوئی اور اُن کے سبب زندگی دوبھر ہونے کی ہی بات کہی تھی۔ کتنے ہی عمر رسیدہ لوگوں کے چہرے آنکھوں میں گھوم گئے جن کو بڑھاپے کے سبب بے اعتنائی، ذہنی آزار اور "آج مرے، کل مرے"، کی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ کباڑخانے کی ٹوٹی پھوٹی اشیاء کی طرح نئی پود بزرگوں کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتی ہے ؟ زندگی کے پچاس ساٹھ طوفانوں کو برداشت کرنے والے انسانوں سے تو بہت زیادہ فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں، اُن کے تجربے، اُن صلاح اور رہنمائی آج کے نوجوانوں کی راہیں آسان اور بے خطر بنا سکتی ہے۔
عمر رسیدہ لوگوں کے بارے میں عام شکایت یہ ہے کہ وہ وقت کے ساتھ نہیں بدلتے۔ وہ گھر کے افراد اور نئی نسل کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نئے تقاضوں کے نام پر نئی نسل عمر رسیدہ لوگوں سے فقط اپنی باتیں منوانا چاہتی ہے، اپنی ہموار کی ہوئی

ایک ساتھ



موسم بھر تو پیا
ارتھوں کی پنکھڑی پر
چھڑک گیا
شبدوں کا رنگ
ایک ساتھ آ طے
پچاگنی بیار میں
شیت اور تاپ
جانے کون چھوڑ گیا
پھولوں کے گالوں پے
چنبن کے چھاپ
کھلنے کے کئی روپ
جینے کے کئی ڈھنگ
ملنے کو بچھڑے تھے
ورشوں کے من
مل کر جو بچھڑے تو
بھیگ گئے تن
ٹھٹھک اٹھے صدیوں کے پاؤں

ہوں پر ان کو چلانا چاہتی ہے اور اپنے نظریات
، پر تھوپنا چاہتی ہے۔
ہم یہ کیوں فراموش کرجاتے ہیں کہ جس
ں نے پچاس ساٹھ برس تک دوسروں کی
ائی کی، دوسروں کو اپنے تجربوں سے مستفید
اور زندگی کے بارے میں کوئی ٹھوس نظریہ
اکیا، کیا عمر کے آخری حصّے میں وہ اس لئے
ں دیا جائے کہ اس کو کسی کا محتاج ہونا ہے؟
ت تو یہ ہے کہ انسان جیسا عمر بھر رہا ہے
ہی بڑھاپے میں بھی رہے گا۔ اُن کے
ر بدل جانے کی امید رکھنے کی بجائے دلائل
اپنے نظریات کے ذریعے اپنے اصولوں کو
کے آگے ضرور پیش کرنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ
عادتوں اور اصولوں پر قائم رہیں تو اس
آزردہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ
، خیالات کو پیش کیجئے وہ اپنے خیال پیش

ملے

باج اٹھے سپنوں کے چنگ
بندھے بندھے تھے یام
اُدھروں سے نین
دُکھ سے بھی گیلے ہیں
دیکھو کے بین
درد در دگونگے ہیں
خوشیاں اَپنگ



—— تارادت بر دردودھ

دیکھو: شان وشوکت، اُدھر: ہونٹ
شدھیوں: یادوں، تھے یام: وقت،

کریں گے۔ سب کا متفق ہونا نہ تو ممکن ہی ہے
اور نہ لازمی ہی، البتہ ان کے کردار کی خصوصیات
اور ان کی خوبیوں سے ہمیں سبق ضرور لینا چاہئے۔
اور اسی لئے خیالوں اور اصولوں میں اختلاف
ہونے پر بھی ان کے احترام، ان کی عزّت میں
کوئی کمی نہیں ہونی چاہئے، جیسا کہ عموماً ہوتا
ہے۔ مگر جس اصول کا اطلاق نئی پود پر ہوتا ہے
وہی عمر رسیدہ لوگوں کے لئے بھی ہے کہ وہ
غیر ضروری طور پر نئی نسل کی نکتہ چینی نہ کریں۔

عمر رسیدہ عورتوں اور مردوں کو سب سے بڑی بات یہی لگتی ہے کہ زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے ہی ان کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جائے۔ جسمانی قوّت کے کم ہوجانے سے ہی کوئی شخص بے کار نہیں ہوجاتا۔ یونان کے مشہور مفکّر افلاطون نے تو اپنے جمہوری نظام میں ان حکمرانوں کا ہی تصوّر کیا تھا جن کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہو۔ اس لئے معمّر انسان کو بڑھاپے میں کوئی دل چسپ کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا کام جس میں جسمانی قوّت کے بجائے ذہنی قوّت کی زیادہ ضرورت ہو، ایسا کام جس میں وہ اپنی حیثیت اور اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکے۔

مگر ہمارے معاشرے میں معمّر انسان کو محتاج قرار دے کر اسے کسی گوشے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اکیلے پڑے پڑے اسے مایوسی کے تھپیڑے پریشان کرتے رہتے ہیں، ذہنی اعتبار سے بھی وہ ضعیف ہوتا چلا جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اس میں احساسِ شکست خوردگی، احساسِ کمتری، زمانے بھر سے شکوہ اور خود پر رحم وغیرہ نقائص پیدا ہوجاتے ہیں۔ انگلینڈ کی ایک خاتون نے اپنے خُسر کے سامنے بیٹھ کر ان کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات کو قلم بند کیا، کیوں کہ اس کے خسر ایک بحری کپتان رہ

چکے تھے۔ کیا ہمارے ملک کے عمر رسیدہ لوگ
اپنی زندگی، اپنے دور کی سیاسی ہلچلوں، خانگی
زندگی کی یادداشتوں اور بھارت کی سیاسی تحریکوں
اور تاریخ سے متعلق حقیقی واقعات کو ترتیب نہیں
دے سکتے؟

وہ بھی سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے
فقط انہیں جذبہ عطا کرنے اور گھر کے کسی فرد کے
دلچسپی لینے کی۔ اور بھی کچھ نہیں تو اپنی زندگی کی
آخری منزل پر بیٹھے معمر لوگوں کو ملک کی سیاحت
اور قابلِ دید مقامات کی سیر کرنے کا موقع فراہم
کر دیا جائے تو وہ موت کو کئی سالوں تک ٹال کر
کنبے، معاشرے اور ملک کے لئے نہایت مفید
ثابت ہو سکتے ہیں۔

بڑھاپا بذاتِ خود اتنا بُرا نہیں، جتنا کہ بڑھاپے
کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بہو کو شکایت
ہے کہ اس کی ساس بوڑھی ہو کر بھی فیشن کرتی ہے
اور ہمیشہ بناؤ سنگھار کئے رہتی ہے۔ دوسری طرف
ایک حضرت کو اپنے والد صاحب کے سنیما دیکھنے
سیر سپاٹا کرنے اور بڑی عمر ہونے پر بھی زبان
کے چٹخارے لینے اور بن ٹھن کر رہنے کی عادت
قطعی ناپسند ہے۔ مگر "اب تو بوڑھے ہو گئے،
اب تو بدل جاؤ" کا جذبہ بوڑھے لوگوں پر بڑا بھاری
ظلم ہے۔ اگر انگلینڈ اور امریکہ کا معمر بڑھاپے میں
بھی زندگی کے تقاضوں سے لطف اندوز ہو سکتا
ہے تو بھارت کے معمر لوگوں نے کیا جُرم کیا ہے؟
معاشرے کو تو جوان بوڑھوں کی ہی زیادہ ضرورت
ہے، نہ کہ بے شمار کمزور، لاغر اور ناتواں اور مایوس
بوڑھوں کی۔

بوڑھوں کا مقابلہ بچوں سے بجا طور پر کیا
جا سکتا ہے۔ اس عمر میں بات بات پر مچلنا، چھوٹی
چھوٹی چیز کے لئے روٹھنا، دوڑنا عین قدرتی امر
ہے۔ مجھے یاد ہے میرے بابا گڑ کے اتنے دلدادہ
تھے کہ ۸۰ سال کی عمر میں بھی گڑ کو کپڑے میں
باندھ کر پیس کر کھانے کی ان میں عادت تھی
گھر میں آتے جاتے چوری چھپے گڑ نیفے یا جیب
میں رکھ لیتے تھے اور باہر آ کر سب کی نظریں بچا کر
کھاتے تھے۔ اگر وہ مانگتے تو کیا انہیں گڑ نہیں ملتا
مگر چوری چھپے کھانے میں انہیں عجیب لطف
معلوم ہوتا۔

کچھ گھروں میں ان باتوں کو ہی لے کر ہنگامہ
کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا ہونے پر لازمی طور
معمر اشخاص اور زیادہ بوڑھے ہو جاتے ہیں کیونکہ
انہیں اپنے سے کم عمر لوگوں کے سامنے لے عزت
ہونا پڑتا ہے۔

بوڑھے مرد اور عورتوں کو رہنے کے
کسی جگہ کے ساتھ دیکھ بھال کرنے والا بھی
چاہیئے۔ اگر مرد یا عورت کا رفیقِ حیات خدا ہو
تو ان کی نگہداشت کرنے والے کی ضرورت
اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ دیکھ بھال کا مطلب
صرف صبح شام کی گرم روٹیاں اور وقت پر
پیار کے ساتھ کھلانا پلانا ہی ہے۔ اسی لئے اکثر
لوگ گھر کے بچوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں
ان کا خیال رکھتے ہیں۔ مناسب دیکھ بھال
پر بچوں کو گھمانے پھرانے ساگ سبزی لانے
گھر کی دیکھ بھال رکھنے وغیرہ کے چھوٹے مو
کام بزرگ وار بذاتِ خود ہی سنبھال لیتے ہیں
سب بزرگ لوگوں سے ایسی امید کرنا یا
اور مکان کو بڑے بوڑھوں کے سر منڈھ کر
سپاٹے کرتے رہنا نئی نسل کے لئے واجب
کہا جا سکتا۔ جو سہولت ہمیں ان سے مقصود
خود ان کو بھی وہ سہولت دی جانی چاہیئے
کچھ گھروں میں مہمانوں کے آنے پر
تقریب اور تہواروں میں بزرگوں کو اس
سب کے سامنے نہیں لایا جاتا کہ مبادا
ویسی بات نہ کر دیں یا کچھ اوٹ پٹانگ
دیں۔ ایسی باتیں براہ راست معمر لوگوں
دل کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔ مغربی ملکوں میں

کچھ بزرگ قدامت پسند ہونے کے باعث ہر نئی بات کی نکتہ چینی کرتے ہیں، مگر مشاہدات پر مبنی ان کی چند باتیں نہایت کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں اور نئی پود کو اپنی اصلاح کرنی ہی چاہیے۔

ستر سالہ بوڑھے بال روم ڈانس کرتے ہیں اور تفریح کے پروگراموں میں شامل ہوتے ہیں تو کیا ہمارے ملک کے بوڑھے تقریبوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں؟ ذرا سوچئے، پچاس ساٹھ سالہ معمر عورتوں و مردوں کا پچیس تیس سالہ لڑکے لڑکیوں سے شادی کرنے کا کیا راز ہے؟ کیا وہ جنسی تشنگی مٹاتے ہیں؟ جی نہیں، بیوی یا شوہر کی شکل میں دیکھ بھال کرنے والا انہیں کوئی اپنا انسان مل جاتا ہے۔ کیوں نہ آپ ہی وہ شخص بن جائیں اور مناسب دیکھ بھال کی صورت میں معمر لوگوں کو بھی دوسرے افراد کی طرح مساوی او ق اور سلوک سے کنبے کا اہم ترین جزو تسلیم کریں۔ مگر دیکھ بھال کرکے معمر لوگوں پر رحم نہ کیجئے یا ان پر احسان نہ لادئیے کیوں کہ دونوں ہی باتیں ان کو توہین کے زمرے میں لے آتی ہیں۔

لوگوں کی ہر بات کو یہ کہہ کر ٹالنا کہ یہ تو معمر یوں ہی کہا کرتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ یہ مانا کہ کچھ بزرگ قدامت پسند ہونے کے باعث ہر نئی بات کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مگر مشاہدات پر مبنی ان کی چند باتیں نہایت کارآمد اور بہتر ثابت ہو سکتی ہیں۔ جیسے، اگر کبھی صبح دیر تک سوتے رہنے کی کبھی برائی کریں، غیر ذمہ داری اور بے راہ روی، بداخلاقی یا بدتمیزی پر وہ گھر بھر کے افراد کی وقتاً فوقتاً سرزنش کریں تو نئی پود کو خود ان کی اصلاح کر لینی چاہیے۔

ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ 'ابھی تو ہم پر والدین کا سایہ ہے، ہم کیوں فکر کریں؟' اس کے معنی یہی ہیں کہ والدین اور گھر کے بڑے بوڑھوں کے سایۂ شفقت میں نئی پود اپنے تفکرات، مسائل اور تکالیف سے لاپروا رہتی ہے۔ جس گھر میں معمر لوگوں کا احترام ہوتا ہے، ان کی قدر و قیمت کو پہچان لیا جاتا ہے، وہاں صحیح معنوں میں سکون، خوش حالی اور آرام کا امتزاج ہوتا ہے

ایسی خواتین کی بھی ملک میں کمی نہیں ہے، جو گھر کے بزرگوں کی توہین میں ہی لطف محسوس کرتی ہیں۔ ہمارے ایک دوست کی بیوی بھی ایسی ہی ہیں۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو ناک چنے چبا رکھے ہیں۔ سبزیوں میں مرچیں بھر دینا، دودھ میں چینی نہ ڈالنا، روٹیاں جلا دینا، ان کے کام کی چیزوں اور کپڑوں کو اِدھر اُدھر پھینک دینا، ہر وقت انہیں کوستے رہنا اور ان کی وجہ سے اپنی گرہستی کو چوپٹ کرنے کی بات سب کو سنا سنا کر کہنا، وغیرہ ان کے خاص کام ہیں۔ ایک دن انہوں نے ہماری بیگم صاحبہ کو باتوں ہی باتوں میں بتایا "بہن جی کیا بتائیں ہماری تو زندگی ان بوڑھوں نے اجیرن کر دی ہے۔ بوڑھا باہر پڑا پڑا کھوں کھوں کرتا رہتا ہے اور بڑھیا اندر میرا ناک میں دم کرتی رہتی ہے۔ 'وہ' تو کبھے سوکھتے جا رہے ہیں اور بوڑھے بوڑھیا فربہ ہوتے جا رہے ہیں دونوں جلدی مریں تو نجات ملے۔"

وہ یہ بھول گئیں کہ انہیں ایک دن بوڑھا ہونا ہے اور تب اپنے بیٹے پوتوں کے منہ سے یہ سننا کیا انہیں اچھا لگے گا کہ بڑھیا تو ہماری جان کا وبال بن گئی ہے۔ یا اپنے شوہر کے لئے یہ الفاظ سننے کیا انہیں برے نہ لگیں گے "بوڑھا مرتا بھی نہیں، نہ جانے اور کب تک قیامت کے بورئیے سمیٹتا رہے گا۔"

اس طرز عمل سے بوڑھے لوگ کیا سوچیں گے ●

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) رگیرو تال کا بیڑیا بقایا صفحہ ۶)

لوگ جمع ہوئے جنہوں نے اپنے دکھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے عرضیاں دی تھیں۔ راجہ صاحب کا پلنگ شامیانے کے اندر خاص طور پر بنائے ہوئے سٹیج پر لایا گیا۔

ان سب عرضیوں کو دیکھ کر راجہ سودھن لال نے وہاں موجود لوگوں سے کہا "میری زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔ اگر میں ان سب عرضیوں کو ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کروں اور رات دن پڑھتا رہوں تو بھی نہیں پڑھ پاؤں گا۔ اچھا ہو کہ کسی چھوٹے بچے سے ایک ایک کر کے عرضیاں نکلوائی جائیں۔ جس کی عرضی پہلے اٹھے گی اسی کی بات پر سب سے پہلے غور کیا جائے گا۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہے گا۔"

لوگوں نے راجہ صاحب کی اس تجویز کو منظور کر لیا۔ بھیڑ میں سے ایک چھوٹا سا بچہ، جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ آیا تھا، راجہ صاحب کے پاس لایا گیا۔ اس لڑکے سے کہا گیا کہ وہ صندوق میں سے ایک عرضی نکال کر راجہ صاحب کو دے دے۔

لڑکے نے صندوق کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں موجود لوگ بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگے کہ کس کی عرضی پہلے نکلتی ہے اور وہ کیا چاہتا ہے؟

لڑکے نے صندوق کے اندر سے ایک عرضی نکال کر راجہ صاحب کو دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ راجہ صاحب نے بھی اشتیاق سے اُسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو پکڑ نہ سکے۔ تب ان کے پرائیویٹ سکریٹری نے اس کاغذ کو لے کر کھولا اور پڑھ کر راجہ صاحب کو سنایا۔

راجہ صاحب نے کہا "یہ رتن چند جوہری کی عرضی ہے۔ بھیڑ میں اگر رتن چند ہوں تو ان سے درخواست کروں گا کہ وہ آگے آجائیں۔"

بھیڑ میں سے ایک بہت بنا سنورا آدمی آگے آیا۔ رتن چند جوہری نرگڑھ کے سب سے زیادہ مالدار آدمیوں میں سے تھے۔ اُنہیں بھی کوئی دکھ ہوسکتا ہے، یہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

راجہ صاحب نے موجود لوگوں کو ایک بار پھر مخاطب کر کے کہا "بھائیو، رتن چند اپنی بیوی کی گہنوں کی بھوک کو پورا نہیں کرسکے، اسی لئے دُکھی ہوکر یہاں آئے ہیں۔ جب رتن چند جوہری کی یہ حالت ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ غریب کسانوں کے اُوپر کیا گذرتی ہوگی! لیکن میں رتن چند جوہری کی خواہش پوری کروں گا۔"

یہ کہنے کے بعد اُنہوں نے رتن چند جوہری سے کہا "آپ اپنی بیوی کو یہاں لے آیئے۔ میں اپنی مرحوم بیوی کے زیورات کی الماری کھلوائے دیتا ہوں۔ وہ اپنے پسندیدہ گہنے پسند کرلے۔"

رتن چند اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔

راجہ صاحب نے اس لڑکے سے کہا "دوسری عرضی نکالو۔"

لڑکے نے صندوق کے اندر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ بھیڑ میں سے آواز آئی "میرا مطالبہ بہت چھوٹا ہے، پہلے اسی پر غور کرلیا جائے۔"

راجہ صاحب نے کہا "یہ کیسے ہوسکتا ہے! مجھے سب کام اُصول کے مطابق ہی کرنے ہیں۔"

اب راجہ سودھن لال نے اُس لڑکے سے اگلی عرضی نکالنے کے لئے کہا۔ بھیڑ میں سے پھر آواز آئی "حضور، عرضیاں ہزاروں ہیں اور میری خواہش بہت چھوٹی سی ہے۔ معلوم نہیں میری باری کب آئے گی! میں بہت ہی بدقسمت انسان ہوں۔ ممکن ہے کہ میری باری کبھی آئے ہی نہیں۔ اس لئے حضور، اس پر پہلے غور کرلیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے!" راجہ صاحب نے کہا۔

وہ آدمی پھر چیخ کر بولا "اچھا حضور، میری بات تو سُن لیں۔"

"نہیں" راجہ صاحب بولے۔

مگر وہ آدمی اس پر بھی نہیں مانا اور اپنا پورا زور لگا کر اونچی آواز میں بولا "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ گیرو تال کے جنگلی ٹیلے میں جو بھیڑیا رہتا ہے وہ مار دیا جائے۔"

راجہ صاحب نے حکم دیا کہ اس آدمی کو باہر نکال دیا جائے اور شامیانے کے اندر اس وقت تک نہ لایا جائے جب تک اس کی عرضی نہ نکلے۔

سپاہی اُس آدمی کو پکڑ کر بھیڑ سے باہر لے گئے۔ اس نے جاتے وقت اُسی تیز آواز میں چلا کر کہا "زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے ایک آدمی بھی بندوق لے کر چلا جائے اسے مار گرائے گا۔"

اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ راجہ صاحب نے لڑکے سے عرضی نکالنے کے لئے کہا۔ لڑکے نے ایک اور کاغذ کا ٹکڑا اُس صندوق میں سے نکال کر راجہ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ عرضی پڑھی گئی اور عرضی دینے والے کو بُلایا گیا۔ اسی طرح سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔

اس دوران راجہ صاحب کے منشی اور پرائیویٹ سیکریٹری میں کچھ باتیں ہوئیں۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح تو دو تین دن میں ہی راجہ صاحب کی دولت ختم ہو جائے گی اور تب وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ اس لئے کچھ ایسا انتظام ہونا چاہئے کہ کسی طرح بھیڑیا مارنے والے سوال کو پہلے لے لیا جائے۔ ساتھ ہی راجہ صاحب کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہئے کہ معلوم نہیں بھیڑیا مارنے پر کتنی دولت صرف ہو۔ اس لئے جب تک وہ مارا نہ جائے اس وقت تک اور عرضیوں پر غور نہ ہو۔

مگر وہ عرضی نکلے تو کس طرح نکلے۔ اس کے لئے منشی جی نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ اسی وقت وہاں سے اُٹھ کر اس جگہ گئے جہاں وہ آدمی کھڑا تھا۔ اس سے انہوں نے پندرہ بیس عرضیاں لکھوائیں اور پوشیدہ طور سے اُنہیں لاکر اور سب کی نظر سے بچا کر صندوق میں اس طرح رکھ دیا کہ لڑکا جب ہاتھ ڈالے تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی عرضی اس کے ہاتھ لگ ہی جائے۔

راجہ صاحب نے اپنے ہاتھ میں آئی عرضی کو پڑھ کر پنڈت رام آسرے کو بھیڑ میں سے بُلایا۔ اس کے بعد اُنہوں نے لڑکے کو دوسری عرضی نکالنے کو کہا۔

لڑکے نے اس بار ہاتھ ڈالا تو مُنشی جی کی ترکیب کارگر ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں پیچ پچ سیرو حاٹ کی چٹھی آگئی۔ اس میں لکھا تھا "حضور! میری صرف ایک درخواست ہے۔ گیرو کے تالاب کے جنگلی ٹیلے پر جو بھیڑیا رہتا ہے اسے مار ڈالا جائے۔"

راجہ صاحب کا حکم ہوا کہ بیرو کو اندر بُلایا

وراثت

برطانیہ کے سابق وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل کا تین سو سالہ مکان اب چرچل میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ جس میں چرچل کی کتابیں، تصویریں، مسودے، تحفے، ملبوسات اور جوتے غرضیکہ اُن کے استعمال کی تمام چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ اُن کے زمانے کی ایک بلّی جو اب تک زندہ ہے وہ اُس کرسی پر بیٹھی رہتی ہے جس پر مسٹر چرچل لکھتے پڑھتے تھے۔ اِس بلّی کے علاوہ کسی بھی آدمی کو اِس کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔

جائے۔ بیرو جاٹ فوراً راجہ صاحب کے سامنے لایا گیا۔ راجہ صاحب نے کہا "ہاں، بیرو تم بڑے بیوقوف معلوم ہوتے ہو۔ لیکن میں گیرو تال کے جنگلی ٹیلے پر ایک کے بجائے بیس سپاہی بھیجتا ہوں۔ تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ وہ بھیڑیا مار دیا جائے گا۔"

اس کے بعد راجہ صاحب نے لڑکے سے اور عرضیاں نکالنے کے لئے کہا۔ مگر منشی جی نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا اور راجہ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "حضور، میں نے اس بھیڑیئے کی بہت عجیب کہانی سُنی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ اس کے قبضے میں ایک خوبصورت راج کنیا ہے اور وہ انسان کی آہٹ پاتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا اسرار ہے جسے حل کرنا سپاہیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا سارا خزانہ خالی ہو جانے پر بھی وہ بھیڑیا مارا نہ جا سکے۔ اس لئے آپ دوسرے لوگوں کی خواہش اس وقت پوری کریں جب وہ بھیڑیا مار دیا جائے۔"

منشی جی کی یہ بات راجہ سبودھن لال کو صحیح لگی اور اُنہوں نے حکم دیا کہ سب لوگ گیرو تال کے کنارے چلیں۔ وہیں کیمپ لگایا جائے۔ بھیڑیئے کے مارے جانے پر باقی عرضیوں پر وہیں غور کیا جائے گا۔

یہ تال چترکوٹ کے پاس پہاڑی علاقے میں ہے۔ اِسے گیرو تال اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے چاروں طرف گیرو کی چٹانیں ہیں اور اِن چٹانوں پر سے جب برسات کا پانی بہہ کر آتا ہے تو سارا تال لال ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف ہری بھری پہاڑیوں کے بیچ یہ تال بڑا ہی حسین لگتا ہے۔

اتنا حسین قدرتی منظر راجہ سبودھن لال نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو لوگ چترکوٹ کا سفر کر[تے] ہیں۔ وہ بھی اس تال تک نہیں پہنچ پاتے کیو[نکہ] اس تال تک جانے کا راستہ بہت خطرناک ہے۔ راجہ صاحب کو بیرو جاٹ کی خواہش پوری کرنی [تھی] اس لئے وہ تال کے کنارے تک گئے اور و[ہاں] انہوں نے ڈیرے ڈلوائے۔ اُن کے ساتھ وہ لو[ہے] کا صندوق بھی گیا جس میں سب کی عرضیاں تھ[یں] اور وہ سب آدمی بھی گئے جنھوں نے ا[س] صندوق میں عرضیاں ڈالی تھیں۔

وہاں خاصا پڑاؤ پڑ گیا۔ سب کے لئے [راجہ صاحب] کی طرف سے انتظام ہونے لگا اور اُس بھیڑ[یئے] کی تلاش ہونے لگی۔ اِس عجیب بھیڑیئے کو د[یکھنے] کے لئے خود راجہ صاحب کے دل میں بڑی خواہش جاگ اُٹھی اور وہ بھی اپنے نو[کروں] کے ساتھ پالکی پر سوار ہو کر اس جنگلی ٹیلے کی [طرف] گئے۔

آدمیوں کی آہٹ پاکر بھیڑیا بھاگ نہ جا[ئے] اس خیال سے سب آدمی اس ٹیلے کی طرف آ[تے ہوئے] کیمپ میں ٹھہرا دیئے گئے تھے اور بہت تھو[ڑے] آدمی اس ٹیلے پر چڑھنے پاتے۔ مسلسل چند گھنٹے کی کھوج کے بعد کہاروں نے حیرت ہو کر پالکی رکھ دی اور راجہ صاحب سے اتنا سے کہا "حضور، ذرا اُدھر ٹیلے کی سب سے او[نچی] چٹان پر دیکھئے۔"



راجہ صاحب نے دیکھا، سچ مچ ایک بھیڑیا
ہے اور اُس کے پاس ہی کھڑی ایک
ئی حسین دوشیزہ لمبی بیلوں کے ڈنٹھل میں
ل اور پتّیاں سجا رہی تھی۔ عورت کا اِتنا
، خوبصورت اور پُرکشش جسم اُنہوں نے
بھی نہیں دیکھا تھا۔ اُن کا اشتیاق اِتنا بڑھا
رہ پالکی میں لیٹے نہ رہ سکے اور اُٹھ کر بیٹھ گئے
بیٹھتے ہی اُنھیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ کبھی بیمار ہی
تھے۔ اُنہیں محسوس ہوا، وہ ابھی ابھی سو کر اُٹھے
اس وقت اُنہیں اپنا جسم اُس تندرست اِنسان
رح محسوس ہو رہا تھا جو گہری نیند کے بعد اُٹھتا
راجہ صاحب نے پالکی میں بیٹھے ہی بیٹھے اپنی
بین مانگی اور اُس سے اُنھوں نے جنگلی ٹیلے پر
ی اُس اِنسانی مورت کو غور سے دیکھا۔

پورانوں میں اُنہوں نے دیو کنیاؤں کے بارے
پڑھا تھا۔ بچپن میں اُنہوں نے پریوں اور شہزادیوں
ہانیاں سُنی تھیں۔ لیکن ٹیلے پر کھڑی ہوئی وہ دوشیزہ
ں اُن شہزادیوں اور پریوں سے کہیں زیادہ حسین
پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ "وہ حسینہ کون ہے؟ وہاں
ٹیلے پر اس بھیڑئیے کے قبضے میں کس طرح
؟ میر جاٹ اِس بھیڑئیے کو کیوں مروانا چاہتا
ے؟" اِس طرح کے بہت سے سوال اُن کے
ں میں طوفان کی طرح اُمنڈنے لگے۔ اُنہوں نے
جاٹ کو بُلوایا اور اُسے بھی وہ منظر دِکھا کر

پُوچھا "کیا یہ وہی بھیڑیا ہے؟"
"ہاں سرکار، وہی ہے"
"تو تُو اُسے کیوں مروانا چاہتا ہے؟"

"حضور، میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ یہاں میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ میرے باپ آپ ہی کے یہاں مُلازم تھے۔ میں چھوٹا ہی تھا کہ وہ مر گئے۔ میری بیوہ ماں نے کسی طرح مجھے پالا پوسا اور آپ کے مرحوم پتا جی سے مُجھے کچھ کھیت اِسی تال کے کنارے کھیتی کرنے کے لئے دلائے میری ماں نے باپ کی ساری کمائی دے کر میرے لئے ایک لڑکی خریدی اور میرا گھر بسایا۔ اس کے بعد میرے ایک لڑکا ہوا۔ اس لڑکے کی شادی ہزار کوششوں پر بھی نہیں ہوئی۔

"میں لکڑی اور چارے کی تلاش میں برابر ٹیلے پر جاتا تھا اور اس بھیڑئیے و اس کے ساتھ رہنے والی لڑکی کو دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے لڑکے کی شادی اس لڑکی کے ساتھ ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے اور اس کی کوئی ذات پات بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھیڑیا میرے اس کام میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ مار ڈالا جائے۔"

"ہوں" راجہ سبلو دھن لال نے کہا۔ انہوں نے دوُربین اُٹھا کر پھر اس بھیڑئیے کی طرف دیکھنے

یہ آگیا ہے یہاں کون . . .

یہ آگیا ہے یہاں کون سا فسونِ معصوم
کہ ٹھنڈی پڑ گئی دوزخ کے بھی عذاب کی آنچ

سحر کی تازہ دمی، چڑھتی دھوپ کی گرمی
تری نگاہ کی ٹھنڈک، ترے شباب کی آنچ

رُکی رُکی سی لبِ شوق پر ہے عرضِ وصال
کہ پھونک دے نہ ترے زیرِ لب جواب کی آنچ

شعاعیں پھوٹ کے جیسے فضا میں گُم ہو جائیں
چھلکتے جام میں ہے یہ چشمکِ حباب کی آنچ

یہ مہر و ماہ بھی اُڑتے ہوئے شرارے رہے
کہ عرش تک ہے محبت کے پیچ و تاب کی آنچ

سمیٹ رکھے ہیں روح القدس نے پر اپنے
پہنچ رہی ہے کہاں تک اس اضطراب کی آنچ

—— فراق گورکھپوری

کی کوشش کی، لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید آدمیوں کی آہٹ پاکر دونوں غائب ہو گئے تھے۔

جاٹ اس بھیڑئیے اور لڑکی کے بارے میں بیرو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکا۔ لیکن راجہ صاحب اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے بے چین ہو اُٹھے۔ اسی لئے وہ اُس گاؤں میں گئے جہاں بیرو جاٹ رہتا تھا۔ گاؤں کی حالت بہت خراب تھی راجہ صاحب نے تمام گاؤں چھان مارا۔ مگر ایک بھی گھر ایسا نہ مِلا جس میں وہ دو چار دن ٹھہر سکیں۔ ہر کمرہ خراب، ہر دروازے پر کوڑا اور ہر آدمی بھوکا اور بیمار اُس گاؤں کی یہی حالت تھی۔

وہ گاؤں کتنا بھدّا تھا اور وہاں کے لوگ کتنے دُبلے پتلے، گندے اور بدشکل تھے! اتنا ہی نہیں، اُس گاؤں کے لوگوں نے جس مٹی پر ہاتھ لگایا وہ بھی ان ہی کی طرح منحوس ہوگئی۔

ان کے کھیتوں میں نہ تو ہریالی تھی نہ تازگی چاروں طرف نحوست چھائی ہوئی تھی جیسے لوگ دُبلے پتلے تھے۔ اُسی طرح اس گاؤں کے جانور بھی دُبلے پتلے تھے۔ کیا یہی گاؤں ہے جہاں سے راجہ صاحب کے گھر میں سونے چاندی کے ٹکڑے جا جا کر جمع ہوتے ہیں؟ راجہ صاحب نے گاؤں والوں سے پوچھا کیا "سارے گاؤں اور وہاں کے رہنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

گاؤں والوں نے کہا "حضور، کئی گاؤں تو اور بھی گئے گُذرے ہیں۔ یہ گاؤں پھر بھی اچّھا ہے۔"

راجہ سبودھن لال کو اتنا غصّہ آیا کہ وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کانپنے لگے۔ اُنہوں نے گرج کر کہا "یہ گاؤں ہے یا جہنّم! تم سب جانور ہو"

گاؤں والے ڈر کے مارے کانپنے لگے جس کے نوکر جا کر انہیں خوفناک دکھائی دیتے تھے، آج وہ خود سامنے کھڑا تھا۔ اب کیا ہو بے چاروں کی گھگّی بندھ گئی۔ راجہ صاحب کو ان



"اچھا تو اب ہمیں ان فائلوں کی طرف بھی دھیان دینا ہوگا!"

کے ساتھ ہی اُن پر رحم بھی آیا۔ وہ بولے "تم لوگوں نے بھی ہمارے پاس کوئی عرضی بھیجی ہے؟"

"حضور، ہم لوگوں نے کوئی عرضی نہیں بھیجی ہے۔"

"کیوں؟" راجہ صاحب نے پوچھا۔

"ہمارا خیال ہے کہ ہم کسانوں کی راج دربار میں کبھی شنوائی نہیں ہوتی۔ ہم صرف محنت کرنے، لگان دینے اور قرض ادا کرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

راجہ صاحب پریشان ہو گئے۔ رہ رہ کر اُن کے ذہن میں سوال اُٹھنے لگا بھیڑیئے کے ساتھ رہنے والی وہ لڑکی اتنی حسین کیوں ہے اور اسی ٹیلے کے نیچے رہنے والے اس گاؤں کے لوگ اِس قدر گندے اور بدشکل کیوں ہیں؟

اُنہوں نے سوچا "شاید وہ دیوی ہو اور یہ کرموں کا پھل بھوگنے والے انسان۔" انہیں کچھ اطمینان ہوا اور انہوں نے اس لڑکی کے بارے میں باتیں کرنی شروع کر دیں۔ گاؤں والوں میں جو بوڑھے تھے، اُنہوں نے بتایا کہ تقریباً اُنیس بیس برس پہلے ایک بھیڑیا ایک کسان کی دودھ پیتی بچی کو اُٹھا لے گیا تھا۔ کسان کی بیوی لڑکی کو دھان کی مینڈ کے پاس سُلا کر دھان کاٹ رہی تھی۔ اُسی وقت ایک بھیڑیا آیا اور اُس بچّی کو اُٹھا لے گیا۔ بے چارہ کسان اور اُس کی عورت رو دھو کر چپ ہو گئے۔ بعد میں اکثر لوگوں نے اس بھیڑیئے کو لڑکی کے ساتھ دیکھا مگر کوئی اُس کو پکڑ نہیں سکا اور نہ لڑکی کو ہی چھڑا سکا۔ ممکن ہے کہ وہ وہی لڑکی ہو اور وہ بھیڑیا بھی وہی ہو۔

راجہ صاحب کے حکم سے وہ کسان بُلایا گیا جس کی لڑکی کو بھیڑیا اُٹھا لے گیا تھا۔ اُس کے اور بھی لڑکے لڑکیاں تھیں۔ راجہ صاحب نے دیکھا کہ وہ بھی بڑے دُبلے پتلے تھے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان میلے کچیلے کپڑے پہنے والوں سے وہ ننگی لڑکی کہیں زیادہ حسین اور صحت مند تھی۔ "اس کا سبب کیا ہے؟" راجہ صاحب نے گاؤں والوں سے پوچھا۔

ایک بوڑھے نے جواب دیا "حضور، جس لڑکی کو بھیڑیا اُٹھا لے گیا ہے اُسے بھیڑنی نے دودھ پلایا ہوگا، پالا پوسا ہوگا۔ کیوں کہ بھیڑیئے کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا، اِس لئے اُن دونوں نے مل کر اس لڑکی کو کھلایا ہوگا، اس کا جی بہلایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکی تندرست اور حسین ہے۔"

راجہ صاحب نے کہا "کیا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے جس سے کہ اس گاؤں کے لوگ خوش حال ہو سکیں؟ میں یہ بات ضرور جاننا چاہتا ہوں۔"

ایک بوڑھے نے کہا "حضور، یہ بات تو آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ آپ ہم سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ ہم تو کچھ نہیں جانتے۔"

راجہ صاحب پریشان ہو گئے اور کسی طرح اس گاؤں میں دو تین دن کاٹ کر اپنے ڈیرے پر لوٹ آئے۔

راجہ صاحب پھر اپنے کچھ قابلِ اعتماد لوگوں کو ساتھ لے کر پہاڑی ٹیلے کا چکّر کاٹنے لگے لیکن اُنہیں اس بھیڑیئے اور اس لڑکی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

کئی دن لگاتار گھومنے کے بعد ایک دن راجہ صاحب بہت تھکے ماندے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے کہ یکایک اُن کے کانوں میں کسی کے سسکنے کی آواز آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں سے تھوڑی ہی دُور پر وہ لڑکی کھڑی سسک سسک کر رو رہی ہے اور بھیڑیا مرا پڑا ہے۔

وہ اُسی وقت اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور اس لڑکی طرف بڑھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ وہ وہاں سے بھاگ کر گپھا میں گھس گئی اور جیسے برسات کی اندھیری رات میں گھنے بادلوں کے بیچ میں بجلی چمک کر چھپ جاتی ہے اور مسافر کے لئے پھر گہرا اور گھنا اندھیرا چھا جاتا ہے، بالکل ویسا ہی

راجہ صاحب کو بھی معلوم ہوا۔ وہ بہت دیر تک اس گپھا کے پاس کھڑے رہے اور پھر اپنے ڈیرے پر چلے آئے ایک دن انہوں نے کتنے ہی بیش قیمت کپڑے اور گہنے لے جا کر اس گپھا کے سامنے رکھے اور باہر کھڑے ہو کر یہ دیکھنا شروع کیا کہ وہ لڑکی ان گہنوں اور کپڑوں کا کیا کرتی ہے۔

جیسے ناسمجھ بچّی اپنی ماں کے گہنوں اور کپڑوں کو دیکھ کر اپنے جسم کو بے ڈھنگے طریقے سے سجانے کی کوشش کرتی ہے، راجہ صاحب نے دیکھا کہ ویسے ہی وہ لڑکی ان کپڑوں اور گہنوں سے خود کو سجانا چاہتی ہے۔ راجہ صاحب دم بخود رہ گئے۔

ایک دن وہ لڑکی راجہ صاحب کے اِتنے نزدیک آگئی کہ اُنہوں نے اُسے پکڑ لیا اور پھر نہیں چھوڑا۔ اپنے ہاتھ سے ایک بیش قیمت رنگین ساری پہنا کر وہ اُسی گاؤں میں لے آئے جہاں سے بھیڑیا اُسے بچپن میں لے بھاگا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس لڑکی کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ قریبی دیہات کے لوگ بھی اُسے دیکھنے کے لئے آئے۔ راجہ صاحب کے کیمپ میں جو لوگ تھے، وہ سب بھی وہاں پہنچے۔

کسانوں نے کہا کہ اس لڑکی کو اگر بھیڑیا نہ اُٹھا لے جاتا تو یا تو یہ مر جاتی یا اسی طرح سے دُبلی پتلی اور غریب ہوتی جیسے کہ اس کے بھائی بہن ہیں۔

راجہ صاحب نے اُس غریب کسان اور اُس کے بچّوں کو دیکھا جن سے الگ ہو کر وہ بھیڑیئے کی گپھا تک پہنچی تھی۔ ان پر راجہ صاحب کو رحم آیا۔

انہوں نے دِل ہی دِل میں کہا "اس گاؤں کی غریبی اور بدصورتی کی بہت کچھ ذمہ داری مجھ پر بھی ہے۔ آخر یہ گاؤں میری ہی عمل داری میں ہے۔ خود بھوکے ننگے اور گندے رہ کر اس گاؤں والوں نے سونے اور چاندی کے ٹکڑے میرے محل میں بھیجے ہیں وہاں جو رونق، چمک دمک اور عیش و آرام کے ذرائع موجود ہیں، اُن کا سرچشمہ تو یہی ہیں اور جس طرح اس گاؤں سے ہمیں محل میں رہنے کی سہولت ملی اسی طرح کیا میرا یہ فرض نہیں تھا کہ میں بھی اِس گاؤں کی طرف دیکھتا اور اسے خوبصورت بنانے کی کوشش کرتا۔

اچانک جیسے ان کے سامنے سے اندھیرا چھٹ گیا اور اب وہ نئی زندگی میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگے۔ اُنہوں نے عہد کیا کہ اب وہ اپنے باقی وقت میں زیادہ نہیں تو کم از کم اِس گاؤں کو خوبصورت بنانے میں تو ضرور لگائیں گے۔

وہ اس لڑکی کو لے کر نزگڑھ واپس پہنچ گئے۔ اسے اُنہوں نے پڑھنا لکھنا سکھایا اور آخر میں وہی لڑکی نزگڑھ کی رانی بن گئی۔

راجہ سبودھن لال بہت دِن تک زندہ رہے، جیوتشی کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ ایک طرح سے وہ پچ بھی تھی۔ یعنی اِس نقطۂ نظر سے کہ اب راجہ سبودھن لال بالکل دوسرے ہو گئے تھے۔ وہ دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کرنے والے رئیس نہیں رہ گئے تھے، بلکہ اب وہ خود بھی دوسروں کو سُکھی بنانے کی کوشش کر رہے تھے، اور اسی لئے بہت سُکھی تھے۔

شاید جیوتشی کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جس اِنسان کی زندگی میں محبت، جوش اور اُمنگ نہیں ہے وہ تو مُردوں سے بھی بدتر ہے۔ اب تو راجہ صاحب اکثر یہی کہا کرتے ہیں "اگر میں اِس پاگل جستجو کے لئے نِکل نہ پڑتا تو شاید موت تو نہ آتی ہاں، میں خود ہی خودکشی کر لیتا۔ بھلا وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو پیار و محبت سے یکسر خالی ہو؟"

●

آپ کے مسائل

میرا چھوٹا بھائی دوسری جماعت میں پڑھتا ہے لیکن وہ سب کو بہت بڑی بڑی گالیاں دیتا ہے۔ اُس کی اِس عادت کو چھڑانے کا کوئی طریقہ بتا دیجئے۔

—— منی مالا بہل، امرت سر

• اکثر ہوتا ہے کہ بچپن میں بچے گالیاں دیتے ہیں تو گھر کے بڑے بوڑھے اُسے ہنسی میں ٹال دیتے ہیں یا خوش ہوتے ہیں۔ اِس طرح بچے میں دھیرے دھیرے گالی دینے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی کو جن حالات میں گالی دینے کی عادت پڑی ہو۔ اُنہیں دُور کرنے کی حتی الامکان کوشش کیجئے۔ پیار اور ہمدردی سے ہی آپ اُس کی اصلاح کر سکتی ہیں۔

•

میری عمر ۲۰ برس ہے بدن ضرورت سے زیادہ بھاری ہے۔ آئندہ دو ماہ میں میں دبلی پتلی ہونا چاہتی ہوں۔ کیا تمام دن بھوکی رہ کر رات کو دو تین چپاتیاں کھانے سے یہ ممکن ہو جائے گا یا اور بھی کوئی ترکیب ہے؟

—— سمیرا، اندور

• بھوکے رہنے سے آپ کو بہت کمزوری محسوس ہوگی۔ اچھا یہ ہوگا کہ آپ آلو، چاول، کیلے اور چینی کھانا چھوڑ دیں کیوں کہ چیزیں چربی پیدا کرتی ہیں دونوں وقت کھانے سے پہلے ایک پلیٹ سلاد یا سبزیوں کا شوربہ لیجئے۔ اِس طرح آپ کو بھوکا بھی نہیں رہنا پڑے گا اور بدن کی چربی کم کرنے کے ساتھ طاقت بنائے رکھنے کے لئے ضروری اشیا بھی مہیا ہوتی رہیں گی۔

•

اگر میں چہرے کے غیر ضروری بال صاف کرنے کے لئے کوئی بال صفا کریم یا صابون استعمال کروں تو کوئی نقصان تو نہیں ہوگا؟ میرے چہرے پر بال ہیں اور مہاسے بھی ہیں اور میں دُبلی پتلی بھی ہوں۔

—— فیروزہ، دھنباد

• چہرے کے بالوں کو صاف کرنے کے لئے ان کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ چہرے کے بالوں کو اُکھاڑنے کا گھریلو طریقہ کام میں لائیں موم کو پگھلا کر بالوں پر لگائیں۔ جب وہ سوکھ جائے تو موچنے سے پکڑ کر اُکھاڑ دیں لیکن اس میں معمولی تکلیف ہوتی ہے اور یہ مستقل علاج بھی نہیں ہے مستقل طور پر بالوں کو صاف کرنے کے لئے الیکٹرولائسس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ علاج مہنگا بھی ہے۔ اگر آپ آزمانا چاہیں تو پتہ لکھا اور ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنے پر آپ کو کلینک کا پتہ روانہ کر دیا جائے گا۔

مہاسوں کے لئے پیٹ صاف رکھیں اور گرم اور جوش آور اثر والی چیزوں کو کھانے سے پرہیز کریں۔ خوراک میں دودھ، دہی اور سبزیوں کی مقدار بڑھا دیں۔ اس سے آپ کی صحت بھی سدھر جائے گی۔ مہاسوں کو نوچیں نہیں۔ اس سے چہرے پر داغ پڑ جائیں گے۔

مسائل اس پتے پر بھیجئے:—
کمپن معرفت سریتا جھنڈے والاں، رانی جھانسی روڈ، نئی دلّی

مقالہ • ٹی ۔ این ۔ گپت

چار طبقاتی

ہندوستانی نظامِ حکومت

جو ذات پات کی طرح ہندوستانی معاشرے کو جکڑے ہوئے ہے

ہمارے ملک میں ذات پات زندگی کے ہر شعبے پر غالب آچکی ہے ۔ دراصل یہ ایک ایسا گھن ہے جس نے زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو متاثر کیا ہے۔ حالاں کہ صدیوں سے ہمارے سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی اس بُرائی پر قانونی طور پر پابندی لگا دی گئی ہے اور بہت سی سیاسی اور سماجی تنظیمیں بھی اس کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، تاہم کچھ حلقوں میں اِس کوشش کا چنداں اثر نہیں پڑا ہے۔ سوسائٹی تو ایک طرف ہمارے سرکاری نظامِ حکومت میں بھی طبقاتی کشمکش پہلے کی طرح ہی اپنا اثر جمائے ہوئے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر طبقاتی معاشرے کی بنیاد رکھنا ہمارا خاص مقصد رہا ہے، لیکن ہمارے نظم و نسق میں طبقاتی کشمکش کا ایسا بول بالا ہے کہ اُسے دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا کہ ہم اپنے مقصد کو پورا کرنے میں کبھی کامیاب بھی ہو سکیں گے!

ہندوؤں کی چار ذاتوں کی طرح ہمارے سرکاری دفتروں میں بھی سرکاری ملازمین کے چار طبقے ہیں۔ درجۂ اوّل کے سرکاری ملازمین کو حکومت کے سربراہ یا ماہرین کہنا درست رہے گا، کیوں یہ عہد قدیم کے برہمنوں کی طرح ہی نوکرشاہی کے اونچے طبقے میں آتے ہیں۔ ان کا کام بھی پڑھنا پڑھانا، سوچنا اور اظہارِ خیال کرنا یا مشورہ دینا ہے۔ سرکاری دفاتر کے سیاہ و سفید کے یہی مالک ہیں۔ یہ منصوبے بناتے ہیں اور انہیں جامہ پہنانے کے لئے نچلے طبقوں کو بھیج دیتے ہیں۔

اس طبقے کے کچھ افسر تو بالکل اپنے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ یہ دوسروں سے ملنا اور اخلاق و خدمات کے جھمیلوں میں پڑنا پسند نہیں کرتے۔

ان کی مثال پرانے زمانے کے مُنیوں سے دی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رِشی مُنی صرف بے لوث خدمت میں اعتقاد رکھتے تھے، یہ کچھ خود غرضی میں بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح اس طبقے کے اکثر لوگ آپس میں اور نچلے طبقے کے افسروں کے درمیان خلیج بنائے رکھے ہیں۔ دراصل تیسرے اور چوتھے درجے کے افسراِن کے تئیں اچھوت جیسے ہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک پہلے درجے کا افسر پہلے درجے کا اکھّڑ خاں بھی ہوتا ہے۔

سرکاری افسروں کی بڑی تعداد دوسرے درجے میں آتی ہے۔ ان کا کام ہندوؤں کی دوسری ذات ـــــ کھتریوں کی طرح ہی ہے۔ اس درجے میں آنے والے افسروں کا خاص کام اعلیٰ حکام کے ذریعے تیار شدہ منصوبوں کو عملی روپ دینا ہے۔

یہ لوگ اوّل درجے کے افسروں کو بہت نہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن کے منظورِ نظر بنے

رہتے ہیں، لیکن یہ بھی باقی دو درجوں کے حاکموں سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو اپنے ہی درجے کے دیگر افسروں سے برتر سمجھتے ہیں اور کچھ خود کو اوّل درجے کے افسروں سے کم نہیں سمجھتے۔ یہ افسران سرکاری 'برہمنوں' یعنی پہلے درجے کے افسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُن سے مسلسل رابطہ قائم کئے رہتے ہیں۔ بسا اوقات یہ تیسرے درجے کے بڑے افسران سے بھی مل لیتے ہیں لیکن نچلے درجے کے افسروں سے تو، صرف اس موقع کو چھوڑ کر جب ان سے کوئی کام لینا ہو، بالکل ہی الگ رہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقے 'صاحب' کہلاتے ہیں۔ جب دونوں درجوں کے افسر ایک ہی دفتر میں بیٹھتے ہیں تو پہلے درجے کا افسر 'بڑا صاحب' اور دوسرے درجے کا افسر 'چھوٹا صاحب' کہلاتا ہے لیکن 'صاحب' یہ دونوں ہی ہوتے ہیں۔

تیسرے درجے کے ملازم 'بابو' پُرانے زمانے کے بھارتی طبقے — ویشوں — کی طرح ہوتے ہیں اور سرکار کو چلاتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کا یہ طبقہ اتنا ہی اچھا یا خراب ہے جتنا کہ کسی بھی معاشرے کا متوسط طبقہ ہونا چاہئے۔ یہ عوام اور افسروں کے بیچ کی کڑی کا کام کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طبقہ ایک دم بدنام اور بدمعاش ہے۔

ان کی براہ راست کسی معاملے میں ذمّہ داری نہیں ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کوئی ذمّہ داری والا کام کرنا بھی نہیں چاہتے، لیکن ہر سرکاری کام اسی سطح سے شروع ہوتا ہے اور تمام سرکاری کاغذات ان ہی کے ہاتھوں سے گذرتے ہیں۔

اگر یہ طبقہ ٹھیک سے کام انجام نہ دے تو پورے کا پورا سرکاری کام آناً فاناً ٹھپ ہو جائے۔ متوسط درجے کے دوسرے لوگوں کی طرح ہی یہ بھی کچھ لوگوں کے کام افسروں سے کراتے ہیں اور بدلے میں کچھ انعام بخشش لے لیتے ہیں۔

سب سے زیادہ سُست رفتاری اسی طبقے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس طبقے کے زیادہ تر ملازم آگے بڑھنا ہی نہیں چاہتے۔ اگر وہ کچھ ترقی کرتے بھی ہیں تو ایک سمت میں تب تک بڑھتے جاتے ہیں جب تک کہ کوئی خارجی دباؤ، جو اکثر معاشی نوعیت کا ہوتا ہے، ان کو بدلنے کے لئے لگایا نہ جائے۔

اس طبقے کے لوگ چاپلوسی کرنا بھی بہت پسند کرتے ہیں اور اس کا استعمال بھی وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے 'صاحب' کی نظروں میں چڑھنا بہت ضروری ہے۔ ان لوگوں کے لئے غیر قانونی طور پر پیسہ حاصل کرنا کسی مَن سے کم اہمیت نہیں رکھتا اور کسی جگہ کی گھٹیا اوچھی چالیں، جو دلال ذہنیت سے مشابہ ہیں، اس طبقے کے ذریعے استعمال کی جاتی ہیں۔ انہیں بڑے افسر اپنے باپ کی طرح عزیز اور قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ یہ بھی چوتھے درجے کے لوگوں سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے دور ہی رہتے ہیں۔

سرکار کے چوتھے درجے کے ملازمین کا شمار ہندوؤں کی اچھوت ذات میں کرنا مناسب ہوگا۔ سرکاری افسروں کے بیچ یہ طبقہ بالکل اچھوتوں کی طرح ہے۔ یہ ملازمین دفتر کے تمام چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں اس طبقے کے زیادہ تر لوگ سماج کے چھوٹے اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر یہ لوگ اَن پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ان کے بلند ارادے بھی نہیں ہوتے۔ ان کی تنخواہ بھی بہت کم ہوتی ہے، جس کی کمی کو وہ اپنے صاحبوں کے پاس آنے والے لوگوں کی بخشش سے پورا کرتے ہیں۔ لیکن چاہے افسروں کی اکڑ ہو یا بابوؤں کا لالچ ہو یا چپراسی کی بخشش، ان سب کا خمیازہ عوام کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

سرکاری ملازمین کے یہ چار طبقے اپنے کام اور تنخواہ کے مطابق دوسرے مختلف طبقوں میں

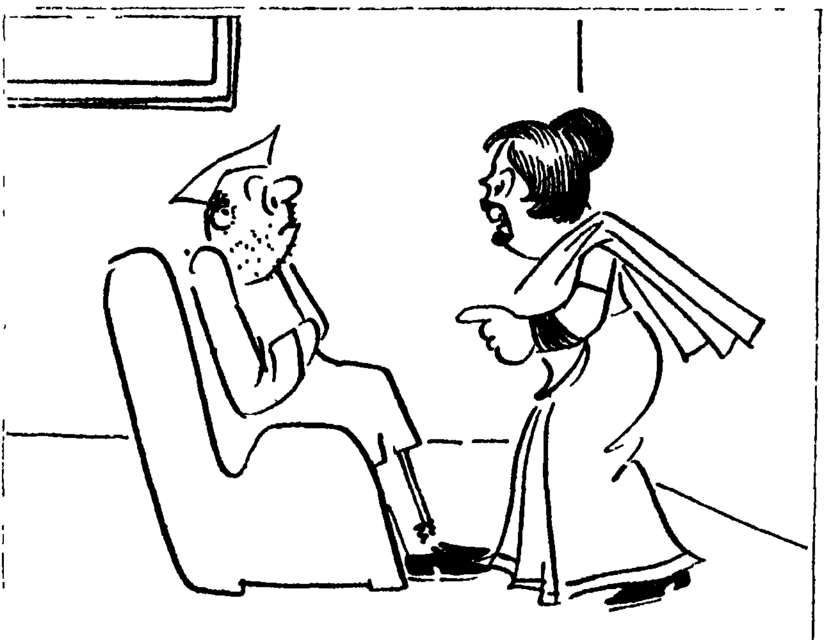
منقسم ہیں۔ سرکاری نوکروں کی اس طرح کی طبقاتی تقسیم سے سماج میں وہی بُرائیاں آگئی ہیں جو ذات پات کے سبب سماج میں پھیلی ہوئی ہیں۔

کیا سرکاری خدمات میں اس طرح کی تقسیم ضروری ہے؟ دراصل یہ ایک قابلِ غور بات ہے۔ صنعتی اداروں میں اکثر تین طرح کے ملازمین ہیں ——— مزدور، انسپکٹر اور افسر۔ لیکن وہاں کی تفریق میں وہ سختی دیکھنے میں نہیں آتی جو سرکاری دفاتر میں ہے۔

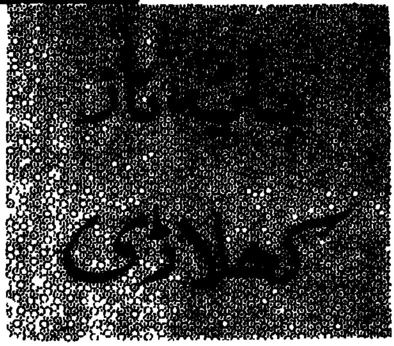
فوج میں جوان اور افسر کے علاوہ کوئی اور طبقہ نہیں ہوتا تب سرکاری خدمات میں ہی چار طبقوں کی تشکیل کرنا اتنا ضروری کیوں سمجھا گیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ حصولِ آزادی کے اُنیس برس بعد بھی اس بُرائی کو دور کرنے کے لئے سرکار نے کچھ بھی نہیں کیا۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حکومت کے کاموں کو ٹھیک طرح سے چلانے کے لئے مزدور، انسپکٹر اور افسر سب ہی کا ہونا بہت ضروری ہے تب بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ گزیٹیڈ سرکاری افسروں میں ایک سے زیادہ طبقہ ہونا کیوں ضروری سمجھا گیا، کیوں نہیں ایک ہی طبقے سے دونوں طبقوں کا کام چلایا جاتا؟

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں کی عادت یا نظم ونسق کی چند بنیادی خامیوں کے سبب یہ سُدھار نہ ہو سکے لیکن جیسے بھی ہو، ہمیں جلد از جلد اس پر غور کر لینا چاہئے اب وقت آگیا ہے کہ سرکار کو اپنے طبقاتی نظام کو سُدھارنا یا ختم کر دینا چاہئے۔ اسے دور کرنے سے ہمارے سماج کو بگاڑنے والے چھوت چھات اور ذات پات کے اثر کو دُور کرنے میں ضرور ہی مدد ملے گی۔ ●



"اس سے پہلے کہ تمہیں گرفتار کے جُرم میں جیل میں ڈال دیں میں تم سے طلاق لے لینا چاہتی ہوں ———"



ہندوستانی ہاکی نے بڑی تعداد میں اعلیٰ پایہ کے کھلاڑی پیدا کئے ہیں۔ لیکن پیٹر جیسے کھلاڑی معدودے چند ہی ہیں۔ پیٹر ہمارا آج کا سب سے اعلیٰ ان سائڈ رائٹ ہے۔

قدرے سیاہی مائل رنگ والا یہ فوجی تقریباً ایک سال سے بہت مصروف ہے۔ ہاکی میں وہ اتنا محو رہا ہے (ملک اور غیر ملک دونوں جگہ) کہ اسے اپنی شادی کے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ کئی ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد واپس لوٹنے پر اب شاید اسے وقت ملے اور وہ اس طرف متوجہ ہو سکے۔

پیٹر کا یہی ایک خوش گوار پہلو ہے۔ لیکن پیٹر کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو پریشان کن ہے اور وہ ہے "کیا پیٹر کا زوال ہو رہا ہے؟"

یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کیونکہ بھارت کے اس نامور کھلاڑی کو ہاکی ٹیم سے باہر رکھنے کی بارہا کوششیں کی جا چکی ہیں۔ ٹوکیو کے اولمپک کھیلوں کے دوران بھی یہ کوشش دوہرائی گئی۔

پیٹر مختصر عرصہ تک ہاکی ٹیم سے باہر رہا۔ لیکن جب اُسے ایک بار ٹیم میں شامل کیا گیا تو اس کی مضبوط پوزیشن اور شاندار کھیل کو دیکھ کر انتخاب کرنے والے بھی اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ اس نے کسی نے انہیں قدرے پریشان بھی کیا۔

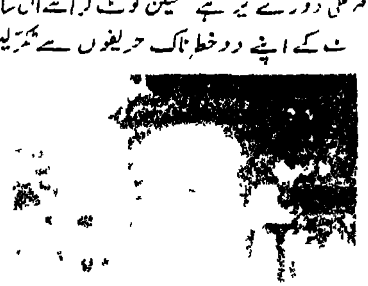
کچھ اسی قسم کے خدشات پیٹر کے پرستاروں کے دلوں میں دوبارہ پیدا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ہر ملکی دورے پر رہے لیکن لوٹ کر اُسے اس سائڈ کے اپنے دو خطرناک حریفوں سے ٹکر لینی

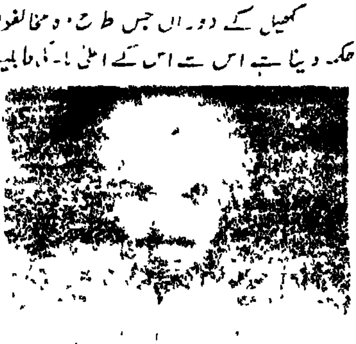
ہوگی۔ یہ ہیں پنجاب کا بلبیر اور آؤٹ سائڈ رائٹ کا سابق کھلاڑی جوگندر۔

جوگندر کو اب ٹیم میں اِن سائڈ رائٹ کے طور پر لے لیا گیا ہے۔ یہ کھلاڑی قابلیت میں پیٹر سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن زوردار شروعات کے ذریعہ مخالفوں پر حملہ کرنے میں یہ پیٹر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انتخابی کمیٹی کے سربراہ مسٹر ناگروالا کی جوگندر پر خاص نظرِ عنایت ہے۔ بے شک بلبیر بھی قابل ہے لیکن پیٹر کے معیار تک پہنچنے کے لئے اُسے وقت چاہیئے۔

یقیناً پیٹر بابو کے پایہ کا کھلاڑی نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے عظیم کھلاڑیوں کا ورثہ اسے ملا ہے لیکن اس کا اپنا ایک مقام ہے۔ جب وہ اپنے کھیل کی بلندی پر ہوتا ہے تو ان سائڈ فارورڈ کے طور پر وہ جو جوہر دکھاتا ہے اس کا جواب دنیا بھر کے کھلاڑیوں میں نہیں ملتا

کھیل کے دوران جس طرح وہ مخالفوں کو حکمہ دیتا ہے اس سے اس کے اعلیٰ پایہ کی قابلیت





کا اندازہ لگتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاس اور آرٹ کی چیز بن گئے ہیں۔ لمبے عرصے سے وہ بھارتی ہاکی کی شان بڑھا رہا ہے۔ فارورڈ کے طور پر دیکھا جائے تو اس کی قابلیت اور ہنرمندی کا ثانی نہیں۔ اس نے کئی بار مخالف ٹیم کی اعلیٰ درجہ کی حفاظتی لائنوں کو توڑ کر تار تار کر دیا ہے۔

اس سب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیٹر میں کوئی خامی نہیں ہے۔ اس میں خامیاں ہیں اور یہی اس کی بڑی دشمن ہیں۔ گول بچانے کی ذمہ داری اندرونی اِن سائڈ فارورڈ کی ہوتی ہے۔ لیکن اس پوزیشن میں پیٹر اس قدر دھیما اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

وہ فارورڈ کھلاڑیوں کی مدد کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اُس کی دی ہوئی گیندوں سے عموماً گول ہو گئے ہیں لیکن سہرا دوسروں کے سر بندھتا رہا ہے۔ اس میں ایک یہ بھی خامی ہے کہ وہ اپنی دھیمی رفتار کی وجہ سے کئی بار مخالف پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ٹیم کو نہیں رہنے دیتا اور کھیل کی ساری سکیم دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ اس کی بے مثال قوت ہے جس کے دم پر وہ گیند کی رفتار پر قابو رکھتا ہے اور دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ سست روی سے کھیل رہا ہے۔

کئی سال [illegible] کھیل کی سکیم بنانے کا وصف سنبھالے رہنے سے پیٹر کو خاص نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ خود گول نہیں کر پاتا اس لئے جب ہم پیٹر کے نام سے وابستہ [illegible] گول دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت نہیں ہوتی۔ حالانکہ ایسے لاتعداد گول کئے گئے جن کا جال بننے میں پیٹر کا خاص ہاتھ تھا۔

ٹوکیو کے اولمپک کھیلوں میں بھارت کو خاص طور پر اسی گول نے بچایا تھا جو پیٹر نے ہالینڈ کے خلاف کیا تھا۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوستان کو چیمپین کی پوزیشن برقرار رکھنے کی امید ہوئی۔ اسی گول سے ہندوستان بی گروپ کے چیمپینوں میں شامل ہوا اور سیمی فائنل میں جا پہنچا۔

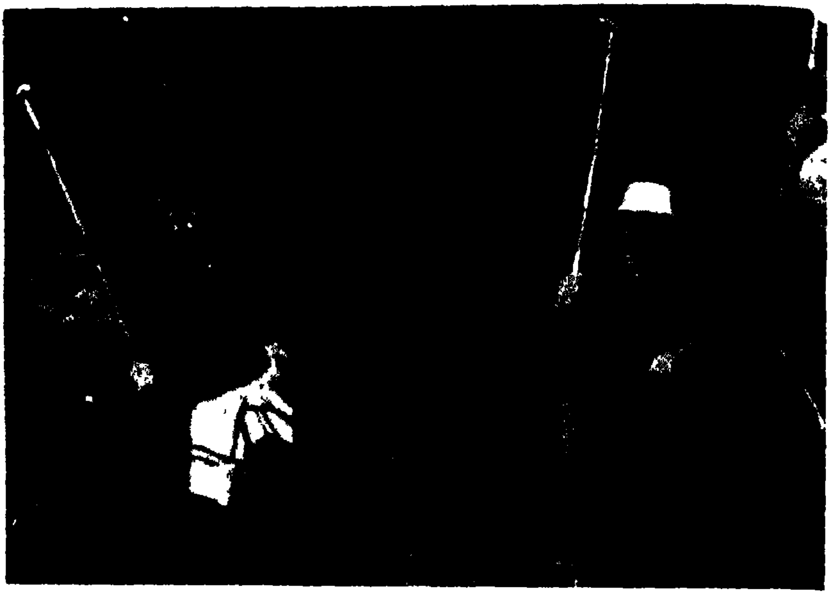
یہ میچ اتنا کشمکش سے پُر تھا کہ انڈین ہاکی فیڈریشن کے پریذیڈنٹ مسٹر اشونی کمار جو بذاتِ خود وہاں موجود تھے، انہوں نے میچ کے بعد کہا کہ ۷۰ منٹ کے میچ کے دَوران آخری سیٹی کی آواز سے زیادہ سُریلی آواز انہوں نے نہیں سُنی۔ ٹیم کے منیجر مسٹر مہاجن اور پیٹر کو لوگوں نے بے پناہ محبت سے گلے لگالیا

پیٹر کے کارنامے صرف ایشیائی اور اولمپک کھیلوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ آخری اولمپک کھیلوں میں، جو ٹوکیو میں ہوئے، پیٹر نے بڑا شاندار اور کارآمد کھیل کھیلا۔ یہ اسی ٹیم میں بھی تھا جس نے پاکستان کے ساتھ آخری میچ کھیلا اور دنیا میں اپنی چیمپین پوزیشن دوبارہ حاصل کی۔

پیٹر کے بارے میں یہ تصور کرنا بڑا مشکل ہے کہ اسے کوئی ضمنی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ جس کھلاڑی نے اس کھیل کے لئے اتنا کچھ کیا اسے باہر رکھنا خودکشی کے مترادف ہوگا پیٹر کو ارجن ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے

یہ کتنی حیرانی کی بات ہے کہ وہ آج تک [illegible] بنگلور کے مشہور [illegible] جس کا شمار [illegible] اس وقت [illegible] ممبر ہے جب [illegible] خدمات کی [illegible] رکھتا ہے۔

فوجی حوالوں میں [illegible] اس میں ایک کھلاڑی کا جذبہ ہے اور [illegible] جو ہمیشہ اپنی ٹیم اور اپنے ملک کے [illegible] ہے۔ اس نے کھیل میں ذاتی غرض سے [illegible] کیا ہے۔ ملک کو ابھی اس کی ضرورت --



والد بزرگوار کے ساتھ پولو کی مشق کرتے ہوئے پرنس چارلس

پرنس چارلس

شہزادہ چارلس اپنے والد ڈیوک آف ایڈنبرا کی طرح پولو کا شوقین کھلاڑی ہے۔ پولو کے کھلاڑی کے طور پر عوام کی توجہ کا مرکز بننے کی اس میں صلاحیت ہے۔

بے شک پولو میں اپنی دل چسپی کے لئے شہزادہ کو اپنے والد پرنس فلپ کا شکرگزار ہونا چاہئے جو اس کھیل کے لئے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ پرنس فلپ کی جب ہندوستان میں تشریف آوری ہوئی تھی تو یہاں بھی آپ کی دل چسپی کے لئے اس کھیل کا انتظام کیا گیا تھا

ساتھ کے فوٹو میں باپ اور بیٹا دونوں اپنے محل کے ہاؤس ہولڈ بریگیڈ پولو کلب کے دوسرے افراد کے ساتھ اس کھیل میں مشغول ہیں

محمد علی (کیسس کلے)

"[illegible] کے چیمپئن کیسس کلے (محمد علی) نے ایک بار [illegible] کر دیا ہے بے شک دنیا بھر میں [illegible] [illegible] اس [illegible] ٹائٹل [illegible] ۲۰ [illegible] [illegible] عالم [illegible] ۱۹ [illegible] فتح حاصل کی

[illegible] ٹائٹل سے محروم کر دیا ہے کیوں کہ اس نے فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے ارادے پر مضبوطی سے اڑا رہا اور اس نے ایک بیان میں کہا " میں اپنا ٹائٹل چھن جانے پر بھی اپنے



محمد علی (کیسیس کلے): کہیں یہ آخری کیک تو نہیں!

ساتھ لے کر جاؤں گا"

کلے کے وکیل نے اس کی طرف سے عدالت میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ جس میں امریکہ کے موجودہ لازمی فوجی خدمت قانون کے پورے ڈھانچے کو چیلنج کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی کلے اپنی موجودہ حالت سے قطعاً غمگیں نہیں ہے وہ ہمیشہ کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ حال ہی میں اس کی ۲۵ ویں سال گرہ پر اس کے پرستاروں نے اسے ایک کیک بطور تحفہ پیش کیا تھا جس کا وزن ۵۷۰ پونڈ تھا اسے تیار کرنے میں ۱۵ انڈے ۱۵۰ پونڈ آٹا اور اسی مقدار میں چینی اور مکھن استعمال کئے گئے تھے۔

اودھم سنگھ

کچھ [illegible] مشہور [illegible] اودھم سنگھ [illegible]

کا کھلاڑی ہے۔ اس وقت وہ پورے ملک کی نمائندگی چاہے نہ کر رہا ہو لیکن وہ اب بھی اپنے وطن پنجاب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ گزشتہ قومی کھیلوں کے دوران بھی وہ پنجاب کی طرف سے کھیلا تھا اور خوب کھیلا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایک سے زیادہ پوزیشنوں میں کھیل سکتا ہے۔ وہ اپنی سٹیٹ کی ۱۹۴۸ سے نمائندگی کر رہا ہے۔ ۱۹۶۴ تک جو بھی ٹیم غیر ملکوں میں گئی وہ اس کا مستقل ممبر رہا تھا۔ وہ ایشیائی اور اولمپک کھیلوں میں بھی شامل ہو چکا ہے۔

۱۹۶۵ کے قومی کھیلوں میں اس نے پنجاب کو فتح یاب بنایا۔ یہ اس کا بڑا خوش [illegible] کا سال رہا۔ آغا خان اور عبید اللہ گولڈ کپ ٹورنامنٹوں میں جن ٹیموں نے [illegible] فتح حاصل کی۔ اودھم سنگھ نے [illegible] کی [illegible]

پرانی دنیا کے
ات عجائبات

بال سرتیا • ابرار محسن

ش جب سکول سے گھر واپس آئی تو عجیب
چہل پہل دیکھی ۔ نوکر اِدھر اُدھر دوڑ رہے
ہے تھے ۔ ڈیڈی مہمانوں کے کمرے میں
ے اُس کی صفائی کرا رہے تھے ۔ ممی
پی خانے میں بہت سی چیزیں پکانے میں مشغول
ں ۔ نازش کتابیں اپنی الماری میں رکھ کر
کے پاس پہنچی اور پوچھا ۔

"کیا بات ہے ممی ؟ یہ آج گھر میں کیا
ہے ؟"

"تمہارے چچا جوزف آنے والے ہیں ابھی
کا تار آیا ہے " ممی نے کہا ۔

"کون ؟ چچا جوزف ——— کرنل جوزف ———
——— نازش خوشی سے اُچھل کر تالیاں
ے لگی " تب تو بڑا مزہ آئے گا "

کرنل جوزف ڈیڈی کے بہت گہرے
ست تھے ۔ پہلے وہ فوج میں تھے مگر ریٹائر
کے بعد وہ مختلف ملکوں کی سیر کر رہے
تے تھے نازش اُن کی آمد ... [illegible]
... کیونکہ چچا جوزف جب ... [illegible]
... بھر سارے تحفے لاتے ... [illegible]

[illegible]

ڑکی اور اُس میں سے بھاری بھرکم چچا جوزف
باہر نکلے ۔ ڈیڈی نے چچا کو سینے سے لگایا ۔ نازش
پاس ہی کھڑی تھی ۔ چچا جوزف نے ہمیشہ کی طرح
اسے اٹھا کر کاندھوں پر بٹھا لیا ۔

" ہماری بیٹی نازش تو بہت بڑی ہو گئی ہے "
چچا نے ڈیڈی سے کہا

رات کے کھانے کے بعد چچا جوزف آرام
کرسی پر دراز ہو کر ڈیڈی اور ممی سے
باتیں کرنے لگے ۔ اچانک باتیں کرتے کرتے وہ
چونک پڑے اور بولے " ارے بھئی ۔ ہماری بیٹی
کہاں ہے ؟"

"میں یہاں ہوں " نازش نے کہا جو اُن کی
آرام کرسی کے پیچھے کھڑی تھی ۔

" آہاہا " انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا
اور اُٹھا کر اُسے گود میں بٹھا لیا ۔

" بیٹی اس مرتبہ تم نے کہانی کی فرمائش
نہیں کی ؟" انہوں نے کہا ۔

"کہانی سننے کے لئے ہی تو کھڑی ہوں اتنی
دیر سے " نازش بولی " سوچ رہی تھی آپ اپنی
باتیں ختم کر لیں تب کہوں "

" ہو ۔ ہو ۔ ہو " چچا نے ایک اور قہقہہ لگایا
"بھئی واہ یہ تو بڑی سمجھ داری کی باتیں کرنے لگی
ہے ۔ اچھا تو یہ بتاؤ کس قسم کی کہانی ہو گی "

"چچا جان " نازش نے کہا " اب بادشاہوں
اور پریوں کی کہانیاں اچھی نہیں لگتیں آپ نے
بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے ۔ اُن کے متعلق کچھ
بتایئے ۔ نئی ... اور انوکھی باتیں ۔

[illegible]



"چچا جان ، مارش نے کہا " اب بادشاہوں اور پریوں کی کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

"کہاں ہیں وہ ؟" مارش نے نانی سے پوچھا
"بتاتا ہوں " چچا جوزف نے سنبھل کر بیٹھتے
ہوئے کہا " سنو۔ دنیا کی ان سات حیرتوں میں سے
سب سے پہلا نام " اہرام " کا آتا ہے "
" یہ کہاں ہے ؟ "
" مصر میں۔"
" لیکن " اہرام " کا مطلب کیا ہے ؟
مارش نے سوال کیا
" تم نے مصر کی تصویروں میں کونی شکل کی
چٹانیں دیکھی ہوں گی۔ یہی " اہرام " یا " اہرامِ مصر "
کہلاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں مصر پر جو بادشاہ
حکومت کرتے تھے وہ فرعون کہلاتے تھے۔

اہرام انہی فرعونوں کی قبریں ہیں۔ اس ز
لوگوں کا کچھ ایسا خیال تھا کہ مرنے کے بعد
کسی دوسری دنیا میں جاکر ایک نئی
ہے۔ اس لئے جب کوئی فرعون مرتا
ایک بہت بڑے مقبرے میں دفن کیا
اس میں ہر قسم کی چیزیں رکھ دی
کھانا، کپڑے، سونا چاندی ...
زندہ ہو تو اسے کسی چیز کی تکلیف
علاوہ اس کے بہت سے زندہ
بھی بند کر دیا جاتا
"زندہ غلاموں کو " مارش نے

چچا جوزف نے کہا "اُس زمانے میں فرعونوں کے ہزاروں غلام ہوا کرتے تھے جو اُن کی خدمت کیا کرتے تھے۔ فرعون اُن کے مالک ہوتے تھے اور اُن پر طرح طرح کے ظلم کیا کرتے تھے ۔۔۔ تو ان میں سے بہت سے غلاموں کو دفن کر دیا جاتا تاکہ جب فرعون زندہ ہو تو غلام اُس کی خدمت کرنے کے لئے موجود ہوں۔"

"یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے" نازش نے سہم کر کہا "تب تو غلام مرجاتے ہوں گے؟"

"بالکل۔ وہ سب کے سب مرجاتے تھے۔"

"مگر غلام فرعون کے ساتھ دفن ہونے کو تیار کیوں ہو جاتے تھے؟"

"وہ کر بھی کیا سکتے تھے" چچا جوزف نے سمجھایا "وہ تو غلام تھے جو اپنے آقا کے لئے جیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی مر بھی جاتے تھے۔ انہیں اتنی آزادی کہاں تھی کہ ظلموں کے خلاف آواز اٹھا سکیں؟ کون سنتا اُن کی فریاد؟ اس زمانے میں غلامی کا عام رواج تھا۔"

"تو پھر غلام بھاگ کیوں نہ جاتے تھے؟"

"غلاموں کے لئے سخت قانون تھے۔ بھاگنے والے غلام کی سزا موت تھی۔ اسی لئے کوئی بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ غلام مار ڈالے [illegible] اور [illegible] جاتے تھے۔"

تب نازش نے کہا "اچھا تو پیرامڈ [illegible]"

[illegible]

[illegible] بڑی بڑی چٹانیں لاکر رکھو [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا اس زمانے میں مشینیں تو تھیں [illegible] کی چٹانیں کس طرح وہاں لائی جاتی [illegible]

"بڑا اچھا سوال ہے" چچا جوزف نے [illegible]

کر کہا "ان چٹانوں کو ہزاروں غلام پہاڑوں سے کاٹ کر رسیوں اور زنجیروں سے باندھ کر گھسیٹ کر لاتے تھے۔ بہت سی چٹانیں نیل پر کشتیوں سے لائی جاتی تھیں۔"

"بڑا مشکل کام ہوگا یہ تو؟" نازش نے کہا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ نہ جانے کتنے غلام اِن چٹانوں کے نیچے کچل کر مرجاتے تھے مگر اُن کے مرنے کی پرواہ کون کرتا۔ غلاموں کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر تھی ۔۔۔ ہاں تو مصر میں ایک ایسا ہی بڑا اہرام ہے۔ اُس کا شمار دنیا کے سات عجائبات میں ہوتا ہے۔ جس فرعون کی یہ قبر ہے اُس کا نام 'خوفو' تھا اور وہ تقریباً ساڑھے چھ ہزار برس پہلے مصر پر حکومت کرتا تھا۔ یہ اہرام زمین سے ۴۵۰ فٹ اونچا ہے۔ اِس کو بنانے کے لئے ایک لاکھ مزدوروں اور چار ہزار غلاموں نے تقریباً بیس برس تک محنت کی تھی۔"

"چچا فرعونوں کی ان قبروں میں تو بہت دولت ہوگی؟"

"نہیں، اُسے لوگ نکال کر [illegible]

[illegible]

[illegible] کے بعد بھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوئے باغات۔ دراصل یہ باغات ہوا میں لٹکے ہوئے نہیں ہیں بلکہ [illegible] قسم کے ہیں۔"

نازش مسکرا کر کہنے لگی "میں تو سمجھی تھی کہ وہ ہوا میں لٹکے ہوئے ہوں گے۔"

"اس کی ایک کہانی ہے" چچا جوزف نے کہا "تم نے شہر بغداد کا نام سنا ہوگا۔ یہ عراق میں ہے۔ بغداد سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر پرانے زمانے میں ایک شہر آباد تھا جس کا نام 'بابل' تھا۔ یہ شہر بہت ہی مشہور تھا۔ آج سے لگ بھگ ڈھائی ہزار برس پہلے اس شہر پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اُس بادشاہ نے ایک عورت سے شادی کی جو ایک ایسی جگہ کی رہنے والی تھی جہاں خوبصورت باغات تھے، پہاڑ تھے۔ وادیاں تھیں۔ جھرنے تھے۔ جب وہ عورت ملکہ بن کر بادشاہ کے پاس بابل چلی آئی تو وہاں اس کا دل نہ لگا۔ اُسے ہر وقت وطن کی یاد ستاتی تھی۔ اُسے باغات یاد آتے تھے۔ برف پوش پہاڑوں اور سبز وادیوں کی یاد اُس کے دل کو تڑپاتی تھی۔ وطن کی یاد ملکہ کے دل سے بھلانے کے لئے اس نے ایک محل بنوایا، عالیشان محل، جس کی دیواروں اور محرابوں پر اُس نے باغات لگوائے۔ محل کے اندر اس نے رنگ برنگے پانی کے چشمے لگوائے۔ ملکہ انہیں دیکھتی اور خوش ہوتی تھی۔ اِن باغات میں ہر قسم کے پھلوں کے درخت تھے اور خوشبودار طرح طرح کے پھولوں کے پودے تھے۔ محل کی دیواروں اور فصیلوں پر اُگے ہوئے یہ باغات ہوا میں لٹکے ہوئے ہی معلوم ہوتے تھے اِسی لیے انہیں [illegible] نام دیا گیا تھا۔

"واقعی چچا جان" نازش نے سوچتے [illegible]

[illegible]

"سکندرِ اعظم کون تھا؟" چچا نے پوچھا۔

"یونان کا بادشاہ تھا" نازش نے جھٹ سے جواب دیا "جو ساری دنیا فتح کرنے نکلا تھا وہ ہندوستان بھی آیا تھا اور دریائے جہلم کے کنارے ایک بہادر راجہ پورس نے اُس کا مقابلہ کیا تھا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ابھی بالکل" چچا جوزف نے نازش کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں تو اسکندریہ مصر میں ہے۔ یہ ایک بندرگاہ ہے۔"

"بندرگاہ سمندر کے کنارے ہی ہوتا ہے جہاں سے جہاز آتے جاتے ہیں؟"

"ہاں۔ اسکندریہ بھی بندرگاہ ہی ہے۔ سکندرِ اعظم ہی کے نام پر اُس کا نام اسکندریہ پڑا۔ یہاں کسی زمانے میں روشنی کا مینار تھا جو بہت مشہور تھا۔ یہی دنیا کی تیسری عجیب چیز ہے۔"

"روشنی کا مینار کیا ہوتا ہے؟" نازش نے سوال کیا "یہ کیوں اور کہاں بنایا جاتا ہے؟"

"روشنی کا مینار انگریزی میں 'لائٹ ہاؤس' کہلاتا ہے اور یہ سمندر میں کسی چٹان پر بنایا جاتا ہے۔ اِس کے اوپری حصے سے روشنی پھوٹتی رہتی ہے۔ یہ روشنی رات کے اندھیرے میں سفر کرنے والے جہازوں کو سمندر میں چھپی ہوئی خطرناک چٹانوں سے آگاہ کرتی ہے اور جہازوں کو صحیح راستہ بتاتی ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے اسکندریہ کے پاس ایک شہزادی کا جہاز رات کے وقت چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب گیا تھا۔ تب ہی یہ روشنی کا مینار بنایا گیا تھا۔ اِس مینار کے اوپر رات کے وقت آگ روشن کر دی جاتی تھی۔"

[illegible] بھی روشنی کا مینار [illegible]

[illegible]

"چوتھی عجیب چیز 'ڈائنا کا مندر' ہے" چچا جوزف نے بتایا۔

"ڈائنا کون ؟" نازش نے سوال کیا۔

"روم کے پرانے باشندے دیوی دیوتاؤں ...یں یقین رکھتے تھے۔ ڈائنا بھی ایک دیوی کا ...نا تھا۔ ایک شہر 'ایفیسس' میں ڈائنا کا خوبصورت ...ں تھا جو کبھی دنیا بھر میں مشہور تھا۔ اِس مندر ...کے بہت سے خوبصورت ستون تھے اور اِس ...کے دروازوں کو سونے اور ہاتھی دانت سے سجایا ...تھا۔"

"اچھا اب پانچویں عجیب چیز بتایئے" نازش ...نے حد دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

چچا جوزف نے پائپ کی راکھ جھاڑ کر اس ...میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا "پرانی دنیا کی پانچویں ...عجیب چیز 'موسولس کا مقبرہ' ہے۔ یہ یونان کے ...ایک شہر 'ہیلی کارنیسس' میں ہے۔ موسولس ...ایک بادشاہ تھا۔ اُس کی موت پر اُس کی ملکہ نے ...اُس کی یادگار کے طور پر یہ عالیشان مقبرہ بنوایا تھا۔ ...اسے بنانے کے لئے بڑے بڑے ماہروں کو بلایا ...گیا تھا۔ اِس پر بے شمار دولت صرف ہوئی تھی۔"

چچا جوزف خاموش ہو کر پائپ کے کش ...لینے لگے۔

"باقی دو عجیب چیزوں کے بارے میں کل ...بتاؤں گا" انہوں نے کہا۔

"نہیں۔ چچا جان" نازش نے اصرار کیا ...بہت لطف آ رہا ہے۔ باقی دو چیزیں بھی ...بتا دیجئے!"

"اچھا سنو۔ چھٹی عجیب چیز کا نام ہے 'رہوڈس ...کا مجسمہ'۔ رہوڈس یونان کے مشرق میں ایک ...جزیرہ ہے۔ اِس جزیرے کے لوگ سورج کی ...پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی سورج کے دیوتا کا ...ایک بلند قامت مجسمہ بنایا گیا تھا۔ یہ ۱۱۲ ...فٹ اونچا تھا اور تانبے کا بنا ہوا تھا۔ اِس کے ...ہاتھ میں مشعل تھی۔ مگر افسوس کہ یہ صرف

ساٹھ سال کے بعد ہی ایک زلزلہ آنے سے گر گیا۔ مگر یہ آج تک مشہور ہے۔"

"بہت خوب" نازش نے کہا "اب ساتویں عجیب چیز بھی بتا دیجئے۔"

"ہاں۔ وہ بھی سُن لو" چچا جوزف نے کہا "یورپ میں ایک شہر ہے 'اولمپیا' کسی زمانے میں یہ شہر یونانی تہذیب کا مرکز تھا۔ اُس زمانے میں سارے مشہور فن کار اور فلسفی وہاں جمع ہوا کرتے تھے۔ اِس شہر میں ایک بڑا میدان ہے۔ جہاں کھیل کود ہوا کرتے تھے جنہیں دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ یہ کھیل آج بھی ہوتے ہیں جن میں حصہ لینے کے لئے ساری دنیا سے کھلاڑی جاتے ہیں۔ غرض کہ یہ شہر بہت مشہور تھا۔ وہیں ایک مندر بھی تھا جس میں 'زی یوس' کا مندر بھی تھا۔ اِس مندر میں دیوتا 'زی یوس' کا ایک مجسمہ تھا جو آج سے تقریباً ڈھائی ہزار برس پہلے بنایا گیا تھا۔ یہ مجسمہ ہی دنیا کا ساتواں عجوبہ تھا اور بے انتہا خوبصورت تھا مگر اب نہ تو وہ مندر ہی باقی بچا ہے اور نہ ہی وہ مجسمہ۔"

چچا جوزف خاموش ہو گئے۔ پھر کہنے لگے "دنیا کی یہ عجیب چیزیں 'پرانی دنیا کے سات عجائبات' کے نام سے مشہور ہیں۔ مگر سوائے اہرامِ مصر کے اور کوئی بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اِس لئے میں نے صرف اہرامِ مصر کو ہی دکھایا ہے اور تمہیں اُن کے متعلق بہت تفصیل سے بتایا ہے۔ باقی چھ عجائبات جانے کب کے برباد ہو چکے ہیں۔ ہاں میں نے وہ جگہیں دیکھی ہیں جہاں یہ عجائبات موجود تھے۔ اچھا اب کہانی ختم۔"

"چچا جوزف اب چائے ہو جائے" ...تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد نازش سے کہنے لگے "اب تمہارے چچا سے ہم گفتگو کریں گے۔"

چچا جوزف نے تھاری کی طرف قہقہہ لگا کر کہا "ہاں بیٹی۔ اب سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"



غزل

میرے نہ ہونے سے صورت یہ میکشی کی ہے
اُداس اُداس ہے ساقی، شراب پھیکی سی ہے

ہر ایک مانگنے والے کو کچھ نہ کچھ بخشا
مگر حضورؐ نے ہم پر زیادتی کی ہے

کبھی نگاہِ کرم ہے، کبھی نگاہِ ستم
خطا معاف، ادا یہ تو آپ ہی کی ہے

ہمیں اجل نے پکارا کچھ اِس خلوص کے ساتھ
گماں ہوا کہ یہ آواز زندگی کی ہے

ہمارے خونِ جگر کا بھی ذکر ہو اے کاش
گلوں میں بات کبھی بے وفا کلی کی ہے

بس ایک جام مئے تلخ سا تیا دیدے
بصد ادب کسی میکش نے عاجزی کی ہے

نہیں ہے قابلِ داد ایک شعر بھی شبنم
تو کس گماں پہ پھر تم نے شاعری کی ہے

— نیعہ شبنم میر

آپ کے خطوط

جون ۱۹۶۷ کا سریتا دیکھ کر آپ کے انتخاب
داد دیئے بغیر نہ رہوں گا۔ بیگیٹی بُر دگمان سنگھ)
سائنس فکشن ہے۔ آج کل جو سائنسی ادب تخلیق
ما رہا ہے اُس میں دل چسپی اور کشش نہیں ہوتی
آپ کے یہاں جو سائنسی ادب پیش کیا جاتا ہے
قابلِ تحسین ہے۔ آپ یہ سلسلہ جاری رکھئے کیونکہ
ام محبت اور معاشی بحران کے افسانے اتنے
دہ منظرِ عام پر آتے ہیں کہ مطالعہ کرنے کو جی
یں چاہتا۔

نعیم موسیٰ خاں کا مقالہ 'کیا آپ کو اپنی بیوی
ے محبت ہے؟' آج کل کے شوہروں کا اچھا نفسیاتی
الہ ہے۔ زبانِ خاموش سے اشاروں کنایوں
، قابل قلم کارہ نے بہت عمدہ اور سربستہ باتوں
اظہر من الشمس کر دیا ہے۔

۱۹۶۵ اور ۱۹۶۶ کے گیٹ آپ کو مدِ نظر
تے ہوئے حال کے کچھ شمارے دیکھ کر تو انگشت
دان رہ جانا پڑتا ہے۔ حسنِ ترتیب، آرائش اور
ل صورتی میں یہ اپنی طرز کا واحد جریدہ ہے۔
اس کی ہمہ گیر ترقی کے لئے دست بہ دعا ہوں۔

—— حکیم جمیل احمد، سکندرہ راؤ

●

جون ۱۹۶۷ میں سید شہنشاہ حسین کی
ن 'پچھی ایک ڈال کے' زمانۂ حال کے لئے
عمدہ سبق ہے۔ کاش آج کل کے وزیروں
بی سیانے جیسا ہی حشر ہو۔ گرانی، رشوت
انی، بدعنوانی اور نکما پن کی حکومت اور عوام
ز دیتے ہیں۔ دراصل اُن کو تقویت دینے
میں بدکردار وزیر اور بدطینت سیاست داں
ہی پیش پیش ہیں۔

گنگا پرشاد پانڈے کی کہانی 'وہ دن آئے گا'
بھی ایک عمدہ کہانی ہے۔

حبیب الرحمٰن راہی (لہرایا ہے آنچل) اور
سلطان اختر سہسرامی (لب و رخسار کا رنگ) کی نظمیں
پسند خاطر ہوئیں۔

—— شکیل احمد راز، افضل گڑھ

●

جون ۱۹۶۷ کا اداریہ (موجِ سریتا) بہت
بے باک اور بصیرت افروز ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
ابن الوقت ہیں انہوں نے جن سنگھ کو خوش کرنے
کے لئے اپنے ذاتی اور مذہبی اصولوں کو قربان کر دیا۔

—— کرپال سنگھ آزردہ، چنڈی گڑھ

●

سریتا کا اپریل (۱۹۶۷) کا شمارہ دیکھا۔ آپ
کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہانیاں، نظمیں،
مقالے اور فیچر —— ہر چیز اپنی جگہ خوب صورت،
صاف ستھری اور معیاری ہے۔ اُردو ماہ ناموں میں
سریتا اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ خدا کرے
یہ ہمیشہ اسی طرح اُردو ادب کی خدمت کرتا رہے۔

—— سیدہ فرزانہ، فتح گڑھ (بھوپال)

●

اپریل ۱۹۶۷ کا سریتا زیرِ مطالعہ ہے۔
موجِ سریتا کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔
مقالے ہمیشہ کی طرح بے باک اور جان دار
ہیں۔ خاص طور سے 'تعلیم میں ملاوٹ' (آشارانی دوہرہ)

'ہمارے بچے اور ہم' (بیگم شمیم ذکاء صدیقی) بہت پسند آئے۔ سلمان عباسی کی نظم خوب ہے۔ مایۂ ناز کھلاڑیوں کا سلسلہ اچھا ہے۔ اِسے جاری رکھئے۔ مجموعی طور پر سریتا کا معیار، حسنِ طباعت، نفاست، مواد اور ترتیب لاجواب تھے۔ روز افزوں ترقی کے لئے اپنی پُرخلوص مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

—— مظہر بانو حیا پوری، گلبرگہ (کرناٹک)

•

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کی پسند کا خیال رکھتے ہیں 'آپ کے خطوط' کے تحت بلند ذوق قارئین (جن میں اہلِ قلم حضرات بھی شامل ہیں) جس قسم کے معیاری خطوط آپ کو لکھتے ہیں، ویسی معیاری تحریر اُن قلم کاروں کی بھی نہیں ہوتی جن کی چوتھے درجے کی تخلیقات تیسرے یا چوتھے درجے کے غیر معیاری رسالوں میں شائع ہوتی ہیں۔

گنگا جمنی زبان اور فنی تقاضوں کی بھرپور تکمیل کے ساتھ ہی سریتا کی بیش تر کہانیاں ہوا کرتی ہیں اور مقالے بھی لاجواب۔ لیکن کبھی کسی خاص اور اہم موضوع پر کسی فن کار کی پھیکی (اور کبھی کبھی بے تکی) تخلیق بھی سریتا میں جگہ پا لیتی ہے۔

—— ظہیر نیازی، بھُرکنڈہ (ہزاری باغ)

•

سریتا کا ہر شمارہ اپنے اندر انفرادیت رکھتا ہے۔ یہ آپ کی فنی صلاحیت کا نتیجہ ہے۔ آپ فن کو فن کار پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں

—— مضطر سجادی، کراس گڈھ (دھنباد)

•

اپنے بے باک اداریہ (موجِ سریتا) پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ مئی ۱۹۶۷ کا سریتا ہر لحاظ سے جاذبِ نظر ہے۔ 'طوفان بھرے ارمان' (اوشا رانی) اور 'قدری'، (وِشونا تھ پربھاکر) پسند آئیں۔ 'کہاں ہے آجا' (رعنا صابری) بڑی پیاری اور اچھی نظم ہے۔ —— جمشید، جمشید

•

میں سریتا کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں میرے خیال میں یہ پرچہ ہندوستان کے آ ادب پر ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ بلاشبہ کی نظم و نثر عمدہ ہوتی ہیں۔ میری دعا ہے کامیابی کے ساتھ چلتا رہے۔

—— غلام مصطفےٰ دل،

•

مئی ۱۹۶۷ کا سریتا نظر نواز ہوا۔ ہر دھارا، ہر لہر اپنا الگ وقار رکھتی ہے۔ ساحرؔ کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

مل ہی گیا میکش کوئی مندر مسجد والوں سے
ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا پھوٹ پڑے میخواروں میں

کاویری کیری آپا کا مقالہ 'پڑھائی' بہت پسند آیا۔ —— ش۔ ک۔ نظام۔ جودھ

•

سریتا کا صحت مند ادبی معیار شروع ہی انفرادی خصوصیات کا حامل رہا ہے جس جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ خدا کرے کا یہ مؤقر جریدہ ہمیشہ ملک اور انسانیت کی خدمت کرتا رہے۔ —— علی اکبر آمبوری، مد۔

•

جان او ہند کا مسلسل ناول 'شراب اور' بہت ہی دل چسپ ہے۔

—— اِندر رنگیلی، نیلو کھیڑی اکر

•

پاکیزہ اور اصلاحی ادب پیش کرنے سریتا کو نمایاں مقام حاصل ہے

—— نسیم شرقی، پٹھارد (مغل سرا

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں اپنی رائے لکھئے — ایڈیٹر


سریتا


طویل تحقیق
اور
طویل تجربات کے
کامیاب نتیجے
ہمدرد
قلزم
ہر ناگہانی تکلیف، جیسے اچانک درد، چوٹ،
سوجن، قے، دست، آگ سے جلنے، زہریلے
جانوروں کے کاٹنے کا فوری علاج۔
"قلزم" ہمیشہ پاس رکھیے
ہمدرد مرہم
ہر طرح کی جلدی تکلیف جیسے پھوڑے پھنسی،
گرمی دانے، داد، چھائیاں، آگ یا گرم پانی سے
جل جانے اور چاقو چھری کے زخم میں کام میں آتا ہے
اسے ہمیشہ گھر میں رکھیے
ہمدرد منجن
دانت اور مسوڑھوں کو صاف اور بیماریوں سے
محفوظ رکھنے اور دانتوں میں موتیوں کی سی
چمک کے لیے ہمیشہ پابندی سے
ہمدرد منجن استعمال کیجیے
ہمدرد بام
سر کے درد، نزلہ زکام، سینہ کی جکڑن اور
روزمرہ کی بہت سی تکلیفوں میں کارآمد ہے
ہمیشہ ساتھ رکھیے
صدوری
صدوری کھانسی اور پھیپھڑوں میں بلغم
جمع ہو جانے کی تکلیف کو دور کرتی ہے بچوں
کی کالی کھانسی اور انفلوئنزا کے بعد کی کھانسی
کے لیے شفا بخش ہے۔
ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی — کانپور — پٹنہ
STERLING-HWL-8 51

ماہنامہ

سریتا

سماجی تعمیر نو کا ترجمان

ایڈیٹر اور پبلشر
وشوناتھ

• مالکان دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ نئی دلی کے لئے دلی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ اور دلی پریس، نئی دلی سے وشوناتھ نے طبع اور شائع کرایا۔

• مقام ادارت اور اشاعت۔ دلی پریس، جھنڈے والاں سٹیٹ، رانی جھانسی روڈ، نئی دلی ۱

قیمت

فی پرچہ	..	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ایک سال	..	۱۲ روپے
دو سال	..	۲۲ روپے
تا عمر	..	۱۵۰ روپے

غیر ممالک کے لئے

ایک سال	..	۱۶ روپے
دو سال	..	۳۰ روپے

۹۹واں شمارہ — اگست ۱۹۶۷

کہانیاں

مقالے

نظمیں

فیچر



سریتا کا ہر پرچہ پوری، جانچ پڑتال کے
بعد ڈاک کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس لئے پر
گم ہو جانے کی صورت میں ادارے پر کوئ
ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ پھر بھی شکایت آنے
پر اگر پرچہ سٹاک میں موجود ہوا تو دوبارہ بھیج د
جائے گا۔

اپنی رہائش گاہ بدلنے کی اطلاع اپنے خریدا
نمبر کے ساتھ ہمیں فوراً دیجئے تاکہ
کو وقت پر مل سکے۔

مضمون نگاروں سے

"سریتا" میں لکھنے والے کرم فرماؤں سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مسودہ بھیجتے وقت ٹکٹ لگا اور پتہ لکھا لفافہ بھیجنا نہ بھولیں۔ ان کی عدم موجودگی میں مسودہ واپس نہیں بھیجا جائے گا اور نہ ادارہ "سریتا" پر مسودہ تلف ہونے کی کوئی ذمہ داری عائد ہوگی۔

—— ایڈیٹر





ماں کا پیار بھرا تحفہ . . .

یہ کھانا پکانے کے بہترین وسیلے

کوٹوجم وناسپتی سے تیار کیا گیا ہے۔

وٹامن
اے اور ڈی سے
بھرپور



MODI VANASPATI MFG. COMPANY MODINAGAR (U.P.

سریتا میں قسط وار چھپنے کے بعد قارئین کے بار بار اصرار پر
اب اِدارہ کتابی صورت میں پیش کرتا ہے



طوفان کے بیچ

مصنف : جان او ہند

ہندوستان کی گزشتہ تاریخ
کے چند المیہ اوراق

خاندانِ مغلیہ آخری سانسیں لے رہا تھا کہ مغرب کی جانب سے کالے بادل اُمڈنا شروع ہوئے۔ مُٹھی بھر انگریز، پرتگالی اور فرانسیسی تاجر اِن بادلوں کے ساتھ ہندوستان کے ساحل سے آ لگے۔ آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ہمارے حکمرانوں نے اُن کی جبہ سائی کی. پھر ایک طوفان اُٹھا جو کنیا کماری سے کشمیر تک چھا گیا، اور جب ہمیں ہوش آیا تو ہم اِن غیر ملکیوں کے غلام بن چکے تھے.

اس تاریخی ناول میں آپ کو ہندوستانی بحریہ کی اوّلین داستان پڑھنے کو ملے گی محبت، شجاعت، نفرت اور حسد کی جھانکیاں نظر آئیں گی. افسانے کا رنگین لباس پہنے یہ تاریخی ناول نہ صرف آپ کی دلچسپیوں کا سامان بنے گا، بلکہ نئے ہندوستان کو آئندہ بھی ایسے طوفانوں سے خبردار رہنے کا سبق دے گا...

• بڑھیا کاغذ • بلاک پرنٹنگ • خوشنما گٹ اپ

قیمت: صرف چار روپے

آج ہی اپنا آرڈر روانہ کیجیے

دِلّی بک کمپنی، ایم ۱۲۔ کناٹ سرکس، نئی دِلّی ۱

سنگ مرمر کا بنا ہوا
دنیا بھر میں مشہور تاج کے
نام پر
ہندوستان کی سب سے زیادہ آرام دہ
اور تیز رفتار ریل گاڑی

تاج ایکسپریس

دلی کو مرکز بنا کر
آپ ایک ہی دن میں آگرہ کے
تاریخی شہر اور آس پاس
کے یادگار مقامات دیکھ سکتے ہیں
صبح نئی دلی سے چلئے
اور دس بجے رات کو لوٹ آئیے۔ آگرہ
اسٹیشن سے قابل دید مقامات تک عام قسم کی اور
ایرکنڈیشنڈ بسوں اور گائڈ کی خدمات کا انتظام ہے۔

A Day's Visit to

agra...

NORTHERN RAILWAY



موجِ سریتا

کانگریس کی آل انڈیا کمیٹی نے اندرا سرکار کو ایک عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے۔ حالیہ دِلّی اجلاس میں اس کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کر کے یہ مانگ کی کہ سابق نوابوں اور راجاؤں کے خاص اختیارات اور پریوی پرس وغیرہ ختم کر دئے جانے چاہئیں اب اِندرا سرکار کو کچھ نہیں سوجھ رہا ہے کہ وہ اِس ہدایت پر کیسے عمل کرے؟ اور اگر وہ اِس پر عمل نہ کرے تو عوام کو اپنا سوشلسٹ چہرہ کیسے دکھائے؟

مشکل یہ نہیں ہے کہ اِن سابق حکمرانوں کے ساتھ اُن کی ریاستوں کے ادغام کے موقع پر کچھ وعدے کئے گئے تھے اور ان وعدوں کو ملک کے آئین میں جگہ بھی دی گئی تھی۔ کانگریسی سرکار کی کوئی اپنی غرض ہو تو وہ کسی بھی وعدے سے پھر سکتی ہے۔ اور اِس خاص موضوع پر کمیونسٹوں و دوسرے بائیں بازو کے لوگوں کی مدد سے آئین میں بھی ترمیم کرا سکتی ہے۔ اصلی مشکل تو یہ ہے کہ اگر اِندرا سرکار اس ریزولیوشن پر صدق دِل سے عمل کرنے کا بیڑا اُٹھالے تو ملک میں باقی ماندہ کانگریسی صوبوں میں سے کم از کم دو اور صوبے اُس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور مرکز میں بھی اس کی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔

یہ دو صوبے ہیں گجرات اور راجستھان۔ مدھیہ پردیش کے مہاراجہ ریوا کی طرح گجرات میں بڑودہ کے راجہ اپنے حمایتیوں کے ساتھ کانگریس چھوڑ جائیں تو اس صوبے میں بھی کانگریسی اقتدار کا زوال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح راجستھان میں بھی سکھاڈیا سرکار، جس کی اکثریت بڑی مشکوک ہے، اِن حکمرانوں کے رحم و کرم پر ہے۔

اِندرا سرکار شاید ان دونوں صوبوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ بھی مول لے لیتی۔ اگر اِس معاملے میں خود اس کے لئے خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اندرا سرکار کو لوک سبھا میں جو ۱۸ ووٹوں کی اکثریت حاصل ہے، اُن میں ۱۵ ووٹ (راجہ دنیش سنگھ اور راجہ کرن سنگھ کو ملا کر) سابق حکمرانوں کے ہیں۔ یہ حکمران اور اُن کے حمایتی اگر کانگریس سے الگ ہو جائیں تو اِندرا جی کی گدی کا کیا حشر ہوگا؟ بس اسی ایک خطرے کی وجہ سے اِندرا اور اُن کے حمایتی مندرجہ بالا ریزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد سے بغلیں جھانک رہے ہیں۔

لیکن اِس کا بدل بھی کم پریشان کُن نہیں ہے۔ ۲۰ سال سے مساوات، جمہوریت اور سوشلزم کے جھوٹے نعرے لگانے والی کانگریسی سرکار کو اب کوئی تو ایسا ٹھوس قدم اُٹھانا ہی ہوگا، جسے وہ اپنے سوشلسٹ دعووں کے ثبوت میں پیش کر سکے۔ لہٰذا کانگریس کی ایک خاص رُکن اور پارلیمنٹ کی ممبر شریمتی تارکیشوری سنہا کی یہ نکتہ چینی بالکل جائز ہے کہ سابق حکمرانوں

کے پر یوی پرسوں کا یہ معاملہ کانگریس کے سوشلسٹ دعووں اور ارادوں کی کسوٹی ثابت ہونے والا ہے؛

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ اِندرا سرکار اِس 'سانپ چھچھوندر' کی لڑائی سے باہر کیسے نکلتی ہے۔ ویسے کانگریسی سرکاروں کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہر ریزولیوشن پر عمل کرنا آئینی طور پر لازم نہیں ہے۔ جاگیرداری کے خاتمے تک کے ریزولیوشن پر آج تک پوری طرح سے عمل نہیں ہوا ہے۔ اور نشہ بندی بھی اگرچہ کانگریس کے آئین کا حصّہ ہے، لیکن آج کی کانگریسی سرکاریں صرف پیسے کے لالچ میں اُسے عائد نہیں کر سکی ہیں۔ پھر کانگریس کی آل انڈیا کمیٹی نے 'بنا سپتی گھی' کی صنعت پر پابندی لگانے کا بھی تو ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ لیکن کسی کانگریسی سرکار نے آج تک اُس پر عمل نہیں کیا۔ اس لئے اگر پریوی پرس کا معاملہ (وزیرِ داخلہ مسٹر چوان کے اعلانِ منظوری کے باوجود) بھی کھٹائی میں پڑ جائے تو حیرت کی بات نہیں۔ اس حالت میں کانگریس کو سوتنتر پارٹی کا یہ الزام تسلیم کرنا ہوگا کہ راجاؤں اور مہاراجاؤں کا گروہ سوتنتر پارٹی نہیں، خود کانگریس ہے۔

مغربی بنگال میں آج کل کس طرح کی سرکار کام کر رہی ہے، اِس کی کوئی نہ کوئی دل چسپ مثال روزانہ سامنے آتی رہتی ہے۔ سب سے تازہ مثال ہے گاندھی وادی وزیرِ اعلیٰ اجے مکرجی اور مارکس وادی نائب وزیرِ اعلیٰ مسٹر جیوتی باسو کے باہمی مقابلے کی۔

اب قریب قریب ثابت ہو چکا ہے کہ مغربی بنگال میں دو متضاد سرکاریں ہیں۔ ایک مسٹر اجے مکرجی اور ان کے ساتھیوں کی اور دوسری اکیلے مسٹر جیوتی باسو کی۔

عموماً ہر موضوع پر ان ہر دو صاحبان کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر وزیرِ اعلیٰ صاحب یہ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں افسر کو معطل کر دیا گیا ہے تو جناب نائب وزیرِ اعلیٰ صاحب فوراً اس کی تردید کرتے ہوئے یہ بیان دیتے ہیں کہ اُس افسر کو بحال کر دیا گیا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ صرف نائب وزیرِ اعلیٰ مسٹر باسو ہی سرکار کے تمام محکموں میں مداخلت کرتے ہیں جب کہ وزیرِ اعلیٰ مسٹر اجے مکرجی مسٹر باسو کے محکموں میں بالکل مخل نہیں ہوتے۔ اِس سے بنگال میں آج کل یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے (سرکاری اور عوامی دونوں شعبوں میں) کہ اصلی وزیرِ اعلیٰ تو جیوتی باسو ہیں اور اجے مکرجی ایک 'شو بوائے' ہیں۔

اِس غیر آئینی پوزیشن کا تازہ ثبوت وہ بیان ہے جو جیوتی باسو نے نکسل باڑی کے فساد زدہ علاقے میں مرکزی سرکار کے جاری کردہ ہتھیاروں کی ممانعت سے متعلق حکم کے خلاف دیا ہے۔ مسٹر باسو کہتے ہیں کہ مرکزی سرکار کا یہ حکم مغربی بنگال کے اندرونی معاملات میں براہِ راست دخل اندازی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرکزی وزیرِ داخلہ مسٹر چوان نے یہ حکم وزیرِ اعلیٰ مسٹر اجے مکرجی کے ایماء پر جاری کیا تھا۔ شاید خود مسٹر مکرجی نے (جو بنگال میں قانون، انتظام اور پولیس کے محکموں کے انچارج ہیں) اپنے طور پر ایسا حکم جاری کرنے سے معذرت چاہی تھی۔ جب جیوتی باسو نے مرکزی سرکار کی مخالفت کی تو وزیرِ اعلیٰ نے یہ کہہ کر معاملے کو ٹالنے کی کوشش کی کہ مسٹر باسو کو مرکزی وزیرِ داخلہ کے ساتھ ہوئی میری بات چیت کا علم نہیں تھا۔ اِسی لئے اُنہیں غلط فہمی ہو گئی۔ مرکزی حکم ہمارے معاملات میں دست اندازی نہیں ہے اور ہم اپنی پولیس کے ذریعے اس کی تعمیل کرائیں گے، وغیرہ۔ اِس

کے مطابق کچھ کارروائی بھی ہوئی۔

لیکن یہ سوال پھر بھی بنا رہتا ہے کہ جب مسٹر باسو مرکزی سرکار کو نکسل باڑی میں ہتھیار بند گروہوں کو قابو میں لانے کا اس کا آئینی اختیار بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہیں تو وہ کس منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نکسل باڑی علاقے کے فسادی اُن کی پارٹی کے ممبر نہیں ہیں؟

کیا اس سب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نکسل باڑی کے فسادی صرف چین اور پاکستان کے حامئتی بائیں بازو کے کمیونسٹ ہی نہیں ہیں بلکہ خاص طور سے خود نائب وزیر اعلیٰ مسٹر جیوتی باسو کے ذریعے کھڑے کئے گئے بلوائی اور غدار ہیں۔ ایسی حالت میں مرکزی سرکار کا باسو کے متعلق کیا غرض ہے، یہ بالکل ظاہر ہو جاتا ہے۔

بھارت میں اگر کسی عام مسلمان رہنما سے یہ کہا جائے کہ شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری و موسیقی بھارت کے تمام باشندوں کے تمدنی سرمائے کا اٹوٹ حصہ ہے تو وہ حیرت زدہ ہو کر جواب دے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اُن کی شاعری اور موسیقی تو بھارتی روائتوں اور بُت پرستی کے رجحانات سے لبریز ہے۔ کوئی دین دار مسلمان انہیں اپنے تمدن کا حصہ کیسے مان سکتا ہے؟ ماضی میں بھارت کے کٹر پنتھی اور مولوی ہندوستانی کلاسیکل موسیقی میں دلچسپی لینے والے مسلمان اُستادوں کو بھی، ایک طرح سے کافر ہی مانتے آئے ہیں!

لیکن بھلا ہو مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں کا کہ انہوں نے اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں کے ساتھ ساتھ بھارت کے کٹر مولویوں اور مسلمان رہنماؤں کی آنکھیں بھی کھول دی ہیں ان بنگالی پاکستانیوں نے پاک سرکار کو اپنے یہاں ڈھاکہ ریڈیو سے رابندر موسیقی و شاعری کے براڈکاسٹ پر عائد پابندی واپس لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مشرقی پاکستانیوں کی یہ تمدنی فتح اتنی ہی اہم اور تاریخی ہے جتنی وہ کامیابی جو انہوں نے اپنی مادری زبان بنگلہ کو پاکستان کی دوسری قومی زبان کے طور پر منظور کرا کے حاصل کی تھی۔

حالاں کہ اب رابندر موسیقی و شاعری سے پابندی اٹھاتے ہوئے پاکستان کے براڈکاسٹنگ وزیر خواجہ شہاب الدین نے یہ صفائی دی ہے کہ یہ پابندی صرف ان گیتوں کو براڈکاسٹ کرنے پر تھی جو پاکستان کی روایات اور تمدن کے خلاف ہوں۔ لیکن رابندر موسیقی و شاعری سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ صرف اپنی خفت مٹانے کا ایک بہانہ ہے۔ ورنہ پاکستان کی نہ کوئی علیحدہ روائت ہے اور نہ تمدن

بھارت میں جب سے ہندو کوڈ بل کی رو سے ہندوؤں میں کثرتِ ازدواج کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے تب ہی سے یہ سوال کافی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے کہ ایسی پابندی صرف ہندوؤں پر ہی کیوں عائد کی گئی۔ کیا صرف ہندو ہی اس ملک کے عام شہری ہیں اور دوسرے لوگ بالخصوص مسلمان دوسرے ملک کے شہری ہیں؟ جب ملک کے نظامِ حکومت کو سیکولر کہا جاتا ہے تو محض مذہب کی بنیاد پر عام شہریوں سے متعلق قانون میں امتیاز کیوں؟

یہ سب سوال بہت اہم اور مدلّل ہیں اور ہماری سرکار آج تک اِن کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی ہے اس لئے جب آزاد ممبر آچاریہ کرپلانی نے لوک سبھا میں یہ سوال اُٹھایا کہ زیادہ شادیوں پر پابندی کا قانون مسلمانوں پر بھی عائد کیوں نہیں کیا جاتا تو وزیر قانون مسٹر گووند مینن کو اس سے زیادہ

اور کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ وہ اِس بارے
یں مسلمان خواتین کی رائے جاننے کی کوشش
کریں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سماجی تبدیلی یا
ترقی کا ہر قدم متعلقہ لوگوں سے پوچھ کر ہی اٹھایا
جاتا ہے تو پھر ہری جنوں کے لئے مندروں میں
داخلے اور چھوا چھوت سے متعلق قانون کیوں پاس
کئے گئے ؟ یقیناً اگر آج مندروں کا انتظام کرنے
والوں اور چھوت کو ماننے والے ہندوؤں سے
ان قانونوں کی اجازت مانگی جائے تو وہ ہرگز
ایسی اجازت نہیں دیں گے۔ بہت سے ہری جن
بھی جن کا کرم کے فلسفے پر پختہ اعتقاد ہے،
ان قانونوں کی حمایت نہیں کریں گے۔ لہٰذا یہ
اصول ہی غلط ہے کہ ملک بھر کے لئے کوئی
قانون بنانے سے پہلے اُس فرقے کی اجازت
حاصل کی جانی چاہیئے۔

جمہوریت میں کوئی قانون کسی خاص
فرقے کے نظریئے سے نہیں بنتا، بلکہ پورے
ملک کے عوام کی کثرتِ رائے سے اور زیادہ سے
زیادہ لوگوں کی بھلائی کے خیال سے بنتا ہے
اس لئے کثرتِ ازدواج کی رسم کو ختم کرنے
کے لئے بھی مسلمانوں یا اُن کی خواتین سے
پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف
ملک کے عوام کے خیالات اور زمانے کے
رجحان کو سامنے رکھنا کافی ہوگا۔ اور آج کا
رجحان اور بھارت کی عام رائے کسی بھی فرقے
میں زیادہ شادیوں کے خلاف ہے۔ یہ خود کئی مسلم
ممالک میں اور ہندوؤں میں کثرتِ ازدواج کے
ممانعت ہو جانے سے ثابت ہوتا ہے۔

لہٰذا اِس بارے میں خود پارلیمنٹ
کو بغیر جانبداری سے غور و خوض کرنا چاہیئے
اور آزادانہ طور پر قدم اٹھانا چاہیئے۔ آخر
پارلیمنٹ ہی ملک کے عوام کی نمائندہ جماعت
ہے۔

بھارت

میں کسی صنعت یا ادارے کو
قومی ملکیت قرار دینے کے نام
پر کیسی کیسی بیوقوفیاں کی جاتی ہیں، یہ کلکتہ کی
ٹرام وے کمپنی کو سرکاری انتظام میں لینے کے
فیصلے سے ظاہر ہے۔

یہ انگریزی کمپنی گذشتہ کئی ماہ سے تیرہ
ہزار روپے یومیہ کے خسارے پر چل رہی تھی۔ اس
خسارے کو پورا کرنے کے لئے اُس نے ٹرام
کرائے میں ایک پیسہ بڑھانے کی مانگ کی تھی،
لیکن سٹیٹ کی نئی بائیں بازو کی سرکار نے اسے
یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر کمپنی
کے ڈائریکٹروں نے لندن سے یہ اعلان کر دیا کہ
اُن کے پاس اِس ماہ ملازموں کو تنخواہ دینے
کے لئے پیسہ نہیں ہے۔ سرکار یا تو گارنٹی دے
کر بینک سے روپیہ دلائے یا خود انتظام سنبھال
لے۔ بائیں بازو کی سرکار نے انتظام سنبھالنے
کا ہی فیصلہ کیا اور اس مطلب کا ایک بِل بھی
پاس کر دیا۔

اب حالت یہ ہے کہ کمپنی کو نہ صرف تیرہ
ہزار روپے یومیہ خسارہ ہو رہا ہے بلکہ اس کو
نئی ٹرام لائنوں اور دوسرے ساز و سامان کے
لئے بھاری پونجی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سب
اب سٹیٹ سرکار کو اپنے خزانے سے پورا
کرنا ہوگا۔ اِس کا نتیجہ وہی ہوگا یعنی کرایہ بڑھانا
پڑے گا۔ مغربی بنگال کی سٹیٹ گورنمنٹ کو
کلکتہ میں اپنی بس سروس پر پہلے ہی سے ۱،۵
کروڑ روپے سالانہ خسارہ ہو رہا ہے۔ اب
تقریباً ۵۰ لاکھ روپے سالانہ خسارہ وہ ٹراموے
پر بھی اُٹھائے گی۔ یہ سارا روپیہ عوام کی جیبوں
سے جائے گا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ کمپنی کو ہی اپنے
طور پر خسارہ پورا کرنے کی اجازت دے دی
جاتی ؟ بہرحال اب اِس انقلابی سرکار کو اور
اس کے ساتھ کلکتہ کے عوام پر حقیقتِ حالہ
روشن ہو جائے گی۔ ●

بی۔ سی۔ گھوش

عرب اسرائیلی جنگ کے سبق

عرب ملک اگر لگاتار جنگ جاری رکھ سکتے تو آخری نتیجہ شاید کچھ اور ہوتا

خبر ہے کہ ہن[illegible]ر نے تینوں فوجوں کی چیف آف آرمی کمیٹی کو ہدایت جاری کی ہے کہ وہ مغربی ایشیا میں ہوئی چار روزہ عرب اسرائیلی جنگ کا جائزہ لے۔ بے شک یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ ہے لیکن ساتھ ہی یہ دیکھ کر کچھ حیرت ہوتی ہے کہ ایسی ہدایت خاص طور پر جاری کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس طرح کا مطالعہ ایک روزمرہ کی بات ہوتی اور ہماری فوجیں ہر پرانی اور تازہ جنگ کا مطالعہ کرکے اس سے سبق لیتیں۔

فوجی افسر جن خاص مضامین کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں، اُن میں فوجی تاریخ بڑی اہم ہے مگر ایسی صورت میں علیحدہ طور پر ہدایت جاری کرنے کی نوبت کیوں آئی؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ عام فوجی مطالعے کے مسلسل عمل میں کوئی رُکاوٹ پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے مرکزی سرکار کو اس قسم کی خاص ہدایت جاری کرنی پڑی؟ یا یہ یقین کیا جائے کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کو فوجی معاملات میں عموماً کورے ہیں، لہٰذا انہوں نے جلد بازی میں یہ ہدایت جاری کردی، تاکہ ہمارے فوجی افسران اِس حالیہ جنگ کے مطالعے سے محروم نہ رہ جائیں!

تینوں فوجوں کی چیف آف آرمی کمیٹی کے پاس حالیہ جنگ کے بارے میں شاید اس سے کچھ زیادہ ہی معلومات ہوں گی جتنی کہ عوام تک پہنچ پائی ہیں۔ لہٰذا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس مختصر سی جنگ کا مطالعہ کرے گی اور اس سے ایسے سبق لے گی جو ہماری فوج اور قوم کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں گے۔

پھر بھی اخبارات میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں اُن سے بھی فوجی تاریخ کے طالب علم کچھ واضح سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہمیں اپنی حفاظتی تیاریوں کو بہتر بنانا ہے تو ان سے مناسب فائدہ بھی اُٹھانا چاہئے۔

ماضی میں ہمیں چین اور پاکستان کے ساتھ دو مختصر جنگیں لڑنی پڑی ہیں۔ اور موجودہ واقعات کا رجحان بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہمیں پھر ویسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا وقت کی یہ مانگ ہے کہ ہم اِن حالات کا سامنا کرنے کے لئے خود کو تیار کریں۔

فوجی سائنس کا یہ مقولہ ہے کہ کسی بھی جنگ



محاذِ جنگ پر توپ کا منہ پھیرتے ہوئے اسرائیلی سپاہی

ں آخری فتح اس فریق کو حاصل ہوگی جس کے
ں تین طاقتیں مقابلتاً زیادہ ہوں گی: انسانی
اقت، مادّی طاقت (جنگی ساز و سامان) اور
لی طاقت (بلند حوصلگی)۔ اب جائزہ لیا جائے کہ
قولہ حالیہ مغربی ایشیائی جنگ میں کہاں تک
یحیح ثابت ہوا۔

ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے پاس
انسانی طاقت اور مادّی طاقت تو تھی
مگر بھی اُن کی بڑی طرح شکست ہوئی۔ کیا اس سے
ثابت ہوتا ہے کہ یہ اصول اب بوسیدہ اور
قیانوسی ہو چکا ہے۔ اور یہ ثابت کرتا ہے کہ
موجودہ جنگوں میں ایک قلیل التعداد لیکن اعلیٰ
بیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج اپنے
سے کئی گُنا زیادہ لیکن مقابلتاً کم تربیت یافتہ اور
ر اسلحہ سے لیس فوج کو شکست دے سکتی ہے۔
یکن گہرائی میں جا کر مطالعہ کرنے سے ثابت
ہوگا کہ یہ اصول آج بھی صحیح ہے۔ عربوں کو جن
وجوہات کی بنا پر شکست ہوئی اُن کا ذکر اِس
اصول میں نہیں ہے۔

عربوں کی شکست کی پہلی اور خاص وجہ ہے
سیاسی بدنظمی۔ اگر صدر ناصر کا ارادہ اسرائیل
کو بیچ بچ صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا تھا تو اسے
اِس کی تیاری بڑے پوشیدہ طور پر کرنی چاہئے
تھی۔ اس کی ساری سکیم پوشیدہ رکھنی چاہئے
تھی اور اس پر عمل بھی پوشیدہ طور پر اچانک
کیا جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس کی بجائے انہوں
نے دھواں دھار تقریروں کا سہارا لیا تاکہ دوسرے
عرب ممالک کی حمائت حاصل کر سکیں۔ کچھ بھی ہو
انہوں نے وقت سے پیشتر اپنے ارادوں کو
اسرائیل پر بے نقاب کر کے حملہ کرنے میں اُسے
پہل کرنے کا موقع دیا۔

ناصر نے ایک بنیادی اصول کو بالائے
طاق رکھ دیا۔ وہ اصول ہے دشمن پر اچانک

حملہ کرنے کا۔ اسرائیل نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور بلا کسی پیشگی اطلاع کے عربوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ اسرائیل نے نہ صرف عرب فوجوں کو اچانک محاصرے میں لے لیا بلکہ اپنے اچانک ہوائی حملوں کے ذریعہ عرب کی ہوائی فوج کو بھی بے کار کر دیا۔ اسرائیلی فوجوں نے یردن اور سینائی کے علاقوں میں تیز رفتاری سے پیش قدمی کی اور عرب فوجیں کچھ اس طرح بے خبری کے عالم میں حملے کا نشانہ بن گئیں کہ وہ کسی بھی مورچے پر جم کر مقابلہ نہ کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں اسرائیل نے اپنی اچانک کارروائی کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور ہر مورچے پر عرب فوجیں یا تو جان بچا کر بھاگ کھڑی ہوئیں یا بڑی طرح شکست کھا کر ہتھیار ڈالنے لگیں۔

صدر ناصر نے بعد میں یہ صفائی پیش کی کہ امریکہ اور روس نے انہیں پہل کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صدر ناصر نے ان بڑی طاقتوں سے یہ کیوں نہ پوچھا کہ اسرائیل کی طرف سے پہل ہونے کے امکان کے خلاف وہ کیا گارنٹی دیتی ہیں؟ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے کہ اسرائیلی حملے کے بعد ان بڑی طاقتوں نے صدر ناصر کی کوئی مدد نہیں کی۔ لہٰذا جو کچھ ہوا اُس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صدر ناصر نے اُن کی بات پر یقین کر کے اور اپنی فوجی سہولتیں قربان کر کے خوفناک سیاسی غلطی کی۔

اِس سلسلے میں اُن واقعات کو سامنے رکھ کر کچھ موازنہ کیا جا سکتا ہے جو تقریباً اُن ہی حالات میں ہمارے ملک میں بھی رونما ہوئے۔ ہندو چین کے جھگڑے کے دوران نہرو صاحب نے بھی تو قریب قریب کچھ ایسا ہی قدم اُٹھایا تھا۔ انہوں نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے بھارتی فوج کو یہ حکم صادر فرمادیا کہ چینی گھس پیٹھیوں کو طاقت کے ذریعہ نکال باہر کیا جائے۔ جب کہ ہم نہ تو اس کے لئے تیار تھے اور نہ ہمیں پورے طور پر چینی طاقت کا علم تھا۔

ہمیں اِن غلط سیاسی فیصلوں کا تباہ کن خمیازہ بھگتنا پڑا کیوں کہ جس وقت ہم نے وہ فیصلہ کیا تھا تب اسے عملی جامہ پہنانے کی قوّت ہمارے اندر نہیں تھی۔ صدر ناصر کے سامنے ہمارے اس تلخ تجربے کی مثال موجود تھی اس کے باوجود انہوں نے غلطی کی۔ لیکن ایک بات پھر بھی اُن کے حق میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے تئیں سچے اور وفادار تو رہے۔ انہوں نے کمال جرأت سے اِس شکست کی مکمل ذمہ داری اپنے ہی کندھوں پر لی۔ اور جنگ میں ناکام رہنے پر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیکن نہرو صاحب نے ہند چینی جنگ میں شکست کے بعد ایسا کوئی قدم اٹھانا ضروری نہیں سمجھا۔

اس سے پیشتر زمانۂ امن کے دوران نہرو صاحب کئی مرتبہ استعفیٰ کی پیش کش کر چکے تھے لیکن جب کبھی ان کی غلطیاں نمایاں طور پر سامنے آئیں انہوں نے کبھی استعفیٰ نہیں دیا۔ قریبی واقف کار حلقوں کا کہنا ہے کہ کئی مرتبہ [illegible] دینے کے باوجود پنڈت نہرو نے ایک بار بھی صدق دلی سے استعفیٰ کی پیش کش نہیں کی تھی وہ جب بھی اس قسم کی باتیں کرتے تھے تو اُن کا محض ایک طفلانہ مظاہرہ یا من بہلاؤ ہوتا تھا اور اس کے ذریعہ وہ اپنی خود پسندی کو سہارا دیا کرتے تھے۔

بھارتی [illegible] ات کے ساتھ ساتھ اس پہلو سے بھی موازنہ کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] کی پوری سہولتیں میسر ہوں تو اُس سے [illegible] اُن سے پورا فائدہ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے



یردن کی سرحد پر یلغار کرتے ہوئے اسرائیلی سپاہی

ہند و پاک جنگ کے دوران ہم نے خاص پاکستان
سرزمین پر اچانک حملہ کر کے دشمن کو بے خبری
میں جا دبوچنے کی کارروائی تو کی۔ لیکن اس کا
پورا فائدہ اٹھانے میں ہم ناکام رہے۔

ہماری سرکار نے پروپیگنڈہ کر کے لوگوں
کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی کہ ہم تو
پاکستانی علاقے میں دور تک جانا ہی نہیں چاہتے
تھے۔ بلکہ ہمارا تو صرف یہ ارادہ تھا کہ پاکستانی
فوج کو میدان میں لا کر تباہ کر دیا جائے۔
لیکن اس بات کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ
نہیں ہے۔ عوام کو آج بھی علم نہیں کہ اس جنگ
میں ہماری ناکامیوں کے اسباب کا گہرا مطالعہ
کیا گیا تھا یا نہیں اور حالات کو سدھارنے
کے لئے کوئی واضح قدم اٹھایا گیا یا نہیں۔

حالیہ جنگ کے دوران عرب رہنماؤں سے
جو سیاسی غلطیاں سرزد ہوئیں ان میں ایک
قابل ذکر یہ تھی کہ ناصر صاحب اس اصلیت کا
پہلے سے اندازہ لگانے میں ناکام رہے کہ عالمی
سیاست کے موجودہ ماحول میں چھوٹے ممالک
کو یہ اجازت نہیں مل سکتی کہ وہ اپنی کسی آپسی
جنگ کو زیادہ دنوں تک جاری رکھیں۔ البتہ
خود بڑی طاقتیں اس میں الجھی ہوں تو بات
دوسری ہے۔

چھوٹے ممالک کے درمیان جنگ کی
پوری حالت میں دونوں فریقوں
پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جانا لازمی ہے تاکہ وہ کسی
قسم کی جنگ بندی منظور کر لیں۔ اور اس کے
بعد گفت و شنید کریں۔ لہٰذا ان جنگوں میں جو
بھی فریق پہل کر کے کچھ فائدہ اٹھائے گا،
اسی کو بعد کی گفت و شنید میں اپنے لئے بہتر
سودے بازی کی سہولت حاصل رہے گی۔

صدر ناصر کے سامنے ہند و پاک جنگ
اور پہلی جنگِ سویز کے واضح حقائق موجود

تھے۔ پھر بھی وہ ان سے مناسب سبق لینے میں ناکام رہے۔ انہیں ہر قسم کے امکانات کا پہلے اندازہ ہونا چاہیئے تھا اور یہ پورے طور پر علم ہونا چاہیئے تھا کہ اسرائیلی فوج اعلیٰ درجے کے اور جدید جنگی ساز و سامان سے لیس ہے اور بہترین طریقے سے تربیت یافتہ ہے۔ لہٰذا یہ بالکل قدرتی تھا کہ ابتدائی کامیابی اسی کو ملتی۔

عربوں کو فائدہ صرف طویل جنگ میں ہی ہوسکتا تھا۔ جس میں اسرائیل کی انسانی طاقت اور جنگی ساز و سامان زیادہ دیر تک نہ چل پاتے۔ اور اس طرح جب اسرائیل کی جنگی طاقت کمزور پڑ چکی ہوتی تب ہی عرب ممالک اُس پر وسیع پیمانے پر حملہ کر کے فتح یاب ہو سکتے تھے۔ اس لئے صدر ناصر کو اس وقت تک اسرائیل کے ساتھ جنگ میں اُلجھنا نہیں چاہیئے تھا جب تک انہیں مکمل یقین نہ ہو جاتا کہ وہ جنگ کو لمبے عرصے تک کھینچ سکتے ہیں

یہ اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے کہ صدر ناصر جیسا مدبّر اور قابل رہنما ان واضح حقیقتوں کو کیسے نظر انداز کر گیا۔ ممکن ہے پسِ پردہ کوئی خاص بات رہی ہو جس کا دنیا کو علم نہ ہو۔ کیا ویت نام کی مثال سے صدر ناصر کو یہ خیال آیا کہ وہ بھی اسرائیل کے ساتھ ایک طویل جنگ لڑ سکیں گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی بڑی طاقت نے انہیں کچھ خاص امداد دینے کا یقین دلایا اور اُسی بنیاد پر انہوں نے جُوا کھیلا؟ لیکن جب موقع آیا تو اُس بڑی طاقت نے اُن کے ساتھ غدّاری کی اور اس طرح عربوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا؟ اس قسم کے کتنے ہی معنی خیز سوالات ہو سکتے ہیں لیکن فی الحال ایسا نظر آتا ہے کہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملے گا۔

ان سیاسی غلطیوں کے علاوہ عربوں کی شکست کی ایک اور بڑی وجہ تھی اُن کی قابلِ رحم پست حوصلگی۔ اسرائیلی مکمل طور پر قومی جوش کے تحت لڑ رہے تھے۔ اُن کی ہستی ہی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ یہی نہیں، اُن کا ایک ایک شخص تربیت یافتہ اور سیاسی طور سے باشعور تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ اُن کے پاس جو جنگی ساز و سامان ہے وہ جدید اور بہترین قسم کا ہے۔ بمقابل اِس کے عرب اکثر و [illegible] تربیت یافتہ اور گھٹیا قسم کے جنگی ساز و سامان سے لیس تھے۔ عرب فوجیوں کے دل میں نہ [illegible] طاقت اور جاں بازی سے لڑنے اور قوم [illegible] خاطر قربانی دینے کی کوئی تڑپ نہیں تھی [illegible] صرف اس لئے لڑنے گئے تھے کیوں کہ اُن کے رہنماؤں نے انہیں ایسا کرنے کا حکم [illegible] اس کے علاوہ انہیں جدید جنگ کا کوئی [illegible] بھی نہیں تھا۔

عربوں میں صرف الجیریائی عوام [illegible] اپنی آزادی کی خاطر ایک طویل جدّوجہد [illegible] ہے۔ اور انہیں لڑائی کا کچھ تجربہ حاصل ہے لہٰذا انہوں نے ہی کچھ جنگی قابلیت دکھائی باقی ماندہ فوج سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے مورچوں پر ڈٹی رہے گی اور آخری سانس تک لڑے گی۔ بعد کے واقعات سے ثابت ہوگیا ہے کہ جب موقع پڑا تو ہر عرب سپاہی نے اپنے ملک کی بجائے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر کی۔

یردن کی مثال لیں۔ اُس کے فوجی صرف اس وجہ سے لڑنے کا حوصلہ کھو بیٹھے کیوں کہ اسرائیلی بم باری سے اُس کی شہری آبادی کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ اس کا مقابلہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران روسیوں اور انگریزوں کے بلند حوصلے سے کیجئے؛ انہوں نے کس طرح ہر ہوائی حملے کا بہادری کے ساتھ



صحرائے سینائی کے شہر، قصیے العارس میں اسرائیلی سپاہی

ما کیا۔ نپولین نے کہا تھا " تعداد کے مقابلے
حوصلہ ایسا ہی ہے جیسے ایک کے مقابلے
دس۔" اگر عرب بھی اتنے ہی بلند حوصلہ اور
جوش ہوتے جتنے کہ اسرائیلی تھے تو پھر لڑائی
ت بھی جاری رہتی اور بیرونی دست اندازی
۔ وہ جنگ بندی کے لئے رضامند نہ ہوتے
۔ تک کہ وہ اسرائیلیوں کو اپنے علاقے سے
۔ باہر نہ کرتے۔ لیکن چوں کہ ان میں لڑنے
جوش و خروش نہیں تھا۔ اس لئے اُن کے
ماؤں کو کم و بیش مجبور ہو کر جنگ بندی منظور
ر پڑی۔ نتیجہ میں گفت و شنید میں بہتر سودا
رنے کی سہولت اسرائیل کو مل گئی۔

عربوں کی جنگی قابلیت کتنی گئی گذری تھی
اس کا اندازہ اس بات سے بھی
۔ سکتا ہے کہ اِس چار روزہ جنگ کے
۔ اُن کے گیارہ جرنیل قید کر لئے گئے۔

عام طور پر کسی جہاز کے کپتان کی طرح جرنیل
بھی قیدی ہونے پر مرنے کو ترجیح دیتا ہے۔
لیکن عرب جرنیل اس مٹی کے نہیں بنے تھے۔
وہ ذلیل ہو کر بھی زندہ رہنے پر بضد تھے۔ صدر
ناصر نے آٹھ دس جرنیلوں کو برطرف کرنے کی
جو کارروائی کی اُس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ جرنیل
اپنے فرائض سرانجام دینے میں ناکام رہے۔
کاش! ہند چینی لڑائی کے بعد بھارت میں بھی
کچھ اِس قسم کی کارروائی کی گئی ہوتی۔ شاید
ہماری تہذیب میں رحم، عدم تشدد اور معافی
کو جو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اسی وجہ سے
ہم نے ان نااہل اور نالائق افسروں کو جنہوں
نے ہمارے ملک کو خطرے میں ڈالا تھا، مزے
کی زندگی گذارنے کا موقع دیا۔

خلاصہ یہ کہ عربوں کی شکست کے دو
بڑے اسباب تھے: سیاسی غلطیاں اور
نااہل رہنمائی۔ میدانِ جنگ میں عرب اس وجہ

سے ہارے کہ اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اور اُن کا لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انسانی طاقت، جنگی ساز و سامان اور بلند حوصلگی، کا اصول آج بھی صحیح ہے اور کسی بھی جنگ میں آخری فتح اسی پر منحصر کرتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایک لڑائی میں شکست کا مطلب جنگ میں شکست ہرگز نہیں ہوتا۔ برطانیہ نے ماضی میں کئی لڑائیاں ہاری ہیں لیکن جنگیں صرف دو یا تین ہی ہاری ہیں۔ اگر عربوں اور اس[illegible] کے درمیان اس جنگ کو جاری رہنے دیا [illegible] تو آخری نتیجہ شاید دوسرا ہوتا۔

ہم یہ صدق دلی سے امید کرتے ہیں کہ ہماری فوجوں کے چیف اِن نکتوں پر بڑی باریکی سے غور کریں گے۔ اور جلد بازی میں ایسی کوئی سفارش نہیں کریں گے کہ ملک کی فوجوں کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرنے کے لئے اُن کی تعداد کم کر دی جائے۔ بھارت میں ہم نے دیکھا ہے کہ ہما[illegible]ے برطانوی سسٹم سے تربیت یافتہ زیادہ افسر ہمیشہ برطانوی فوجی نظام کو ہی اپنانے کی وکالت کرتے رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے ملک کی حقیقی مشکلات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا زیادہ تر جنگی ساز و سامان غیر ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے اور بھارت جیسا غریب ملک یہ ساز و سامان زیادہ مقدار میں خرید نہیں سکتا خریداری کی لمبی فہرست بنا لینا غلط نہیں بشرطیکہ جیب میں پیسے ہوں۔ لہذا موقع آگیا ہے کہ ہم ملک کے وسیلوں سے ہی خود کو لیس کرنے کا ہنر سیکھیں۔

مغربی ایشیا کی اِس حالیہ جنگ سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ غیر ملکی امداد پر ایک حد سے زیادہ انحصار خطرناک ہے۔ یہ حد[illegible] اور اصلی ساز و سامان سے بھی ایک بڑی [illegible] بلند حوصلگی اور جوش۔ ہمیں غیر ممالک سے [illegible] ساز و سامان حاصل کرنے کی کوششوں کی [illegible] اس حوصلے اور جوش و خروش کو فروغ دینے پر زور دینا چاہئے۔ ●



کام لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
— اکبر الہ آبادی

عداوت نامے

طنز • لاج ٹھاکر

شری اور شریمتی بے ڈھنگی کی دخترِ نیک اختر
لم ڈھینگی کی شادی خانہ آبادی مسٹر
کلا جنگی پی۔ ایچ۔ ڈی (آکسن) ایل ایل ڈی، ڈی۔
لی۔ یو، ایکس، فرزند ارجمند شری بے پینڈی،
ئیسِ اعظم مالک فرم بے پینڈی (پی) لمیٹڈ
ے مورخہ ۱۳ ار کو ہونا قرار پائی ہے۔ اِس موقع
پر آپ کی شرکت باعثِ مسرّت ہوگی۔

ایسے دعوت نامے موصول فرما کر لوگ



ے نہیں سماتے۔ اپنی اِس عزّت افزائی پر
دیں 'اٹین شن' کیے دوستوں میں ڈینگیں
کتے نہیں ہانپتے۔ خدارا عقل کی عینک کے
نوں کی دھول اچھی طرح صاف کر، اس
دت نامے کو پڑھیے تو آپ سمجھ جائیں گے کہ
بان دعوت نامہ آپ کو طعنوں سے نوازا جا رہا
ہے، گویا کہ دیکھ رہے ہیں آپ ہماری دختر
لم ڈھینگی کو۔ جسے آپ کہتے تھے مڈل
ہے، سلائی کڑھائی اور امورِ خانہ داری سے
ہی نابلد ہے، اُس کی شادی مسٹر فلاں (جن
کے ساتھ ڈگریوں کی اتنی لمبی دُم ہے اور جو
ایک رئیسِ اعظم کے بیٹے ہیں) کے ساتھ ہو رہی
ہے۔ لیکن آپ کی تینوں پڑھی لکھی ڈگری ڈپلومہ
یافتہ سلائی کڑھائی کٹائی، خانہ داری سے واقف
بیٹیاں ابھی تک کنواری بیٹھی ——— کوئی کہیو
رے پیا آون کی' دُھن گا رہی ہیں۔ ابھی آپ تو
کہتے تھے کہ ہماری بیٹی آپ کی لڑکیوں کے مقابلے
میں، قطعی بھونڈی اور بدصورت ہے، اُس کی
موٹی ناک، کالی رنگت اور موٹے ہونٹوں کے
بارے میں بڑے چٹخارے لے لے کر آپ
کی محفلوں میں تذکرے ہوتے رہے ہیں۔ دیکھ
لیجئے اس کی [illegible] سی ناک اور ٹائر سے ہونٹوں
والی ملکہ [illegible] قسمت او[illegible] ہماری حکمت کو۔
اس دوزخی [illegible] نے کیسا چھیلا نوجوان
پھانسا ہے۔

اسی طرح کا ایک [illegible] دعوت نامہ
جو کسی رشتہ دار یا عزیز دوست نے اپنے
ذاتی مکان میں قدم رکھنے [illegible] آپ

کو بھیجا ہے اپنی رنگ برنگی زبان سے کہہ رہا ہے "اجی آپ کا اور ہمارا کیا میل۔ آپ کی اور آپ کی سات پشتوں کی زندگی کرائے کے مکانوں میں کٹی ہے۔ مالک مکانوں کے گلے اور پاؤں پڑتے آپ کی زندگی گذری ہے۔ سال میں چھ بار فوج داری یا تیمار داری کی نوبت آئی ہے۔ ایک مکان سے دوسرے مکان میں ہر مہینے سامان ڈھوتے ہوئے آپ کو دیکھ کر مغالطہ ہوتا کہ کہیں آپ نے ٹھیلہ ڈھونے کا پیشہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ ہمیں دیکھئے، دنوں میں ہی عالی شان کوٹھی کے مالک بن گئے۔ آپ ہماری اس کوٹھی کی شان کو دیکھ کر عش عش کر اٹھیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "عش عش" کی بجائے غش ہی کھا جائیں۔

آپ آ تو رہے ہی ہیں، خود ہی دیکھ لیں گے کہ آپ میں تو آٹے کی ایک بوری خریدنے کی سکت نہیں اور ہم نے سیمنٹ کی سیکڑوں بوریاں کوٹھی پر صرف کر دی ہیں۔ آپ کے کرائے کے کمرے کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے اور ہماری کوٹھی میں لگی ٹائلیں ماہ و انجم کی مانند جگمگا رہی ہیں۔ اجی آپ کی رسوئی سے تو ہمارا فلش سسٹم بیت الخلاء ہی ہزار درجہ اچھا ہے۔ کیا آپ جھوٹ سمجھتے ہیں؟ آپ آکر خود ملاحظہ فرمائیے۔ یقین کیجئے اُس بیت الخلاء میں بس جانے کو آپ کا دل نہ چاہے تو ہمارا ذمہ۔"

کبھی کبھی عداوت نامے کی ایک اور قسم کسی روزنامہ میں شائع شدہ تصویر کی شکل میں آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ ہماری نظر اِس تصویر پر اٹک جائے گی جس میں کوئی نوجوان گردن سے سر تک ہاروں سے لدا کسی طیارے کے سامنے کھڑا ہوگا۔ اُس کی دونوں جانب والدین سینہ پھیلائے کھڑے ہوں گے۔ تصویر کے نیچے چھپا ہوگا مسٹر فلاں کے صاحب زادے غیر ممالک میں گھاس کھودنے کی تربیت کے لئے جا رہے ہیں۔ گھاس کھودنے سے مُراد یہ نہیں کہ صاحبزادہ سچ مچ واپس آکر گھاس کھودے گا۔ مدعا یہ کہ اعلیٰ سفر کے لئے رختِ سفر باندھا ہے۔

عزیز بذاتِ خود تو ہاروں سے اس طرح ڈھکے چھپے ہوں گے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہوگا کہ کوئی بندۂ خدا روانہ سفر ہے یا ہاروں کے گٹھر کو ممالکِ غیر میں ایکسپورٹ کیا جا رہا ہے۔ ہاں والدین یہ کہتے ہوئے ضرور خوش ہوں گے کہ دیکھا، آپ کے بچے تو کالج میں ہڑتالیں کرا کر اپنا نام اور والدین کی ناک کٹوانے کی جستجو میں ہیں لیکن ہمارا نونہال غیر ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جا رہا ہے۔ دیکھو نا کیسا ہونہار لڑکا ہے حالاں کہ یہ بھی آپ کے بڑے لڑکے کے ساتھ میٹرک میں تین بار فیل ہوا۔ لیکن اب دیکھو صبح کا بھولا شام کو گھر سے بے گھر ہو رہا ہے۔ ہے نا عجیب بات!



لئے بار لوگ اشتہار بازی یا دعوت ناموں کا سہارا نہیں لیتے۔ گاؤں سے دیسی [illegible] منگوانے والا آپ کا یار راہ میں سے ہی [illegible] سیٹ کر آپ کو اپنے دولت کدے پر لے [illegible] ئے گا۔ آپ کی آستین کو گھی سے تر کرتے [illegible] ئے آپ کے ہاتھ کی پشت پر گھی مل کر آپ [illegible] سونگھنے کو کہے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اُس گھی کی [illegible] ریف میں زمین و آسمان کے قلابے اس طرح [illegible] ے گا کہ آپ کو یقین ہو جائے گا کہ اصل و سَو [illegible] صدی خالص گھی وہی ہے اور آپ تو آج تک [illegible] ے میں مٹی کا تیل ہی استعمال کرتے رہے [illegible] اس کے بعد جب تک آپ خدا کو حاضر ناظ [illegible] کر اس بات کا اعتراف نہ کر لیں کہ واقعی وہ [illegible] لی گھی ہے اور اس کے ساتھ کا گھی کر دا ض [illegible] ل ہی نہیں سکتا، آپ کی آستینوں کا ستیاناس [illegible] رے اور گھی سُنگھا سُنگھا کر آپ کو بے ہوش کر دینے کی مکروہ حرکت سے وہ باز نہ آئے گا۔

یا کبھی آپ کی سائیکل پنکچر ہو گئی اور آپ بس کی لائن میں ہر بس میں سوار ہونے کی کوشش میں اپنے کپڑوں اور حلیے کا ستیاناس کرا چکے ہیں، ناکام و نامراد جاتی ہوئی بس کو بے بسی سے دیکھ رہے ہیں۔ اُسی وقت آپ کا کوئی دوست جس نے ابھی ابھی کار خریدی ہو اپنی نئی کار کو پیں پیں، کرتا ہوا لا کر آپ کی بغل میں کھڑی کر دیتا ہے۔ کار کا دروازہ کھلتا ہے اور آپ کو کار میں بیٹھنے کی دعوت ملتی ہے۔ آپ اس عزیز رشتہ دار یا دوست کو شکریہ شکریہ کہتے کار کی چھت سے ٹکراتے ہوئے اگلی سیٹ پر تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔ 'رن' سے کار چل پڑتی ہے۔ آپ کو سر سہلانے سے فرصت ملنے سے پیشتر ہی پوچھا جاتا ہے، کیا آپ بس کا انتظار کر رہے تھے، حالانکہ صاحب

وہ [illegible] ہوا ہے شاید
نظر [illegible] سا سائے کے لئے
[illegible] منزل کے لئے
[illegible] چھوڑ گیا ہے شاید

[illegible] جیسے کسی تنہا کی طرح
[illegible] آنکھ نے
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] ٹوٹتے ہیں جو سہارا کرتے تھے
وقت پھر گرد اڑاتا ہے، گزر جاتا ہے
منظر شام و سحر اور نکھر جاتا ہے
تجربے بعد ترا رنگ بھرا کرتے ہیں

اپنے احساس کے زندان سے نکل کر دیکھو
شوقِ بیتاب کی تسکین کے عنوان ہیں بہت
دیدہ و دل کے بہل جانے کے سامان ہیں بہت
اک ذرا زاویۂ فکر بدل کر دیکھو

زندگی، خوبصورت خوابوں کی دلہن کی مانند
منتظر ہے کہ تم آؤ تو محبت پیار کرے
[illegible] کو امید سے گلنار کرے
کھل اٹھے عمر کی فضا، صبح چمن کی مانند

[illegible] ہوا سال گزشتہ
[illegible] خود سے گریزاں کیوں ہو

— محمود سعید

کار بہ چشم خود آپ کو بس کی لائن اور لوگوں کو آپ کی ہڈیاں توڑتے ہوئے دیکھ چکے ہیں لیکن ایسا ہی سوال کرنا ان کے لئے اشد ضروری ہے۔

آپ کے اثبات میں جواب دیتے ہی ان کی طرف سے بس میں سفر کرنے کی خرابیوں اور دشواریوں پر لیکچر شروع ہو جاتا ہے۔ جیب سے لے کر ٹانگ بازو کٹ جانے تک اور وقت و جان دونوں کے ضائع ہونے کے امکان پر دھواں دھار لیکچر ہوتا ہے۔ اگر گلو خلاصی کے لیے آپ کہہ بیٹھے کہ صرف آج ہی بس پر سوار ہو رہے تھے ورنہ سائیکل پر ہی جاتے ہیں تو سائیکل کی سواری پر لے دے شروع ہو جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی کار کی خوبیوں اور اس کے ہر پرزے کی صفائی اور کام کرنے کے ڈھنگ سے آپ کو روشناس کرایا جائے گا۔

جب تک ٹیل لاسٹ اور ہیڈ لائٹ کے درمیانی کل پرزوں کے بارے میں آپ کی واقفیت میں اضافہ نہ ہوگا ان کی کار بے مدعا سڑکوں پر چکراتی رہے گی۔ سائیکل یا بس پر ایک آدھ گھنٹے میں پہنچنے کی بجائے جب منزل مقصود پر تین گھنٹے بعد پہنچیں گے تو آپ خود کو ایک ماہر موٹر مکینک محسوس کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے ان کی کار سے اترتے ہی آپ کباڑی بازار کا ہی رخ کرنے اور وہاں سے سپیئر پارٹس لا کر کار بنانے کا ارادہ ہی کر ڈالیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن سے ہماری جان پہچان نہ ہو، بلا برابر ہے لیکن ہمیں مرعوب کرنے سے وہ کبھی نہیں چوکتے۔ ٹیلی ویژن کے ایریل کو کبوتروں کی ماڈرن چھتری سمجھ کر کچھ لوگوں کے خود نمائی کے بھرم کو آپ بے شک توڑ دیں، لیکن نیا ریڈیو لانے والا پڑوسی اپنے ہمسایوں کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ پورے والیوم پر بجتا ہوا ریڈیو آپ کے سونے جاگنے پڑھنے کے اوقات پر چیخ چیخ کر کہے گا "یہ دیکھئے صاحب یہ نیا ریڈیو لے آئے"! فلک شگاف حد تک ریڈیو بجا کر گویا آپ کا پڑوسی آپ پر جتا رہا ہے کہ ہم آپ کی طرح بھونپو والا گراموفون استعمال نہیں کرتے ذرا ہمارے ریڈیو کی آواز ملاحظہ ہو۔ محلے بھر کے کتے بلیوں کی آواز اور گدھوں کا ریکنا اس کے آگے دب کر رہ جاتا ہے۔ ایک صبح سے لے کر دوسری صبح تک مشرقی، مغربی، شمالی، جنوبی موسیقی اس پر نشر ہوتی رہتی ہے۔

جب کہیں سے کوئی پروگرام نشر نہ ہو رہا ہو تو دل نواز "بجائیں بجائیں"، "شوں شائیں"، آپ کے کان کھانے کو بے چین رہتی ہے۔ ہمارے ریڈیو پر نت نئے گانے سنے جا سکتے ہیں، لیکن آپ کے بھونپو والے گراموفون پر پچھلے ۲۵ برسوں برسوں سے اسٹر کے۔ ایل۔ سہگل کا "جھلنا جھلاؤ جی" والا ریکارڈ ہی بجایا جا رہا ہے۔ اور اب تو وہ ریکارڈ بھی اس قدر گھس چکا ہے کہ پتہ نہیں چلتا کہ مرحوم سہگل "جھلنا جھلاؤ جی" گا رہے ہیں یا آپ کے ریکارڈ سے "جھنجھنا بجاؤ جی" کی صدا آ رہی ہے۔ کئی بار تو اس بات میں امتیاز کرنا ہی مشکل ہو جاتا کہ آپ کے ہاں واقعی ریڈیو بج رہا ہے یا آپ گراموفون میں چابی بھرنے کا شغل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ●

جدید تھرمامیٹر

امریکہ نے ہیرے سے ایک ایسا تھرمامیٹر ایجاد کیا ہے جو بڑے پیمانے پر بخارات کی جانچ کرتا ہے۔ یہ کم از کم ۲۲۵ ڈگری سینٹی گریڈ (اس درجہ حرارت پر سب چیزیں منجمد ہو جاتی ہیں) اور زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ ڈگری فارن ہائٹ (جس میں دھات سرخ رنگ کی ہو جاتی ہے) تک کی حرارت ناپ سکتا ہے۔

پاپ کی گٹھری

کہانی • شکیبیر

پاروتی نے نیند سے چونک کر کواڑ کھولے اور رنجنا کو اپنے دروازے پر کھڑی دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ رنجنا کا اُس کے گھر آنا اور وہ بھی آدھی رات کے وقت — یہ دونوں ہی باتیں اس کے لئے بالکل اتفاقیہ اور خلاف توقع تھیں۔

'کیا کرنے آئی ہے یہ؟ اور وہ بھی اِس وقت آدھی رات کو؟' رنجنا کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے اُس نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور پھر لاپرواہی سے بولی "کیا بات ہے رنی؟"

"موسی ..." اور رنجنا کا گلا رُندھ گیا۔

اُس نے غور سے دیکھا۔ رنجنا کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اچانک جیسے اُسے کوئی بات یاد آگئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور پھر نفرت کی لہر اُس کے جسم میں سرسرا اٹھی اس کا دل چاہا کہ رنجنا کو دُھتکار دے لیکن وہ ایسا کر نہ سکی بولی "اندر آجاؤ"

اندر آتے ہی رنجنا اُس کے قدموں پر گر کر سسک پڑی "موسی، میں تم سے پناہ مانگنے آئی ہوں۔ میری آبرو اب تمہارے ہاتھ ہے۔ میری لاج رکھنا موسی! تم نے بھی دُھتکار دیا تو میں ڈوب مروں گی۔ گھر والوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے"

وہ بھونچکی سی رنجنا کی باتیں سنتی رہی۔ اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ جب اُس کے کانوں سے رنجنا کے یہ الفاظ ٹکرائے کہ اسے گھر والوں نے نکال دیا ہے تو وہ چونک سی پڑی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ کیا بات ہوئی؟ کیوں نکال دیا گھر والوں نے تمہیں؟" ایک ہی سانس میں اُس نے رنجنا سے اتنی ساری باتیں پوچھ ڈالیں۔

"موسی" رنجنا نے اسی طرح سسکتے ہوئے جواب دیا "میں نے گناہ کیا ہے۔ میں اندھی ہوگئی تھی۔ میرے پیٹ میں ..."

"بچہ!" وہ اس طرح چونکی جیسے کسی نے سوتے میں اُس کی پلکوں پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو

"ہاں — مو... سی"

"کس کا؟"

"وہ ... وہ ... اب یہاں نہیں ہے۔ وہ محلہ ہی نہیں، شہر بھی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ معلوم کہاں۔ مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں"

"کون تھا وہ؟"

"ہمارے پڑوس میں رہتا تھا یہاں کس

... بپا ہو گئی جب لوگوں نے دیکھا کہ پاروتی ... وہ اکیلی ... اُس کے گھر سے نوزائیدہ ... کی آواز آرہی تھی۔



کالج میں پڑھتا تھا۔ خود کو کسی بڑے زمیں دار کا بیٹا بتاتا تھا۔ اس سے زیادہ اُس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں موسی۔"

"اوہ" اُس کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ بولی "کب گیا وہ؟"

"تین ماہ ہو گئے۔"

"تو نے اُسے روکا نہیں؟"

"نہیں موسی۔ ... مجھے اُس وقت یہ سب معلوم نہیں تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میرا گناہ باہر نہیں آئے گا۔ جوانی کی ایک بھول ہی بنا رہے گا اور کسی کو میرے چال چلن پر شک نہیں ہوگا۔

لیکن اب ...." کہتے ہوئے رنجنا کی ہچکی بندھ گئی

پاروتی خاموش رہی۔ وہ تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ طنز سے سکڑے ہوئے تھے اور دل خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ سیٹھ گردھاری لال کی بیٹی آج اُس کے در پر آئی تھی اور اُس سے رحم، ہمدردی اور مدد کی بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ اُلجھن میں مبتلا سوچ رہی تھی کہ کیا کرے — رنجنا کو نا امید لوٹا دے، دھکے دے کر اپنے گھر سے باہر نکال دے یا اس بے سہارا اور مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ آج سیٹھ جی سے بدلہ لینے کا سنہری موقع اسے ہاتھ آیا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے اور سب کو اکٹھا کر کے سیٹھ کی بیٹی کی کالی کرتوت بتائے

سیٹھ گردھاری لال جو خود کو بڑے شریف اور ایمان دار کہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے ناپاک ارادے میں ناکام ہونے کے بعد اُسے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اُس کے او

رحمان کے تعلقات کو لے کر انہوں نے محلّے میں وہ ہنگامہ برپا کیا کہ اُس کے لئے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ رحمان کا اُس کے گھر آنا جانا بند ہو گیا تھا اور وہ بد قسمت بھری دنیا میں بالکل اکیلی اور بے سہارا رہ گئی تھی۔

حالانکہ سیٹھ جی کو بہ خوبی معلوم تھا کہ اس کا رحمان کے ساتھ بہن بھائی کا پاک رشتہ ہے اور وہ اس کے مرحوم خاوند شمبھو کا دوست ہے۔ شمبھو کے زمانۂ حیات میں بھی وہ بالکل گھر کے فرد کی ہی مانند بے روک ٹوک آیا کرتا تھا۔ وہ اور شمبھو ایک ہی درزی کے سٹور میں کام کرتے تھے۔ شمبھو کی موت کے بعد رحمان ہی اُس بیوہ اور یتیم کا سہارا رہ گیا تھا۔

وہ اُس کے لئے سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام لاتا اور اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ اِس حقیقت سے محلّے والے اچھی طرح واقف تھے اور سیٹھ جی بھی۔ رحمان کے اِس گھر میں آنے پر کسی کو اندرونی طور پر چاہے اعتراض رہا ہو لیکن ظاہری طور پر کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔

سیٹھ جی بھی عموماً اس کے گھر آتے رہتے تھے اور شمبھو کی موت کے بعد تو یہ آنا جانا اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ بھی اُس کے ساتھ بڑی اپنائیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے اور ہر وقت اس کی مدد کرنے کے خواہش مند رہتے۔ لیکن ان کی ہمدردی کا صحیح مطلب اُس کی سمجھ میں اُس دن آیا جس دن سیٹھ جی ایک عمدہ ساری اور سنگار کا سامان لے کر اُس کے پاس آئے تھے۔

اُس دن بھی آج ہی کی طرح آدھی رات کا وقت تھا۔ وہ گہری نیند میں سو رہی تھی کہ اچانک دروازے پر آہستہ سے دستک سنائی دی۔ اس نے چونک کر آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سیٹھ جی گتّے کا ایک بڑا سا ڈبہ ہاتھ میں تھامے سامنے کھڑے تھے۔

"آپ! اور اِس وقت؟" اُس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ایک ضروری کام سے آیا ہوں" سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بے دھڑک اندر آ گئے۔

اُن کے اس طرح بے وقت آنے پر وہ سہم سی گئی۔ بولی "کیا کام ہے؟"

"کام؟" سیٹھ جی مسکرائے اور ہوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کا ڈبہ اُس کی جانب بڑھا کر بولے "کام بھی ابھی بتاؤں گا۔ پہلے اسے سنبھالو اور کھول کر دیکھو۔"

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبہ لے لیا۔ کھول کر دیکھا تو دنگ رہ گئی۔

"یہ کیا سیٹھ جی؟" اچانک ہی اس کے ہونٹ ہلنے لگے "یہ ساری اور یہ ..... سنگار کا سامان؟" خوف اور حیرت سے اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"ہاں ہاں" سیٹھ جی نے کھو کھلی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "تمہارا یہ حال مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ تمہاری جیسی پری ....."

"پری؟" اس نے سیٹھ جی کو ٹوکا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی جو کچھ تم ہو اور جو کچھ مجھے کہنا چاہئے" سیٹھ جی پہلے کی ہی طرح دانت نکال کر بولے۔

"لیکن سیٹھ جی میں ایک بیوہ ....."

"تمہیں یہی سمجھانے تو آیا ہوں آج میں" سیٹھ جی نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا "یہ روپ اور جوانی تو موتیوں میں تُلنے لائق ہے۔ یک تم ہو کہ انہیں گھن لگائے جا رہی ہو۔ کھیلنے کھانے کے چار دن ہوتے ہیں اور ایک تم ہو کہ بوڑھوں سے بھی گئی گذری بنی رہتی ہو۔"

"میری قسمت میں یہ سب کہاں تھا سیٹھ جی" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر رندھے گلے سے بولی "اگر ہوتا تو بھگوان میرا سہاگ ہی کیوں لُوٹتا۔ وہی کیوں .....؟"

"یہی تو تمہاری نادانی ہے" سیٹھ جی نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا "مرنے والا تو مر گیا لیکن تم خود کو کیوں مار رہی ہو؟" کہہ کر وہ اُس کی جانب بڑھے۔

"سیٹھ جی!" وہ شکاری کے جنگل میں پھنسی ہرنی کی مانند تھر تھر کانپتی ہوئی بولی "میرے حال پہ رحم کھائیے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ جائیے۔ بھگوان کے واسطے چلے جائیے۔"

"ابھی نہیں، تھوڑی دیر بعد جاؤں گا" سیٹھ جی نے شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی!" پیچھے ہٹتے ہوئے ایک دم زخمی گھائل شیرنی کی طرح گرجی "اب اور آگے نہ بڑھنا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

لیکن سیٹھ جی کے سر پر تو شیطان اتنی بُری طرح سوار تھا کہ انہیں دنیا کی کوئی خبر نہیں تھی وہ اُس کی طرف بڑھتے رہے۔ انہیں ہوش تو تب آیا جب اُس کی چیخ دپکار کے درمیان ایک زور کا تھپڑ اُن کے منہ پر پڑا۔ اور وہ اپنے گالوں کو سہلاتے ہوئے وہاں سے دُم دبا کر بھاگے۔

اور پھر دوسرے ہی روز محلّے کی فضا اس کے خلاف ہونی شروع ہوگئی۔ محلّے کی عورتوں اور لڑکیوں کا اُس کے پاس آنا جانا، بچّوں کا اُس کے گھر کے اندر باہر کھیلنا، سبھی رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوگیا اور چند ہی دنوں میں بالکل بند ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے اور رحمان کو لے کر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں اور پھر سرِ عام باتیں ہونے لگیں۔

وہی پاروتی جو کچھ دن پہلے تک محلّے بھر میں بہن اور بھابی اور کسی کی تائی، چچی، بوا اور موسی تھی، اب اُس سے کسی کا کوئی رشتہ نہ رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نفرت سے منہ پھیر لیتے اور اس طرح ناک بھوں سکوڑ کر چل دیتے جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔

محلّے میں سبھی گھر ہندوؤں کے تھے اور رحمان کا یوں بے دھڑک آنا جانا، ایک ہندو عورت سے ملنا جلنا اب سب کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا۔ محلّے کے نوجوان اسے اپنی عزّت پر حملہ سمجھنے لگے تھے وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہتے "ہم زندہ رہتے ہوئے یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ حرامی بچہ اس رانڈ کے پاس آئے جائے اور اس طرح ہمارے دھرم پر حملہ کرے۔"

"ہم نے بھی زمانہ دیکھا ہے" بزرگ لوگ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے "ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ محلّے میں یہ پاپ ہو رہا ہے۔ اونہہ بڑے بہن بھائی بنے پھرتے ہیں دونوں؟ وہ تو بھگوان بھلا کرے سیٹھ جی کا کہ انہوں نے محلّے میں ہو رہے اس پاپ کا پتہ لگایا اور اس سے پردہ ہٹایا۔"

"ہائے رام" عورتیں ہاتھ نچا کر اور دیدے مٹکا کر آپس میں باتیں کرتیں "ارے کہتے ہیں کہ اتنی آگ لگ رہی ہے تو دوسری شادی رچا لے۔ منع کون کرتا ہے۔ جا کر اسی کے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟ محلّے میں کیوں اپنے پاپ کی آگ پھیلا رہی ہے۔ اونہہ، رانڈ، بیسوا، بدچلن کہیں کی۔"

پاروتی سب کچھ سُنتی اور خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ بھلا وہ محلّے والوں کو کس طرح یقین دلاتی کہ وہ بالکل پاک دامن ہے اور رحمان اسے اپنی سگی بہن سے بھی زیادہ سمجھتا اور مانتا ہے۔ یہ سب تو سیٹھ جی کی من گھڑت کہانی ہے۔ وہ اُس کی عصمت لوٹنا چاہتے تھے۔ اپنے شیطانی ارادے میں ناکام ہونے پر انہوں نے اس کے خلاف زہر پھیلایا ہے۔ اس سلسلے میں اگر وہ صفائی بھی پیش کرتی تو کیا محلّے والے یقین کرتے؟ یہی سوچ کر وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی اور برداشت کرتی رہی۔ رحمان اب بھی اُس کے یہاں آتا جاتا تھا لیکن اس نے اس کے متعلق اُسے کبھی کچھ نہیں بتایا۔

پھر ایک دن شام کے وقت رحمان کے آنے پر جب وہ رو رو کر آپ بیتی سنا رہی تھی تو اچانک اپنے گھر کے باہر اُسے محلّے والوں کا شور و غل سنائی

اور ساتھ ہی دروازے پر دستک سنائی دی
، نے گھبرا کر دروازہ کھولا اور دیکھا کہ سیٹھ جی کی
دت میں محلّے والوں کی بڑی بھاری بھیڑ دہ
یں والوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ خوف
، کانپ اٹھی۔ لیکن ایک دم سنبھل کر دل کو
بوط کر کے بولی "کیا ہے؟"

" ابھی سب معلوم ہو جائے گا" سیٹھ جی نے
ریہ لہجے میں کہا " نکال باہر اپنے آشنا کو۔
ے گلچھرّے اُڑا لئے۔"

" سیٹھ جی" اس نے چوٹ کھائی ناگن کی
ح بل کھا کر کہا " آپ کی بھی بہن بیٹی ہیں۔ آپ
ں . . ."

" لیکن میری بہن بیٹی تیری طرح بدچلن نہیں
ں" سیٹھ جی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بلند
واز میں کہا " ادنہہ چوری اور سینہ زوری" پھر
. محلّے والوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے " دیکھا
پ لوگوں نے۔ حرام کراتی ہے اور . . . "

" سیٹھ جی!" اُس نے آگ بگولہ ہو کر سیٹھ جی
و ٹوکا " اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے کہ
پ خود کتنے پانی میں ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی
. محلّے والوں کو آپ کی کرتوت کا پتہ چلے لیکن
ب آپ نے زبان کھلوا ہی دی ہے تو . . . "
کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رُکی پھر آگ برساتی
نکھوں سے سیٹھ جی کی طرف دیکھتے ہوئے
لی۔

" حرام میں کراتی ہوں یا آپ کرنا چاہتے
ھے مجھ سے؟ اگر آپ کی بات مان لیتی تو میں
اک دامن اور ستونتی تھی۔ نہیں مانی تو رنڈی
ور حرام کرانے والی بن گئی۔"

سن کر سیٹھ جی کو ایک منٹ کے لئے لقوہ مار
یہ گیا لیکن ایک دم خود کو سنبھال کر ہاتھ مٹکاتے
ہوئے بولے " ہاں ہاں، اب تو تُو یہ سب کہے
گی ہی۔ تیرا یاپ جو کھول کر رکھ دیا ہے میں نے"

یہ کہہ کر انہوں نے محلّے والوں سے کہا " دیکھ لیا
آپ لوگوں نے؟ ایسے بکواس کر رہی ہے جیسے
اس کے علاوہ محلّے میں سبھی بدمعاش بستے ہوں۔"
" سبھی نہیں۔ لیکن آپ ضرور بدمعاش ہیں"
وہ چلاّئی۔

شورش کر رحماں بھی باہر آگیا۔ اُسے دیکھتے
ہی قیامت برپا ہو گئی۔ لوگوں نے جو منہ میں آیا
اُسے کہنا شروع کیا۔ اُس نے ہزاروں قسمیں
کھائیں اور محلّے والوں کو لپی اور پاروتی کی
پاک دامنی اور نیک چلنی کا یقین دلانے کی ہر ممکن
کوشش کی لیکن سیٹھ جی کے جادو کے سامنے
اُس کی کوئی پیش نہ گئی۔ وہ بے چارہ دل مسوس کر
رہ گیا۔ پھر پولیس والے پکڑ کر اُسے تھانے لے گئے
جہاں اُسے کافی دھمکایا اور مارا پیٹا گیا۔ آخر میں اس
کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے
تھانے والوں نے اُسے چھوڑ دیا۔ لیکن ساتھ ہی
یہ تنبیہہ بھی کر دی کہ وہ آئندہ اس محلّے میں کبھی
قدم نہ رکھے۔"

اِس واقعہ کے بعد رحمان کا آنا جانا بند ہو گیا۔
اور وہ بے چاری اپنی بے بسی پر دل ہی
دل میں تلملا کر رہ گئی۔ وہ محلّے والوں اور خاص
طور سے سیٹھ جی سے بدلہ لینے کی تاک میں۔ رہنے
لگی۔ اب وہ خود رحمان کے گھر جا کر اُس کا حال
معلوم کر آتی، اور ساتھ ہی سلائی کڑھائی کا کام
لوٹا آتی۔ لیکن ان سبھی باتوں کو مشکل سے دو
مہینے ہی گذرے تھے کہ یہ واقعہ ہو گیا۔

" موسی . . . موسی!" اسے کافی دیر تک
خاموش اور خیالات میں گم دیکھ کر رنجنا نے
بے چینی سے پوچھا "کس سوچ میں گم ہو گئیں تم؟"
" ایں ہاں۔ . . . کچھ نہیں" اُس نے
چونک کر سنبھلتے ہوئے جواب دیا
" موسی!" رنجنا پھوٹ پڑی " کیا تم بھی
مجھے گلے نہ لگاؤ گی، کیا میرے باپ کی کرتوتوں



کا صلہ مجھے بھوگتا پڑے گا ؟ کیا .... ؟"

"ہاں ! کیوں نہیں ؟" اُس نے دل کو پتھر کرتے ہوئے جواب دیا "آخر تو تُو اسی باپ کی بیٹی ہے نہ جس کی وجہ سے ...."

"موسی !" رنجنا نے روتے ہوئے بات کاٹی "باپ کا بدلہ بیٹی سے تو مت لو"

"میں کچھ نہیں جانتی" وہ چٹان سے بھی زیادہ سخت ہو کر لاپرواہی سے بولی "نکل جا میرے گھر سے۔ اور جہاں منہ کالا کیا ہے وہیں جا کر مر"

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ پھر سنجیدہ ہو کر نہایت تیز آواز میں بولی "اب معلوم ہو گا تیرے باپ کو کہ کسی پر کیسے جھوٹی تہمت لگائی جاتی ہے اور اس کا کیا صِلہ ملتا ہے۔ کل جب محلّے والوں کو اُس کی بیٹی کی کالی کرتوتوں کا پتہ چلے گا تو دیکھنا کتنی عزت رہے گی اُس کی محلّے میں ؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا"

اور وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔

"اچھا... موسی" رنجنا نے ایک سرد آہ بھری "میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی پتھر دل بھی ہو سکتی ہو۔ میں تو تمہیں دیوی سمجھتی تھی اور اسی لئے تمہاری پناہ میں آئی تھی۔ اچھا میں چلی جاتی ہوں۔ لیکن وعدہ کرو کہ میری موت کے بعد میرے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کرو گی۔ ایسا نہ ہو کہ صبح میری لاش محلّے میں آئے تو لوگ اسے ایک پاپن، کلنکنی اور بدچلن کی لاش سمجھیں" یہ کہہ کر رنجنا اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔

یہ سب دیکھ کر پاروتی کے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھی اور وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اُسے محسوس ہوا کہ مصیبت زدہ اور بے سہارا رنجنا کو پناہ نہ دے کر وہ کوئی گناہ کر رہی ہے۔ اگر رنجنا اُس کے گھر سے ناامید لَوٹ جاتی ہے تو یہ اس کی اخلاقی موت ثابت ہو گی۔ پھر اُس میں محلّے والوں اور سیٹھ گردھاری لال میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اور اگر رنجنا کی جگہ اُس کی اپنی بیٹی اِس مصیبت میں ہوتی تو ؟ غلطی سب سے ہو جاتی ہے۔ اگر رنجنا سے بھول ہو گئی اور ..."

اور پھر وہ سب کچھ بھول گئی۔ سیٹھ جی کا بے رحم سلوک اور ظلم و ستم، اُن سے بدلہ لینے کی خواہش۔ یہاں تک کہ وہ پورے ماضی کو بھول گئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ رنجنا اُس کی اپنی بیٹی ہے اور اُسے سہارا دینا اُس کا فرض ہے۔

"ٹھہرو رنجنا" اُس نے چونک کر رنجنا کو پکارا۔

"نہیں موسی" رنجنا نے رُندھے گلے سے
اب اور وقت نہیں ضائع کروں گی۔ اِس
پہلے کہ صبح ہو اور محلّے والوں کو میرے گناہ
چلے میں اپنی زندگی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔"
"پگلی بیٹی" اُس نے لپک کر رنجنا کو پکڑ لیا
ٹھ گئی موسی سے؟ تم کہیں نہیں جاؤگی۔ تمہارے
کی کسی کے کان میں بھنک تک نہیں پڑے گی
میرا اپنا گناہ بن جائے گا۔"
"موسی!" رنجنا اُس سے لپٹ گئی "تم کتنی
ہو موسی! بالکل دیوی ہو دیوی۔"
"بس اب رہنے دے" اُس نے رنجنا کے
ہاتھ رکھ دیا "جھوٹی تعریف کر کے کیوں مجھے
ہوں میں گھسیٹتی ہے؟" پھر تھوڑی دیر بعد دو
رات کی تاریکی میں محلّے سے نکل کر سڑک
ارہے تھے۔

رنجنا کو رحمان کے سپرد کر کے اُس نے
اطمینان کا سانس لیا اور خود اسی وقت
واپس لوٹ آئی۔ رنجنا کے اچانک غائب
انے سے کچھ دنوں تک محلّے میں چہ میگوئیاں
رہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ بند ہوگئیں۔ محلّے
ں کو بتایا گیا کہ رنجنا اپنے ماموں کے ہاں گئی
۔ اور محلّے والوں نے سیٹھ گردھاری لال کی
پر یقین کر لیا۔
پھر پانچ چھ مہینے بعد ایک دن محلّے والوں
دیکھا کہ پاروتی کے دروازے پر ایک چھوٹا
الا لٹک رہا ہے۔ جب کئی روز تک تالا نہ کھلا
لے سے اُس کے اِس طرح غائب ہو جانے
ہوت من گھڑت افواہیں اُڑائی گئیں۔
وقت گذرتا رہا۔ پاروتی کو محلّے سے گئے
ماہ سے زیادہ عرصہ گذر گیا تھا۔ اور محلّے کے
تقریباً اُسے بھول چکے تھے۔ ایک دن آدھی
ت کے وقت سیٹھ گردھاری لال کے دروازے
ی نے دستک دی۔ سیٹھ جی نے اُٹھ کر دروازہ
کھولا تو دیکھا کہ بجلی کے کھمبے کی دھندلی روشنی
میں رنجنا، پاروتی اور رحمان کھڑے ہیں۔ پاروتی
کی گود میں ایک نوزائیدہ بچّہ تھا۔ ان سب کو
دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ لیکن
موقع کی نزاکت بھانپ کر غصّہ پی گئے۔ پھر تھر تھر
کانپتے ہوئے سب کو اندر آنے کے لئے کہا۔
"سیٹھ جی" اندر آکر پاروتی نے سنجیدگی
سے کہا "رنجنا بیٹی ماما کے گھر سے لوٹ آئی ہے۔
اس کا ماما اور موسی اسے لے کر آئے ہیں۔ لیجئے
سنبھالئے اپنی امانت۔"
"نہیں" انہوں نے افسردگی سے کہا "یہ
پاپن ہمارے لئے مر چکی ہے۔"
"پاگل نہ بنئے سیٹھ جی" رحمان نے انہیں
سمجھاتے ہوئے کہا "غلطی سب سے ہو جاتی ہے۔
رنجنا بیٹی سے بھی ۔ ۔ ۔ ۔"
"نہیں۔ نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر
غصّے سے کانپتے ہوئے کہا "اِس نے جہاں منہ
کالا کیا ہے وہیں جا مرے" پھر رنجنا کو مخاطب
کر کے بولے "حرام زادی، تجھے شرم نہیں
آتی اپنا کالا منہ مجھے دکھاتے ہوئے۔ تو اپنے
پاپ کو لے کر ڈوب کیوں نہ مری۔"
"سیٹھ جی" پاروتی نے روکا اور پھر غیر معمولی
سنجیدگی سے بولی "وقت ضائع نہ کیجئے۔ اور
جھٹ پٹ رنجنا بیٹی کو سنبھال کر ہمیں اجازت
دیجئے۔ اس سے پہلے کہ محلّے والوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"
"نہیں۔ نہیں" سیٹھ جی پھوٹ پڑے "ایسا
نہ کرنا۔ میں برباد ہو جاؤں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہتے
ہوئے اُن کی ہچکی بندھ گئی۔
"نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بے فکر رہیں"
پاروتی نے انہیں ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا
"اگر کچھ ہونا ہوتا تو آج سے سات ماہ پیشتر
ہو چکا ہوتا۔ جس دن رنجنا میرے پاس پناہ مانگنے
آئی تھی۔ اب تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی"
"لیکن اِس گناہ کو میں کہاں چھپاؤں گا؟"

انہوں نے بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اِسے گناہ مت کہئے سیٹھ جی" پاروتی نے بچّے کو چومتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا "جب گناہ تھا، تب تھا لیکن اب تو یہ ایک کنول کا پھول بن چکا ہے۔ اِس کے باپ دادا نے اِسے اور اِس کی ماں دونوں کو ہی قبول کر لیا ہے۔ اب وہ لوگ جلدی ہی بارات لے کر آئیں گے اور اِس کی ماں کو پالکی میں لے جائیں گے" کہہ کر اُس نے بچّے کو ایک بار پھر چوما اور مسکراتے ہوئے سیٹھ جی کی طرف دیکھنے لگی۔

پاروتی کی بات سن کر سیٹھ جی کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ پاروتی کے خاموش ہوتے ہی وہ جیسے گہری نیند سے جاگے۔ چونک کر بولے "کیا کہہ رہی ہو تم؟ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ میں تمہاری بات سمجھا نہیں"

"وقت آنے پر سب سمجھ جاؤ گے" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ کو جلدی ہی رحمان بھیّا کے ساتھ بھوانی گڈھ جانا ہوگا"

"کیوں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں کے زمیں دار صاحب بنسی لال جی کے ساتھ سمدھیانہ جوڑنے۔ وہ ہمارے منّے کے دادا ہوتے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے ایک بار پھر بچّے کو چوما۔ اور مسکراتے ہوئے بولی "رحمان بھیّا نے ہی سب پتہ لگایا ہے۔ اور انہوں نے ہی بھوانی گڈھ جاکر زمیں دار صاحب سے مل کر اِس بات کے لئے انہیں راضی کیا ہے"

"وہ کیسے؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولے

"بات یوں ہوئی" پاروتی بولی "کہ رنجنا بیٹی کے پاس جو چھوٹی سی گٹھری تھی، اُس میں زمیں دار کے اُس بیٹے کا فوٹو بھی تھا جس نے رنجنا بیٹی کے ساتھ محبت کا سوانگ رچا کر اُس کی عصمت لُوٹی تھی۔ اُس فوٹو کو لے کر رحمان بھیّا شہر کے ایک ایک کالج میں لگاتار کئی روز تک چکّر کاٹتے رہے۔ تاکہ فوٹو کو پہچان کر کوئی اُس کا نام پتہ بتا دے۔ آخر ایک کالج میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی اور وہاں سے نام پتہ لے کر وہ اگلے روز ہی بھوانی گڈھ روانہ ہو گئے۔ اور زمیں دار صاحب سے مل کر انہیں تمام قصّہ بتایا۔

"زمیں دار صاحب نہایت شریف اور ایماندار انسان ہیں اور وہ آپ کی ہی ذات برادری کے ہیں۔ انہوں نے بیٹے کو بلا کر اُسے بہت ڈانٹا پھٹکارا اور بلا تاخیر رنجنا بیٹی کو اپنی بہو بنانے کے لئے راضی ہو گئے"

"ہاں سیٹھ جی" رحمان نے اُس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا "زمیں دار صاحب سچ بڑے نیک اور شریف انسان ہیں۔ وہ کہنے لگے ہم خود بیٹی بیٹے والے ہیں اور ہمیں معلوم ہے اِن حالات میں ماں باپ پر کیا گزرتی ہے۔ خدا سب کی عزّت محفوظ رکھے۔ آپ سیٹھ گردھاری لال سے کہہ دیں کہ بلا کسی شرط ہماری بہو ہوئی۔ جب کہلا بھیجیں گے ہم بارات لے کر آجائیں گے لیکن میں نے یہ خیال کر کے کہ اُن کی عزّت اور وقار پر آنچ نہ آئے۔ اُن سے چار پانچ مہینے کی مہلت لے لی ہے۔ تاکہ جب تک رنجنا بیٹی بھی زچگی سے فارغ ہو جائے اور تبھی یہ کام ....."

"لیکن تب تک بچّے کا کیا ہوگا؟" سیٹھ نے بات کاٹتے ہوئے ڈر اور شبہ سے پوچھا

"اِس کی آپ کوئی فکر نہ کریں" رحمان نے سنجیدگی سے جواب دیا "زمیں دار صاحب نے فرمایا تھا کہ اسے کچھ عرصے کے لئے کسی آیا کو سونپ دیا جائے۔ جس کا خرچ وہ خود برداشت کریں گے مگر پاروتی بہن نہیں مانیں"

"کیوں؟" سیٹھ جی نے رحم طلب نگاہوں سے پاروتی کی جانب دیکھا۔

"ہاں، سیٹھ جی" پاروتی نے جواب دیا "میں نہیں چاہتی کہ ہمارا منّا کسی غیر کے پاس رہے

"لیکن ۔ ۔ ۔ ۔" سیٹھ جی کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ بس ٹکر ٹکر پاروتی اور رحمان کو دیکھتے رہے۔

پاروتی پھر مسکرائی لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوگئی "آپ فکر کیوں کرتے ہیں سیٹھ جی؟ مہتاب تک میرے پاس رہے گا جب تک یہ اپنے باپ دادا کے گھر نہیں جاتا۔ آپ سمجھ گئے نا ۔۔۔ تب تک رنجنا بیٹی کا گناہ میرا اپنا گناہ بنا رہے گا۔ اور محلے والوں کو اِس راز کا بالکل پتہ نہ چلے گا۔"

اگلے دن محلے میں ایک قیامت برپا ہوگئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ پاپن پاروتی پھر لوٹ آئی ہے۔ اور اس کے گھر سے ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آوازیں سنائی پڑ رہی ہیں۔ محلے کا ہر فرد جو گھر سے باہر آیا کہہ رہا تھا۔ اور پاروتی کے گھر کے باہر محلے والوں کا ایک مجمع لگ رہا تھا۔ بھوڑمل سیٹھ جی بھی تھے۔ لیکن آج وہ محلے والوں کو چپ رہنے کی نصیحت کر رہے تھے۔ مری ہوئی سی آواز میں انہیں سمجھا رہے تھے "بھائیو! بیکار کی تکرار ٹھیک نہیں ہوتی۔ وہ پاپن پاگناہ گار ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں اس سے کیا مطلب؟ اُس کے اعمال اُس کے ساتھ ہیں اور ہمارے ہمارے ساتھ ۔۔۔"

پھر تھوڑی دیر بعد ان کی نصیحت کو مان کر جب رفتہ رفتہ محلے کے سب لوگ چلے گئے تو انہوں نے پاروتی کے گھر کی طرف اس نظر سے دیکھا جیسے کسی دیوی کے مندر کی جانب دیکھ رہے ہوں۔ پھر انہوں نے ناقابلِ ذکر عقیدت اور شردھا سے اس مندر کی طرف سر جھکایا اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل دیئے ●



"منے کی اماں، دروازہ نہیں کھولنا ہے تو نہ کھولو۔ ۔۔۔ کھڑکی سے ۔۔۔"



پچھلی رات خواب دیکھا کہ میں ہمالیہ پر چڑھ رہی ہوں اور اس کی برفیلی ڈھلانوں پر بار بار پاؤں پھسل رہے ہیں۔ صبح جب میں نے یہ خواب اپنی سہیلیوں کو سنایا تو ان میں سے ایک نے بڑی مسرت سے کہا "بھئی، مجھے تو خواب کبھی بھی نہیں دکھائی دیتے۔ میں تو گہری نیند سوتی ہوں۔"

لیکن کیا خوابوں کا نہ دکھائی دینا گہری نیند اور خوش رہنے کی علامت ہے؟ کیا ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کبھی بھی خواب نہیں دیکھتے؟ دراصل بغیر خواب کی نیند پر جو اظہار اطمینان کیا جاتا ہے وہ خواب کے بارے میں مروجہ غلط فہمیوں اور قدامت پرستی کے باعث کیا جاتا ہے۔

کچھ سال پہلے تک خواب دیکھنا بُرا سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ زیادہ کھانا کھانے اور گندے خیالات کی وجہ سے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں کے بارے میں یہ نظریہ کہ گندے خیالات ہی خواب میں عملی شکل میں نظر آتے ہیں اتنا زیادہ مستحکم تھا کہ برسوں تک 'گڈ نائٹ سویٹ ڈریم' کے محاورے سے مجھے ذہنی ہم آہنگی حاصل نہ ہو سکی۔ میں سمجھتی تھی کہ بے خواب کی رات ہی اچھی یا پرسکون رات ہوتی ہے۔

لیکن میں غلطی پر تھی۔ اب سائنس دانوں نے خواب کے بارے میں بہت سی مروجہ غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آدمی کو خوش رکھنے اور اس کا ذہنی توازن برقرار رکھنے کے لئے خواب آنا اتنا ضروری ہے جتنا کہ نیند کا آنا لازمی ہے۔

کچھ لوگوں نے خود کو سائنس دانوں کے حوالے کر دیا اور سائنس دانوں نے ان پر عالم خوا

تجربے کئے ہیں۔ انہوں نے اس بے خوابی
راز کو اجاگر کر دیا ہے۔ اب وہ خوابوں کے
ے میں ایک علیحدہ سائنس کو جنم دینے میں
دِف ہیں۔ سوتے ہوئے بچوں کی آنکھوں کی
ں جلدی جلدی حرکت کرتی ہیں اسے دیکھ کر
س دانوں نے تجربے کے لئے لوگوں کی پلکوں
سروں پر چھوٹے چھوٹے 'الیکٹروڈس' لگا دیئے
،تاکہ آنکھوں کی حرکت اور دماغ کی کیفیت کو
کے ذریعے ناپا جا سکے۔

ایک رات کے بعد دوسری رات پھر کئی
ں تک ان لوگوں پر تجربے ہوتے رہے، جنہوں
خود کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا تھا۔ دیکھا گیا کہ
، مخصوص وقفے کے بعد کئی بار آنکھوں میں دھکے
جھٹکے کے ساتھ حرکت ہوتی ہے۔

ایسے وقت جب ایک والنٹیر کو جگایا گیا تو
نے بتایا کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن دوسرے
ت پر جگانے سے معلوم ہوا کہ خواب نہیں دیکھ
تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ
ں خواب نہیں دکھائی دیتے جب انہیں ان کی
ھوں کی گردش کے بعد فوراً جگایا گیا تو انہوں
، بتایا کہ وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ بہت سے
بوں کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہر آدمی یہاں تک
چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہر رات خواب دیکھتے
،، یہی نہیں بلکہ ہر شخص ایک رات میں اوسطاً
سے سات خواب دیکھتا ہے۔ ہمارے سونے
تقریباً بیس فی صد وقت خواب دیکھنے میں گذر جاتا ہے۔

اگر ایسا ہے تو ہم میں سے بیشتر لوگ
خواب یاد کیوں نہیں رکھ پاتے؟

اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہمیں ان
خوابوں کے بتانے میں شرم محسوس ہوتی ہے۔
اس لئے ان کا ذکر ہم کسی سے نہیں کرتے۔ ممکن
ہے ایسا بھی ہو لیکن دوسرے اسباب بھی ہیں
جن کا اثر خوابوں کے یاد رکھنے پر پڑتا ہے —
چاہے ہم اُن کا ذکر کریں یا نہیں۔

خواب دیکھنا نیند کی شعوری کیفیت ہوتی ہے۔
اس وقت دماغ میں ہلکی ہلکی سی حرکت
ہوتی ہے۔ یادداشت، جو کہ قوت استدلال
کی امداد کرتی ہے اور جمالیاتی حس کی تکمیل کرتی
ہے، سوئی رہتی ہے۔ خواب دیکھنے والا شخص
شراب پیئے ہوئے شخص کی طرح مدہوش ہو جاتا
ہے۔ اسی لئے، خواب جلدی دکھائی دے جاتے
ہیں اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ خواب
یاد رکھنے کی صلاحیت بھی کم ہو جاتی ہے۔

جیسے ہی آنکھ کھلے اگر اسی وقت خواب
یاد کیا جائے تو یاد رہ سکتا ہے۔ اس وقت
خواب منتشر نہیں ہو پاتا۔ پانچ منٹ گزرنے
کے بعد خواب دُھندلا پڑ جاتا ہے اور مزید پانچ
یا دس منٹ کے بعد ہو سکتا ہے کہ خواب یاد
نہ رہے۔

اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ خواب یاد
رکھ پاتا ہے تو اس کا سبب خواب دیکھنے
کے بعد فوراً جاگ جانا، خواب یاد کرنا اور
اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لینا ہے۔
اس طرح کے خواب ایک یا دو دن کے بعد بھی
یاد آ سکتے ہیں بشرطیکہ ان سے ملتے جلتے واقعات
ظہور پذیر ہوں۔ لیکن عام طور پر ہم صرف اُنہی

خوابوں کو یاد رکھ پاتے ہیں جن کے دیکھنے کے فوراً بعد ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اکثر ایسے خوابوں کو ہم اچھا سمجھتے ہیں۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں کبھی نیند نہیں آتی انہیں شاید خواب دکھائی دیتا ہے کہ وہ بیدار ہیں۔

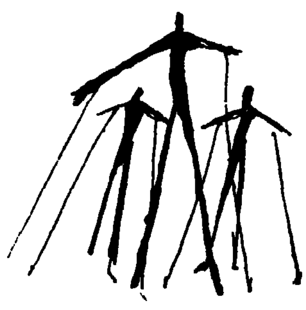
ایک عام وہم یہ ہے کہ خواب کی دنیا میں وقت کم ہوتا ہے اور ہم تھوڑے سے وقت ہی میں ایک پورا خواب دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ ایک خواب نو منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک بھی چل سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی ۔ ۔ ۔ میں کسی ایک واقعہ کے ظہور پذیر ہونے میں جتنا وقت لگتا ہے اتنا ہی وقت خواب کے دیکھنے میں بھی صرف ہوتا ہے۔

ایک اور حقیقت دیکھنے میں آئی ہے کہ خواب دیکھنے میں نیند کا بالترتیب سلسلہ چلتا ہے آدمی پہلے نوے منٹ تک خوابوں کے بغیر اور گہری نیند سوتا ہے۔ اس کے بعد اُس کا پہلا خواب شروع ہوتا ہے جو تقریباً نو منٹ تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر ۹۰ منٹ کے لئے گہری نیند سوجاتا ہے۔

دوسرا خواب پہلے خواب سے زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ یہ تقریباً اُنیس منٹ تک چلتا ہے۔ اس طرح ہر خواب طویل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تیسرا خواب ۲۴ منٹ کا اور چوتھا ۲۸ منٹ کا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ بالغ انسان کی بغیر خواب کی نیند کا وقت کبھی نوے منٹ ہی ہوتا ہے۔ اس مقررہ فرق کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن سائنس دانوں کا عقیدہ ہے کہ اس کا رشتہ نیند اور اختیار سے ہے۔ بچوں کے مشاہدے سے اس کا اندازہ ہوا ہے۔ بچے ایک گھنٹے کے لئے گہری نیند سوتے ہیں، پھر کسمساتے ہیں اور اس کے بعد یا تو وہ پھر ایک گھنٹہ میں سوجاتے ہیں یا پوری طرح جاگ اُٹھتے ہیں۔ نیند کی یہ صورتِ حال عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور بالغ ہونے پر آدمی ۹۰ منٹ تک گہری نیند سونے لگتا ہے۔

اگر آپ کسی سوتے ہوئے شخص کو کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھیں تو یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کیوں کہ ایسا تو خواب دیکھنے کے پہلے یا بعد ہوتا ہے۔ شاید اس وقت جسم خواب دیکھنے کے لئے مناسب حالت میں آنے کے لئے تیاری کر رہا ہو کیوں کہ خواب دیکھتے وقت آدمی بالکل ساکت رہتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آنکھیں اور انگلیاں حرکت کرتی ہیں۔



علم خواب خوابوں کی نئی نئی قسموں کا پتہ لگا رہا ہے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ خواب دیکھتی ہیں۔ نوجوان بوڑھوں سے زیادہ خواب دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عقل مند لوگ اپنے سے کم عقل والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خواب دیکھتے ہیں۔ عورتوں اور مقابلتاً کم عمر کے جوانوں کو مردوں اور بوڑھوں کی بہ نسبت زیادہ رنگین خواب دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے خواب کا تعلق

ایک تہائی حصہ رنگین ہوتا ہے اور بقیہ دو تہائی صرف کالے و سفید رنگ ہی پر منحصر ہوتا ہے۔

ایک اور پہلو جو اُجاگر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ صرف کچھ تھوڑے ہی سے خواب محبت اور دوستی کے جذبے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قتل کی وارداتیں دکھائی دیتی ہیں لیکن بیش تر خوابوں میں مارپیٹ وغیرہ دکھائی دیتی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ خوابوں میں ہم اپنے ان خیالات کو عملی تشکیل دے سکتے ہیں جنہیں عالم بیداری میں مجبوریوں کے باعث عملی روپ نہیں دے سکے۔

کیا خوابوں میں مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی جھلک ہوتی ہے؟ بائبل کے مطابق اور

کہاں نکل جاتے!

عدم کو یاں سے تو گھبرا کر اے اجل جاتے
وہاں بھی جی جو نہ لگتا کہاں نکل جاتے
سیاہ کار وہ ہوں حشر میں حساب میرا
جو وقت صبح سے ہوتا چراغ جل جاتے
بُتوں کی بھی جو پرستش نہ کرتے اے زاہد،
خدا کے سامنے ہم لے کے کیا عمل جاتے
دکھا کے تیغ جو مقتل سے یار بڑھ چلتا
اجل کے پاؤں پہ سر رکھ کے ہم مچل جاتے
پتنگ بن کے لپٹتے تو شمع رویوں سے
وہ ہم نہ تھے کہ تپ ہجر سے پگھل جاتے
— امیر مینائی

ابراہم لنکن جیسی عظیم ہستیوں کا مستقبل بتانے والے خوابوں کے باوجود ماہر نفسیات کا عقیدہ ہے کہ خواب مستقبل کے بارے میں صحیح رہنمائی نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نظریہ خواب دیکھنے والے کی خام خیالی پر منحصر ہوتا ہے۔ مختلف لوگوں کے خوابوں میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے اس لئے خوابوں کی تعبیریں پیش کرنے والی کتابوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ یہ یکسانیت اس لئے ہوتی ہے کہ سب لوگ ایک طرح کے خراب خیالات کو دباتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت زیادہ دولت کی خواہش۔ لیکن سب ہی لوگوں کو خواب میں اس خواہش کے الگ الگ مطلب اور روپ دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی ایک نہیں۔

جس آدمی کو اپنے پیروں کے ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے اس کو اڑنے کا خواب دکھائی دے سکتا ہے۔ اگر کسی دوسرے شخص کو بھی ایسا ہی خواب دکھائی دیتا ہو تو ممکن ہے کہ وہ غیر ملکوں میں اڑ کر جانے کی اپنی خواہش کو عملی روپ دے رہا ہو۔ صرف وہی شخص جو خواب دیکھنے والے فرد کی زندگی اور تجربات و نظریات سے واقف ہو اس کے خواب کا صحیح مطلب بتا سکتا ہے۔ لیکن ہمیشہ خواب سے مستقبل کے حالات و واقعات کی نشاں دہی کرنا یکسر غلط ہے

کیا ایک ہی خواب کا بار بار دکھائی دینا، کسی شخص کی بھلائی کی علامت ہے؟ سائنس دانوں کا عقیدہ ہے کہ جس طرح زندگی کے لئے ہوا ضروری ہے، اسی طرح خواب بھی لازمی ہے۔

خوابوں کی اہمیت کا تجزیہ کرنے کے لئے رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کئے ہوئے دو گروہوں پر تجربے کئے گئے۔ ایک گروہ کے لوگوں کو خواب دیکھنے کا موقع دیا گیا اور خواب کے ختم ہوتے ہی ان کو جگا دیا گیا۔ دوسرے گروہ کے لوگوں نے جیسے ہی خواب دیکھنا شروع کیا انہیں جگا دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں پھر سونے دیا گیا۔

دونوں گروپ کے لوگوں کو برابر برابر نیند آئی لیکن جس گروہ کے لوگوں کو خواب نہیں دیکھنے دیئے گئے وہ دھیرے دھیرے چڑچڑے ہوگئے۔ ان کے لئے یکسوئی کی حالت میں رہنا مشکل ہوگیا۔ کچھ کو تفکرات نے گھیر لیا، کچھ گھبرائے سے رہنے لگے۔ لیکن دوسرے گروہ کے لوگوں پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔

یہی نہیں، جن لوگوں کو خواب نہیں دیکھنے دیئے گئے انہیں تجرباتی دَور ہی میں زیادہ خواب دکھائی دیئے۔ ایک شخص کو جسے پہلے دن سات خواب دکھائی دیتے دوسرے دن ۳ سے ۱۰، تیسرے دن ۱۷ اور چوتھے دن ۱۷ خواب دکھائی دیئے۔ یعنی جب ان کا تجرباتی دَور ختم ہوگیا تو تو انہوں نے خوابوں کی کمی کو زیادہ خواب دیکھ کر پورا کرلیا۔

نئے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر کبھی آدمی کو خواب دیکھنے کی عام رفتار سے محروم کردیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت خراب ہوسکتا ہے اور اس کی شخصیت پر بہت بُرا اثر پڑ سکتا ہے یہاں تک کہ وہ پاگل بھی ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف سماجی اور مختلف بندشیں انسان کو اس کی بہت سی خواہشوں کو عملی شکل دینے سے باز رکھتی ہیں لیکن خوابوں میں ایسے خیالات، جیسے تشدد، ناپسندیدگی، نفرت، غصہ وغیرہ کو اچھی طرح پورا کیا جاسکتا ہے، جس سے زندگی میں ہم آہنگی اور سکون پیدا ہونے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرے لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچائے بغیر انسان خوابوں میں اپنی ادھوری خواہشوں کو پورا کرسکتا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں دولت، محبت، خوشی اور عوض و معاوضہ سب ہی کچھ اس کا اپنا ہوتا ہے خوابوں میں اسے ناامیدی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ حقیقت میں یہ خواب اتنے دل کش ہوتے ہیں کہ ہم انہیں دیکھتے ہی رہنا چاہتے ہیں۔

خواب کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری نیند محفوظ رہتی ہے۔ اگر آپ خواب دیکھتے ہوئے آدمی پر ٹھنڈا پانی بھی ڈال دیں تب بھی وہ بیدار نہیں ہوگا کیوں کہ اسے محسوس ہوگا کہ یہ سب خواب ہی میں ہو رہا ہے ممکن ہے کہ جب گرمی کے دن ہوں تو ٹھنڈ پانی اوپر پڑنے سے خواب دیکھنے والا آدمی ٹھنڈک پاکر اور بھی گہری نیند سو جائے۔

سائنس داں خوابوں کے اس علم کو انسانی خدمت میں استعمال کرنے کے طریقوں کی تلاش میں ہیں۔ ماہرین نفسیات نے اس علم کے ذریعے کئی قسم کی جسمانی اور اعصابی بیماریوں سے لوگوں کو نجات دلائی ہے شاید آگے چل کر رات کو زیادہ تکلیف پہنچانے والے مرض دمہ اور ناسور وغیرہ کا علاج بھی اسی طرح کیا جاسکے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ دن بھی دور نہیں جب بُرے خوابوں کی جگہ اچھے خوابوں ہی کو دکھایا جاسکے یعنی خوابوں کو بدلا جاسکے۔ رات اچھی طرح گذرے، شیریں خواب نظر آئیں، شاید یہ نیک خواہشات نئے علم خواب سے شرمندۂ تعبیر ہوسکیں۔ ●

[illegible]



جامع مسجد کے صدر دروازے کے سامنے اور میرے بالائی کمرے کی کھڑکی کے
پے کی جگہ ایک مدّت سے مستان بابا کے لئے
ے مخصوص تھی اور وہ مالکانہ رعب کے ساتھ
ں پر قابض تھا کیوں کہ ایک تو تراہا ہونے کے
سب سے اِدھر سے راہ گیروں کی آمدورفت
افی تھی۔ دوسرے مسجد کا قُرب ہونے کی وجہ
ے بھی یہ جگہ اُس کے پیشے کے لئے بہت موزوں تھی۔

قریب ۵۰ سال کے مضبوط اور سیاہ فام
سم کا مستان بابا صبح سے شام تک پیڑ کے
نیچے سر جھکائے آنے جانے والوں کی آہٹ پر
کان لگائے خاموش بیٹھا رہتا۔ مگر اُس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی بدبو، بڑے بڑے ناخن، لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال اور بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ کلائیوں میں پڑے ہوئے لوہے کے موٹے موٹے کڑے، مستان بابا کے وہ انداز تھے جنہوں نے اُس کی خاموشی کو اتنا پُراثر بنادیا تھا کہ اُسے نظر انداز کرنا بہت مشکل تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مستان بابا ایک مخصوص انداز سے جھُرجھری لیتا اور ہاتھوں کو اس طرح جھٹکتا کہ لوہے کے کڑے زور سے بج اُٹھتے اور اکثر اُن کڑوں کے چھناکے کے ساتھ ہی اس کے سامنے رکھے ہوئے برتن میں کسی سکّے کے گِرنے کی کھنک سنائی دیتی۔

آس پاس کوئی دوسرا فقیر نہیں بیٹھ سکتا تھا ایک آدھ مرتبہ دوسرے فقیروں نے رہ گذر کی اہمیت کو دیکھ کر وہاں دعاؤں کی دُکان لگانے کی کوشش کی بھی مگر مستان بابا نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

جمعہ کے دن جب کہ جامع مسجد پر صرف شہر ہی نہیں بلکہ قریب کے بیرونی مقامات کے فقیر بھی جمع ہوتے تو مستان بابا بے بس ہوجاتا اُس کی ذات اور جگہ کی پہلے جیسی اہمیت باقی نہ رہتی مگر پھر بھی مستان بابا نمازیوں کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چھپھڑوں کو پورے زور سے پھُلاکر نعرہ لگا

بلند کرتا رہتا اور جھرجھری لے کر ہاتھوں کو جھٹکتا اور اس طرح اپنے وجود کو دوسرے تمام فقیروں میں نمایاں کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

•

اپنے مخصوص حلیے اور اداؤں سے مستان بابا نے ہر طبقے کے جاہل مردوں اور عورتوں میں اپنے عقیدت مندوں کا اچھا خاصہ حلقہ بنا لیا تھا اور اب وہ ایک بھیک مانگنے والا فقیر نہیں، بلکہ پہنچا ہوا درویش تھا۔ جس کے بارے میں عقیدت مندوں کے مختلف خیالات تھے۔ کوئی کہتا مستان بابا کے قبضے میں جنّات ہیں، جن سے وہ جو کام چاہتا ہے کرا لیتا ہے۔ کوئی کہتا مستان بابا پر کسی بڑے پیر کا سایہ ہے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کی ہر بات کرا لیتا ہے۔ اور کسی کا خیال تھا کہ چوں کہ مستان بابا نے دنیا ترک کر دی ہے اور خود کو یادِ الٰہی میں فنا کر دیا ہے۔ اس لئے اُس کی روحانی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ لوگوں کے بگڑے کام بنا دیتا ہے۔

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو، اکثر مستان بابا کے پاس عورتیں اور مرد بیٹھے سرگوشیاں کرتے نظر آتے۔ مستان بابا کسی کے سر پر ہاتھ پھیر دیتا، کسی کے سینے پر پھونک دیتا، کسی کو خاک کی چٹکی عنایت کرتا اور کسی کے لئے ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے دعا کرتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ مستان بابا کسی عقیدت مند پر چیخ پڑتا، اُسے گالیاں دیتا اور بھاگ جانے کو کہتا۔ اور لوگ کہتے کہ یہی وہ کرم ہے جو صرف قسمت والے پر ہی ہوتا ہے۔ جس کے بعد مُراد کا بر آنا لازمی بات ہے۔

میرے بالائی کمرے کی دوسری کھڑکی اس شکستہ مکان کے صحن میں کھُلتی تھی جس میں مستان بابا رہا کرتا تھا۔ اس لاوارث شکستہ مکان پر بھی اُس نے اسی رعب کے ساتھ قبضہ کر رکھا تھا جس کے ساتھ برگد کے پیڑ کے نیچے کی جگہ اس کی جاگیر بنی ہوئی تھی۔

مستان بابا کسی کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور کسی کے لئے ہاتھ اُٹھا پڑتا، اُسے گالیاں دیتا اور بھاگ

میری کھڑکی سے مکان کا صحن اور نیم تاریک دالان صاف نظر آتا تھا۔ جس میں پوال کے اوپر مستان بابا کا میلا بستر تھا۔ اس کے علاوہ دالان میں ایک کھونٹی پہ چند کپڑے، راکھ سے بھرا ہوا اینٹوں کا چولھا، مٹی کے چند برتن اور ٹین کا ایک زنگ آلود ٹرنک تھا۔ اور یہی مستان بابا کی پوری کائنات تھی۔

مستان بابا کا بزنس بڑی اچھی طرح چل رہا تھا کہ ایک دن ایک نیا رقیب آگیا۔

اُس کی عمر قریب ۴۰ سال ہوگی۔ بھرا بدن، سانولا رنگ، بکھرے ہوئے خشک بال، جسم پر میل اور پھٹے ہوئے کپڑے۔ جن میں سے جگہ جگہ سے جسم عریاں ہو رہا تھا۔ شانوں پر میلی سی چادر ڈالے وہ آئی اور بغل میں دبی ہوئی پوٹلی کو گھٹنے کے نیچے دبا کر برگد کے پیڑ کے نیچے بہت اطمینان سے بیٹھ کر کپڑوں سے جوئیں چننے لگی۔

مستان بابا اس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ دوپہر سے مغرب کے وقت تک وہ بھیک مانگتی رہی اور پھر جب رات ہونے لگی اور راہ گیروں کی آمد و رفت کم ہو گئی تو پیڑ کے نیچے ہی گٹھری سر کے نیچے رکھ کر سو گئی

جب مستان بابا آیا تو چراغ یا ہو گیا۔

"ابے کون ہے تو؟ اٹھ بے اٹھ" مستان بابا نے لاٹھی سے اُس کی ٹانگ ہلائی " باپ کی جگہ سمجھ کر سو رہا ہے کیا؟"

وہ گڑبڑا کر اٹھی، چند لمحے اُس نے مستان کو خاموشی سے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ

پھیر دیتا، کسی کے سینے پر پھونک دیتا، کسی کو خاک کی چٹکی عنایت خاموشی سے دعا کرتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ مستان بابا کسی عقیدت مند پر چیخ جانے کو کہتا اور لوگ کہتے کہ یہی وہ کرم ہے جس کے بعد مُراد کا بر آنا لازمی ہے۔

لاٹھی چھین کر دور پھینک دی۔

"اے مسٹنڈے، میں نے کہا تو نے لاٹھی کیسے لگائی حرام خور۔ تیرے باپ نے ٹھیکہ لیا ہے سڑک کا ——— کلیجہ چاب لوں گی ہاں۔ میرا نام فضلی ہے فضلی ——— خبردار جو آگے بات کی۔ مُردار . . . ۔"

مستان بابا نے سمجھا تھا کوئی مرد ہے۔ عورت کو دیکھ کر کچھ تو ویسے ہی حیران تھا پھر فضلی کی زبان درازی نے اُسے اور بھی ہکا بکا کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش کھڑا رہا اور پھر جب فضلی نے ذرا دم لیا تو مستان بابا نے اپنے مخصوص انداز میں جھُرجھری لی، ہاتھوں کو جھٹکا اور نعرۂ تکبیر بلند کیا مگر فضلی پر اِس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

"جانتی نہیں مستان بابا کو۔ جلا کر خاک کر دوں گا" مستان بابا نے گرج کر کہا۔

"چل چل، یہ ڈھونگ اور کسی پر چلا۔ تجھ ایسے جانے کتنے مستان بابا دیکھے ہیں ہم نے" فضلی نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔

راہ گیر رُک گئے تھے۔ مستان بابا نے آنکھیں نکال کر راہ گیروں کو گھورا "جاؤ، جاؤ، خدا کا قہر ٹوٹنے والا ہے" مستان بابا نے جھُرجھری لے کر ہاتھوں کو جھٹکا اور راہ گیر تیزی سے چل پڑے۔

تھوڑی دیر مستان بابا خاموش رہے۔ پھر لاٹھی اٹھائی اور پیڑ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"تو آئی کہاں سے ہے؟" مستان بابا کا لہجہ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

"ذرا پرے ہٹ کر کھڑا ہو رے" فضلی نے جل کر کہا۔

"تو آئی کہاں سے ہے؟" مستان بابا نے پھر پوچھا۔

"تجھ سے مطلب ——— تو کہاں سے آیا ہے؟" فضلی اب بھی برہم تھی۔

"میں تو یہاں ہی رہتا ہوں" مستان بابا کا لہجہ مصالحت آمیز ہو گیا۔

"رہتا ہوگا" فضلی نے بے نیازی کے ساتھ کہا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر لیٹ گئی۔

"میں تجھ کو یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ دیکھ جھگڑا مت بڑھا، اُٹھ جا" مستان بابا بے بسی کے ساتھ بولا۔

فضلی نے کوئی پرواہ نہیں کی۔

"مکاری مت گانٹھ" مستان بابا نے فضلی کا شانہ ہلایا "اُٹھ یہاں سے۔"

فضلی تڑپ کر اٹھی۔ مستان بابا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مکار ہوگا تو۔ تیرا باپ۔ حرام خور ہاتھ لگاتے شرم نہیں آتی۔ بابا بن کر بدمعاشی کرتا ہے داڑھی نوچ لوں گی اب کے جو ہاتھ لگایا۔"

راہ گیر پھر رک گئے۔ تب مستان بابا نے راہ گیروں سے مدد چاہی۔

"آپ مائی باپ ہیں۔ انصاف کرو لوگو — میں اِس جگہ پر برسوں سے بیٹھتا آرہا ہوں۔ آج نہ جانے یہ کہاں سے آگئی اور میری جگہ گھیر لی۔

اب جو میں ......"

"تو یوں بول نا سیدھے منہ سے ـــــ لکڑی کیسے لگائی تو نے۔ کوئی بھیڑ بکری سمجھا ہے؟ اپنی مائی کے خصم ہاتھ کیوں لگایا؟" فضلی بولی اور اپنی گٹھری سمیٹتی ہوئی اٹھنے لگی۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ تو جا یہاں سے" راہ گیروں میں سے کسی نے کہا۔ فضلی نے کوئی جواب نہیں دیا، گٹھری بغل میں دبا کر مسجد کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

کپڑوں کی گٹھری کو سر کے نیچے رکھ کر فضلی سیڑھیوں پر ایک کونے میں اطمینان کے ساتھ لیٹ گئی۔ خلاف معمول مستان بابا نے اُس کو مسجد کے دروازے سے ہٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید اُس نے سوچا کہ فضلی کا قیام عارضی ہے۔ پھر وہ فضلی سے مرعوب بھی ہو گیا تھا۔

مستان بابا عشاء کی نماز کے وقت تک برگد کے نیچے بیٹھا رہا۔ حالاں کہ روز وہ مغرب کے وقت گھر چلا جاتا تھا۔ اور پھر جب وہ چلا تو مسجد کے دروازے پر فضلی سے ذرا دور ہٹ کر ٹھہر گیا

"مسجد کا راستہ ہے یہ۔ گھیر کر بیٹھے گی تو کوئی ٹھوکر مار کر اٹھا دے گا۔ میری مان تو کہیں اور چلی جا۔"

فضلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیوں ری، بتاتی کیوں نہیں، تو آئی کہاں سے ہے؟" مستان بابا نے کہا۔

فضلی پھر خاموش رہی۔

"کیا تیرا کوئی نہیں۔ عورت ذات ہو کر اکیلی یہاں ......"

"ارے کیوں ٹر ٹر کرتا ہے؟" فضلی اٹھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں" مستان بابا گڑبڑا کر بولا "میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زمانہ خراب ہے

عورت ذات کو رات . . . . "

"ارے چل اپنا رستہ لے۔ اونہہ عورت ذات!" فضلی طنزیہ مسکرائی "ہمت ہے کسی مائی کے لال میں تو ہاتھ لگا کر دیکھے۔"

"اب تو جان، میرا کام تو بتانا تھا" مستان بابا چلتے ہوئے بولا اور فضلی بے فکری کے ساتھ پھر لیٹ گئی۔

دوسرے دن صبح مستان بابا خلافِ معمول بہت سویرے برگد کے نیچے آگیا۔ فضلی ابھی چادر میں منہ ڈھکے سو رہی تھی۔ مستان بابا کا رُخ آج مسجد کے دروازے کی طرف تھا۔

سڑک پر ابھی آمد و رفت زیادہ نہیں تھی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ پائے بغیر ہی مستان بابا نے دو تین مرتبہ جھرجھری لی اور ہاتھوں کو جھٹکا فضلی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔ مستان بابا نے خلافِ معمول زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ فضلی نے کسمسا کر کروٹ بدل لی اور تب مستان بابا اپنی جگہ سے اُٹھا اور ڈرے ڈرے قدموں سے فضلی کے قریب پہنچ کر بولا۔

"فضلی، اری او فضلی!"

"کیا ہے؟" فضلی نے چادر سے منہ نکالا۔

"نماز کا وقت ہے۔ رب کا نام لے" مستان بابا کا لہجہ نرم تھا۔

"تجھے کیا؟" فضلی کا لہجہ سپاٹ تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے کیا ہوتا؟" مستان بابا بولا "میں تو کہتا ہوں صبح صبح رب کا نام لے۔"

"تو نے لیا؟" فضلی کا لہجہ ترش ہوگیا۔

"او ہو، تو تو بات کرتے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ میرا کام تو نیک راہ بتانے کا تھا آگے تو جان" مستان بابا مایوس لہجے میں بولا۔ اور اپنی جگہ واپس آگیا۔

دن بھر مستان بابا اور فضلی میں نوک جھونک ہوتی رہی۔

دوسرے دن قدرے سکون رہا۔ صرف دو ایک بار ہلکی سی جھڑپ ہوئی۔

اگلے روز ماحول پُر امن تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ اور پھر ماحول دوستانہ ہو گیا۔

آج مستان بابا کی گردن جھکی نہیں رہی۔ اُس کا رُخ مسجد کے دروازے ہی کی طرف تھا۔ اور اب مستان بابا اس طرح گاہے گاہے جُھرجُھری لیتا اور ہاتھ جھٹکتا جیسے بھولا ہوا فرض یاد آگیا ہو۔ فضلی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی سر میں کنگھی کرتی اور جوئیں مارتی رہی۔ کبھی کبھی مستان بابا کوئی بات کرتا تو فضلی نرمی سے جواب دیتی رہی۔ آج بھی مستان بابا خلافِ معمول عشاء کی نماز کے بعد تک برگد کے نیچے بیٹھا رہا۔

دوسرے روز صبح میں نے مستان بابا کو پہلی مرتبہ سڑک کے نل پر ہاتھ اور پاؤں دھوتے دیکھا۔ ہاتھوں کو کنگھی کر کے اُس نے بکھری ہوئی داڑھی اور سر کے بال سمیٹے، لبادہ جھاڑا اور برگد کے نیچے آنے سے پہلے فضلی کے پاس گیا۔ فضلی بیدار ہو چکی تھی۔

"تو نے چائے پانی کر لیا؟" مستان بابا نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" فضلی بولی۔

"تو پھر بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ جا جا کے بازار کے ہوٹل سے چائے پی آ۔ کیا پیسے نہیں ہیں؟" مستان بابا نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ہیں کیوں نہیں"، فضلی بولی۔

"تو پھر جا، اور سن" مستان بابا بولا "خدا کی بندی، ذرا سویرے سے جاگا کر اور رب کا نام لیا کر۔"

فضلی نے چادر سمیٹ کر جسم کے گرد لپیٹی، اور خاموشی سے پیالہ اٹھا کر بازار کی طرف چل دی مستان بابا برگد کے نیچے آگیا۔

رات کو جب مستان بابا گھر جانے لگا تو پہلے فضلی کے پاس گیا اور لبادے کے نیچے سے پیالہ نکال کر فضلی کے برابر رکھ دیا۔

"یہ بریانی ہے، کھا لینا۔"

"تو نے کھا لی؟" فضلی نے پوچھا۔

"تو ہی کھا لے، میرا خیال نہ کر" مستان بابا بولا اور پیالہ فضلی کے پاس چھوڑ کر چل دیا۔

میں نے دیکھا اس رات مستان بابا گئے رات تک پُرانے دُھلے ہوئے کپڑے سیتا رہا۔

صبح مستان بابا نے دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس نے نل پر ہاتھ منہ دھویا، سر اور داڑھی کے بال کنگھی کر کے سمیٹے اور مسجد کے دروازے پر آیا۔ فضلی بیٹھی کپڑوں سے جوئیں بین رہی تھی۔

"چائے پانی کر لیا؟" مستان بابا نے پوچھا۔

"ہاں" فضلی بولی۔

"خدا کی بندی کبھی ہاتھ منہ بھی دھو لیا کر" مستان بابا بولا "وہ سامنے سڑک پر نل ہے کوئی منع تھوڑی کر دے گا۔"

"تو نے تو آج کپڑے بدل رکھے ہیں" فضلی مسکرائی۔

"ارے کیا کپڑے!" مستان بابا جھینپ کر بولا "کیا تیرے پاس اور کپڑے نہیں ہیں؟ تیرے تو میلے ہو گئے ہیں۔"

"ہیں کیوں نہیں"، فضلی نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا "اِس میں ہیں۔"

"تو پھر بدل لے نا۔ پھٹے ہوئے کپڑے ٹھیک نہیں رہتے" مستان بابا نے کہا اور فضلی نے چادر ٹانگ پر پھیلالی۔

"جا، جا کے سڑک کے نل پر منہ دھو اور دیکھ نل کے بالکل سامنے میرا گھر ہے۔ وہاں جا کر کپڑے بدل لے۔ اور کیا —— کوئی سڑک پر بیٹھ کر بدلے گی؟"

"مگر وہ بھی تو پھٹے ہوئے ہیں" فضلی

حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا!" مستان بابا کچھ سوچ کر بولا۔ "آ میرے ساتھ چل۔ میں سوئی دھاگا دے دوں گا سی لینا۔ آ چل، آ۔"

فضلی اٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔

میں دوسری کھڑکی پر آگیا جو مستان بابا کے گھر میں کھلتی تھی۔

فضلی اس طرح مستان بابا کے گھر میں داخل ہوئی جیسے نئی دلہن پہلی بار سسرال میں آ رہی ہو۔

دالان میں آکر مستان بابا نے فضلی کو بستر پہ بیٹھنے کو کہا اور خود ٹرنک میں سے سوئی دھاگا اور کپڑوں کے ٹکڑے نکالنے لگا

"لے، سی لے" مستان بابا نے سوئی دھاگا در چیتھڑے فضلی کی طرف بڑھائے "ضرورت ہو تو ان کے پیوند لگا لینا" اور پھر خود ہی فضلی کی گٹھری کھول کر دیکھنے لگا جس میں دو تین پرانے جمپر، شلوار اور دوپٹہ تھا۔

"یہ جمپر ٹھیک کر لے، اور یہ شلوار، ہاں یہ ٹھیک رہے گی۔ دوپٹہ تو سفید ہی ہے۔ صرف مَ۔ خیر کوئی بات نہیں" مستان بابا نے گالی حمہ نکال کر فضلی کے سامنے ڈال دیا اور فضلی نے - جھکا لیا۔

"منہ ہاتھ بھی دھو لینا۔ اچھا میں جاتا ہوں" مستان بابا گھر سے نکل گیا۔

فضلی نے کپڑے سیئے، تبدیل کئے۔ گھر کے یک ایک کونے ۰ ایک ایک شے کا جائزہ لیا۔ باہر ۔ن پہ ہاتھ منہ دھویا۔ بال درست کئے اور جب مسجد کے دروازے کو جاتی ہوئی برگد کے پاس سے گذرنے لگی تو مستان بابا بولا۔

"یہیں بیٹھ جا دھوپ میں۔"

فضلی کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ مستان بابا نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا پھر بولا۔

"یہ گٹھری وہیں رکھ آئی ہوتی۔ میں چرا تھوڑی لیتا۔"

"یہ بات نہیں، دھیان نہیں رہا" فضلی بولی۔ مستان بابا مسکرایا۔

"خیر، بیٹھ جا۔ دروازے پر ابھی دھوپ نہیں اُتری۔ وہاں ٹھنڈ ہوگی۔"

فضلی کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی برگد سے ذرا ہی دُور سڑک کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔

کئی دن گذر گئے۔

میں نے دیکھا، مستان بابا کے ہاتھوں سے لوہے کے کڑے غائب ہوگئے داڑھی ترش کر قاعدے میں آگئی۔ بال ڈھل کر کانوں کے پیچھے سمٹ گئے، ناخن ترش گئے۔ جسم کا میل غائب ہو گیا اور کپڑے صاف رہنے لگے۔

فضلی میں بھی ایسی ہی تبدیلیاں آگئیں اُس کے بالوں میں تیل پڑنے لگا۔ ردر کنگھی ہونے لگی ۔ جوئیں غائب ہو گئیں۔ بدن صاف ستھرا ہو گیا۔ اب کپڑے جسم کے ہر حصّے کی پردہ پوشی کرنے لگے تھے اور مستان بابا کا کمبل اُس کے پاس آگیا تھا

اُس دن جمعرات تھی۔

رات کو جب سڑک سے اُٹھنے کا وقت ہوا تو مستان بابا فضلی سے بولا۔

"دیکھ کل جمعہ ہے اور تو تو جانتی ہے یہاں جانے کہاں کہاں کے فقیر جمع ہو جاتے ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ تو کل یہاں نہ بیٹھنا۔ میرے گھر میں رہنا نماز تک۔ جو ملے گا میں تجھے دے دوں گا۔"

فضلی نے بغیر کسی پس و پیش کے مستان بابا کی بات مان لی۔

اگلے دن جب جمعہ کی نماز کا وقت ہوا اور فقیر مسجد پر جمع ہونے لگے تو فضلی سڑک سے اُٹھ کر مستان بابا کے گھر میں آگئی

میں نے دیکھا، فضلی نے گھر میں جھاڑو لگائی، بستر کو جھاڑ کر دھوپ دکھائی اور پھر ٹھیک سے بچھا دیا، برتن دھوئے، چولہے کی راکھ پھینکی۔

ٹرنک کھول کر کپڑے نکالے اور پھٹے ہوئے کپڑے سینے لگی۔

جمعہ کی نماز ہو چکی اور دوسرے فقیر چلے گئے تو فضلی آئی اور برگد کے قریب بیٹھ گئی۔ مستان بابا اور فضلی رات تک سرگوشیاں کرتے رہے۔

خلافِ معمول مستان بابا اُس دن جلد ہی گھر آگیا مگر تنہا نہیں، آج اُس کے ساتھ فضلی بھی تھی میں نے دیکھا، رات تک فضلی اور مستان بابا باتیں کرتے رہے۔ وہ ہنس بھی رہے تھے، مذاق بھی کر رہے تھے اور کبھی کبھی سنجیدہ ہو کر سوچنے بھی لگتے تھے۔

فضلی نے چائے بنائی اور جب وہ چائے کا پیالہ مستان بابا کو دینے لگی تو مستان بابا نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد فضلی مستان بابا کے قریب بیٹھ گئی۔

"فضلی!" جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں مستان بابا نے فضلی کو پکارا اور اس کا بازو فضلی کی کمر میں حائل ہو گیا۔ فضلی کسمسا کر رہ گئی۔

"فضلی، فضلی" مستان بابا کے لہجے میں محبت کی گہرائیاں تھیں۔ اُس کا چہرہ فضلی کے چہرے پر جھک رہا تھا

"ہوں ـــ ہوں ـــ ہوں ـــ" فضلی کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

یکایک فضلی نے تڑپ کر چھینک لی اور مستان بابا داڑھی کے بالوں کو سمیٹتا ہوا چلنے لگا۔

پھر مستان بابا نے اپنے بستر کے دو بستر بنائے اور دونوں کافی فاصلے سے سونے لیٹ گئے۔

نہ جانے کب تک وہ باتیں کرتے رہے ـــ باتیں، جن میں دلوں کی دھڑکن اور مستقبل کے خوابوں کی گونج ہوتی ہے ـــ باتیں، جن میں جذبات کا خمار اور آرزوؤں کی تڑپ ہوتی ہے ـــ باتیں، جو ہر مرد عورت سے اور ہر عورت مرد سے کرنا چاہتی ہے۔

چند روز گذر گئے۔

فضلی اب مستقل طور سے مستان بابا کے گھر میں رہتی تھی ـــ دن بھر وہ دونوں سڑک پر بیٹھتے اور دن چھپے گھر میں چلے جاتے۔ مستان بابا دن بھر کی آمدنی اور نذرانے فضلی کے پاس رکھواتا اور فضلی اس طرح اس کا خیال رکھتی جیسے جیون ساتھی ہو مگر مستان بابا اور فضلی کے درمیان ایسا رشتہ نہیں تھا، ان کی راتیں اب بھی کنواری تھیں۔ اُن کی زندگی کی طرح کنواری۔

صبح سڑک پر آنے سے پہلے مستان بابا اور فضلی گھر کے آنگن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے اکثر میں نے مستان بابا کو تیل، کنگھا، سر دھونے کی کھل، نہانے اور کپڑے دھونے کا صابن اور ایسی ہی دوسری ضرورت کی چیزیں خریدتے دیکھا جنہیں وہ لبادے میں چھپا کر لاتا اور گھر میں آکر فضلی کے سامنے رکھ دیتا اور ان لمحوں میں فضلی کی آنکھوں میں وہ پیار، وہ چمک اور ہونٹوں پہ وہ مسکراہٹ اُبھرتی جو عورت کی آنکھوں اور ہونٹوں پر اُس وقت نظر آتی ہے جب وہ کسی مرد کے لئے شدت سے اپنائیت محسوس کرتی ہے۔ جب وہ مرد کو اپنا مالک ہی نہیں ملکیت بھی محسوس کرتی ہے ـــ اور مستان بابا کے چہرے پر اُن لمحوں میں وہ تاثرات پیدا ہوتے جو مرد کے چہرے پر اپنے فرض اور جذبات کے تقاضے کی تکمیل سے پیدا ہوتے ہیں۔

دن گذرتے رہے۔

مستان بابا کی نمایاں تبدیلیوں نے اُس کے عقیدت مندوں پر کوئی خراب اثر نہیں ڈالا تھا وہ ان تبدیلیوں کو 'میاں کی نئی شان' اور فضلی کو خاص عقیدت مند سمجھتے تھے، جس نے میاں کی خدمت کے لئے زندگی وقف کر دی تھی

ایک رات۔

پورے چاند کی وہ بڑی رومانی رات تھی مستان بابا اور فضلی جاگ رہے تھے

رات بیت رہی تھی۔

فضلی نے حسبِ معمول مستان بابا کو چائے
پلائی تھی اور اب اُس کے قریب بیٹھی ہنس
کر باتیں کر رہی تھی اور مستان بابا اُس کے
سے کھیل رہا تھا۔

پتہ نہیں فضلی نے کیا بات کہی کہ یکایک
تان بابا بہت سنجیدہ ہو گیا۔ ہاتھوں کی اُنگلیوں
یک دوسرے میں بھینچ کر اُس نے ٹھوڑی گھٹنوں
کہ لی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر مستان بابا بولا
ا مطلب یہ تھوڑی تھا فضلی —— میں تو کہہ رہا
کہ تیرا سڑک پر بیٹھنا مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔ طرح
ح کے لوگ گذرتے ہیں۔ کوئی کسی کی آنکھیں
ڑی پھوڑ سکتا ہے۔ اگر تو وہاں نہ بیٹھتی ہوتی
ج وہ لونڈے ایسی بات کیوں کہتے تجھ سے؟"

"تم تو بُرا مان گئے" فضلی سوچتے ہوئے
ی' میں کب چاہتی ہوں کہ وہاں بیٹھوں۔ میرا
ی چاہتا ہے گھر میں رہنے کو —— جی چاہتا
ہے کہ اس گھر کو صاف ستھرا کر دوں۔ فرش پر گوبری
دوں۔ دیواریں میلی پڑی ہیں ان پر پنڈول پھیروں
رے لئے کھانا بناؤں —— دروازے پر
پردہ ڈال دوں —— اور —— اور تو مجھ
سے نکاح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو روکا کس نے ہے؟" مستان بابا بولا
"تو بیٹھ گھر میں۔ مت کسی کے آگے ہاتھ پھیلا۔
میں تجھے مال مسالہ لا کر دوں گا تو روٹی بنایا کر۔
تجھے کپڑے لا دوں گا —— پردہ لا دوں گا۔ تو
جو کہے گی تجھ کو لا کر دوں گا اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ایسے لانے سے کیا؟" فضلی اُداس ہو گئی
"بھیک کے پیسے سے لایا تو کیا! بات تو یہ ہوتی
کہ تو محنت کر کے کما کر لاتا اور میں گھر میں بیٹھ کر
خرچ کرتی —— جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے سب مرد عورتیں
کرتے ہیں۔"

"فضلی!" مستان بابا تڑپ گیا۔ چند لمحے
وہ خاموشی سے فضلی کے چہرے کو گھورتا رہا اور پھر
چادر سے آنکھیں پونچھ کر سر جھکا لیا۔

دوسرے دن صبح میں نے دیکھا، مستان بابا
کے بال کٹ چکے تھے اور وہ مسجد سے بہت دور
—— ایک زیرِ تعمیر عمارت پر دوسرے مزدوروں
کے ساتھ پتھر ڈھو رہا تھا۔

میں اُسے ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔ ●

شادی کرانے والا درخت

[illegible] ۲۱ سالہ کارل [illegible] واحد ڈاکیہ ہے جسے ہر روز ایک درخت پر چڑھ کر ڈاک تقسیم کرنی پڑتی ہے۔

[illegible] میں ایک اور [illegible] کا ایک درخت پڑتا ہے اس درخت کے نام [illegible] کے [illegible] لوگوں کی چٹھیاں ہر روز آتی رہتی ہیں۔ کارل یہ چٹھیاں درخت میں [illegible] کے ایک سوراخ میں ڈال دیتا ہے۔ ضرورت مند [illegible] آتے ہیں اور [illegible] چٹھیاں لے جاتے ہیں۔

[illegible] آج تک [illegible] نے اس درخت کو ڈاک کے [illegible] سے اب تک بے شمار مرد و زن اس درخت کی وساطت سے [illegible] کر چکے ہیں۔ اس درخت کے نام دنیا بھر کے مختلف ممالک سے [illegible]

[illegible] دنیا بھر کے لوگ آتے ہیں۔



آغازِ جنوں

بدلی بدلی ہوئی ہے فضائے چمن باغباں آج غمگین غمگین ہے
ہر کلی آج افسردہ ہے اور ہر پھول غمگین غمگین ہے
آگیا آگیا موسمِ دلربا چھاگئی چھاگئی اُودی اُودی گھٹا!
ساقیا! ساقیا جامِ رنگین دے زندگانی بھی رنگین رنگین ہے
دوستی کا بھرم کھل گیا دوستو جو حقیقت تھی وہ سامنے آگئی
گھر لٹا کر مجھے کچھ سکوں مل گیا! ہم نشینوں کو تسکین تسکین ہے
جن کو شیریں بیاں جانا کرتے تھے ہم اُن کی شیریں بیانی میں اک چال تھی
اُن کی بدلی نظر آرہی ہے نظر آج ہر بات نمکین نمکین ہے
جب شجاعت کا محفل میں نام آگیا اُن کے چہرے پہ اک برہمی آگئی
اس طرح چھاگئی خامشی جس طرح صورتِ حال سنگین سنگین ہے

شجاعت جودھپوری

ے چلنے کے گھنٹہ بھر بعد سنگاپور آگیا۔ اشتیاق
نگون سے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ ساحل
نہری چادر کی مانند لگ رہا تھا۔ کنارے کے نزدیک اُگے
ئے درخت ہمارے یہاں کیرل یا کوچین جیسا منظر پیش
رہے تھے۔ ملایا جزیرہ نما کے جنوبی کنارے پر سنگاپور کا
یرہ ہے۔ بلندی سے دیکھنے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنجان
دی والی بڑی بندرگاہ ہے۔

ہوائی اڈہ خاصہ بڑا ہے اور قدرتی بھی۔ کیوں کہ
گاپور جنوب مشرقی ایشیا کا سنگم ہے۔ ہوائی جہاز
اُترتے وقت ہم نے دیکھا ہمارے دوست مسٹر صراف
مہیشوری مسکراتے ہوئے ہماری جانب آرہے تھے۔
تہ میں حیدرنگی پر "صراف کارپٹ" ان کی ہی فرم ہے۔ یہاں

البتہ اس کے دوسرے علاقوں کو دیکھنے کے لئے کافی وقت
چاہئے۔ مسٹر مہیشوری نے بتایا کہ یہاں ملیشیا کے بارے میں
تھوڑی بہت واقفیت ہو سکتی ہے کیوں کہ کلکتہ کی طرح سنگاپور
بھی ایسا شہر ہے جہاں ملیشیا کی سب ہی ریاستوں کے باشندے
آباد ہیں

ہوائی اڈے سے جاتے ہوئے شہر دیکھتا رہا۔ جولائی
کا مہینہ تھا۔ تیسرے پہر کی دھوپ میں جیسی پریشانی کلکتہ
میں رہتی ہے، ویسی یہاں نہیں تھی شاید جزیرہ ہونے
کے سبب ہوا میں خنکی تھی۔ شہر اچھا لگا، رنگون سے بھی
اچھا۔ سڑکوں پر کہیں کہیں لمبے تڑنگے سکھ، پولیس کی وردی میں
بہت اچھے لگ رہے تھے۔ گورکھے سپاہی اور ہندوستانی
تو اتنے نظر آئے کہ کبھی کبھی دھوکا ہونے لگتا تھا کہ ہم ملیشیا

ملیشیا

رامیشور تانتیا

جو ایشیا میں ہی نہیں دنیا میں، بھی ایک نیا تجربہ کر رہا ہے

ن مالیچوں کا کافی بڑا کاروبار ہے۔ درآمد برآمد کے بڑے
ر ہونے کی وجہ سے کاروباری حلقوں میں ان کی اعلےٰ
اکھ ہے۔

ڈریول ایجنٹ نے پہلے ہی سے ہمارے قیام کا
ندوبست ہوٹل میں کر رکھا تھا۔ لیکن صراف جی کے اصرار
ہم ٹال نہ سکے، ہم نے انہیں بتایا "ہمارے دورے کا
مقصد غیر ملکوں کی مالی حالت اور نظام کا مطالعہ کرنا ہے،
ں ذاتی حیثیت سے یہاں کی عوامی زندگی کو سمجھنے میں بھی
ی کی دلچسپی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ اتنے قلیل وقت میں ملایا کی
ذاتی زندگی سے متعلق مکمل واقفیت حاصل کر پانا ممکن
ہیں۔ سنگاپور تو ملیشیا فیڈریشن کا فقط ایک حصّہ ہے

کے کسی شہر سے نہیں گذر رہے ہیں بلکہ کہیں اور ہیں۔

سنگاپور کا حدود اربعہ صرف ۲۹۲ مربع میل ہے۔ اسے ایک انگریز سر ریفلس نے ۱۸۱۹ء میں آباد کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ چھوٹا سا جزیرہ دلدل اور جنگلوں سے گھرا تھا اور بحری ڈاکوؤں کا اڈا تھا جو ملکّہ سے گذرنے والے جہازوں کو لوٹا کرتے تھے۔ ان میں چینی ڈاکوؤں کا ایک گروہ بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سنگاپور کی تاریخ یقیناً پرانی ہوگی کیوں کہ جنوب میں جاوا، سماترا، بالی وغیرہ جزیرے اور شمال میں جوہور، سانگ وغیرہ کے علاوہ سیام، کمبوڈیا وغیرہ جزیرے ہیں۔ ان سب میں بھارت کے تہذیبی اور تمدنی آثار کبھی تھے اور اب بھی ہیں۔ بدات خود سنگاپور کا نام



کوالالمپور کا لی بان محل

ظاہر کرتا ہے کہ کبھی اس کا نام سنگھ پور رہا ہوگا۔
گنجان آبادی ہے۔ تقریباً سبھی مشرقی ملکوں میں
گنجان آبادی ہے۔ پھر بھی سنگاپور کو دیکھنے پر یہ محسوس ہوتا
ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق آباد کیا گیا ہے
سڑکیں صاف ستھری اور کشادہ، دونوں کناروں پر سایہ دار درختوں
کی قطاریں اور ان کے پیچھے مکان۔

ملیشیا میں کچھ اور ہی جاننا چاہتا تھا۔ ملیشیا ایشیا ہی
میں نہیں، ملکہ دنیا میں ایک نیا تجربہ کر رہا ہے۔
چینی، ملائی اور ہندوستانی — ان تینوں مختلف قوموں کا
امتزاج — سوئیزرلینڈ میں جرمن، فرانسیسی اور اطالینوں کا
کامیاب امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ آسان تھا کیوں کہ
تینوں پڑوسی ملک رہ چکے ہیں، عیسائی ہیں اور ان میں صدیوں
سے باہمی خون کا رشتہ بھی قائم رہا ہے۔ ملیشیا کی تجربہ گاہ
میں بالکل برعکس اجتماع ہیں، زبان، تمدن، تاریخ، مذہب اور
خون ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ دیکھنا یہی تھا کہ ان میں
یگانگت پیدا کرنے میں انہیں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔
یہاں کے قابلِ دید مقام دیکھنے کا سوال پیدا ہوا تو
لائیگر بام گارڈن، ریفلیس پلیس، چینگی کا ساحل، میوزیم، جہاجا
بندرگاہ، فورٹ کیننگ ہل وغیرہ کئی نام پیش کیے گئے۔ یہ بھی
صلاح دی گئی کہ ملایا کی دیگر ریاستیں، خصوصاً پیناگ، کیڈا اور
جوہور دیکھ لی جائیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ملیشیا کا دارالسلطنت
کوالالمپور تو ضرور دیکھا جائے۔ ایک دوست نے کہا "جب
آپ ملیشیا آئے ہیں تو یہاں کے گھنے اور دلدل والے
جنگل ضرور دیکھئے، آپ کو کئی قسموں کے سانپ اور بڑے
بڑے اژدہے دیکھنے کو ملیں گے۔ اڑنے والے سانپ!
شاید دیکھ پائیں۔"

ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کیا کیا دیکھیں۔ وقت کی
اس کے علاوہ مالی اور اقتصادی حالت کے مطالعہ
کے لئے بھی لوگوں سے ملنا ضروری تھا۔ لہٰذا یہ ذمہ داری
بیگم صراف نے اپنے کندھوں پر لے لی۔
آمد و رفت کے لئے نئے اور پرانے سبھی قسم
ذرائع سنگاپور میں ہیں۔ یورپ کے شہروں کی
یہ مہنگے نہیں ہیں، بلکہ کلکتہ کی طرح یہاں بھی سوار یار
ہیں۔ سائیکل رکشا اور ٹیکسیاں بھی بہت ہیں۔ سنا ہے



ی خرید سکتے ہیں، کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ ویسے
یس روپے کے حساب سے گاڑیاں کرائے پر مل
ں۔

کے بارے میں یہاں دقت نہیں ہوتی۔ قلی اور
مزدور تک (چاہے ہندوستانی، ملائی یا چینی ہو)
، کچھ اور لہل لیتے ہیں۔
میں چہل لے پر ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔
ٹیکسی نارتھ برج روڈ سے مشرق کی طرف بڑھنے
اسے میں گاؤں سا نظر آیا۔ یہاں کا رہن سہن دیکھنا
تھا۔ ٹیکسی رکوادی۔ بالکل ہندوستانی گاؤں جیسی
۔ مگر زیادہ صاف ستھری۔ ملایا میں مکان زمین کی سطح
رے اونچے بنائے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر گھر کے
پھولوں کے پودے لگانے کا رواج ہے۔ ناریل کے
اک بہتات ہے۔
آن واحد میں گاؤں کے لڑکے لڑکیاں میرے آس پاس
نے لگے۔ ان میں کچھ جنوبی بھارت کے بھی تھے، دو ایک
کے بھی۔ مکھیا بھی آگیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی
تا تھا۔
آپس کی بات چیت میں میں زبان اور الفاظ پر خاص
ے رہا تھا۔ ٹیک، انیک، راجہ، رس، پُشپک وغیرہ
ہندی کے الفاظ ظاہر کر رہے تھے کہ گزشتہ ۵۰۰ سالوں
سلامی اثر کے باوجود ملایا کی سرزمین سے بھارت
ن مٹا نہیں۔
مکھیا کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ملیشیا کے باشندوں
ب اسلام ہے، چینی بودھ ہیں، ہندوستانی ہندو
کے نام پر ان کا آپس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اس
بھی بتایا کہ ان کے یہاں رامائن اور مہابھارت کو
لی صورت میں لوگوں کی تفریحِ طبع کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

میں حیران تھا۔ ہندوستان کے مسلمان تو رامائن
مہابھارت کا نام تک نہیں لیتے۔ وہ خود کو عرب، ترک،
ایران اور مغلوں کی اولاد سمجھتے ہیں اور مشرق بعید کی اس
مسلمان قوم اور ملک میں رام لیلا، کرن، بھیشم، یدھشٹر
کے کردار۔ ان کے نام بھی پرمیشوری، دیوی اکرن، امرت وغیرہ۔
رات کے کھانے پر دوستوں سے پتہ چلا کہ ملیشیا
فیڈریشن میں کاروبار اور تجارت کی سہولتیں سب کو
حاصل ہیں۔ سنگاپور میں تو بہت ہی سہولتیں حاصل ہیں
کیوں کہ ہانگ کانگ اور جبرالٹر کی طرح یہ بھی ایک آزاد
بندرگاہ (فری پورٹ) ہے۔ برآمد درآمد پر یہاں کوئی ٹیکس
نہیں اور نہ فروخت پر ہی کوئی ٹیکس ہے۔ انکم ٹیکس
بہت ہی کم ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حکومت
ہر لحاظ سے تعاون کرتی ہے۔
لیکن ان لوگوں کو اندیشہ تھا کہ چینیوں کی اکثریت
ہونے کی وجہ سے سنگاپور مستقبل قریب میں ہی ملایا
فیڈریشن سے علیحدہ ہو جائے گا۔ بعد میں ہوا بھی یہی۔

اگلے دن ساڑھے نو بجے ہم پارلیمنٹ ہاؤس پہنچے
ان دنوں اجلاس نہیں ہو رہا تھا لیکن
سپیکر نے دو تین ممبروں کو ہم سے ملاقات کے لئے
بلوایا۔ اس کا اخلاق نہایت ہی مخلصانہ تھا۔ میں اندازہ
لگا رہا تھا کہ برما اور ملیشیا میں کتنا فرق ہے۔ یہاں
کے وزیراعظم ٹنکو عبدالرحمٰن ہمارے ملک کے تئیں
شروع سے ہی مخلص رہے ہیں۔ ان کے ساتھیوں
اور عوام کو بھی اسی جذبے سے سرشار پایا۔
ملیشیا یعنی ملایا فیڈریشن کی تاریخ کافی حد تک
ہم سے ملتی جلتی ہے۔ بھارت کی طرح یہاں بھی
راجاؤں کی حکومت رہی ہے اور الگ الگ ریاستیں
رہی ہیں۔ ان میں لگاتار آپس میں جھگڑے اور جنگیں

ملیشیا کے باشندوں کا مذہب اسلام ہے چینی بودھ ہیں اور ہندوستانی ہندو۔ مذہب کے نام پر ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ مسلمانوں میں رامائن اور مہابھارت کو رقص کی صورت میں لوگوں کی تفریح کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

ہوتی رہی ہیں۔ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے قومی مفاد کو نظر انداز کر کے غیر ملکیوں سے مدد لینے کی ذہنیت یہاں کے سلطانوں میں بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ملکیوں کا اثر و رسوخ یہاں بڑھ گیا۔ پہلے پرتگالی آئے، بعد میں ڈچ اور سب سے آخر میں انگریز۔

انگریزوں کی زبردست حکمت عملی کے سامنے پرتگالی اور ڈچ ٹک نہیں پائے۔ سارے ملایا میں ایک خود مختار حکومت نہ ہونے کی وجہ سے انگریزوں کو اپنے پیر جمانے میں دقت پیش نہ آئی۔ تاجر انگریز حکمران بنے اور جیسے کہ محکوم ملکوں کے ساتھ ہوتا ہے، وہی ہوا۔ برطانیہ نے خوب ہاتھ رنگے۔ ٹین، ربر، ماربل اور مصالحے کی تجارت سے برطانیہ کو بے حد منافع حاصل ہوا۔

ایشیا کی سیاست میں جاپان پہلی عالمگیر جنگ کے بعد وارد ہوا۔ اس کی بڑھتی ہوئی صنعتوں کے لئے خام مال کی ضرورت تھی اور مال بیچنے کے لئے بازار درکار تھا۔ جاپان کی نگاہ جنوبی ایشیا کے ملکوں پر پڑی۔ لیکن یہاں برطانیہ سے برآمد ہونے والے مال پر دوسرے ملکوں کی نسبت درآمدی محصول کم تھا اور دیگر کئی قسم کی سہولیات بھی حاصل تھیں، اس لئے جاپان کے مکمل طور پر قدم نہیں جم سکے۔

دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہونے پر ۱۹۴۲ء میں جاپان نے ملایا پر بھی حملہ کیا۔ ان کا قبضہ یہاں تین ساڑھے تین سالوں تک ہی رہا۔ لیکن اتنے ہی دنوں میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ اپنے کارخانوں کے لئے ٹین، ربر اور دیگر اشیاء لے جاتے رہے۔ سپاہی اپنی جنسی بھوک ملایا میں مٹاتے رہے۔ سامراجی سب کے سب ایک جیسے ہیں خواہ وہ یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

جاپانیوں کی شکست کے بعد انگریز پھر آگئے۔ مگر فتحیاب ہونے کے باوجود دنیا میں ان کی ساکھ کم ہو چکی تھی۔ ان کا شمار دوسرے درجے کی طاقتوں میں ہونے لگا تھا۔ خود بھی انگریز اپنے شکستہ حال ملک کے مسئلوں میں الجھے ہوئے تھے۔ چین میں چیانگ کائی شک کو ہٹا کر کمیونسٹوں نے سرخ چین کی تشکیل کر لی تھی۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ایشیائی ملکوں کا رہنما سا تھا جاپان، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایشیا اور امریکہ کے ملکوں کا رہنما بننے کا متمنی تھا سرخ چین۔

سرخ چین کے جاسوس ہر جگہ سرگرم عمل تھے۔ ویت نام، برما، ملایا اور انڈونیشیا میں (خاص طور سے) جنگ سے بدحالی کے شکار برطانیہ کے لئے اپنے نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ بھارت، برما اور لنکا آزادی حاصل ہو چکی تھی لیکن ابھی تک ملایا ان کے قبضے میں تھا۔ ملایا میں کمیونسٹوں نے گوریلا طریقہ اختیار کیا۔ توڑ پھوڑ، قتل و خون اور ڈاکہ زنی کرنے والوں نے خود کو نجات دہندہ کے طور پر بتایا۔ انہی دنوں اکتوبر ۱۹۵۱ء کے دن برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری کا خون کر دیا گیا۔ انگریزوں کی آنکھیں کھلیں انہوں نے حفاظتی اقدامات مضبوط کئے اور ملایا کو آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ ۱۹۵۵ء میں عام انتخابات ہوئے تنکو عبدالرحمٰن وزیر اعظم بنے۔ مختلف ریاستوں پر سلاطین کی فوجی حکومت بدستور قائم رہی۔

مگر سرخ چین کو سکون کہاں؟ ملایا میں چینی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے وہ یہاں سے لئے بڑی تعداد میں ہر سال آتے ہی رہتے ہیں۔ انکے یہاں کی سیاست، صنعت اور تجارت پر ان کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ حالت یہ ہے کہ ملائی اپنے ہی ملک میں غیر ملکی بنتے جاتے ہیں۔ سنگاپور میں تو خاص طور سے۔



ملیشیا کا پارلیمنٹ ہاؤس

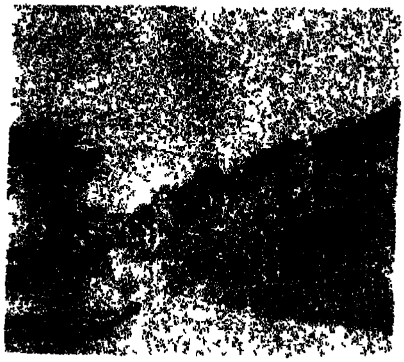
حال دیکھنے میں آئی ۔ ہمارے ملک میں بھیس بدل کر کشمیر میں داخل ہونے والے پاکستانیوں کے باعث ہمیں بھی بہت کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرپڑ رہا ہے سرخ چین کی ریشہ دوانیوں سے لوگ عاجز آگئے تھے اور ان کے روزمرہ کے سیاہ کارناموں سے ملایا کے باشندوں کے دل میں ان کے تئیں نفرت پیدا ہوگئی تھی۔

۱۹۵۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری کو یہاں کے کسی باشندے نے قتل کردیا۔ یہاں کے مسوں نے بڑا شور مچایا ۔ انگریز چین کے ساتھ تعلقات نہیں بگاڑنا چاہتے تھے کیوں کر ان کو ہانگ کانگ ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا ۔ اس لئے ۱۹۵۷ء میں ملایا کو مکمل طور پر آزاد کرنے کا اعلان کرکے انھوں نے اپنی گلو خلاصی کرائی۔

ترینگانو، کلانتن، پینانگ، سیلنگور، جوہور اور سنگاپور وغیرہ بارہ ریاستوں کو ملاکر ملیشیا بنایا ۔ آزادی کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے وراثت میں حاصل ہوئی بدامنی اور بدانتظامی۔ ملک کی اقتصادی حالت خستہ اور شکستہ تھی۔ خوش قسمتی یہ تھی جو اس ملک کو ٹنکو عبدالرحمان جیسا فہم شناس، تجربہ کار سیاست داں اور پختہ ذہن رہنما ملا۔

آزادی کے بعد ٹنکو عبدالرحمان نے دنیا کے ملکوں سے دوستی اور خلوص کی پالیسی اختیار کی۔ ملک میں پھیلی افراتفری اور ابتری پر قابو پاما اور ملایا میں قومی جذبے کو بیدار کیا ۔ سرخ چین نے سمجھ لیا کہ اس کی دال ملیشیا میں نہیں گلے گی۔ ملیشیا میں اس کی نجات دہندہ فوج بے نقاب ہو چکی تھی ۔ ہمسایہ انڈونیشیا کی سیاست میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر وہ اسی کے ذریعہ دھمکیاں دینے لگا۔ دنگہ فساد بھی ہوا۔

پاکستانیوں کی طرح انڈونیشیا کہیں گھس بیٹھئے بھیجتا تو کہیں چھاپہ مار اتار دیتا۔ کبھی چینیوں کو بھڑکاتا تو کبھی ملائیوں کو ۔ ان سب کے باوجود ٹنکو عبدالرحمان نے چینیوں



ملیشیا کے اکثر شہر ساحل سمندر پر واقع ہیں

کے ساتھ اپنے ملک میں فرق روا نہیں رکھا۔ انہیں مساوی قومی حقوق دیئے۔

اس کے بعد ہمیں ہانگ کانگ بینک کے منیجر سے مل کر ملیشیا کی اقتصادی حالت اور اس کی بتدریج ترقی پر گفتگو کرنی تھی۔

ملیشیا ۱,۷۰۰ کروڑ روپوں کی برآمد اور ۱,۹۲۰ کروڑ روپوں کی درآمد کرتا ہے۔ اس طرح ہر سال ۲۲ کروڑ روپوں کا غیر ملکی سکہ زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے پھر بھی جس تیزی سے وہاں صنعتوں کا جال بچھ رہا ہے، امید ہے کہ ملیشیا جلدی ہی خود کفیل ہو جائے گا۔ زراعت اور معدنیات سے متعلق صنعتوں کی ترقی بھی امید افزا ہے۔

ملیشیا میں درآمد برآمد اور فروخت پر محصول نہیں ہے۔ انکم ٹیکس بھی کم ہے۔ اس لئے غیر ملکی تاجر اور صنعت کار یہاں سرمایہ لگانے کے لئے رضامند ہی نہیں بلکہ کشش بھی محسوس کرتے ہیں۔ نئی صنعتوں کے لئے حکومت کی جانب سے مقررہ ادارے اور بنکوں سے کئی قسم کی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ مناسب سود پر قرض بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس طرح غیر ملکی سکے کی فراوانی رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ملک میں صنعتیں بھی بڑھتی جارہی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں اکیلے سنگاپور کی بندرگاہ میں ۸۳۰ لاکھ ٹن سامان کی آمد و رفت ہوئی۔ یہاں ۳۸,۷۰۰ جہاز آئے۔ ان کے مقابلے میں ہمارے ملک کی خاص



کوالالمپور کی خوبصورت جامع مسجد

بندرگاہوں، کلکتہ اور بمبئی میں گذشتہ سال صرف ۴۰۰۰ جہاز ہی خالی ہوئے ہیں۔

ہمارے یہاں آئے دن ہڑتالیں اور "کام کم کرو" کے عمل سے بین الاقوامی جہاز رانی میں ہمارے وقار کو کافی دھکا لگا ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں اپنے جہاز بھیجنے سے ہچکچاتی ہیں۔ ہمیں ہر سال کروڑوں روپیہ ڈیمرج کا بھرنا پڑتا ہے اور کرایہ زیادہ لگتا ہے وہ الگ ملتہ ہم سے ۴۵ گنا چھوٹا ملک ہے لیکن اس کی برآمد ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ اب تک میں جتنے ملکوں میں گھوما ہوں ان میں پاکستان کو چھوڑ کر دیگر سب کی حالت ہم سے کہیں اچھی ہے۔

سنگاپور میں پولیس کی سخت نگرانی رہتی ہے کہ بھی ہر بڑے شہر اور بندرگاہوں میں ہونے والی وارداتیں یہاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ چین سے کافی تعداد میں کم سن لڑکیاں یہاں آکر بکتی ہیں۔ اس دھندے کو زیادہ تر چینی ہی چلاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں چکلوں یا محلوں میں شرمناک زندگی گذارتی ہیں۔ اسلامی رسم و رواج کے سب ان میں سے کچھ حرم میں داخل ہوجاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ انڈونیشیا کے بالی جزیرے سے بھی یہاں لڑکیاں بھگا کر لائی جاتی ہیں ان لڑکیوں سے ناچنے گانے کا کام لیا جاتا ہے ہوٹلوں میں غیر ملکیوں (خاص طور سے ملاحوں) کے پاس یہ لڑکیاں بھیجی جاتی ہیں۔ کلکتہ کی طرح ناجائز تجارت میں یہاں بھی چینی اور پاکستانی عناصر کا بازار گرم ہے۔

کہانی

کنجالی

جو اپنے ہی ملک والوں کی غداری کے سبب ... پرتگالیوں کا قیدی بنا

کھٹ کھٹ .....

ہتھیار بند سنتری کے پیروں کی آواز۔

جھن جھن .....

گوا کے بدنام پرتگالی قید خانے کا آہنی پھاٹک کھلا۔

پتھریلی دیواروں سے گھری اُس اندھیری کوٹھری میں زنجیروں سے بندھا ہوا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ کنجالی۔

محمد کنجالی —— پرتگال کا شہنشاہ بھی جس کے نام سے لرزتا ہے!

لالچی، ظالم، شہنشاہیت کے نشے میں چور پرتگالی بھی جس کے پرتاپ کے سامنے گھٹنے ٹیک چکے تھے! آج وہی عظیم شخص اپنے ہی ملک کے ایک آدمی کی غداری کے سبب پرتگالیوں کا قیدی بنا ہوا ہے

ایک ہتھیار بند سنتری اُس کی طرف کھانے کی تھالی لئے بڑھ رہا تھا۔ کنجالی کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں برس رہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے سنتری نے کھانے کی تھالی اُس کے سامنے سرکا دی۔ اگلے ہی لمحے تھالی میں ٹھوکر لگی اور سہما ہوا سنتری فوراً باہر کھسک آیا۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں پتھریلی کوٹھری کے ایک روشن دان سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ اُسی طرف دیکھتے ہوئے کنجالی نے سوچا "کل سویرے ہی پرتگالیوں کے گلوٹین سے اُس کی زندگی کا کھیل ختم ہو جائے گا۔" ماضی اس کی نظروں کے سامنے سنیما کے پردے کی طرح سرکنے لگا .....

کوچین کی بندرگاہ سے بحرِ عرب کی پُرجوش لہروں کے تھپیڑوں کو سہتے ہوئے ایک تاجر جہاز لنکا کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز میں مرچیں بھری تھیں۔ یہ ناجائز تجارت تھی۔ ناجائز اِس لئے کہ مرچوں کی تجارت پر پرتگالیوں کی اجارہ داری تھی۔ اِس لئے کسی ہندوستانی سوداگر کو اس کے لئے اجازت نہ تھی۔

تیز ہوا سے بادبان بھر گئے تھے اور جہاز ساحلِ سمندر سے دو تین میل کے فاصلے پر تیزی سے بہہ رہا تھا

جہاز کے مالک محمد اور ابراہیم دونوں کے گھر ساحل سمندر کے قریبی دیہات میں تھے۔ دھیرے دھیرے جہاز ساحل کے اور نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی دلہن کا دیدار کرنے کی تمنّا محمد کے دل میں موجزن تھی۔ بار بار شرم و حیا سے لال ہو جانے والا چہرہ اُس کے دل میں گدگدیاں پیدا کر رہا تھا۔

دفعتاً محمد کی آنکھیں مشرق کی جانب جم گئیں۔ اور ایک ہیبت ناک نظارہ دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی "بھائی جان!"

ابراہیم کے ساتھ سب کی نظریں اُدھر گھوم گئیں۔ آگ کی لال لال لپٹیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ لالچی اور بے رحم پرتگالی ساحلِ سمندر کا ایک اور گاؤں نذرِ آتش کر رہے تھے۔

گاؤں پہنچ کر انہیں چاروں طرف گرم راکھ اور زخموں سے کراہتے بوڑھے ملے۔ جوان یا تو لڑ کر مرے تھے یا پرتگالی انہیں قیدی بنا کر لے گئے تھے تاکہ انھیں غلام بنا کر بیچ سکیں —— عورتوں کے ساتھ بھی درندانہ سلوک کیا گیا تھا۔

کچھ بہادر عورتوں نے یہ بے عزّتی برداشت نہ
کرکے موت کو گلے لگا لیا تھا۔ محمد کی ماں نے
آنسوؤں کے بیچ جو کچھ کہا اُس کا مطلب یہ تھا کہ
فرنگیوں کے ناپاک ہاتھ لگنے سے پہلے اُس کی
نئی دلہن نے دروازہ اندر سے بند کرکے خنجر اپنے
سینے میں پیوست کر لیا۔ وہ زندگی کی صرف ۷ بہاریں
ہی دیکھ سکی تھی۔ جب وہ اُن وحشیوں کے ہاتھ
نہ لگی تو انہوں نے اُس کے مکان میں آگ لگا دی۔

محمد نے اپنی بیوی کا جُھلسا ہوا جسم دیکھا تو
اُس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر
پر اٹھا لے لیکن اُس کے بدن میں آواز پیدا
کرنے والی تمام طاقت جیسے سلب ہوگئی تھی۔
آنکھوں میں آنسو خون بن گئے تھے اور دل پتھر
ہوگیا تھا۔ بے سہارا بچّے کی طرح وہ اپنی ماں
کی گود میں جا گرا تھا۔ ماں نے اُس کے سر پر
ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا "بیٹا اِن فرنگیوں
سے بدلہ لینا اب تیرا کام ہے۔ سات سمندر پار
رہنے والے یہ لال منہ والے جانور یہاں آکر
اُودھم مچائیں اور یہاں کوئی مائی کا لال نہیں جو
انہیں مزا چکھائے"
اپنی دلہن کی لاش کو چھوتے ہوئے محمد نے
مغرب کی طرف منہ کرکے قسم کھائی کہ جب تک
وہ اِن فرنگیوں کو نیست و نابود نہیں کرے گا
چین سے نہیں بیٹھے گا
کھٹ، کھٹ ...... پیروں کی آہٹ ہوئی۔
ایک سنتری ہاتھ میں مشعل لے کر آیا،
اور کمرے کے کونے میں کچھ رکھ کر باہر چلا گیا۔
محمد اور ابراہیم دونوں بھائی کوچین چھوڑ
کر اب پونانی بندرگاہ پر آکر بس گئے تھے۔
کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں
منجھے ہوئے جہازی اور بہادر جنگ جُو بھی تھے۔
محمد بے بسی سے پرتگالیوں کا بڑھتا ہوا لالچ، ان
کا ظلم، ان کی بدنظمی، اسلام کے تئیں اُن کی

بھرّائے ہوئے لہجے میں
کے پیارے کہلاؤ گے او
طاقت تمہاری پُشت پر ہے

منافرت اور سمندر و زمین پر دن بہ دن بڑھ
ہوئے ان کے مظالم دیکھتا رہا۔
جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو بھائی
لے کر وہ کالی کٹ کے راجہ زمورِن کے پاس
اور اُس کے پیروں پر اپنی تلوار رکھ دی
تخلیہ پاکر اُسے اپنے ارادے سے آگاہ
پرتگالیوں کی زیادتی سے زمورِن بھی عاجز
تھا۔ اُس نے اُس تنہائی میں اُسے گلے
زمورِن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی
تھی۔ اُس نے بھرّائے ہوئے لہجے میں
آج سے تم کُنجالی (علی کا کُنجُو یعنی علی کے
کہلاؤ گے اور ہمارے مارا کلم (جہاز)
کے تم مارا قار (کپتان) ہوگے۔ میری تما
اور پوری فوجی طاقت تمہاری ہی پُشت
ہے۔ پوری ہمت اور جواں مردی سے
سفید کتّوں کو یہاں سے مار بھگاؤ"

محمد کُنجالی نے اُس دن تلو
کپتان زمورِن کے سامنے اپنے
رہنے اور فرنگیوں کی سرکوبی کرنے کی قسم
کھٹ، کھٹ .....
سنتریوں کا پہرہ بدل رہا تھا۔
جھن، جھن .....
نیا سنتری چابیوں کی جانچ کر
دیر کے لئے تصوّرات کا سلسلہ ٹوٹ
جلدی ہی وہ پھر خیالات میں کھو گیا۔
زمورِن کا بحری سپہ سالار بنتے
اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔ کنجا

کالی کٹ کے بادشاہ زمورِن نے کہا" محمد، آج سے تم علی جہازی بیڑے کے کپتان۔ میری تمام دولت اور پوری فوجی ہمت اور جواں مردی سے تم ان سفید کتّوں کو یہاں سے مار بھگاؤ"

کپتان، بلیا حسن جیسے لائق سردار اُسے ملے۔ کُنّی علی نے تو کمال ہی کر دکھایا۔ اُس نے پُرتگالیوں کے چھکّے چھُڑا دئے۔ پہلے پُرتگالیوں کے ڈر سے ہندوستانی جہازوں کو سمندر میں چلنا دوبھر تھا۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ پرتگالی ان کے ڈر سے مسلح اور ہوشیار ہو کر کئی جہازوں کا بیڑہ ایک ساتھ لے کر چلنے لگے۔

کُنّی علی کا ایک حملہ اُسے آج تک یاد ہے۔ شام کا وقت تھا۔ وہ ایک ساحلی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ دوسری پہاڑیوں کی چوٹیوں کی طرح اِس چوٹی پر بھی کُنّی علی کا حملہ آور دستہ بیٹھا تھا۔ دور سے آتا ہوا پرتگالی بیڑہ دیکھ کر اُن لوگوں نے آگ جلا کر اشارہ کیا۔

دور دور تک پھیلے کُنّی علی کے دستے کے چھوٹے چھوٹے جہازوں نے وہ اشارہ دیکھ لیا اور پھر جلدی سے اپنے ہلکے چھوٹے جہازوں کو لے کر انہوں نے پرتگالی جہازوں کو گھیر لیا۔ کُنّی علی کے ہلکے جہازوں پر تیس تیس سے زیادہ مسلح سپاہی نہ تھے مگر اُن کی ہمت بلا کی تھی۔ جب تک پرتگالی سنبھلتے، کُنّی علی کے سپاہیوں نے فرنگی جہازوں کے مستولوں اور بادبانوں میں آگ لگا دی۔ پھر تلوار نکال کر فرنگیوں پر پل پڑے۔ آمنے سامنے کی لڑائی میں ہندوستانیوں کا مقابلہ کرنے والا کون تھا! شام کے دُھندلکے میں پرتگالیوں کے جہاز جلنے لگے اور کُنّی علی کے ساتھیوں کی فتح کی آوازیں سمندر کے شور میں بھی سنائی دینے لگیں۔ سمندر کا نیلا پانی فرنگیوں کے خون سے لال ہو گیا۔ کُنجالی نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "خدا اب میرا انتقام شروع ہو چکا ہے۔ میں ایک بھی فرنگی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا!"

مگر وہ دن بھی کیا تھے! کبھی پرتگالیوں کے جہازوں کو گھیر کر اُن پر حملہ کیا جا رہا ہے۔ کبھی اُن کے کالی کٹ والے قلعے پر گولہ باری کی جا رہی ہے۔ فتح پر فتح۔

لیکن پرتگالی اتنی جلدی ہمت ہارنے والے نہ تھے۔ 'سمندروں کے شہنشاہ'، پرتگالی حکمران سے کافی امداد اور طاقت لے کر دوگنے جوش میں واپس آتے۔

کُنّی علی کے جہازی بیڑے نے فتح پر فتح حاصل کی۔ 'ٹریسٹن ڈا کُہنا' کے ساتھ سمندری لڑائی میں اُس نے ڈان لارینزو کو مار گرایا اور پرتگالی بیڑہ ہار کر بھاگ کھڑا ہوا۔ لیکن پُرتگالیوں کی ہمت دوبالا کرنے میں کوچین کے راجہ کول کتری کے راجہ اور کوئی لون کی رانی پیش پیش تھے۔ کئی مورچوں پر علی کو ہارنا پڑا۔ سنپاؤں کے ساتھ بارکُر کی لڑائی میں اُس کے بیڑے کو کافی نقصان اُٹھانا پڑا اور وہ بھاگ نکلا۔ کُنّی علی جینا بھی منگلور اور ماؤنٹ علی کے درمیانی مقام کی لڑائی میں پرتگالی کپتان ڈی ایسا کے ہاتھ پکڑا گیا۔ کافی رشوت دے کر اُسے چھڑایا بھی گیا تو رہائی سے پہلے ہی اُسے کلام پاک کی قسم کھانی پڑی کہ آئندہ وہ پرتگالیوں سے کبھی نہ لڑے گا۔ بلیا حسن نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا لیکن اُس کے رشتے دار ارکّل کے راجہ نے اسے واسکو ڈی گاما



کے ہاتھوں میں سونپ دیا اُڈورگا مانے اسے کنانور کی حوالات میں ڈال دیا جہاں مینجیں نے اُس کو قتل کرڈالا۔

اِس طرح کُنجالی کی بحری فوج کمزور ہوگئی لیکن کُنجالی نے ہمت نہ ہاری۔ زمورن کے حکم سے جس نے بہت سے خطرناک مورچوں میں حصہ لیا تھا، لنکا تک پرتگالیوں سے لڑنے چلاگیا تھا، اب اپنے کو کٹا قلعے میں محفوظ کرکے اپنی طاقت بڑھانے میں جُٹ گیا تھا۔ ایک تعلقے دار کی شکل میں اب وہ سراُٹھا رہا تھا۔ طاقت کے نشے میں وہ اتنا مست ہوا کہ اپنے سامنے زمورن کو بھی کچھ نہیں سمجھا۔

ایک دن کُنجالی نے زمورن کے ہاتھی کی دُم کاٹ لی۔ زمورن کے لئے ہاتھی کی دُم کا کٹنا خاندانی روایات کے لحاظ سے باعثِ تحقیر تھا۔ اُس نے کسی طرح کُنجالی کو مزہ چکھانے کے لئے پرتگالیوں سے سازبازکی۔ کُنجالی کا کانٹا نکالنے کے لئے پرتگالیوں کا کانٹا بھی اسے برداشت کرنا پڑا۔ صلح کے مطابق پرتگالی بحری بیڑہ زمورن کے بری بیڑے کی مدد سے کٹا کے قلعے پر دھاوا بولنے والا تھا۔ اس میں بڑے معرکے کا فوجی سربراہ تھا لوئی ڈی گاما۔ وہ بھی کیا لڑائی تھی! یہ سب خوب یاد ہے اُسے۔

کٹا قلعے کے بُرج پر بیٹھا ہوا کُنجالی پوری فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ سمندر کے شور کو چیرتا ہوا اِکّا دُکّا گولہ دشمنوں کی طرف سے داغا جا رہا تھا اور قلعے سے بھی اُسی کے جواب میں ایک دو گولے ہی پھینکے جا رہے تھے۔ بارود اور گولے برباد نہیں کئے جا سکتے۔ تین مہینے سے وہ محاصرہ کئے بیٹھے تھے۔ کُنجالی کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ ایک دو دن میں بڑا بھاری حملہ ہونے والا ہے۔ دشمن کے پوشیدہ رازوں کا پتہ لگانے کے لئے اُس نے کئی جاسوس تعینات کر رکھے تھے۔ وہ بُرج پر بیٹھا اُن ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ کبھی

س کی نظر نیچے دشمنوں کے جمِ غفیر پر جا رہی تھی تو
لمبی تاروں بھرے آسمان کی طرف۔
رات کا ایک پہر گذر چکا تھا۔ آدھی رات
ہونے کو تھی۔ اسی وقت پانی میں شرابور، تھکان
سے چُور ایک نائر جاسوس آیا۔ کُنجالی نے پہلے
سے بھیگے کپڑے تبدیل کرنے کو کہا لیکن اُس نے
واب دیا "نہیں، میں بعد میں بدل لوں گا۔ پہلے
پنی کارگذاری کی تفصیل تو آپ کو دے دوں ساُن

[illegible]

کی تیاری بہت زور دار ہے۔ زمورن اور فرنگیوں
نے مل کر اتنے جہاز جمع کر لئے ہیں کہ جن کا شمار نہیں۔"
کُنجالی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ آواز
میں کچھ کرختگی آ گئی "تمہیں اُن کا پتہ لگانا تھا۔"
جاسوس نے دست بستہ عرض کی "میری طرف
سے کوتاہی نہیں ہوئی۔ براہ کرم آپ پہلے میری
پوری بات تو سُن لیں۔ پھر جو مناسب سمجھیں کریں۔"
کُنجالی نے اثبات میں سر ہلایا۔
جاسوس کہتا گیا "زمورن کی بارہ ہزار نائروں
کی فوج نے ایرنگل سے لے کر ساحل سمندر تک
کوٹا کو آدھے چاند کی طرح گھیر لیا ہے۔"
کُنجالی کے منہ سے از خود نکلا "اچھا! یہ تو
بہت بُرا ہوا۔ اب ہم سمندر کی طرف سے ذرا
بھی مدد نہ لے سکیں گے ———"
جاسوس اپنی بات پوری کرنا چاہتا تھا۔
کُنجالی کی بات پوری ہوئے بغیر ہی اُس نے کہنا
شروع کیا "فرنگیوں نے ندی کے دہانے پر پوری
ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ بیپن میں بنائی ہوئی چھ
کشتیاں وہاں کھڑی ہیں۔"
کُنجالی بے اختیار بول پڑا "ندی کے شمال
سے ہمیں حملے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اب
اُدھر سے بھی ہمیں چوکنا رہنا ہے۔"
جاسوس برابر کہتا رہا "فرنگی کپتان فیرے ایریا
۳۰۰ فرنگی سپاہیوں کے ساتھ زمورن کی فوج
میں شامل ہو گیا ہے۔"
"اور؟" کُنجالی بے تاب ہو گیا۔
"اور کپتان لوئی ڈی سیلوا ۶۰۰ فرنگی
سوار دادوں کے ساتھ حملہ کرنے ہی والا ہے۔"
کُنجالی کو دشمن کی بے پناہ طاقت کا اندازہ
تھا۔ اُس نے کہا "ہاں وہ پرانا اور تجربے کار
جنگ جُو ہے۔ سمندر کی طرف سے حملہ ہو تو ہم
اُس کا مقابلہ اچھی طرح نہ کر سکیں گے کیوں کہ
ہمارے بڑے جہاز تو سمندر میں ہیں اور اُنہیں
اس حلقے کو پار کر کے یہاں لانا بالکل ناممکن ہے۔"
جاسوس سے نہ رہا گیا۔ اپنے اختیاروں کی
پرواہ کئے بغیر ہی اس نے پوچھا "تو پھر اُدھر کی
حفاظت کس طرح ہو گی؟"

سیکڑوں خطرناک مورچوں پر ڈٹے رہنے
کے منصوبے بنانے میں طاق
کُنجالی سے خاموش نہ رہا گیا "سردار کُنٹی امو
گل دونوں کو لے کر قلعے کے نیچے مغرب میں
ڈٹا رہے گا اور پرتگالی جہازوں کا مقابلہ کرے گا۔"
جاسوس منہ زور تھا۔ اس نے زور دے کر
کہا "لیکن کُنجالی، اس بار دشمنوں کا حملہ بہت
زوردار رہے گا۔"
مطمئن کُنجالی نے اُسے دلاسہ دیا "گھبرانے
کی ضرورت نہیں ہے۔ ۱۵۰۰ چنیدہ توپچی اور
بندوقچی ہمارے قلعے کی بہت دنوں تک بہادری
کے ساتھ حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے رسد
اور بارود کا بھی کافی انتظام ہے۔"
کُنجالی نے یہ بات کہہ تو دی مگر اُسے
محسوس ہوا جیسے یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اُس
نے سوچا کیا سچ مچ لمبے عرصے تک قلعے میں
بند رہ کر لڑنے لائق رسد اور بارود اُس کے
پاس ہے! کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے اُسے
کوئی اہم بات یاد آ گئی۔ اُس نے پوچھا "ہاں تو

ایرنگل کی چوٹی کی طرف مسلسل نگرانی رکھنے
کے لئے سپاہی لگا دیئے گئے۔ سوتے ہوئے
سپاہیوں کو جگا دینے کا حکم جاری کر دیا گیا
چاروں طرف ایک خطرناک لڑائی کی خبر پھیل گئی
قلعے سے آدھی رات کا گھنٹہ ابھی بج بھی
نہ پایا تھا کہ ایرنگل پہاڑ کی چوٹی سے جلتی ہوئی
مشعلوں کے ذریعے کوئی اشارہ کیا جانے لگا۔
کُنجالی نے قہقہہ لگایا۔ طبلِ جنگ بجانے
والوں کو اُن کے کام پر مستعد کیا۔ پھر اپنے
معتمد خاص مصاحب چنّا علی کو بلا کر کہا "دیکھو
ان لوگوں نے وقت معیّنہ سے پانچ گھنٹہ پہلے
ہی حملہ شروع کر دیا ہے۔ فیرے ایریا چھ سو
پرتگالی اور پانچ ہزار نائروں کے ساتھ حملہ کر
رہا ہے، لیکن تم نے ایک خاص بات دیکھی؟"
"کیا؟" مصاحب بولا۔

کُنجالی نے پھر قہقہہ لگایا اور بولا "یہ لوگ
قلعے کی دیوار کی طرف سے ہی حملہ
کر رہے ہیں مگر ان لوگوں کے پاس قلعے
چڑھنے والی سیڑھیاں نہیں ہیں۔"
چنّا علی فوراً بول پڑا "معلوم ہوتا ہے
اتحادی حملے کے چکّر میں سیڑھیاں نظرانداز
کر دی گئی ہیں۔ آپ نے شاید ایک اور بات
نہیں دیکھی۔"
"وہ کیا؟"
"سیلوا اپنے ۶۰۰ جوانوں کے ساتھ کالی کٹ
کی خلیج میں لاتعداد جنگی کشتیاں لئے چپ
انتظار کر رہا ہے۔"

کُنجالی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہ...
میں اُسے کوئی عار نہ تھی کیا
جھک سکے گا۔ پھر اُس نے



"وہ لوگ کب حملہ کریں گے؟"
جاسوس بولا "کل صبح سورج نکلتے ہی۔
اِس بُرج سے وہ جو ایرنگل کی چوٹی دکھائی
دے رہی ہے وہیں سے حملے کی شروعات ہوگی۔
بیلچیر کلا کا یہ اشارہ جلتے ہوئے نیزے سے ہوگا۔"
یہ سنتے ہی کُنجالی نے جاسوس کو شاباشی دیتے
ہوئے کہا "یہی تمہاری سب سے انمول اطلاع
ہے" پھر تالی کے اشارے سے قریب کھڑے
ہوئے پہرے دار کو بلا کر اُس نے تمام پہرے
داروں اور توپچیوں کو خبردار ہو جانے کو کہا۔

ے کوئی جواب نہ پاکر چنّا علی نے
نجالی پوچھا "اُسے توندی پار کرکے فیرے
یا سے ملنا تھا؟"
کُنجالی نے کہا "لیکن اُس نے اِس اشارے
تسلیم نہیں کیا۔ وہ پہلے سے تیارشدہ منصوبوں
۔ مطابق ہی چار پانچ گھنٹے بعد حملہ کرے گا۔"
چنّا علی نے وقت کی اہمیت پر غور کرتے
ے کہا "تو کنجالی، پھر مجھے جانے کی اجازت
ی جائے تاکہ میں جاکر فیرے ایریا کا راستہ بند
کردوں۔"

اپنے منگولی چہرے پر ایک فیصلہ لئے
ا علی وہاں سے چلا گیا۔ کنجالی نے جب فرنگیو ں
ے اس چینی جہازی کو بچایا تھا اُس وقت وہ بچہ
ھا۔ اب وہ جوان ہوگیا تھا۔ کنجالی نے اُسے
ب مشاق بحری سپاہی بنا دیا تھا۔
دشمن کے متحدہ گروپ کے منصوبے میں
ستتا۔ پھیل جانے اور کنجالی کے منظم مقابلہ کرنے
ے طریقے کے باعث فرنگیوں کا ایک ایک کمانڈر
ام آرہا تھا۔ فیرے ایریا گرا تو اُس کی جگہ میجر
ی وانے پُر کردی۔ اُس کے سینے میں بھی گولی
گی۔ دشمن کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ قلعے کے
الی سرے سے کٹی دوڑا ہوا آیا اور ہانپتے کانپتے
لا "چچا جان، آج کی بازی تو ہم نے مار لی۔
وہ دیکھو۔"
کنجالی نے آدھے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ
بھاگنے کے لئے ایک ہی کشتی پر بہت سب
رنگی سپاہی سوار ہو گئے ہیں۔ وہ کشتی ڈوبی
اور سب تیر تیر کر بھاگنے لگے۔ کنجالی کا جبڑا
سخت ہوگیا۔ چلّا کر بولا "اِن فرنگیوں کے لئے
کوئی رحم نہیں۔ نشانہ باندھ کر انہیں چُن چُن
کر مارو۔ کوئی بچنے نہ پائے۔"
ایک منظر دیکھ کر کنجالی نے کُٹی سے کہا
"دیکھنا، وہ کوئی پادری نظر آتا ہے۔"
کُٹی نے اُدھر دیکھا اور بولا "ہاں چچا جان،
وہ تو فادر فرانسس پتیستاں ہے۔
"وہ یسوع مسیح کی طرح صلیب لئے سب
لوگوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔"
"وہ بھاگنے والے فرنگی سپاہیوں میں
مذہب کے نام پر جوش بھر رہا ہوگا۔"
"یہ لیجئے، وہ بھی کام آگیا۔ پتہ نہیں یہ
پادری کیوں بیچ میں آجاتے ہیں۔"
"یہ فرنگی جہاں بھی اپنا اثر پھیلانا چاہتے
ہیں، پہلے وہاں اپنے پادریوں کو بھیج دیتے ہیں۔
پہلے صلیب بھیجتے ہیں پھر توپ اور بندوق۔"
کھٹ۔ کھٹ۔۔۔
جھن جھن۔۔۔۔

دو مسلح سنتریوں کے ساتھ لمبا چوغہ پہنے بال
سنوارے ایک پادری اندر آیا۔ اُس کے گلے
میں ہاتھی دانت کا صلیب لٹک رہا تھا۔ چہرے
پر اطمینان کے ساتھ کچھ تلخی کے آثار بھی تھے۔
کنجالی نے استعجاب سے اُس کی طرف
دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔
پادری نے اپنے ہاتھ کا صلیب اُٹھایا
اور کہنا شروع کیا "کنجالی، میں خداوند اور
یسوع مسیح کا خادم ہوں۔ میں تمہارے گناہ

ڈال دے گا مگر صرف زمورن کے آگے۔ اُس کے آگے گھٹنے ٹیکنے
کنجالی نے زمورن کا نمک کھایا تھا۔ فرنگیوں کے سامنے وہ قطعاً نہ
ور اپنے ساتھیوں کی جان بخشی کا قول مانگا۔ اُس کی بات تسلیم کرلی گئی۔

کا کفارہ ادا کرنے آیا ہوں۔ تم کتنے بھولے ہو!"
کنجالی کے چہرے پر نفرت کے آثار جھلکنے لگے۔
پادری اس کی طرف دیکھے بغیر کہتا رہا
"عدالت میں تمہیں سزائے موت مل چکی ہے۔ تم چند لمحوں کے مہمان ہو۔ آؤ کفارہ ادا کر کے اپنے گناہ کم کر لو۔ اپنا قصور تسلیم کر لو۔"

کنجالی سے اب ضبط نہ ہو سکا وہ ایک دم بولا "پادری، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ میں نے صرف تمہارے معتقدین کو جہنم رسید کیا ہے۔ تم بھی اپنی صلیب اور کالا چوغہ لے کر اپنا منہ کالا کرو اور جہنم پہنچو۔"
پادری ناامید ہو کر جب واپس جانے لگا تو آخری ڈنک مارنے سے نہیں چوکا "جاتا ہوں

کنجالی۔ کچھ ہی دیر میں تمہیں گلوٹین پر چڑھا کے لئے قاتل آجائیں گے۔ گلوٹین کی تیز دھ سے تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ تمہارے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جائیں گے تمہارے کٹے ہوئے سر میں نمک بھر کر را۔ میں ٹانگ دیا جائے گا۔"
قیدی کنجالی کا سر فخر سے تن گیا وہ کڑ کر بولا "جاؤ پادری، اپنے فرنگی آقاؤں قدم بوسی کرو۔ ہندوستانی مرنے سے نہ ڈرتے۔ میں تیار ہوں" پھر زمین پر حقارت سے تھوکتے ہوئے بولا "ابلیس کا بچہ، میرا نہیں بچا سکتا، میری روح کو بچانے آیا ہے آغ
پادری چلا گیا اور پھاٹک بند ہو گیا۔
پادری صرف اُس کا دماغی توازن لگا!

پھلجھڑی

نوکری کے ایک امیدوار سے مالک نے کہا کہ وہ اُسے باغ سے سیب اکٹھے کرنے کی نوکری پر رکھ سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایک بھی سیب نہ کھائے شرط قبول کرتے ہوئے امیدوار نے جواب دیا "آپ اطمینان رکھیں۔ میں گذشتہ دس برس سے ایک ہوٹل کا منیجر رہا ہوں لیکن میں نے وہاں کبھی کھانا نہیں کھایا۔"

— محمد سلیم، اعظم گڈھ

●

ایک شوہر نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ شادی کے بعد سے اُس کی بیوی اس پر روز چپل چلایا کرتی ہے۔ جب تھانے دار نے پوچھا کہ اِس سے پیشتر اُس نے کبھی رپورٹ کیوں نہیں درج کرائی تو اُس نے جواب دیا کہ اتنے عرصے کی مشق کے بعد اب اُس کی بیوی کا نشانہ ٹھیک بیٹھنے لگا ہے۔

— ہزاری لال، بریلی

گاؤں کے ایک میلے میں آئے ہوئے ایک دیہاتی سے ایک دکان د نے سائیکل خریدنے پر اِ کیا۔ دیہاتی نے کہا کہ وہ تو ایک گائے خریدنا چا ہے۔
اس پر دکان دار نے اُسے صلاح دی کہ وہ گائے کی سواری کرے گا تو کتنا بیوقوف ثا ہوگا۔ دیہاتی نے جواب دیا کہ اگر وہ سائیکل دودھ دوہے گا تو کیا اس سے بھی زیادہ بیوقو نہیں ثابت ہوگا۔

— شکیل احمد،

●

ایک مریض نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اُسے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود کو ہلاک کر رہا ہے
ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"فکر نہ کرو۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ ایسا ہوتا ہے۔"

— پی۔ ایس۔ چاندی والا دہلی

ایا تھا۔ اور اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔
کنجالی اپنی ذہنی کش مکش میں گرفتار تھا۔ کیوں زموین نے دھوکا دیا۔ ہاتھی کی دُم اُس کے لئے اتنی بیش قیمت ہو گئی کہ اُس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود ڈالی۔
عرصہ دراز تک دشمن محاصرہ کئے رہے۔ ان کے پاس ۱۲۰۰ فرنگی اور ۱۲۰۰۰ نائر سپاہی تھے۔ اس کے برعکس قلعے میں کل ۸۰۰ مُور سپاہی تھے۔ قلعے میں رسد کم ہوتی جا رہی تھی۔ کنانور کے علی راجہ کی طرف سے بھیجی گئی رسد نہ مل سکی تھی۔ اُلاّل کی رانی تھیر دمل دیوی کے بھیجے ہوئے ۲۰۰۰ بوری چاول میں سے کچھ تو نزدیک نے کشتیوں پر حملہ کر کے نوچ کھسوٹ لیا۔ فرٹارڈو کا زبردست حلقہ تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر واہ رے سپاہیو، تمہاری ہمت! قلعے کا چپّہ چپّہ لُٹتا چلا گیا مگر وہ ہمت شکن نہ ہوئے۔
۵ دن تک دشمنوں نے گولہ باری کی۔ قلعے کا بیرونی حصّہ ماؤنٹ بلنچ بھی ٹوٹ کر دشمن کے قبضے میں آگیا۔ دن بہ دن فوجیوں کی تعداد کم ہو رہی تھی۔ بار بار شکست تسلیم کر لینے کے لئے دشمن کی پیش کش آ رہی تھی۔
آخر میں سب ہی لوگوں کے مشورے سے کنجالی نے فیصلہ کیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا مگر صرف زموین کے آگے۔ اُس نے زموین کا نمک کھایا تھا۔ اُس کے آگے گھٹنے ٹیکنے میں اسے کوئی عار نہ تھی۔ لیکن فرنگیوں کے سامنے وہ قطعاً نہ جھک سکے گا۔
زموین نے اسے تسلیم کیا۔

ایک معشوق نے اپنے عاشق سے پوچھا کہ اس کو کیسے پتہ چلا کہ وہ اُس سے محبت کرتا ہے عاشق نے پُرسوز آواز میں جواب دیا "جب لوگوں نے مجھے پاگل، دیوانہ اور بیوقوف کہنا شروع کیا۔"
— شکنتلا، دلّی

●

جدید مصوّری کی ایک نمائش میں ایک صاحب نے ایک تصویر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ واہیات تصویر ہے۔ نہ معلوم کس نے اِسے نمائش میں لگا دیا ہے۔ تبھی پاس کھڑے کچھ صاحبان نے انہیں بتایا کہ جناب آپ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہیں۔
— احمد علی، سرہند

●

ایک جج کو بچپن میں اِس بات سے بڑی چڑ تھی کہ ایک ایک غلطی پر ماسٹر دس دس بیس بیس بار کیوں لکھواتے ہیں۔
ایک بار بغیر بتی کے سائیکل چلانے کے الزام میں ایک ماسٹر صاحب پکڑے گئے۔ جج نے اُسے سزا سنائی کہ وہ ۵۰۰ بار لکھے کہ وہ آئندہ بغیر بتی کے سائیکل کبھی نہیں چلائے گا۔
— سرفراز احمد، پٹنہ

●

استاد نے اپنے ایک شاگرد سے کہا "تم کلاس میں ہر وقت باتیں کرتے رہتے ہو یہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہے۔"
شاگرد نے بڑی انکساری سے کہا "جناب عالی، مجھے سوتے میں باتیں کرنے کی عادت قطعی نہیں ہے۔"
— اطہر شیراز، دیوبند

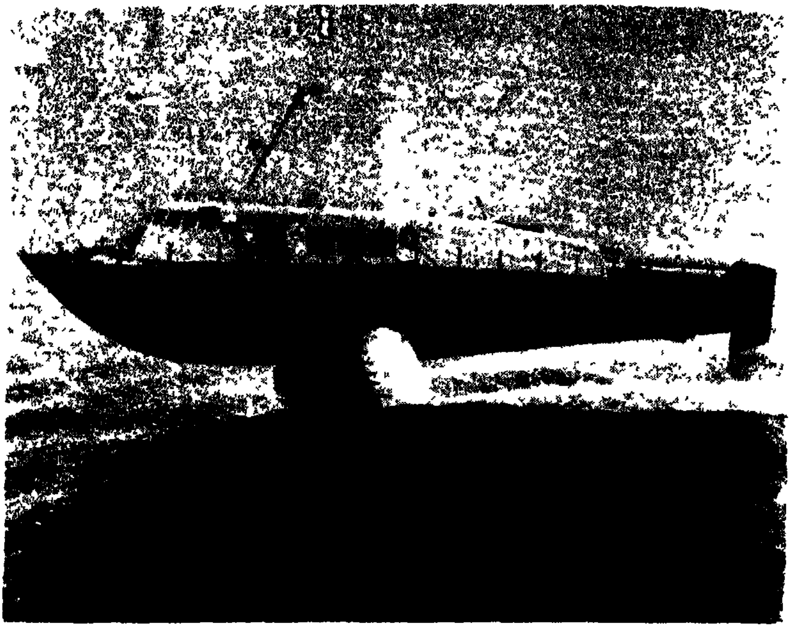
●

دو شخص ایک پارٹی میں ملے۔ بات چیت کے دوران ایک نے دوسرے پر نظر ڈالی اور بولا "وہ دیکھو کتنی وزنی عورت ہے۔"
"وہ میری بیوی ہے" دوسرا بولا۔
"اچھا مجھے معلوم نہ تھا" پہلا شخص قہقہہ مار کر بولا۔
— محمد حسین، گلبرگہ

رات میں کنجالی نے ایک بڑا ڈراؤنا
خواب دیکھا کہ زمورن اُسے فرناڈو کے ہاتھوں
سونپ رہا ہے جو اُسے موت کے گھاٹ اتار
رہا ہے۔ اطمینان اور بے اطمینانی کے جھولے
میں جھولتے ہوئے کنجالی نے اپنی اور اپنے
ساتھیوں کی جان بخشی کا قول مانگا۔
زمورن نے یہ بھی تسلیم کر لیا۔
اُس دن بڑی گرمی تھی۔ قلعے کے جنوبی
سمت واقع صدر دروازے کے دونوں طرف
فرنگی اور کالی کٹ نائر سپاہی آمنے سامنے ڈٹے
تھے۔ قلعے کا پھاٹک کھلا اور قلعے کے باقی سپاہی
فوجیوں کی ان قطاروں کے بیچ سے ہوکر گذرے
پہلے زخمی اور قریب المرگ ۴۰۰ مُور سپاہی
اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ نکل گئے۔ زمورن نے
انہیں بہ خوشی جانے کی اجازت دے دی۔
سب کے بعد سر پر کالا رومال لپیٹے اور زمین
کی طرف اپنی تلوار کی نوک کئے ۵۰ سالہ کنجالی
آیا۔ وہ اپنے تین سرداروں کے بیچ میں چل رہا
تھا۔ جن میں ایک چنّا علی تھا۔ زمورن کے پاس
جاکر غلام بن جانے کے ارادے سے اُس نے
اُس کے ہاتھوں میں تلوار سونپ دی اور خود اُس
کے پیروں میں جاگرا۔
اسی وقت فُرناڈو نے بڑی مضبوطی سے
اُس کی ایک بانہہ پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچ
لیا۔ ہزاروں فرنگیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے
والے کنجالی نے ایک زور کا جھٹکا دیا کہ فُرناڈو
گرتے گرتے بچا، اور پادری ڈی اوگو نے اُسے
گرنے سے تھاما۔

سینکڑوں ہتھیار بند فرنگیوں کے نرغے
پھر میں نہتّا کنجالی یوں گھر گیا جیسے حملہ آور
سیکڑوں بھیڑیوں کے درمیان بے یار و مددگار
شکاری۔ جب وہ کنجالی کو گھسیٹتے ہوئے لے
جارہے تھے تب اُس نے سنا کہ زمورن کے

نائر فوجی بھی اس غدّاری کے خلاف غصّ
بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔
کھٹ، کھٹ . . . . .
کیا اُس کے ساتھی اُسے قید سے
چھڑا سکیں گے؟
چھن چھن . . . .
قاتل کے ساتھ مسلّح سپاہی اُسے
لگانے کی جگہ پر لے جانے کے لئے آگئے
کنجالی اپنی جگہ پر سینہ تان کر یوں کھ
گویا بحرِ عرب کے پاس مغربی وادی کی سب
اونچی چوٹی آسمان کو چھونے لگی ہو۔
وہ بہت شان کے ساتھ اُن کے
بڑھنے لگا۔ آخر کار حوالات کا پھاٹک آگیا
کا شور اُسے سنائی پڑا۔ قریب ہی کیمپوڈ
کے چوک میں گوا کے چھوٹے بڑے، غر
پرتگالی جارج، بنیا بقّال، گرجوں کے
سب ہی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ وہ گوا
سب سے بڑے دشمن کا حشر دیکھنا چا
اس بڑے مجمع کا شور شرابہ کنجا ل
وہاں پہنچتے ہی پُرسکون ہو گیا۔ سب لوگ
پھاڑے اُسے دیکھ رہے تھے جو اس وقت
سر فخر سے بلند کئے ہوئے تھا۔
کنجالی سوچ رہا تھا۔
کیا ہی اچھا ہوتا اگر مرنے سے
اپنے سرداروں کے ساتھ اپنے جوہر دک
اُن معصوم لوگوں کا کیا ہوگا جن پر یہ فرنگ
ہیں۔ اے خدا، تو میری جان کے بدلے
کے ساحل پر ہزاروں مجھ جیسے کنجالی پید
جو اِن فرنگیوں سے ملک کی حفاظت کر سک
نیچے تلے قدموں سے وہ تختہ دار پر چڑ
نے سکیفولڈ کے نیچے سر رکھ دیا۔ تیز دھ
پھل بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ گرا او
فخر سے اٹھا ہوا سر تن سے جدا ہو گیا، ا
فوّارہ پھوٹ پڑا۔



مستقبل کے سمندری جہاز

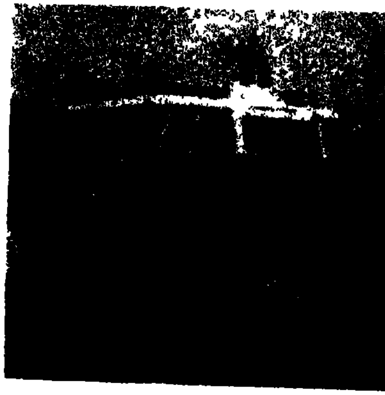
مقالہ •

قمر کاشف

کہا جاتا ہے کہ سمندری جہاروں کا مستقبل کچھ خاص حوصلہ افزا نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جہازوں کے وزن، تعداد اور معیار تینوں پہلوؤں میں ہی ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ صرف گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا میں سمندری جہازوں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے۔ اور بین الاقوامی تجارت اور رسل و رسائل میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا آرہا رہا ہے۔ جاپانی ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۱۹۷۰ تک دنیا بھر کے جہازوں کا وزن ۱۷۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن ہوجائے گا۔

زمانۂ جدید کے سمندری جہازوں میں مزید ترقی مندرجہ ذیل باتوں کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے۔ جہاز زیادہ بڑے بنیں۔ زیادہ تیز رفتار ہوں، کم خرچ اور بالانشیں ہوں یعنی تھوڑے ایندھن اور کم خرچ میں زیادہ لمبا سفر کرسکیں۔ بہتر انتظام ہو، مسافروں کے لئے آرام دہ ہوں اور ان کی حفاظت کا دھیان رکھا جائے اور ساتھ ہی جہاز پائیدار بھی ہوں۔

ان باتوں کو دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ زمانۂ حال کے جہاز پہلے کی نسبت یقینی طور پہ بہتر ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ہم گذشتہ تبدیلیوں



۲۸ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والا ہائیڈروفائیل

پر غور کریں تو یہ اندازہ لگانا ناممکن نہیں کہ مستقبل کے جہاز کس طرح کے ہوں گے۔

جہاز سازی کی ترقی ٹیکنولوجی کی کئی شاخوں کے اشتراک سے ہوئی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہاز بنانے کے سامان، طاقت کے ذرائع، اور مشینوں میں (ساتھ ہی سماجی حالات میں بھی) جیسے جیسے ترقی ہوئی ہے اسی کے مطابق جہاز سازی کا فن بھی آگے بڑھا ہے۔ کچھ ممالک میں تو ان حلقوں میں کسی بالکل ہی نئے آئیڈیا یا تصور کی وجہ سے انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔

عام طور سے دیکھا جائے تو اس حلقے میں ان دنوں ایک رجحان یہ رہا کہ خاص خاص مقاصد کے لئے خاص قسم کے ہی جہاز تیار کئے جائیں۔ جیسے: خام دھاتیں اور خام مال لے جانے والے جہاز، اناج لے جانے والے جہاز اور تیل کے ٹینکر وغیرہ۔ یہ رجحان مستقبل میں اور زیادہ زور پکڑے گا۔ یہاں تک کہ مختلف مقاصد کے جہاز مختلف ڈھانچوں کے بننے لگیں گے۔ مثال کے طور پر دھات بردار، رسد رسانی والے یا ٹینکر جہاز اور اسی طرح کے دوسرے مال بردار جہاز جہاں تک کفایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ممکن ہو سکے گا۔ ڈھانچے میں بڑے ہوتے جائیں گے۔ ان کے معاملے میں رفتار کا سوال زیادہ اہم نہیں ہوگا جب کہ مسافر جہازوں کے معاملے میں سہولت اور حفاظت کو اہمیت حاصل ہوگی اور ساتھ ہی رفتار بڑھانے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا

ٹیکنیکی نظریئے سے دیکھا جائے تو جہاز سازی کا جو مال اس وقت میسّر ہے وہ جہازوں کے امکانی ڈھانچے کی ایک حد مقرر کر دیتا ہے۔ جہاز تیار کرنے میں جو مال کام آتا ہے، وہ مضبوط اور پائیدار ہو اور کافی بڑے پیمانے پر تیار کیا جا سکتا ہو۔ اس وقت اسپات ہی ایک ایسی دھات ہے جو مندرجہ بالا سبھی شرطوں کو پورا کرتی ہے۔

کسی دھات یا دوسری چیز کے وزن اور مضبوطی کے درمیان جو تناسب ہوتا ہے اُسی کی بنیاد اُس کے نقائص اور اوصاف کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ اس نظریئے سے اسپات سے بنائے شدہ ایک جہاز کے ڈھانچے کی بھی ایک حد مقرر ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر معمولی قسم کا اسپات استعمال کیا جائے تو جہاز ایک خاص حد سے بڑے ڈھانچے کا نہیں تیار کیا جا سکتا۔ پھر بھی گذشتہ جنگ سے پہلے جہاں سب سے بڑا ٹینکر ۱۵۰۰۰ ٹن کا تھا۔ وہاں آج کا ٹینکر ۱۰۰۰۰۰ ٹن کا ہو گیا ہے۔

اِس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسافر، مال بردار جہاز جاپان کا 'نِشّو مارُو' ہے۔ اس کا وزن ۲۳۲۰۰۰ ٹن ہے اور اِس کی معمولی اسپات پلیٹ کا گیج ۲۰ ملی میٹر ہے۔ حالاں کہ اب اِس سے بھی کم گیج کی پلیٹ استعمال کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ پھر بھی جس گیج کی ضرورت ہے اُسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ معمولی اسپات کے بڑے جہاز کا وزن [illegible] ٹن سے زیادہ نہیں ہو سکے گا

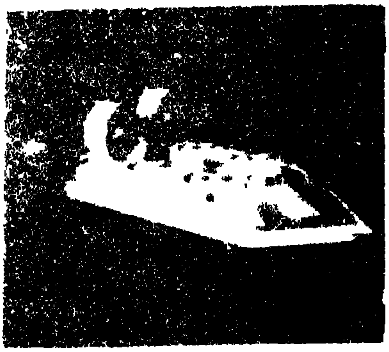
مندرجہ بالا وزن سے بڑے جہاز

لئے خاص طرح کے اسپات کی ضرورت ہوگی۔ اِس وقت ۶۰ کلوگرام فی مربع ملی میٹر دباؤ برداشت کر سکنے والا اسپات دستیاب ہے، جو جہاز سازی میں استعمال بھی کیا جا رہا ہے لیکن اس پر لاگت بہت زیادہ آتی ہے۔

۷۰ اور ۸۰ کلوگرام فی مربع ملی میٹر دباؤ والا اسپات بھی ڈھالا جا رہا ہے۔ چونکہ جہاز کی بناوٹ کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہے کہ جس میں استعمال کی جانے والی اسپات پلیٹ کس قسم کی ہو اور اس نظریئے سے یہ نئے قسم کے اسپات پُرانے معمولی اسپات سے بہتر نہیں ہیں، اس لئے زیادہ بڑے جہاز بنانے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ مضبوط اور بڑھیا قسم کا اسپات تیار کیا جائے، یا جہاز سازی میں کوئی نئی اختراع کی جائے۔

کچھ بھی ہو یہ تو یقینی ہے کہ جہازوں کے اوپر کے ڈھانچوں کی بناوٹ میں ایلومنیم کا استعمال بہت زیادہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس دھات کی مضبوطی اس کے وزن سے تناسب میں بہت زیادہ ہے۔ پھر بھی جہاز کے عام ڈھانچے اور پیندے کے حصے وغیرہ میں اس دھات کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ایک تو اس پر لاگت بہت زیادہ آتی اور دوسرے یہ تیار بھی کم مقدار میں ہوتا ہے۔

ان تکنیکی باتوں کے علاوہ عام خیال یہی ہے کہ جہاز جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی فائدہ مند ہوگا۔ لیکن یہ بھی سب جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں بڑے جہازوں کی سب سے زیادہ اور بہتر کارگذاری ۹۰،۰۰۰ ٹن کے وزن پر پہنچ کر حاصل ہوتی ہے اور اس سے زیادہ وزن میں کام کا معیار گرتا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسری رکاوٹیں بھی ہیں: جیسے بندرگاہوں میں گنجائش کا سوال اور پانی کی گہرائی وغیرہ۔



خشکی اور پانی میں یکساں رفتار سے دوڑنے والا ہائیڈرو سکیمر

ان سب باتوں پر مستقبل میں ہونے والی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا بھی بہت دور رس اثر پڑے گا۔ پھر بھی سب باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مستقبل کا بڑا مال بردار جہاز ۲۰۰،۰۰۰ ٹن سے زیادہ وزنی نہیں ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ طاقت کے ذرائع کے لحاظ سے انقلابوں کا زمانہ ہے۔ اس وقت سمندری جہازوں کے لئے سب سے بڑا طاقت کا ذریعہ تیل (ڈیزل) ہی ہے۔ ویسے ایٹمی طاقت بھی ترقی کر رہی ہے لیکن ابھی ایٹمی تکنیک سے گرمی، گرمی سے بھاپ اور بھاپ سے انجن چلانے کے جس طریقے کا تجربہ کیا جا رہا ہے، اس میں اس کی رفتار زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے جب تک کوئی کارآمد طریقہ نہیں ڈھونڈ لیا جاتا ایٹمی طاقت کو مستقبل میں تجارتی جہازوں کے لئے کارآمد اور سودمند بنایا جانا مشکل ہے۔ یہی بات عام مسافر جہازوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک رفتار کا تعلق ہے اس وقت عام مال بردار جہاز کی رفتار بیس پچیس میل فی گھنٹہ ہے۔ مستقبل میں یہ رفتار تیس، چالیس میل فی گھنٹہ تک بھی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن زیادہ امکانات اسی بات کے ہیں کہ مال کو تیز رفتار سے پہنچانے

کے لئے مال سمندری جہازوں کی جگہ مال بردار ہوائی جہازوں کا استعمال زیادہ ہونے لگے گا۔ اور عام مسافر جہاز سفر کرنے کے لئے اتنے زیادہ استعمال نہیں ہوں گے جتنے کہ سیر و تفریح کے لئے۔

اس لئے اگلے سمندری جہازوں کی رفتار چالیس پچاس میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں بڑھے گی۔ لیکن کم فاصلے کے سمندری سفر کے لئے کچھ دوسری ہی طرح کے جہاز استعمال کئے جائیں گے جیسے: ہائیڈروفائیل (پانی کی سطح پر تیزی سے پھسلنے والے جہاز)، ہوورکرافٹ (ہوا کے دباؤ سے پانی کی سطح سے تھوڑا اونچا اٹھ کر اڑنے والے جہاز جو ٹھوس زمین پر بھی سطح سے تھوڑا اوپر اٹھ کر اڑ سکتے ہیں) وغیرہ۔ جدید زمانہ کے ان نئے اور تیز رفتار جہازوں کی رفتار ۱۰۰ میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ بڑھ سکتی ہے۔

اس میدان میں سب سے پہلی بات تو ڈرائیونگ اور کنٹرول کی ہے۔ جہازوں کو موڑنا، گھمانا، سنبھالنا وغیرہ آج کل کی نسبت زیادہ آسان اور آرام دہ ہو جانا چاہئے۔ تاکہ مسافروں کو ہلنے ڈولنے کا کم احساس ہو۔ اس سلسلے میں کئی طرح کے اوزار اور مشینیں ریسرچ اور تجرباتی دور میں ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ان اوزاروں کی مانگ بڑھتی جائے گی۔ انہیں مسافر جہازوں کے علاوہ مال بردار جہازوں میں بھی لگایا جا سکے گا۔ مال لادنے اور اُتارنے کا ساز و سامان بھی آگے چل کر بہت ترقی کرے گا۔ لیکن مستقبل میں ایسی مشینوں کو بندرگاہوں پر ہی زیادہ تر لگایا جائے گا اور جہازوں پر کم۔ شاید جہازوں پر یہ بھاری بھرکم مشینیں رہیں گی ہی نہیں۔ اور مال لادنے اور اُتارنے کا سارا کام بندرگاہوں میں لگی آٹومیٹک مشینوں کے ذریعہ ہوگا

اس وقت سمندری جہاز کے اخراجات کا قریباً ۱۵ فی صد حصہ جہاز کے عملے پر خرچ ہوتا ہے۔ ان اخراجات کو کم کرنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ آٹومیٹک مشینیں جہازوں پر لگائی جا رہی ہیں۔ حال ہی میں جاپان میں ایک ایسا جہاز بنایا گیا ہے جس میں تمام انجنوں پر کنٹرول کے لئے ایک ہی کنٹرول روم میں کمپیوٹر لگائے گئے ہیں جن کے ذریعہ کوئی بھی آدمی تمام انجنوں کو ایک ساتھ چلا سکتا ہے۔

قوی امید ہے کہ ایسے کمپیوٹر کنٹرولروں کا استعمال مستقبل میں اور بڑھتا جائے گا۔ اور جہاز چلانے کا معائنہ اور دیکھ بھال کے بہت سے کام ان کے ذریعہ زیادہ آسانی اور حفاظت سے سرانجام دئے جا سکیں گے۔ یہ سب باتیں جہاز سازی اور جہاز رانی کے حلقوں میں زیرِ غور ہیں۔ اور اِن کے عمل میں آنے کے بڑے روشن امکانات ہیں۔ جب یہ سب ہو جائے گا تو جہازوں میں موجودہ تعداد سے ایک تہائی سے بھی کم آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔ جہاز رانی بھی نسبتاً زیادہ آسان اور بے خطر ہو جائے گی۔ اور کمپیوٹر مشینوں کے ذریعہ چلائے اور کنٹرول کئے گئے جہازوں کے حادثوں کا شکار ہونے کا خطرہ بھی کم ہوگا۔

آخر میں یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ مندرجہ بالا اندازے اس وقت تک کی ریسرچ اور حقائق کی بنیاد پر مبنی ہیں۔ آگے چل کر جو نئی ایجادیں ہو سکتی ہیں اور جو نئی چیزیں وجود میں آ سکتی ہیں ان کے متعلق کوئی اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ کیوں کہ سائنس صرف اندازوں پر مبنی نہیں بلکہ تجربات کے ذریعے نئی باتیں حاصل کرنے کا شعبہ ہے۔ •

> انسانی زندگی کا بیشتر وقت انتظار میں گذر جاتا ہے۔ کل بھی تو آج جیسا ہی ہوگا۔ زندگی برباد ہوئی جاتی ہے اور ہم زندہ رہنے کی تیاری میں ہی مشغول رہتے ہیں۔ —— ایمرسن

اب ہنسنے کی باری ہے

مسافر نے گھبرا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "جب
ا موڑ پر تیزی سے ٹیکسی گھماتے ہو تو مجھے ڈر
وس ہونے لگتا ہے۔"
"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے" ٹیکسی
۔ائیور نے ہنستے ہوئے کہا "تم بھی موڑ پر
ری طرح آنکھیں بند کر لیا کرو۔"

•

بیوی نے بڑی ادا سے کہا "میں ۲۵ سال
، تو نہیں لگتی۔"
شوہر نے جواب دیا "ہاں، اس وقت تو
، کچھ برس پہلے ضرور لگتی تھیں۔"

•

ایک دوست نے دوسرے سے کہا "جب
ے پاس اتنی کتابیں ہیں تو ایک شیلف کیوں
، بنوا لیتے؟"
دوسرا دوست بولا "میں جن لوگوں سے
میں مانگ کر لاتا ہوں وہ شیلف ادھار نہیں دیتے۔"

•

"بیرا ادھر آؤ" گاہک چلّایا۔
بیرا سہما سا گاہک کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا
"دیکھو، چائے کے پیالے میں مکھی پڑی
، ہے۔"
بیرے نے انگلی سے مکھی پیالے سے نکالی
بہت غور سے اُس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر بڑی
یدگی سے اُس نے جواباً عرض کیا "حضور، یہ
ے ہوٹل کی نہیں ہے۔"

ایک لڑکی بڑی دل چسپی سے کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی۔ جیوں ہی کتاب ختم ہوئی اُس نے نفرت کے ساتھ ایک طرف پھینک دیا۔
پاس ہی لڑکی کی ماں بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے پوچھا "کیوں، کیا ہوا؟ کیا کتاب پسند نہیں آئی؟"
لڑکی نے جواب دیا "اوہ، کتنا دردناک انجام ہے اِس کا! ہیروئن ہیرو کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور بے چارے کو پھر واپس اپنی بیوی کے پاس ہی جانا پڑتا ہے۔"

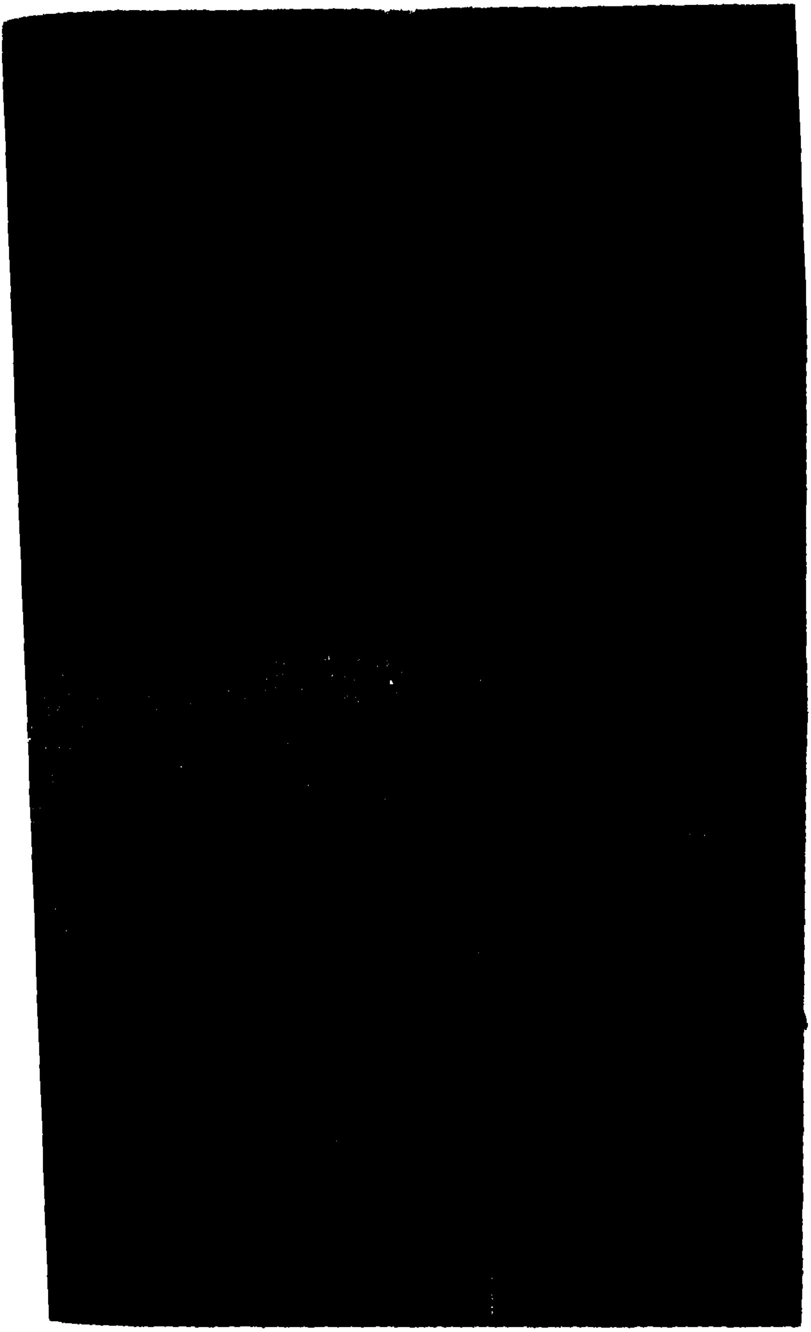
•

ایک شخص پر دو بیویاں رکھنے کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اُس کے وکیل کی اعلیٰ پیروی کی وجہ سے عدالت اُسے مجرم ثابت نہ کر سکی لہٰذا جج نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا "آپ کو مقدمے میں باعزت بری کیا جاتا ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"
وہ شخص ہڑبڑا کر بولا "اوہ۔ شکریہ شکریہ۔ یعنی اس کا مطلب ہے کہ بس اب اپنی دونوں بیویاں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں؟"

•

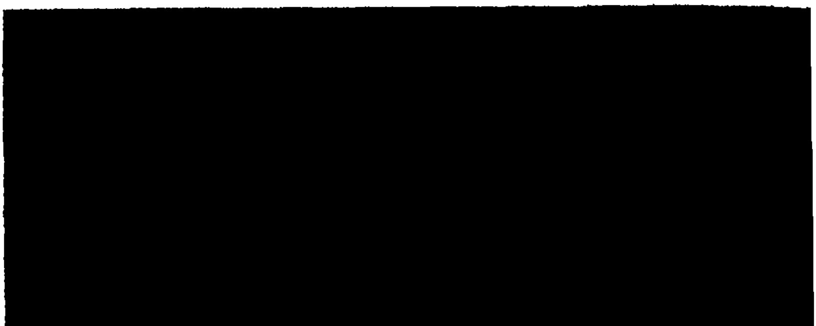
ایک ناخوش سکول ماسٹر نے اپنے استعفےٰ پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا:
"ان سکولوں میں آج کل یہ رواج ہے کہ ماسٹر پرنسپل سے خوف کھاتے ہیں۔ پرنسپل سپرنٹنڈنٹ سے خوفزدہ ہیں اور سپرنٹنڈنٹ بورڈ کے ممبروں سے، بورڈ کے ممبر طالب علموں کے ماں باپ سے اور ماں باپ اپنے بچوں سے ڈرتے ہیں۔ لیکن بچے کسی سے نہیں ڈرتے۔"

•



کی جیلوں میں نظر بند ۳۲۰ قیدیوں میں،
انگلینڈ میں ایک کی کمی ہو گئی ہے۔ یہ برطانیہ میں گرفتار کیا گیا روس کا سب سے بڑا ہوشیار اور خطرناک جاسوس جارج بلیک ہے ـــــ وہ جیل سے فرار ہو گیا ہے۔

بلیک رات کی تاریکی اور کہرے کا فائدہ اُٹھا کر جیل کی کوٹھری سے بھاگ نکلا۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں کو وہ پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ اُس نے کھڑکی سے اُترنے کے لئے ہاتھ کی بنی رسّی کی ایک سیڑھی استعمال کی اور اُس کے بعد لندن کے لاکھوں لوگوں کے بیچ غائب ہو گیا۔ سب کے سب دنگ رہ گئے۔



اس دوران وہ اپنے غیر ملکی مددگاروں کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ اور انہوں نے اُسے اب تک اُس کے وطن سوویت روس میں پہنچا دیا ہوگا۔

جارج بلیک کوئی معمولی جاسوس نہیں ہے اُس کا شمار ہوشیار اور کامیاب روسی جاسوسوں میں ہوتا ہے۔ تقریباً دس برس تک وہ بڑی کامیابی کے ساتھ برطانوی سرکار کی آنکھوں میں دھول جھونکتا رہا ـــ روسی جاسوس ہوتے ہوئے بھی وہ برطانیہ کے جاسوسی کے محکمے میں کام کرتا رہا اور اپنے سرکاری عہدے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ اور دوسرے



مغربی ممالک کے بڑے بڑے راز۔ اسکو پہنچاتا رہا۔

۱۹۶۱ میں گرفتاری کے بعد اُسے لندن کی مرکزی عدالت نے ۴۲ برس، کی قید بامشقت کی سزا دی غالباً برطانیہ میں ہونے والی کسی غیر ملکی جاسوس کو دی جانے والی یہ سب سے لمبی سزا تھی۔ لیکن بلیک نے ان ۴۲ برسوں میں سے صرف ۵ برس ہی جیل میں گذارے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک جیل میں رہنے والا انسان نہیں ہے۔ اس کی خاص وجہ صرف کمیونزم کی طرف، اس کا طبعی میلان ہی نہیں بلکہ حسن اور شراب بھی اُس کی بہت بڑی کمزوریاں رہیں۔

اُس کی اب تک کی تمام زندگی ایک بہادر کارنامہ لگتی ہے۔ وہ نہ تو انگریز ہے اور نہ اُس کا اصلی نام جارج بلیک ہی ہے بلکہ انگریزی خون کی تو اس کے جسم میں ایک بوند بھی نہیں ہے۔

وہ یہودی ہے اور پیدائش سے ڈچ (یعنی ہالینڈ کا باشندہ) ۱۹۲۲ میں وہ ہالینڈ کے شہر روٹرڈم میں پیدا ہوا۔ اُس کا اصلی نام جیورج بیہر ہے۔ اُس کے والدین کھاتے پیتے اور آسودہ حال تھے۔ انہوں نے اُسے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُس کے والد ایک ہسپانوی مصری یہودی تھے اور والدہ ڈچ عیسائی۔ خود بلیک نے بھی اپنے لڑکپن کے کچھ دن مصر میں گذارے۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران، ۱۹۴۰ میں جب نازی جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کیا تو انھوں نے نوجوان بیہر کو یہودی ہونے کے باعث نظربند کر دیا۔ اُس کی ماں اور دیگر بھائی بہنوں نے انگلینڈ میں پناہ لی۔ اُدھر بیہر بھی جلدی ہی نازیوں کے چُنگل سے آزاد ہو گیا۔ اُس کا قید سے بھاگ نکلنے کا یہ پہلا کامیاب موقع تھا۔

اُس نے جرمنی خفیہ پولیس کے کیمپ سے نکلنے کے لئے بھی رسّی کی سیڑھیوں کا بندوبست کیا تھا اور اُس موقع پر بھی ہالینڈ میں اُس کے دوستوں نے اُسے پناہ دی تھی۔ وہ نازی حکومت کے خلاف لڑنے والی ڈچ گوریلا تحریک میں شامل ہو گیا اور اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی جب کہ وہ صرف ۱۸ برس کا تھا، اُس کا شمار تحریک کے لیڈروں میں ہونے لگا تھا۔

آخر جب نازیوں کی روزافزوں پیش بندیوں سے اسے ہالینڈ چھوڑنے کے لئے مجبور ہونا پڑا تو وہ جرمن مقبوضہ فرانس اور فرینکو کے فاشسٹ سپین میں سے ہوتا ہوا برطانیہ جا پہنچا۔ یہ بات ۱۹۴۲ کی ہے۔ لندن میں اپنی ماں کے پاس جاکر وہ آرام سے بیٹھ کر نکما آدمی نہیں بننا چاہتا تھا۔ غیر فوجی زندگی بھی اُسے پسند نہ تھی۔ وہ جلدی ہی برطانیہ کی بحری فوج میں بھرتی ہو گیا۔

بحریہ میں رہ کر اُس نے دو ہُنر سیکھے۔ ایک تو برطانیہ کی انتہائی خفیہ سروس ایم ۱۶ کا فن اور دوسرا ایک ہنر یافتہ ڈپلومیٹ کے طور طریقے۔ جلدی ہی اسے برطانیہ سرکار کے امورِ خارجہ میں ایک اعلیٰ جگہ مل گئی۔ اس جگہ پر کام کرنے کے دوران اُس نے شروع سے ہی ڈبل کردار ادا کرنے کا تجربہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ خود برطانیہ کے لئے بھی وہ ایک ڈبل کردار فرد تھا کیوں کہ اُس کا ظاہری کام تو سیاسی نوعیت کا تھا مگر اصلی کام تھا جاسوسی ویسے دنیا بھر کے سفارت خانوں میں کام کی اصل نوعیت بھی یہی ہے۔

۱۹۴۷ میں وہ جنوبی کوریا کے دارالخلافہ سیئول میں برٹش وائس کونسلر مقرر ہوا۔ یہاں اُس کا کام برٹش سرکار کی طرف سے دوسرے تمام ممالک کے خلاف جاسوسی کرنا تھا۔ یعنی کمیونسٹ طاقتوں اور برطانیہ کے مغربی مددگاروں کی سرگرمیوں اور کارروائیوں کی خبریں لندن پہنچانا

کمیونسٹوں نے جب کوریا میں جنگ شروع کر دی اور ۲۹ جون ۱۹۵۰ کو کچھ دنوں کے لے جنوبی کوریا کی راجدھانی سیئول پر قبضہ کر لیا تو بیہر کو، جو اب جارج بلیک کہلاتا تھا، ازسرِ نو قیدیوں کے کیمپ میں جانا پڑا۔ کمیونسٹوں نے اُسے شمالی کوریا میں نظربند کیا اور وہاں وہ ۱۹۵۳ تک نظربند رہا۔ جنگ بندی سمجھوتے کے بعد جب وہ رِہا ہوا تو اس کا سیاسی نظریہ بالکل بدل چکا تھا۔ اب وہ کمیونزم کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا

سانگِ تغزل

وہ حسن، عالمِ نیرنگ کی جو ہو تصویر
جنھیں سمجھتے تھے ہم دورِ جاوداں کے حریف
مسافرانِ رہِ عشق کا خدا حافظ
مجھے بھی بے خبری تھی بوقتِ عہدِ وفا
فراقؔ عشق ہی ایسے میں آڑے آئے تو آئے

نظر وہ، بات کو لے جائے جو کہیں کہیں
وہ دن تمام ہوئے اور وہ راتیں بیت گئیں
نہ کوئی رہبرِ دُنیا نہ کوئی رہبرِ دیں
تمھیں بھی ہوش نہ تھا میں نے سچ کہا کہ نہیں
حیات نیزہ سنبھالے ہوئے اجل بہ کمیں

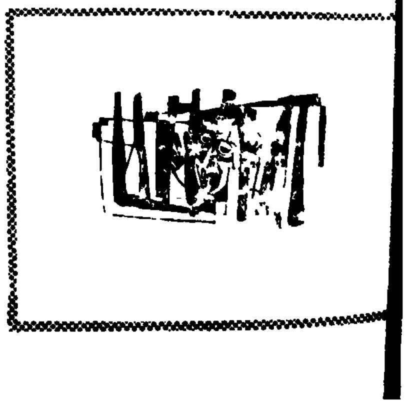
— فراقؔ گورکھپوری

نظر بندی کے اُس عرصے میں بلیک کے رویّہ کے بارے میں اُس کے ساتھی قیدیوں نے بعد میں کہا تھا کہ وہ عام طور سے غیر معمولی ہمّت اور استقلال سے کام لیتا تھا۔ وہ نہ جسمانی تکالیف سے گھبراتا تھا اور نہ ذہنی طور پر ہی اُن بے ہودہ اور مسلسل اقدامات سے جو کمیونسٹ ایجنٹ برٹش قیدیوں کو کمیونزم کی طرف مائل کرنے کے لئے کیا کرتے تھے.

قیدیوں کو کمیونزم کی طرف جُھکانے کے لئے شمالی کوریا کے ایک ایجنٹ کو بلیک اکثر اتنے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا کہ وہ بے چارہ آخرکار پریشان ہو کر وہاں سے چلتا بنا اور تب افسران نے اس کی بجائے ایک بہت ذہین قسم کا ایک روسی ہدایت کار تعینات کیا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غدّاری بلیک کے خون کا جزو تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن نومبر ۱۹۵۱ میں جب کہ اسے نظر بند ہوئے صرف ۱۷ مہینے ہی ہوئے تھے وہ اپنے کیمپ افسران کے پاس گیا اور بہت اطمینان سے اعتراف کیا کہ وہ کمیونزم کا قائل ہو گیا ہے اور اب آگے کمیونزم کی توسیع کے لئے کام کرنے کو تیار ہے.

اُس کے ساتھی قیدیوں کا خیال ہے کہ تقریباً انہی دنوں تمام قیدیوں کو موت کے مارچ کے لئے لے جایا جانا تھا۔ اس کے لئے انہیں اتنے زیادہ لمبے راستے پر پیدل چلنا ہوتا تھا کہ



ان میں سے جو مرنے لائق ہوتا تھا مر جاتا۔ ساتھیوں کا کہنا ہے کہ اس سفر سے ایک رات پہلے بلیک چپ چاپ فرار ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی دن کیمپ کا چیف گارڈ "ٹائیگر" بلیک کی گردن پکڑے لے آیا اور اس نے دوسرے قیدیوں کو بتایا کہ یہ (بلیک) فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ دوسرے قیدیوں کو یہ بات جچی نہیں۔ خود بلیک نے بھی اس موقع پر یہ شیخی بگھاری تھی کہ اسے دوبارہ پکڑ لینے کے بعد بھی افسران نے اسے اچھا کھانا کھلایا اور سگریٹ نوشی کی بھی اجازت دی۔ ظاہر ہے کہ کسی بھاگنے والے قیدی کے ساتھ اس طرح کی نرمی برتی جانے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے.

گو بلیک کمیونسٹ بن کر آزاد ہونے کا مستحق ہو گیا تھا لیکن اس نے قیدی بنے رہنے کو ہی ترجیح دی تاکہ اس کے بارے میں اس کے ساتھیوں کے دلوں میں کوئی شک و شبہ پیدا نہ ہو سکے.

وہ اس کے بعد بھی پندرہ مہینے تک مزید کیمپ میں رہا۔ شاید اس کا وہ صبر و استقلال جس کے اُس کے ساتھی لوگ مدّاح تھے اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنی نظر بندی کے ان آخری ۱۵ مہینوں میں خود اپنی مرضی سے قیدی بنا رہا۔ اُس دَوران وہ جب چاہتا خود کو رہا کرا سکتا تھا۔ اس سے اُسے یقیناً ہی ایک طرح کا ذہنی سکون اور روحانی اطمینان حاصل ہوا ہو گا اور اسی جذبے کے پیشِ نظر شاید اس کے ساتھیوں نے اس کی غیر معمولی ہمّت و جرأت کی داد دی

اِتنا ضرور اس کے حق میں کہا جانا چاہیے کہ کمیونزم کو قبول کرتے ہوئے اُس نے افسران کے آگے تین شرائط رکھی تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ قیدی بنا رہے گا اور اس ضمن میں اُس کے ساتھ کوئی خاص رعائت نہیں برتی جائے گی۔ دوسری جو اطلاعات وہ نئے مالکوں (روس) کو پہنچائے گا

اُس کا کوئی معاوضہ وہ نہیں قبول کرے گا۔ اور
تیسری یہ کہ وہ اپنے ساتھی قیدیوں کی کارگزاریوں
کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب بلیک کو کسی طرح کا
کوئی لالچ نہیں تھا تو اُس نے غدّاری
کیوں کی؟ اس کا جواب اُس کے مقدمے کی
سماعت کرنے والے لارڈ چیف جسٹس لارڈ پارکر
نے دیا، وہ جتنا آسان تھا اتنا ہی تسلّی بخش بھی۔
انہوں نے کہا تھا " ملزم بلیک خود کہتا ہے کہ اُس
نے اپنی مرضی سے کمیونسٹوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ
کیا۔ کیوں کہ اُسے یقین ہوگیا تھا کہ صرف کمیونسٹ
نقطۂ نظر سے ہی بہترین سماج کی تشکیل ہو سکتی ہے۔
وہ خود روسیوں کے پاس گیا اور اُن سے ایک
پیسے کا بھی مطالبہ کئے بغیر، اُس نے اُن کے لئے
کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

گرفتاری کے بعد اُس نے جو لمبا اقبالی بیان
دیا تھا اُس میں بھی اُس نے بڑی صاف گوئی سے
یہ بات تسلیم کی تھی کہ ایسی کوئی اہم سرکاری دستاویز
نہیں ہے جو اُس کے ہاتھ آئی ہو اور اُس نے
روسیوں کے پاس نہ پہنچائی ہو۔

خیر، اب آگے کی کہانی اس طرح ہے کہ
مارچ ۱۹۵۳ میں بلیک اور دوسرے برٹش قیدی
کمیونسٹوں کی قید سے رہا ہو گئے۔ لندن پہنچنے پر
اُن سب کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ اُس وقت
کے ایک فوٹو میں بلیک اپنے گھنگھرالے بالوں
اور بھری ہوئی داڑھی میں بہت با اثر انسان نظر
آتا ہے۔ اس پر کسی طرح کا کوئی شک نہیں تھا۔ اُسے
آرام کے لئے لمبی چھٹی دے دی گئی۔

اکتوبر ۱۹۵۴ میں اُس نے وزارت خارجہ
کی ایک خوبصورت سیکریٹری سے شادی بھی کی۔ یہ
لڑکی ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی بیٹی تھی۔ آخر اپریل
۱۹۵۵ میں بلیک کو برلن بھیجا گیا جہاں وہ برٹش فوجی
گورنمنٹ کے سیاسی شعبے میں کام کرتا رہا۔ بعد میں
اس کی بیوی نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ برلن میں
کام کے دوران اُس کا شوہر بہت کچھ خفیہ کام کرتا
رہا۔ راتوں میں وقت بے وقت ایجنٹوں سے ملتا اور
سربستہ گفتگو کرتا تھا۔ لیکن خود اُسے کبھی یہ شبہ
نہیں ہوا کہ اُس کے شوہر کی اصلی ہمدردی سوویت
سرکار کے ساتھ ہے، ویسے وہ کمیونسٹ ادب۔
مارکس اور لینن کی کتابیں —— بہت پڑھتا تھا لیکن
ایسا مطالعہ تو کسی بھی جاسوس کے لئے ضروری ہو سکتا

بلیک فیملی نے برلن میں چار سال گذار۔
اور یہ عرصہ بہت ہی سُکھ اور آرا
کا تھا بلیک کو بہت معقول معاوضہ ملتا تھا ا
چھٹیوں کی بھی خاصی رعائت تھی۔ جو وہ اکثر
اور یوگوسلاویہ میں گذارتے تھے۔
اپنی سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں ا
کو اکثر مشرقی جرمنی (کمونسٹ) جانا پڑتا تھا
وہیں وہ عموماً اپنے روسی دوستوں سے ملتا ت
میں مغربی برلن کے ایک اخبار نے لکھا تھا
وقت مشرقی جرمنی میں مغربی طاقتوں کی ط
سے کام کرنے والے کم سے کم چھ جرمنی
بلیک کی غدّاری کے ہتھے چڑھے تھے۔
اُس کے ذریعہ روسیوں کو دی گئی اطلاع
گئے اور گولی کا نشانہ بنے۔ اور اُن کے خو
ذمہ داری صرف بلیک پر ہے۔



برلن میں بلیک کا ایک جرمن مخبر تھا ہورسٹ آئٹنز۔ بلیک اُسے پِکّی کے نام سے جانتا تھا اور آئٹنز بلیک کو میکسنڈی بریز نامی ایک ڈچ کی حیثیت سے۔

آئٹنز عرف پِکّی نامی یہ مخبر ہی بلیک کی تباہی کا واحد سبب بنا۔ وہ ۱۹۵۰ سے ہی برلن میں برٹش جاسوسی شعبے میں کام کر رہا تھا۔ ۱۹۵۶ میں وہ برٹش افسران کے لئے پارٹ ٹائم مخبر تھا۔ اُس نے اپنی آمدنی بڑھانے کے خیال سے روسیوں کو بھی اپنی خدمات پیش کیں اور صرف ۲۵ ڈالر ماہانہ کے معمولی معاوضہ پر ان کے لئے کام کرنے لگا۔ ویسے اپنے پیشے میں وہ بہت ایماندار اور محنتی تھا اور اپنے دونوں طرف کے مالکان کے لئے مساوی وفاداری کے ساتھ کام کرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ایک دوسرے شعبے کو جو بھی اطلاعات نشر کرتا تھا وہ کبھی تو سچ ہوتی تھیں اور کبھی بالکل بے بنیاد۔

خیال ہے کہ آئٹنز عرف پِکّی کو ہی سب سے پہلے اس حقیقت کا پتہ چلا کہ بلیک دراصل روسیوں کے لئے کام کر رہا ہے۔ اِس راز کو پِکّی نے اپنے پاس محفوظ رکھا تاکہ کسی مناسب موقع پر اُس سے فائدہ اُٹھائے۔

وہ مناسب موقع ۱۹۶۰ میں آیا۔ پِکّی کی بیوی نے دوسری عورتوں کے تئیں اپنے شوہر کے جھکاؤ سے آزردہ ہو کر اس کے مغربی سربراہوں کو اُس کی اصلیت سے آگاہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وقت پِکّی کو گرفتار کر لیا گیا اور معاملے کو بالکل پوشیدہ رکھا گیا۔

تقریباً ۱۲ مہینے بعد پِکّی پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا، جب بلیک کا کیس ختم ہو چکا تھا۔ اسے اُس کی دیرینہ خدمات کے صلے میں تین سال کی سزا دی گئی۔ اُس کی بیوی کو بھی اس کی خدمات کے طفیل صرف آٹھ ماہ کی سزا دی گئی۔ پِکّی خاندان کے ساتھ برتی گئی نرمی سے ظاہر ہے کہ پِکّی نے بند کمرے سے فائدہ اٹھا کر بلیک کے بارے میں اپنی تمام معلومات برٹش سرکار کے گوش گذار کر دی تھی۔

بلیک ۱۹۵۹ میں برلن سے واپس آیا۔ اس کے سال بھر بعد جب پِکّی گرفتار ہوا تو اُس کی کوئی اطلاع اسے نہیں مل سکی۔ اسے بتایا گیا کہ اسے ایک عرب ملک میں جاسوسی کے لئے وزارت خارجہ کے بیروت میں واقع عربی مطالعہ مرکز میں کچھ دن تربیت لینی ہوگی۔ یہ سکول بیروت سے ۲۰ میل دور شیملان میں تھا۔ چنانچہ بلیک اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ستمبر ۱۹۶۰ میں وہاں جا بسے تقریباً اسی وقت سے لندن میں برٹش خفیہ سروس ایم ۱۶ کو بلیک کے بارے میں کچھ پریشان کن خبریں ملنے لگیں۔

اس کے پیچھے اس جرمن مخبر آئٹنز عرف پِکّی کا ہاتھ ضرور رہا ہوگا۔ لیکن پِکّی کے مشتبہ پس منظر کی وجہ سے اِن خبروں سے صرف تشویش ہی پیدا ہوئی، بلیک پر کوئی شک بالکل نہ کیا گیا۔

اس بیچ خود بلیک سے بھی ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں برطانیہ کا مشہور عالم 'پورٹ لینڈ جاسوسی کیس' منظرِ عام پر آگیا۔ اس میں برطانیہ کے پورٹ لینڈ بحریہ اڈے سے خفیہ کاغذات اُڑانے کے سلسلے میں پانچ روسی جاسوس

تو کبھی اس [illegible] شے
تو بھی انساں ہے، وہ بھی انسان تھے
کوئی [illegible] کیوں ساتھ [illegible] تا ہے
کوئی [illegible] کیوں [illegible] ہوتا نہیں
تو جو کہتا ہے ہم کو بھلایا تھا کیوں
تو نے یہ عشق کرنا سکھایا تھا کیوں
میرا سب کچھ اسی عشق میں لٹ گیا
اب بتائیں تجھے ہمدردوں بھی تو کیا
—— احمد ندیم قاسمی

پکڑے گئے تھے اور ان پر مقدمہ چلا تھا۔ اس وقت سب جگہ یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ جاسوسوں نے برٹش اٹامک انرجی کمیشن اور نیٹو تنظیم کے ایٹمی ہتھیاروں کے راز روس کو پہنچائے ہیں۔ اس بات کو لے کر برطانیہ میں کافی ہنگامہ مچا تھا اور برٹش پرائم منسٹر میکمیلن اور دوسرے افسران کو اپنے یہاں اٹامک پوشیدگی اور حفاظت وغیرہ کے بارے میں امریکن سرکار کا شک دور کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بہرحال یہ سب ہوا تھا اور تمام دنیا کے اخباروں میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ لیکن بلیک نے یہ سب دیکھتے ہوئے بھی بیروت میں روسی ایجنٹوں سے اپنی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ بند نہ کیا۔ خود بیروت میں واقع برٹش سفارت خانے کے ایک حفاظتی افسر نے اسے ایک ایسی ہی خفیہ ملاقات کرتے دیکھا۔

مارچ ۱۹۶۱ میں پولش کمیونسٹ سرکار کا نائب وزیر داخلہ کرنل انیتھوتی ایلسٹر روسی کیمپ کو چھوڑ کر مغرب سے آملا۔ ایلسٹر پولش خفیہ پولیس (جیڈ ۲) کا سربراہ تھا اور اس حیثیت سے وہ برلن وغیرہ میں بلیک سے کئی بار ذاتی طور پر مل چکا تھا۔

وہ ۵۴ سالہ پولش سیاسی مدبر پیدائش سے ہی یہودی تھا اور وہ پولینڈ سے اس لئے بھاگا کیوں کہ انہی دنوں سوویت سرکار نے اعلان کیا تھا کہ تمام کمیونسٹ سرکاروں سے یہودیوں کا صفایا کیا جانا چاہیئے۔

ایلسٹر کی باتوں پر ہی ایم ۱۶ نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ اب بلیک پر ہاتھ ڈالنے کا وقت آگیا ہے۔ اپریل ۱۹۶۱ میں غیر ملکی سفارت خانے کی طرف سے اُس کے نام ایک تار بھیجا گیا کہ وہ جلدی ہی لندن آئے۔ اس میں احتیاط کے طور پر یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو ایسٹر کی چھٹیوں کے بعد کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ بلیک نے ا[illegible]
کچھ سوچے یا شاید اپنی خود یقینی کی وجہ سے ا[illegible]
وقت سمندری جہاز کا ٹکٹ لے لیا۔ اس درمیا[illegible]
ایم ۱۶ میں اس کے بڑے افسروں نے پورا ا[illegible]
ہفتہ بڑے تذبذب میں گذارا کہ بلیک کہیں ل[illegible]
آنے کی بجائے کسی کمیونسٹ ملک کا رُخ نہ کر[illegible]
بہرحال وہ لندن پہنچا اور لندن پہنچتے ہی ا[illegible]
گرفتار کر لیا گیا۔

باقاعدہ مقدمے سے پہلے کی تمام کار[illegible]
بند کمرے میں ہوئی۔ اخباروں میں اس کے مقد[illegible]
کی پہلی تاریخ ۳ رمئی کو پڑی۔ اسی دن سماعت
ہوئی اور صرف ۱۵ منٹ میں تمام کارروائی پو[illegible]
ہو گئی۔ اس عرصہ میں بلیک نے اقبال جرم کر[illegible]
لارڈ چیف جسٹس نے اسے سزا سنائی۔

اٹارنی جنرل کے مطابق بلیک نے ر[illegible]
کو بہت زیادہ معلومات بہم پہنچائی تھی او[illegible]
سب کچھ اتنے پوشیدہ طریقے سے کیا گیا کہ [illegible]
میں سب کے سامنے کچھ بھی نہیں بتایا جاسکتا [illegible]

مگر اس کے ساتھ ہی اس نے کہا" [illegible]
بلیک بہت ذمہ دار کام پر مامور تھا لیکن [illegible]
قسمتی سے اس کے کام کی نوعیت کچھ ایسی [illegible]
پوشیدہ اسلحہ کی بابت اس کو کچھ معلوم نہ ہو [illegible]

یہ بیان اس لئے دیا گیا تھا کہ امریک[illegible]
پر یہ واضح ہو سکے کہ روس اُس کی ایٹمی طاق[illegible]
بالکل نابلد ہے۔ اُس نے جو کچھ بھی کیا وہ [illegible]
معاشرتی تنظیم میں اپنی ساکھ جمانے کی وجہ [illegible]

وہی سابق برٹش ایجنٹ جو اب [illegible]
کمیونسٹ ہے، پھر ایک بار جیل سے بھاگ [illegible]
ہے۔ لیکن کیا اِس بار اُس کے روسی آقا [illegible]
اپنے مغربی حریفوں کے خلاف استعمال کر[illegible]
شاید اب یہ مشہور جاسوس اگر روس پہنچ [illegible]
وہاں پر ہی پنشن لے کر قیام پذیر ہو جا[illegible]
ایسا اس لئے ممکن نہیں ہے کیوں کہ اُس [illegible]
بدن میں ابھی گرم خون ہے۔



و جے واڑہ کی
نچویں درجے میں پڑھنے
لی ایک لڑکی نیرملا نے
ار کے قحط زدگان کی
راد کے لئے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو
ا روپے بھیجے ہیں۔ اُس نے صدر موصوف
ایک خط بھی لکھا ہے —— میں اپنی ساری
، شدہ رقم بھیج رہی ہوں میں نے ڈوکومنٹری
میں بہار کے لوگوں کی مصیبتیں دیکھی ہیں۔ میں
، سے بہت متاثر ہوئی ہوں اور اپنے جیب
ج کے پیسے اُن لوگوں کی نذر کرتی ہوں۔"

—— روزنامہ آزاد ہند۔ کلکتہ

(بھیجنے والے: واجد حسین، جھریا)

•

ضلع مراد آباد میں امروہہ کے نزدیک واقع
ع بلولہ میں غروب آفتاب کے وقت ایک
یا گھس آیا اور مکان کے دروازے پر کھیلتے
ئے ایک بچے کو اُٹھا کر لے بھاگا۔
گاؤں کے پردھان عیوض خاں نے فوراً اُس
ئے کا تعاقب کیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد
ما ایک جگہ رُک گیا۔ بچے کو منہ سے نیچے اُتار
س کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اُسی دوران عیوض خاں
بچے کو گود میں بھر لیا اور بے تحاشہ واپس بھاگے
بھڑیے نے عیوض خاں پر حملہ کیا۔ اس اثنا میں اور
ب بھی آ گئے جنہوں نے بھیڑیے کو مار بھگایا۔
بچہ تو صحیح سلامت بچ گیا مگر عیوض خاں
ریڑھ کی ہڈی ضرور ٹوٹ گئی۔
اُس وقت عیوض خاں اپنی تکلیف کو بھول کر
ت بچے کی جان بچانے کی کوشش میں تھے۔

—— مخبر عالم، مراد آباد

(بھیجنے والے: خالد ملک چاندپوری، بجنور)

•

دربھنگہ میں ایک نوجوان ہومیوپیتھ ڈاکٹر گیندر پرشاد ساہو رکشے پر ایک مریض کو دیکھنے جا رہے تھے کہ راستے میں اُنہیں ایک بیگ پڑا ہوا ملا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ساڑھے پانچ ہزار روپے تھے۔ ڈاکٹر کی دور بیں نگاہوں نے دور سڑک پر ایک آدمی کو سائیکل پر تیزی سے جاتے دیکھا۔ انہوں نے اندازہ لگایا اور رکشہ اسی سائیکل سوار کے پیچھے دَوڑا دی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بیگ اُسی سائیکل سوار کا تھا۔ ڈاکٹر نے اُسے لوٹا دیا۔

—— سرچ لائٹ، پٹنہ

(بھیجنے والے: سید شوکت علی، گیا)

•

ٹریکٹر چلاتے ہوئے فرانس کے ایک کسان کا ہاتھ کٹ گیا۔ اُس نے کٹے ہوئے ہاتھ کو اُٹھایا اور ایک میل کے فاصلے پر واقع اسپتال میں جا کر ڈاکٹری امداد حاصل کی

—— سالار، بنگلور

(بھیجنے والی: نیلوفر ثمینہ، میسور)

•

مونگھیر میں آنند بھون میں ایک سماجی اجتماع کے افتتام پر جب مہمان لان میں ٹہل رہے تھے تو ایک چھوٹا بچہ کلکٹر کے پاس آیا اور انہیں ۵۰۱ روپے کا ایک چیک پیش کیا جس کے ساتھ ایک تحریر بھی تھی —— جیب خرچ سے بچی ہوئی رقم کو بہار کے قحط زدہ لوگوں کی امداد پر صرف کیا جائے۔ میرے پیسے اور بچوں کو پیٹ بھر روٹی بھی نہ ملے تو میں اپنے جیب خرچ کا کیا کروں۔"

—— آزاد ہند، کلکتہ

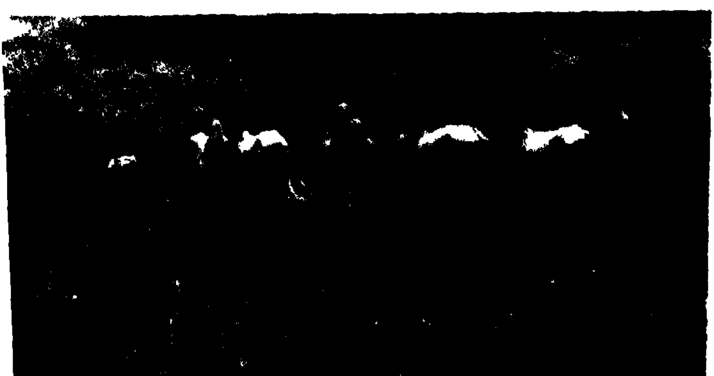
(بھیجنے والی: شکیلہ اختر، کلکتہ)

اس فیچر کے لئے اخباروں کی کٹنگ بھیجئے۔ شائع ہونے پر پانچ روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔
—— ایڈیٹر



یادوں کے پھول

[illegible]



مقالہ

•

ایس۔ ایم۔ سعید

نئی نسل



ج کل ہر طرف یہی سننے میں آتا ہے کہ
ئی نسل غیر ذمے دار، اور غیر مہذب ہے۔
، نسل اپنے فرائض کی طرف سے بے خبر ہے۔
نے حقوق کا صحیح مقصد نہیں سمجھتی۔ اپنے قدیم
بر کو بھول چکی ہے اور سماج میں ہونے والے
خطاط کی تمام تر ذمے دار یہی نسل ہے۔ دوسری
رف اسی نسل کو ملک کا مستقبل اور اس کا
مار بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ایک
ہم مسئلہ ہے کہ اگر نئی نسل حقیقت میں اتنی
نحطاط پذیر ہے تو اس کے ہاتھوں میں ملک کا
ستقبل سونپ دینا کہاں تک ٹھیک ہوگا۔

اِس مسئلہ سے قطع نظر موجودہ نسل میں
ے ضابطگی، قانون شکنی، غیر ذمے داری اور
پنے فرائض سے بے خبری کس قدر پائی جاتی
ہے۔ سب سے بنیادی سوال تو یہ ہے اگر نئی
سل میں فی الحقیقت انحطاط ہو رہا ہے تو اِس
کی ذمے دار وہ خود ہے یا اُس کے بزرگ؟ یہ
ذمے داری ایک فرد کی ہے یا پورے سماج کی؟
ذمے داری ان سیاسی حالات، سماجی ماحول،
اقتصادی مسائل، ذہنی تبدیلیوں، بدلتی ہوئی
قدروں، مختصر یہ کہ اس سماجی ڈھانچے کی ہے جس
میں نئی نسل آنکھ کھولتی ہے۔ جس میں وہ پرورش
پاتی ہے جس میں وہ پلتی بڑھتی ہے اور جس میں
رہ کر وہ جلد ہی پرانی نسل کی نمائندہ اور نئی نسل
کی خالق بن جاتی ہے یا نئی نسل فطری اور قدرتی

جو قانون شکنی، بے ضابطگی اور غیر ذمے داری کے لئے بدنام ہے۔

طور پر اپنے ساتھ ان خرابیوں کو لے کر آتی
ہے؟
اگر یہ غیر ذمے داری اور بے راہ روی
نئی نسل کی فطرت کا ہی جزو ہے تو پھر اس کا
ماتم ہی کرنا بیکار ہے لیکن اگر اس نسل کے
زوال کے کچھ دوسرے اسباب ہیں تو پھر اس
کے لئے نئی نسل کو ہی کیوں نشانۂ ملامت بنایا جاتا
ہے؟ درحقیقت اس انحطاط کا ذمہ دار پورا سماج
ہے جس میں پُرانی نسل بھی شامل ہے۔

میرے خیال میں نئی نسل کی کوئی واضح تعریف
ہی ایک دشوار بات ہے۔ آج
کی مشترک سماجی زندگی میں 'قدیم' اور 'جدید'
نسل کے مسائل اتنے مربوط اور مشترک ہیں کہ
سماج کو نئی اور پُرانی نسل میں تقسیم کرنا پورے
معاشرہ کی ایک غلط بنیاد پر تقسیم ہوگی۔
سماج میں رہنے والا ہر فرد چاہے وہ بچہ ہو
یا بوڑھا، نئی نسل کا نمائندہ ہو یا پُرانی قدروں کا
علم بردار، ایک دوسرے سے الگ نہیں رہ سکتا۔
نئی نسل پُرانی نسل کی آغوش میں آنکھ کھولتی ہے
اُسی کے سائے میں جوان ہوتی ہے اور پھر ایک
ایسی منزل آتی ہے جب وہ خود نئی نسل کے
زمرہ سے نکل کر اپنے کو قدیم نسل میں شمار کرنے
لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نئی اور پُرانی نسلوں
کے بیچ کوئی ٹھوس تقسیم نہیں کر سکتے۔
موجودہ دور میں زندگی اتنی تیزی سے
رواں دواں ہے کہ لمحہ بھر میں نئی چیز پُرانی چیز میں
تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی حال نسلوں کا ہے۔ محسوس
یہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کا ماتم کرنا کچھ فیشن سا ہوگیا
ہے اور ہر آدمی اس الزام کو جو پہلے اُس کے
بزرگ اس پر لگا چکے ہیں، دوہرا کر اپنے دل
کے بوجھ کو ہلکا کر لیتا ہے اور اس طرح الزامات
کا ایک ناتمام سلسلہ چلتا رہتا ہے۔
آج ہر وہ شخص جو خود کو پُرانی نسل اور

آج نئی نسل کو غیر ذمے داری

ان حالات میں تمام ملک

قدیم قدروں کا حامل سمجھتا ہے اور جو خود
تک غیر ذمے دار تصور کیا جاتا تھا، آج ا
سامنے پیدا ہونے والوں پر اُنہی الزامات
عائد کرتا ہے۔ اس طرح وہ جو خود غیر ذمے
کے خطابات سے پہلے نوازے جا چکے ہیں
کو غیر ذمے دار اور نا فرض شناس کہہ کر
سا محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح سے مخصوص
ہی نہیں پورا معاشرہ غیر ذمے دار افراد کا
ایسا مجموعہ بن جاتا ہے جس کا ہر فرد کسی نہ
غیر ذمے داری سے ذمے داری کی صف
پہنچ جاتا ہے۔

اِس لئے سوال یہ ہے کہ اگر ذمے دا
غیر ذمے داری ایک وصفی چیز
اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے تو یہ سمجھ میں نہ
کہ آج کا وہ نوجوان جسے غیر ذمے دار
ہے چند ہی سال بعد کی نئی نسل بانئے
والوں کو غیر ذمے دار کہہ کر خود کو ذمے دا
زمرہ میں کیسے شامل کر لیتا ہے؟ اگر حقیقتاً
الاہ غیر ذمے داری اپنی جگہ پر کوئی مستق
تو محض چند سال کا وقفہ غیر ذمے داری
بے خبری کو باخبری، بے راہ روی کو را
لاپرواہی کو فرض شناسی، مختصر یہ کہ بُر
اتنا اچھا کیسے بنا دیتا ہے؟ اس سے
نکلتا ہے کہ ذمے داری اور غیر ذمے د
محض زمانے سے کیا جاتا ہے اور ار
وصفی حیثیت نہیں ہے۔ نئی اور پُرانی
محض عمر سے نہیں، قدروں کے لحاظ سے

بے راہ روی اور فرائض سے بے خبر ہونے کا الزام دیا جاتا ہے۔

ستقبل اُن کے ہاتھ سونپ دینا کہاں تک ٹھیک رہے گا ؟

اس سلسلے میں ایک دل چسپ بات یہ ہے
ا یوں تو ہر آدمی نئی نسل کو موردِ الزام ٹھہرانے
رتیا۔ دکھائی دیتا ہے لیکن اگر کسی باپ سے
پوچھا جائے کہ کیا تمہارا بیٹا غیر ذمّے دار اور
بے راہ رَو ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد کم ہی
لے گی جو اپنے بیٹے پر لگائے جانے والے ان
زامات کو خندہ پیشانی سے قبول کرلیں۔ تو اب
ال یہ ہے کہ شخصی حیثیت سے کوئی بھی باپ
پنے بیٹے کو غیر ذمّے دار تسلیم کرنے پر تیار نہیں
پھر پوری نسل غیر ذمّے دار کیسے ہوسکتی ہے
ب سماج فرد کی ہی ایک بسیط شکل ہے۔

س سے دو نتیجے نکلتے ہیں کہ یا تو کوئی نسل غیر ذمّے دار اور انحطاط پذیر نہیں
ہے اور یا پھر ہر شخص کے پاس قدروں کے
لف پیمانے ہیں جن سے وہ فرد اور سماج کی
وصیات کا تعین الگ الگ ڈھنگ سے کرتا
۔ اور ایسا کرنے میں بھی وہ اپنے اور پرائے
، تفریق کرتا ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہی ہے کہ نئی نسل خود اپنی
دنیا کی ذمّے دار نہیں ہوتی وہ تو پُرانی نسل
ہی پروردہ ہوتی ہے، اسی سے متاثر ہوتی ہے
، اسی نسل کی قدروں اور کلچر کا مظہر ہوتی ہے۔
ج میں نئی اور پُرانی نسلیں دو الگ الگ خانوں
، اس طرح تقسیم نہیں کی جاسکتیں کہ جوان اور
ھے کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق رکھا
ئے اور نہ ہی نئی نسل ہمیشہ نئی رہتی ہے۔
آج نئی اور پرانی نسل میں امتیاز کی بنیاد
عمر پر رکھی جاتی ہے۔ نئی نسل کا ایک فرد ایک بچّے کا باپ بنتے ہی پیچھے کی طرف ہٹنے لگتا ہے اور جلد ہی وہ پُرانی نسل کا علم بردار اور نئی نسل کا ناقد بن جاتا ہے اور قطعاً بھول جاتا ہے کہ یہ تخلیق خود اُن کی ہے جس کی اچھائی یا بُرائی کی ذمّے داری ان پر بھی عائد ہوتی ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ کوئی بھی انسان فطری طور پر ذمّے دار یا غیر ذمّے دار پیدا نہیں ہوتا۔ مشہور فلسفی روسو کے اِس خیال سے کہ انسان فطرتاً نیک پیدا ہوتا ہے مگر سماج اُسے خراب بنا دیتا ہے، پوری طرح اتفاق نہیں کیا جاسکتا مگر اُسے اس ترمیم کے ساتھ ضرور قبول کیا جاسکتا ہے کہ خراب ماحول انسان کو خراب بنانے کا ذمّے دار ہوتا ہے۔ نئی نسل تو آنکھیں بند کئے ہوئے وجود میں آتی ہے۔ اگر اسے روشن ماحول ملتا ہے تو اُس کی زندگی بھی روشن بن جاتی ہے ورنہ وہ تاریکی میں بھٹکتی اور ٹکراتی رہتی ہے اور گمراہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے ایک نسل کی تعمیر و ترقی کے اسباب وہ ماحول اور سماج ہوتا ہے جسے وہ آنکھ کھول کر دیکھتی ہے اور جس میں وہ تربیت پاتی ہے۔

درحقیقت ہمارے عروج و زوال، ترقی و تنزلی کی ذمّے داری پورے سماج پر ہے جس میں نئے اور پُرانے سب ہی لوگ شامل ہیں۔ یہ ذمّے داری اُن سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کی ہے جن میں ہم پیدا ہوتے ہیں، جنہیں ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے اگر آج کے نوجوانوں میں اخلاقی قدروں کی

کمی یا نافرض شناسی کی کوئی جھلک ملتی ہے آ
اس کے لئے موردِ الزام محض نوجوان طبقہ ہ
نہیں بلکہ وہ سماج اور ماحول اور اس ماحول کے
پیدا کرنے والے ہیں جسے اُس نے آنکھ کھول
دیکھا ہے اس لئے اصلاح کی ضرورت محض آ
کے نوجوانوں میں ہی نہیں ہے بلکہ پورے معاش
کی اصلاح درکار ہوگی تب ہی ہم انحطاط کا دا
سدّ باب کر سکتے ہیں۔

اسی ذمّے داری کو دوسرے پر لاد دینا از
کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی بات کم
اس الزام کے سلسلے میں ہے جو آج ہمارے بز
نوجوانوں پر عائد کرتے ہیں. نئی نسل کے انحط
پذیر ہونے کے احساس کے پیچھے ایک سبب
بھی ہے کہ موجودہ دنیا اتنی کروٹیں لے رہی ہے
اور زندگی اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، ذہ
تبدیلی اس عجلت سے ہو رہی ہے کہ اس سے نئ
اور پرانی نسل کے بیچ ایک خلیج سی بنتی جاتی ہے۔
نسلوں کے قافلے تیزی سے گذر رہے ہی
ہر قافلہ اپنے نقوش چھوڑتا ہوا گذر جاتا ہے ا
جب دوسرا قافلہ اسی راستے سے گذرتا ہے ت
گزشتہ نقوش کو اپنے پیروں سے روندتا ہ
چلا جاتا ہے۔ پُرانے نقوش اپنے کو پامال ہو
ہوئے دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں۔ یہ چیخ پُرانی
کی ہوتی ہے جو نئی نسل کے نئے نقوش کو قبول
پر تیار نہیں ہوتی۔ اس طرح نئی اور پُرانی نس
درمیان قدروں کا ایک ٹکراؤ پیدا ہو جاتا۔
پُرانی نسل بدلتے ہوئے حالات
مطابق اپنے کو ڈھال نہیں پاتی اور نوجوا
رہن سہن، اُن کے طور طریقے اور اُن کے
پسند خیالات سے مزاجی ہم آہنگی نہ ہو
سبب وہ ان پر طرح طرح کے الزامات
لگتی ہے۔ حالاں کہ وہ اس بات کو بھول
ہے کہ اس نئی نسل کی معمار وہ خود ہی

ضاد کو ہم اکثر قدامت پسندی اور ترقی پسندی
کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔
مشہور فلسفی ارسطو نے سماج کو خاندان کی
ایک ارتقائی شکل مانا ہے۔ نسلوں کی ابتدا اور
پرورش خاندانوں میں ہی ہوتی ہے۔ اس لئے
وہ خاندان جس میں بچّہ پیدا ہوتا ہے جس میں وہ
پرورش پاتا ہے جس ماحول کو وہ دیکھتا ہے اسی
کے مطابق اس کا مزاج بنتا ہے اور اسی سے اس
کی زندگی کا خاکہ ترتیب پاتا ہے۔ ہمارے ملک
کے نوجوانوں میں پایا جانے والا انتشار اور بے
ضابطگی کا رجحان کچھ سیاسی اور سماجی قوتوں کا
اکردہ ہے جس سے سارا سماج متاثر ہوتا ہے۔
لاقی زوال اور نئی نسل کے انحطاط پذیر ہونے
ایک سبب ملک کے اقتصادی مسائل اور معاشی
حالی ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا اثر نہ
رف پوری معیشت کو متاثر کر رہا ہے بلکہ اس کا
سارے معاشرے پر پڑنا لازمی ہے۔ اس کا
محض ملک کی اقتصادی ترقی ہی پر نہیں بلکہ ہر
و کی زندگی پڑتا ہے۔

بچّہ آج جس خاندان میں پیدا ہوتا ہے
عام طور سے اُس کے اقتصادی مسائل
کافی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی صحیح تعلیم و تربیت
کر اٹھا سکیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا
شی بدحالی اخلاقی تنزلی کا سبب بن جاتی ہے۔
رح خاندان جو ارسطو کی نگاہ میں سماجی زندگی
رائی تعلیم گاہ ہوتے ہیں اپنے فرائض کو پورا
میں مجبور نظر آتے ہیں۔ ملک میں آج بھی
ن موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کی کمی اخلاقی
، قانون شکنی بے ضابطگی اور حقوق و فرائض
شناسی جیسی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔
یہاں ایک اہم سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اگر
ل میں پائی جانے والی ان برائیوں کا
علم کی کمی ہے تو پھر تعلیم یافتہ طبقہ اور

خصوصاً طلبار میں آج اتنی بدنظمی کیوں دکھائی دیتی ہے۔ دراصل یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کے اسباب تلاش کرنے میں آج پورا ملک سرگرداں ہے۔ میرے خیال میں طلبار کی بدنظمی اور اخلاقی تنزلی کا سبب اُن کا خاندانی پسِ منظر اور وہ ماحول ہے جس میں انہوں نے پرورش پائی ہے، ان اقتصادی پریشانیوں کا ہے جن کا انہیں ابتدا سے ہی سامنا کرنا پڑتا ہے، اس معاشی غیر مساوات کا ہے جس سے ان میں رشک وحسد کا جذبہ پیدا ہونا لازمی ہے، ان غیر معیاری فلموں اور فحش لٹریچر کا ہے جو انہیں گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

اکثر ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ایک باپ کی اپنے بچے پر گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس ماحول میں بچے کی پرورش ہوتی ہے اُس سے نئی نسل ہمیشہ متاثر رہتی ہے چاہے وہ کالج کی زندگی ہو یا سماجی زندگی۔ ایک خوش حال خاندان کا بچہ جو اچھا کھاتا پہنتا ہے اچھی طرح رہتا ہے اچھے سکول میں تعلیم پاتا ہے عام طلبار سے مہذب اور باسلیقہ دکھائی دیتا ہے۔

طلبار کی جتنی بھی تحریکیں ہوتی ہیں اور جتنے بھی 'بے بنیاد ایجی ٹیشن' ہو رہے ہیں ان میں عام طور سے انگلش سکول میں پڑھنے والے طلبار نہیں ہوتے کیوں کہ اچھے سکولوں میں پڑھنے والے طلبار ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے سرپرست ان کی صحیح تعلیم وتربیت کا بار اٹھانے کے قابل ہوتے ہیں۔

نوجوانوں کی گمراہی کا سبب ہمارے سیاسی حالات بھی ہیں۔ عوام میں سیاسی شعور کا فقدان ہونے کی وجہ سے جو سیاسی نظام تربیت پا رہا ہے اس سے عوام اور خصوصاً نوجوانوں میں بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ آج طلبار کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ انہیں غلط طرح سے اُکسایا جاتا ہے، قانون شکنی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ حکومت اور برسراقتدار پارٹی کی طرف سے بدظن کیا جاتا ہے اور جب یہ نئی نسل جذبات سے بے قابو ہو کر قانون شکنی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اسی کی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔

رائے عامّہ کو ہموار کرنے اور الیکشن جیتنے کے لئے خود سیاسی جماعتیں ذات پات، مذہب خاندان اور دوسری بنیادوں پر تفریق پیدا کر کے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتی ہیں۔ نتیجتاً اس سے طلبار میں گمراہی پیدا ہو جاتی ہے۔

معاشی غیر مساوات نے سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی ہے ہر طبقہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔ سماجی ماحول کو زہر آلود کرنے میں فحش لٹریچر، فلمیں اور ایسی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ قانون کی گرفت قدرے ڈھیلی ہے۔ مختصر نوجوانوں کی اخلاقی تنزلی کی ذمّے داری پورے معاشرہ پر آتی ہے اور بزرگ محض نوجوانوں کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی ذمّے داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

نوجوانوں کی اصلاح کے لئے ہمیں ایسا صحت مند ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں آسودگی، مساوات، ہمدردی اور رکھ رکھاؤ کے اصول رائج ہوں۔ خاندانوں کی از سرِ نو تنظیم کرنی ہوگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کو اس طرح روکنا ہوگا کہ ہر خاندان بچوں کی صحیح تعلیم کا خود کفیل ہو سکے۔

معاشی مساوات ایک بنیادی ضرورت ہے مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اقتصادی خوشحالی بھی اکثر اخلاقی تنزلی اور عیش وعشرت کا سبب بنتی ہے۔ اسی وقت ہم ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر کر سکیں گے جس میں پرورش پا کر نئی نسل ملک کے مستقبل کا بار اٹھانے کی متحمل ہو سکے۔

شراب اور شباب

مسلسل ناول • جان ادہند

گذشتہ سے پیوستہ

شہنشاہ جہانگیر کی مے نوشی کے تدارک کے لئے ملکہ نور جہاں نے معتبر منصب دار رستم کو حکیم شباب کو
نے کے لئے روانہ کیا۔ وہ ایک قافلے کے ساتھ چلنے والی ایک خوبصورت حسینہ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ دورانِ
مریں تُند بیلے ڈاکو بھی اُس حسینہ پر فریفتہ ہو گئے اور انہوں نے اُس کا اغوا کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ مگر رستم نے نہ
رف حسینہ کو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رکھا بلکہ اُسے اور اُس کی ماں کو ایک حفاظتی دستے کے ہاتھ سونپ بھی دیا۔
رستم نے ہر چند کوشش کی کہ حکیم شباب بذاتِ خود جہانگیر کے علاج کے لئے عازم سفر ہوں مگر حکیم صاحب
مانے اور انہوں نے رستم کو اپنے ساتھ ٹھہرا لیا تاکہ دو چار دن میں ایک مجرب دوا تیار کی جا سکے۔
حکیم شباب کے پاس ٹھہرنے کے دوران رستم کو عجیب حالات کا شکار ہونا پڑا۔ وہ ایک سُرنگ میں پہنچ گیا جہاں
ہ قید کر لیا گیا۔ وہیں اُس کی ملاقات خوبصورت حسینہ سے ہوئی۔ اُسے سخت تعجب ہوا کہ وہ حسینہ سرنگ میں رہنے
الے سردار کی بیٹی تھی۔
رستم حکیم شباب سے دوا لے کر رخصت ہونے ہی والا تھا کہ سُرنگ والے بوڑھے سردار نے اُسے اپنے
س بلایا۔ رستم نے مناسب موقع پا کر حسینہ کی ماں سے اپنے دل کی کیفیت آشکار کر دی۔ بوڑھی نے بتایا کہ اس
ی مراد پوری ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔
اس عرصے میں بوڑھے سردار نے جہانگیر کی دوا کی بوتل اُڑا کر اُس کی بجائے تیزاب کی ایک بوتل رکھ دی تاکہ
ہ جہانگیر سے اپنی پرانی دشمنی نکال سکے۔ جب بوڑھی عورت اور حسینہ کو یہ عقدہ کھُلا تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ انہوں
ے ایک تیز رفتار قاصد رستم کے پیچھے بھیجنا چاہا مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔
بوڑھے سردار حسن قلی استجلو نے پانچ چھ خطوط بھی مغل دربار کے باغی سرداروں کے نام بھیجے جس میں
ںس مطلع کیا گیا کہ جہانگیر کی موت لازمی ہے وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ رہیں
واپسی پر رستم ایک ٹولی کے ساتھ چلتا رہا جس میں ایک بوڑھا بھاٹ اپنا اِکتارہ بجا کر لوگوں کی
لچسپی کا سامان جُٹاتا۔ بابھا اور راجپوتوں کو اُن کی خاندانی شجاعت و بہادری کے قصے سُنا سُنا کر
غل سلطنت کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔
رستم مغل پڑاؤ میں پہنچا اور شہزادہ خُرّم کو جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ شہزادہ خُرّم رانا امر
سنگھ سے ملاقات کی تیاریاں کر رہا تھا اُس نے رستم کی بات سنی اور اپنی جگہ محتاط ہو گیا۔
شہزادہ خُرّم رستم کو ساتھ لے کر اجمیر پہنچا اور وہاں کے جنگل میں شکار کا انتظام کیا وہیں
یک چیتا مارا گیا جس کے گلے میں ایک پٹہ پڑا ہوا تھا جس پر علی قلی استجلو (شیر افگن کا نام)
درج تھا
نور جہاں کو سارا واقعہ ذہن نشین ہو گیا وہ عجیب سی بے کلی محسوس کرنے لگی۔
اب آگے پڑھئے۔

ہندوستان کی زمین ہے اور میرے خاندان کو اِس نہیں آئی ۔ اِس زمین نے بہت
رحمی سے میرا بھائی مجھ سے چھین لیا، میری حیثیت چھین لی اور اس کے ساتھ ہی میری بیٹا
بھی چھین لی ۔ بہادر شیر افگن کے ناپاک قاتل کو اُس کے گناہ کا بدلہ مل جانے کے بعد
اِس زمین پر رہنے کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔"

"لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ کسی فطری امر کی وجہ سے شہنشاہ کو وہ
پلائی ہی نہ جائے۔" بیگم نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا "کوئی بھی ایسی بات ہو سکتی ہے
یا حادثہ ہو سکتا ہے، جس سے آپ کا منصوبہ پورا نہ ہو سکے۔ میرے دل کی پوچھئے تو مجھے
اِس سے قطعی افسوس نہ ہوگا۔"

سردار خشک سی ہنسی ہنسا۔

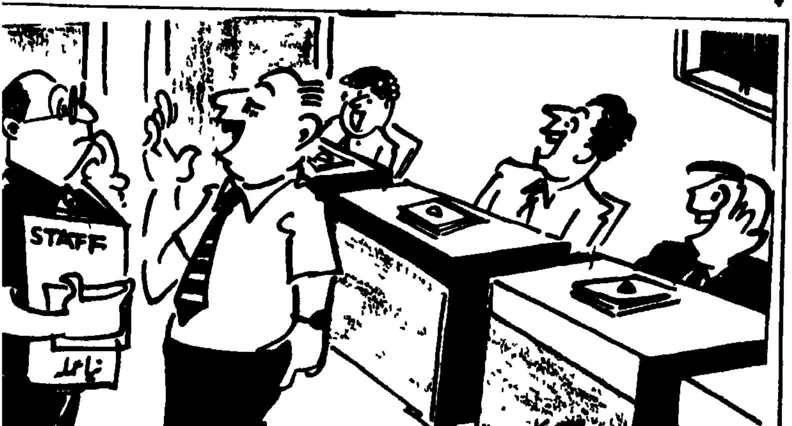
"مجھے معلوم ہے ممتاز کہ شروع سے ہی تم اُس بدمعاش مُغل کو اُس کے گناہ
کی سزا دینے کی میری کوششوں کے خلاف رہی ہو۔"

"فرض کیجئے کہ آپ کی سازش کسی نہ کسی وجہ سے ناکام ہو گئی تو پھر آپ کیا کریں گے؟"

"اصل بات تو یہ ہے کہ اِس بارے میں مَیں نے ابھی کچھ نہیں سوچا ہے۔ لیکن
ناکام نہیں ہو سکتی ۔ گناہگار کو سزا ضرور ملے گی ۔"

"لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ سزا اِسی جہان میں ملے" بیگم نے جواب دیا "اکثر یہ
ہوتا ہے کہ گناہ گار پھلتے پھولتے رہتے ہیں اور نیک انسان بے قصور ہوتے ہوئے
مصائب جھیلتے ہیں ۔"

"ہاں، یہ بات بھی سچ ہے بیگم ۔ میں اِس کا پوری طرح قائل ہوں ۔ لیکن جلدی یا بدیر
سے سزا ضرور ملتی ہے ۔ جہانگیر اپنے گناہوں کی سزا سے نہیں بچ سکتا ۔ نہیں بچ سکتا ۔ بالکل نہیں
بچ سکتا" اُس نے جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔



"جتنے چاہے آدمی بھیج دیجئے ۔ کام ہمارے یہاں ہمیشہ پڑا رہے گا ۔ آخر یہ پرانے لوگ اور کس لئے ہیں!"



اگلی صبح سردار کو یہ خبر ملی کہ اُس کا پالتو چیتا اپنے پنجرے سے نکل بھاگا ہے اور تلاش کرنے پر بھی اُس کا پتہ نہیں چلا ہے۔

"یہ بہت بُرا ہُوا، بہت بُرا" سردار بڑبڑایا "یہ چیتا میرے نیک بھائی نے اپنی رت سے ایک ماہ پہلے مجھے دیا تھا۔ یہ میرے بھائی کا آخری تحفہ تھا اور اس دلیر جانور کو یکھ کر مجھے ہمیشہ اپنے دلیر بھائی کی یاد آتی تھی، جو اَب اِس دُنیا میں نہیں ہے۔ اب اُس کی یہ نشانی بھی چلی گئی۔ یہ اچھا فال نہیں ہے۔ بہت ہی منحوس بات ہے۔"

"دیکھو" اُس نے خبر لانے والے خدمت گار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چیتے کو ارے جنگل میں تلاش کرو۔ ممکن ہے کہ مل ہی جائے۔ وہ کہیں زیادہ دُور نہیں گیا ہوگا۔ جیسے ی ہو اُسے تلاش کر لاؤ۔ وہ ضرور واپس آنا چاہیئے، نہیں تو ..... بہت منحوس فال ہوگی۔ بت منحوس ....." وہ پھر بڑبڑانے لگا۔

لیکن اپنے پالتو چیتے کے گُم ہو جانے سے بھی زیادہ سنجیدہ خبر اُسے ملی۔ کچھ دیر کے ند اُسے بتایا گیا کہ اُس کی بیٹی اور ایک خادمہ صبح سے غائب ہیں اور اُن کا کچھ پتہ یں چل رہا۔

"میری زبیدہ غائب ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟ وہ کہاں جا سکتی ہے؟ اُسے تلاش رو، نمک حراموں۔ جب تک وہ مل نہ جائے، مجھے اپنا چہرہ مت دکھانا۔ میری بیٹی بیدہ چلی گئی۔ ایک کے بعد دُوسری منحوس بات ہو رہی ہے" اُس نے پریشانی سے ہا۔

اگلے روز بادشاہ نے شہزادہ خُرم کے استقبال میں ایک بہت بڑا دربار منعقد کیا۔ ہزادہ خُرم میواڑ کا میدان سَر کر کے لوٹا تھا۔ ساتھ ہی میواڑ کے رانا کی طرف سے اُس کے کنور کرن سنگھ کو بھی دربار میں پیش ہونا تھا۔ یہ ایک ایسی شان دار کامیابی تھی جو ،جہانگیر کے والد اکبر کو بھی نصیب نہ ہو سکی تھی۔

ایک بہت عالیشان دیوان خانے میں ایک اُونچے چبوترے پر شہنشاہ کا تخت تھا۔ س چبوترے کے سامنے نیچے ایک اور چبوترہ کافی دُور تک پھیلا ہُوا تھا جس کے ارے چاندی کا جنگلہ بنا ہُوا تھا اور بیچ کا فرش ریشمی اور مخملی قالینوں سے ڈھکا ہُوا ا۔ اِس نچلے چبوترے پر شہنشاہ کے رُوبرو بڑے بڑے امیر امراء، ایلچی اور دُوسرے

معزز مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہی جاہ و جلال کے آگے سب مہر بہ لب تھے
اِس خوب صورت جنگلے کے باہر ایک اور دائرہ تھا جس کے چاروں طرف رنگین لکڑی کی جھلمل لگی ہوئی تھی۔ یہ دائرہ، خاص لوگوں اور دو صدی منصب داروں سے نچلے درجے کے اہلکاروں کے لئے مخصوص تھا۔ اِن دونوں دائروں سے پرے ایک کھلا میدان تھا جس میں دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

شہنشاہ کے تخت کے دونوں طرف شاہی چوبدار کھڑے تھے اور دیوان خانے کا دروازہ اور دونوں دائروں کے کناروں پر جھماتی وردیاں پہنے نیزہ بردار پہرے پر تعینات تھے
دربار میں کسی عورت کو آنے کی اجازت نہیں تھی پھر بھی شاہی حرم اور اُمراء کی بیگمات کو دربار کا شان و شوکت بھرا اجلاس دیکھنے سے محرُوم نہیں رکھا گیا تھا۔ دیوان خانے کی دیواروں کے اُوپر بند برآمدوں میں چلمنوں کے پیچھے شاہی حرم کی تمام خوب صُورت حسینائیں موجود تھیں اور چلمن کی اوٹ میں بیٹھی دربار کے نظارے سے محظوظ ہو رہی تھیں دربار میں بیٹھے لوگوں میں سے جب کسی کی نگاہیں چلمن سے ٹکراتیں تو اُنہیں چلمن کی درازوں سے دو کالی کالی آنکھیں جھانکتی نظر آتیں۔

شہزادہ خُرّم کی نشست عین شہنشاہ کے تخت کے سامنے تھی۔ اُس کے پیچھے کرن سنگھ تھا جو کچھ بے چین اور پریشان نظر آرہا تھا۔ شاید اُس کے دل پر اس شرمندگی کا بوجھ تھا کہ اپنی قوم کے دشمن مغل بادشاہ کے سامنے مجبور ہو کر اُسے سر جھکانا پڑ رہا ہے۔ شہزادہ خُرّم اِس بات کو سمجھتا ہوا اپنے شکست خوردہ دُشمن کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا تھا تاکہ اُس کا دِل بہلا رہے اور اُسے اپنی ندامت اور پریشانی کا خیال نہ آئے۔

تمام لوگ شہنشاہ کی آمد کے منتظر تھے۔ لکڑی کے جنگلے کے پیچھے چھوٹے اہلکاروں کے درمیان رُستم اپنے دو ساتھیوں عہدی سراج اور بہادر کے پاس کھڑا تھا۔ اُس کا ساتھی فرید وہاں موجود نہیں تھا۔

کل رات اُنہوں نے فرید کو بیگم خالدہ کے محل کی ڈیوڑھی کے نیچے کنیز نادرہ کے ساتھ چہل کرتے دیکھا تھا۔ رُستم کے دوست اُس سے اراولی کے سفر کے بارے میں پُوچھ رہے تھے۔ رُستم اُن کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

دیوان خانے کی پشت کا دروازہ کھُلا۔ دربار میں لوگوں کی بات چیت بند ہو گئی اور گہری خاموشی چھا گئی۔ تمام لوگ اُٹھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔ چوب دار نے آواز لگائی اور آخر زری اور ریشم میں لپٹی ہیرے جواہرات کی چمک سے جگمگاتی ہوئی شہنشاہ کی بارعب صورت نمودار ہوئی اور وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنے تخت پر جا بیٹھے۔

پھر شہزادہ خُرّم شہنشاہ کے سامنے پیش ہُوا۔ وہ فرشی سلام کے لئے جھکنے ہی لگا تھا کہ شہنشاہ نے اُسے اِشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ خُرّم آگے بڑھا تو شہنشاہ نے اپنے تخت سے اُٹھ کر اُسے گلے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی کو پیار سے چُوم لیا۔
تبھی ایک اہلکار نے سونے کی طشتری میں رکھا ہُوا فرمان شہنشاہ کے سامنے پیش

ہنشاہ نے یہ فرمان اٹھا کر اپنے ہونہار شہزادے کو عطا کیا۔ اِس فرمان کی رُو سے
ہزادے کا درجہ بلند کر کے اُسے پندرہ ہزار پیادوں اور آٹھ ہزار سواروں کی منصبی عطا
ی گئی تھی۔ پھر چوب داروں نے ایک ہیروں سے جڑی ہوئی تلوار پیش کی جو شہنشاہ نے
پنے دستِ مبارک سے شہزادے کے گلے میں ڈال دی۔ اِس کے علاوہ ایک قیمتی خلعت
ر ایک لعلوں کا ہار بھی مُحترم کو عطا کیا گیا۔
شہزادے نے جُھک کر شکریہ ادا کیا اور شہنشاہ کی خدمت میں تسلیم و آداب گذارنے
کے بعد پھر کنور کرن سنگھ کی شہنشاہ کے سامنے پیشی ہوئی۔ کنور نے جُھک کر بادشاہ کو سلام کیا تو
نشاہ نے اُسے اٹھایا اور اپنی دائیں طرف جگہ دی۔ شہنشاہ نے کرن سنگھ کو بھی ایک بہت
یتی خلعت اور ایک ہیروں سے جڑی تلوار بخشی۔
سب لوگوں کی نگاہیں اِس کارروائی پر جمی ہوئی تھیں۔ نوجوان رُستم بھی بہت
ڑے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک کِسی نے ہلکے سے اُس کا کندھا تھپتھپایا۔ رُستم
ا تو دربار کے ایک فوجدار نے رُستم کے کان میں بتایا کہ باہر کوئی خاتون اُس سے
رُ ملنا چاہتی ہے۔ رُستم چپ چاپ بھیڑ میں سے کھسک کر اُس فوجدار کے پیچھے چل
یا۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون عورت تھی جو اِس وقت اُس سے ملنا چاہتی تھی
شامیانے سے باہر آکر اُس نے دیکھا کہ ایک بُرقع پوش عورت اُس کا
نتظار کر رہی ہے۔ رُستم کو دیکھتے ہی اُس نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور چلتی
رئی دیوان خانے کے پچھلی طرف چلی گئی۔ رُستم حیران سا اُس بُرقع پوش عورت کے پیچھے پیچھے
ل دیا۔
کچھ دُور چلنے کے بعد دونوں ایک دیوار کے پاس پہنچے۔ اسی دیوار میں ایک دروازہ کھول
کر وہ عورت اندر ہو گئی۔ رُستم بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ رُستم نے دیکھا کہ وہ ایک
غ میں آپہنچا ہے جہاں سنگِ مرمر کے فوارے چل رہے ہیں۔ درختوں اور پودوں کی
بی لمبی روشیں بنی ہوئی ہیں۔ بُرقع پوش عورت اُس سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے
چے رُک گئی۔
آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔ وہ چلتا ہوا اُس درخت کے پاس جا پہنچا تو اُس
نے دیکھا کہ وہاں ایک اور بُرقع پوش عورت پہلے سے موجود ہے۔
بُرقع پوش عورت نے چہرے سے نقاب اُلٹ دی۔ رُستم کے ہونٹوں سے حیرت
ے چیخ نکل گئی "زبیدہ!"
"اتنے زور سے نہ بولو۔ کہیں کوئی سُن نہ لے" زبیدہ نے آہستہ سے کہا "ہمارے پاس
قت بہت کم ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے دوائی کی بوتل کا کیا کیا؟"
"میں اُسے حفاظت سے لے آیا تھا، کیوں؟"
"وہ ابھی تک تمہارے پاس ہی ہے؟"
"نہیں، میں نے یہاں آتے ہی وہ ملکہ معظّمہ کے حوالے کر دی تھی"
"تب ہماری شامت آگئی" زبیدہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"شامت سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"اُس میں دوا کی جگہ زہر تھا؟ تمہارے آنے کے بعد سب عقدہ کھلا۔"

"کیا؟ زہر؟ تو اُس حکیم نے ....؟"

"نہیں حکیم نے تو دوا ہی دی تھی۔ لیکن بعد میں دوا کی جگہ زہر کی بوتل رکھ دی گئی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" نوجوان رُستم نے گھبراہٹ سے ہکلاتے ہوئے پُوچھا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میرے .... میرے ابّا جان نے۔ اُنہیں بادشاہ سلامت سے سخت دشمنی ہے۔ ہم سے جو وہ ظاہرا دوستی دکھا رہے تھے وہ صرف اِس لئے تھی کہ حکیم کی دی ہوئی دوا کی جگہ زہر کی شیشی رکھ سکیں۔ میں اپنے ابّا جان کی عادت سے واقف تھی اِس لئے شروع سے ہی مجھے شک تھا۔ لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ اصلی سازش کیا ہے؟

"تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے پوری بات کا پتہ چلا۔ میری والدہ کو بھی اِس کا علم ہو گیا تھا۔ ہم نے تمہیں اِس سازش سے آگاہ کرنے کے لئے خط دے کر ایک قاصد بھیجا، لیکن اُس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا اور وہ خط ابّا جان کے ہاتھوں میں پہنچا دیا۔ کل تک یہ بات ہم سے چھپی ہوئی تھی۔ میرے ابّا جان نے کل کوئی بات ایسی کہی تو مجھے کچھ کچھ اصلیت کا پتہ چلا۔ میں نے قاصد کو بُلا کر پُوچھ تاچھ کی تو اُس نے را اُگل دیا۔

"جنگل میں اپنے پڑاؤ سے میں بھاگ کر آئی ہوں۔ ہم لوگ ایران جا رہے ہیں۔ ساتھ میں ایک کنیز لے آئی ہوں۔ میں شہزادہ خُرّم کی چھاؤنی میں شامل ہو گئی تھی۔ ارجم بانو سے میں نے ایک جھوٹا قصہ گھڑ دیا تھا۔ اُنہوں نے مجھے اپنی حضوری میں لے لیا مجھے اُمید تھی کہ تمہارے ملکہ معظّمہ کو دوا دینے سے پہلے ہی میں تمہیں تلاش کر لو گی۔ میں چلمن کے پیچھے سے دربار دیکھ رہی تھی کہ میری نظر تم پر پڑی اور میں نے کنیز کو تمہارے پاس بھیجا۔ لیکن افسوس کہ میری تمام کوششیں بے سُود گئیں۔ میں دیر سے پہنچی۔"

"نہیں، زبیدہ، زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی وقت ہے۔ شہنشاہ ابھی تک صحیح سلامت دربار میں ہی موجود ہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اُنھوں نے وہ زہر نہیں پیا ہے۔ ابھی د ہے۔ میں ملکہ نور جہاں کے پاس ابھی اِس بات کا اقبال کر لیتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو" زبیدہ نے کچھ پُراُمید لہجے میں کہا "ملکہ معظّمہ دربا موجود نہیں ہیں۔ وہ ضرور اپنے محل میں ہوں گی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ جُرم کا مجھے کرنا ہے۔"

"لیکن اِس سے تمہارے ابّا جان کے سر الزام آئے گا۔ شہنشاہ کو زہر دینے کی سازش لئے اُنھیں سزا مِلنی تو چاہئے لیکن تم اُن کی بیٹی ہو۔ تم یہ سب کیسے کر لو گی؟"

"یہ تو ٹھیک ہے رُستم لیکن میں اور کیا کروں؟"

"تمہیں اِس بات میں اُلجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے زبیدہ۔ نہ تمہیں، نہ تمہا ابّا جان کو۔ میں ملکہ حضُور کو صرف اتنی بات بتاؤں گا کہ میں نے جو شیشی اُنہیں دی تھی،

ہے۔ کیونکہ حکیم صاحب سے مجھے جو شیشی ملی تھی وہ کہیں گم ہوگئی ہے۔"
" لیکن کیا اِس سے ملکہ نورجہاں ناراض نہ ہوں گی؟ تم پر اُن کا قہر ٹوٹ پڑے گا۔
ان کے کئے کی سزا تم کیوں بھگتو۔"
" اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سب سے کم بُرائی اِسی بات میں ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس
میں تمہارے ابّا جان کا نام لئے بغیر حالات کو سنبھال سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ تم اُن کا نام نہیں
سکتیں، چاہے کیسا ہی سنگین جُرم انہوں نے کیا ہو، اور تمہاری وجہ سے میں بھی اُن کا نام
لے سکتا... بہرحال، اب وقت نہیں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ میں فوراً ملکہ معظمہ سے ساری
بتا دیتا ہوں۔"
" میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اگر تمہاری خواہش یہ ہے تو میں ملکہ نورجہاں سے نہیں
گی۔ لیکن میں تمہارے واپس آنے تک تمہارا انتظار کروں گی۔"
فوراً ہی رستم اور اُس کے پیچھے زبیدہ اور کنیز ملکہ نورجہاں کے محل کی طرف چل
ے۔ سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ابھی تک دربار چل رہا تھا اور تمام لوگ وہاں موجود تھے۔
وہ ایک موڑ پر مُڑے ہی تھے کہ پیچھے سے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ جلدی کے
ب رستم اور زبیدہ نے اس آہٹ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ لیکن چند قدموں کے بعد
طاقتور ہاتھ رستم کے کندھے پر پڑا۔ رستم چونک کر مڑا۔ شاہی محل کا حوالدار اور دو
اُس کے سامنے کھڑے تھے۔
" تم ہی رستم علی خاں عہدی ہو؟" حوالدار نے پوچھا۔
" ہاں۔"
" ملکہ بیگم کے حکم سے تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔"
بغیر کچھ بولے رستم اُن کے ساتھ چل دیا۔ ذرا سا مُڑ کر اُس نے دونوں بُرقع پوش
ں کی طرف دیکھا اور اشارے سے زبیدہ کو چُپ رہنے کے لئے کہا اور پھر تیزی
مُنہ موڑ کر چل دیا۔
نورجہاں دربار میں نہیں گئی تھی۔ اُس کے سامنے بہت اہم مسائل تھے جو دربار کی شان
ت دیکھنے سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ وہ اپنی خوابگاہ میں تھی۔ اُس کے قدموں میں
مارہ پڑی ہوئی سسکیاں لے رہی تھی اور اپنے آنسوؤں سے نیچے بچھے غالیچے کو تر کر رہی
۔ ملکہ نورجہاں اس وقت بہت ناراض نظر آ رہی تھی۔ اُس کے باریک کمان جیسے ابرو
ہوئے تھے اور اس کی سیپ جیسی آنکھوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں۔ گہرے سُرخ
کے پانی سے لبریز ایک شیشی سامنے تپائی پر پڑی تھی۔
" اُٹھ کر بیٹھ، کنیز" ملکہ نے حکم دیا " رونا بند کر کے سیدھی طرح میرے سوال کا
دے..."
" ملکہ بیگم...."
نورجہاں نے غصے سے اپنا پاؤں پٹخا " ٹسوے بہانا بند کر اور سیدھی کھڑی ہو جا۔
حقیقت کا پتہ لگنا ہی چاہیئے۔ ضرورت پڑی تو ہم تمہاری کھال اُدھڑوا کر سچائی کا پتہ لگا
لیں گے۔ بول، کس کے کہنے پر تو نے ایسا کیا؟ ہم جانتے ہیں کہ تو اپنی مرضی سے ایسا نہیں

کر سکتی۔ کون تھا وہ؟ جناب خاں تھا۔ یا کوئی اور باغی اور سازشی؟"

"نہیں، ملکہ بیگم، جناب خاں نہیں تھا۔"

"تو پھر کون تھا؟ جلدی بتا۔ بول!"

"وہ تھا.... وہ تھا.... ملکہ بیگم آپ کی پناہ۔ میں ایک غریب کنیز ہوں۔ میں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ لیکن میں بڑے لوگوں کے قضیے میں پس جاؤں گی۔ حضور کی امان۔"

"بے وقوف لڑکی، تجھ سے ملکہ بیگم سوال کر رہی ہے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری مرضی کے خلاف سلطنت میں کوئی بھی تجھے گزند نہیں پہنچا سکتا۔ ہمیں فوراً بتا کہ یہ کس کی شرارت تھی؟"

"حضور.... حضور.... وہ خالدہ بیگم...."

"ہوں.... وہ بوڑھی چڑیل! اُسے اِس کی کیا ضرورت تھی؟"

"ملکہ بیگم، وہ آپ سے بہت جلن رکھتی ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ اور تو اُس کے اِشارے پر ہمارے خلاف شرارت کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ احسان فراموش، فاحشہ! ہماری نوازشوں کا تو نے یہ بدلہ دیا ہے؟ تجھے یاد ہے کہ تیرا پرانا آقا کس طرح تجھ پر ظلم کرتا تھا اور تجھے بھوکا رکھتا تھا؟ ہم نے تجھ پر رحم کر کے تجھے خرید لیا اور اپنی حرم میں سے کر تجھے خاص کنیز کا رُتبہ عطا کیا۔ ہم نے تجھ پر اتنی مہربانیاں کیں اور بدلے میں تو نے ہمارے ایک دُشمن کے اِشارے پر ہم سے غدّاری کی۔"

"ہمارا ارادہ تو یہ ہے کہ تجھے بخشے ہوئے تمام قیمتی لباس اور زیورات تجھ سے واپس لے لیں اور ایک بار پھر تجھے اُنہی گلیوں میں پھنکوا دیں جہاں کی خاک چھانتی ہوئی تو یہاں آئی تھی۔ بتا، کس کے کہنے سے تو نے یہ شیشی چرائی تھی؟"

"رحم ملکہ معظمہ!" روتی ہوئی کنیز پھر نورجہاں کے قدموں میں گر پڑی اور سسکتی ہوئی بولی "میں ایک بدنصیب لونڈی ہوں۔ اگر خالدہ بیگم کا حکم نہ مانتی تو وہ میری زندگی دُوبھر کر دیتیں۔ اُنہوں نے مجھے رات کو سر چھپانے کی جگہ دے رکھی ہے، حضور۔"

"وہ تو ہم بھی تجھے آسانی سے دے سکتے تھے، اگر تو مجھے بتا دیتی کہ وہ منحوس بڑھیا تجھے ہمارے خلاف شرارت کرنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ اچھا، خیر۔ سیدھی کھڑی ہو۔" نورجہاں نے کچھ نرمی سے کہا "اچھا، یہ دوا چُرا کر تو نے تھوڑی سی جلدی ...ماں کی ...میں ملا دی۔ کیوں، یہی ہوا نا؟"

"جی ہاں، ملکہ حضور۔"

"تو نے ایسا کیوں کیا؟"

"حضور، میرا خیال تھا کہ یہ جامِ محبت ہے۔"

"جامِ محبت!"

"جی، ہاں ملکہ پناہ، خالدہ بیگم اور دوسرے لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ رستم خاں کو ارادلی کے حکیم کے پاس جامِ محبت لانے کے لئے ہی بھیجا گیا تھا۔"

"اُس بڑھیا اور اُس کے ساتھیوں کے دماغ میں کیا کیا خرافات آتی ہیں۔ جام

یہ بھی خوب رہی ۔معلوم ہوتا ہے خالدہ بیگم اپنا دماغ بھی کھو بیٹھی ہے ۔

"جی، حضور، اُن کو یہی یقین ہے کہ شہنشاہ عالم کی محبت کو حضور نے جامِ محبت اور دُوسرے جادُوؤں سے اپنے بس میں کر رکھا ہے ۔"

"واہ، کیا خیال ہے!" نورُ جہاں نے نفرت سے کہا "اچھا تو جامِ محبت سمجھ کر تم نے اِسے اس نوجوان کو پلا دیا تاکہ تم اُس کا دِل جیت سکو؟"

"جی، ہاں، حضورؑ۔ میں .... میں .... چاہتی تھی کہ کوئی میرے ساتھ بھی محبت کرے لیکن مجھ سے کوئی بھی عشق نہیں کرتا تھا۔ سب مجھے دِل بہلانے کا کھلونا سمجھتے تھے اور بس۔ مجھ غلام کنیز کے لئے اُن کے دِلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن مجھے بہت تمنا تھی کہ کوئی مجھ سے سچا پیار کرے۔ اِسی لئے کل رات جب مہدی فرید خاں خالدہ بیگم سے ملنے آیا تو میں نے وہی جامِ محبت تھوڑا سا اُس کی شراب میں ملا دیا۔ اسے پیتے ہی وہ لڑھک گیا۔

"میں ڈر گئی اور انتظار کرتی رہی کہ وہ ہوش میں آجائے۔ لیکن وہ پھر ہوش میں نہیں آیا اور صبح کے وقت میں نے دیکھا وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اُس کی لاش اُس خالی سائبان میں پڑی ہے، جہاں کل رات ہم ملے تھے۔

"میں خوف زدہ ہو کر آپ کے قدموں میں حاضر ہو گئی ہوں اور جو کچھ بھی میں جانتی ہوں، میں نے سچ سچ آپ کو بیان کر دیا ہے۔ ملکہ حضورؑ، میرے ہاتھوں سے اُس کی موت واقع ہو گئی ہے، لیکن میں بے قصور ہوں۔ میں نے جان بوُجھ کر یہ قصوُر نہیں کیا۔ جامِ محبت سمجھ کر میں نے اُسے زہر پلا دیا۔ ملکہ حضورؑ، میں جان کی امان مانگتی ہُوں۔ آپ ہی مجھے پھانسی کے تختے سے بچا سکتی ہیں ۔"

"یہ رونا دھونا بند کرو، کنیز" نورجہاں نے کہا اور گہری سوچ میں ڈُوب گئی۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کہنے لگی "بے وقوف لڑکی، تو نے غلطی تو بہت بڑی کی ہے لیکن ایک طرح تو نے شہنشاہ کے دشمنوں کی جان بچائی ہے۔ اگر تو نے یہ شربت فرید خاں کو نہ پلایا ہوتا تو کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہوتا کہ یہ زہر ہے۔

"پھر بھی اِس بات کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے کہ شہنشاہ کی دوا زہر کیسے بن گئی۔ ہم نے رُستم خاں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا ہے۔ کیوں کہ وہی اِس دوا کو لایا تھا۔ اور جہاں تک اُس نوجوان مہدی کی موت کا تعلق ہے تو اُسے ایک غریب کنیز کے دِل سے کھیلنے کی بھی سزا مل گئی۔ ایسے لوگوں کے لئے ہمارے دِل میں کوئی رحم نہیں۔

"لقد تو بھی اِس سے سبق سیکھ لے، کنیز، اگر تو واقعی کسی شخص کی محبت چاہتی ہے تو ہر ایک کے ساتھ بھٹکنا چھوڑ دے۔ اِس طرح کی حرکتوں سے لوگ تجھ سے نفرت ہی کریں گے، پیار نہیں۔ اب جا۔ لیکن خالدہ بیگم کے پاس ہرگز مت جانا۔ یہ تمام باتیں جو تو نے مجھے بتائی ہیں، اپنے تک ہی رکھنا، ہم فرید کی لاش وہاں سے ہٹانے کا انتظام کر دیں گے۔"

کنیز کے چلے جا کے بعد ایک بار پھر تنہائی میں نور جہاں ان تمام نئے حالات پر غور کرنے لگی۔ جہانگیر کی شراب نوشی ے کرنے کی اُس کی نیک خواہش کا کیا نتیجہ نکلا۔ اُس نوجوان مہدی کو اراولی کے علاقے میں اِس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ وہاں سے حکیم شہاب کو اپنے ساتھ لے کر آ ے لیکن وہ حکیم کے بجائے زہر کی بوتل لے آیا۔

شہنشاہ کی زندگی تو اچانک اس حادثہ کے سبب بچ گئی، لیکن پھر بھی اِس بات کے ظاہر ہونے سے وہ بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوسکتی تھی۔ اگر یہ تمام باتیں اُس کے دشمنوں کو معلوم ہوگئیں تو وہ یہ بات بنا سکتے ہیں کہ ملکہ معظمہ نے شہنشاہ کو زہر دینے کی کوشش کی۔"

اُس کے دماغ میں کئی شکوک رینگ رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ دوا کی شیشی پہلے خالدہ بیگم کے پاس لے جائی گئی ہو اور اُس نے اِس میں زہر ڈال دیا ہو۔ تاکہ نور جہاں کے خلاف ثبوت پیش کیا جا سکے۔ یہ لڑکی نادرہ اُس کے ساتھ ملی ہوئی تو نہیں؟ یا یہ دھوکے سے اُس کے ہاتھ میں کھیلی؟ سازش در سازش کی فضا میں کیا صحیح مانا جائے، کس پر بھروسہ کیا جائے، یہ بات طے کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔

نور جہاں ابھی اِن باتوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ایک خواجہ سرا نے آ کر اطلاع دی کہ باہر کھڑی ایک لڑکی اُن سے ملنا چاہتی ہے۔ لڑکی نے اپنا نام نہیں بتایا ہے لیکن ملکہ حضور سے ملے بغیر وہ واپس نہیں جانا چاہتی۔

"کوئی غریب لڑکی مصیبت میں ہوگی" ملکہ نورؔ جہاں نے کہا جو ایک حد تک مغرور اور اقتدار پسند تو ضرور تھی لیکن ہمہ وقت دُوسری بے بس اور غریب عورت کی فریاد سُننے کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتی تھی اور پوری ہمدردی سے اُس کی مدد کرتی تھی۔

"ملکۂ عالم، وہ لڑکی کوئی ایسی غریب تو معلوم نہیں دیتی" خواجہ سرا نے کہا "اُس کی قیمتی پوشاک سے تو یہ معلوم دیتا ہے کہ وہ کسی اُونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔"

"اُسے آنے دو۔ کبھی کبھی اچھے خاندان کی عورتوں پر بھی مُصیبت آ جاتی ہے۔"

نورؔ جہاں نے کچھ دیر کے لئے تمام سازشوں کی بات اپنے دل سے نکال دی اور کسی بے کس غریب کی فریاد سُننے کے لئے تیار ہوگئی۔

کچھ دیر بعد ہی اُس لڑکی کو نورؔ جہاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ خواجہ سرا کے چلے جانے کے بعد اُس نوجوان لڑکی نے اپنا نقاب اُٹھایا۔ نور جہاں نے دیکھا کہ یہ لڑکی بے حد خوب صُورت تھی۔

"بیگم" اُس نوجوان خاتون نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہُوئے کہا۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت گھبرائی ہُوئی ہے "ملکہ معظمہ، میرا خیال نہیں، کہ آپ کو میرے بارے میں کچھ بھی یاد ہو۔ آٹھ برس پہلے کی بات ہے جب آخری دفعہ آپ سے ملاقات ہُوئی تھی۔ اِس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ لیکن میں اُس وقت بالکل چھوٹی سی لڑکی تھی۔"

نورؔ جہاں نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کے نوجوان چہرے کو غور سے دیکھا۔ آٹھ برس میں جو جو کچھ ہوا اُس کے دیکھتے ہوئے تو یہ بہت لمبا وقت تھا۔ اُس وقت وہ دُور بنگال کے ایک چھوٹے سے جاگیر دار کی بیوی تھی اور اب وہ ملکہ معظمہ تھی۔ پوری سلطنت کی ملکہ۔

اُس نے اپنا دماغ آٹھ برس پیچھے لوٹایا۔ اِس خوب صُورت معصوم لڑکی کے چہرے کو دیکھ کر کچھ دُھندلی سی یادیں اُس کے ذہن میں تیرنے لگیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے یہ چہرہ ضرور کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں؟ یہ اُسے یاد نہیں آرہا تھا۔ اُس وقت

س کا چہرہ آٹھ دس سال کی لڑکی کا چہرہ رہا ہوگا۔ تب بہت معصوم اور فرشتہ جیسا ہوگا۔
" دوشیزہ، میں نے تمہیں ضرور کہیں دیکھا ہے — لیکن مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ تمہیں
ہاں دیکھا ہے۔ تم کون ہو؟"
" میں حسن علی استجلو کی بیٹی ہوں جو...."
" زبیدہ، میری بھتیجی!" نورجہاں نے نوجوان لڑکی کو اپنے سینے سے لگالیا " تم تو کافی
ی ہوگئی ہو۔ تم بھی میری لاڈلی کی عمر کی ہو۔ تمہارے ابا جان کہاں ہیں اور ممتاز تمہاری
ں۔ وہ کہاں ہے؟ مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں آس پاس ہو۔ کل شکار میں ایک بڑا چیتا
گیا تھا۔ اس چیتے کے گلے میں ایک پٹہ پڑا ہوا تھا جس پر استجلو نام کھدا ہوا تھا۔
اتنے عرصے تم لوگ کہاں رہے؟ میں تم سے ملاقات کی بہت خواہش مند تھی۔
معلوم ہے کہ تمہارے ابا جان مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ میں نے شہنشاہ سے شادی
ں کی؟ میں اُن سے مل سکتی تو یہ غلط فہمی دور کر دیتی۔ اب کہاں ہیں تمہارے والدین؟"
زبیدہ نے جواب دیا " میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتادیتی ہوں بیگم...."
" مجھے چچی جان کہو۔"
" ہاں، چچی جان، لیکن میں ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ رُستم علی خاں عہدی کو
کر دیا جائے۔ وہ بے قصور ہے۔ میں یہ ساری بات بتا سکتی ہوں کہ دوا کی بجائے شیشی میں
کہاں سے آگیا وہ سب سُننے کے بعد آپ اِس بات کا بہتر فیصلہ کر سکیں گی کہ میرے ساتھ
میرے والدین کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"
ملکہ نورجہاں اور اُس کے سابق خاوند کی بھتیجی دونوں کافی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔
ن لڑکی نے تفصیل سے بتایا کہ کِس طرح اُس کے ابا جان نے اُس کی دوا کی شیشی بدل
اور کِس طرح اُس نے اور اُس کی ماں نے رُستم کو اطلاع بھیجنے کی کوشش کی لیکن
م رہی۔ اِسی بات کے ساتھ ساتھ زبیدہ اور رُستم کے تعلقات بھی نورجہاں پر ظاہر
کئے۔
نورجہاں کو زبیدہ نے یہ بھی تفصیل سے بتایا کہ شیر افگن کی موت کے بعد اُس کے
ین پر کیا کیا گزری اور کن کن مُصیبتوں سے اُنہیں گزرنا پڑا۔
" اچھا، تو اصل میں یہ بات تھی۔ حسن علی کو یقین تھا کہ اُس کے بھائی کا قتل ہوا
۔ اِس لئے اُس نے اِس طرح بدلہ لینے کی کوشش کی " نورجہاں نے زبیدہ کی پوری
ا سُننے کے بعد کہا " میں نہیں سمجھتی کہ اُسے کیا سزا دوں۔ اِس جُرم کے لئے تو وہ
ے کم سزائے موت کا حقدار ہے۔ لیکن میں پُرانے گڑے مُردے اُکھاڑنا نہیں
ی۔ میرے بہت سے دُشمن ہیں جو مجھے بدنام کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں
ے دیں گے۔ شہنشاہ صحیح سلامت ہیں۔ اِس لئے یہ سارا واقعہ کسی پر ظاہر کرنے کی
بت نہیں۔"
" چچی جان، آپ بہت رحم دِل اور مہربان ہیں۔"
" لیکن میں ایک شرط رکھنا چاہتی ہوں کہ حسن علی کو مغل سلطنت کی حدود سے فوراً باہر
انا چاہیئے۔"

" دراصل ابا جان خود ایران جا رہے ہیں۔ میری کنیز اب تک اُن کے پاس اِس مہر
اتھ پہنچ چکی ہوگی کہ اُن کی سازشیں ناکام ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مہر ملنے کے
، وہ اِس بات کو محسوس کرلیں گے کہ شہنشاہ کو زہر دینے کی سازش کے جرم میں اُن
پڑے جانے کا خدشہ ہے۔ اِس لئے مجھے اُمید ہے کہ وہ اب تک یہاں سے روانہ
نے کی تیاری کر چکے ہوں گے۔"

" اور زبیدہ، تمہاری کیا صلاح ہے؟ تم کیا کروگی؟ اپنے ابا جان کے پاس جاؤگی؟"

" میں تو آپ کے رحم وکرم پر ہُوں چچی جان۔ میں تو اب ایک ایسا قدم اُٹھا چکی ہوں
پس نہیں مڑ سکتی۔ ابا جان مجھے فریبی کہیں گے۔ اور کبھی معاف نہیں کریں گے۔
میں اپنے ابا جان کی وجہ سے ایک بے گناہ آدمی کو نقصان پہنچتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔
طرف مجھے ابا جان سے پیار تھا اور دُوسری طرف....."

" اُس خوب صُورت مہدی نوجوان سے محبت، کیوں؟" نورؔ جہاں نے مُسکراتے ہوئے
ہ کا فقرہ پورا کر دیا تو زبیدہ کا چہرہ بیر بہوٹی بن گیا۔

زبیدہ کا اندازہ صیح نکلا۔ جیسے ہی بُوڑھے سردار کو یہ اطلاع ملی کہ اُس کی سازش
م ہوگئی ہے، اُس نے فوراً خیمے اُکھاڑنے کا حکم دے دیا اور ایران کی طرف روانہ
یا۔ اُسے ایک بات کا بے حد ملال تھا کہ اُس بے وقوف نوجوان کی خاطر اُس کی
نے ہی اُسے دھوکا دیا۔ اجمیر کی سرحدوں سے نکلتے ہوئے اِس کارواں کو کسی نے
وکا۔ نورؔ جہاں نہیں چاہتی تھی کہ دربار کے موجودہ سازش بھرے ماحول میں کوئی
نیا بکھیڑا کھڑا کیا جائے۔

رستم کو رہا کر دیا گیا اور پھر کچھ ہی عرصے بعد اُس کی زبیدہ سے شادی ہوگئی۔ ملکہ
ہ نے خود زبیدہ کا نکاح کرایا۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ ملکہ نورؔ جہاں نے کم ازکم پانچ سو
ے نکاح کرائے تھے جن میں دُلہن کے والدین کا حق خود اُس نے ادا کیا تھا۔

تاریخ اِس بات کے بارے میں ابھی تک متفق نہیں ہے کہ شیر افگن کی خوبصورت
کے لیے اُس کے قتل میں جہانگیر کا ہاتھ کہاں تک تھا۔ کچھ اُسے بالکل بے گناہ جانتے
، تو دُوسرے اُس پر پورا شک کرتے ہیں۔ شاید یہ سوال پُورے طور پر کبھی طے نہ ہوسکے۔

نکاح کے ایک ہفتہ بعد رستم اور زبیدہ دونوں نور جہاں سے وداع لینے کے لئے
ر ہوئے۔ ملکہ بیگم کی نظرِ کرم سے نوجوان مہدی کو اُڑیسہ میں ایک جاگیر عطا کر دی گئی
ی۔ اِس معاملے میں نورؔ جہاں نے بہت دُور بینی سے کام لیا تھا۔ وہ اُن کا بھلا چاہتی
ی اِس لئے موجودہ حالات میں اُنہیں دُور بھیج دینا ہی اُن کے لئے بہتر تھا۔

زبیدہ نورؔ جہاں کے ماضی کی یادگار تھی۔ وہ ایک ایسی کڑی تھی جس سے نُور جہاں
ے پہلے خاوند کا سلسلہ قائم ہوتا تھا۔ نورؔ جہاں اُس ماضی کی یاد تازہ رکھنا نہیں چاہتی
ی۔ اور خاص طور پر یہ نہیں چاہتی تھی کہ دربار میں سے کوئی دوبارہ اُس ماضی کو
ریدے۔

نورؔ جہاں نے بہت پیار سے زبیدہ کو رُخصت کیا۔ اُس کے دِل میں زبیدہ کے
لئے ایک گہری محبت پیدا ہو چکی تھی۔ رُستم اور زبیدہ چلے گئے۔ نورجہاں کو اب اِس بات

تھا کہ اُس کی پُرانی زندگی کا ایک باب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ اِس طرح بہت چابکدستی سے اُس نے ایک خطرناک حالت کو بخیریت تمام انجام دے دیا تھا۔

لیکن نُورجہاں اِس بات سے بخُوبی واقف تھی کہ برسرِاقتدار رہنے کا مطلب ہے ہمیشہ آنکھیں کھُلی رکھنا۔ اُسے ہمیشہ چوکنا رہنا پڑتا تھا۔ اپنے دُشمنوں کی تمام چالیں ناکام کرکے اُنھیں دبائے رکھنے کے لئے اُسے ہمیشہ تیار رہنا پڑتا تھا۔

دربار کی خطرناک اور بے رحم سازشوں کا یہ کھیل ——— کیا یہ زندگی بہتر ہے؟ ایک سوال ہمیشہ اُس کے سامنے رہتا تھا۔ ملکہ معظمہ کی نسبت ایک معمولی سے جاگیردار کی خوب صورت بیگم کی حیثیت سے کیا اُس کی زندگی بہتر نہ ہوتی؟ یقینی طور پر اُس زندگی میں اُسے زیادہ سکون ملتا لیکن وقت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس گئی اور وہاں سے پردہ اُٹھا دیا۔ صبح کا اُجالا چاروں طرف پھیل گیا۔

'میں اب اِس زندگی سے واپس نہیں لوٹ سکتی' نُورجہاں نے سوچا 'میں بہت دُور چل آئی ہُوں۔ اب مجھے زندگی کی یہی بازی آخر تک کھیلنی ہوگی۔

'لیکن کب اور کیسے یہ بازی ختم ہو، یہ کوئی نہیں جانتا۔ شاید بیس تیس برسوں میں یہ سب ختم ہو جائے۔ دوست دُشمن بن جائیں۔ شہنشاہ بھی نہ رہیں۔ اور وقت اِس سلطنت کو بھی ختم کردے۔ کون جانتا ہے؟ کوئی بھی چیز ہمیشہ نہیں رہتی۔ لیکن آخری لمحے تک بازی چلتی رہے گی۔ مہرے بدلتے رہیں گے لیکن بساط اِسی طرح بچھی رہے گی'

کسی نے دروازے پر دستک دی۔ نورجہاں کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک قاصد تھا جو نُورجہاں کے والد اعتمادالدولہ کا خط لایا تھا۔ نُورجہاں نے مہر توڑ کر خط پڑھا۔

"ہاں بازی چلتی رہے گی" وہ بڑبڑائی۔

ختم شُد



"بابو جی ذرا اونچا سنتے ہیں آپ ان کی جیب میں دس کا پتہ ڈال دیجئے۔ بس آپ کا کام ہو جائے گا"

... روم پر ایک ایسا بادشاہ
... تھا جس کی بربریت کی داستانیں
... کر آج بھی دل کانپ جاتا ہے۔ اس کا نام
... تھا۔ وہ روم کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اُس
... زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ فرمانِ خداوندی تھا
... صرف اتنا تھا کہ خدا کی حکم عدولی تو کی بھی
... سکتی تھی مگر نیرو کی حکم عدولی کا مطلب ہوتا تھا
... موت۔

نیرو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صحیح الدماغ
نہیں تھا بلکہ ایک نیم پاگل، خبطی قسم کا انسان
تھا۔ ایسے لوگ دوسروں کو دکھ پہنچا کر ایک
... لذت محسوس کرتے ہیں وہ اکثر لوگوں کو
... اس لذت کے لئے قتل تک کر دیتے ہیں۔

... نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس قسم کے
لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں اور ان کی
... ناممکن ہوتی ہے۔

نیرو اکثر و بیشتر محض تفریحاً اپنے سامنے لوگوں
کو قتل کرایا کرتا تھا۔ مقتول کو تڑپتے، چلاتے
دیکھ کر وہ خوشی سے تالیاں بجاتا اور جلاد کو
انعام و اکرام سے مالا مال کر دیتا تھا۔ جب کبھی وہ
... میں ہوتا تو خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا کرتا۔
اس کے عالیشان محل میں بیش قیمت پتھر
سے بنا ہوا ایک بہت بڑا تالاب تھا جس

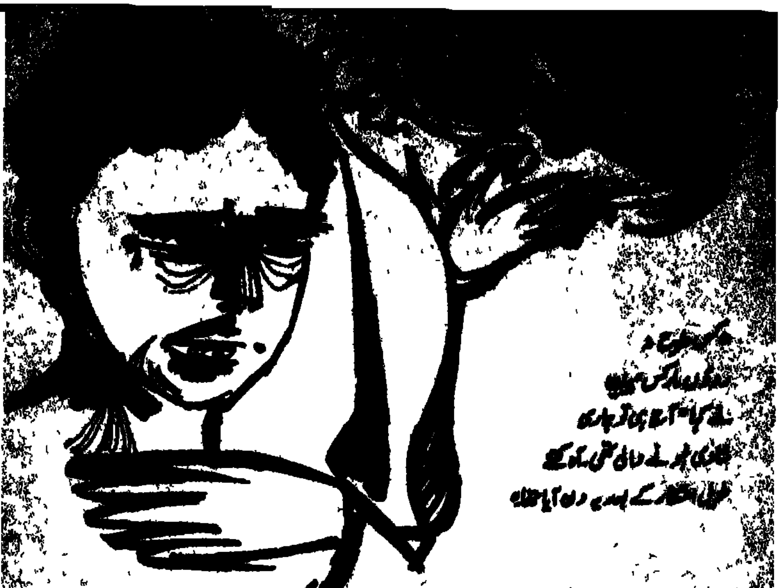
بچھو اگر لال رنگ کے ...
کھانے سے نارنجی ہو کر وہ تالاب کے ...
بیٹھ کر مے نوشی کیا کرتا تھا۔ اس کے ... حسین
نازک اندام حسین رقاصائیں رقص کرتیں۔ جب کبھی
کسی مگرمچھ یا وہیل نے پانی میں سے سر ابھارا نیرو
نے کسی رقاصہ کو اٹھا کر فوراً پانی میں پھینک دیا
بھیانک آبی جانور کا غار جیسا دہانہ کھلا اور وہ بے
کس رقاصہ اس میں سما گئی۔ نیرو اس منظر کو دیکھ کر
بڑا محظوظ ہوتا۔ دوسری رقاصاؤں کو یہ خونیں منظر
دیکھ کر سہمنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ رقص بدستور
جاری رہتا اور نیرو جام پر جام لنڈھاتا رہتا۔
ایک روز نیرو اپنی خوابگاہ میں شراب
کے نشے میں بدمست پڑا تھا۔ اس کے چاروں

سُرخ دھبے

کہانی • [illegible]

طرف حسین لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ نیرو کا دل بہلانے
کی خاطر، تعیش کے لئے ملک بھر کی خوبرو نئی بیاہی
حسیناؤں کو محل میں لایا جاتا۔ یہ لڑکیاں جب تک
جوان رہتیں نیرو ان سے کھلونوں کی طرح دل
بہلاتا رہتا اور جب ان کا شباب ڈھلنے لگتا
تو انہیں گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا
جاتا۔

نیرو ایک وسیع سلطنت کا خداوند تھا
اس لئے ملک کی ساری حسین چیزوں کا وہ
مختار کل تھا۔ ایک بادشاہ اپنی رعایا کا باپ



[illegible] ہوا ہے مگر نیرو، روم کی ساری حسیناؤں
[illegible] تھا۔ جیسا زمانہ ہوتا ہے لوگ بھی اسی
[illegible] میں رنگ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو
[illegible] کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ اس زمانے
[illegible] لڑکیاں عیاش بادشاہوں کی نگاہوں سے
[illegible] کی بجائے اس کوشش میں لگی رہتی تھیں
[illegible] طرح ان کی منظورِ نظر بن کر کم از کم
رکھیل ہی کی حیثیت سے زندگی گزار
[illegible] والدین بادشاہوں کو خوش کرنے
[illegible] اپنی خوبصورت بیٹیوں کو آغوشِ شاہی میں
[illegible] اور انعام میں جاگیریں اور اعلیٰ منصب حاصل
[illegible] بادشاہ کی ہر کنیز کی یہ تمنا ہوتی کہ وہ
[illegible] بن جائے اس لئے ان میں حسد
[illegible] ہوتا تھا۔

[illegible] سب سے زیادہ حسین لڑکی
[illegible] کسی کسان سے [illegible] وہ ایک
[illegible] کی لڑکی تھی اور ایک غریب

کسان کے لڑکے سے محبت کرتی تھی [illegible]
لہٰذا نیرو کو جولیا کے حسن کے متعلق [illegible]
اور اسے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ ایک [illegible]
سے محبت کرتی ہے۔ نیرو نے اسی [illegible]
جولیا کو محل میں بلوا لیا اور خود اسے [illegible]
سے اس کے محبوب کا [illegible]
کو نیرو سے نفرت نہ ہوئی کیونکہ نیرو [illegible]
تھا اور حسن و شباب کی لذتوں سے [illegible]
[illegible] ہونے کے ساتھ صرف بادشاہوں کو
ہوا کرتا ہے رہا کر نہیں۔ جولیا اپنی [illegible]
زندگی سے بڑی مطمئن تھی، کیونکہ [illegible]
[illegible] کی وجہ سے نیرو نے اسے [illegible]
پر [illegible] رکھی تھی۔ اسی وجہ سے [illegible]
لڑکیاں جولیا سے جلنے لگی تھیں۔

نیرو نے آس پاس کھڑی ہوئی سب [illegible]
پر نظریں ڈالیں۔

"جولیا کہاں ہے؟" اس نے پوچھا
"جولیا پچھلی رات سے بخار کی شدت [illegible]



رومن سپاہی قتل ہو رہے تھے، گھائل ہو رہے تھے اور نیرو جام پہ جام پی رہا تھا۔

سپہ سالار اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ [illegible] شانے پھیلا کر سلام کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تم جانتے ہو، ہم نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" [illegible] نے آنکھیں نچا کر سپہ سالار سے دریافت کیا۔

"نہیں حضور" سپہ سالار نے ادب سے کہا۔

"تم گورے چٹے مسٹنڈے ہو۔ بہادر ہو کر [illegible]

"جی ہاں" سپہ سالار سہم کر بولا۔

"تو سنو" تحمل نیرو نے جیں کر کہا "آئندہ [illegible] ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے [illegible] ہماری فوج [illegible] کرو۔ بہت

دل بھر گئے ہیں قتل و غارت گری کا منظر دیکھتے ہوئے۔"

"جی، بہت بہتر" سپہ سالار نے کہا۔

"بس اب جاؤ" نیرو نے ایک لڑکی کو گدگداتے ہوئے سپہ سالار سے کہا اور وہ اسی انداز سے سلام کر کے چلا گیا۔ نیرو پھر حسن اور شراب کی نیرنگیوں میں ڈوب گیا۔

سارے روم میں بڑے زور شور سے جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہزاروں ماؤں کے لال، دلہنوں کے سہاگ، حسیناؤں کے محبوب اگلے روز جا رہے تھے جنگ کرنے، سر اور دھڑ کی بازی لگانے صرف اپنے بادشاہ کی دیوانگی کی خاطر، سپاہی اپنی تلواروں پر آب رکھ رہے تھے اور حسیناؤں کے جھرمٹ میں نیرو جام ہاتھ میں

[illegible]
... سپاہیوں کی گردنیں اڑتے دیکھ رہی تھی۔

"نہ جاؤ ہیلینا" نوجوان نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔"

"کیسے نہ روکوں مارکس" ہیلینا نے سسکتے ہوئے کہا "آج ہی تو ہماری شادی ہونے والی تھی۔ کتنے طویل انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا! سارے انتظامات کئے جا چکے تھے۔ اب کس طرح تمہیں جنگ کی آگ میں جاتے دیکھ سکتی ہوں۔"

"یہ نیرو کا حکم ہے" مارکس نے اسے سمجھایا "میں مجبور ہوں۔ جہاں تم نے اتنا انتظار کیا ہے وہاں تھوڑا اور سہی۔ ہیلینا رات ڈھل رہی ہے۔ کچھ گھڑی میں دن نکلنے والا ہے۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ فوج کوچ کر جائے گی۔ مجھے جانے دو۔"

ہیلینا نے مارکس کے دلکش چہرے پر نظر ڈالی، اس کے بازوؤں میں مچلتی ہوئی مچھلیوں کو اپنے شبنمی ہاتھوں سے دبایا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بلکتی ہوئی چلی گئی۔

نیرو کی فوج کے سپاہی چھوٹے ممالک میں قتل عام کر کے فتح کے جھنڈے گاڑتے رہے۔ بے شمار رومن سپاہی بھی قتل ہو رہے تھے، گھائل ہوتے تھے، اپاہج ہو رہے تھے۔ توانا جسم مفلوج اور حسین چہرے مسخ ہو رہے تھے۔ نیرو پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

[illegible]
... خاموش بجا رہا ہے۔ اب ... [illegible]
کرانا سپاہیوں کی بجائے ایک کمرے میں [illegible]
ہوں۔ اسے بیٹا [illegible]
اف میں کیا کروں!!!

ادھر نیرو اپنے محل کی سب سے اونچی بالکنی میں بیٹھا جلتے روم کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کا محل اونچائی پر ہونے کی وجہ سے تقریباً سارا روم اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

"روم پرانا ہو چکا ہے۔"
نیرو بڑبڑایا۔
"میں نیا روم بناؤں گا۔ اس پرانے روم کو آگ لگا دینی چاہئے۔"

روم بھیانک آگ کی لپٹوں میں جلنے لگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ شعلے گرنے لگے۔ سارے شہر میں قیامت برپا تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے، چلا رہے تھے، آگ میں جل رہے تھے، گرتی ہوئی عمارتوں کے نیچے دب کر دم توڑ رہے تھے۔

"ہیلینا، ہیلینا" مارکس ایک جلتے ہوئے مکان کے باہر کھڑا چیخ رہا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونکا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک بھیانک چہرہ تھا، بری طرح جھلسا ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی جل چکی تھیں۔

"تم آگئے مارکس" جھلسے ہوئے چہرے سے آواز نکلی "آہ میں نے تمہارا کتنا انتظار
[illegible]

[illegible] تھی۔ مارکس نے اس کی آواز
[illegible] وہ دم بخود کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔
[illegible] میرا چہرہ اتنا بگڑ چکا ہے کہ تم مجھے



ابی بچہ ہی تو ہے

مقالہ • فرحت قمر

نہیں آپ ایسا کرتے ہیں یا نہیں لیکن پیشتر عموماً ماں باپ اپنے بچوں کو بگاڑنے میں کافی مدد پہنچاتے ہیں۔ جس طرح اپنی صحت بگاڑنے کے لئے انسان طرح طرح کی کوششیں کرتا ہے۔ چائے نوشی اور تمباکو نوشی شروع کر دیتا ہے، چاٹ وغیرہ کھاتا ہے، دیر سے سوتا ہے دیر سے اُٹھتا ہے وغیرہ۔ بالکل اسی طرح بچے کے نگراں بچے کو تباہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اگر بچہ ہاتھ پاؤں مار کر حرکت کرنا چاہتا ہے تو اُسے گود میں قید کر لینا، اُترنے کی ضد کرے تو پھر منا، چاٹنا اور اگر [illegible] اپنی کوشش جاری رکھے تو اُچھال اُچھال کر [illegible] دھیان بٹانے کی کوشش کرنا عام بات ہے۔ اپنے طور پر ماں باپ یہ سب ٹھیک سمجھ کر ہی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ بچے کی نشوونما کے لئے غیر صحت مند اور غیر فطری ہے۔

دُنیا کا ایک دستور ہے کہ جس چیز کی طرف جتنا زیادہ دھیان دیا جائے وہ چیز اتنی ہی زیادہ بگڑ جاتی ہے اور جس کی طرف کافی لاپرواہی اور کوتاہی سے کام لیا جائے وہ ٹھیک چلتی رہتی ہے۔ ایک اور بھی عجیب و غریب بات ہے کہ جو چیز باہر سے خوبصورت اور شاندار معلوم دیتی ہے اُس کے پیچھے [illegible] اور مصائب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اِسی کے برعکس یہ بھی ایک سچ ہے کہ جس کام [illegible] وقت محسوس ہوتی ہے وہ بڑا [illegible] ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ باتیں ہر جگہ [illegible] ہر حالت میں عائد نہیں ہوتیں [illegible] ایسے ہی ہوتا ہے۔ بچوں کی [illegible] بھی یہ بات کافی حد تک [illegible] اُن کی طرف توجہ دیکھا [illegible] وہ [illegible] جاتے ہیں اور جتنا انہیں اُن کے [illegible] دیا جائے وہ [illegible] جاتے ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] جائے کہ انہیں [illegible]
اور کن قالبوں میں کھینچ دیا جائے۔ آزادی
اور پابندیوں کا ہی دوسرا نام ہے۔ بچوں
کو کس حد تک آزادی دی جائے اس کا
فیصلہ ماں باپ کو کرنا ہوگا۔ انہیں یہ بھی
دیکھنا ہوگا کہ بچوں کو کیا دینا مناسب ہے اور
کیا نہیں۔ مجھے یہاں اُن باتوں کی طرف ہی
توجہ دلانی ہے جن کو ماں باپ عموماً اچھا
سمجھتے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر اُن کے غلط نتائج
نکلتے ہیں۔

عام طور پر ماں باپ بچے کو صرف بچہ ہی
سمجھتے ہیں اور اُس کی ہر بات کو
ابھی بچہ ہے کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ یہ ایک
بنیادی غلطی ہے۔ اگر بچپن میں کچھ اصولوں،
آدرشوں اور پابندیوں کی بنیاد پر بچے کو
ٹریننگ نہیں دی جاتی تو بچہ ہمیشہ بچہ ہی بنا
رہے گا۔ جو ایسا کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ اس
بات کو نہیں جانتے کہ بچہ پیدا ہونے کے
بعد سے ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں آنے سے
پہلے ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ماں کے پیٹ
کی اندھیری دُنیا میں وہ بہت کچھ حاصل
کرتا رہتا ہے اور باہر آتے ہی گرد و پیش کی
چیزوں اور آوازوں کے ردِّ عمل کا اثر محسوس
کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ
پیدا ہوتے ہی دیکھ نہیں سکتا، بڑوں کی بڑی
بڑی باتوں کو سمجھ نہیں سکتا، لیکن یہ بالکل غلط
ہے کہ وہ ماحول سے اثر انداز نہیں ہوتا۔ بچے
کے سیکھنے کا سلسلہ ایک دن کی عمر سے لے
کر آخری دم تک چلتا رہتا ہے۔

[illegible] کے پانچ برس انسانی زندگی کی
[illegible] ہیں۔ بچہ جو کچھ پہلے پانچ برسوں

[illegible]

[illegible] حاصل کرنا [illegible] ہوتا ہے

میں پلتے ہوئے تاثرات و شعور
بچپن کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور
وہیں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اِس بات
کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے کہ
بچوں کی کوری چادر پر اپنا اثر پڑے کیوں کہ
اسی زمانے میں وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں پر
قابو پانا سیکھتے ہیں۔ جو کچھ اسے بننا ہے
اُس کے لیے اِسی نازک عمر میں تیاری کی
جانی چاہیے۔

اِن بنیادی باتوں کو سمجھنے کے بعد مجھے
پھر اُسی بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا
ضروری ہے کہ بزرگ بچوں کے مخلص و ہمدرد
ہونے کے باوجود کس طرح اُن کو بگاڑنے
میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

بچپن میں بچوں کے لباس کی طرف
خاص توجہ دی جاتی ہے۔ اُن کو خوب صورت
اور قیمتی کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ بزرگ اِن
قیمتی کپڑوں کو خراب ہونے سے بچانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ اور اِس طرح بچوں کو
اپنی قدرتی آزادی اور اچھل کود سے محروم رہنا
پڑتا ہے۔ بچوں کو تنگ اور چست کپڑے
پہنانا اُنہیں گڑیا کی طرح خوب صورت ضرور
بنا سکتا ہے لیکن اس سے اُن کی جسمانی نشو و نما
میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ تنگ لباس اور تنگ
جوتے قیدی کی زنجیر کی طرح بچے کو باندھے رکھتے
ہیں۔ بچوں کو جس حد تک اور جب ضروری ہو
تب کپڑے پہنانے چاہییں۔ صرف [illegible]
بچہ بڑی آسانی کے ساتھ اپنے گھر میں کھیل سکتا
ہے۔ [illegible]

[illegible] کا
[illegible] مناسب حد تک [illegible] ہیں کہ [illegible] کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہاں یہ ضروری بات ہے کہ بڑوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ مٹی کھانے نہ لگ جائیں۔ اور اس بات کے لئے بھی تیار رہنا پڑے گا کہ کھیل کود کے بعد اُن کو ٹھیک طرح سے صاف کیا جائے۔

والدین ہر چھوٹی بڑی بات میں بچوں کی مدد کرنا ہی محبت سمجھتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے میں غیر ضروری طور پر بچوں کو روکا اور ٹوکا جاتا ہے اور اُن کی مدد کی جاتی ہے۔ بڑے سمجھتے ہیں کہ بچہ کوئی کام کر ہی نہیں سکتا جب کہ حقیقت یہ ہے بچہ اپنی قدرتی صلاحیتوں کے سہارے خود بخود بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ہاتھ پاؤں یا کپڑے خراب ہونے کے ڈر سے بچوں کو خود کھانے پینے کی آزادی دینے کی بجائے بڑے اُن کو اپنے ہاتھ سے کھلاتے ہیں۔ بے شک یہ ہمدردی اور شفقت کی نشانی ہے لیکن بچے کے لئے یہ بات نامناسب ہے۔ بچپن میں کپڑے خراب ہونے دینا اس سے بہتر ہے کہ بچہ اپنے اعضا پر قابو نہ پا سکے اور بڑا ہو کر بھی کپڑے خراب کرتا ہے۔

بڑے اپنی سوجھ بوجھ بھی بچوں پر لادنا چاہتے ہیں۔ بچے نے ایک [illegible] پر رکھا کہ ماں باپ نے ٹوکا۔ بچے نے پانی [illegible] اٹھانے کی کوشش کی اور ماں باپ نے ڈانٹا "دیکھو گر پڑو گے!" آپ کو کیا حق ہے کہ بچے کے معصوم دل پر وہ خوف بٹھائیں جس کا اُس کو گمان تک نہیں؟ اس طرح تو بچے کا اپنے آپ پر سے اعتماد ہی اُٹھ جائے گا۔ پُر خطر [illegible] کر سکنا بڑی بیماری کی خاصیت ہے

بہر حال آدمی کی زندگی میں کامیابی یا ناکامی کی بنیاد ہوتی ہے۔ بچوں میں اس وصف کو مناسب تقویت دی جانی چاہئے نہ کہ ہر قدم پر اُن کی ہمت کو پست کیا جائے۔ ہر قدم پر اگر بچے کو روکا ٹوکا جائے تو اُس میں دنیا میں آگے بڑھ کر کامیابی حاصل کرنے کی ہمت پیدا نہ ہو سکے گی۔ بچے کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں ناکام ہونے پر پھر سے کوشش کرنے کی ٹریننگ دی جانی چاہئے۔ ناکام ہو جانا یا ادھورا کام کر گذرنا نکمے پن کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

بچے چوٹ کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ خون سے بھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔ یہ بڑے ہی ہیں جو ان کے دل میں چوٹ کا احساس یا خون کا خوف پیدا کر دیتے ہیں۔ بچے کا پاؤں پھسل گیا، وہ گرا اور ماں "ہائے میرا بچہ" کہہ کر دوڑی۔ بچہ رونے لگا۔ اور ماں جتنا پچکارتی گئی بچے کا رونا اتنا ہی بڑھتا گیا۔ در اصل بچے کا یہ رونا دھونا اصل چوٹ کی وجہ سے کم اور ماں کی گھبراہٹ سے پیدا ہونے والے ردِ عمل سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ماں بچے پر یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ اُس کے گر جانے سے کوئی بہت بڑی یا بہت بُری بات ہو گئی ہے بلکہ اُس کی ہمت بڑھائے، اُس کا دھیان ہٹائے تو بچہ زندگی کی مشکلات اور چوٹوں کو ہمت سے برداشت کرنا سیکھے گا۔ بچپن میں بڑوں کی نامناسب ہمدردی اور غیر ضروری سہارا پا کر بچہ بڑا ہو کر ہر چھوٹی بڑی تکلیف میں دنیا سے توقع رکھے گا کہ کوئی دوڑ کر اُس کی مدد کرے اور بدقسمتی سے دنیا کا دستور ایسا نہیں ہے۔

میز سے ٹھوکر کھا کر بچہ ذرا سا ہٹ جاتا ہے اور آپ اُس سے کہتے ہیں "مارو میز کو!" بچہ میز کو مارتا ہے اور چپ ہو جاتا ہے اور آپ کا بھی تھوڑا سا من بہل جاتا ہے۔ آپ یہ کہتے

کر رہے ہیں؟ ذرا سوچیے! آپ اپنے بچے کو بدلہ لینا سکھا رہے ہیں — بدلہ جس کی آگ میں خود بدلہ لینے والا بھی جلتا ہے۔ آپ بچے کو یہ سکھا رہے ہیں کہ غلطی اُس کی نہیں بلکہ میز کی تھی۔ جب کہ ٹھوکر کے لئے میز ذمّہ دار نہیں ہے۔ آگے چل کر یہ بچہ اپنی ہر غلطی کو دوسروں پر تھوپنا چاہے گا اور خود کو پہنچنے والی ہر معمولی تکلیف کا بدلہ لینا چاہے گا۔

آپ کی گود سے اُتر کر کھیلنا چاہتا ہے۔ لیکن آپ اُسے نیچے نہیں اُتارتے کیونکہ آپ اُس کی میٹھی باتوں اور کھیل کود کا مزہ لے رہے ہیں۔

وہ ضد کرتا ہے یا مچلتا ہے تو آپ منہ بناتے ہیں۔ بچہ آپ کی رکاوٹ پر اور بھی مچلتا ہے۔

بچہ ایک کاغذ پھاڑنا چاہتا ہے، ایک تنکے کو توڑنا چاہتا ہے، آپ سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ جھڑک دیتے ہیں۔ اِس طرح آپ ایک طرف تو بچے کے سیکھنے کے عمل میں خلل ڈال رہے ہیں اور دُوسری طرف اُسے ضدی بنا رہے ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ اگر بچہ ڈِنر سیٹ توڑنا چاہتا ہے تو آپ اسے شوق پُورا کرنے دیں۔ یا آپ کی کتاب پھاڑنا چاہے تو پھاڑنے دیں۔ اِس بات کا تو آپ ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سی بات غلط ہے اور کون سی ٹھیک۔ بس بات سے کوئی نقصان نہ ہو وہ بات بچے کو بلا روک ٹوک کرنے دی جانی چاہیے یا ذرا سوجھ سے کام لے کر اُس کو کام کے کاغذات کے بدلے ردّی کاغذ دے دیجئے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اگر آپ اُسے ہر کام سے روکیں گے تو بچہ اور ضدّی ہو جائے گا۔ بچہ بذاتِ خود ضدّی نہیں ہوتا بلکہ بڑے اُسے ضدّی بناتے ہیں۔

عام طور پر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ بچّوں کی غلط باتوں اور غلط حرکتوں کا مزہ لینے کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بچے نے کسی کا منہ چڑھا دیا، بہن کو گرا دیا — ماں کے چپت لگا دی تو بڑے ہنس دیئے۔ یہ بڑوں کی خود غرضی ہے کہ وہ اپنے دِل بہلاؤ کے لیے بچّوں کی غلط باتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر اسی موقع پر اُن کو پیار سے روک دیا جائے تو وہ بُری عادتیں نہیں سیکھیں گے اور سرپرستوں کو اُن کے بڑا ہونے پر بڑوں کی رسوائی کی شکایت بھی نہیں ہوگی۔

بچہ آپ کے دِل بہلاؤ کا سامان نہیں ہے۔ وہ آپ کے کندھوں پر ذمّے داری کا بھاری بوجھ ہے — ایک ایسی ذمّہ داری جس پر سماج کی بُرائی، بھلائی، سکھ، دُکھ کا انحصار ہے۔ بچّوں کی تربیت کے سلسلے میں آپ کو ٹھنڈے دماغ سے کام لینا پڑے گا۔ آپ بچّوں سے اُن کا بچپن مت چھینئے۔ اُنہیں بزرگ بنانے کی کوشش مت کیجئے۔

بچے کے جذبات کچے ہوتے ہیں۔ آپ کو اُن میں پختگی پیدا کرنی ہے۔ بچّوں میں حیوانیت چھپی ہوئی ہے آپ کو اُسے ہٹانا ہے۔ اُن کے ڈگمگاتے قدموں کو مضبُوط بنا کر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی مشکل راہوں پر چلنے کے لائق بنانا ہے۔ آج کی ننھی کلی کل پھول بنے گی جسے دنیا کی کڑی دھوپ اور تیز ہواؤں کو بھی برداشت کرنا ہے۔ دُنیا میں جیت ہی جیت نہیں، ہار بھی ہے۔ کامیابی ہی کامیابی نہیں ناکامی بھی ہے۔ آرام ہی آرام نہیں تکلیفیں بھی ہیں۔ اپنے بچّوں کے لئے آپ کی محبت کا عملی ثبوت یہی ہے کہ آپ انہیں اچھا کردار دے دیں اور اگر آپ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ چیز بچے کے لئے دنیا کی تمام بہترین نعمتوں سے بڑھ کر ایک نعمت ہوگی۔ •

شیشۂ دل

ہر آدمی اِس قید سے باہر تو نہیں ہے
جینے کی سزا موت سے بڑھ کر تو نہیں ہے
ہر ظلم کو سہہ لینا مقدر تو نہیں ہے
دُنیا میں کسی سے کوئی کم تر تو نہیں ہے
تڑپا کے مِرا دل وہ سکوں پا نہ سکیں گے
اُن کا بھی تو دل ہے کوئی پتھر تو نہیں ہے
بھر جائے جو آسانی سے دو چار دنوں میں
یہ زخمِ جگر راہ کی ٹھوکر تو نہیں ہے
میں نے ہی تمہارے دلِ معصوم کو چھیڑا
الزام تو مجھ پہ ہے یہ تم پر تو نہیں ہے
ٹوٹا ہوا دِل جوڑنا ممکن نہیں ساقی
یہ شیشۂ دِل ہے کوئی پتھر تو نہیں ہے
کم ظرف کی تنقید سے ہو جائے پریشاں
شیدا کوئی معمولی سخن ور تو نہیں ہے

—— شیدا دومانی



موٹاپا

مقالہ • رضیہ

آپ کا چہرہ چاند کی طرح خوبصورت کیوں نہ ہو، اگر آپ کے جسم کے دیگر اعضاء موٹے ہوں گے تو آپ کی شباہت بھدی، بے ڈھنگی اور بے ڈول لگے گی، اور آپ کی خوبصورتی برباد ہو جائے گی۔

موٹاپا ایک مرض ہے۔ حسن کا دشمن ہونے کے ساتھ ہی اس سے آپ کی قوت بھی کم ہوتی ہے۔ اس کے سبب چلنے پھرنے اور گھر کے کام کاج میں آپ جلد ہی تھک جاتی ہیں۔

موٹاپے کا اثر عموماً شادی کے بعد ہوتا ہے۔ جب ایک دو بچے ہو جاتے ہیں۔ شادی سے پہلے کی پھرتیلی زندگی، کھیل کود سب ختم ہو جاتے ہیں اور گھر کے تھوڑے بہت کام سے جسم کی ضروری ورزش نہیں ہو پاتی۔ وہی عورتیں اکثر موٹی ہوتی ہیں جو آرام طلب ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ متوازن غذا کی طرف توجہ نہ دینے سے بھی جسم پر چربی بڑھنے لگتی ہے۔

موٹی عورتوں کو اپنی خوراک میں سے دہی، مکھن، گھی، دال، مٹھائی وغیرہ چربی بڑھانے والی چیزیں بالکل نکال دینی چاہئیں۔ دن میں صرف دوبار ہی کھانا چاہیئے۔ کھاتے وقت پانی نہیں پینا چاہیئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھوکے رہ کر دُبلا بننے کی کوشش کی جائے۔ ایسی چیزیں کھایئے جن سے طاقت تو آئے مگر چربی نہ بڑھے، جیسے دودھ، پھلوں کا رس، ہری سبزیاں وغیرہ۔

موٹاپا دُور کرنے کا دوسرا طریقہ ہے ورزش۔ اگر آپ باقاعدگی سے روز پندرہ بیس منٹ ورزش کریں گی تو آپ کا جسم ضرور سڈول ہو جائے گا۔ لیکن ورزش شروع کرنے سے پہلے آپ ڈاکٹر سے اپنا معائنہ ضرور کرا لیجئے کہ کہیں آپ کو کوئی ایسا مرض تو نہیں کہ ورزش کرنے سے اُلٹا ہی اثر پڑے۔



کندھے اور گردن کے لئے

یہ یاد رکھیئے کہ ورزش کوئی جادو نہیں ہے کہ دو چار دن میں ہی آپ کا موٹاپا دور کر دے، بلکہ اس کا اثر آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔ جب آپ ورزش کرنا شروع کریں تو اپنی کمر، کولہوں، رانوں، چھاتی وغیرہ کا ناپ لے کر نوٹ کر لیں۔ ہر چھٹے مہینے کے بعد ناپ لے کر دیکھئے کہ کچھ فرق پڑا یا نہیں۔ اچھا ہو اگر آپ کسی سڈول عورت کی تصویر بھی سامنے دیوار پر لٹکا لیں۔ اسے دیکھ کر آپ کو ترغیب حاصل ہوگی۔

یہاں پر چند ورزشیں دی گئی ہیں، جن کو باقاعدگی سے عمل میں لانے سے آپ کا موٹاپا کم ہو سکتا ہے۔

اگر آپ کے کندھے اور گردن آگے کو جھکے ہوئے ہیں اور پیٹھ کے اوپر والے حصے پر کُبڑا پن سا نمایاں ہو رہا ہے تو مندرجہ ذیل کسرت کیجئے:

دیوار کے سہارے پیٹھ لگا کر پالتی مار کر



رانوں کے لئے

بیٹھ جائیے۔ پیٹ کو اندر کی طرف کھینچئے، چھاتی باہر کی طرف کو اور گردن سیدھی تان لیجئے۔ دونوں بانہوں کو پیچھے اوپر لے جائیے، پھر کندھے اور کہنیوں سے رفتہ رفتہ بانہوں کو نیچے لا کر چھوڑ دیجئے۔ اس طرح کم سے کم پانچ بار دوہرائیے۔

اگر آپ کے کولہے بھاری ہیں تو یہ کسرت کیجئے: کولہوں کے سہارے زمین پر بیٹھ کر ٹانگیں آگے کو پھیلا کر تان لیجئے۔ ہاتھوں کو پیچھے زمین پر ٹیک دیجئے۔ اب ہاتھوں پر وزن ڈال کر کولہوں کو اوپر اُٹھائیے، ٹانگ،



کمر کے لئے



کمر، چھاتی ایک سیدھ میں ہو جائیں۔ پھر تیزی سے کولہوں کو زمین پر واپس لے آئیے۔ ایسا پانچ بار کیجئے۔

کولہوں کے لئے ایک ورزش اور ہے: زمین پر چت لیٹ جائیے۔ ایک ٹانگ کو گھٹنے سے موڑ کر اٹھا لیجئے۔ اب دوسری ٹانگ کے کولہے کو جلدی جلدی ایک ہی رفتار سے اوپر نیچے اُٹھائیے اور گرائیے۔ جب تک آپ بُری طرح تھک نہ جائیں یہ کسرت کو بدل بدل کر کرتی رہیے۔

اپنی کمر پتلی کرنے کے لئے مندرجہ ذیل ورزش کیجئے: پیٹھ کے بل زمین پر چت لیٹ جائیے اور بانہوں کو سر کے پیچھے زمین پر ٹکا دیجئے

چھاتی کے لئے



پیٹھ کا اوپر والا حصہ زور سے کر زمین پر جھکائیے اور پیٹ اندر کو کھینچا رہے۔ اب دونوں پیروں کو ملا کر آہستہ آہستہ اوپر اٹھائیے اور ساتھ ہی دوسری جانب سے دونوں بانہوں، سر اور کندھوں کو بھی کئی انچ اوپر اٹھائیے۔ پھر آہستہ آہستہ واپس پہلی والی حالت میں آجائیے۔ جب تک آپ تھک نہ جائیں یہ عمل برابر کرتی جائیے۔

کمر کے لئے ایک ورزش اور ہے۔ پیروں کو ایک فٹ کے فاصلے پر رکھ کر دونوں بانہیں سیدھی اوپر کرکے کھڑی ہو جائیے۔ اب آگے جھک کر، گھٹنے موڑے بغیر، بائیں ہاتھ سے بائیں پیر کو چھوئیے، سیدھی ہو جائیے۔ اب بائیں ہاتھ سے دائیں پیر کو چھوئیے۔ اس کسرت کو پھرتی کے ساتھ پانچ بار کیجئے۔

رانوں کو سڈول بنانے کے لئے یہ کسرت کیجئے: پیٹھ کے بل زمین پر چت لیٹ جائیے، ٹانگوں کو سیدھا پھیلا دیجئے اور بانہوں کو کندھوں کے دونوں طرف پھیلا دیجئے۔ اب بائیں ٹانگ کو ایک دم سیدھی کھڑی کرکے تیزی کے ساتھ گھما کر دائیں ہاتھ سے چھوائیے۔ اسی طرح دوسری ٹانگ سے بھی کیجئے۔ شروع شروع میں کم سے کم دس بار ضرور کیجئے۔ اس ورزش سے جسم میں خون کا دورہ بھی ٹھیک رہے گا۔

اگر چھاتیاں بھاری ہو کر لٹکنے لگی ہوں تو مندرجہ ذیل ورزش کیجئے:

دیوار کے ساتھ پیٹھ اور ایڑیاں لگا کر کھڑی ہو جائیے۔ کندھے سیدھے رہیں اور گردن تنی ہوئی۔ پیٹ کو اندر سکوڑ لیجئے۔ اب دونوں بانہوں کو کندھوں کی سیدھ میں پھیلا کر، پنجوں کے بل کچھ قدم آگے چلئے، اور ساتھ ساتھ بانہوں کو کندھے سے پہلے پیچھے کی طرف سے گول چکر میں تیزی سے گھمائیے، پھر آگے کی طرف سے گھمائیے۔ پھر ایک دس بار کیجئے۔ اس کسرت سے کندھے اور گردن بھی سڈول ہوتے ہیں۔ ●

سرحدی علاقہ

ان دنوں ڈاکٹر امرناتھ جھا اتر پردیش پبلک سروس کمیشن کے صدر تھے۔ پی۔ سی۔ ایس کا انٹرویو چل رہا تھا۔ ایک نوجوان امیدوار کمرے میں داخل ہوا تو جھا صاحب نے اسے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بلیا سے" نوجوان نے جواب دیا۔

جھا صاحب مسکرائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے دریافت کیا "آپ بتا سکتے ہیں کہ بلیا والے بیوقوف کیوں کہلاتے ہیں؟"

نوجوان نے فوراً جواب دیا "کیونکہ بلیا بہار کی سرحد پر واقع ہے۔"

[illegible] انٹرویو میں بیٹھے دوسرے ممبر کھل کھلا کر ہنس پڑے [illegible] نوجوان کے [illegible] اس جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ پھر دوسرا [illegible]

[illegible] ہوگیا۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مرحوم ڈاکٹر جھا صاحب بہار [illegible]



ممتا کی جوت

امی ستر سال کی عمر پائیں گی، میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ زندگی کے سنہرے دن ان کے لئے ایک عذاب بن کر رہ گئے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں ہی وہ بوڑھی لگتی تھیں۔ سر کے سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ تیس پینتیس سال کی ایک مسلسل جدّ و جہد نے امی کو بالکل تھکا دیا تھا۔ جب راحت کے دن آئے تو انہوں نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔

بڑے بھیا نے ڈاکٹر بن کر دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حیدر آباد میں مَیں ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم ہو گیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ وہ میرے پاس آ کر رہیں۔ بھیا نے بھی بہت زور دیا مگر وہ نہیں مانیں۔ بھیا نے یہ تجویز رکھی کہ کم از کم امی نئے گھر میں ہی منتقل ہو جائیں جہاں ساری سہولتیں مہیا کر دی گئی تھیں مگر امی اپنے پرانے گھر کو کسی حالت میں چھوڑنے پر رضامند نہیں تھیں، لہٰذا نیا گھر کرائے پر اٹھانا پڑا۔

جب تک ذمّہ داریوں سے لدی ہوئی تھیں امی کو اپنی ملازمت سے ۱۲۵ روپے ملتے تھے۔ وہ پرائمری سکول میں ٹیچر تھیں۔ پھر صبح و شام فرصت کے اوقات کپڑے سی کر تیس چالیس کی آمدنی کر لیتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بھیا میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے ویسے تو فیس معاف تھی مگر اچھے کپڑوں اور [illegible] پر [illegible] خرچ آتا تھا۔ [illegible] میں ایم اے کرنے پر تلا ہوا [illegible] ہر تیسرے سال ایک نئی ہستی کو جنم دیتی [illegible] تیں۔ اُن کی شادی بڑی دھوم دھام سے [illegible] تھی۔ نانا جان کا بڑا مکان فروخت کر دیا گیا [illegible] سارے زیور ابا کی مسلسل بیماری

جب امی ۵۰ سال کی ہوئیں تو ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکی تھیں۔ بھیا ڈاکٹر بن گئے تھے اور انہوں نے دلی میں اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی اور میں کالج میں لیکچرار۔ ہم نے چاہا کہ اب تک جتنے دن بھی امی کے مصیبت میں گزرے، گزر گئے، آئندہ انہیں ہر حالت میں راحت ہی راحت ہونی چاہئے، لہٰذا ہم نے طے کیا کہ ہر ماہ سو سو روپے امی کو بھجوا دیں اور مکان کا کرایہ بھی امی اپنے خرچ کے لئے رکھ لیں۔ ان کی اپنی تنخواہ کی الگ رقم ملتی تھی مگر ہم جب کبھی امی کے پاس گئے تو انہیں معمولی کپڑوں میں پایا۔ میں جھنجلاتا تو امی کہتیں "ارے پگلے، مجھے اب اچھے کپڑوں اور روغنی غذاؤں کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگ خوشی سے دن گزارو، یہی میرے لئے راحت کا باعث ہے۔"

"اتنے دنوں تو آفتوں [illegible]

[illegible] ہمیں کھا یا پہنا یا، [illegible]

بتایا کہ آرام سے کھا پی سکیں مگر آپ ہیں کہ ہمیں شرمندہ کرنے کی شاید ٹھان رکھی ہے۔ اپنے بعد آپ ہمارے لئے ایک بڑی رقم بھی چھوڑنا چاہتی ہیں" میرے آنسو نکل پڑتے۔

وہ مسکرا کر مجھے سینے سے لگالیتیں "تم دگ سمجھ نہ سکو گے۔"

مجھے یہ سوچ سوچ کر بڑی کوفت ہوتی تھی کہ آخر امی کو کیا ہو گیا ہے۔ مانا کہ زندگی جدوجہد کا نام ہے مگر امی نے زندگی کو مسلسل جدوجہد کیوں بنا رکھا ہے، میرا اندازہ تو یہ ہے کہ وہ مشکل سے اپنے آپ پر سو ڈیڑھ سو روپے اٹھاتی ہوں گی، بقیہ دو تین سو روپے ماہانہ کیوں بچاتی ہیں؟ کیا وہ اپنے حج اکبر کے مبارک سفر کے لئے تو جمع نہیں کر رہی ہیں؟ گذشتہ کئی سالوں سے یہی کہتی آ رہی ہیں کہ میری ذمہ داریاں ختم ہو جائیں تو حرم شریف چلی جاؤں گی اور لوٹ کر نہیں آؤں گی۔

"کون سی ذمہ داری اب بھی باقی رہ گئی ہے" میں خفا ہو کر پوچھتا۔ مسکراہٹ میری ہر بات کا جواب ہوتی۔ وہ مسکرا کر میرا سارا غصہ کافور کر دیتیں۔

۔۔ سال میں جب امی نے آنکھیں میچ لیں تو ہمارا یہ اندازہ تھا کہ ان کا بنک بیلنس کم از کم تیس چالیس ہزار تو ضرور ہوگا۔ اس کے تصور ہی سے شرمندگی سے سر جھک جاتا۔ یہ خودکشی کی بات نہ تھی [illegible]

[illegible]

نے مشورہ دیا کہ گرمیوں میں نندی ہل چلی جائیں اور وہاں کچھ دن گذار آئیں، مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں۔ "اگر پیسے اتنے ہی زیادہ ہوں تو مجھے دے دو، میں ان کا بہتر استعمال جانتی ہوں" وہ ایسے موقعوں پر کھلکھلا پڑتیں۔ ہم جھنجھلا کر رہ جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوا کہ وصیت نامے میں امی نے اپنے اس پرانے گھر کو ایک تعلیمی ادارے کے نام وقف کر دیا تھا مگر پیسوں کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا تھا اور سخت حیرت تو اس بات پر تھی کہ بنک میں ایک ہزار سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ یہ بات قطعی یقینی تھی کہ انہوں نے اپنے آرام و آسائش پر ہرگز ہرگز خرچ نہ کیا ہوگا، تو پھر؟ یہ ایک راز بن کر رہ گیا۔

اس راز کا پتہ تو صرف ان کی ڈائری سے ہو سکتا تھا، ہم سب انہیں ڈائری لکھتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ یہ ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی ڈائری کو وہ بڑی حفاظت سے رکھتی تھیں۔

میں ڈائری کے اوراق الٹنے لگا۔

۱۶ ر مارچ۔

آج ڈاکٹر کی رپورٹ آئی تھی۔ عمیم نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ کینسر کی تصدیق ہو گئی تھی، دل میں کسی نے چٹکی بھر لی۔ مگر عمیم کے چہرے پر وہی دل کش مسکراہٹ تھی جیسے وہ اپنے آپ کو اور مجھے ~~دھوکہ~~ دینا چاہتے تھے۔ میں انجان بن کر بولی "ڈاکٹر کی رپورٹ آئی ہے؟" وہ میری بات کو ان سنی کر کے کوئی بہانہ بنا کر گھر سے نکل گئے

۲۰ ر مارچ۔

"عشرت، میرا خیال ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا" عمیم مجھ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیا میں نہیں جانتی تم کہ ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔

میں نے آج تک تمہیں دھوکہ ... [illegible]

میں مدا ہنسی تھی اور ... دل ... ہوں " مجھے ان کی باتوں پر ہنسی بھی آتی اور رونا بھی۔ یہ وقت رونے کا نہیں تھا۔

" مجھے اس بات کا علم ہے " میں مسکرائی " اور آپ کے دل میں جو بسا ہوا ہے، اُس کو بھی جانتی ہوں "

وہ حیرت سے مجھے تکنے لگے۔

" اگر آپ چاہیں تو اُس کی نشان دہی بھی کر سکتی ہوں "

بچ مچ وہ حیرت میں ڈوب گئے۔

" اگر آپ اس کو دیکھنا چاہیں تو اُس کو ابھی آپ کے سامنے کھڑا کر دوں بشرطیکہ آپ تھوڑے وقفے کے لئے آنکھیں بند رکھیں "

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں اُن کے سامنے کھڑی ہو گئی، بولی " اب آنکھیں کھولئے اور بتایئے، کیا یہ وہی خوش قسمت لڑکی تو نہیں۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان کے ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹاتے ہوئے بولی " میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔ اگر مجھے کینسر ہو جاتا تو کیا آپ میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیتے؟"

" جس کی زندگی چند دن کی ہو اُس سے دل لگانا کہاں کی عقل مندی ہے؟"

" میں اپنے سوال کا براہِ راست جواب چاہتی ہوں "

" تم سچ مچ بڑی نادان ہو عشی، بھلا کوئی جان بوجھ کر اپنے آپ کو آگ میں جھونکتا ہے "

" اگر اسی میں کسی کی خوشی پنہاں ہو تو، پھر کیا حرج ہے؟"

... کر ایسی باتوں سے دھوکہ

گی۔ اگر شادی کے بعد آپ کی طبیعت بگڑ جاتی تو۔۔؟"

" یہ تو تمہاری اندھی محبت بول رہی ہے۔ دانائی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں چچی اور چچا جان کو صحیح حالات سے آگاہ کر دوں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میری زندگی کے مشکل سے سات آٹھ سال باقی رہ گئے ہیں، میرا خیال ہے کہ کوئی بھی ماں باپ اپنی بچی کی زندگی برباد کرنا نہ چاہیں گے۔ کم از کم والدین کے کہنے پر اپنے خیال سے باز آ جاؤ گی۔ دوسری جگہ تم بیاہ کر چلی جاؤ گی، تمہارے اپنے بچے ہوں گے، وقت تمہارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا۔ جب تمہیں میری موت کی خبر ہو گی تو کہہ اٹھو گی " نعیم نے مجھے شادی سے روک کر مجھ پر احسان کیا، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے "

" للہ، ایسا بھی مذاق نہ کیجئے کہ کسی کی موت بن جائے " مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میرے آنسو نکل پڑے۔

" اپنی چند دن کی خوشی کے لئے دیدہ و دانستہ تمہیں ایک آفت میں مبتلا کر دوں یہ تصور ہی میرے لئے گراں ہے "

" آپ شاید مجھے بے حیا بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے کہے دیتی ہوں، اگر آپ نے مجھے خود سے دور کر دیا، آپ کی قسم میں زہر کھا لوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے "

" عشی، ذرا سوچو تو۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ خود کشی بزدلی ہے، گناہ ہے "

" بزدلی اور گناہ سے بچا لینا آپ پر منحصر ہے "

۲۵ مارچ

آج کا دن میری خوشی کا سب سے بڑا دن تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں سچ مچ اُن کی ہو گئی تھی " عشی، تم بہت ضدی ہو، تم نے میری ایک نہیں مانی " وہ کہہ رہے تھے۔

۱۲ دسمبر

پانچ سال تک پیچھے گزر گئے میری زندگی

ساتویں دن بھی آپہنچا۔ صبح سے اُن کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چند گھنٹوں کے مہمان ہیں۔ میرے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ میرے امتحان کے لمحے تھے، انہوں نے کہا "عشی، میں سوچتا ہوں کہ مجھ سے یہ بڑی غلطی سرزد ہو گئی کہ تمہاری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ مجھے ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا۔ وقت گھاؤ بھر دیتا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ اپنی چند روزہ خوشی کے لئے تمہیں عمر بھر کے لئے جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیا۔ پھر اسماء، خالد اور زعیم کی تعلیم کی ذمہ داری الگ ٹھہری....."

"اللہ، آپ کچھ نہ کہئے، اللہ و رسول گواہ ہیں، میں اپنے کئے پر کبھی نہیں پچھتائی اور نہ کبھی پچھتاؤں گی۔"

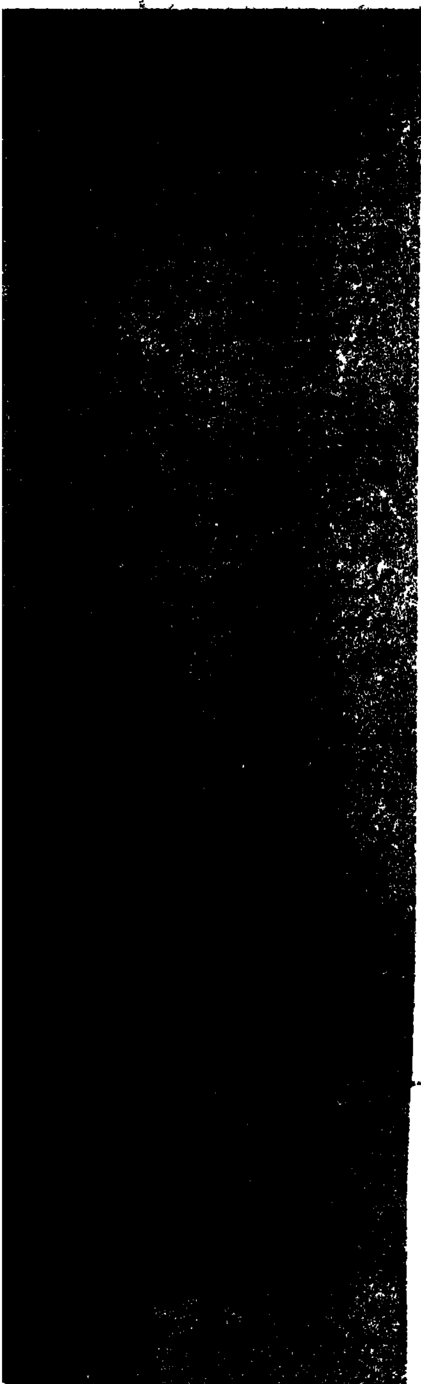
۲۵ر دسمبر

آج اسماء ۲۰ سال کی ہو گئی، اس کا بیاہ بھی اسی دن ہو رہا ہے جب کہ ہمارا ہوا تھا۔ ایک معزز گھرانے میں جا رہی ہے، آج اُن کی یاد بہت آ رہی ہے، وہ ہوتے تو اپنی لاڈلی کو دلہن بنا دیکھ کر پھولے نہ سماتے...

میں جلد جلد ڈائری کے اوراق اُلٹنے لگا۔

۱۲ر جون

میرے دونوں لال برسرِ روزگار ہو گئے۔ زندگی میں انہیں خوشیاں ہی خوشیاں نصیب ہوں۔ آج خالد نے ہزار منع کرنے پر بھی مزید ۲۰۰ روپے بھجوائے ہیں اور زعیم نے ۱۰۰ روپے۔ ان پاگلوں نے میرے لئے نیا گھر بنوایا ہے، چاہتے ہیں کہ اس پرانے بوسیدہ گھر کو چھوڑ کر اس میں جا بسوں جہاں ساری سہولتیں و آسائشیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ میں نے جانا مناسب نہ سمجھا، میرا جی نہیں چاہا۔ اس کمرے کو میں کیسے چھوڑ دیتی جہاں میں نے اپنی زندگی کے پانچ سنہری سال اُن کے ساتھ گزارے تھے۔



مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ سایہ بن کر میرے ساتھ رہتے تھے۔ اس کمرے میں قدم رکھتی ہوں تو ایک مسرّت سی دوڑ جاتی ہے۔ سامنے لگے ہوئے فوٹو کو تکتی رہتی ہوں، اُن کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر مجھ میں ایک عزم پیدا ہوتا ہے، ایک نئی طاقت اُبھرتی ہے۔ میں زندگی کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ اِن پاگلوں کو کیسے سمجھاؤں یہاں تو میری روح ہے۔ روح کے بغیر جسم بے کار ہے۔ میری ضد کے سامنے میرے اِن لاڈلوں کو ہار ماننی پڑی۔ میں نے نیا گھر کرائے پر اُٹھا دیا۔

تین ساڑھے تین سو روپے ہر ماہ میری ہتھیلی پر جم جاتے ہیں۔ مجھ اکیلی جان کے لئے اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت ہے؟ اِن تینوں کی ذمّہ داریوں سے سُبکدوش ہو کر جیسے مجھ میں ایک خلا سا آگیا ہے مگر ممتا کی جوت جو ہر ماں میں جل اُٹھتی ہے اس کی تسکین کے لئے کوئی راہ نکلنی ہے۔

ریفوجی کیمپ میں کئی کئی گھنٹے گذار دیتی ہوں۔ دھنش کوڑی کے سیلاب شدہ علاقے کے لوگ یہاں بسائے گئے ہیں۔ بدقسمت و برباد شدہ لوگوں کی داستان سن کر انہیں تسلی دینا میرا مشغلہ بن گیا ہے۔ اِن بدنصیب لوگوں میں سولہ سترہ سال کی نازک شاہینہ بھی ہے جو پری میڈیکل کلاس میں پڑھتی تھی اور تعطیلات میں گھر آئی تھی، اُس کے خاندان کا کوئی فرد بچ نہیں پایا۔ وہ اِس دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی ماں سمجھ کر مجھ سے لپٹ گئی مجھے اس کو اپنے سینے سے لگا کر ایک سکون سا ملا۔ میں اُس کو اپنے ساتھ لے آئی۔

اسی کیمپ سے مَیں نے دو بہنوں کو اپنا لیا ہے۔ یہ جڑواں لگتی ہیں۔ کوئی سات آٹھ برس کی ہیں۔

اِن تینوں کو ایک علیحدہ گھر میں بسا دیا ہے،

سن رسیدہ ہو گئے ہیں۔ چاہتی تھی کہ جب خالد اور نعیم گھر آئیں تو انہیں اِس بات کا پتہ نہ چلے کہ پھر ایک جھنجھٹ میں پڑ گئی ہوں۔ وہ میرے آرام کی سوچتے ہیں اور مجھے ایسی جھنجھٹ میں سکون ملتا ہے۔ انہیں کیسے سمجھاؤں؟

۲۲ر مئی

مجھے انتہائی خوشی ہے کہ شاہینہ ڈاکٹر بن گئی۔ میری آرزو ہے کہ خالد سے بیاہ دوں۔ میں دونوں کی مرضی جاننا چاہتی ہوں۔ جب اس مرتبہ خالد میسور آئے گا تو شاہینہ سے ملاؤں گی۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کر لیں تو آئندہ سال بیاہ رچا دوں گی۔ میں خالد کو اکیلے جرمنی بھجوانا نہیں چاہتی۔

۱۰ر فروری

محسنہ ایم۔ ایس۔ سی میں پورے صوبے میں فرسٹ آئی ہے۔ اُس کو اپنے ہی کالج میں لکچرار شپ مل گئی ہے۔ طاہرہ نے بی۔ ایڈ کے بعد ایم۔ اے کیا ہے، وہ تالیف و تصنیف کرنا چاہتی ہے۔

آج میری ساری ذمہ داریاں ختم ہو گئیں مزید کوئی ذمہ داری اٹھانے کی طاقت مجھ میں باقی نہیں رہ گئی۔ میں جلد از جلد حرم شریف چلی جانا چاہتی ہوں، خدا میری مُراد بر لائے۔

میں سوچنے لگا ' اولاد اکثر اپنے والدین کو بیوقوف بناتی ہے، مگر امی نے ہمیں بیوقوف بنایا امی نے شاید یہ اچھا ہی کیا کہ اِس بات کو راز ہی میں رکھا، کون جانے اُس وقت ہم کس نگاہ سے دیکھتے، شاید تین نرم و نازک حسین پھول جیسی پتیاں سنورنے کے بجائے بادِ مخالف کی نذر ہو جاتیں، پھل پھول والے پیڑ کی طرف ہر کسی کی نگاہِ طلب اٹھ جاتی ہے مگر بیج میں چھپے ہوئے گل و گلزار کو صرف ایک ماں کی نگاہ ہی دیکھ سکتی ہے۔

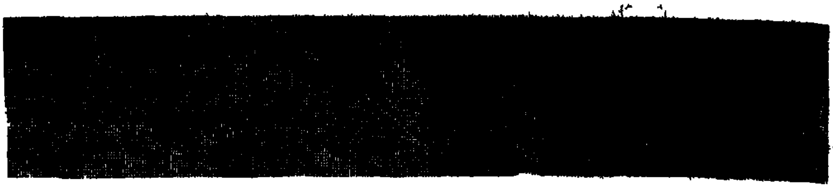
مجھے طلاق چاہیئے

ایک امریکی خاتون نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا ہے کہ اُس کے خاوند کے سر سے چوبیسوں گھنٹے آوازیں آتی رہتی ہیں، جس کی وجہ سے اُس کا اپنا دماغ پریشان رہنے لگا ہے۔ لہٰذا اُسے طلاق دلائی جائے۔ اُس کا بیان ہے کہ کبھی تو اُس کے خاوند کے سر سے خطرے کی گھنٹی جیسی آواز نکلتی ہے۔ کبھی تالاب میں مینڈکوں کے ٹرانے جیسی، کبھی گڑیا کے رونے جیسی اور کبھی جذبات کے تحت ٹھنڈی آہوں جیسی۔ رات کے وقت یہ آوازیں بہت زور سے سُنائی پڑتی ہیں۔

خاوند کے سر سے نکلنے والی اِن آوازوں کا سبب دو سال پیشتر ہوئے ایک حادثے کو بتایا جاتا ہے۔ جس میں اُس کا سر پھٹ گیا تھا۔ اِس دَوران سر کے تین آپریشن کیئے گئے لیکن اِس کے باوجود یہ آوازیں دس فٹ دور کھڑے انسان کو صاف سُنائی دیتی ہیں۔

لیکن ایسی بھی بہت سی خواتین ہیں جنہیں، سر پھٹنے کا حادثہ تو درکنار کبھی نکسیر تک پھوٹنے کا تجربہ نہیں ہوا ہوگا۔ اِس کے باوجود اُن کے سر سے قریباً اسی طرح کی، بلکہ اِس سے بھی خوفناک آوازیں ہر وقت نکلتی رہتی ہیں۔ حزن سے اُن کے شوہر پاگل ہو جاتے ہیں۔

بدقسمت خاوند کے سر کی آوازیں تو شاید اُس کے سر کے اندر سے ہی سنائی پڑتی ہیں۔ لیکن جن معزز خواتین کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے اُن کے سر کی آوازیں اُن کے منہ اور ناک کے راستے اُن کی مرضی اور کوشش سے نکلتی ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں، جنہیں طعنہ زن کہا جاتا ہے۔ اس لئے اگر سر کی آوازیں ہی طلاق کی جائز بنیاد ہوں تو دنیا کے شادی شدہ مردوں کو بیویوں سے نجات ملنی چاہئے



کھوئے کی لیچیاں

سامان: کھویا ۲۵۰ گرام؛ چینی ۷۵ گرام؛ خشخاش دو بڑے چمچے؛ مونگ پھلی کچھ دانے؛ گھی ایک چمچہ

طریقہ: کھوئے کو گھی میں ملا کر پہلے اُسے دھیمی آنچ پر ہلکی سُرخی تک بھون لیں۔ چینی کو پیس کر رکھ لیں۔ کھویا ٹھنڈا ہونے پر اُس میں چینی اور دو تین بوند لیچی اسنس کی ملا دیں۔ اب اُس کی لیچی کی شکل کی گولیاں بنائیں۔ اور ہر گولی کے اندر مونگ پھلی کا ایک ثابت دانہ رکھتی جائیں۔ یہ لیچی کی اندرونی گٹھلی معلوم دے گی۔ اِس کے بعد خشخاش کو توے پر ڈال کر بھون لیں۔ بھورے رنگ کی ہونے پر اُتار لیں اور اس میں گولیوں کو لپیٹ لیں۔ اس طرح گولیوں پر لیچی کی مانند دانے سے اُبھر آئیں گے۔

انہیں ٹھنڈا کر کے پلیٹ میں ہرے پتّوں کے ساتھ سجائیں تو بہت خوبصورت لگیں گی

اگر کھویا مہنگا ملے یا دستیاب نہ ہو تو سپریٹا دودھ سے کر تیار کر سکتی ہیں۔ صرف چکنائی کے علاوہ بھی اوصاف اس میں ہوتے ہیں۔ ذائقہ بالکل کھوئے جیسا ہوتا ہے۔ صرف بھونتے وقت گھی ایک کی بجائے دو چمچے ڈالنا ہوگا

نمکی

سامان: میدہ دو کپ؛ پیاز بڑی دو عدد؛ تھوڑا نمک اور تلنے کے لئے تھوڑا گھی

طریقہ: پیازوں کا چھلکا اُتار کر انہیں باریک پیس لیں۔ میدہ، پسی پیاز اور نمک آپس میں ملائیں، اور اندازے سے موئن دے کر مٹھری کے میدے کی طرح سخت گوندھیں۔

چھوٹے اور تنگ منہ کی دو برتنوں کے ڈھکن لیں۔ ایک کا ناپ گول بسکٹ کے برابر ہو اور دوسرا تنے پیسے یا چونّی کے برابر۔ گندھے میدے کا کچھ حصّہ چکلے پر روٹی کی طرح بیلیں پھر ڈھکنوں سے جگہ جگہ دبا کر گول بسکٹ جیسے کاٹ لیں۔ ان بسکٹوں کے درمیان چھوٹے ڈھکن سے اسی طرح دبا کر سوراخ بنالیں۔ اب گھی میں دھیمی آنچ پر سُرخ ہونے دیں۔

پلیٹ میں سجاتے وقت انہیں ایک کے اوپر ایک گولائی میں رکھیں۔ ناشتہ کے لئے یہ بڑا لذیذ نمکین ہے۔

چمپاکلی

سامان: میدہ ۲۵۰ گرام؛ کھویا ۲۵۰ گرام؛ چینی ۷۵ گرام؛ گھی تین بڑے چمچے

طریقہ: میدے میں دو چمچے گھی ملا کر اُسے کچھ سخت گوندھ لیں اور دبا کر خوب ملائم کریں۔ کھوئے کو ایک چمچے گھی میں بھون کر پسی ہوئی چینی میں ملا لیں اور کسی پھل کی روح کی دو تین بوندیں بھی ڈال لیں۔ اس کھوئے کی گنجوں کے برابر چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا لیں۔

ادھر میدے کو چکلے پر الگ الگ بیل کر چھوٹی بڑی ٹکیاں بنالیں۔ سب سے نیچے بڑی، اُس پر اُس سے بڑی چھوٹی اسی طرح سات ٹکیاں ایک کے اوپر ایک کر کے رکھ لیں۔ رکھتے وقت ہر تہ میں انگلی سے ذرا سا گھی بھی لگاتی جائیں۔ اب اوپر کی ٹکیوں میں انگلی سے دبا کر چھید کر لیں اور اس میں ایک کھوئے کی گولی پھنسا دیں۔ پھر ساتوں ٹکیوں کی کلیوں کو چاقو سے کاٹ کر پھول کی طرح چاروں طرف بکھیر دیں۔ اِس طرح ساری ٹکیاں پھول کی شکل کی بنا کر رکھتی جائیں۔ اب انہیں آگ پر دھیمی آنچ میں تلیں۔

پلیٹ میں سجانے پر یہ بڑی پُرکشش دکھائی دے گی، اور کھانے میں بھی کم لذیذ نہیں ہوگی۔



رچنا سے ماسٹرنی صاحبہ جب بھی کوئی سوال پوچھتی ہیں، وہ جواب دیتے ہوئے اکثر غلط الفاظ بول جاتی ہے۔ سوال کا جواب ٹھیک ہونے پر بھی اُس میں کچھ غلط الفاظ آنے کی وجہ سے وہ اکثر مذاق کا موضوع بن جاتی ہے۔

اپرا جب بھی اپنی سکھیوں، سہیلیوں کے ساتھ بیٹھتی ہے تو اکثر دانتوں سے اپنے ناخن تراشتی رہتی ہے۔

انیسہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ جب بھی بات چیت میں شریک ہوتی ہے تو اپنے دوپٹے کا سرا اپنے ہاتھوں میں لے کر اینٹھتی رہتی ہے۔ یہ ہاتھ میں اینٹھا جانے والا ساری کا سرا بھی ہو سکتا ہے اور رومال [illegible]

انیتا تو لڑکوں کی موجودگی میں کبھی بات چیت میں حصہ لیتی ہی نہیں ہمیشہ سر جھکائے کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہتی ہے یا وہاں سے غائب ہونے کا موقع تلاش کرتی ہے۔

شنیتا اب شادی کے لائق ہو گئی ہے۔ جب بھی کوئی اُسے دیکھنے آتا ہے تو وہ نروس ہو کر پسینہ پسینہ ہو جاتی ہے۔ کسی بھی بات کا معقول جواب اُس سے نہیں بن پڑتا اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ بعد میں وہ خود اپنی اِس بے وقوفی پر جھنجلا اٹھتی ہے لیکن وقت آنے پر حالات پھر اس کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔

کیا آپ

یہ غلط الفاظ بول جانا، تلفظ میں لڑکھڑا جانا، دانتوں سے ناخن تراشنا، انگوٹھے یا انگلیوں سے دوپٹہ اینٹھنا، سہیلیوں میں بیٹھ کر گفتگو میں حصّہ نہ لینا، یا جواب دیتے وقت نروس ہو جانا وغیرہ یہ سبھی علامتیں یا تو غیر ضروری جھینپ اور شرم کے سبب ہیں یا خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے۔

کہیں آپ بھی اس کی شکار تو نہیں؟ اگر ہوں تو ابھی سے اِس عادت کو سُدھارنے کی کوشش کیجئے، ورنہ آگے چل کر کسی مقابلے میں، ملازمت کے لئے دیئے گئے کسی انٹرویو میں، ملازمت کے دوران کسی افسر کے معائنے کے وقت، یا شادی کے انتخاب میں آپ ناکامیاب ہو سکتی ہیں۔ اِن امتحانوں سے نہ بھی گذرنا پڑے تو آپ اپنی زندگی میں ناکامیاب ہو سکتی ہیں۔ کم از کم آپ مقبول تو کبھی نہیں ہو سکتیں آپ کی شخصیت کی کشش بہت حد تک اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ اپنی گفتگو، رہن سہن اور عادتوں سے دوسروں کو کس حد تک متاثر کر سکتی ہیں۔ خود اعتمادی کی کمی اور جھینپنے کی عادت کسی صورت میں آپ کی شخصیت کو پُر اثر نہیں بنا سکتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ آپ کی یہ عادت بہت کچھ اِس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ بچپن میں آپ کی شخصیت کی نشو و نما کس طریقہ سے ہوئی ہے۔ آزاد اور پُر اثر ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی ہر طرح کے حالات میں اپنے کو بہ آسانی مقبول بنا لیتی ہے جب کہ بندشوں اور روک ٹوک میں پلی ہوئی

جھینپتی ہیں؟

لڑکی ایسی حالات میں خود کو بے چین محسوس کرتی ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھ دار ہیں اور اپنی اِس کمزوری کو سمجھتی ہی نہیں بلکہ اُسے پورے طور پر محسوس کرتے ہوئے افسردہ بھی ہیں تو کوشش کر کے اِسے سُدھار بھی سکتی ہیں۔ محنت اور مشق کے سامنے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ لیجئے آپ کی مدد کے لئے چند تجویزیں پیش خدمت ہیں:

خود اعتمادی کے لئے آپ کو اپنی معلومات کا دائرہ وسیع کرنا ہوگا۔ دوسرے اپنے سوچنے کے طریقے میں بھی تبدیلی لانا ضروری ہے۔ عام معلومات بڑھانے کے لئے اخبارات اور رسالے پڑھیں، معیاری کتابوں کا مطالعہ کریں، بحثیں سُنیں۔ دوسروں کی پُر اعتماد اور پُر اثر گفتگو پر دھیان دیں۔ اس سے آپ بھی بحث مباحثوں میں حصّہ لینے سے کترائیں گی نہیں۔ اگر آپ کی عام معلومات اچھی ہے تو اس کا احساس ہی آپ میں خود اعتمادی پیدا کر دے گا۔ پھر بھی سوچنے کے طریقے میں تبدیلی لازمی ہے۔ مجھے کیا آتا ہے؟ میں کس لائق ہوں؟ مجھ میں یہ خامی ہے اور میں اس بات میں کمزور ہوں وغیرہ کم تری کے جذبات کو دل سے نکال پھینکئے۔ آپ اس ڈھنگ سے سوچیئے کہ آپ کسی سے بھی کم نہیں ہیں۔ آپ کی سہیلیوں میں اگر کچھ خوبیاں ہیں تو ان کی جگہ آپ میں کچھ دوسری خوبیاں ہوں گی۔ آپ کوشش کر کے دوسری خوبیاں بھی اپنے اندر پیدا کر سکتی ہیں اور اگر ہیں تو انہیں فروغ دے سکتی ہیں۔ اس طرح ایک طرف اپنی عام علمی کمزوری کو دور کر کے اور اپنے اندر مکمل خود اعتمادی پیدا کر کے آپ اپنی گفتگو میں بھی اثر پیدا کر سکتی ہیں۔

وقت کی قدر کیجئے۔ ہر کام پابندی سے کرنے اور ہر جگہ عین وقت پر پہنچنے سے بھی اپنے میں خود اعتمادی اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے تب آپ بات چیت کے دوران خود کسی جھجک

ہوں گی۔ جلد بازی میں تیار ہو کر لیٹ پہنچنے والے بڑے بڑے مقرر بھی کئی مرتبہ گھبرا جاتے ہیں۔ لہٰذا جب کبھی آپ کو کسی تقریب میں شامل ہونا ہو، بحث مباحثے میں حصہ لینا ہو تو کافی دیر پہلے تیار ہو کر آرام سے وقت پر پہنچنے کی کوشش کیجئے اور بڑے اطمینان اور تحمل سے اپنی باری کا انتظار کیجئے۔

انٹرویو وغیرہ کے موقع پر گھبرا کر جلد بازی سے کمرے میں داخل نہ ہوں۔ سکون کے ساتھ لمبا گہرا سانس لے کر اٹھیں اور اندر داخل ہو کر آداب بجا کر اپنی نشست پر بیٹھ جائیں۔ اس طرح آپ محسوس کریں گی کہ سوالات کا جواب دینے کے لئے آپ مکمل طور پر تیار ہیں۔

اجنبیوں سے ملاقات کے دوران آپ اُن کے چہروں کی طرف ہی نہیں، بلکہ اُن کے ناموں اور تعریفوں کی طرف بھی پوری توجہ دیں۔ اس طرح آپ جلد ہی اُن سے بات چیت کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں گی۔

اگر کسی کے ہاں جائیں تو اپنے میزبان کے کھانے کی، اُس کے گھر کی سجاوٹ کی، اُس کے سلیقے اور پسند کی داد ضرور دیجئے۔ تعریف ہر آدمی کی کمزوری ہے۔ اور اس کمزور نبض پر ہاتھ رکھ کر آپ بآسانی دوسرے کا دل جیت سکتی ہیں۔ کسی بھی تحفے، نیکی یا احسان کے بدلے شکریہ ادا کرنا نہ بھولئے۔ ان تمام باتوں کو اپنی عادتوں میں شامل کیجئے۔ ایک مکمل شخصیت اور کامیاب [illegible] باتوں کی [illegible]

[illegible]

اگر مدِ مقابل شخص کے متعلق آپ کچھ جانتی ہو تو اُس کے رجحانات کو گفتگو کا مرکز بنائیں یا یہ کوئی اور موقع محل کی بات شروع کر سکتی ہیں۔ اگر زیادہ دیر تک گفتگو چلنے کا امکان ہو اور آپ زیادہ دیر تک اس موضوع پر بات نہ کر سکتی ہوں تو بڑی صفائی سے گفتگو کا رُخ اس موضوع کی طرف موڑ دیں جس کی آپ کو اچھی معلومات ہے۔ اس طرح آپ کو نروس نہیں ہونا پڑے گا۔

گفتگو اور عمل میں کامیاب بننے کے لئے ایک لازمی شرط ہے ——— جائزہ یا مطالعہ دوسروں کی ہر اچھی بات کا، ہر اچھے طریقہ کا اور ہر اچھی عادت کا خاموش رہ کر بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور پھر اُسے جوں کا توں اپنانے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے معقول طریقے سے ایسے ڈھالنا چاہیئے کہ وہ نقل معلوم نہ ہو اور آپ میں اچھی خوبیاں ترقی کریں۔ غیروں کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے وقت آپ اپنی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ لے سکتی ہیں۔ تب اُن خامیوں کو دور کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔

اپنی جسمانی اور اقتصادی خامیوں کو دور کرنے کے لئے اپنے اندر خوبیاں پیدا کرنا ضروری ہے اِس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے ورنہ کمتری محسوس کرنے یا جھینپنے کا کوئی سبب نظر نہیں [illegible] لڑکوں سے ملاقات کے دوران [illegible] ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہو تو اُن سے زیادہ مل کر اور تحمل سے مل کر اس عادت کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے لئے اوّل تو آپ کا لباس، میک اَپ، بالوں کی بناوٹ یا سنگھار اس قسم کا ہونا چاہئے کہ لڑکوں کی نظر خواہ [illegible] آپ کی طرف مائل نہ ہو [illegible] گھل مل کر جھینپنے کی عادت کا علاج [illegible] شخصیت کی خوبیوں میں ترقی اور مکمل خود اعتماد [illegible]



ہمارے پڑوس میں
...ہنے والے ایک صاحب
...نے اپنے دوستوں پر اپنے
...ن بچے کا رعب ڈالنے
کے لئے اُسے بُلایا اور چمکار کر کہا "بیٹے وہ نظم
...ناؤ جو اتی نے تمہیں کل سکھائی تھی۔"
بچے نے مچل کر کہا "پہلے مجھے ایک
...پت لگائیے۔"
انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیوں
...؟"
بچے نے فوراً جواب دیا "جب میں
...دوں گا تو آپ مجھے دس پیسے دیں گے پھر
...نظم سناؤں گا۔"
— خالد فیروز خاں، دِلّی

•

ایک دن میں اپنے دوست وحید سے
...کلام تھا کہ اُسی وقت اُس کا چھوٹا بھائی "ننھے"
...رے پاس آکر بیٹھ گیا۔
میں نے ننھے سے پوچھا "کیا تمہاری
...دی ہو گئی ہے؟"
"نہیں" ننھے کا جواب تھا۔
"تمہارے وحید بھیّا کی شادی ہو گئی ہے؟"
...نے پھر پوچھا۔
"نہیں" ننھے نے بڑی معصومیت سے
...ب دیا "ابھی ہمارے یہاں صرف ہمارے
...ی کی ہی شادی ہوئی ہے۔"
— ایس ایم رفیق حسن، ...

•

میری تین سالہ بھتیجی فرح ایک دن اپنی کتاب
...تی ہوئی بھائی جان کے پاس پہنچی اور
...میری کتاب کہاں ہے؟"
...جان نے کہا "بیٹا میری کتاب ..."

...ہوئے بھائی جان کے
پاس پہنچی تو بولی "ابی،
میری کھلونی کہاں ہے؟"
— سہیل انور، کلکتہ

•

میری ایک بہن جو آٹھویں جماعت میں پڑھتی
ہے ایک دن مجھ سے بولی "بھیّا ایک لڑکا مجھے
سکول جاتے وقت راستے میں تنگ کرتا ہے۔"
میں نے اُس سے کہا "اچھا میں اُسے جیل
بھجوا دوں گا۔"
میری سب سے چھوٹی بہن جو پاس ہی کھڑی
تھی اور چار سال کی ہے جھٹ سے بولی "بھیّا، دیدی
بھی مجھے بہت تنگ کرتی ہے اسے بھی جیل بھجوا دونا۔"
— ایم جمال الدین، بستی پور

•

ایک دن میں نے اپنے کچھ دوستوں کو رات
کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم سب
دوست ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے خوش گپیوں
میں مشغول تھے کہ دورانِ گفتگو میرا چھوٹا بھائی
پپّو (عمر پانچ سال)، جو شرارتی ہونے کے ساتھ ساتھ
حاضر جواب بھی ہے میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور
میرے ایک دوست سے نہایت فصاحت و
شیریں کلامی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی باتیں کرنے
کا سلیقہ دیکھ کر سب لوگ تعجب کرنے لگے۔ میرے
ایک دوست نے اُس کی ذہانت کی بہت تعریف
کی۔ دوستوں میں ایک دوست جو تا حال خاموش
بیٹھے تھے کہنے لگے "جو بچے لڑکپن میں ذہین ہوتے
ہیں وہ ... بڑے ہو کر کند ذہن ہو جاتے ہیں۔"
پپّو نے فوراً جواب دیا "جناب بچپن میں کافی
ذہین تھے یہی وجہ ہے کہ اب تک چپ رہے۔"
— اقبال احمد خاں مدنی، ...

حدیثِ غم

گذر رہے تھے کسی طرح زیست کے ایام
بہت ہی چاہا کہ ان کو گذار لوں یوں ہی
تصورات کے رنگیں فریب دے دے کر
گلِ اُمید کا چہرہ نکھار لوں یوں ہی

کسی سے اپنی تباہی کا کچھ گلہ نہ کروں
کسی کی آنکھ مرے غم سے اشک بار نہ ہو
خود اپنی آگ میں جل کر میں خاک ہو جاؤں
کسی کا دل مرے دُکھ کا شریکِ کار نہ ہو

نہ میں کسی سے کہوں اپنی بے بسی کی حدیث
نہ کوئی مجھ سے محبت کی داستان کہے
لبوں کو سی کے لگا دوں میں قفلِ خاموشی
کہ کوئی مجھ کو نہ پیرا ہلِ روح وجان کہے

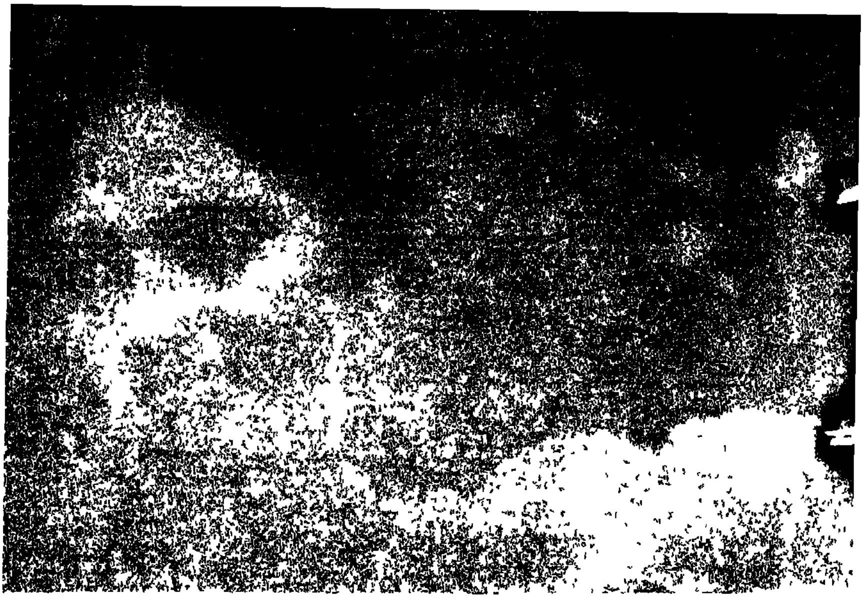
کھلے نہ راز مرے مرگِ ناگہانی کا
کسی کو میری تباہی کی داستاں نہ ملے
میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں ایسے ہی کھو جاؤں
مرے وجود کا دنیا کو کچھ نشاں نہ ملے

بہت ہی چاہا کہ ماضی کا آسرا لے کر
ترے خیال کی شیرینیوں میں کھو جاؤں
نہ فکرِ فردا کا اُبھرے مرے ذہن میں فتور
اور اپنے حال سے ہی بے نیاز ہو جاؤں

اِسی غرض سے میں دنیا کے ایک کونے میں
سب ہی کی نظروں سے خود کو چھپائے بیٹھا تھا
کہ ان اندھیروں میں مجھ کو کوئی دیکھ نہ سکے
اِسی لئے شمع اپنی بجھائے بیٹھا تھا

اِسی اُمید پہ میں اِک طویل مدت تک
غموں سے لڑتا رہا اور مر کے جیتا رہا
خود اپنے ہاتھوں سے اِس دل کے جام میں بھر کے
خود اپنے حسرت وارماں کا خون پیتا رہا

نگاہِ دُنیا تو ہر چند مجھ کو پا نہ سکی
تری نگاہوں سے خود کو مگر بچا نہ سکا
تو میرے دل میں پھر کچھ ایسے ہی چلی آئی
کہ تیرے قدموں کی آہٹ کو بھی میں پا نہ سکا



وہ تیرے ساتھ گذارے ہوئے حسیں لمحات
وہ میرے پیار کی دنیا مری وفا کی اساس
وہ لمحے جو مری تسکین کی ضمانت تھے
بھلا نہ پایا جنہیں آج تک مرا احساس

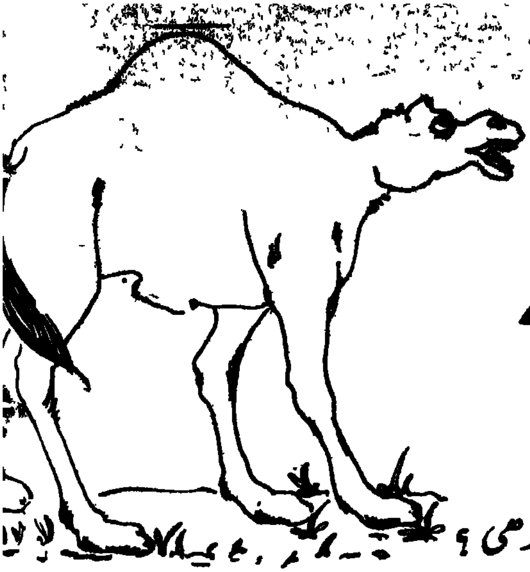
تجھے جو دیکھا تو مجھ کو وہ لمحے یاد آئے
جو تیرے پیار میں مَیں نے کبھی گذارے تھے
وہ جن میں اپنی وفاؤں کے رنگ بھر بھر کے
وہ جن سے صحنِ گلستاں کبھی سنوارے تھے

تری قسم نہ میں تیرے قریب ٹھہروں گا
کہ تیرے جسم کی گرمی نہ مجھ کو پگھلادے
پھر ایک بار وفاؤں کو میری ٹھکرا کے
تو عہدِ ماضی کی تاریخ کو نہ دوہرادے

ترے پیار کو کھو کر بہت اُداس تھا میں
ترے بغیر کہیں میرا جی نہ لگتا تھا
بہت دنوں سے میں دنیا کی تیرہ راہوں میں
تری تلاش میں ہی مارا مارا پھرتا تھا

چلا ہوں پھر میں محبت سے بدگماں ہو کر
تو تیری یاد اب آتی ہے مجھ کو سمجھانے
تجھے بھلا چھوڑ کر تیری ہی جستجوؤں میں
بگاڑے ہیں تجھے زندگی کے ویرانے

—— داعی نوگانوی



اُونٹ رے اُونٹ

تیری کون سی کل سیدھی؟

ہمارے دیس کے کس بچے نے اونٹ نہ دیکھا ہوگا۔ پھر بھی اس نرالے جانور کی بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ شاید تم بچوں کو سن کر تعجب ہو۔ اگر کسی ایسے ملک کا کوئی بچہ، جہاں اونٹ نہیں ہوتا، تم سے پوچھے کہ "اونٹ کیا جانور ہوتا ہے؟" تو تم تو شاید یہی کہو کہ یہ ایک بڑا لمبا سا جانور ہوتا ہے۔ بڑا ہی بدصورت۔ لمبی لمبی ٹانگیں اور بھَدی گردن تو اتنی لمبی ہوتی ہے کہ اگر کوئی کوٹھے پر بیٹھا ہو تو میاں اونٹ اپنی تھوتھنی اُس کے منہ میں بھڑا دیں۔ بس یہی تایا کچھ اور بھی۔ اچھا، اب ہماری بھی سنو۔

گردن کا ذکر ہوا ہے تو پہلے اُس کی گردن ہی کا حال سنو۔

کون اور اتنا بڑا جانور اپنی پچھلی ٹانگوں [illegible]

منہ بھڑا دے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں کہے "کیا کر رہے ہو جی۔ مانتے نہیں؟" اس وقت تم اس پر بیٹھے ہو تو کیا ڈر گئے؟ یہ بھی کچھ نہیں۔ اچھا، تو پھر اب سنو۔

کون اور جانور ہے جو اپنی گردن کو اپنی اگلی ٹانگوں کے اندر لے جاکر، دونوں پچھلی ٹانگوں کے بیچ سے نکال کر، کھوپڑی اُلٹی کئے ہوئے، پیچھے کوئی کھڑا ہو تو اُسے دیکھ سکے اور گویا کہے "کہئے جناب، آپ یہ کمال دکھا سکتے ہیں؟" تم تو 'مرغا بن کے' یہ کر لو اور اُن سے کہو "لیجئے جناب، کون سا ایسا کمال کیا تھا آپ نے۔" مگر یہاں تو ذکر جانوروں کا تھا۔ اونٹ صاحب یہ کرتب ضرور دکھا سکتے ہیں۔ اگر ان کا جی چاہے... کتنی لمبی گردن ہے۔ مگر مثل مشہور ہے جانے کہیں کہنے سے کھیت چرتا ہے!

ان کی [illegible]

اُن کا لمبا سا [illegible] صورت [illegible] ہوتا ہے۔ جس کے نیچے کے [illegible] میں ہوتے [illegible] [illegible]ے ہونٹ ہیں، جن سے رال بہہ رہی ہوگی۔ [ج]ب غصّے میں ہوتے تو لیے غبارے کی طرح [ا]ن لال زبان جبڑے کے ایک طرف نکلتی ہوئی دکھائی پڑی۔ اور غضب صورت ہو گئے۔ اگر کہیں منہ کھول دیا تو ان کے بڑے بڑے، میلے کچیلے، ٹیڑھے کبڑے دانت جھانکنے لگے۔ یہ [د]انت بڑے ڈر کی چیز ہیں۔ کسی کو اگر وہ اِن [دانت]وں سے پکڑ لیں تو پھر منہ کھولنا ہی بھول جائیں۔ [ب]ڑی مشکل سے چھوڑیں۔ وہ اگر کبھی منہ کھولیں تو دور ہی رہنا۔ کٹوانے بھی نہ ہوں تو منہ سے وہ بدبو آئے گی کہ تم بھی یاد کرو گے!

اُن کی ناک کے بڑے بڑے نتھنوں میں یہ خرابی تو ضرور ہے کہ آسانی سے نکیل بندھ [ج]اتی ہے۔ مگر اِن نتھنوں میں ایک اچھائی بھی ہے۔ ریگستان کی آندھیوں میں اتنی ریت اُڑتی ہے کہ جانوروں اور آدمیوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ [ج]ب ایسے جھکّڑ چلتے ہیں تو میاں اونٹ بڑے [ا]طمینان سے اپنے نتھنوں کو بھینچ لیتے ہیں جس [س]ے اُن کی ناک میں اتنی گرد نہیں جاتی جتنی کہ [د]وسرے جانوروں اور آدمیوں کی ناک میں۔ [تم ذ]را اپنے نتھنے پھلا تو لو گے مگر بھینچ نہ سکو گے۔ [ذ]را اکیلے میں کوشش کر کے دیکھو۔

ان نتھنوں کی ایک صفت اور یہ ہے کہ [میل]وں دور سے پانی سونگھ سکتے ہیں۔ ریگستان [میں] جہاں کوسوں پانی کا نام نہیں ہوتا، اونٹ کی [سو]نگھنے کی قوت نے کتنی ہی مرتبہ اپنے راستے [بھٹک]ے ہوئے سوار کو، جو پیاس سے مر رہا تھا، [پانی تک] پہنچا کر اُس کی جان بچائی۔ خود ان کو تو اگر کئی کئی دن تک [illegible] [illegible]ی بلا سے۔ کیوں کہ [illegible]

پیٹ ان کے پیٹ میں جو چار خانے ہوتے ہیں ان میں سے ایک کی تھیلیوں میں وہ خوب پانی بھر سکتے ہیں، جو کم از کم تین چار دن تک تو کام دے ہی جاتا ہے۔ جب زیادہ پیاس لگے تو بڑی کنجوسی سے اپنے پیٹ کے خزانے سے تھوڑا سا پانی غرغرا کر حلق تک لے آئے اور سوکھا گلا بھگو لیا۔ مگر اس غرغرانے میں گندے پانی کی وہ بُو نکلتی ہے کہ سوار کا دماغ سڑ جاتا ہے۔ بعض اونٹ تو سُنا ہے دس دن تک بنا پانی کے رہے مگر نہیں مرے۔

اچھا، خوب سوچ کے بتاؤ کہ کوئی چوپایہ ایسا بھی ہے جس کے کھُر بیچ سے دو حصّوں میں پھٹے ہوں اور وہ جگالی نہ کرتا ہو۔ سوچا؟ ہار گئے نا؟ کوئی بھی نہ ملا۔ ملتا کہاں سے۔ ہے بھی نہیں کوئی! اونٹ کے تلوے بیچ سے پھٹے ہوتے ہیں اور وہ بھی جگالی کرتا ہے۔

کبھی میاں اونٹ کو ڈکار لیتے بھی سنا؟ چار پیٹوں سے نکلی ہوئی کیسی گھن گرج ڈکار ہوتی ہے!

ان کی بڑی بڑی اُداس آنکھیں تو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ آنسو بھی بہہ رہے ہوں۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اونٹ کبھی کبھی خوب آنسو بہاتا ہے اس کو ٹھنڈی سانسیں بھرتے بھی کبھی سنا؟ بوجھ زیادہ ہونے پر یا مار کھانے کے بعد بے چارہ کبھی کبھی ٹھنڈی سانسیں لیتا ہے۔ اور کبھی تھرتھرانے تک لگتا ہے۔ کیا کرے بے چارہ۔ مجبور ہے۔ عقل نہیں جو سمجھے کہ کیوں پِٹا۔ اتنے ننھے سے سر میں کتنا سا بھیجا ہوگا؟ عقل کہاں سے آئے۔

ذرا اونٹ کے پیروں کو تو غور سے دیکھو۔ گول گول گدّے دار اور بیچ [illegible] میں پھٹے ہوئے ہیں۔ [illegible] [illegible] گدّی کے کھُر پھٹے ہوتے ہیں [illegible] ریگستان کی ریت [illegible] [illegible]

ہے۔ اِن سب باتوں سے تو اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہتے ہیں۔

ان لمبی لمبی ٹانگوں کی ایک صفت یہ ہے کہ یہاں سے اونٹ صاحب بڑے کس کے لات مارتے ہیں۔ ایک تو ٹانگیں ہی کیا کم لمبی ہیں۔ پھر لات مارنے میں ایسے اُستاد ہیں کہ جس ٹانگ سے چاہیں اور جدھر چاہیں لات ماردیں۔ گھوڑا تو پیچھے ہی کی طرف دولتی مارتا ہے۔ یا بہت بدمعاش ہوا تو سامنے بھی کبھی کبھی اپنا مُنہ کسی پر دے مارا۔ مگر اونٹ صاحب تو پہلو کی طرف بھی لات رسید کرسکتے ہیں۔ جیسے کہ اُن کی ٹانگیں ربڑ کی ہوں۔ جدھر چاہا کھینچ دیں۔ وہ غصے میں ہوں تو اُن کے آگے پیچھے، دائیں بائیں چھ چھ فٹ تک خطرہ ہی خطرہ ہے۔ بیل کی اگاڑی سے بچ لو اور گھوڑے کی پچھاڑی سے، مگر میاں اونٹ سے کوئی کہاں تک بچے۔

اُن کے دانتوں اور ٹانگوں سے تو بچوں کا دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ مگر اُن کے پاس دو ہتھیار اور بھی ہیں۔ ایک تو کبھی کبھی جب بہت غصے میں ہوتے تو اپنا سر اس کے سر پہ دے مارتے ہیں جس سے خفا ہوں۔ کوئی پہلوان بھی ہو تو اُس کی کھوپڑی پھٹ جائے۔ دوسرا ہلکا پھلکا ہتھیار ہے اُن کا تھوک وہ زور سے تھوک کا نشانہ لگاتے ہیں کہ جیسے کسی غلیل سے گولا نکلے۔ زیادہ چوٹ نہ بھی آئے تب بھی اُن کے تھوک میں وہ بدبو ہوتی ہے کہ بس دماغ ٹھکانے لگ جائے۔

ہاتھی اور اونٹ ہی ایسے لمبے تڑنگے جانور ہیں جن کو بٹھا کر اُن پر سواری کی جاتی ہے۔ ہاتھی تو خیر اتنا سمجھ دار جانور ہے کہ جلد سدھ جاتا ہے۔ چاہے اُس کو بٹھا کر اس پر بیٹھو، چاہے اُس کی دُم پکڑ کر اُس پر چڑھ جاؤ یا سیڑھی لگا کے۔ بعض ہاتھی تو اتنے شریف ہوتے ہیں کہ خود اپنی سونڈ سے تم کو اپنی پیٹھ پر پہنچا دیں۔ گھوڑے، بیل، گدھے بھی کتنی جلد سدھ جاتے ہیں اور پھر اُن کے مالکوں کو اُن سے روزمرہ کا کام لینے میں کون ایسی دقت ہوتی ہے؟ مگر مسٹر اونٹ پر جب کوئی سوار ہو رہا ہو یا بوجھا لاد رہا ہو تو تماشہ دیکھو۔ کتنی مشکل سے بیٹھیں گے۔ کیوں کہ وہ دونوں اگلے پیر دوہرا کر اپنے پیٹ کے نیچے کر لیتے ہیں۔ اب اگر تم اُن کے اگلے کسی پیر کے گھٹنے کو اپنے پیر سے دبا دو تو میاں اونٹ بے بس ہو جائیں۔ اُٹھ ہی نہ پائیں۔ کبھی کبھی اُن کے بیٹھنے کے بعد اُن کے گھٹنے کے جوڑ سے کچھ اوپر رسّی لپیٹ دی جاتی ہے، جس سے وہ مجبوراً بیٹھے بوجھا لدوایا کرتے ہیں۔

تم نے جو اونٹ دیکھے ہوں گے وہ کتنے بیسر پیسر چلتے ہیں۔ مگر سب اونٹ ایسے مریل نہیں ہوتے۔ گھوڑوں میں بھی تو مریل ٹٹو ہوتے ہیں اور تیز گھوڑے بھی۔ اسی طرح اونٹوں میں بھی کچھ تو مال گاڑی کی طرح بوجھا لادنے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ سات آٹھ من تک بوجھ

پلاسٹک کا میدان

امریکہ کی ایک پلاسٹک کمپنی نے $\frac{9}{16}$ اِنچ موٹائی کی پلاسٹک کی ایک ایسی تہ تیار کی ہے جسے کہیں بھی بچھا کر اور تھوڑا پانی چھڑک کر گھاس کا میدان تیار کیا جا سکتا ہے۔

امریکہ کے ٹیکساس شہر کے نزدیک [illegible]

ادھر ایک دن میں [illegible] پچاس میل تک بھی چلے جاتے ہیں۔ مگر کچھ اونٹ بہت تیز چال کے ہوتے ہیں اُن کو سانڈنیاں کہتے ہیں۔ جو بیس پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے کچھ دور تک دوڑ سکتی ہیں اور دن بھر میں پچاس ساٹھ میل پورے کر لینا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔

پُرانے زمانے میں جب ڈاک خانے نہ تھے تو کہیں کہیں سانڈنی سوار ہی ڈاک لے جاتے تھے۔ سانڈنیوں پر سامان نہیں لادا جاتا۔ کہیں گھوڑ دوڑ کے گھوڑے کو یکّہ میں جوتا جاتا ہے؟ اب بھی راجپوتانہ میں سانڈنی سواروں کا ایک فوجی دستہ ہے۔ کیوں کہ راجپوتانہ میں ریگستان ہے اور وہاں کوئی اور سواری اتنا کام نہیں دے سکتی جتنا کہ غریب اونٹ۔

اونٹ کی چال کو ذرا خوب غور سے دیکھو اور پھر گھوڑے یا کسی اور چوپائے کی۔ دونوں کی چال میں کتنا فرق ہے۔

قریب قریب سب ہی چوپائے اس طرح چلتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنا اگلا بایاں پیر پہلے اٹھایا تو پھر اگلا داہنا پیر اُٹھائیں گے۔ اس کے بعد پچھلا بایاں اور پچھلا داہنا۔ تم بھی جب چھوٹے سے تھے اور گھٹنوں چلتے تھے تو یوں ہی ہاتھ پیر اُٹھاتے تھے۔ پہلے بایاں ہاتھ پھر داہنا ہاتھ۔ اس کے بعد بایاں اور پھر داہنا پیر۔ جب تم نے کھڑا ہونا سیکھ لیا اور چلنے لگے تب بھی تمہارے ہاتھ پاؤں چوپایوں کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ مگر اونٹ صاحب کی چال کو کبھی غور سے دیکھا؟ اُن کی تو ہر چیز نرالی ہے۔ چال بھی سب سے الگ ہے۔ اگر پہلے اگلا بایاں پیر اُٹھایا تو پھر پچھلا بایاں پیر اٹھائیں گے۔ اس کے بعد اگلا داہنا اور پچھلا داہنا یعنی وہ لوگ اُن کے ایک طرف کے [illegible] پیر اُٹھتے ہیں اور پھر دوسری طرف کے۔ یہ نہیں کہ اور چوپایوں کی طرح ایک کے بعد ایک اگلے اور پھر پچھلے۔ اونٹ کی اِس نرالی چال سے اس کا سوار خوب جھٹکے کھاتا ہوا جاتا ہے۔ آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ ہم تم اونٹ پر تھوڑی دیر بھی بیٹھیں تو ہڈی پسلی ڈھیلی ہو جائے۔ باز آئے ایسی سواری سے۔ اس سے تو پیدل چلنا اچھا۔

ہم جب چھوٹے سے تھے تو سنا تھا کہ اونٹ اور گدھا تیرنا نہیں جانتے۔ باقی سب جانور پیدا ہوتے ہی تیر سکتے ہیں۔ اس بات میں تو اونٹ اور گدھے کو بیچ بیچ بدنام کیا گیا ہے۔ گدھا تو خیر گدھا ہی ہے مگر وقت پڑنے پر وہ بھی تیر سکتا ہے اور اونٹ بھی۔ یہ ضرور ہے کہ اونٹ ٹھہرا ریگستان کا جانور۔ اتنا مضبوط تیرنے والا جانور وہ نہیں جیسے ہاتھی یا گھوڑا ہوتا ہے۔ اس بے چارے کو تو مشق کرنے کا موقع کم ہی [illegible] کتنی ہی ندیاں اور نالے تو اس کے [illegible] تک ہوں گے۔ [illegible]

[illegible]

وفادار بندر

جاپان کے ایک چڑیا گھر کے پنجرے سے جب ۲۴ بندر بھاگ نکلے تو انہیں پکڑ کر پھر پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر جو وفادار بندر بھاگے نہیں تھے انہوں نے اُن بھگوڑے بندروں کو اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ سب وفادار بندروں نے مل کر بھگوڑے بندروں کو پکڑ پکڑ کر کاٹنا شروع کر دیا۔ تب ہی افسروں نے ایک ڈاکٹر بلا کر تمام بندروں کے دانت نکلوا دیئے۔

[illegible] بات ضرور ہے کہ میاں اونٹ [illegible] ناروں کو تو چھوڑ کیچڑ تک سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس طرح تمہارا کِرِپ سول جوتا کیچڑ میں پھسلتا ہے اسی طرح اُن کے گول گول گدّے دار پیر جو ریگستان میں کتنے ہی کام کے ہوں پھسلن میں اُن کو ایسی پٹخنی کِھلا سکتے ہیں کہ پھر تو اُن کا اُٹھنا ہی مشکل ہو۔ اُن کی لمبی لمبی لوچ دار ٹانگیں جو لات مارنے میں داہنے اور بائیں بھی کھنچ سکتی ہیں کیچڑ میں کہیں باہر کی طرف پھسل گئیں اور یہ چاروں ٹانگیں پھیلائے، بھَد سے۔ پیٹ کے بل زمین پر پھیل گئے تو ایسی چوٹ آئے گی کہ ان کی دُرگت ہی بن جائے گی۔

مسٹر اونٹ کے کُوبڑ کو تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ اِس سے تو یہ حضرت اور بھی اچھے لگتے ہیں! کچھ ملکوں کے اونٹوں کے تو دو دو کُوبڑ ہوتے ہیں مگر ہمارے دیس کے اونٹوں نے اللہ میاں سے کہا ہوگا کہ بس ایک ہی کافی ہے۔ اِس کُوبڑ پر جتنا جی چاہے ہنس لو مگر ہے یہ اُن کے کام کی چیز۔ یہ سمجھ لو کہ اُن کی پیٹھ پر یہ ایک ناشتہ دان بندھا ہے۔ اگر کئی کئی دن فاقہ بھی ہو تو کیا پرواہ۔ ایسے ہی وقت میں تو یہ چربی کی گٹھری گھل گھل کر اُن کو قوت پہنچا کر اُن کی جان بچاتی ہے۔ اب ذرا غور کرنا۔ جس اونٹ کا کُوبڑ چھوٹا یا ڈھیلا ڈھالا، ایک طرف کو لٹکا ہو تو سمجھ لینا کہ اس کا مالک اس کو پیٹ بھر کے نہیں کِھلاتا۔

شاید یہ سمجھ کر اونٹ صاحب نے اللہ میاں سے کُوبڑ مانگا ہو کہ پھر کوئی اُن کی پیٹھ پر کیسے بیٹھے گا۔ مگر حضرتِ انسان بھی بڑے ہی بلا ہیں۔ اس پیٹھ پر بیٹھنے کے لئے ایسی کاٹھیاں بنا لیں کہ اُن کے کُوبڑ پر پہنا دی جائیں اور دونوں پہلوؤں میں لوگ بیٹھ سکیں۔ اِن کو 'کجاوہ' یا 'محمل' کہتے ہیں۔ ایسی کاٹھیوں میں خرابی یہ ہے کہ [illegible] دونوں طرف برابر [illegible] جائے۔ [illegible] کی طرف [illegible]

[illegible] کی طرف [illegible] جائے گی اور [illegible] ہیں جو [illegible] کی [illegible] سے [illegible] جائے گا۔

تم کسی موٹے کو اس طرح گرتے دیکھو تو ہنسی کے مارے لوٹ جاؤ۔ مگر نہ تو وہ منکو، جو گر پا کر ایک کو کٹے پہ سے گر سے ہیں، تم ابھی ہنسیں گے اور نہ اونٹ صاحب کے اُداس چہرے پر کوئی خوشی کی لہر دوڑے گی۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر اُن کی شامت یوں آئے گی کہ ہلکی طرف اگر کچھ سامان لادنے کو نہیں ہوا تو اونٹ والا کچھ پتھر ہی رکھ دے گا کہ دونوں طرف بوجھ برابر ہو جائے۔ کچھ وزن اور بڑھ ہی جائے گا۔ خیر شش ہو گر کیا کریں؟ یہ کاٹھیاں تو اور مصیبت ہو گئیں۔

اِس ریل، موٹر اور ہوائی جہاز کے زمانہ کے تم بچّوں نے اونٹوں کا قافلہ جسے 'کارواں' کہتے ہیں بھلا کیا دیکھا ہوگا۔ یا شاید کسی پکچر میں دیکھا بھی ہو۔ اب بھی ایسے ملک ہیں جہاں لوگ اونٹوں کی ایک ریل سی بنا کر دور دور تک ریگستانوں میں سفر کرتے ہیں۔ سب سے آگے والے اونٹ کو انجن مان لو۔ اس کے بعد کے سب اونٹوں کی نکیلیں اپنے آگے والے



[illegible] کو آ کے والا یہ تم نے سب سے چھوٹی لکیر کھینچی [illegible] تم خود کسی ٹیکسی ڈرائیو کے لڑکے ہو؟

ساتھی کی [illegible] ہیں۔ اور پیاڑوں
کی ریل [illegible] دے چھوٹے
آہستہ آہستہ لے [illegible] ایسے راستوں پر
طے کرتی ہے جہاں نہ تمہاری ریل کام دے نہ موٹر۔
اونٹوں کو تیز چلانا کچھ آسان نہیں۔ ہاں ایک
ترکیب ہے اگر وہ تھک بھی جائیں تو قدم بڑھاتے
چلیں گے۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ ان کو گانا سُنایا
جائے۔ میاں اونٹ کو کسی اور چیز سے دل چسپی
ہو یا نہ ہو مگر گانے کا اثر اُن پر کافی ہوتا ہے۔
جب ہی تو ایسے قافلوں میں اُن اونٹ سواروں
کی بڑی قدر ہوتی ہے جو اونٹ کی پسند کے
مطابق گانا جانتے ہوں۔ ان گانوں کو سُن کر اونٹ
صاحب کچھ تو ضرور اپنی تھکن بھول جاتے ہیں۔
اور تیز تیز قدم بڑھانے لگتے ہیں۔ گانے کا اثر اکثر
اور جانوروں پر بھی ہوتا ہے اور آدمیوں پر تو
خیر ہوتا ہی ہے۔ جب ہی تو جوش دلانے کے
لئے فوجوں میں بینڈ ہوتے ہیں۔ تم بھی تو سکول
سے آکر ریڈیو پر اپنی پسند کے فلمی گانے
سنتے ہو اور دن بھر کی تکان بھول جاتے ہو۔ مگر
میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم بھی اونٹ ہو
ور صرف [illegible] کی کسر ہے۔

تم نے اونٹوں کا کارواں نہ بھی دیکھا ہو
مگر اونٹ گاڑی تو شاید دیکھی ہی ہوگی؟ یہ
ایک بڑے سے پنجرے کی طرح جس میں چار
پہیے لگا دیئے گئے ہوں۔ اگلے پہیے بہت نیچے
[illegible]تے ہیں اور پچھلے اُن سے بہت بڑے۔ اس
[illegible]رے میں نیچے اوپر دو دو خانے ہیں، ان کو فرسٹ
[illegible]س اور سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ سمجھ لو۔ آگے
[illegible]پر کے حصے کے سامنے ڈرائیور بیٹھتا ہے۔
[illegible]منے میاں اونٹ جوت دیئے گئے اور گئے
[illegible] انجن کا کام دینے۔ اب تو لاریوں نے اِن
[illegible]نٹ گاڑیوں کا خاتمہ کر دیا ہے مگر اب بھی اُن
[illegible]ستوں پر اِکا دُکا دکھائی دے جاتی ہیں جہاں
[illegible] نہیں چل سکتیں۔

ہم نے تو اونٹ گاڑی رات ہی کو چلتے
دیکھی تھی۔ دس بارہ مسافر لدے تھے۔ وہ سب
کے سب مع ڈرائیور کے مزے سے خراٹے لے
رہے تھے۔ میاں اونٹ بھی کچھ جاگتے کچھ سوتے
رینگ رہے تھے۔ راستہ نپا تلا تھا۔ یہ بھی ہوتا
تھا کہ کہیں کوئی نیم کا پیڑ ملا تو اونٹ صاحب نے
دو چار منہ مار دیئے۔ زیادہ دیر رُکے تو ڈرائیور
جاگ اُٹھا اور ڈنڈا اپڑا۔ لگے اونٹ صاحب وہی
چرخ چوں کرتی گاڑی کو گھسیٹنے۔

یہ مثل تو تم نے سُنی ہی ہوگی "جیسی روح
ویسے فرشتے"، پھر اونٹ جیسا جانور بدمزاج نہ
ہوتا تو کیا ہوتا؟ وہ تو اوّل درجے کے کوڑھ مغز
ٹھہرے۔ بڑی مشکل سے کوئی بات اُن کی سمجھ
میں آتی ہے۔ کبھی اُن کو خوش یا چونچال نہ پاؤ گے۔
اُن کو کچھ بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ ہر وقت منہ لٹکائے
رہتے ہیں۔ جیسے کہ کچھ بڑی دور کی سوچ رہے
ہوں۔ آخر ان کو فکر کا ہے کی؟ کھانے پینے کی
فکر تو اور جانوروں سے کم ہی ہونی چاہئے۔ کچھ نہ
ملے تو نیم کی کڑوی پتیاں کہیں گئی نہیں۔ وہ بھی
نہ سہی تو ببول کے کانٹے تو ہیں۔

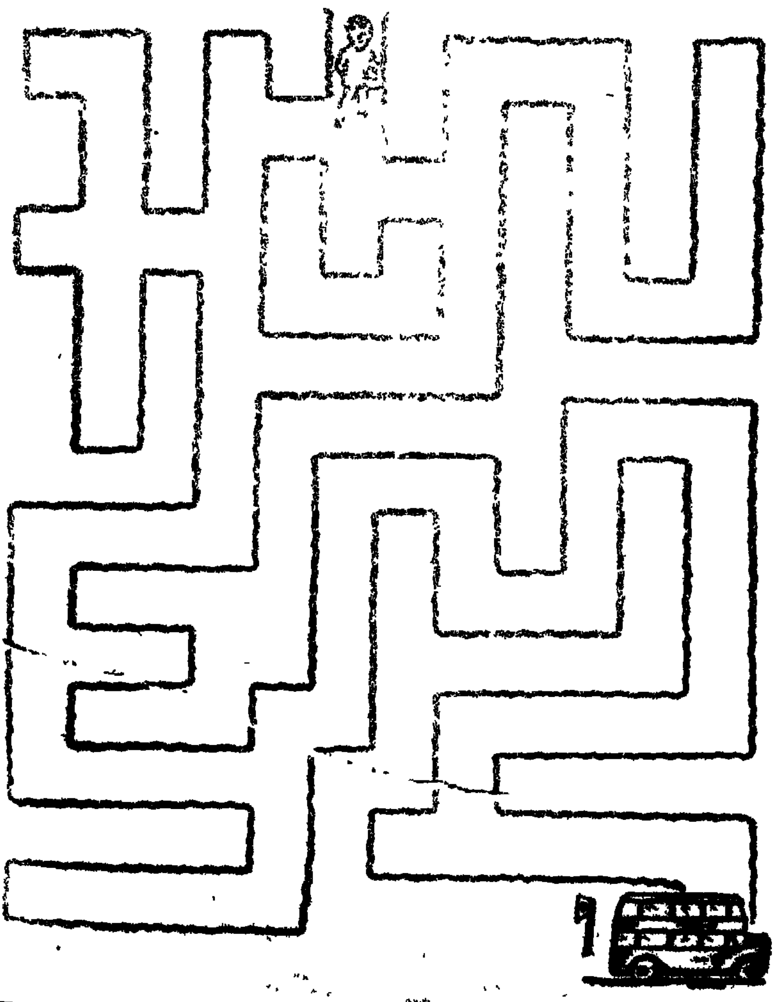
یہ کسی سے پریم نہیں کرتے اور کیوں کریں؟
ان بے چاروں سے کون دوستی کرتا ہے؟
کتے، بلی اِن سے اچھے کہ ان کے مالک ان کو
چمکارتے اور سہلاتے تو ہیں۔ ہاتھی اور اُس
کے مہاوت میں کتنی دوستی ہے، گھوڑے کو
اُس کا سوار برابر شاباشی دیا کرتا ہے۔ کبھی کسی
اونٹ والے کو بھی دیکھا کہ اپنے اونٹ کو تھپکے
یا چمکارے؟ اِن بے چاروں کی قسمت میں تو وہی
[illegible] اور ڈنڈے ہیں۔

"شتر کینہ" کا لفظ بنا کر آدمیوں نے اونٹ کو
[illegible] بدنام ضرور کیا ہے۔ اس لفظ کا [illegible]
[illegible] کے ساتھ اگر کوئی زیادتی کرے [illegible]
[illegible] کبھی معاف نہ کرے [illegible]
[illegible] اونٹ [illegible]

غصہ ور ہے اور اپنا کام سارے ہاتھ سے
کو سونا ہوتا ہے۔ کوئی کام دل لگا کے نہیں
کرتا۔ کاہل بھی ہے۔ بیوقوف بھی۔ یہ بھی ٹھیک
ہے کہ اگر کبھی کوئی اس کے ساتھ بہت زیادتی
کرے تو اس سے بدلہ لینے کی سوچے اور تب

[illegible]
کر اُس نے اگر بدلے بھی لیا تو پھر بھول
جاتا ہے۔ دل میں بات نہیں رکھتا۔ بہت
باتیں تو اس کو یاد ہی نہیں رہتیں۔ ہاں
تک خفا ہو تو اس سے دور ہی رہنا ٹھیک

یہ بچہ راستہ بھول گیا ہے۔ کیا آپ اسے بس سٹاپ کا راستہ بتا سکتے ہیں؟







پ
یکٹریس
نا چاہتی ہیں ؟

لڑکیوں کا خیال ہے کہ ملک گیر شہرت ، ...ں بے انتہا دولت ، آرام و آسائش اور ...ن کی زندگی فلموں میں کام کرنے والے ...ں ہی کو حاصل ہوتی ہے ۔ کچھ لوگوں کو تو ایسی زندگی حاصل ہو جاتی ہے لیکن بہت فلمی دنیا کے اداکار اپنی ساری زندگی کوشش ... کے باوجود بھی انہیں حاصل نہیں کر پاتے ۔ ... فلمی دنیا کی کشش اس قدر زیادہ ہوتی ... وجوان لڑکے لڑکیاں اداکار بننے کے ...ں مند رہتے ہیں ۔ فلمی میگزین اور اخبارات ... وہ اُن کا دل پڑھائی لکھائی میں نہیں لگتا ۔ فلمی اداکاروں کے پیچھے وہ دیوانے ... پیدا اور موقع ملتے ہی بمبئی کے لئے ...ے ہوتے ہیں ۔

... اداکار بننے کے قابل بھی یا نہیں ، ... ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنا چہرہ ... اچھا کاری کی طرح اچھی اداکاری کر لیتی ہوں یا وجینتی مالا کی طرح اچھا رقص کر سکتی ہوں یا خود کو سائرہ بانو سے بھی زیادہ خوبصورت سمجھتی ہوں لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے بھی یہ ضروری نہیں کہ آپ جیسے ہی بمبئی پہنچیں فلمی پروڈیوسر آپ کے سامنے کنٹریکٹ لئے آ پہنچے ۔

ابھی تک فلمی دنیا میں قدم قدم پر مختلف خطرے ہیں ۔ خاص طور سے لڑکیوں کے لئے ۔ فلم میں کام کرنے کی خواہش مند لڑکیوں کو کامیابی کا یقین دلا کر کون کس وقت اپنا مطلب نکال کر رفو چکر ہو جائے اس بات کا پتہ تب ہی چلتا ہے جب ایسا ہو جاتا ہے ۔ وعدے پر وعدے کئے جاتے ہیں ، جن کے بدلے میں اکثر لڑکیوں کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ۔ لڑکی بمبئی پہنچی نہیں کہ سبز باغ دکھانے والے لوگ اُس کے پیچھے لگ گئے ۔

اس کے بعد بھی اگر فلموں میں کام مل جائے

تو یہ ضروری نہیں کہ آپ ہیروئن ہی بن جائیں گی
سال تک آپ اپنی زندگی کے سنہرے دن ایکسٹرا کام کرنے والی لڑکیوں کے طور پر بسر کریں گی. اور بعد میں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دی جائیں گی اور مان لیجئے کہ آپ ہیروئن بن بھی گئیں، آپ کا نام بھی خوب ہو گیا اور آمدنی بھی ہونے لگی، آپ ایک شاندار کوٹھی میں رہنے لگیں اور شاندار موٹر کاروں میں گھومنے لگیں، لیکن کتنے دن ؟ آپ کے دو چار فلم باکس آفس پر ناکام ہوئے نہیں کہ فلمی پروڈیوسر آپ کو پوچھیں گے بھی نہیں. اپنی شان و شوکت کو بنائے رکھنے کے لئے آپ کو پیسے کی ہمیشہ ضرورت رہے گی جس کے وسیلے تب ختم ہو جائیں گے.

بمبئی میں اور خاص طور سے فلم لائن میں لوگ پیسے ہی کے دوست ہوتے ہیں. پیسے کی کمی میں یہی دوست سب سے زیادہ آپ کا مذاق اُڑائیں گے اور آپ کا سکھ چین آندھی میں تنکے کی مانند اُڑ جائے گا.

فلمی دنیا میں لڑکیوں کی صورت اور جوانی کی جتنی قدر ہوتی ہے اُسے بچائے رکھنا بھی اُتنا ہی مشکل ہے. وہاں مست بھنوروں کی کمی نہیں. آپ ان سے جتنا ہی بچ کر رہنا چاہیں گی، اُتنا ہی آپ کو کام کم ملے گا. فلمی ایکٹریس بننے کے لئے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے

چاہیے کسی بھی روپ سے ہو

ابھی تک فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کی [illegible] بہت ہے جنہیں فن سے کم محبت ہے اور [illegible] و عورت سے زیادہ. شروع شروع میں جب کوئی لڑکی فلم لائن میں جانا چاہتی ہے تو [illegible] واسطہ ایسے ہی لوگوں سے زیادہ پڑتا ہے [illegible] ایسی حالت میں کوئی اپنے آپ کو کب تک [illegible] بچا کر رکھ سکتا ہے.

فلمی دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں لیکن [illegible] کی تو کوئی ضمانت نہیں کہ آپ ہمیشہ اُن ہی [illegible] سائے میں محفوظ رہیں گی. اگر آپ کا یہ خیال [illegible] کہ آپ اپنے شوہر کی حفاظت میں رہ کر [illegible] میں کام کر سکتی ہیں تو اس خیال کو فوراً [illegible] ذہن سے نکال دیجئے. جن ایکٹریسوں کے شو[illegible] بھی فلم میں کام کرتے ہیں اُن کی بات دو[illegible] ہے. نتیجتاً آپ کی گھریلو زندگی اتنی خوش [illegible] نہیں رہ سکتی جتنی کہ آپ چاہتی ہیں. شاید [illegible] سے پہلے آپ کے شوہر ہی غیر مطمئن ہو جا[illegible]

اگر آپ کو اداکاری، رقص یا سنگیت [illegible] شوق ہے تو اچھا یہی ہوگا کہ آپ مقامی ڈرا[illegible] کلبوں، رقص و سنگیت اجتماعوں وغیرہ میں حص[illegible] کر اس شوق کو پورا کریں. فلم لائن میں ہی [illegible] جانا چاہتی ہیں تو ہر طرح کا خطرہ اُٹھا[illegible] کے لئے تیار رہیئے.

قانون

ماسکو کی مقامی حکومت نے غنڈوں کو سزا دینے کے لئے ایک قانون نافذ کیا ہے کہ گرفتار شدہ غنڈے ایک دوسرے کے بال بنائیں. خواہ اُن کا کوئی بھی ہیر سٹائل ہو. وجہ بتاتے ہوئے روسی فیڈریشن کے عوامی رہنمائی کے وزیر نے کہا کہ غنڈوں کے لئے نائیوں کی تعداد نہیں بڑھائی جا سکتی. اور انہیں ایک دوسرے کے بال بنانے ہی پڑیں گے.

وصیت

دنیا میں سب سے زیادہ عجیب و غریب وصیت ایک ملاح کی پیٹھ پر گودی گئی تھی اور دستخط اُس کی ران پر کئے گئے تھے.
یہ وصیت آئینی طور پر صحیح مانی گئی تھی.

آخر ایسا کیوں؟

ہمارے ملک میں مختلف کھیلوں کو فروغ دینے پر بڑا زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن ں کا مقام ہے کہ ملک کی ایک اہم صنعت ھیلوں کے سامان کی صنعت کی طرف بالکل نہیں دی جا رہی۔

ہمارے ملک میں تیار شدہ کھیلوں کا سامان جگہ بہترین قسم کا تصور کیا جاتا ہے۔ ہماری ید ضرورتوں کے علاوہ غیر ممالک میں بھی اس بہت زیادہ کھپت ہے۔ گو ہر سال اِس ت کی برآمد بڑھتی جا رہی ہے، پھر بھی اس کے ہ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس رقی کے لئے کوئی واضح قدم اٹھانے کی ی سرکار نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔

کھیلوں کا ہندوستانی سامان غیر ممالک بازاروں میں کسی بھی ملک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ال لاکھوں روپے کی مالیت کے آرڈر غیر ممالک آتے ہیں۔ لیکن ہمارے صنعت سازوں کو ے محدود وسائل کے اندر کام کرنا پڑتا ہے۔ ں کسی قسم کی سہولتیں اور رعایتیں میسّر نہیں ۔ سرکار کی طرف سے کوئی امدادی سکیم نہیں ۔ ایسی حالت میں ہمارے کارخانہ دار اس ت میں زیادہ سرمایہ لگانے کو تیار نہیں ہیں۔ میں بہت سے آرڈر رد ہو جاتے ہیں اور ے ملک کو غیر ملکی زرِ مبادلہ کا نقصان اٹھانا ا ہے۔

اس صنعت کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ زمانے کی کروٹوں کے ساتھ اس شعبے میں بھی مانگ اور پسند بدلتی رہتی ہے لیکن بھارت میں ریسرچ کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہونے سے مناسب ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ لہٰذا صنعت ساز بھی مال میں جدید اصلاح کرنے سے قاصر ہیں۔ دوسرے یہ صنعت منظّم بھی نہیں ہے تاکہ سرکار پر کسی قسم کا دباؤ ڈال سکے۔ سامان بھی بڑی محدود مقدار میں تیار ہوتا ہے، جس سے بڑے آرڈروں پر مال سپلائی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی مال برآمد کرنے والوں کی تسلی کا کوئی انتظام ہے۔ دیر تک پڑے رہنے سے کبھی کچھ آرڈر رد ہو جاتے ہیں اور آرڈر دہندہ کو کہیں اور انتظام کرنا پڑتا ہے۔

جس قدر ملک میں کھیل فروغ پا رہے ہیں ویسے ہی اس صنعت کی گھریلو مانگ بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ گو ملک میں اعلیٰ قسم کا سامان تیار ہوتا ہے پھر بھی نوابی ذہنیت کے لوگ غیر ملکی مال کو پسند کرنا باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی اس صنعت کو نقصان پہنچتا ہے۔

گذشتہ آٹھ سالوں کے دوران اِس صنعت کی برآمدگی میں ہر سال مقابلتاً ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۶۰ میں ۷۲ لاکھ روپے اور ۱۹۶۱ میں اس سے دُگنی مالیت کا سامان برآمد کیا گیا۔ ۱۹۶۵ میں یہ رقم ۲۷ لاکھ تک پہنچ گئی۔ گذشتہ برس ۸۹ لاکھ روپے کا مال برآمد کیا گیا لیکن روپے

کی قیمت گِر جانے سے ۱۹۶۵ کی نسبت ۱۰ لاکھ روپے کا خسارہ رہا۔

ادھر درآمد کنندہ ملکوں کی بھی تعداد بڑھی ہے۔ قریباً ۷۰ ممالک میں ہمارا کھیلوں کا سامان جاتا ہے۔ ان میں مغربی جرمنی، برطانیہ، آسٹریلیا، ملیشیا، سنگاپور، ویسٹ انڈیز، کینیا، روس اور چیکوسلوواکیہ قابلِ ذکر ہیں۔

ہم جو سامان برآمد کرتے ہیں اُس میں فٹ بال کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دوسری مختلف قسم کی گیندیں بھی غیر ممالک میں مقبول ہیں۔ صرف فٹ بال سے سالانہ ۲۴ لاکھ روپے کا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ کپ اور ٹرافیاں ۱۷ لاکھ روپے کی مالیت کی برآمد کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ برآمد ہونے والا دوسرا سامان ہے: کرکٹ اور ہاکی گیندیں، ہاکی اور کرکٹ کے بلّے، بیڈ منٹن، نیٹ (جال)، ہوزری کا سامان اور کیرم بورڈ وغیرہ۔ مچھلی پکڑنے کا سامان اور گولف وغیرہ بھی برآمد کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے سیالکوٹ (پاکستان) اس صنعت کا مرکز تھا۔ اب جالندھر، لدھیانہ (پنجاب) آگرہ اور میرٹھ (یو۔پی) اس کے خاص مرکز ہیں۔ بمبئی اور کلکتہ میں بھی بھاری مقدار میں یہ سامان تیار ہوتا ہے۔ دِلّی میں بھی تھوڑا بہت سامان بنتا ہے۔

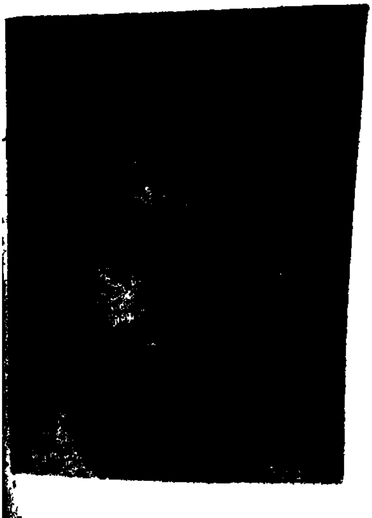
چوں کہ ابھی تک اس صنعت کی طرف ہماری سرکار نے لاپرواہی کا رُخ رکھا ہے اور اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا لہٰذا یہ صنعت مناسب ترقی نہیں کر سکی۔ صنعت کئی جگہوں سے بکھری ہونے سے منظم بھی نہیں ہے۔ ریسرچ کی عدم موجودگی سے اسے اور بھی دھکا پہنچ رہا ہے [illegible] تقسیم سے پہلے [illegible]

حنیف محمد

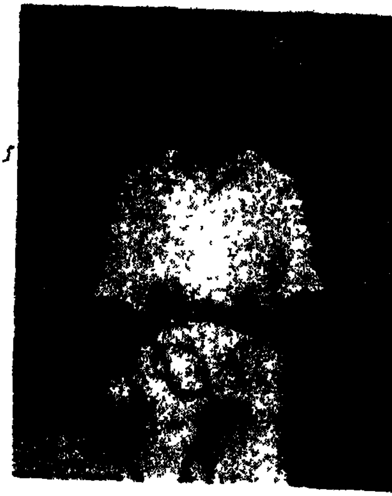
ہر ملک نے کرکٹ کے میدان میں ا[illegible] کھلاڑی پیدا کئے ہیں جو دوسروں کے لئے ق[illegible] تقلید ہوتے ہیں۔ کچھ کھلاڑیوں نے میچ جیت[illegible] کر اپنی ٹیموں کی شان بڑھائی اور اپنے ملک[illegible] نام روشن کیا اور کچھ نے ریکارڈ قائم کئے۔

ایک قائم شدہ ریکارڈ کو توڑنے سے ز[illegible] قابلِ فخر بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ حنیف [illegible] اسی صف کا کھلاڑی ہے۔ پاکستان نے آ[illegible] تک جتنے بھی کھلاڑی پیدا کئے ہیں حنیف [illegible] ان میں سب سے اونچا مقام حاصل ہے ا[illegible] کا ان چند کھلاڑیوں میں شمار ہوتا ہے جو بہت [illegible] عمری میں ہی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پاکستان کے اس عظیم کھلاڑی کو چند ر[illegible] پیشتر لین ہٹن جیسے نامور کھلاڑی کے ہاتھوں قا[illegible] شدہ ریکارڈ توڑنے کا فخر حاصل ہے۔ لیکن حنیف کا یہ ریکارڈ چند ہفتے ہی قائم رہا جب کہ گار[illegible] سوبرز (۳۶۵ بغیر آؤٹ ہوئے) نے ایک ن[illegible]



حنیف محمد



ہنومنت سنگھ

ریکارڈ قائم کر دیا۔ پچ پچ سو برز کا یہ ریکارڈ آج تک نہیں توڑا جا سکا۔

۳۲ سالہ حنیف کا بھائی بھی ایک مشہور کھلاڑی ہے۔ اُس کا نام مشتاق محمد ہے۔ حنیف آج کل انگلینڈ میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کر رہا ہے۔ اس نوجوان ٹیم سے کھیل کے قدر دانوں کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ پاکستانی کھلاڑی، اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم مقابلہ کرنے میں ضرور تیز ہیں۔ حنیف ایک قابل کپتان ہے۔

ہنومنت سنگھ

حال ہی میں بھارت نے جو پہلا ٹیسٹ میچ انگلینڈ کے مقابلے پر ہارا، اس کی دوسری پاری میں بھارت کے بلے بازوں کے کھیل میں ایک باعمل جوش دکھائی دیا۔

انگلینڈ نے اپنی پہلی پاری میں ۵۵۰ رن بنا کر چار وکٹوں پر کھیل ختم کر دیا۔ اِدھر بھارتی ٹیم پہلی پاری میں صرف ۱۶۴ رن بنا کر ساری کی ساری آؤٹ ہو گئی۔ معاملہ دگرگوں ہوتا نظر آ رہا تھا — لیکن دوسری پاری میں بھارتی بلے بازوں کے اعلیٰ کھیل نے میچ کے ان شوقینوں کو واپس آنے پر مجبور کر دیا جو اپنے ٹکٹ پھاڑ کر میدان سے چلے گئے تھے۔

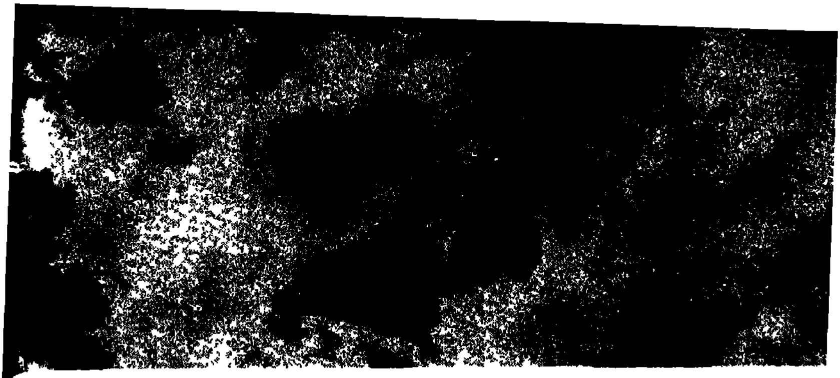
پہلی پاری کی کمی پوری کرنے کا فخر پٹودی اور ہنومنت سنگھ کی جوڑی کو حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنی شرکت میں پانچویں وکٹ پر ۱۴۴ رن بنائے۔ نواب پٹودی نے کل ۱۲۹ اور ہنومنت سنگھ نے کل ۷۳ رن بنائے۔

ہنومنت کا کھیل ٹھوس اور جارحانہ رہا، حفاظتی نہیں۔ جب سے اس کھلاڑی نے ٹیسٹ میچوں میں حصہ لینا شروع کیا ہے آج تک مسلسل ترقی کرتا آ رہا ہے۔ اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اُس نے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں انگلینڈ کے خلاف سنچری (۱۰۰ رن) بنائی تھی۔ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے خلاف وہ اپنے جوہر دکھا چکا ہے۔ رانجی ٹرافی میں بھی وہ خوب رن بناتا رہا ہے۔

ہنومنت ایک باحوصلہ اور قابل اعتماد کھلاڑی ہے۔ ملک کو اس سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں مگر یہ خواب اسی وقت شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے جب ہنومنت سنگھ کھیل کی سیاسیات کا شکار نہ بنے •

فرماں برداری

امریکہ کے سابق صدر مسٹر واشنگٹن نے ایک بار کانگریس کے کچھ ممبروں کو دعوت دی۔ وہ لوگ دعوت میں کچھ دیر سے پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ صدر نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے دیر سے آنے کے سبب صدر سے معافی مانگی۔ صدر نے فرمایا "میرا باورچی مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کرتا کہ مہمان آئے یا نہیں، وہ تو صرف ایک بات پوچھتا ہے کہ کھانے کا وقت ہوا یا نہیں"



رخصتی

ذرا ہوشیار لوگو ، پالکی میں آپا جاتی ہیں
بڑی نازک ہیں گلِ اندام ہیں نیندیا کی ماتی ہیں

چلے جانا کہارو ، تم جہاں کلیاں ہی کلیاں ہوں
میری آپا کو بچپن سے بڑی رغبت ہے کلیوں سے
گذرنا پالکی لے کر جدھر معصوم دنیا ہو
نظرِ بد سے بچا کر دل کی تم معصوم گلیوں سے

کبھی بھولے سے آنسو تک نہ آئے ان کی آنکھوں میں
یہ گھر میں اپنے بابل کے بہت مسرور رہتی تھیں
نہ چھوتا تھا کوئی پھولوں کی چھڑیوں سے انہیں ہرگز
گہہ خندہ درخشندہ ، گہہ مخمور رہتی تھیں

تمہارے بھی کہارو اپنی کوئی بہن ہوگی ہی
اُسی کا واسطہ دیتی ہوں آپا کو میری لا ،
میری آپا بہت گھبرائیں گی اپنے پیا گھر میں
بہت جلدی ، بہت جلدی ، بہت جلدی چلے آنا

میری آپا بہت انمول ہیں سب کی دلاری ہیں
بڑی خوش رو بڑی گل رُو ، بڑی ماؤں کی پالی ہیں

— انجم مولانگری





★ ہیرے کانچ کی چوڑیاں

فلم ساز و ہدایت کار : کشور ساہو
ستارے : بسواجیت، نینا ساہو، للتا پوار، سپرو، ہیلن، شیوکمار، نظیر حسین

غیر شادی شدہ ماں کا مسئلہ بڑا پرانا ہے، لیکن ہمیشہ نیا بھی ہے۔ جب تک شادی کا رواج ختم نہیں کر دیا جاتا کنواری ماں کس طرح سماج سے ٹکرا کے زندہ رہے — اس تھیم پر بڑی پُر اثر فلم بن سکتی تھی، لیکن "ہیرے کانچ کی چوڑیاں" دوسری بمبئی کی فلموں کے معیار سے اونچا نہیں اُٹھ سکی کیوں کہ دو چیزیں فلم پر بُری طرح حاوی ہیں: ایک تو نامی گرامی ہدایت کار کشور ساہو کی کمزور ہدایت کاری اور دوسرا باکس آفس پر کامیابی کے لئے ٹھونسے گئے مناظر۔

روی (بسواجیت) بمبئی سے چھٹیوں میں گھر آتا ہے اور دو تین ملاقاتوں میں ہی موہنی (نینا) سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ محبت رنگ لاتی ہے اور جب روی امتحان کے بعد واپس آنے کا وعدہ کرکے بمبئی جاتا ہے تو راز کھلتا ہے کہ موہنی ماں بننے والی ہے۔ بات روی کے باپ تک پہنچتی ہے۔ وہ اپنی بیماری کے علاج کے بہانے روی کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاتا ہے۔ اور مزید تعلیم کے لئے وہیں چھوڑ آتا ہے۔ تین سال بعد جب روی لوٹتا ہے تو موہنی بچّے کی ماں بن جاتی ہے۔ روی کا باپ موہنی کے خلاف بدچلنی کا الزام لگا کر روی کو اُس سے بدظن کر دیتا ہے۔ آخر سارے راز بے نقاب ہوتے ہیں اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔

کنواری ماں کی جدّوجہد سے بھری اِس کہانی میں پُر اثر مناظر کی کمی نہیں ہے لیکن غیر قدرتی اور حد درجے کے ڈرامائی واقعات

پچھلے بارہ مہینوں میں

★★★★ گائیڈ

★★★ ممتا، آسرا

★★ نیتا جی سبھاش چندر بوس، وقت، آرزو، شہید، بھیگی رات، غبن، آئے دن بہار کے، نئی عمر کی نئی فصل، انوپما، پالکی

★ ہمالیہ کی گود میں، خاندان، دو دل، بے خبر، نیلا آکاش، ساز اور آواز، سورج، دو بدن، دل لگی، تصویر، بہاریں، محبت، نئی پتنی، راز، نیا قانون، ملن، مہربان

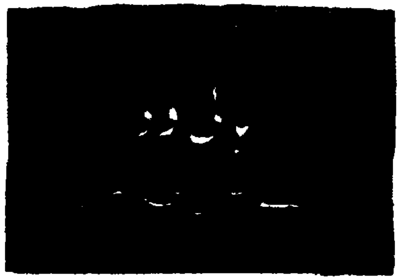
○ بدتمیز، سگائی، دل نے پھر یاد کیا، علی بابا چالیس چور، وہاں کے لوگ، چندن کا پلنا

نے اُس کا اثر زائل کر دیا ہے۔
مثال کے طور پر بچّے کی پیدائش کے منظر میں نہ طوفان کی ضرورت تھی نہ بارش کی، اور یہی اِس بات کی کہ موہنی کا باپ پڑوسن کے دروازے پہ بار بار ناک رگڑ کر گڑگڑاتا۔ موہنی کی چیخ و پکار سن کر پڑوسن کا لڑکا ڈاکٹر (بپن شیکھر کمار) ماں کی مرضی کے خلاف اُس کی مدد کرنے آجاتا ہے۔
حالاں کہ روی کے تمام دوستوں کو روی اور موہنی کی محبت کا راز معلوم تھا۔ اِس کے باوجود پورے تین سال تک کسی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ بچّے کا باپ کون ہے۔
موہنی کو روی کے تئیں بے رُخی بھی بناوٹی نظر آتی ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہونے کے باوجود وہ روی کے محبت ناموں کو جلا دیتی ہے۔ شاید محبت ناموں کو باپ (ہدایت کار) کے سامنے پڑھنے سے شرماتی ہے۔ ویسے چوری چھپے وہ روی کو خط تو لکھ سکتی ہے۔ لیکن اس صورت میں کہانی آگے کیسے بڑھتی ؟
ایسی بے شمار خامیوں سے فلم بھری پڑی ہے، جس سے سب کچھ بے اثر ہو گیا ہے۔

نینا کی اداکاری بڑی ہی مایوس کن ہے کیوں کہ نینا میں ایک ہیروئن کی سی رعنائی نہیں ہے۔ گو کشور ساہو نے اُسے پورے طور پر ایک گلیمر گرل کے طور پر ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نینا کے چہرے میں کشور ساہو کا عکس جھلکتا ہے۔ جب کبھی نینا پردے پر آتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ کشور ساہو کا بھوت ہمارے ذہن میں اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ نینا کے بولنے کا لہجہ بھی بالکل کشور ساہو جیسا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کشور ساہو خود پس منظر میں نسوانی آواز میں بول رہا ہے۔
بسوا جیت کی اداکاری میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے، البتہ نئے اداکار شیکھر کمار سے ضرور کچھ امید ہوئی ہے۔
شنکر جے کشن کی موسیقی میں شور و غل کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ فوٹوگرافی بھی گھٹیا درجہ کی ہے ہیرو اور ہیروئنوں پر لاکھوں روپیہ صرف کرنے والے فلم ساز نہ معلوم اچھی کہانی پر کیوں خرچ نہیں کرتے ؟ فلم ساز، ہدایت کار و افسانہ نگار سبھی کچھ بننے کے چکّر میں کشور ساہو ایک اچھی خاصی کہانی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ ●

ریاض

جانوروں میں بھی انسانوں کی طرح کام کرنے کا ملکہ پایا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔
ایک مشہور شکاری جیسے ہی کیمپ سے باہر نکلا ایک خوف ناک شیر آ ۲۰ فٹ کے فاصلے پہ سامنے کھڑا نظر آیا۔ اِدھر شیر چھلانگ لگانے کو جھکا اور اُدھر شکاری نے بندوق سے فائر کر دیا۔
گولی خیریت سے پاس سے نکل گئی اور شیر نے اتنی لمبی چھلانگ لگائی کہ وہ شکاری کے پیچھے ۱۵ فٹ دور جا گرا۔ شکاری دوڑ کر کیمپ میں گھس گیا
دوسرے دن شکاری نزدیک سے گولی چلانے کی مشق کرنے کے لیے کیمپ سے نزدیک کی جھاڑیوں میں آئے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں۔ چھپ کر اس نے کیا دیکھا کہ شیر چھوٹی [illegible] کی مشق کر رہا تھا



بمبئی میں چیتن آنند کی فلم "آخری خط" کی کامیابی سے فلمی حلقوں میں بڑی مسرت پھیل گئی ہے۔ اس فلم کا مرکزی رول ایک ننھے اداکار بنٹی نے ادا کیا ہے۔ بمبئی کے اکثر فلمی نقادوں کی حوصلہ شکن تنقید کے باوجود بمبئی میں یہ فلم بے حد پسند کی گئی ہے۔ جس سے آرٹ کے دلدادہ لوگوں کو بے حد خوشی ہوئی ہے

راجیش کھنہ (جس نے فلم "آخری خط" میں ایک اہم رول ادا کیا ہے) اب ناصر حسین کی فلم "بہاروں کے سپنے" میں بطور ہیرو جلوہ گر ہو رہا ہے۔ اس فلم میں بمبئی کے امیر اور غریب طبقوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

اس سال برلن میں ۳ر جولائی کو منعقد ہونے والے فلمی میلے میں جس فلم کی شمولیت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لہٰذا وہاں پر یہ فلم مقابلے سے الگ رکھ کر دکھائی گئی۔

راجیش کھنہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اداکار ہے۔ یہ تھیٹر گروپ اور انڈین نیشنل تھیٹر کا سرگرم کارکن رہا ہے۔ فلمی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے یہ بمبئی میں انگریزی، ہندی اور اُردو سٹیجوں پر نہایت مقبول تھا۔ اسی وجہ سے اُسے اداکاری کا اچھا تجربہ حاصل ہے۔ پرائیویٹ حلقوں میں یہ جتین کے نام سے مشہور ہے۔ سنجیدہ مزاج راجیش کھنہ اپنا بیشتر وقت معیاری فلموں اور ڈراموں کو دیکھنے یا پڑھنے میں صرف کرتا ہے۔

مشہور و معروف بھارتی فلمی تاریخ داں اور فلمی تحریک کے معزز رہنما مسٹر بی۔ ڈی۔ گرگ نے ایک بیان میں سنسر سے متعلق اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا "لفظ "سنسر" ہماری جمہوریت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ ہمارے آئین میں جن بنیادی حقوق کی گارنٹی دی گئی ہے اُن میں بولنے اور خیالات کے اظہار کی آزادی بھی شامل ہے۔ لہٰذا کسی بھی فلم ساز کو اپنے خیالات کے اظہار اور اُن کی عکاسی



"آخری خط" کا مرکزی اداکار ــــ بنٹی، جس نے فلمی نقادوں کے حوصلے پست کر دیئے۔



ہما مالنی: جب تک فلم 'بہاروں کے سپنے' مکمل نہیں ہو جاتی وہ کسی دوسری جگہ کام نہیں کرسکتی۔

کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔"

جو کچھ بھی پیش کیا جائے اگر وہ گھٹیا، غیر سماجی، غیر جمالیاتی اور فحش ہے تو عوام خود اس کا خیال رکھیں گے۔ اگر کوئی فلم غیر مہذب ہو گی تو لوگ خود ہی اسے نہیں دیکھیں گے اور اس طرح آئندہ ایسی فلمیں بننا بند ہو جائیں گی۔

مسٹر گرگ بمبئی کے بورڈ آف فلم سنسر کے بھی ممبر ہیں۔ سنسر سے متعلق انہوں نے نہ صرف اپنے ساتھیوں کو ہی لتاڑا بلکہ مرکزی اطلاعات و نشریات کے وزیر کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

جب وزیر موصوف نے اس کے متعلق تجویزیں مانگیں کہ نوجوانوں کی صحیح رہنمائی کس طرح کی جائے تو مسٹر گرگ یک لخت گرج اُٹھے "نوجوانوں کی رہنمائی کرنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگ ہماری رہنمائی کریں۔ ہم بیل گاڑی کے زمانے کے لوگ ہیں۔ ہمارے نوجوان ایٹمی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم اُن کی ر[ہنمائی] کرنے پر اڑے رہیں تو یہ وقت کو گھسیٹ کر واپس لے جانے کے مترادف ہے۔"

بھارت کے مختلف حصوں میں طال[ب] علموں کی جو ناپسندیدہ سرگرمیاں نظر آتی ہیں [ان] کا شاید یہ واحد حل ہے۔ پُرانے لوگ نوجوان[وں] پر اپنے خیالات زبردستی لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل ایٹمی زمانے میں پیدا [ہونے والا] نوجوان بیل گاڑی کے زمانے کے انسان کی ر[ہنمائی] کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرسکتا۔

بھارت

میں انگریزی سفید پوش اور تہذیب یافتہ لوگوں کی مادری زبان بن [گئی] ہے۔ نتیجہ میں ہماری فلمی صنعت کو بالی وڈ [سے] زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

یہ انگریزی داں بھارتی جس طرح د[یگر] بھارتی اشیاء کو گھٹیا تصور کرتے ہیں ا[...]

طرح بھارتی فلموں کو بھی ناپسند کرتے ہیں اور صرف ہالی وڈ فلموں کی تعریف کرتے ہیں۔ اِس بات کو بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ ان فلموں کا ہمارے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے کردار اور سماجی زندگی پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ خاص طور پر جب کہ یہی نوجوان نسل کل اِس ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والی ہے۔

بھارتی فلم تقسیم کاروں کے علاوہ یہ فلمیں ہمارے ملک کو اور کسی قسم کا روزگار مہیا نہیں کرتیں، جب کہ ہماری فلمی صنعت کے مختلف شعبوں میں تقریباً دو لاکھ آدمی برسرِ روزگار ہیں۔ اِس صنعت سے وابستہ کئی دوسری شاخیں اور تجارتی ادارے تو قریب قریب پانچ لاکھ لوگوں کو کام مہیا کرتے ہیں۔

اگر ہمارے سیاسی مدبر اور افسر صدقِ دل سے بھارتی فلموں کے گرتے ہوئے معیار سے پریشان ہیں تو اس صنعت کی بہبودی کے لئے مناسب یہ ہے کہ فلم فائی نینس کارپوریشن ملک بھر میں تقریباً ایک ہزار تھیئٹر تعمیر کرائے۔ ان میں صرف اُنہی فلموں کی نمائش کی اجازت ہو جو آرٹ کے لحاظ سے معیاری ہوں۔ تاکہ اِن فلموں کے فلم سازوں کو اپنے سرمائے کا کچھ منافع بھی حاصل ہو سکے۔

علاوہ ازیں پونا انسٹی ٹیوٹ ہر سال تقریباً ۱۴۸ لوگوں کو فلمی صنعت کی مختلف تکنیکوں کی ٹریننگ دیتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک تہائی تربیت یافتہ لوگ ہی ہر سال فلمی صنعت میں کھپ رہے ہیں۔ اور باقی بے کار جا رہے ہیں۔ لہٰذا فلم ڈویژن کا یہ فرض ہے کہ ان لوگوں کو کوئی مناسب روزگار مہیا کرے۔

ہیما مالنی (راج کپور کی کھوج) فلم 'سپنوں کا سوداگر' کے مکمل ہونے تک مدراس کے مشہور ہدایت کار سری دھر کی فلم میں کام نہیں کرے گی۔ وہ اس وقت 'سپنوں کا سوداگر' میں راج کپور کے ساتھ آ رہی ہے۔ اِس فلم کے ہدایت کار آنند سوامی کا ہیما مالنی کے ساتھ ایک کنٹریکٹ ہے۔ جس کی رو سے وہ اِس فلم کے مکمل ہونے تک کسی دوسری کمپنی کی فلم میں کام نہیں کر سکتی۔ قریباً ایک درجن فلم ساز اپنی فلموں کے لئے ہیما مالنی کی اس فلم کے مکمل ہونے کا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔



ناصر حسین کی فلم 'بہاروں کے سپنے' کا ہیرو : راجیش کھنہ

بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے مطابق کاردار سٹوڈیو بند کر دیا گیا ہے۔ پلاٹ کا مالک اس جگہ پر ہوسٹل تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

فلم انڈسٹری جو پہلے ہی زوال کی طرف بڑھ رہی ہے، یہ فیصلہ اُس کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوگا۔ اس وقت تقریباً ۵۰۰ آدمی بے کار ہو جائیں گے۔ ●

مئی ۱۹۶۷ کا 'سریتا' پڑھا۔ طباعت و ترتیب کے لحاظ سے بے حد پسند آیا۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔ مقالوں میں 'ایوب' (قمر کاشف) قطعی بے بنیاد، اشتعال انگیز اور تشنہ ہے۔ اُردو پر ہو رہے ظلم کے خلاف آپ بھی قلم اُٹھا کر اُردو دوستی کا ثبوت دیجئے۔ امید ہے اِس مشورے پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

— کے۔ زاہد تاپوری، گلبرگہ

•

'سریتا' میرا من پسند پرچہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ 'سریتا' جو اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے یہ قابلِ صد ستائش و تحسین ہے۔

— محبوب نظر، دھنباد

•

'سریتا' ہر لحاظ سے پاک اور بلند ہے۔ اِس میں چھپنے والا تمام مواد — کہانیاں، مقالے، فیچر اور نظمیں — بہت ہی معیاری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'سریتا' دن رات ترقی کرتا جا رہا ہے۔ 'سریتا' واقعی سماجی تعمیر کا ترجمان ہے۔ میری رائے میں 'سریتا' سے اچھا رسالہ اُردو میں شاید ہی کوئی ہو۔ میں اپنے 'سریتا' پڑھنے والے دوستوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ 'سریتا' کے بارے میں آپ اپنے دوستوں کو جو کہ 'سریتا' سے ناواقف ہیں اُن کو 'سریتا' کا مطالعہ کرنے کو کہیں اور 'سریتا' کا معیار اِس سے بھی زیادہ بلند کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری تھوڑی سی محنت سے 'سریتا' میں اور بھی [illegible] آ جائے گا اور یہ رسالہ ہندوستان کا [illegible] رسالہ بن جائے گا۔

— محمد [illegible]

•

یوں تو 'سریتا' بہت [illegible]
ہوں لیکن جون ۱۹۶۷ [illegible]

پسند آیا۔ انیسہ کا مقالہ 'شوہر کا کا'، نیرجا کا 'میٹھے بول' بہت پسند [illegible] میں 'ستر دن کے مہمان'، پربودھ کا 'شکستِ فاش'، ستیہ پربھاکر کا [illegible] 'سریتا' میں نظموں اور غزلوں کا معیار بلند ہوگیا ہے۔ سلطان اختر سہسرامی 'رخسار کا رنگ' پڑھ کر دل جھوم اُٹھا [illegible] سے محفوظ رکھے (آمین)۔ ظاہری او[illegible] دونوں قابلِ صد ستائش ہیں۔ امید آئندہ بھی معیاری مقالے، کہانیاں اور غزلیں 'سریتا' میں پیش کرتے رہیں۔

— سلمیٰ

•

فلمی رسالوں سے بیزار کرتے [illegible] دوست نے 'سریتا' کی طرف رجوع [illegible] یقین جانئے پچھلے چھ ماہ سے کسی ف[illegible] کو ہاتھ تک لگانے کی ہمت نہ ہوئی [illegible] 'سریتا' کی کشش اور اُس کے [illegible] اور کہانیوں کی وجہ ہے کہ ج[illegible] اس کا مطالعہ نہ کر لوں [illegible] لیجئے آج ہی جون [illegible] بشکل 'میٹھے [illegible] ہی نظر [illegible] روش کی طرح [illegible]

[illegible] رہے

— [illegible] بھیجیں

•

[illegible] لازوال خدمت کر[illegible] اور افادی فیملی میگزین میرا[illegible]

— احمد جمال پا[illegible]

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں اپنی رائے لکھئے

— ایڈیٹر



